اوراقِ زندگی

اہم شخصیات کی ہنگامہ خیز آپ بیتیاں

www.currentfun.com

عبدالستار اعوان

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

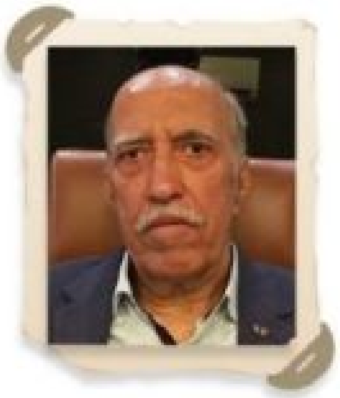

محمد وحید چودھری
معروف صنعت کار

ڈاکٹر یوسف عالمگیرین
ادیب، صحافی

عبدالغفور چودھری
ڈپٹی کمشنر (ر)

ایثار رانا
سینئر صحافی، کالم نگار

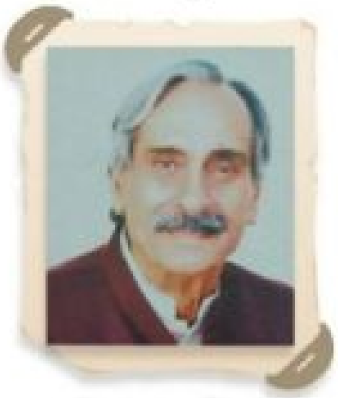

امیر نواز نیازی
ادیب، کالم نگار، سابق بیوروکریٹ

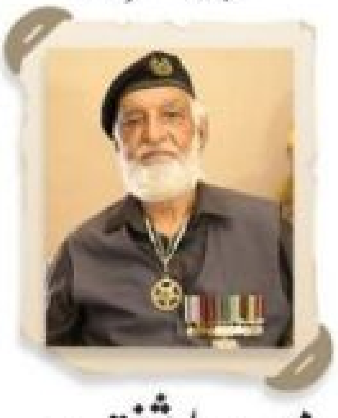

میجر جنرل شفیق احمد
جنگ ستمبر کے ہیرو

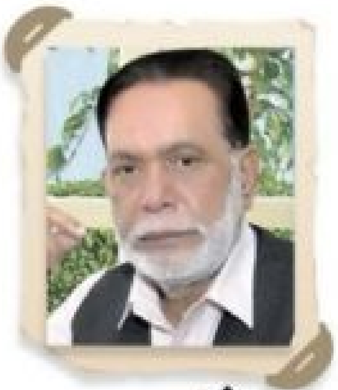

حافظ شفیق الرحمن
کالم نگار، اخبار نویس

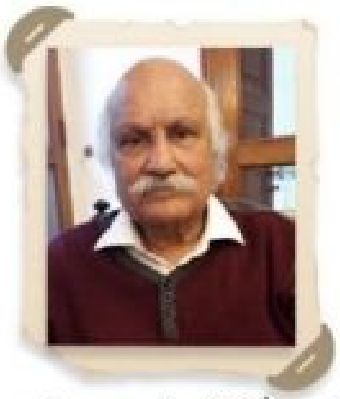

لیفٹیننٹ کرنل شجاعت لطیف
جنگ 1971ء کے ہیرو

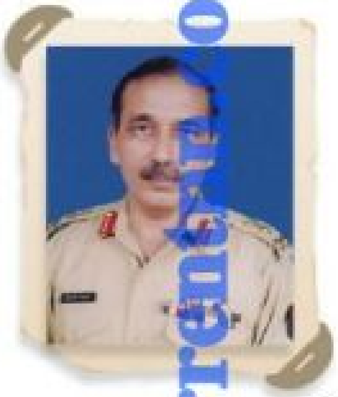

بریگیڈیئر (ر) صولت رضا
ممتاز ادیب

عامر خاکوانی
دانش ور، کالم نگار

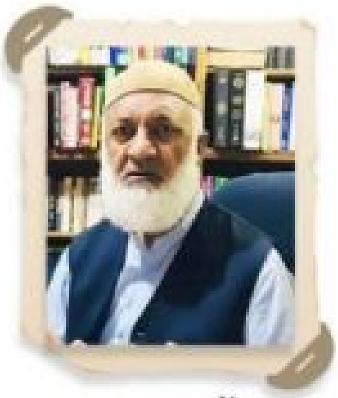

متین خالد
مصنف، مذہبی سکالر

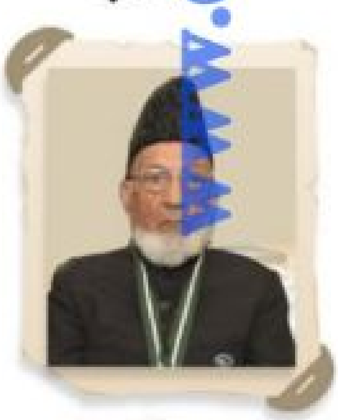

میاں ابراہیم طاہر
صحافی، کارکن تحریک پاکستان

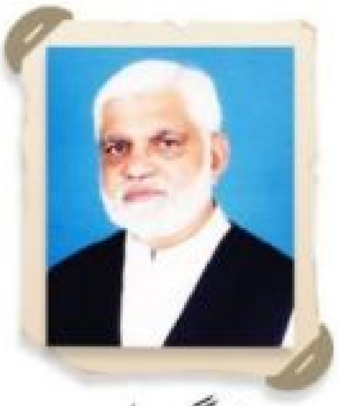

انور گوندل
سابق طالب علم رہنما

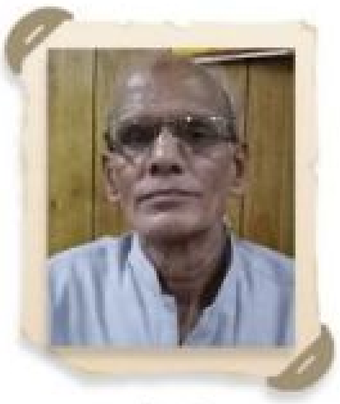

زاہد بلند شہری
اخبار نویس، سیاسی کارکن

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سینئر ایڈیٹر قومی ڈائجسٹ
پروفیسر خالد ہمایوں اور عبدالستار اعوان

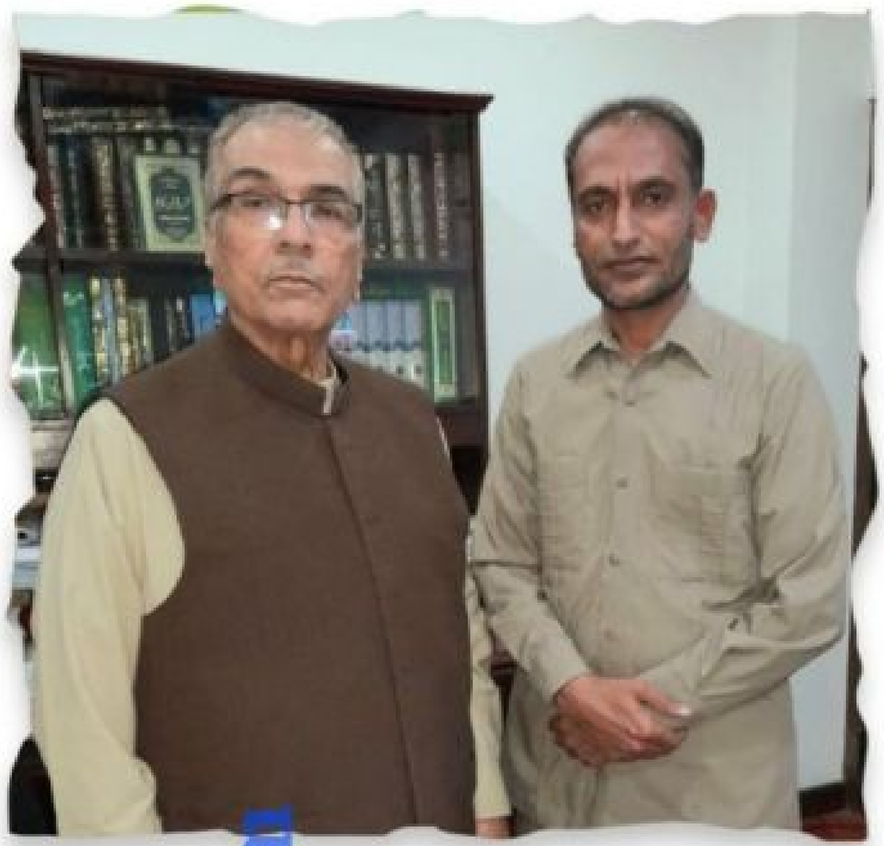

ممتاز صحافی، تجزیہ نگار، چیف ایڈیٹر قومی ڈائجسٹ
مجیب الرحمن شامی اور عبدالستار اعوان

www.currentnn.com

ادیب، شاعر، صحافی
ڈاکٹر یوسف عالمگیرین کی رُودادِ زندگی

ادیب، کالم نگار، بیوروکریٹ
امیر نواز نیازی کا سفرِ زیست

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

میجر جنرل شفیق احمد (ستارہ جرات)
کی جنگی یادداشتیں

اینکر، کالم نگار، اخبار نویس
ایثار رانا کی دلچسپ یادیں

ڈپٹی کمشنر ریٹائرڈ
عبدالغفور چودھری کی حیرت انگیز داستان

تحریک پاکستان کے کارکن، سینئر صحافی
محمد ابراہیم طاہر کی داستان

www.currentnm.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کالم نگار، صحافی
عامر خاکوانی کی سرگزشت

معروف صنعت کار
محمد وحید چودھری کے تجربات ومشاہدات

www.currentnn.com

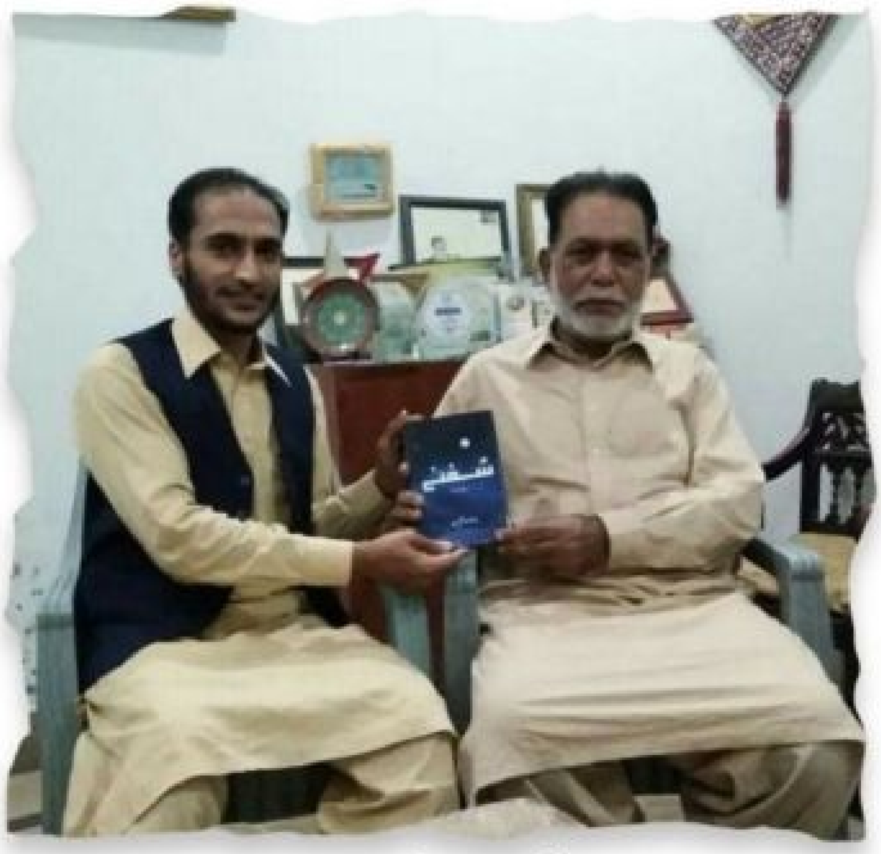

دانش ور، کالم نگار
حافظ شفیق الرحمن کی ہنگامہ خیز زندگی کی کہانی

مذہبی سکالر، مصنف
محمد متین خالد کی رُودادِ حیات

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دانش ور، سیاسی کارکن

محمد زاہد بلند شہری کی دلچسپ آپ بیتی

سابق طالب علم رہنما

محمد انور گوندل کی دلچسپ یادیں

لیفٹیننٹ کرنل شجاعت لطیف

کی حیرت انگیز داستان

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مختصر تعارف

عبدالستار اعوان (ایم اے سیاسیات)

زیرِ نظر کتاب اُن یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو عبدالستار اعوان نے منتخب افراد سے طویل ملاقاتوں کے ذریعے بڑی محنت سے محفوظ کیں اور یہ یادگار آپ بیتیاں/ یادداشتیں موقر جریدے ماہنامہ قومی ڈائجسٹ میں شائع ہوئیں۔

عبدالستار اعوان میانوالی کے ایک گاؤں ڈھوک غزن میں قطب شاہی اعوان قبیلے میں پیدا ہوئے۔

گھر کے خوبصورت علمی ماحول، والدین کی تربیت، اعلیٰ تعلیم یافتہ بڑے بھائیوں کی خصوصی توجہ اور بچوں کے جرائد ماہنامہ تعلیم و تربیت، پھول اور ہمدرد کے مطالعہ سے پڑھنے لکھنے کا شغف پیدا ہوا۔

پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کیا۔

2005ء میں بھکر/ میانوالی کے مقامی اخبارات "بھکر ٹائمز"، "سانول" و دیگر جرائد سے صحافتی سفر کا آغاز کیا۔

2007ء میں پہلی بار قومی اخبار روزنامہ پاکستان (ملتان) کے لیے مستقل کالم "اعوانیات" لکھنا شروع کیا۔

2009ء سے افواج پاکستان کے ترجمان جریدے "ہلال" میں شہدائے افواج پاکستان کی داستانیں لکھ رہے ہیں۔

روزنامہ خبریں، روزنامہ نئی بات اور روزنامہ اسلام میں مستقل کالم "احوال عصر" لکھتے رہے۔

ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" میں اہم افراد کی یادداشتیں محفوظ کیں و دیگر موضوعات پر لکھا۔

سنڈے میگزین روزنامہ پاکستان میں کتابوں پر تبصرے و جائزے قلمبند کیے۔

2008ء سے 2010ء تک روزنامہ اسلام لاہور میں سب ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ چند برس طلبہ میگزین "نقیب طلبہ" کی ادارت کی۔

معروف صحافی رحمت علی رازی (مرحوم) کے روزنامہ طاقت کے ساتھ وابستہ رہے۔

روزنامہ "اومیگا نیوز" لاہور میں ادارتی صفحہ کے انچارج رہے۔

کتابوں کے مطالعہ سے خصوصی دلچسپی ہے اور ذاتی کتب خانے میں کثیر تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔

کتابیں

اوراقِ زندگی (یادداشتیں)

احوال عصر۔ کالموں کا مجموعہ (زیر طبع)

ہمارے شہداء (پاک فوج کے مجاہدین کا تذکرہ)

شہدائے میانوالی (زیر طبع)

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اوراقِ زندگی

اہم شخصیات کی ہنگامہ خیز آپ بیتیاں

[ماہنامہ قومی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی یادداشتوں کا مجموعہ]

www.currentnn.com

ملاقاتیں / قلمبندی

عبدالستار اعوان

ناشر

ادارہ مظہر التحقیق، ملتان روڈ، لاہور

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جملہ حقوق ماہنامہ ''قومی ڈائجسٹ'' کے نام محفوظ ہیں

نام کتاب .... اوراق زندگی
مصنف .... عبدالستار اعوان
سن اشاعت .... فروری 2025ء
کمپوزنگ .... رشید احمد
ڈیزائنر .... محمد دانش
صفحات 620
قیمت .... 3000 روپے
ملنے کے پتے : ادارہ مظہر التحقیق، ملتان روڈ لاہور۔ 03338052393
سندھ ساگر پبلی کیشنز۔ اردو بازار لاہور 03034193485

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تاریخی حقائق، قومی سربستہ راز، سیاسی انکشافات، دفاعی معلومات، ادبی سرگوشیوں اور صحافیانہ موشگافیوں پر مشتمل دلچسپ، چشم کشا، حیرت انگیز اور منفرد یادداشتوں کا مجموعہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بسم الله الرحمن الرحيم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

فہرست مضامین

	عنوان	صفحہ نمبر
1	ڈاکٹر یوسف عالمگیرین۔ادیب،صحافی	7
2	امیر نواز نیازی۔ادیب،کالم نگار،سابق سول افسر	67
3	عامر خاکوانی۔دانش ور،کالم نگار	87
4	ایثار رانا۔سینئر صحافی،کالم نگار	154
5	بریگیڈیئر (ر) صولت رضا،ممتاز ادیب	190
6	محمد وحید چودھری۔معروف صنعت کار	295
7	حافظ شفیق الرحمٰن۔معروف کالم نگار،اخبار نویس	319
8	متین خالد۔مصنف،مذہبی سکالر	384
9	زاہد بلند شہری۔اخبار نویس،سیاسی کارکن	431
10	عبدالغفور چودھری۔ڈپٹی کمشنر (ر)	457
11	انور گوندل۔سابق طالب علم رہنما	540
12	میاں ابراہیم طاہر۔سینئر صحافی،کارکن تحریک پاکستان	566
13	لیفٹیننٹ کرنل شجاعت لطیف۔جنگ 1971ء کے ہیرو	595
14	میجر جنرل شفیق احمد۔جنگ ستمبر کے ہیرو	609

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

14 افراد کی کہانی

ہر وہ شخص جو کسی نہ کسی شعبے میں کچھ نہ کچھ کر دکھاتا اور اپنے آپ کو منواتا ہے، اُس کے پاس بتانے کے لیے کچھ نہ کچھ ہوتا ہے اور اس سے سیکھا بھی کچھ نہ کچھ جا سکتا ہے۔ اُس کی کتابِ زندگی ان سب لوگوں کے لئے گائیڈ کی حیثیت رکھتی ہے جو آگے بڑھنا اور اپنے مستقبل کو سنوارنا چاہتے ہیں۔ دائرہ چھوٹا ہو یا بڑا، کسی کو شہرت کم ملی ہو یا زیادہ، اہمیت اس لگن، جستجو اور کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں پودا لہلہاتا ہے اور پھل یا پھول سے لد جاتا ہے۔ عبدالستار اعوان نے 14 منتخب افراد کی کتابِ زندگی آپ کے سامنے کھول کر رکھ دی ہے، گویا ایک کتاب میں 14 کتابیں سمٹ آئی ہیں۔ انہیں پڑھیے اور ان سے ملاقات کیجیے جو ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں۔

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

قوم افراد کے مجموعے کا نام ہے اور اگر ہر فرد کمر ہمت کس لے، ہار نہ مانے اور اپنا سفر جاری رکھے تو پوری قوم ناقابلِ تسخیر بن جاتی ہے۔ 14 افراد کی کہانی اگر پوری قوم کی کہانی بن جائے تو عبدالستار اعوان کا سر بھی فخر سے بلند ہو جائے گا اور ہم سب بھی سربلند ٹھہریں گے۔

مجیب الرحمٰن شامی ۔سینئر صحافی، تجزیہ نگار

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ادیب، شاعر، صحافی

ڈاکٹر یوسف عالمگیرین

کی رُودادِ زندگی

وطن عزیز کے ادبی اور صحافتی افق پر ڈاکٹر یوسف عالمگیرین کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا تعلق ضلع نارروال کی تحصیل ظفروال کے ایک گاؤں دودہم خورد سے ہے (قبل ازیں یہ گاؤں ضلع سیالکوٹ تحصیل شکرگڑھ کا حصہ تھا)۔ وہ پاک فوج کے شعبہ تعلقات عامہ ''انٹر سروسز پبلک ریلیشنز'' میں انفارمیشن افسر بھرتی ہوئے اور اب گزشتہ کئی برس سے افواج پاکستان کے ترجمان رسالے ''ہلال'' کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کے والد گرامی چونکہ فوج میں تھے اور مختلف مقامات پر تعینات رہے تو یہ آٹھویں جماعت تک مختلف شہروں میں زیر تعلیم رہے۔ میٹرک کا امتحان ملٹری کالج جہلم سے پاس کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ میں بھی زیر تعلیم رہے، پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے صحافت کیا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل ماس کمیونی کیشن اور پی ایچ ڈی ماس کمیونی کیشن کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کا پہلا کالم 'دستک' کے عنوان سے روزنامہ جہاں نما لاہور میں 1990 میں شائع ہوا، وہ گزشتہ تیس برس سے مختلف موضوعات پر قومی جرائد میں لکھ رہے ہیں۔ ان کی متعدد ادبی کتابیں چھپ چکی ہیں اور پانچ زیر طبع ہیں۔ ان کی زندگی میں مختلف نشیب و فراز آئے اور انہوں نے بہت سی اہم شخصیات کو قریب سے دیکھا۔ قومی ڈائجسٹ نے پہلی بار ان کی دلچسپ یادداشتیں محفوظ کی ہیں۔ لیجیے ان کی یادیں انہی کی زبانی ملاحظہ کیجیے۔

✠......❖......✠

میرے آباء و اجداد کا تعلق ضلع گورداسپور کی تحصیل شکرگڑھ کے موضع دودھم خورد سے تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد ضلع گرداسپور کو بھی پاکستان میں شامل ہونا تھا لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جواہر لال نہرو کے گٹھ جوڑ اور سازش کی وجہ سے گرداس پور بھارت کے حصے میں چلا گیا تا کہ بھارت کو جموں و کشمیر تک براہِ راست زمینی راستہ میسر ہو سکے۔ بہرحال خوش قسمتی رہی کہ گورداسپور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کی تحصیل شکرگڑھ کو ضلع سیالکوٹ کا حصہ بنا دیا گیا۔ یوں ہمارا خاندان ہجرت کی صعوبتوں اور تکلیفوں سے بچ گیا۔ موضع دودھم خورد میں زیادہ گھرانے راجپوتوں کے ہیں، گجر برادری کے گھرانے بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نواحی گاؤں دودھم کلاں ہے وہاں زیادہ گھرانے گجر برادری کے ہیں۔ کبڈی، کشتی اور والی بال وہاں کے نوجوانوں کے محبوب مشاغل ہیں۔ سبھی لوگ زراعت کے شعبے سے منسلک ہیں۔ جو بچے پڑھ لکھ جاتے ہیں وہ افواجِ پاکستان، پولیس، محکمہ تعلیم اور دیگر محکموں میں ملازمتیں کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق راجپوت کاٹل برادری سے ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں جن بزرگوں کو دیکھا اُن پر آج بھی فخر محسوس ہوتا ہے۔ میرے دادا جان لہر بخش بہت دبنگ، دلیر اور منہ پر کھری بات کرنے والے شخص تھے۔ کسی بڑی سے بڑی پنچائیت میں اگر موجود ہوتے تو کوئی بھی شخص جھوٹ یا فریب کے بل بوتے پر بچ نہیں سکتا تھا۔ جھوٹ بولنے پر اُس کے پٹنے کے قوی امکانات موجود ہوتے تھے۔ ان کی دلیری اور صاف گوئی کے درجنوں واقعات ہیں۔ ایک واقعہ یہاں درج کرتا ہوں کہ تقسیم کے وقت ہمارے گاؤں میں ہندوؤں کے دو گھر موجود تھے۔ پیشے کے اعتبار سے بڑھئی (ترکھان) تھے۔ دونوں گھرانے گاؤں کے زمینداروں کے چھوٹے موٹے کام کاج کر کے گزارا کرتے تھے لیکن جب تقسیم کے وقت وہ بھارت جانے لگے تو گاؤں کے کچھ لوگوں نے اُن کا گھیراؤ کر لیا اس کی ایک وجہ تو وہ خبریں تھیں کہ کس طرح بھارت کی جانب سے آنے والے مسلمان گھرانوں جن میں مرد، عورتیں، بچے بوڑھے سبھی شامل تھے پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ لوگوں میں غم وغصہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک ہی گاؤں میں رہتے ہوئے کوئی ذاتی عناد بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں کی ایک بوڑھی مائی نے کسی بچے کو بھیجا کہ چوہدری لہر بخش کو اس بات کی خبر کرو۔ یہ اپنے گھر میں سو رہے تھے تو یہ اُسی طرح بنیان اور تہمند پہنے اپنے ہاتھ میں روائتی لاٹھی (ڈانگ) پکڑے وہاں جا پہنچے اور لوگوں کو سمجھایا اور پیچھے ہٹنے کا کہا انہوں نے اس بوڑھی عورت کو الگ کر کے کہا جو تمہارے زیورات وغیرہ ہیں یا کوئی قیمتی شئے ہے وہ الگ سے پوٹلی میں سنبھال لو۔ یوں اُن لوگوں کو گاؤں سے بحفاظت نکالنے میں میرے دادا جان نے کلیدی کردار ادا کیا۔ بوڑھی ہندو عورت جب گھر کی دہلیز سے نکل رہی تھی تو آواز دے کر میرے دادا جان کو کہا ''چودھری لہر شام نوں ککڑیاں گھر واپس آئیاں تے اونہاں نوں ٹوکرے تھلے ڈک دیویں، اونہاں نوں کوئی کتا یا بلی نہ کھا جائے۔'' (شام کو جب مرغیاں دانہ دنکا چگ کر واپس آئیں تو اُنہیں بحفاظت ٹوکرے کے نیچے بند کر دینا، مبادا کوئی کتا یا بلی وغیرہ اُنہیں کھا نہ جائے)۔ میرے دادا کے پانچ بھائی تھے ایک جوانی ہی میں فوت ہو گئے تھے، باقی چار بھائیوں کو میں نے دیکھا ہے۔ اُن

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کی اولاد آج بھی آبائی گاؤں میں ہی ہے۔ میں نے اپنے پردادا جان چوہدری چراغ کو بھی دیکھا ہے اُن کی رحلت 1971 کی جنگ کے بعد ہوئی۔

1971ء کی جنگ سے پہلے دودھم خورد میں ہمارا بہت بڑا احاطہ تھا۔ بڑے بڑے کمرے اور بہت بڑا صحن تھا۔ دادا جان کی اولاد اور اُن کے بھائیوں کے بچے بھی اُسی بڑے صحن کے آس پاس اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ 1971 کی جنگ میں جب ہمارا علاقہ بھارت کے قبضے میں چلا گیا تو ہمارے گاؤں کے لوگ اور علاقے کے دوسرے دیہات کے لوگ محفوظ جگہوں کی طرف نکل گئے۔ ہمارے دادا گاؤں چھوڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ لہٰذا ہمارا گھر شاید وہ واحد گھر تھا جس کا سارا سامان بھارتی فوج ساتھ لے گئی یا اُس نے ضائع کر دیا تھا۔ جب 1971 کی جنگ شروع ہونے کا خطرہ ہوا تو میرے والد صاحب، جو پاک فوج میں سروس کر رہے تھے وہ بار ہا خط کے ذریعے مطلع کرتے کہ وہاں سے نکل آئیں اور سیالکوٹ ہیڈ مرالہ کے قریب ہمارے ننھیال میں واقع گھر میں چلے جائیں یا پھر بورے والا میں مقیم رشتہ داروں کے پاس چلے جائیں لیکن دادا جان ڈٹے رہے کہ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ بھارتی فوج کے حملے سے دو تین دن قبل میرے ابو نے میرے چچا جان سرور صاحب کو خط لکھا کہ تم یوسف، اُس کی امی اور میری دو چھوٹی بہنوں کو سیالکوٹ چھوڑ آؤ۔ انہوں نے ہمیں ساتھ لیا، امی نے ایک گرین کلر کا اٹیچی کیس ہوتا تھا، اُس میں چند کپڑے ڈال کر صرف وہ ساتھ رکھ لیا۔ چچا نے ایک گھوڑے والے کو کرائے پر حاصل کیا اور ہمیں چک امرو سٹیشن سے سیالکوٹ والی ٹرین پر بٹھانے نکلے لیکن وہاں رش اور افراتفری دیکھ کر خود بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے اور ہمیں ہمارے ننھیال چھوڑ کر جب واپس دودھم خورد پہنچے تو اگلے ہی روز شام کو بھارتی فوج بارڈر کراس کر کے ہمارے گاؤں پہنچ چکی تھی۔ یوں ہمارے خاندان کے پاس Reactoin ٹائم بھی نہیں تھا۔ انہوں نے حویلی میں بندھے ہوئے جانور کھول دیئے، چولہے پر رات کے لئے کھانا پک رہا تھا وہ بھی وہیں چولہے پر چھوڑا اور صرف اپنی جانیں بچا کر پیدل سیالکوٹ میں ایک گاؤں سنکیال جہاں میری ایک پھوپھو جان بیاہی ہوئی تھیں ان کے پاس جا پہنچے۔ پھر شائد اگلے ہی روز پیر سبز ہیڈ مرالہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں چند روز رہنے کے بعد ہمیں بھی ساتھ لیا اور سیالکوٹ سے ٹرین پر پہلے لاہور، پھر بورے والا پہنچے۔ ہم لوگ بورے والا چک 463/EB میں نانا کے گھر اور 329/EB میں اپنے رشتہ داروں کے پاس رہتے رہے۔

جنگ ختم ہوئی تو جب گاؤں واپس پہنچے تو ہمارے گاؤں کے تمام گھروں کو بھارتی فوج نے بلڈوز کر دیا ہوا تھا۔ میٹھے پانی کے کنویں مٹی ڈال کر بند کر دیئے گئے تھے۔ کئی کنوؤں کی کھدائی شروع

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کی تو کدال لگنے سے گرنیڈ پھٹنے اور کئی لوگوں کے معذور ہونے کے واقعات ہوئے۔ مجھے یاد ہے جب ہمارے گاؤں میں کنویں کی کھدائی کی جا رہی تھی تو ہم بچے ہونے کے ناتے یہ عمل قریب سے دیکھنا چاہتے لیکن بڑوں کو تشویش تھی کہ کوئی گرنیڈ وغیرہ نہ پھٹ جائے لہٰذا ہم اس خطرے کے پیش نظر دور بیٹھ کر یا کسی درخت پر چڑھ کر اس کارروائی کا نظارہ کرتے رہے۔

میں ضلع سیالکوٹ ہیڈ مرالہ کے قریب اپنے ننھیال میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش سرٹیفکیٹ کے مطابق 12 جنوری 1967 ہے یوں 1971 کی جنگ میں میں چار پانچ سال کا تھا۔ میری یادداشت اچھی ہے۔ مجھے لوگ، اُن کے چہرے، حتیٰ کہ کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے بسا اوقات وہ بھی یاد رہ جاتے ہیں۔ مجھے اپنے گاؤں میں جنگ 71 سے پہلے اور 71 کے بعد والے حالات آج بھی یاد ہیں۔ میرے پردادا چوہدری چراغ دین بھی مجھے یاد ہیں، میں چھوٹا سا تھا اُن کی چارپائی کے ارد گرد اپنے کزنز کے ساتھ کھیلتا کودتا، ان کے پاؤں دباتا۔ ان کا مسکراتا چہرہ مجھے یاد آتا ہے۔ وہ بہت Lovley اور Pleasing سے تھے۔ میری پردادی عائشہ بی بی سابق وفاقی وزیر پروفیسر احسن اقبال کے دادا کی پھوپھو تھیں۔ احسن اقبال کے دادا ڈاکٹر مشتاق علاقے کی بہت بڑی شخصیت تھے اور ان کا سیاسی اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ اسی لئے ہمارے خاندان والوں کی جب بھی کسی سے مڈبھیڑ ہوتی یا کوئی پھڈا وغیرہ کر بیٹھتے تو سیدھا ڈاکٹر مشتاق کے پاس جا پہنچتے اور وہ پولیس کو کہہ کر دونوں پارٹیوں میں صلح صفائی یا راضی نامہ کروا دیتے۔ یوں معاملے خوش اسلوبی سے طے ہو جاتے۔ میرے والد بتاتے ہیں کہ وہ میٹرک کے طالب علم تھے جب ہمارے بزرگوں کا شائد پولیس والوں کے ساتھ ہی کوئی پھڈا ہو گیا۔ یہ صبح صبح گھوڑی پر بیٹھ کر ڈاکٹر مشتاق کے گاؤں فتووال پہنچے تو وہ ابھی ناشتہ کر رہے تھے وہ میرے ابو کو دیکھتے ہی ہنس کر بولے "دودھماں والیو اَج کِنوں کُٹیا جے" (کہ آج کس کی پٹائی کی ہے) یہ ڈاکٹر مشتاق ہی تھے جنہوں نے اپنے بچوں کو بہت اچھی تعلیم دلوائی اور وہ مختلف شعبوں میں کامیاب رہے۔ ان کی بہو آپا نثار فاطمہ مجلس شوریٰ کی ممبر رہیں۔

مجھ سے پہلے میرا بھائی پیدا ہوا جو ایک ہفتہ تک زندہ رہنے کے بعد فوت ہو گیا۔ اُس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُسے نظر لگ گئی یا کسی نے تعویذ ڈال دیئے۔ اکثر جگہوں پر ایسا سوچا جاتا ہے۔ جب میں پیدا ہوا تو میرے نانا جان چودھری محمد بوٹا نمبردار نے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھنا شروع کر دی کسی غیر عورت کو وہ مجھے دیکھنے بھی نہ دیتے پھر میں 22 دن کا ہی تھا تو وہ مجھے ٹرین کے ذریعے چک امرو اور پھر وہاں سے اپنی بانہوں میں اٹھا کر گاؤں دودھم خورد تک چھوڑ آئے،

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جہاں میرے دادا چودھری لہر بخش نے میرا نام محمد یوسف رکھا۔ میرے نام رکھنے کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میں پیدا ہوا تو میرا رنگ بہت Fair تھا۔ دوسرے ان دنوں لوگ شام کو اکٹھے ہو کر بیٹھ جاتے اور کوئی پڑھا لکھا لڑکا، بزرگوں کو حضرت یوسفؑ اور زلیخا کا قصہ سنایا کرتا۔ ہیر وارث شاہ بھی لوگ سنا کرتے تھے۔ شاید یوسف نام اُنہیں پسند آنے کی یہی وجہ تھی۔ میری تاریخ پیدائش کے حوالے سے میرے نانا جان نے اپنی نمبرداری کی کتاب جسے 'وحی' کہا جاتا ہے اُس میں کہیں لکھ رکھا تھا کہ بیٹی کے ہاں بیٹا ہوا۔ 11 چیت (پنجابی مہینہ) اور 25 مارچ 1966 بہر طور دستاویزات میں 12 جنوری 1967 ہی درج ہے تو اُسے ہی سرکاری حیثیت حاصل ہے۔ امی بتاتی تھیں جب میں پیدا ہوا تو اُس سے اگلے دن عید کا روز تھا۔

میں کچی جماعت میں پرائمری سکول دودھم کلاں میں داخل ہوا۔ سکول کی کل کائنات ماسٹر صاحب کا ایک میز، دو کرسیاں، ایک لکڑی کا بلیک بورڈ اُس کے ساتھ سٹینڈ اور چار پانچ چاک تھے۔ ماسٹر صاحب کے آنے سے پہلے پانچویں جماعت کے بڑے بڑے بچوں کی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ ساتھ کیکر کے درختوں کے نیچے سکول 'قائم' کر دیا جائے۔ جب ماسٹر صاحب جن کا نام منظور صاحب تھا، آتے تو وہ ڈیلرہ کی جانب سے آتے اور ''دودھم کلاں'' کے بالکل ساتھ ایک ندی جسے لوکل زبان میں ''کریز'' کہا جاتا، کے اُس پار کھڑے ہو جاتے۔ پھر گاؤں کا کوئی نوجوان یا ذرا ہمت والے چند سٹوڈنٹس اُنہیں کندھوں پر اٹھا کر ندی پار کرواتے تا کہ ریت اور پانی کی وجہ سے اُن کے جوتے خراب نہ ہو جائیں۔ وہاں سے میں پکی جماعت میں ہوا تو مری کے قریب باڑیاں جہاں میرے والد صاحب کی یونٹ تھی، کے مقام پر مڈل سکول میں داخل ہوا۔ وہاں ایک ماسٹر گلزار صاحب ہوتے تھے مجھے آج بھی یاد ہیں۔ دوسری جماعت میں ہوا تو والد صاحب کی یونٹ تریٹ کے مقام پر منتقل ہوئی تو میں تریٹ پرائمری سکول میں شفٹ ہو گیا۔ وہاں ماسٹر ذوالفقار صاحب اور ماسٹر جاوید صاحب کے نام مجھے یاد ہیں۔ تریٹ سے والد صاحب کی یونٹ مظفرآباد آزاد کشمیر چلی گئی تو ہمیں انہوں نے اپنے گاؤں بھجوا دیا۔ پانچویں جماعت میں مڈل سکول ڈیلرہ میں داخل ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب وزیرِاعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف مذہبی جماعتوں کی تحریک چل رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ تحصیل شکر گڑھ جاتے تو مذہبی جماعتوں کی طرف سے پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف نعرے بازی کا احوال بتاتے۔

ایک نعرہ آج بھی مجھے یاد ہے 'دس روپے دا جھاڑو تے 20 روپے دی بالٹی، ہائے پیپل پارٹی، ہائے پیپل پارٹی'۔ تحریک کی وجہ سے بچوں کی تعلیمی سرگرمیاں متاثر ہوئیں تو حکومت نے پہلی سے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نویں جماعت تک کے بچوں کو بغیر امتحان کے پاس کر دیا۔ یوں میں بھی چھٹی جماعت میں پر موٹ ہو گیا۔ اسی دوران والد صاحب نے مظفر آباد شوکت لائنز کے قریب ایک گھر کرائے پر لے لیا اور ہمیں ساتھ لے گئے۔ میرا داخلہ گورنمنٹ پائیلٹ ہائی سکول نمبر ون میں کروا دیا۔ وہاں کے اساتذہ کرام میں پیر فضل صاحب، شبیر صاحب، رؤف صاحب اور جاوید صاحب (ہمارے کلاس ٹیچر) مجھے یاد ہیں۔ آزاد کشمیر میں فٹ بال کا کھیل بہت مقبول تھا۔ سکول کے بعد میرے لئے نیلم سٹیڈیم میں پاک فوج کے اتھلیٹکس کے مقابلے اور دیگر کھیلوں کے مقابلے دیکھنا ایک اہم مشغلہ تھا۔ میں چھٹی جماعت میں سکول سے فارغ ہو کر گھر پہنچتا، کھانا کھا کر، سپورٹس ڈریس (نیکر، بنیان اور پی ٹی شوز) پہن کر سیدھا والد صاحب کی یونٹ میں سٹینڈ پر لگے اخبار میں 'ٹارزن کی کہانی' کی اگلی قسط پڑھتا پھر گراؤنڈ میں چلا جاتا۔ جب ساتویں جماعت میں ہوا تو والد صاحب کی یونٹ کیمبر چھاؤنی اوکاڑہ چلی گئی تو میرا داخلہ ایف جی سکول اوکاڑہ میں کروا دیا گیا۔ میں نے آٹھویں کا بورڈ کا امتحان وہیں سے پاس کیا۔ سکول بھر میں میری دوسری پوزیشن تھی۔ سر یحییٰ ہمارے کلاس ٹیچر تھے۔ اسی دوران میں نے ملٹری کالج جہلم سرائے عالمگیر کے لئے امتحان دیا جس میں کامیاب رہا۔ یوں میں آٹھویں جماعت پاس کر کے دوبارہ آٹھویں جماعت میں ملٹری کالج داخل ہو گیا۔ ہماری انٹری 3 مئی 1980 کو ملٹری کالج جہلم سرائے عالمگیر میں رپورٹ ہوئی۔

میری تین بہنیں ہیں اور ہم چار بھائی ہیں۔ دو بھائی روزگار کے سلسلے میں سعودی عرب ہیں ایک بھائی پاکستان ہی میں ہے اور سرکاری ملازمت میں ہے۔ میرے والد محمود عالم صاحب (صوبیدار میجر ریٹائرڈ) راجپوت کاٹل جبکہ والدہ راجپوت منہاس خاندان سے تھیں۔ میرے ابو اور امی دونوں آپس میں خالہ زاد یعنی فرسٹ کزن تھے۔ میرے والد صاحب نے 1958 میں میٹرک کا امتحان دیا۔ ریاضی میں کمپارٹ آئی جس کو کلیئر کرنے کے لئے انہوں نے دوبارہ کوئی امتحان نہیں دیا اور فوج میں بھرتی ہو گئے اور 1987 میں صوبیدار میجر کے رینک سے ریٹائرڈ ہوئے۔ وہ اپنے کام میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ لکھائی بہت خوبصورت اور بچوں کی تربیت میں سخت واقع ہوئے تھے۔ مجھے حکم تھا کہ مغرب کی اذان آپ لوگوں کو گھر میں ہونی چاہیئے جس کی ہم نے ہمیشہ تعمیل کی۔ میری پڑھائی کا بہت خیال رکھا۔ جہاں جہاں پوسٹنگ ہوئی ہمیں ساتھ ساتھ رکھتے۔ چھٹی جماعت تک ہم کبھی گاؤں اور کبھی جس جگہ ان کی پوسٹنگ ہوتی، وہاں جاتے، لیکن چھٹی جماعت سے لے کر ان کی ریٹائرمنٹ تک ہم ان کے ساتھ رہے۔ میں آٹھویں میں ملٹری کالج کے لئے سلیکٹ ہوا تو یہ بھی والد محترم کا وژن تھا۔ جن دنوں میں تیاری کر رہا تھا تو وہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

رات کو بہت دیر تک میرے ساتھ جاگتے اور مجھے تیاری کرواتے اور کبھی کبھار صحیح طرح سے سبق یاد نہ کرنے پر ہلکی پھلکی مرمت بھی کرتے، میں ساتھ ساتھ آنسو پونچھتا اور ساتھ دیئے گئے سوالات یاد بھی کر رہا ہوتا۔ ان کا میرے دل میں خوف بہت تھا۔ اس لئے شائد ان کے ساتھ کبھی اس طرح سے ''فرینک نیس'' نہیں ہو سکی جس طرح آج کل کے بچے اپنے والدین کے ساتھ فرینک ہوتے ہیں بلکہ کبھی کبھار 'لائیٹ' بھی لے لیتے ہیں۔ شائد وقت تبدیل ہو گیا ہے۔

میں فرسٹ ایئر میں تھا کہ ایک دفعہ کسی دوست کی طرف گیا، وہاں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔ میں جب گھر داخل ہوا تو ابو نے پوچھا اتنی دیر کیوں ہو گئی تو میں نے ویسے ہی کہہ دیا کہ سائیکل پنکچر ہو گئی تھی۔ ابو نے بیٹ مین سے کہا تم صبح سائیکل کو پنکچر لگوا دینا۔ سائیکل میں ہوا ذراکم کی تھی' جو میں نے ہی کی تھی' وہ پنکچر تو نہیں تھی لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب بیٹ مین نے واپس آ کر ابو سے دو پنکچروں کے پیسے لئے۔ میں نے اس پر شکر ادا کیا کہ کہیں اس نے آ کر یہ نہیں کہہ دیا کہ میں نے ٹائر کی ٹیوب تبدیل کرا دی ہے۔

والد صاحب کی قدرے سخت تربیت اس طرح کام آئی کہ الحمدللہ آج تک زندگی میں کوئی بڑی گڑ بڑ نہیں کی۔ چھوٹی موٹی کوتاہیاں ہر کسی سے ہو جاتی ہیں اللہ معاف فرمانے والا ہے۔ ہمیشہ لوگوں کے حوالے سے نیت اچھی رکھی اور مثبت سوچ رکھی۔ دوستوں اور تعلق داروں کی ہمیشہ قدر کی اور رزق حلال کمایا۔ ہمارے والد نے بھی ہمیں حلال رزق کما کر کھلایا۔ جہاں تک والد صاحب کے مشاغل کا تعلق ہے تو فوج جوائن کرنے سے پہلے اپنے علاقے میں کبڈی کے بہترین کھلاڑی کے طور پر مانے جاتے تھے۔ والی بال کے بھی اچھے کھلاڑی تھے۔ سو میٹر، دو سو میٹر اور کراس کنٹری میں بہت اچھے تھے۔ جسمانی اور ذہنی طور پر ایک مکمل فٹ انسان کے طور پر زندگی بسر کی۔ آج وہ اسی برس سے اوپر ہیں لیکن الحمدللہ اچھی صحت ہے اور دل میں کوئی بوجھ نہیں۔ کبھی کسی سے زیادتی نہیں کی اور ہمیشہ حق سچ کا ساتھ دیا۔

والدہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ اپنا نام لکھ لیتی تھیں۔ لیکن جب میں نے تختی لکھنی شروع کی تو وہ مجھے ''پورنے'' ڈال کر دیتی تھیں۔ (مطلب کہ مجھے کچی پینسل سے لکھ کر دیتی تھیں اور میں پھر قلم دوات سے اس پر لکھا کرتا)۔ والدہ صاحبہ قرآن شریف باقاعدگی سے پڑھتی تھیں۔ اپنے بچوں بالخصوص بڑا بیٹا ہونے کے ناتے میرے حوالے سے بہت Posessive تھیں۔ جب ہم مری کے قریب باڑیاں میں تھے جہاں میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا تو جو سرکاری مکان ملا ہوا تھا وہ بہت کشادہ اور انگریز سٹائل کی بلڈنگ تھی جس کے چاروں طرف درخت، ہریالی اور پھر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سردیوں میں شدید برف باری ہوتی۔ جو سرکاری پانی کے نل تھے اُن میں پانی جم جاتا لہٰذا والدہ اور دیگر خواتین جو برف چھت سے نیچے کی جانب لٹکی ہوتی اُسے اُتار کر چولہے پر گرم کر کے اس پانی کو ململ کے کپڑے سے چھان کر استعمال میں لاتیں۔ ہم کبھی گھر کی پچھلی جانب اُترتے تو میں اور امی برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے کو مارتے جس پر ابو سے کئی مرتبہ ہمیں جھاڑ بھی پڑتی۔ باڑیاں بہت خوبصورت جگہ تھی۔ آلو بخارے، انار، اخروٹ، سیب کے درخت وافر تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے درخت پر اکثر بندر چڑھے دکھائی دیتے۔ کبھی کبھار رات کو ہمارے گھر کی اچانک لائیٹ آف ہو جاتی، ابو باہر نکلتے تو میٹر بند ہوتا۔ ایک دن ابو ڈنڈا پکڑ کر دروازے کے پیچھے چھپ گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ جیسے ہی لائٹ آف ہوئی تو ابو فوراً باہر نکلے تو ایک بڑا سا بندر میٹر آف کر رہا تھا، ابو نے ڈنڈا مارا تو بھاگ گیا۔ اس کے بعد کافی دن تک افاقہ رہا۔

یہ باڑیاں والا گھر ہی تھا جہاں میں نے امی ابو کے منہ سے پہلی مرتبہ سنا کہ ہم کوشش کریں گے کہ یوسف جب آٹھویں میں ہوا تو ملٹری کالج کے لئے امتحان دلوائیں گے۔ بچے وہیں ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ بہترین انسٹرکٹرز اور ماحول ہوتا ہے اور بچوں کی اچھی تربیت ہو جاتی ہے۔ میں نے سُنا تو میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے کہ میں نے ملٹری کالج نہیں جانا۔ اس پر امی ہنسنے لگیں کہ تمہیں ابھی تھوڑا بھیج رہے ہیں۔ آٹھویں میں تم بڑے ہو جاؤ گے اور خوشی خوشی ملٹری کالج جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں نے جب گیمبر چھاؤنی اوکاڑہ سے ملٹری کالج کے لئے امتحان دیا، سلیکٹ ہوا تو خوشی خوشی جا رہا تھا لیکن اس دن امی رو رہی تھیں۔ میں اپنے ٹرنک اور دیگر سامان کے ساتھ گیمبر چھاؤنی کے سٹیڈیم کے سامنے والے سٹاپ پر جس ٹانگے پر سوار ہو کر ابو کے ساتھ گیمبر بس سٹاپ کے لئے روانہ ہو رہا تھا امی کھڑی ہو کر ہمیں دیکھتی رہیں۔ پھر گھر کی طرف چل پڑیں۔ میری اپنی والدہ کے ساتھ بہت وابستگی تھی۔ میں ان سے اپنی کوئی بات آسانی سے کر لیتا تھا لیکن ابو کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا۔ مجھے ملٹری کالج چھوڑ کر ابو جب واپس گھر گئے تو میری امی نے کئی دن تک ان سے بات نہیں کی۔ پھر کچھ دنوں بعد ہی امی نے ابو سے کہا کہ یوسف کی تصویر جو ملٹری کالج جانے کے لئے کھنچوائی تھی، کو بڑی کروا کر فریم کروا کر گھر میں رکھیں جس کی ابو نے تعمیل کی۔

میرے ددھیال اور ننھیال دونوں گھرانے کٹر مذہبی گھرانے نہیں تھے۔ بس جس طرح نارمل مسلمانوں کے گھرانے ہوتے ہیں ویسے ہی تھے کسی معاملے میں بہت زیادہ شدت نہیں تھی۔ ددھیال کی جانب مورل ویلیوز، کردار اور کھری بات کرنے کا رجحان زیادہ تھا۔ ددھیال والے ذرا اکھڑ ٹائپ تھے۔ اب وہ اکھڑ پن نہیں رہا۔ اب اگلی نسل پڑھ لکھ گئی ہے۔ اعتدال پسندی ہے۔ برسر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

روزگار ہیں اور باوقار طریقے سے زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ جبکہ ننھیال سائیڈ ذرا ڈپلومیٹک واقع ہوئی ہے۔ دودھیال اور ننھیال دونوں سائیڈز پر کسی کو سیاست سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ جب ووٹنگ ہوتی تو اپنی پسند کے اُمیدوار کو جا کر ووٹ ڈال آتے۔

میں اس طرح کا شرارتی نہیں تھا جس سے کبھی کسی کو کوئی نقصان پہنچا ہو، باقی ہلکی پھلکی شرارتیں تو چلتی تھیں۔ میں شائد تیسری جماعت میں تھا تو ان دنوں اپنے ننھیال کے قریب واقع ایک گاؤں میں داخل تھا ان دنوں تشنج کے انجکشن لگانے والی محکمہ صحت کی ٹیمیں سکولوں میں جا کر انجکشن لگاتی تھیں۔ ہماری کلاس میں آئے تو کلاس ٹیچر نے مجھے کہا کہ ایک ایک بچے کو ٹیم کے سامنے لاتے جاؤ اور انجکشن لگواتے جاؤ۔ کچھ بچے دیگر ڈیوٹیوں پر مامور کئے گئے۔ انجکشن لگنے شروع ہوئے تو کلاس میں ہر طرف آہ و بقاء کا عالم تھا تقریباً سبھی بچے رو رہے تھے۔ میرا دل بھی پسیج چکا تھا لیکن میں اپنے فرائض منصبی 'بطریقِ احسن' سرانجام دے رہا تھا۔ جب ایک دو بچے رہ گئے تو اُس کے بعد انجکشن لگانے کی میری باری بھی آنی تھی۔ میں نے اُن دو بچوں کو اُدھر ہی چھوڑا اور کھڑکی سے کود کر دوڑ لگا دی۔ ماسٹر صاحب نے پانچویں جماعت کے بچے جن میں بعض بہت لیٹ داخل ہوتے ہیں اور کافی بڑے ہو چکے ہوتے ہیں، میرے پیچھے لگا دیئے کہ اسے پکڑ کر لاؤ۔ یوں میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ دھر لیا گیا۔ جب مجھے وہ کلاس کے اندر لے کر آئے تو ماسٹر صاحب سمیت محکمہ صحت کی ساری ٹیم ہنس رہی تھی اُن میں سے کسی ایک نے میرا بازو پکڑا اور انجکشن لگا دیا اور کہا لو بھئی اتنا سا کام تھا۔ بچوں نے خواہ مخواہ کلاس میں شور مچایا ہوا ہے۔ اس انجکشن کو عرفِ عام میں ''ماتا کا ٹیکا'' کہتے تھے۔ ہماری نسل کے دائیں یا بائیں بازو پر آج بھی اُس ماتا کے ٹیکے کا نشان ہے۔ ویسے عرصہ دراز سے ہماری قوم کو بڑے بڑے ٹیکے لگتے چلے آ رہے ہیں لیکن نشان نہیں چھوڑا جاتا۔

میں خود کو اوسط درجے کے طلباء میں ہی شمار کروں گا، نہ انتہائی ذہین اور نہ انتہائی نالائق تھا۔ میری تعلیمی کارکردگی عمومی طور پر ساٹھ پرسنٹ والی فرسٹ ڈویژن کے اردگرد ہی گھومتی رہی۔ میٹرک میں فرسٹ ڈویژن، ایف اے میں سیکنڈ، بی اے میں فرسٹ ڈویژن، ایم اے میں سیکنڈ، ایم فل میں فرسٹ ڈویژن اور پی ایچ ڈی میں بھی الحمدللہ اے گریڈ ہے۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) سے 2004 میں ایک سپیشل ڈپلومہ اِن انگلش لینگویج کیا تھا اُس میں بھی فرسٹ ڈویژن تھی۔

میں جن مختلف تعلیمی اداروں اور جن جماعتوں میں پڑھتا رہا اُس کا احوال تو پہلے بیان کر چکا ہوں۔ پہلی دفعہ ہاسٹل میں رہنے کا موقع تب ملا جب میں مئی 1980 میں ملٹری کالج جہلم سرائے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

عالمگیر میں داخل ہوا۔ ملٹری کالج میں گزرے تین برس اَن گنت یادوں اور بہترین دنوں کی یاد دلاتے ہیں۔ وہاں سے میں نے 1983 میں میٹرک کیا۔ لیکن ملٹری کالج میں ہمارے ساتھ ہاتھ ہوگیا۔ شاید 1981 میں ہونے والے یومِ والدین کے موقع پر وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل سوار خان بطورِ مہمان خصوصی تشریف لائے اور انہوں نے خوشخبری سنائی کہ اب جونیئر کیڈٹ بٹالین (جے سی بی) کے کیڈٹس بھی دو سال کے لئے ملٹری کالج میں ٹریننگ کیا کریں گے۔ اس طرح آپ لوگ جب میٹرک کرکے جے سی بی کے لئے سلیکٹ ہو جائیں گے تو پھر سے اپنے ہی کالج میں دو سال کی ٹریننگ کریں گے اور پھر یہاں سے سیدھا (پی ایم اے) پاکستان ملٹری اکیڈمی رپورٹ کریں گے وہاں سے دو سال کی تعلیمی و عسکری تربیت کے بعد پاک فوج جوائن کریں گے۔ ہم نے اس بات کو روٹین ہی میں لیا اور ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ اگلے ایک دو سال میں قسمت ہمارے ساتھ کیا کھیل کھیلنے جا رہی ہے۔ ہماری اینٹری نے 15 جے سی بی کے لئے اپلائی کیا جو کیڈٹس سلیکٹ ہو گئے وہ مختلف مقامات پر ہونے والی ٹریننگ کے لئے بھجوا دیئے گئے۔ لیکن جو کیڈٹس سلیکٹ نہیں ہوئے اُنہیں ملٹری کالج سے ایف ایس سی کرنے کا جو موقع ملنا تھا وہ اُس سے اس طرح محروم ہو گئے کہ ان کے ہاسٹلز اور کلاسز کو جونیئر کیڈٹ بٹالین کے کیڈٹس کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ یوں جو کیڈٹس جے سی بی کے لئے کوالیفائی نہ کر سکے اُنہیں ملٹری کالج جہلم بھی میٹرک کے بعد ہی چھوڑنا پڑا۔ یوں ہم ٹھیک تین سال کے بعد اپنا ایک تعلیمی سال ضائع کر کے (میں 1980 میں آٹھویں جماعت پاس کر کے ملٹری کالج میں دوبارہ سے آٹھویں جماعت میں داخل ہوا تھا) پھر اُسی تعلیمی ماحول میں واپس آ گئے جو چھوڑ کر گئے تھے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ میری مختصر سی زندگی جو بہت ہموار چل رہی تھی میں مجھے ایک جھٹکا 1983 ہی میں لگ گیا اور یوں محسوس ہوا جیسے دنیا تاریک ہو گئی۔ ہمارے وہ ساتھی جن کے ساتھ ہم پی ایم اے اور کاکول کی باتیں کرتے تھے اور اگلی زندگی کے بارے میں بات چیت کرتے تھے وہ ہم سے بچھڑ گئے۔ گویا 16 سال کی عمر ہی سے زندگی نے ایک ایسا موڑ کاٹا جس سے زندگی کا سفر کٹھن اور پُر خار ہوتا چلا گیا۔

مجھے ملٹری کالج جہلم سے جے سی بی کے لئے سلیکٹ ہونے کا اتنا یقین تھا کہ میں نے سوائے گورنمنٹ کالج لاہور کے کسی اور کالج میں داخلہ فارم بھی جمع نہیں کروایا تھا۔ میری میٹرک میں فرسٹ ڈویژن تھی لیکن ظاہر ہے گورنمنٹ کالج کے لئے میرٹ کافی ہائی ہوتا ہے۔ لہٰذا میں نے سپورٹس کی بنیاد پر فارم میں حوالہ دیا ہوا تھا لیکن جس دن میرا سپورٹس کے لئے باسکٹ کا ٹرائل تھا (میں ملٹری کالج میں باسکٹ بال کا کلر ہولڈر اور بیسٹ پلیئر تھا) اسی دن مجھے کوہاٹ آئی ایس ایس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بی کے لئے رپورٹ بھی کرنا تھی تو میں کوہاٹ چلا گیا۔ آنکھ تب کھلی جب میری سلیکشن نہ ہوسکی۔ گورنمنٹ کالج گیا تو وائس پرنسپل نے فرمایا کہ اب ڈیٹ گزر چکی ہے اب گورنمنٹ کالج تو کیا لاہور کے کسی بھی کالج میں تمہارا داخلہ نہیں ہوگا۔ آپ کو دیگر کالجوں میں بھی فارم جمع کروانے چاہئیں تھے۔ ایسا ہی ہوا۔ بعد میں بڑی مشکلوں سے گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ میں داخلہ ملا اُس کے لئے بھی پرنسپل پروفیسر شمیم فرحت چغتائی صاحب نے شائد ڈائریکٹر ایجوکیشن سے خصوصی اجازت حاصل کی تھی کہ کیڈٹ کالج کا پڑھا ہوا لڑکا ہے۔ داخلہ لیٹ ہوگیا ہے۔ اس کالج میں داخل تو ہوگیا لیکن وہاں پڑھائی والا اُس طرح سے ماحول نہیں تھا۔ وہاں بہت کم نمبروں والے بچے تھے جن کی خاص توجہ پڑھائی کی جانب نہ تھی۔ داخلہ فیس جمع کرانے کا مرحلہ آیا تو میں کلیریکل سٹاف کے دفتر کے سامنے کھڑا تھا میں نے ایک باریش انسان کو دیکھا (جن کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ وائس پرنسپل تھے) وہ ہر وقت تسبیح کرتے رہتے۔ میں نے پوچھا سر فیس کہاں جمع کرانی ہے، بجائے اس کے کہ وہ کلیریکل آفس کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے، انہوں نے کہا پُتر جی فیس بنک میں جمع ہونی ہے۔ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کالج سے نکلا اور صدر بازار گول چوک میں قائم بنک میں جا پہنچا۔ کچھ دیر لائن میں لگا رہا۔ باری آئی تو میں نے فیس جمع کرانا چاہی، انہوں نے کہا آپ پہلے سٹوڈنٹ ہیں جو بنک میں فیس جمع کروانے آ گئے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم شائد ہمارے بینک کی مین برانچ میں ہو رہے ہوں۔ میں وہاں سے پیدل مین برانچ جو صدر بازار ہی میں تھی پہنچا، وہاں بھی ایک لمبی لائن تھی، جب مطلوبہ کاؤنٹر پر پہنچا تو انہوں نے کہا یہ کالج والے خود جمع کرتے ہیں۔ آپ سے کسی بندے نے مذاق کیا ہے۔ میں نے کہا ایسا ہو ہی نہیں سکتا وہ ایک بزرگ سی شخصیت تھی شائد وہ کالج کے کوئی پروفیسر ہی ہوں، انہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ میں واپس کالج گیا تو کلیریکل سٹاف چھٹی کر چکا تھا۔ اگلے دن صبح صبح ان کے پاس گیا تو انہوں نے کہا پرنسپل صاحب نے تمہیں صرف کل کے لئے اجازت دی تھی۔ آج دوبارہ پرنسپل سے ملو اور اجازت حاصل کرو۔ میں پھر پرنسپل آفس کے باہر بیٹھ گیا۔ اندر جانے کی اجازت ملی تو مدعا بیان کیا، انہوں نے اکاؤنٹ کلرک کو بُلایا اور کہا کہ اس کی فیس جمع کرلو۔ یوں یہ مرحلہ مکمل ہوا۔

اس کالج میں داخلہ ملنے سے بہر حال یہ فائدہ ہوا کہ مجھے پروفیسر اجمل نیازی صاحب جیسی شخصیت سے فیض حاصل کرنے کا موقع میسر آ گیا۔ میں نے کالج میگزین ''سرچشمہ'' کے لئے ایک مضمون لکھ کر متعلقہ سٹاف کے حوالے کیا تو تھوڑی دیر بعد مجھے ایک سٹوڈنٹ بُلانے آیا کہ پروفیسر اجمل نیازی صاحب بُلا رہے ہیں اُس وقت تک اُنہوں نے پی ایچ ڈی نہیں کی تھی اور ڈاکٹر نہیں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کہلاتے تھے۔ میں ان کے پاس گیا تو کالج کے لان میں ایک دائرے میں کرسیوں پر دیگر پروفیسر صاحبان تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے یہ مضمون تم نے لکھا ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو کہنے لگے یہ 'سرچشمہ' کے اس شمارے کا سب سے بہترین مضمون ہے۔ تم آج سے کالج میگزین 'سرچشمہ' کے سٹوڈنٹ مدیر ہو۔ یوں میری خوش بختی رہی کہ محترم اجمل نیازی صاحب جیسی حوصلہ افزائی کرنے والی شخصیت کی مجھے سرپرستی حاصل ہوگئی۔ میں اُس کالج کا سینئر پراکٹر بھی تھا۔ نیشنل کیڈٹ کور (این سی سی) کے دستے کا کمانڈر بھی تھا۔ میری قیادت میں کالج کے این سی سی دستے نے 23 مارچ 1984 اور 23 مارچ 1985 کو پاکستان ڈے کے موقع پر ہونے والی پریڈ میں گورنر پنجاب غلام جیلانی کو فورٹریس سٹیڈیم لاہور میں سلامی پیش کی۔ ملٹری کالج کی تربیت کی وجہ سے میری ڈرل بہت شاندار تھی اور پریڈ کے لئے دیا جانے والا کاشن بھی بہت اعلیٰ تھا۔ مجھے NCC کا بیسٹ کیڈٹ کا ایوارڈ دیا گیا میں نے یہ ایوارڈ 31 مارچ 1984 کو کور ہیڈکوارٹرز لاہور میں ہونے والی تقریب میں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل سردار ایف ایس لودھی سے وصول کیا جبکہ وویمن گارڈ کی بہترین کیڈٹ کا ایوارڈ کنیئرڈ کالج کی طالبہ نغمہ فاروقی نے وصول کیا۔ اسی طرح میں نے 23 مارچ 1985 میں بھی کالج دستے کی قیادت کیا اور 31 مارچ 1985 کو کور ہیڈکوارٹرز لاہور میں اس وقت کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمد اسلم شاہ سے شیلڈ وصول کی۔ وویمن گارڈز کی شیلڈ کنیئرڈ کالج کی عظمٰی لودھی نے وصول کی۔ دیگر کالجوں میں ڈویژن پبلک سکول کے طالب علم عابد ظفر، اپوا کالج کی سعدیہ صوفی اور کوئین میری کالج کی عالیہ پیرزادہ نے سرٹیفکیٹ وصول کیئے تھے۔

میں 30 مارچ 1985 کو ریہرسل کے لئے کور ہیڈکوارٹرز گیا تو وہاں بریگیڈیئر نصراللہ جو کنڈکٹ کر رہے تھے نے مجھے پہچان لیا اور کہا "یوسف یو ہیو کم اگین ٹو ریسیو دا ایوارڈ" (یوسف آپ ایوارڈ لینے اس برس پھر سے آ گئے ہیں) میں نے اس بات پر خود کو بڑا elevated محسوس کیا۔ اُن دنوں کیپٹن صولت رضا (بعد میں بریگیڈیئر) وہاں آئی ایس پی آر کی جانب سے پی آر او تھے لیکن ظاہر ہے اُس وقت اُن سے اس طرح ملاقات نہیں تھی اور نہ ہی معلوم تھا کہ وہ وہاں تعینات ہیں۔

میری خوش بختی ہے کہ میرا اپنے اساتذہ کرام کے ساتھ ہمیشہ عقیدت اور احترام والا معاملہ رہا۔ میں الحمدللہ ایک مہذب سٹوڈنٹ تھا۔ کچی جماعت میں تھا تو ماسٹر منظور صاحب ہوا کرتے تھے وہ میرے والد صاحب کے کلاس فیلو تھے تو مجھے اُن سے بہت اپنائیت محسوس ہوتی، اسی طرح ڈیلرہ مڈل سکول کے جو ہیڈ ماسٹر تھے وہ کسی دور میں میرے والد صاحب کے بھی ٹیچر تھے، تو وہ آتے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جاتے میرا اور میرے ابو کا احوال پوچھتے۔ پہلی جماعت میں مڈل سکول باڑیاں (مری) میں ہمارے کلاس ٹیچر ماسٹر گلزار صاحب ہوتے تھےانہوں نے ایک دفعہ بچوں کو سامنے والے پہاڑ سے پودینہ لانے کو کہا میں بھی کلاس کے ہمراہ چلا گیا مجھے پودینے کی پہچان نہ تھی۔ میں نے مقامی لڑکوں سے پوچھا تو انہوں نے نجانے کون کون سی بوٹیوں کے بارے میں مجھے بتایا کہ یہ پودینہ ہے۔ یوں جب کلاس میں واپس آ کر سب بچوں نے پودینہ پیش کیا تو ان میں سے میری کولیکشن منفرد تھی۔ اس پر ماسٹر گلزار حیران ہوئے اور پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو، میں نے بتایا کہ سیالکوٹ کا۔ کہنے لگے یہاں کس کے پاس ہو میں نے بتایا کہ والد صاحب آرمی میں ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے کبھی کسی کام کے لئے لوکل بچوں کے ساتھ نہیں بھیجا اور مجھے اپنے پاس بٹھائے رکھتے۔ میں پہلی جماعت ہی میں تھا تو سکول اسمبلی میں اعلان ہوا کہ کل ہماری چھٹی ہے لیکن ایک تقریب ہے تو بچے بے شک سکول یونیفارم کے بغیر آئیں اور تقریب میں شرکت کریں۔ میں نے امی کو بتایا کہ میں نے کل ایک تقریب میں جانا ہے تو وہ مسکرائیں کہ تم نے کون سی تقریب میں جانا ہے؟ خیر انہوں اگلے دن مجھے پینٹ شرٹ پہنائی، بالوں کو تیل لگا کر کنگھی کی، آنکھوں میں سرمہ ڈالا، گردن پر پاؤڈر وغیرہ لگا کر تیار کر کے سکول بھیج دیا وہاں گیا تو بچے بہت کم تھے۔ سینئر کلاس کے لڑکوں نے کہا تم اتنے چھوٹے سے ہو، تم کدھر آ گئے ہو۔ اس کے لئے تو باڑیاں کے ساتھ نیچے ایک گاؤں کی مسجد ہے وہاں تقریب ہے۔ خیر وہ مجھے ساتھ لے گئے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے مجھے دیکھ کر اُنہیں بہت حیرانی اور خوشی ہوئی اور مجھے سب سے اگلی صف میں بٹھا دیا۔ اور وہاں لوگوں کو بتایا کہ یہ میرے سکول کا سٹوڈنٹ ہے۔ تقریب اٹینڈ کرنے آیا ہے۔ تقریب کے دوران بھی وہ مسلسل مجھے دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے۔ تقریب کے بعد مجھے شاباش دی۔ اگلے روز اسمبلی میں انہوں نے سینئر کلاسز کے بچوں کو سخت سست قرار دیا کہ تم لوگ نہیں آئے یہ چھوٹا سا بچہ ہمارے کہنے پر وہاں پہنچا ہوا تھا۔ بعد میں اُن سینئرز میں سے ایک دو نے مجھے تڑیاں بھی لگائیں کہ ''توں کی اُتھے جانے نی کیہ لوڑ سی آں، خامخواہ اساں نی وی بے عزتی کرا دتی آ'' (کہ تمہیں وہاں جانے کی کیا پڑی تھی خواہ مخواہ ہماری بھی بے عزتی ہوئی تمہاری وجہ سے) خیر میں نے باقی ٹائم ان لڑکوں سے بچ بچا کر گزارا۔

پرائمری سکول تریٹ میں ذوالفقار صاحب ہیڈ ماسٹر ہوا کرتے تھے۔ ساتھ ماسٹر جاوید صاحب تھے۔ اُس سکول کی بھی ایک اچھی بات یہ تھی کہ وہاں وہ تقریبات کرواتے رہتے تھے۔ میں نے تیسری جماعت میں میجر عزیز بھٹی شہید نشانِ حیدر پر تقریر کی، پھر جب کوئی تقریب ہوتی وہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مجھے تقریر کرنے کے لئے کہتے۔ لیکن ایک مسئلہ تھا کہ میں تقریر کے پہلے جملے ہی سے بہت جوش اور سرگرمی سے ہاتھ مار کر تقریر شروع کر دیتا۔ اس کا حل ٹیچر نے یہ نکالا کہ وہ تقریر کے وقت میرے پیچھے کھڑے ہو جاتے اور مجھے بتایا گیا کہ شروع میں آرام آرام سے تقریر کرنی ہے جب تمہاری گردن کے پچھلی طرف پنسل سے ہلکا سا ٹچ کروں تو پھر تم روایتی جوش سے شروع کر دینا۔ یہ فریضہ ماسٹر جاوید صاحب سرانجام دیتے تھے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ میجر عزیز بھٹی شہید قوم کے وہ پہلے ہیرو تھے جن سے میں چھوٹی عمر میں روشناس ہوا۔ ان کی دلیری کے حوالے سے تقریریں کرتا رہا۔ پھر زندگی کی کئی بہاریں دیکھنے کے بعد جب 2019 میں عزیز بھٹی شہید کے سگے بھائی سردار بھٹی (مرحوم) نے اپنے بھائی پر "مائی براد ر، مائی ہیروؤ" کے نام سے انگریزی میں کتاب لکھی تو اُن کے داماد اور معروف شاعر طاہر نجفی صاحب نے مجھے ان کی تقریب کے حوالے سے بتایا۔ عزیز بھٹی شہید کی بھتیجی اور سردار بھٹی صاحب کی بیٹی پروفیسر شاہینہ ایوب بھٹی صاحبہ نے مجھے کتاب بھجوائی۔ اس تقریب میں میں نے بھی مضمون پڑھا۔ مجھے سردار بھٹی صاحب سے مل کر یوں محسوس ہوا جیسے اُن سے عزیز بھٹی شہید کی خوشبو آتی ہے۔ میں تقریب ختم ہونے کے بعد بھی کچھ دیر ان کے پاس سٹیج پر بیٹھا رہا۔ مجھے ان کے پاس کچھ دیر بیٹھنا اچھا لگا۔ اس تقریب کے اگلے ہی سال اُن کی رحلت ہو گئی لیکن میں سمجھتا ہوں انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے بھائی کے ساتھ محبت کا حق کتاب لکھ کر ادا کر دیا۔ تقریب کے انعقاد کے وقت اُن کی عمر شائد 96 سال کے لگ بھگ تھی۔ انہیں خطاب کی دعوت دی گئی تو انہوں نے ہال میں ''پاکستان زندہ باد'' کا ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔ شومئی قسمت سے اس جذبے اور اس رنگ سے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لگانے والے اب کم کم ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اسی طرح آٹھویں جماعت میں ایف جی سکول اوکاڑہ کینٹ میں سر یحییٰ ہوتے تھے وہ بھی مجھے بہت Buck up کرتے اور بہت شفقت دیتے۔ ان کا دیا ہوا حوصلہ اور اعتماد آج بھی یاد ہے۔ میں جب مئی 1980 میں آٹھویں جماعت میں داخل ہوا تو محمد یوسف سے کیڈٹ محمد یوسف بن گیا اور مجھے ایک کالج نمبر الاٹ ہو گیا۔ وہاں تعلیمی و تربیتی مراحل سے گزرا تو میں آج خود کو انتہائی خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک سے بڑھ کر ایک اُستاد عطا فرمایا۔ پروفیسر سعید راشد صاحب (معروف دانش ور / مصنف) شیر شاہ ہاؤس کے ''ہاؤس ماسٹر'' تھے اور وہ اُردو اور انگریزی پڑھاتے تھے۔ اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر پروفیسر طارق چودھری صاحب تھے وہ میتھ پڑھاتے تھے ان کا شمار بہترین اساتذہ میں ہوتا تھا۔ میرے جیسا ریاضی میں کمزور سٹوڈنٹ بھی ان سے پڑھ کر ریاضی کو کچھ نہ کچھ سمجھنے میں کامیاب

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہو جاتا۔ پروفیسر سعید راشد کا انداز بہت مختلف تھا وہ سٹوڈنٹس کو مارنے یا سختی کے عادی نہیں تھے۔ پروفیسر طارق چودھری صاحب کا رویہ بھی بہت شفقت آمیز رہا لیکن جہاں ضرورت پڑتی وہ سرزنش سے گریز نہ کرتے۔ یقیناً بچوں کی زندگیاں سنوارنے کے لئے یہ بھی اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنی کہ شفقت۔ پروفیسر لطیف صاحب آرٹس کے ٹیچر تھے، جو کمال کے مصور اور آرٹسٹ تھے۔ پروفیسر عین الدین علوی صاحب بھی پروفیسر سعید راشد کی طرح علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ سر شفیق اور پروفیسر رشید صاحب بھی اپنا ایک انداز رکھتے۔ ماشاءاللہ یہ سارے اساتذہ ایسے ہیں کہ ان پر الگ الگ کتاب بن سکتی ہے۔ کبھی اللہ نے توفیق دی تو اپنے اساتذہ کے حوالے سے بہت تفصیل سے لکھوں گا۔ ان کے علاوہ متعدد یونیفارم آفیسرز تھے جو ہمارے انسٹرکٹرز تھے، اُن کی تربیت کا انداز بھی مثالی تھا اور یہ اُنہی کی کاوش ہی ہے کہ آج ہمارے جیسے کئی بچے مختلف میدانوں میں اپنے اپنے حصے کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔

میں چونکہ آٹھویں جماعت میں پہلی دفعہ گھر سے اکیلا کبھی دوسری جگہ منتقل ہوا اور ملٹری کالج جہلم سرائے عالمگیر کے لئے سلیکٹ ہو کر ایک فوجی تعلیمی و تربیتی ماحول میں رہنے کا موقع ملا تو اس حوالے سے بہت یادیں ہیں۔ جس طرح وہاں کیڈٹس کی گرومنگ کی جاتی ہے اور جس طرح سے سول اور ملٹری اساتذہ کیڈٹس کو گائیڈ کرتے ہیں اور تربیت فراہم کرتے ہیں یہ ملٹری کالج جیسے اداروں ہی کا خاصا ہے۔ اب یہ کیڈٹس کا اپنا نصیب ہے کہ قدرت نے اُس کا رزق یونیفارم کی نوکری میں لکھا ہوتا ہے یا کسی اور پروفیشن میں۔ بہرکیف یہ میری خوش بختی رہی کہ مجھے ملٹری کالج جہلم میں پڑھنے کا موقع ملا۔ ملٹری کالج میں پہلا روز آج بھی لمحہ لمحہ میری آنکھوں کے سامنے ہے کالج گیٹ پر جس طرح ہمارا استقبال کیا گیا اور شیر شاہ ہاؤس کی جانب ریفر کیا گیا وہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہمارے سینئر کیڈٹس اس کام پر مامور تھے کہ وہ ہمارے ٹرنک شیر شاہ ہاؤس میں پہنچا رہے تھے اور نئے آنے والے کیڈٹس اپنے والدین کے ہمراہ شیر شاہ ہاؤس میں داخل ہوتے تو وہاں شیر شاہ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر پروفیسر سعید راشد سفید پینٹ شرٹ زیب تن کئے ہر کسی کا مسکراتے چہرے کے ساتھ استقبال کئے جا رہے تھے اور کیڈٹس کو کالج نمبرز الاٹ کئے جا رہے تھے۔ پھر وہی کالج نمبر ملٹری کالج میں دوران تعلیم اور تعلیم کے بعد اُس کا زندگی بھر کا حوالہ بن جاتا ہے۔

اس مرحلے سے فارغ ہو کر والدین ایک ایک کر کے کالج سے واپس جا رہے تھے۔ میرے ابو واپس جانے سے قبل مجھے کالج کنٹین پر لے گئے اور وہاں چائے اور پیسٹری وغیرہ کا آرڈر دیا۔ جب ابو کے واپس جانے کا مرحلہ آیا تو میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میری یہ حالت دیکھ کر میرے ابو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جنہیں میں نے ہمیشہ بہت مضبوط شخص کے طور پر دیکھا تھا کی آنکھوں میں بھی مجھے پانی چھلکتا دکھائی دیا اور وہ بے تاب سے ہو گئے۔ لیکن ظاہر ہے بچوں کا مستقبل والدین کے سامنے ہوتا ہے اس کے لئے اُن پر سختی بھی کی جاتی ہے اور اُنہیں خود سے دور بھی کرنا پڑتا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد مجھے مل کر واپس چلے گئے۔ میں بھی کچھ وقت میں نارمل ہو گیا۔ پھر وہی ملٹری کالج تھا جہاں ہم نے فوجی رگڑے بھی کھائے، کراس کنٹریاں بھی کیں، تربیت کی سختیاں بھی برداشت کیں بے عزتی بھی رُج (بھرپور) کے کرائی۔ ویسے بھی فوجی اداروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں چائے اور بے عزتی کا کوئی خاص ٹائم نہیں ہوتا لیکن کبھی نہیں سوچا کہ ہم یہاں کیوں آئے؟۔ کوئی کہیں کیوں جاتا ہے۔ یہ بھی ایک تجسس ہے جسے قدرت ہی جانتی ہے بعض اوقات کوئی شخص کسی کام کے لئے بہت موزوں دکھائی دیتا ہے لیکن اُسے وہ کام نہیں ملتا اور وہ کچھ اور کر رہا ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا بھی انسان کا کام نہیں ہے۔ ایک قطرے سے بنا ہوا انسان قطرہ قطرہ قلزم بنتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان بہت کمزور اور بے بس ہے۔ طاقت ور وہی ہے اور انسان کی طاقت صرف اتنی ہی ہے جو خدائے بزرگ و برتر نے اُسے عطا کی ہوتی ہے۔ وہ خود کچھ بھی نہیں ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو لاکھوں کے مجمع کو لفظوں کے سحر میں جکڑ لینے والے کے لئے بسا اوقات ایک لفظ کی ادائیگی بھی محال ہو جاتی ہے۔ یہ رحمتیں، یہ برکتیں، یہ نوازشیں سب اللہ کی ہیں جو انسان کو عطا کی جاتی ہیں اور وہ خود کو ان کا مالک گرداننے لگتا ہے۔ ایک دوسرے سے حسد، کدورت اور بے معنی مقابلہ بازی انسان کو کمزور کرتی ہے، بیمار، لاغر اور ذہنی طور پر اپاہج بنا دیتی ہے وہ اس سے نکل ہی نہیں سکتا اور یہی اُس کا امتحان ہوتا ہے۔ لوگ جس کو اپنے سے کم تر سمجھ رہے ہوتے ہیں کون جانتا ہے کہ وہ اندر سے کتنا مطمئن ہے، اس پر اللہ کا کتنا کرم ہے لوگ اللہ کی عنایت کی ہوئی کسی ایک طاقت، کسی ایک خوبی اور کسی دنیاوی عہدے کو دوسروں کے ساتھ موازنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ یہ سب تو اللہ کا ہے۔ اس کا توفیق کردہ ہے۔ انسان کو ہر وقت اللہ سے مانگتے رہنا چاہئے کہ جو تو نے عطا کیا ہے وہ عطا کئے رکھنا۔ توفیق، طاقت، حوصلہ، صحت اور زندگی سب اُسی کی ودیعت ہے۔ لہٰذا والدین اپنے بچوں کے لئے صرف اچھی کوشش کر سکتے ہیں اُنہیں اچھا نصیب یا مقدر نہیں دے سکتے۔

بہر حال ملٹری کالج کے حوالے سے ہر یاد اپنے اندر ایک داستان سموئے ہوئے ہے۔ 1983ء میں یہاں سے میٹرک کرنے کے بعد اصولاً ہم ملٹری کالج کے فارغ التحصیل کہلائے جانے لگے لیکن ملٹری کالج میں نجانے کون سی ''گیدڑ سنگھی'' تھی کہ ہم وہاں سے جانے کے بعد بھی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ایم سی جے، ایم سی جے کا ورد کرتے رہے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ہمارے پاس کوئی اور موضوع ہی نہیں ہوتا۔ گھنٹوں ملٹری کالج کی باتیں کرتے نہیں تھکتے۔ آج سے کئی برس قبل میں مئی 1980 میں ملٹری کالج میں آٹھویں جماعت کے لئے سلیکٹ ہونے کے بعد اپنا کالا ٹرنک جس پر سفید پینٹ سے محمد یوسف لکھا ہوا تھا لے کر ابو جان کے ساتھ کیمبر چھاؤنی سے ملٹری کالج کے لئے روانہ ہوا۔ میں جس بس میں سرائے عالمگیر کے لئے سوار تھا وہ بس لالہ موسیٰ رُکی تو وہاں سے ایک اور لڑکا کالے ٹرنک اور اپنے ابو کے ساتھ اس بس میں سوار ہوا۔ ملٹری کالج کے گیٹ پر ہم دونوں اکٹھے اُترے مجھے بعد میں معلوم ہوا وہ لڑکا عبدالحئی تھا جو اب کینیڈا میں ایک بہت بڑی کمپنی کا مالک ہے۔

ملٹری کالج میں گزرا ہوا ایک ایک پل مجھے اب بھی یاد ہے۔ شیر شاہ ہاؤس میں وارد ہوئے تو سعید راشد صاحب نے کالج نمبر الاٹ کرتے ہوئے ہمارا سواگت کچھ اس انداز میں کیا کہ ہم نے خود کو اسی وقت سے نیم لفٹین سمجھنا شروع کر دیا۔ میں افتخار ڈوم کے سامنے اسی ''نیم لفٹینی'' کے سحر میں مبتلا کھڑا تھا کہ اچانک ''بھیڈاں من دیو'' کا نعرہ فضا میں بلند ہوا۔ میں یہ سمجھا کہ شاید ہمیں تازہ دودھ کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے ملٹری کالج میں بھیڑیں پالی گئی ہیں لیکن اس ''بھیڑ چال'' کی کچھ کچھ سمجھ اس وقت آنے لگی جب شیر شاہ ہاؤس کے صحن میں دو کرسیاں لگا دی گئیں اور دو باربر حضرات اپنی اپنی کرسی کی کمان سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ چونکہ میں پہلے ہی برآمدے میں کھڑا تھا، ہاؤس پریفیکٹ نے مجھے بلایا اور ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چاچا باربر نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا تو میں اسے دست شفقت سمجھا لیکن اس نے مشین اس تیزی سے میرے سر کے اردگرد گھمائی کہ صرف وہ بال بچ سکے جو اس کے ہاتھ کے نیچے تھے۔ اس کے بعد قینچی سے باقی ماندہ بالوں کو لیول کرنا بھلا چاچے کے لیے کیا مشکل تھا۔ ہم دنبے کی سی تیزی سے چاچا حجام کے چنگل سے نکلے۔ کمرے میں جا کر آئینہ دیکھا تو محسوس ہوا کہ ہماری یہ پھرتی بھی کسی کام کی نہیں۔ چاچے نے جو کرنا تھا وہ کر چکا تھا۔ اس کے بعد ہم محتاط ہو گئے اور ہم نے فیصلہ کیا کہ یہاں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہے۔

ویسے بھی چاچا حجام سے پہلے افتخار ڈوم میں میرا پالا ایک پُر جوش انسان ندیم نصیب (بعد میں میجر ریٹائرڈ) سے پڑ چکا تھا۔ جو افتخار ڈوم میں میرے ساتھ لاکر شیئر کر رہا تھا۔ میں نے ایک بیگ کو جو میرے ساتھ والے بیڈ پر رکھا تھا کو کھسکا کر دوسرے بیڈ پر رکھنا چاہا تو ایک بھاری بھرکم آواز This is my bag نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ مجھے یہ لڑکا اُس وقت 'وکھری ٹائپ' کا لگا جو بعد کی زندگی میں واقعتاً وکھری ٹائپ ہی کا نکلا ایسے خوبصورت مزاج اور فہم والے لوگ کم کم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ ہمیں اپنے ڈیسک سے Hawks کی ٹافیاں یہ کہہ کر اٹھانے سے منع کرتا تھا کہ 'بدتمیز واس کو ٹافی مت سمجھو This is my medicine'' اور یہ میری ماما میرے لئے بھیجتی ہیں۔ اس تنبیہہ کے باوجود بھی ہمیں جب کبھی موقع ملتا اس medicine سے مستفید ہونے سے باز نہ آتے۔

شیر شاہ ہاؤس میں شام کو پہلے ہی روز ہمارا تعارفی سیشن ہوا اُس میں سب نے اپنی مرضی کے مطابق کوئی شعر' کوئی واقعہ یا کوئی لطیفہ سنایا۔ مجھے یاد ہے ارشد جاوید نے شائد پہلے ہی روز نپولین بونا پارٹ والی تقریر سُنا کر پروفیسر سعید راشد صاحب کو گرویدہ کرلیا۔ وہاں حماد احمد نے اپنا تعارف حماد احمد گھمن ولد ریاض احمد گھمن چیمہ ہسپتال ڈسکہ بتا کر ماحول کو خوشگوار بنا دیا۔ لیکن ایک کیڈٹ ساجد شکور جو آج ہم میں نہیں ہے نے ''رنگ دل کی دھڑکن بھی لاتی تو ہوگی۔۔ یاد میری اُن کو بھی آتی تو ہوگی'' گانا سُنا کر شیر شاہ ہاؤس کی فضاؤں کو معطر کر دیا۔ آج بھی یہ گانا لگا ہو تو ہم اُنہی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ ساجد شکور (بریگیڈیئر ساجد شکور شہید) ساجد بھی ہمارے ساتھ افتخار ڈوم میں تھا۔ اس کی habits بہت neat تھیں۔ نمازی' دھیمی آواز میں گفتگو کرنے والا' ہنس مکھ' کبھی موڈ نہ دکھانے والا۔ شرٹ پہنتے ہوئے' ٹائی لگاتے ہوئے بھی سلیبس کی کوئی کتاب چارپائی پہ کھلی پڑی ہوتی جس پر اُس کی نظریں جمی رہتیں۔ ہم سب اپنے گھروں سے پہلی پہلی مرتبہ ہی نکلے ہوں گے۔ ساجد کو بھی پہلے ایک دو مہینے اُس کے گھر والے ملنے نہ آئے تو شاید اُس نے کوئی دھمکی آمیز خط اپنی امی ابو کو لکھا کہ وہ اگلے ہی ویک اینڈ پر آ گئے۔ ساجد کی والدہ نے ساجد کو افتخار ڈوم کے سامنے کھڑے دیکھا تو اُنہوں نے دور ہی سے اُسے دیکھ کر اونچی مگر دلگیر آواز اور خالصتاً پختون لہجے میں کہا 'ساجدا۔۔۔' اور ساجد گولی کی سی تیزی سے دوڑتا ہوا اُن کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ہر کام جلدی جلدی کرتا حتیٰ کہ نماز بھی جلدی سے ادا کرنے کا عادی تھا۔ چار میل کی کراس کنٹری تو وہ اور بھی جلدی میں مکمل کرتا۔ اُسے دنیا کے کاموں میں اتنی جلدی کیوں تھی اُس کا تو تب پتہ چلا جب وہ 'بھرا ہوا میلہ' چھوڑ کر اس دنیا ہی سے رخصت ہو گیا۔ جب تک ہم زندہ رہیں گے ہمیں اپنے ''سورڈ آف آنر'' (وہ...77 لانگ کورس کا سورڈ آف آنر تھا) ساجد کی یادیں ہمارے ساتھ رہیں گی آج ہم اُس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ کچھ کر سکتے ہیں تو اُس کے درجات کی بلندی کی دعا کر سکتے ہیں۔ یہ جذبے اور یہ اپنائیت ہمیں ملٹری کالج کی تربیت کی بدولت ہی حاصل ہوئی ہے۔ کراس کنٹری میں تو ہمارا ایک اور اینٹری میٹ بھی بہت دلچسپی لیتا تھا۔

ہم 9th میں تھے کہ جہلم نہر کے پُل پر کراس کنٹری کی وِسل (سیٹی) کا انتظار کرتے ہوئے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس نے مجھے بتایا کہ اس مرتبہ میں نے کراس کنٹری میں فرسٹ آنا ہے تو میں نے کہا اچھی بات ہے مجھے کوئی ایشو نہیں کیونکہ میں نہ کبھی کلاس میں فرسٹ آیا تھا نہ کراس کنٹری میں' خیر! کراس کنٹری شروع ہوئی تو وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہماری آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ ہم اپنے حساب سے رواں دواں تھے، ہم نے کینٹین سے خریدا ہوا Sterpsils کا پیکٹ شروع کرلیا تھا اور خراماں خراماں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک گاؤں کے پاس سے گزرے تو 'کھالے' میں ایک کیڈٹ بے ہوش پڑا تھا اور گاؤں کی کچھ عورتیں لسی اور دودھ کے گلاس ہاتھوں میں تھامے اس کیڈٹ کو یہ کہتے ہوئے اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ''ایہناں فوجیاں نے منڈا ماردتا اے'' (ان فوجیوں نے لڑکا مار دیا ہے) ہم نے آگے بڑھ کر دیکھا تو ہمارا دوست کراس کنٹری سے لاتعلق لیٹا دکھائی دیا' بعد میں وہ کالج کی ایمبولینس پر کالج کے گراؤنڈ پہنچا۔ لیکن آج بھی ہمیں جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میں اُس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ابھی صرف 9th میں ہی تھا تو اپنے سے بہت بڑے FSC والے بھائی جانز (ملٹری کالج میں سینیئرز کو بھائی جان کہا جاتا ہے) کو بھی مات دینا چاہتا تھا۔ وہ بعد میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔

ملٹری کالج کے ساتھ ہماری محبت کو دیکھ کر بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ ہمیں شاید ''مالی خولیا'' ہو گیا ہے کیونکہ ہم سول ہو یا فوج ہر جگہ کسی بھی کامیاب اور باکردار آدمی کو دیکھیں تو اسے ''عالمگیرین'' سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمیں زعم ہے کہ عالمگیرینز کے علاوہ مجوزہ خوبیاں کسی اور میں ہو ہی نہیں سکتیں۔ یہ وہی جذبہ ہے جو معروف کالم نگار عطاء الحق قاسمی کے والد مولانا بہاء الحق قاسمی کشمیریوں سے متعلق رکھتے تھے۔ وہ عطاء الحق قاسمی کے ہر دوست کو کشمیری سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ عطاء الحق قاسمی کا ایک دوست جو کسی اور قوم سے تھا، کے بارے میں بھی ان کے والد صاحب کہنے لگے یہ لڑکا تو ہے ہی کشمیری۔ عطاء الحق قاسمی نے قسم اٹھا کر کہا کہ یہ کشمیری نہیں بلکہ کسی اور ذات کا ہے۔ اس پر ان کے والد صاحب قدرے غصے سے کہنے لگے اتنا خوبصورت لڑکا دوسری قوموں میں کہاں سے آ گیا، ہاں پھر اس کا والد کشمیری ہوگا۔

ملٹری کالج کے حوالے سے باتیں تو اتنی ہیں کہ شاید پوری ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ ہم ملٹری کالج کے شکرگزار ہیں کہ اُس نے پورے پاکستان کے مختلف جگہوں سے پھول اُٹھا کر ہمیں ایک گلدستے کا روپ دے دیا۔ جس کی خوشبو ہمیں ہمیشہ معطر رکھتی ہے اور آج کئی برس گزرنے کے بعد بھی ہمارے تعلق اتنے ہی گہری اور مضبوط ہیں جیسے ایم سی جے میں ہوا کرتے تھے۔

استاد محترم سعید راشد صاحب جب آرمی پبلک سکول منگلا کے پرنسپل تھے تو میں نے ان کا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

انٹرویو کیا جو لاہور کے ایک میگزین میں شائع ہوا۔ انٹرویو کے دوران ان کے کامیاب اور اعلیٰ عہدوں پر فائز شاگردوں کا ذکر شروع ہوا تو کہنے لگے میں تو اپنے اس سٹوڈنٹ کو بھی own کرتا ہوں جو زندگی کی دوڑ میں بظاہر پیچھے رہ گیا ہے اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے لیکن ایک بات جو میرے لیے اطمینان کا باعث ہے وہ یہ کہ میرا سٹوڈنٹ جہاں کہیں بھی ہے، وہ اپنی جگہ ایک بھاری پتھر ہے۔ راشد صاحب کا کوئی عمل مقصد کے بغیر نہ تھا۔ ان کے عید کارڈ بھی منفرد پیغام لے کر آتے تھے۔ ان کا ایک عید کارڈ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے ایک طرف اندھیرے میں شمع روشن تھی جبکہ دوسری جانب منیر نیازی کی ایک نظم تھی جس کا عنوان تھا ''غور سے دیکھو''!

غور سے دیکھو
آدمیوں
کے
ہجوم میں
اس
انسان کو
غور سے دیکھو
''اس کی آنکھوں
میں
کوئی بڑا مقصد ہے
اپنی عورت سے بڑا
اپنے بچے سے بڑا''

زمانہ طالب علمی کے حوالے سے مزید بتاتا چلوں کہ میں کبھی بھی کسی سٹوڈنٹ تنظیم کا حصہ نہیں رہا۔ بلکہ جس انداز سے سٹوڈنٹس یونینز، اساتذہ اور کالج یا یونیورسٹی ایڈمنسٹریشن کو یرغمال بنا کر اپنے کام نکلواتی رہی ہیں میں ان کا بھی سخت ناقد رہا ہوں۔ میں اسلامیہ کالج کینٹ لاہور میں سینیئر پراکٹر تھا اور این سی سی کا کمانڈر بھی تھا۔ میں نے ایک روز دیکھا کہ کالج کے بعض لڑکے صدر بازار لاہور سٹاپ سے ایک والوو بس کو کالج کے اندر لے آئے۔ ڈرائیور یا کنڈیکٹر سے کسی سٹوڈنٹ کی لڑائی ہوئی ہوگی۔ میں نے دیکھا تو بہت ندامت محسوس ہوئی، میں این سی سی کی وردی میں ہی تھا، ڈرائیور گھبرایا ہوا تھا۔ والوو کے اگلے حصے میں خواتین اور دیگر سواریوں سے بس بھری ہوئی تھی۔ میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سیکنڈ ایئر میں تھا اور بس کو لانے والے زیادہ تر طالب علم فرسٹ ایئر کے تھے میں نے بس کو رُکنے کا اشارہ کیا وہ رُک گئی۔ میں نے لڑکوں سے کہا یہ کیا کیا آپ لوگوں نے؟؟ آپ بس کو کالج کی بلڈنگ تک لے آئے ہو، سب لوگ کالج کا نام پڑھ رہے ہوں گے جو بدنامی کا باعث بنے گا۔ ساتھ ہی میں نے ڈرائیور سے کہا بس کو لے جائے۔ ڈرائیور میری طرف دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے اُسے دوبارہ کہا کہ لے جائیں بس کو۔ اُسے کیا چاہئے تھا، اس نے فوراً بس موڑی اور کالج کی حدود سے نکل گیا۔ اس پر لڑکے ناراض بھی ہوئے کہ یوسف بھائی یہ کیا کیا آپ نے، تو مَیں نے اُنہیں سمجھا بجھا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

اسی طرح پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ صحافت میں زیر تعلیم تھا تو ہاسٹل نمبر 9 اور پھر ہاسٹل نمبر 1 میں رہا۔ وہاں جمعیت کا ہولڈ تھا۔ میں جمعیت کا کبھی ممبر نہیں رہا لیکن ان لڑکوں سے دوستی تھی میں نے اُنہیں بہت اچھا پایا۔ اچھی کتابیں پڑھنے والے، اچھی گفتگو کرنے والے لڑکے تھے۔ ملک کے طول وعرض سے سٹوڈنٹس وہاں پڑھنے آتے ہیں بہت سارے صرف ''ٹور ٹپے'' کے لئے کوئی سٹوڈنٹس یونین جوائن کر لیتے ہیں اور ایسے ہی طلباء خرابی کا باعث بنتے ہیں اور متعلقہ سٹوڈنٹس یونین کی بدنامی کا بھی۔ میرا پنجاب یونیورسٹی میں 91-1989 سیشن تھا۔ ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کے اُس وقت کے ناظم ہمارے ایک سال سینئر جنید سلیم تھے۔ وہ سب سٹوڈنٹس میں مقبول تھے۔ انتہائی ڈیسنٹ اور سافٹ سپوکن۔ وہ جن دنوں اُردو نیوز کے جدہ آفس میں سب ایڈیٹر تھے، میں یہاں لاہور بیورو میں رپورٹر تھا۔ آج کل تو وہ ماشاءاللہ ایک معروف اینکر ہیں اور بہت خوبصورت پروگرام کرتے ہیں۔

میں ملٹری کالج جہلم میں 1980 میں آٹھویں میں داخل ہوا اور 1983 میں میٹرک کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ میں 1983 سے 1985 تک پڑھتا رہا۔ سائنسز میں رجحان نہیں تھا اس لئے ایف ایس سی چھوڑ کر ایف اے کیا۔ بی اے پرائیویٹ اُمیدوار کے طور پر 1988 میں فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ بی اے میں میرے مضامین جرنلزم، اُردو ایڈوانس اور پنجابی تھے۔ 1989 میں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اُردو کے لئے میرا نام پہلی لسٹ میں آ گیا لیکن میں نے جرنلزم کی دوسری لسٹ کا انتظار کیا جس کی دوسری لسٹ میں میرا نام میرٹ پر آ گیا اور میں نے شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میرا سیشن 91 -1989 تھا۔ لیکن ہمارا رزلٹ لیٹ آیا اور دسمبر 92 میں میں نے ماسٹر مکمل کیا۔ رزلٹ لیٹ آنے کی وجہ ایک پرائیویٹ یونیورسٹی کی جانب سے ایم اے ماس کمیونیکیشن پرائیویٹ طور پر شروع کرنا تھا۔ جس کے خلاف پنجاب

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یونیورسٹی خصوصاً ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کے طلباء پیش پیش تھے۔ سینئر صحافی اور آزاد کشمیر کے سابق وزیر اطلاعات مشتاق منہاس بھی اس میں کافی متحرک تھے۔ یہ پنجاب یونیورسٹی میں میرے جونیئر تھے۔ گویا مشتاق منہاس میں قائدانہ صلاحیتیں شروع سے ہی موجود تھیں۔ یوں سٹوڈنٹس نے کافی جدوجہد کر کے یونیورسٹی انتظامیہ کو اس پرائیویٹ یونیورسٹی سے الحاق کرنے سے روکا۔

ڈاکٹر منیر الدین چغتائی ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ جرنلزم پارٹ ون اور پارٹ ٹو کے طلباء ان کے آفس جا پہنچے اور ملاقات کے لئے اصرار کیا۔ ملاقات کا وقت نہ ملنے پر لڑکوں نے ان کے آفس کے باہر دھواں دار تقریریں کیں بالآخر انہوں نے اندر بُلایا۔ ہم لوگ اندر جا پہنچے تو ہمارے شعبہ کے چیئر مین ڈاکٹر مسکین حجازی صاحب پہلے سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی وائس چانسلر ڈاکٹر منیر الدین چغتائی سے کہا یہ سارے بہت اچھے بچے ہیں، اس پر وائس چانسلر نے کہا ہاں مجھے اندر آوازیں آ رہی تھیں ان لوگوں کی اور جس وقت یہ میرے دروازے کو ٹھڈے مار رہے تھے اُس وقت بھی مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کتنے اچھے بچے ہیں (خیر ٹھڈے تو شائد باقاعدہ نہیں مارے دروازے کے ساتھ پریشر پڑنے پر دروازے کی آوازیں ضرور آئی ہوں گی۔)

خیر بات کسی اور طرف نکل گئی۔ دسمبر 1992 میں میں نے ایم اے صحافت کیا، پنجاب یونیورسٹی ہی سے 1999 میں ایم اے اُردو بطور پرائیویٹ اُمیدوار کیا۔ 2004 میں نمل (NUML) یونیورسٹی سے سپیشل ڈپلومہ اِن انگلش لینگویج کیا۔ 2013 میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل ماس کمیونیکیسن اور جولائی 2020 میں اوپن یونیورسٹی ہی سے ماس کمیونیکیشن میں پی ایچ ڈی مکمل کی ہے۔

بعض افراد زندگی میں اتنے اِن ہوتے ہیں کہ ان کے آؤٹ ہونے کا گماں بھی محال دکھائی دیتا ہے۔ یہی معاملہ ڈاکٹر مسکین حجازی سے متعلق بھی ہے۔ جو اس جہاں فانی سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن دل ہے کہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ میرا 1989 میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں داخلہ ہوا تو اس وقت ڈاکٹر مسکین حجازی ڈیپارٹمنٹ کے چیئر مین تھے۔ ڈاکٹر مسکین حجازی اس کے علاوہ یونیورسٹی کی سطح پر تقریباً ہر ذمہ داری میں نمایاں دکھائی دیتے تھے۔ وہ سٹوڈنٹس ایڈوائزری کونسل کے چیئر مین بھی تھے جہاں اقبال خلیل انہیں معاونت فراہم کرتے تھے جبکہ شعبہ صحافت کے سابق چیئر مین احسن اختر ناز مرحوم اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے پبلک ریلیشنز آفیسر ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مسکین حجازی کی شخصیت ایسی تھی کہ ایک دو لیکچرز کے بعد ہی طلبا و طالبات ان کے گرویدہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہو گئے۔ وہ صحافت اور خصوصاً مسلم صحافت کی تاریخ انتہائی مزے لے لے کر پڑھایا کرتے تھے۔ ظفر علی خان کی مدبرانہ اور دلیرانہ صحافت کے کئی قصے انہیں ازبر تھے۔ظفر علی خان کے ذیل میں دیئے گئے اشعار بھی ہم نے انہی سے سنے۔

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں
اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے
اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے
لب پر ہے صدا آزادی کی
اور دل میں شوق غلامی کا
اکھڑی تھی ہوا انگریزوں کی
ان دونوں نے مل کر باندھی ہے

یا یوں کہیے کہ مسلم صحافت کے عناصر ثلاثہ جن میں مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل تھے ان کی پسندیدہ ترین صحافتی شخصیات میں سے تھے۔ صحافت کے شعبے سے ڈاکٹر مسکین حجازی کی رغبت میں شاید کچھ حصہ ان کے سسر جناب باری علیگ مرحوم کا بھی تھا کہ جو برصغیر کے ایک معتبر اور منجھے ہوئے صحافیوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس طرح حسرت موہانی کے حوالے سے پڑھاتے ہوئے ان کے اشعار کا حوالہ دینا بھی ان کا اک خاصہ تھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے شعر پڑھتے ہوئے اور بھی اچھے لگتے تھے۔ حسرت کے اس شعر کا تو وہ اکثر حوالہ دیا کرتے تھے۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

ان کی زبان سے سنے ہوئے صحافتی قصے اور چٹکلے آج ان کے نہ ہونے کے احساس کے ساتھ دل کو مخموم کرتے ہیں۔ الہ آباد (بھارت) سے شائع ہونے والے اخبار The Pioneer سے متعلق اکبر آلہ آبادی کا تبصرہ جو انہوں نے سنایا آج بھی اتنے برس بیتنے کے بعد ذہنوں سے محو نہیں ہوا وہ کچھ یوں تھا۔

گھر سے خط آیا ہے کہ ہوگیا ان کا چہلم
پائنیر لکھتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گویا ادبی حلقوں کی جانب سے صحافتی ادارے سے متعلق اس سے بہتر انداز میں تنقید شاید نہیں ہوسکتی۔ اس شعر سے پائنیر کا کچا چٹھا اور پالیسی سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر مسکین حجازی آرائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے لیکن انہوں نے ایک مضبوط آرائیں ہونے کے باوجود تمام ذاتوں کے طلبا کو ہر حوالے سے اکاموڈیٹ کیا۔ کسی کے داخلے کا معاملہ ہو یا کوئی اور پھڈا، ڈاکٹر مسکین حجازی ایک شفیق باپ کی طرح ان کی مدد کے لیے موجود ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ انہوں نے مجھے اور میرے ایک کلاس فیلو ریاض الحق سندھو کو الراعی انٹرنیشنل جو آرائیں برادری کا ترجمان میگزین ہے کے ایڈیٹر چوہدری محمد حسین مرحوم کے پاس بھیجا اور کہا کہ انہیں نہ بتایئے گا کہ آپ آرائیں نہیں ہیں لہذا آپ لوگ اپنی پہلی جاب کے ساتھ ساتھ سیکنڈ ٹائم وہاں بھی کام کرتے رہیں یہ الگ بات ہے کہ چوہدری محمد حسین سے ہمارے مذاکرات کامیاب نہیں رہے کیونکہ وہ بغیر تنخواہ کے کام کرنے والے رضاکاروں کی تلاش میں تھے۔ لہذا ایک ہی نوکری پر اکتفا کرنا پڑا۔

ڈاکٹر مسکین حجازی طلبا کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں چنداں پیچھے نہیں رہتے تھے۔ یونیورسٹی میں داخلہ لیتے ہی میں نے ایک میگزین میں 'ایم اے اخباراں' کے عنوان سے ایک مضمون چھپوا دیا اور اس میں شعبہ صحافت میں ہونے والے داخلوں سے متعلق عدالت میں دائر رٹوں کا بھی ذکر کر دیا۔ اس کی ایک کاپی کسی طرح ڈاکٹر مسکین حجازی جو چیئرمین شعبہ صحافت تھے تک پہنچ گئی انہوں نے نائب قاصد کو بھیجا کہ یوسف عالمگیرین نام کا ہمارا کوئی نیا اسٹوڈنٹ آیا ہے اسے بلوائیں۔ میں جانے لگا تو میرے کلاس فیلو ریاض الحق نے اپنے مخصوص سٹائل میں مجھے باور کرایا کہ تم نے یہ مضمون لکھ کر خود اپنے پاں پر کلہاڑی ماری ہے۔ ابھی تم نے دو سال اس ڈیپارٹمنٹ میں رہنا ہے اور شروع کے مہینوں میں یہ کارروائی ڈال دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو شدید ناراض ہونگے۔ بہتر یہ ہے تم اِدھر اُدھر ہو جا۔ ہم نے بلا سوچے سمجھے اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے ادھر ادھر ہونے میں عافیت جانی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کلاسز ختم ہوئیں تو مجھ سمیت ہماری کلاس کے کچھ لڑکے چیئرمین شعبہ صحافت کے دفتر کے باہر سے گزر رہے تھے کہ اچانک دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مسکین حجازی باہر نکلے۔ لڑکے انہیں دیکھ کر رک گئے ڈاکٹر صاحب سیدھے ہماری جانب آئے اور آتے ہی پوچھا آپ میں سے یوسف عالمگیرین کون ہے؟۔ میں نے تھوڑا تذبذب سے کام لیا تو سب لڑکوں نے بیک زبان ہو کر نشاندہی کی کہ سر یہ یوسف عالمگیرین ہے۔ میں بھی مؤدبانہ انداز میں دو قدم آگے بڑھا اور کہا سر میں ہی یوسف عالمگیرین ہوں۔ اس پر ڈاکٹر مسکین حجازی نے مجھے تھپکی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے آپ کی ایک تحریر دیکھی ہے مجھے بہت اچھی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لگی۔ آپ بہت اچھا لکھنے لگو گے۔ یہ تعریف کچھ کلاس فیلوز کو شاید زیادہ مناسب نہ لگی تو انہوں نے اس بات کو طنز پر مبنی ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی جس پر ڈاکٹر مسکین حجازی نے کہا بھئی میں انتہائی سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں اور یہ بہت جلد کسی اخبار میں کالم لکھنا شروع کر دے گا۔ اس کے لیے آپ کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

استادِ گرامی کے منہ سے نکلی ہوئی بات یوں پوری ہوئی کہ طالب علمی کے دور ہی میں میرا کالم ''دستک'' کے نام سے روزنامہ جہاں نما لاہور اور ''لاہور میں'' کے نام سے کالم روزنامہ پاکستان لاہور کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہونا شروع ہو گیا۔ 1993 میں کچھ کالم 'سچی بات' کے نام سے روزنامہ نوائے وقت لاہور میں بھی شائع ہوئے۔ ذکر ہو رہا تھا ڈاکٹر مسکین حجازی کی شفقت اور سرپرستی کے وصف کا۔ تو انہوں نے سینکڑوں سیلف میڈ طلبا کو اپنے پاں پر کھڑا ہونے میں معاونت فراہم کی۔ بعض طلبا نے ڈاکٹر مسکین حجازی کے اوپر مقالے اور تھیسسز بھی لکھے۔ سینکڑوں لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے ڈاکٹر مسکین حجازی کی ذات کو استعمال کر کے متعدد دنیاوی فوائد حاصل کیے اور پھر کام نکل جانے کے بعد کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر مسکین حجازی صحافت کے میدان میں ایک برگد کے درخت کی مانند تھے جس کی چھاؤں تلے سینکڑوں افراد نے پڑاؤ کیا، چھاؤں سے مستفید ہوئے اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر مسکین حجازی کے شاگردوں میں سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی سمیت سینکڑوں نامور پاکستانی ملک و قوم کی خدمت میں مصروف عمل ہیں۔ یوسف رضا گیلانی کی صحافیوں سے انتہائی نپی تلی اور صاف صاف گفتگو سے لگتا بھی ہے کہ انہوں نے صحافت پڑھی ہوئی ہے۔ یوسف رضا گیلانی تو ڈاکٹر صاحب کی رحلت پر ان کے گھر بھی گئے اور دعائے خیر کی۔ مختلف اخبارات و جرائد، ٹی وی چینلز اور تعلقات عامہ کے اداروں میں مختلف حیثیتوں میں کام کرنے والے سینکڑوں افراد نے ڈاکٹر مسکین حجازی سے کسب فیض حاصل کیا اور اب عزت و وقار سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اللہ ڈاکٹر مسکین حجازی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ (آمین)

میری عملی صحافت کا آغاز شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ پارٹ ٹائم جاب کرنا میری مجبوری تھی، لہٰذا میں نے داخلہ لینے سے قبل ہی سوچ رکھا تھا کہ میں ساتھ نوکری بھی کروں گا۔ ہیڈ مرالہ میں میرے ایک صحافی دوست طاہر منیر طاہر نے مجھے پروین ملک صاحبہ جو اُن دنوں ''پاک جمہوریت'' اخبار کی ایڈیٹر تھیں کے نام ایک رقعہ دیا کہ پارٹ ٹائم کے لئے ان کی مدد کریں۔ میں بھی پاک جمہوریت میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھا کرتا تھا لیکن

www.currentnn.com
Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

پروین ملک صاحبہ سے میری براہِ راست ملاقات نہیں تھی۔ وہ بطورِ رائٹر مجھے جانتی تھیں۔ میں اُن سے ملا اور رقعہ دیا تو وہ خوش ہوئیں کہ آپ کا داخلہ شعبہ صحافت میں ہوگیا ہے۔انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بھی ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز اسی ڈیپارٹمنٹ سے کیا تھا۔انہوں نے فوراً مجھے ایک رقعہ ڈاکٹر مہدی حسن صاحب کے نام لکھ کر دیا جو شعبہ ماس کمیونکیشن میں پڑھاتے تھے۔اس میں انہوں نے لکھا کہ یہ سٹوڈنٹ ''پاک جمہوریت'' کا مضمون نگار رہا ہے اسے کہیں جاب بھی کرنی ہے۔لہٰذا اس کی معاونت فرمائیں۔ڈاکٹر مہدی حسن صاحب نے خوشی کا اظہار کیا کہ اچھی بات ہے کام کرنا چاہئے۔انہوں نے مدد کا وعدہ فرمایا۔

میرا یونیورسٹی میں داخلہ ہوا تو میں کلاس کے بعد کبھی کبھی ڈاکٹر اجمل نیازی کے ہاں وحدت کالونی میں واقع ان کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ڈاکٹر صاحب ہمیشہ شفقت سے ملا کرتے تھے۔جب داخلے کے بعد پہلی مرتبہ ان سے ملنے گیا تو میں نے بتایا کہ میرا ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ ہوگیا ہے تو وہ خوش ہوئے اور کہا کہ توفیق بٹ ہمارا ایک دوست ہے اس کا داخلہ بھی وہاں ہوا ہے۔بعد میں میرا لاہور کا زیادہ وقت عزیز دوست توفیق بٹ کے ساتھ ہی گزرا اور ادبی سرگرمیوں میں ایک ساتھ آنا جانا شروع ہوئے۔توفیق بٹ کا گھر لاہور میں میرے اپنے گھر جیسا تھا۔سید مٹھا بازار میں اُن کا آبائی گھر اور پھر حبیب اللہ روڈ پر نئے گھر میں زیادہ وقت گزرتا۔توفیق بٹ کے والد اور والدہ بہت ڈیسنٹ اور شفقت برتنے والے تھے۔توفیق بٹ کے والد کا اچھا خاصا بزنس تھا لیکن تصنع ان میں نام کو نہیں تھا۔بہت صابر و شاکر انسان تھے۔اللہ دونوں کے درجات بلند فرمائے۔آمین۔

بہرکیف میں نے ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب سے پوچھا سر The Nation اخبار میں کوئی واقف ہے تو کسی سے بات کریں میں وہاں کام کرنا چاہتا ہوں۔ڈاکٹر صاحب نے فوراً پوچھا'' توں اوتھے کیہ کریں گا'' (تم وہاں کیا کرو گے) میں نے کہا ''سر جو باقی کردے نیں۔'' (جو باقی کرتے ہیں) اس پر وہ میری طرف دیکھ کر ہنس پڑے، کہنے لگے بڑا شریر ایں یار توں۔پھر انہوں نے خود ہی کہا کہ ہوسکتا ہے وہ ایم اے مکمل کرنے سے پہلے نہ رکھیں۔میں اس طرح کرتا ہوں طارق فاروق سے بات کرتا ہوں وہ ہمارے دوست ہیں اور بیڈن روڈ لاہور سے روزنامہ جہاں نما کے نام سے ایک اخبار شروع کرر ہے ہیں۔اُن دنوں جہاں نما ہفت روزے کے طور پر شائع ہورہا تھا۔طارق فاروق صاحب برادرم توفیق بٹ کے بھی دوست تھے۔انہوں بھی طارق فاروق سے کہا۔یوں میں جنوری/ فروری 1990 میں ہفت روزہ جہاں نما کے آفس میں جانا شروع ہوگیا۔ان

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دنوں ایک دھماکہ ہوا تھا بھاٹی دروازے میں تو مجھے طارق فاروق صاحب نے کہا کہ اس دھماکے پر ایک تجزیہ لکھیں میرا تراہ نکل گیا کہ یہ کیا کام دے دیا گیا۔ خیر میں نے اُس پر ایک مضمون لکھ دیا۔ طارق صاحب نے اُسے ہفت روزہ جہاں نما کے ٹائیٹل کے طور پر شائع کیا۔ یوں وہ مضمون میرا کسی بھی اخبار یا رسالے کے لئے کسی کرنٹ افیئرز یا قومی ایشو پر پہلا مضمون تھا۔

اپریل 1990 میں جہاں نما روزنامے کے طور پر شروع ہوا تو طارق فاروق صاحب کے بعد میں آل اِن آل تھا، سب ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر، سب کچھ میں تھا۔ شروع کے چند دن خورشید الزمان خوشحالی صاحب کو بُلایا گیا وہ بڑے زبردست انسان تھے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے بتا دیا کہ طارق فاروق صاحب کی خواہش ہے کہ میں زیادہ وقت کے لئے یہاں کام کروں مگر میں نے ادھر زیادہ نہیں رُکنا یہ سب آپ نے ہی کرنا ہے اور آپ آسانی سے کر لیں گے۔ یوں خورشید الزمان خوشحالی صاحب عملی صحافت میں میرے پہلے اُستاد کے طور پر سامنے آئے۔ چند دنوں بعد میں نیوز ایڈیٹر، شفٹ ایڈیٹر سب کچھ تھا۔ کلر ایڈیشن بھی میں ہی تیار کرواتا، ادارتی صفحہ بھی میری نگرانی میں تیار ہوتا۔ PPI سے انگریزی کریڈ آتی اُس کا ترجمہ اور خبریں بنانا بھی میری ذمہ داری تھی۔

معروف صحافی علی جاوید نقوی نے جہاں نما کو بطور کالم نویس جوائن کیا اور ٹی وی مانیٹرنگ بھی وہ دیکھتے تھے۔ ایک آدھ ٹرینی سب ایڈیٹر بھی ہمارے ساتھ تھا اور خوش نویسوں کی ایک پوری ٹیم جو گوڈے پر مستر رکھ کر قلم دوات کے ساتھ خبریں لکھتے۔ بہت محنت طلب کام تھا ان کا۔ حکیم یوسف عزیز صاحب صرف لیڈ اور دیگر سرخیاں لکھنے کے لئے شام کو آیا کرتے تھے۔ میں نے کچھ عرصہ یہ کام کیا تو مجھے لگا کہ یونیورسٹی سے غیر حاضریاں بہت بڑھ گئی ہیں تو میں نے کلاسز کی جانب توجہ دی اور جہاں نما سے چند چھٹیاں کر لیں۔ اسی دوران معروف صحافی سعید اختر کو جہاں نما کی نیوز ایڈیٹر کی ذمہ داریاں دی گئیں اور میں نے طارق صاحب سے بات کی کہ میں 3 بجے تک پہنچ جایا کروں گا تو انہوں نے کہا اس طرح سے روزانہ کاپی لیٹ ہو جایا کرے گی۔ آپ دو بجے تک آ جایا کریں پھر اُس کا حل میں نے یہ نکالا کہ میں ڈیپارٹمنٹ کا آخری پیریڈ مس کرتا اور اپنی کتابیں کسی ہوسٹل فیلو کے حوالے کر کے ایک بجے والی یونیورسٹی کی بس پکڑ لیتا۔ کبھی چیئرنگ کراس اور کبھی ریگل چوک اتر جاتا وہاں سے پیدل بیڈن روڈ روزنامہ جہاں نما پہنچتا اور کام شروع کر دیتا۔ وہاں سعید اختر اور میں ہر حوالے سے سارے کام سنبھالے ہوئے تھے۔ بعد میں جمشید بٹ بطور سب ایڈیٹر آ گئے اب وہ ماشاءاللہ ایک منجھے ہوئے ایڈیٹر ہیں۔

سعید اختر بھی کہنہ مشق صحافیوں میں سے ایک ہیں۔ ہمارے ساتھ والے کیبن میں وسیم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گوہر مرحوم ایڈیٹر پلک تھے اور مرزا شعیب ڈپٹی ایڈیٹر تھے۔ ثاقب بخاری فوٹو گرافر تھے وہ ماہنامہ پلک اور جہاں نما کے لئے کام کرتے تھے۔ یامین صدیقی بھی جہاں نما کے ساتھ منسلک رہے۔ معروف صحافی شعیب بھٹہ بطور رپورٹر جہاں نما کے ساتھ کچھ عرصہ منسلک رہے۔ مجھے جہاں نما سے پارٹ ٹائم کام کرنے کے ایک ہزار روپے ملا کرتے تھے۔ ان دنوں دیگر اخبار بھی تقریباً 15 سو روپے تک ہی تنخواہ دیا کرتے تھے۔ میری کالم نگاری کا دور بھی جہاں نما ہی میں 1990 میں ہی شروع ہو گیا اور ''دستک'' کے نام سے میرے کالم شائع ہونا شروع ہوئے۔ میرے اور علی جاوید نقوی کے کالم صفحہ 2 پر آمنے سامنے شائع ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کالم اور اداریہ 'دانے دار' لکھوایا جاتا اور دانے دار لکھنے والا بہت منجھا ہوا خوش نویس گردانا جاتا۔

اللہ نے ہمیشہ اور ہر موڑ پر مجھے کامیاب کیا۔ میں پارٹ ٹائم کرتا رہا۔ کچھ نہ کچھ سیکھتا رہا اور تجربہ حاصل ہوتا رہا۔ گزارہ بھی چلتا رہا۔ کچھ پیسے گاؤں جاتا تو امی دے دیتیں، باقی میں جہاں نما سے ملنے والے پیسوں سے گزارہ کرتا۔ جہاں نما میرے لئے سب کچھ ہی تھا۔ یونیورسٹی سے فارغ ہوا تو طارق فاروق صاحب نے بالائی منزل پر ایک کمرہ میرے حوالے کر دیا۔ طارق صاحب اس کمرے کو ذرا سیٹ کر کے میرے حوالے کرنا چاہتے تھے لیکن میرے کلاس فیلو اور دوست، اب معروف کالم نگار توفیق بٹ اپنی کالے رنگ کی خیبر گاڑی پر مجھے ایک نمبر ہاسٹل لینے آ گئے۔ میرا سامان گاڑی میں رکھا اور بیڈن روڈ جا پہنچے جس پر طارق بھائی جان نے کمرہ جہاں ہے، جیسے ہے کی بنیاد پر میرے حوالے کر دیا۔ طارق فاروق اور بھابھی نازلی طارق فاروق اللہ کے کوئی خاص لوگ تھے۔ لوگوں کے لئے خیر کثیر۔ صاف نیت والے لوگ تھے۔ طارق فاروق صاحب کو ہم سب بھائی جان طارق کہتے تھے۔ وہ جہاں نما اخبار کے مالک تھے لیکن وہ کوئی روایتی باس نہیں تھے۔ سب سے اچھا برتاؤ کرتے۔ وہ علاج بالغذا پر یقین رکھتے تھے۔ شائد اسی لئے ان کے گھر میں اچھی غذا بنتی۔ ان کا گھر توفیق بٹ کے لئے اپنے گھر جیسا تھا۔ میں اور توفیق بٹ اکثر 37 لکشمی فیشن میں طارق بھائی جان کے گھر ہی پائے جاتے۔ یہ گھر انہوں نے قدرت اللہ شہاب کے بیٹے سے خریدا تھا۔ اب طارق بھائی جان بھی نہیں ہیں اور بھابھی نازلی طارق بھی نہیں رہیں۔ اللہ اُن کے درجات بلند فرمائے۔ کیا خوبصورت جوڑی اللہ نے بنا کر دنیا میں بھیجی تھی۔

بہرکیف اپریل 1993 میں 'سچی بات' کے نام سے نوائے وقت لاہور میں کچھ کالم شائع ہوئے۔ میں نے ایک کالم لکھا ''صدر نے ڈنڈی ماری ہے'' جو بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ خان کے ایک بیان کو بنیاد بنا کر لکھا گیا۔ انہیں وہ تنقید پسند نہ آئی تو انہوں نے جناب مجید نظامی کو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

فون کر دیا۔ انہوں نے چیک کروایا کہ یہ کون نووارد کالم نگار ہے جو نوابزادہ صاحب کو ہی پڑ گیا ہے، اسے تھوڑا گیپ دیں۔ یوں میرے کالم ''سر منڈاتے ہی اولے پڑے'' کے مصداق تعطل کا شکار ہو گئے۔ میرا کالم شائع ہونے کے تیسرے دن نوائے وقت میں نوابزادہ صاحب کی جانب سے ایک تین کالمی خبر بھی شائع ہوئی کہ بعض کالم نگار میرے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر جب میں 1998 سے دو ہزار کے دوران اردو نیوز کا رپورٹر تھا تو میں کئی دفعہ فون کر کے یا کبھی کبھار فون کے بغیر بھی لاہور ریلوے سٹیشن کے قریب واقع نوابزادہ صاحب کے پاکستان جمہوری پارٹی والے دفتر جایا کرتا تھا اور کسی ایشو پر اُن کا بیان یا مؤقف لینے کے لئے تو وہ ہمیشہ انتہائی وضع داری اور شفقت سے ملتے۔

نوائے وقت میں کالم نگاری شروع کرنے کے لئے میں اس وقت کے ڈپٹی ایڈیٹر اسد اللہ غالب سے ملا۔ اُنہیں کالم دیا اُنہیں پسند آیا اور انہوں نے بغیر کسی سفارش کے مجھے کالم لکھنے کا موقع دیا جس پر میرے دل میں اُن کے لئے ہمیشہ احترام کا جذبہ رہا۔ وگرنہ بہت سے لوگ کسی میں ذرا سا ٹیلنٹ دیکھ لیں تو اُس کی راہ میں روڑے اٹکانا شروع ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب ہماری کلاس کا وائیوا ہوا تو اسد اللہ غالب صاحب سبجیکٹ پروفیشنل کے طور پر چیئرمین ڈاکٹر مسکین حجازی کے کمرے میں موجود تھے اور سوالات کر رہے تھے۔ میں اندر داخل ہوا تو ڈاکٹر مسکین حجازی نے کہا یہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا سب سے اچھا لڑکا ہے۔ بہت اچھا لکھتا ہے۔ یہ مستقبل کا عطاء الحق قاسمی ہے۔ اس پر اسد اللہ غالب نے شگفتہ انداز میں کہا پہلے والے عطاء الحق قاسمی صاحب کا کیا کریں گے؟ ظاہر ہے یہ ایک جملہ معترضہ تھا جو انہوں نے کہا۔ ان سمیت سبھی لوگ جناب عطاء الحق قاسمی کے کام اور نام کے معترف ہیں۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا تو لکھنے پڑھنے کی جانب ایک رغبت محسوس کی۔ جب پانچویں جماعت میں مڈل سکول ڈیلرہ میں تھا تو میں نے ایک کاپی پر مختلف شاعروں کے شعر درج کر رکھے تھے۔ میں اپنی کولیکشن دوستوں کو پڑھ کر سناتا تو وہ حیران رہ جاتے۔ اس سے بھی قبل مجھے قلم جمع کرنے کا شوق تھا۔ آٹھویں جماعت میں ملٹری کالج میں داخلہ لیا تو وہاں پروفیسر سعید راشد ایسے مصنفین اور محققین سے فیض حاصل کیا۔ انہوں نے شیر شاہ ہاؤس کی لائبریری کو بالکل اوپن رکھا ہوا تھا۔ اس لائبریری کو 24 گھنٹوں میں ایک لمحے کے لئے بھی تالا نہیں لگتا تھا وہی سعید راشد صاحب کا آفس بھی تھا۔ کوئی کیڈٹ کسی بھی وقت اس لائبریری میں جا کر استفادہ کر سکتا تھا۔ کوئی بھی کتاب اُٹھا کر کمرے میں لے جا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ چھٹیوں میں اپنے ساتھ گھر بھی لے جائے تو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کوئی نہیں پوچھتا تھا، راشد صاحب سے کسی نے پوچھا کہ اس طرح کتابیں بچے واپس نہیں بھی کرتے ہوں گے تو راشد صاحب نے کہا لیکن اس طرح بہت مہنگی مہنگی کتابیں اس لائبریری کا حصہ بھی بن جاتی ہیں اور مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کون رکھ گیا ہے۔ اسی طرح سہ پہر میں ریسٹ ٹائم ہوتا یا جب شام کو سٹڈی ٹائم ہوتا تب بھی کیڈٹس کو اجازت تھی کہ وہ اس لائبریری میں جائیں اور کتابیں لے کر پڑھ سکتے ہیں۔ سوایسے ماحول میں ہلکا پھلکا لکھنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک دو مزاحیہ ٹایپ نظمیں لکھیں وہ راشد صاحب کو دکھائیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ وہاں سے میٹرک کر کے فارغ ہوئے تو اسلامیہ کالج کینٹ کے مجلّے 'سر چشمہ' کے لئے باقاعدہ طنز و مزاح پر مبنی ایک تحریر'' کینٹ کالج کی سیر'' لکھی جس پر ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب نے مجھے اس کا سٹوڈنٹ معاون مدیر مقرر کیا۔

میں نے باقاعدہ شاعری فرسٹ ایئر میں شروع کر دی تھی۔ ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب کو دکھائی تو انہوں نے کہا تم نثری نظم اچھی لکھتے ہو۔ ایسا کرو تم محترمہ کشور ناہید صاحبہ سے ملو وہ اُن دنوں لاہور میں پاکستان نیشنل سینٹر کی ڈائریکٹر تھیں۔ انہیں شاعری دکھائی تو انہوں نے بھی کہا خود کو نثری نظموں کے ذریعے ایکسپریس کرو۔ میں نے نثری نظمیں بھی زیادہ نہیں لکھیں پنجابی شاعری کی طرف رجحان زیادہ تھا انٹر کے فوراً بعد ہی پنجابی غزلیں اور منفرد اشعار کہنے شروع کئے میری پہلی پنجابی غزل کا ایک شعر۔

شہر دے لوکی لڑ لڑ مر گئے، کتھے گئے سیانے لوک
او کھے ویلے کم نہ آئے، جانے تے پچھانے لوک

غیر سرکاری اور پرائیویٹ ملازمت تو میں نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ہی شروع کر دی تھی۔ لاہور آرائے بازار کے قریب جہاں والد صاحب کو سرکاری گھر ملا ہوا تھا اس کے بالکل ساتھ ایک آرٹلری یونٹ تھی وہاں ایک لڑکا الیاس اپنے بھائی کے پاس جو 'ایجوکیشن جے سی او' تھے کے پاس رہ کر یہی کام کر رہا تھا۔ وہ اُس یونٹ میں سول ٹیچر کے طور پر جو غیر تعلیم یافتہ فوجی جوانوں کے لئے ایجوکیشن کلاسز چلتی تھیں انہیں پڑھاتا تھا۔ ان کا سلیبس بہت بنیادی اور مڈل کی سطح تک کا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ 14 سو روپے ماہانہ ملتے ہیں۔ صرف چند کلاسز پڑھانا ہوتی ہیں۔ انہیں ایک اور میٹرک پاس ٹیچر کی ضرورت ہے تو اُس نے مجھے وہ کلاسز دلوا دیں، میں نے اُس وقت انٹر کیا ہوا تھا۔ میں بھی دو چار پیریڈ پڑھاتا اور باقی وقت بی اے کی تیاری کرتا۔ اسی دوران 1987 میں میرے والد صاحب ریٹائر ہو کر گاؤں شفٹ ہو گئے۔ میں نے لاہور میں ہی رہتے ہوئے بی اے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے پیپر دیئے اور فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ بعد میں 1989 میں شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس طرح سے یہ ٹیچنگ میری زندگی کی پہلی جاب ثابت ہوئی۔ دوسری جاب 1990 میں روزنامہ جہاں نما کی تھی جو ایک پرائیویٹ جاب تھی ہے۔ جہاں نما سے پہلے گلبرگ لاہور میں سید شایان کی ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں دو چار دن کام کیا۔ وہاں موٹر سائیکل کی ضرورت تھی جو میرے پاس نہیں تھی۔ سو میں نے جاب چھوڑ دی۔ مشقِ سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی کے مصداق میں کام بھی کرتا رہا اور پڑھتا بھی رہا۔

پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کرتے ہوئے ساتھ پارٹ ٹائم جاب کرنے کا اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ فائدہ دیا کہ جب میرا ایم اے مکمل ہوا تو ساتھ میں دو سال کا عملی صحافت کا تجربہ بھی حاصل کر چکا ہے۔ 1993 کے اوائل میں اخبار میں ایک اشتہار آیا جو کہ گورنمنٹ آف پنجاب کے تحت ایشیائی ترقیاتی بینک کا ایک پراجیکٹ تھا۔ لائیوسٹاک پروڈکشن ایکسٹینشن پراجیکٹ نامی اس پراجیکٹ میں آڈیو ویژول آفیسرز درکار تھے۔ جو ایم اے صحافت اور دو سالہ عملی تجربہ رکھتے ہوں۔ اسی دوران معین قریشی نگران وزیراعظم بن چکے تھے۔ سیاسی دباؤ اور سفارش کلچر کم ہو چکا تھا۔ میں نے گریڈ 17 کی اس ویکنسی پر اپلائی کیا اور میرٹ پر سلیکشن ہوگئی یوں میں نے دسمبر 92 میں ایم اے کیا تھا تو 8 مئی 1993 کو میں گورنمنٹ آف پنجاب میں گریڈ 17 کا آفیسر بننے میں کامیاب ہوگیا۔ ایشین بینک کے معاہدے کے تحت اس پراجیکٹ کو پانچ سال بعد ریگولر ڈائریکٹوریٹ میں تبدیل ہونا تھا لیکن دسمبر 97 میں جب اس کو پانچ سال ہوئے تو بجائے اس کو ریگولرائیز کرنے کے یکسر بند کر دیا گیا۔ یوں میں تقریباً 5 سال سرکاری نوکری کے بعد بے روزگار ہوگیا۔ اس دوران میں سی ایس ایس کے پرچے دے رہا تھا۔ جس میں ایک دو مضامین میں کامیاب نہ رہا اور اب سرکاری نوکری بھی نہ رہی کہ میں اپنا اگلا چانس avail کر سکتا۔ اوور ایج ہونے کی وجہ سے آئندہ کوئی ٹرائی نہ کر سکا۔ 98 میں میں نے اردو نیوز جدہ جوائن کر لیا۔ اُردو نیوز جدہ جوائن کرنے سے قبل میں نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر مجید نظامی صاحب سے ملا۔ میں نے نظامی صاحب سے کہا میں نوائے وقت میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے میرے کالم اور تحریریں نوائے وقت میں شائع ہوتی رہیں۔ انہوں نے میرا سی وی اور جو کالم ساتھ لف تھے، دیکھے اور کہا آج ڈپٹی ایڈیٹر ارشاد عارف صاحب چھٹی پر ہیں، وہ کل آئیں گے تو اُن سے مشورہ کریں گے کہ آپ کو کس شعبے میں رکھنا ہے۔ عموماً نظامی صاحب جاب کے سلسلے میں ملنے والوں کو اکثر نیوز روم بھجوا دیا کرتے تھے تا کہ اُن کا ٹیسٹ وغیرہ لیا جا سکے لیکن مجھے انہوں نے ٹیسٹ سے متعلق کچھ نہیں کہا اور کہا کہ ارشاد

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

عارف آ جائیں تو اُن سے مشورہ کرلیں گے۔

میں نے دو تین دِن انتظار کیا اور سوچا کہ نوائے وقت جا کر چیک کر لیتا ہوں کہ کیا اَپ ڈیٹ ہے میں شعبہ صحافت نیو کیمپس میں گھوم رہا تھا، باہر نکلا تو میرے اُستاد ڈاکٹر اے آر خالد صاحب ملے، پوچھا کہاں کی تیاری ہے میں نے کہا سر نوائے وقت جا رہا ہوں کہنے لگے، آئیں میرے ساتھ میں بھی نوائے وقت جا رہا ہوں۔ میں اُن کے ساتھ اُن کی سفید رنگ کی مہران گاڑی میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے اپنا کالم بھی وہاں دینا تھا۔ راستے میں میں نے اُنہیں بتایا کہ مجید نظامی صاحب سے اس بابت ملا تھا۔ وہ مجھے لے کر سیدھا ڈپٹی ایڈیٹر ارشاد عارف کے کمرے میں گئے۔ ہم جا کر بیٹھ گئے، ڈاکٹر صاحب نے کہا ارشاد صاحب، یوسف عالمگیرین دو تین دن قبل نظامی صاحب سے ملا تھا۔ اس کا کیا فیصلہ ہوا۔ ارشاد عارف صاحب نے پہلے تو نفی میں جواب دیا کہ مجھے ان کے سی وی کا پتہ ہی نہیں۔ پھر انہوں نے مجھے پوچھا آپ کو راولپنڈی نوائے وقت میں سب ایڈیٹر کے طور پر بھیج دیں تو آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کوشش کریں کہ لاہور میں ایڈجسٹ ہو جاؤں۔ پھر کہنے لگے ملتان نوائے وقت میں بھی ایک سیٹ ہے وہاں بھیج دیں۔ میں نے اس کے لئے بھی نفی میں جواب دیا تو ڈاکٹر اے آر خالد کہنے لگے ”یار ارشاد عارف ایچ نہ کر، نظامی صاحب توں چیک کر کے ویکھو کیہ صورت حال بن سکدی اے۔“ مجھے آج بھی کبھی ڈاکٹر اے آر خالد صاحب کا میرے لئے Concern یاد آتا ہے تو اُن کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے کہ آپ کے اساتذہ اور ویل وشرز کس طرح آپ کے لئے کاوش کر رہے ہوتے ہیں۔

اسی طرح پروفیسر شفیق جالندھری صاحب مجھے نوائے وقت آفس کے باہر مل گئے، کہنے لگے کدھر، میں نے ماجرا بیان کیا تو انہوں نے میرا بازو پکڑا اور مجھے شاہراہِ فاطمہ جناح پر واقع روزنامہ چٹان کے دفتر میں چیف ایڈیٹر مسعود شورش (آغا شورش کاشمیری صاحب کے فرزند) کے پاس لے گئے کہ آپ ہفت روزہ چٹان سے روزنامہ چٹان شروع کر رہے ہیں تو یوسف عالمگیرین بھی ادھر ہی آپ کے پاس کام کرے گا۔ مسعود شورش صاحب کی سب سے چھوٹی بہن بھی ہمارے ساتھ شعبہ صحافت میں کلاس فیلو تھیں۔ میں بہر طور نوائے وقت میں دلچسپی رکھتا تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا چند دن تک جب تک فیصلہ نہیں ہو جاتا چٹان جانا شروع کرتا ہوں۔ میں شائد ایک آدھ ہفتہ چٹان جاتا رہا۔ احمد شجاع پاشا وہاں نیوز ایڈیٹر تھے لیکن میرے ہوتے ہوئے ہی وہ چھوڑ کر چلے گئے۔ میں وہاں چند دن ہی گیا کہ مجھے نصر اللہ غلزئی صاحب بیورو چیف اردو نیوز جدہ کی کال آ گئی کہ آپ کا سی وی جدہ آفس بھیجا ہوا تھا آپ کام شروع کریں۔ وہاں سے اپروول ایک آدھ دن میں آ جائے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گی۔ یہ وہ وقت تھا جب خالد منہاس اُردو نیوز لاہور بیورو سے جدہ جا چکے تھے۔ جناب رؤف طاہر مرحوم بھی جدہ روانہ ہونے والے تھے۔ میرا اسی وی انہوں نے ہی نصر اللہ غلزئی صاحب کو دیا تھا۔

بہرحال میں اُردو نیوز میں جاب کر رہا تھا تو 99 کے اوائل میں میرا دوست اشرف شریف ایک اشتہار میرے پاس لے کر آیا کہ یار ایک ویکنسی آئی ہے، تم اپلائی کرو تم ہو جاؤ گے۔ یہ انفارمیشن آفیسر (BS-17) کی آسامی تھی، خیر میں نے اپلائی کر دیا۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں تحریری امتحان ہوا۔ سینٹرل ماڈل سکول لاہور سینٹر بنا وہاں بھی کوئی ساٹھ اُمیدوار ہوں گے جنہوں نے امتحان دیا۔ اس میں ایم اے انگریزی، انٹرنیشنل ریلیشنز اور جرنلزم سمیت دیگر ماسٹرز ڈگری ہولڈر اُمیدوار تھے۔ انٹرویوز بھی شائد اسلام آباد، لاہور اور کراچی کے اسٹیشنز پر ہوئے۔ میں لاہور سے تھا سو فیڈرل پبلک سروس کمیشن لاہور کے آفس میں انٹرویو ہوا، کوئی 9 سے دس امیدوار وہاں بھی تھے انٹرویو کے لئے بریگیڈیئر راشد قریشی (بعد میں میجر جنرل) انٹرویو کے لئے بطور ڈیپارٹمنٹل ریپرزنٹیٹو پینل میں موجود تھے۔ بورڈ کے پریذیڈنٹ ایف پی ایس سی کے کوئی سینئر ممبر تھے۔ بہرحال شائد 25 نومبر 1999 کو مجھے دوست ناصر محمود کی کال آئی کہ تمہاری آئی ایس پی آر کے لئے سلیکشن ہوگئی ہے اور ایف پی ایس سی کی کال آئی ہے۔ میں چونکہ کبھی لاہور میں اور کبھی سیالکوٹ میں چکر لگا رہا ہوتا تھا تو میں نے ایڈریس کسی ایسے دوست کا دیا ہوتا تھا جو مستقل لاہور کا رہائشی ہو۔ پنجاب گورنمنٹ میں سلیکشن کا لیٹر مجھے کلاس فیلو اور دوست توفیق بٹ کے ایڈریس پر موصول ہوا تھا۔

23 نومبر 1999 کو میرا اپائمنٹ لیٹر اس دن سائین ہوا جس دن میری بڑی بیٹی کی گنگا رام ہسپتال میں پیدائش ہوئی۔ ان دنوں گنگا رام ہسپتال کی انچارج ڈاکٹر راشدہ یاسمین تھی جو بہت متحرک اور باہمت خاتون ہیں، وہ میری بیٹی کو خود دیکھنے بھی آئی تھیں۔ بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں اللہ کا فرمان بھی یہی ہے اور سچ بھی یہی ہے۔ اللہ سب کی بیٹیوں کے نصیب اچھے، سکون والے اور عزت والے بنائے۔ آمین۔

آئی ایس پی آر والی سرکاری جاب میری تیسری سرکاری جاب تھی جو مجھے ملی۔ پنجاب گورنمنٹ میں آڈیو ویژول آفیسر کی جاب سے پہلے 1986 میں جب میں نے صرف ایف اے کر رکھا تھا۔ میری سلیکشن ایئرپورٹ سکیورٹی فورس میں بطور اسسٹنٹ سب انسپکٹر ہوگئی تھی لیکن میں نے جوائن نہیں کیا کہ ماسٹرز کر کے مقابلے کا امتحان دوں گا یا کسی گزٹیڈ آفیسر کی جاب کے لئے کوشش کروں گا۔ بہرحال رزق، مقام اور وقت متعین ہوتا ہے انسان نے جہاں پہنچنا ہوتا ہے وہاں پہنچتا ہے اور زندگی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کا سفر جاری رہتا ہے۔ میں نے مارچ 2000 میں بطور انفارمیشن آفیسر آئی ایس پی آر جوائن کیا اور نومبر 2012 سے ایڈیٹر ہلال میگزین کے طور پر خدمات سرانجام دے رہا ہوں۔ اسی دوران میں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی۔ سفر جاری ہے۔ اللہ صحت اور توفیق دیئے رکھے گا تو خدمات کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ انشاء اللہ!

میں اپنے ملک میں بائی چوائس موجود ہوں، لوئر مڈل کلاس سے تعلق ہونے کے باوجود میں نے کبھی بھی دولت کے لئے بیرونِ ملک جانے کا نہیں سوچا۔ میں نے ہمیشہ اپنے ملک میں رہ کر اپنا کردار ادا کرنے کا سوچا اور اسی مٹی سے جڑے رہتے ہوئے آگے بڑھنے کا خواہاں رہا۔ 1994 کی بات ہے میں ایشیائی ترقیاتی بنک کے گورنمنٹ آف پنجاب کے جس پراجیکٹ میں تھا۔ وہاں دو آسٹریلین سپیشلسٹ بھی تھے۔ ان میں سے ایک کافی وضع دار اور سلجھا ہوا انگریز تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ میرے کولیگز کی موجودگی میں مجھے پوچھا کہ میری بیٹی چھٹیوں کے دوران میری فیملی کے ہمراہ پاکستان آرہی ہیں کیا آپ اُس سے شادی کرو گے۔ یہ ظاہر ہے اس نے انگریزی میں ہی پوچھا۔ ان دنوں میری صرف منگنی ہوئی ہوئی تھی شادی نہیں ہوئی تھی، میں نے فوراً کہا Thanks, I am already engaged ساتھ میں نے اُردو زبان میں دوستوں سے آہستگی سے پوچھا جو مجھے سمجھ آئی ہے آپ کو بھی وہی سمجھ میں آیا ہے۔ اس پر میرے کولیگ اور دوست طارق جاوید نے کہا ''چودھری صاحب سمجھ تے ایہو گئی اے'' بہرحال بعد میں ہمارے انگریز کولیگ کی فیملی بھی لاہور آئی ہم دیگر کولیگز نے مل کر اُنہیں ڈنر دیا اور بہت عزت دی۔ جس سے وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔

اسی طرح 1996 میں میرے ایک کزن اور بہنوئی شاہد کھوکھر نے میرے گھر والوں کے کہنے پر مانچسٹر سے مجھے سپانسر شپ لیٹر منگوا دیا تاکہ برٹش ایمبیسی کے ذریعے اپنا کیس پراسیس کروں لیکن میں راولپنڈی میں اپنے دوست عمر فاروق جو سعود ساحر مرحوم کے صاحبزادے ہیں، کے گھر ایک رات رہ کر واپس لاہور چلا گیا کہ برٹش ایمبیسی والے اس لیٹر کو نہیں مانتے، گویا اپنے ملک پاکستان میں رہ کر قسمت آزمانے کا فیصلہ سراسر میرا ذاتی اور ہوش وحواس میں کیا گیا فیصلہ تھا۔

کالموں کے بارے میں تو میں پہلے بتا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے خاکے بھی لکھے ہیں۔ خاکے لکھنے کی طرف مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر ایک فطری رجحان ہے۔ اس میں ادبی حلقوں میں اُٹھنے بیٹھنے کا عمل دخل بھی ہے۔ توفیق بٹ جو میرے کلاس فیلو تھے نے جب گورنمنٹ کالج لاہور میں تھے تو اس وقت ایک ادبی تنظیم ''ہم سخن ساتھی'' کی بنیاد رکھی تھی۔ اس تنظیم کا نام شائد بشریٰ رحمان صاحبہ نے تجویز کیا تھا۔ جب وہ 1989 میں شعبہ صحافت میں آئے تو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب کی بدولت میرا ان سے ایک اچھا تعلق بن گیا۔ انہوں نے مجھے ہم سخن ساتھ کا پہلے سیکرٹری پھر نائب صدر مقرر کیا۔ ہم سخن ساتھی کے تحت بڑے بڑے ادبی فنکشنز ہوتے۔ جس میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، شہزاد احمد عطا الحق، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر اجمل نیازی، دلدار پرویز بھٹی، جاوید اقبال کارٹونسٹ اور بہت سے دیگر معروف ادیبوں اور شاعروں کی شرکت ہوتی۔ یوں ایک ٹیم کے طور پر ہم سخن ساتھی کے بہترین فنکشن سامنے آئے۔

ان تقریبات میں میں بھی مضامین پڑھتا، جو صاحب کتاب کی تصنیف اور شخصیت کے حوالے سے ہوتے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی شخصیات ایسی ہیں جن کے ساتھ تقریبات ہوئیں لیکن میں نے ان کے حوالے سے نہیں لکھا۔ بہت سارے خاکے میں 1997 تک لکھ چکا تھا۔ میری خاکوں کی کتاب ''خوش باشیاں'' 2008 میں فائن پبلیکیشنز نے شائع کی۔

کتابوں سے محبت تو بچپن میں بچوں کی کتابیں اور کہانیاں پڑھ کر پیدا ہوئی۔ پھر جب چھٹی جماعت میں والد صاحب کے ساتھ مظفر آباد آزاد کشمیر شفٹ ہوئے تو میں نے ان کی یونٹ میں قائم ریکریشن روم جا کر کتابوں سے استفادہ کرتا۔ چونکہ وہ آرمی یونٹ کی لائبریری تھی تو اس میں زیادہ عسکری شخصیات کی کتابیں پڑھنے کو ملتیں۔ ان میں سید ضمیر جعفری، کرنل محمد خان، صدیق سالک، مشتاق یوسفی، شفیق الرحمان کی کتب ہوتیں تو میں نے انہیں پڑھا، یوں قدرتی طور پر میرا رجحان اردو ادب میں طنز و مزاح کی جانب ہوا۔ تھوڑا سا بڑا ہوا اور اخبار پڑھنے کی طرف لگاؤ ہوا تو عطاء الحق قاسمی کے مزاحیہ کالم مجھے attract کرنے لگے۔ جب میٹرک کے بعد آرمی کے لئے اپلائی کیا تو کیپٹن (بریگیڈیئر ریٹائرڈ) صولت رضا کی کاکولیات اور کرنل اشفاق حسین کی جنٹلمین بسم اللہ جیسی کتابیں پڑھیں۔ کرنل اشفاق حسین جب کیپٹن تھے تو ملٹری کالج میں ہمارے انسٹرکٹر بھی تھے۔ آج بھی مجھے لگتا ہے کہ مجھے طنز و مزاح کے میدان میں زیادہ کام کرنا چاہیے تھا۔ لیکن سرکاری مصروفیات کا تقاضا خالصتاً سنجیدہ، قومی اور بین الاقوامی موضوعات کا ہوتا ہے۔ ہلال کے اداریے بھی قومی، ملی اور بین الاقوامی موضوعات سے متعلق ہوتے ہیں۔ سرکاری جابز میں لانگ سٹنگز کا بھی رواج ہوتا ہے تو لکھنے لکھانے کے پراجیکٹ اُس طرح سے ہو نہیں سکتے۔

جہاں تک زبان کی بات ہے تو مجھے سب سے زیادہ پنجابی سے محبت ہے۔ پنجابی میری ماں بولی ہے۔ اس کے ساتھ میری محبت ایک فطری عمل ہے۔ اس زبان میں اظہار کرنا بھی میرے لئے سب سے پسندیدہ امر ہے۔ ماں کے متعلق میرا ایک پنجابی قطعہ ہے جو مجھے بہت پسند ہے، وہ یہ ہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اپنے پنڈ نوں جاواں کِکن
ٹرجاواں تے آواں کِکن
ماں باجھوں ہُن گُج نئیں لبھدا
کٹھیاں کراں دعاواں کِکن

پنجابی شاعری تو میں نے انٹرمیڈیٹ میں شروع کردی تھی لیکن میری کتاب 2018 میں قلم فاؤنڈیشن لاہور کے زیرِانتظام شائع ہوئی۔ اس کا فلیپ پنجابی کے معروف ناول نگار اور شاعر زاہد حسن اور سینئر صحافی و شاعر جبار مرزا نے لکھا۔ میرا پہلا کالم 'دستک' کے عنوان سے روزنامہ جہاں نما میں 1990 میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ میں نے مزاحیہ مضامین بھی لکھے ہیں اور اُن کا مجموعہ بھی تقریباً تیار ہے۔ جلد ہی منظر پر آئے گا، انشاءاللہ۔ افسانہ میں نے کبھی نہیں لکھا۔ رجحان بھی نہیں ہے۔ طنز و مزاح کی جانب رجحان ہے۔ انشاللہ اس حوالے سے کچھ کام کروں گا۔ روزنامہ پاکستان لاہور کے ادبی صفحے کے ساتھ وابستہ رہا۔ اس میں لاہور کی ادبی ڈائری 'لاہور میں' کے نام سے لکھتا رہا۔ روزنامہ نوائے وقت میں 'سچی بات' کے نام سے کالم 1993 میں لکھے۔ ان دنوں روزنامہ نوائے وقت اسلام آباد کے لئے سچی بات کے نام سے کالم لکھتا ہوں۔ جناب مجیب الرحمٰن شامی کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے روزنامہ 'پاکستان' لاہور میں بھی میرے کچھ کالم شائع ہوئے۔ دیگر اخبارات میں بھی تحاریر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ماہنامہ ہلال کی میگزین کی ادارت نومبر 2012 سے کر رہا ہوں۔ کچھ ادبی مجلوں میں بھی میری تحریریں شائع ہوتی ہیں۔

افواج پاکستان کے ترجمان رسالے ''ماہنامہ ہلال'' کا میں شائد چھٹی یا ساتویں جماعت سے قاری ہوں۔ والد صاحب کی یونٹ میں یہ میگزین آتا تو میں بھی اسے دیکھتا تھا۔ پھر ملٹری کالج جہلم سرائے عالمگیر کی لائبریری میں آیا کرتا تھا، بلکہ میں نے ملٹری کالج کے لئے جو تحریری امتحان دیا تھا اس کا رزلٹ میں نے ہلال میگزین میں دیکھا تھا۔ ملٹری کالج کے بعد جب میں لاہور کے ایک کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تو میں ہلال کا خریدار تھا۔ میرا میگزین والد صاحب کے ایڈریس پر آتا تھا۔ ابو جی ایک بریگیڈ ہیڈکوارٹرز میں ایس ایم تھے وہاں دو میگزین آتے تھے ایک بریگیڈ ہیڈکوارٹرز کے نام اور دوسرا میرے نام۔ اس وقت شائد 27 یا 28 روپے سالانہ خریداری فیس تھی۔ ان دنوں ممتاز اقبال ملک جو ''ہلال'' میں آنے سے قبل لاہور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ زندگی کے رپورٹر تھے، میں انہیں مختلف تحاریر بھیجتا رہا۔ پہلے تو وہ حیلے بہانوں سے ''ٹرخاتے'' رہے۔ میں سکینڈ ایئر میں تھا تو میں نے ایک مضمون لکھ کر بھیجا جس کا عنوان تھا: ''فوجی تربیت کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اہمیت'' ان کا جواب آیا کہ فوجیوں کو فوجی تربیت کا بخوبی اندازہ ہے آپ اس مضمون کو کسی اور اخبار میں شائع کروائیں۔

جب میں نے مارچ 2000 میں آئی ایس پی آر جوائن کیا تو شائد ستمبر 2000 میں اس وقت کے ایڈیٹر میجر مستعین الرحمان (اب ریٹائر) کی پوسٹنگ آ گئی تو کرنل صولت رضا جو ان دنوں ڈپٹی ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز تھے، نے مجھے ہلال میگزین کی ادارت سونپ دی۔ میں کچھ عرصہ ہلال میں خدمات سرانجام دیتا رہا اس دوران جناب مستعین الرحمان کی پوسٹنگ رک گئی اور میں پھر سے اپنی اصل ذمہ داری پی آر سیکشن میں آ گیا۔ بہرطور جب سن 2000 میں مجھے ایڈیٹر لگایا گیا تو اس وقت ممتاز اقبال ملک کی ذمہ داریاں ایک اور ڈائریکٹوریٹ میں تھیں۔ انہیں کسی نے بتایا کہ آئی ایس پی آر میں ایک نئے آفیسر آئے ہیں انہیں ایڈیٹر لگایا گیا ہے انہوں نے نام پوچھا تو بتایا گیا کہ یوسف عالمگیرین، تو ممتاز اقبال ملک نے فوراً کہا ''اوئے ایہہ اوہ لاہور والا منڈا تے نئیں'' (یہ وہ لاہور والا لڑکا تو نہیں)۔ میں چونکہ انہیں بہت خط لکھتا اور اپنی تحاریر بھیجتا رہتا اس لئے شائد انہیں میرا نام یاد رہ گیا۔

جہاں تک کالموں کے متعلق میرا اپنا نقطہ نظر ہے تو وہ یہ ہے کہ بعض کالم ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی ایک مستقل حیثیت ہوتی ہے وہ یاد رہ جاتے ہیں یا یاد رکھے جاتے ہیں لیکن بیشتر کالموں کی زندگی ایک آدھ دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ کالم جو اپنے مواد اور ڈکشن کی بناء پر یاد رکھے جاتے ہیں ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ صحافت اور ادب کے درمیان کی کوئی شے ہے مکمل ادب نہیں ہے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی کے نزدیک کالم جلدی میں لکھا گیا ادب ہے۔ ویسے ایک دور تھا جب کالم نگاروں کے نام انگلیوں پر گِنے جا سکتے تھے۔ جب میں نے بھی کالم لکھنا شروع کیا اور خاص طور پر نوائے وقت لاہور میں میرے کچھ کالم شائع ہونا شروع ہوئے تو اس وقت اخبارات میں چند ایک معروف نام ہی تھے جو کالم لکھا کرتے تھے۔ میرا پہلا کالم نوائے وقت میں شائع ہوا تو انٹرنیشنل ہوٹل لاہور میں کوئی ادبی تقریب تھی وہاں عطاء الحق قاسمی صاحب بھی تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو بازو پکڑ کر اپنے ساتھ ایک طرف لے گئے اور کہا ''یار تیرا کالم پڑھیا، پڑھ کے واقعی لگیا پئی کالم پڑھ نے پئے آں۔ توں لکھنا نہ چھڈیں'' (یار تمہارا کالم پڑھا، پڑھ کے واقعی لگا جیسے کوئی کالم پڑھ رہے ہیں۔ تم لکھنا نہ چھوڑنا) میرے لئے وہ لمحہ یادگار لمحہ بن گیا کہ یہ بات ملک کا ایک بہت بڑا کالم نگار اور ادیب کہہ رہا تھا۔ میرے لئے یقیناً یہ ایک خوشی کا باعث تھی۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ کس طرح عطاء الحق قاسمی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ پھر چند برس بعد ان کے بیٹے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یاسر پیرزادہ نے بھی کالم نگاری شروع کردی۔ مجھے عطاء الحق قاسمی صاحب کہیں ملے تو کہنے لگے ”ویکھیا یاسر کڈے سوہنے کالم لکھ داپیا اے“ (دیکھا یاسر کتنے خوبصورت کالم لکھ رہا ہے) میں نے کہا ”سر تہاڈے تے یار دوست کالم لکھن لگ پیندے نیں، یاسر تے تہاڈا خون اے“ (آپ کے تو یار دوست لکھنا شروع کردیتے ہیں، یاسر تو آپ کا خون ہے) اس پر انہوں نے ایک بھرپور قہقہہ لگا دیا۔

مجھے شعروشاعری سے بھی خاصی دلچسپی ہے۔ اچھا شعر چاہے کسی بھی شاعر کا ہو وہ اثر چھوڑتا ہے اور دل کو بھاتا ہے۔ کسی دور میں میں ناصر کاظمی کو کافی پڑھتا تھا۔ منیر نیازی کی شاعری بھی مختلف تھی۔ ادیبوں میں بعض بڑے اور سکہ بند نام بھی ہیں، انہیں تو ہر کوئی پڑھ ہی رہا ہوتا ہے۔ مجھے نثر میں ڈاکٹر اجمل نیازی مرحوم کی نثر بہت مختلف لگی۔ ان کی نثر میں ایک ترنم ہے، ایک نغمیت ہے، ایک آسودگی اور وارفتگی ہے۔ ان کے لفظ بے چین کرتے ہیں۔ اثر چھوڑتے ہیں۔ ان کے اسلوب اور طرزِ تحریر پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایسا ہو بھی رہا ہو۔ کالم نگاری میں عطاء الحق قاسمی کو ہمیشہ خوشدلی سے پڑھا۔ سلاست اور روانگی ان کا خاصا ہے۔ وہ لفظوں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ بعض کالم نگاروں کے کالموں اور تحریروں سے لطیفے نکال دیں تو وہ اچھی خاصی سنجیدہ تحریر بن جاتی ہے۔ صحافت میں حمید نظامی مرحوم کی شخصیت اور کام نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ انہوں نے جس انداز سے قائداعظم کی رہنمائی میں ایک اردو اخبار شروع کیا اور اسے مسلمانوں کے نظریئے کا ترجمان بنایا وہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

لاہور میرا سب سے پسندیدہ شہر ہے۔ اس سے بہت خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ لاہور کا سینہ بہت کشادہ ہے، یہ شہر ملک بھر سے آئے ہوئے لوگوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور اُنہیں ”اون“ کرلیتا ہے۔ لاہور کی ادبی محفلیں، صحافتی یادیں، دوست اس امر کے متقاضی ہیں کہ ان پر الگ سے ایک کتاب لکھی جائے۔ یونیورسٹی کے دور میں میرا شمار بھی ورکنگ جرنلسٹس میں ہوتا تھا۔ میرے علاوہ میرے کلاس فیلوز میں تنویر شہزاد ہفت روز زندگی کے ساتھ وابستہ تھے۔ سجاد انور روز نامہ جنگ، ظہیر صدیقی ڈان، عرفان سہیل روزنامہ جرأت، نائلہ رضا روزنامہ مساوات کے ساتھ وابستہ تھے۔ نائلہ رضا ہماری کلاس کی واحد لڑکی تھی جو دورانِ تعلیم صحافت میں خدمات سرانجام دے رہی تھیں۔ ایم اے کرنے کے بعد تابندہ ریاض (ممتاز فلمی شاعر، صحافی ریاض الرحمٰن ساغر کی صاحبزادی) نے روزنامہ نوائے وقت جوائن کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد تو ہماری کلاس کے بہت سے لڑکے صحافت کے شعبے میں ہیں اور سینئر حیثیت میں بہترین خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ہم نے 1992 میں ایم اے ماس کمیونیکیشن کیا۔ اویس باجوہ، عامر خان مرحوم اور مجھے غالباً 1995

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں خیال آیا کہ اُردو بازار سے نوٹس لے کر ایم اے اُردو کا امتحان دینا چاہئے۔ ہم تینوں دوست شام کو اویس باجوہ کے گھر جمع ہو جاتے، اویس کی امی جو تحریکِ پاکستان کی کارکن بھی رہی تھیں اور ہمیں بھی اپنے بچوں جیسا ہی سمجھتیں ہمارے لئے کھانا تیار کرتیں، ہم کھانا کھا کر سو جاتے اور صبح ناشتہ کر کے اپنے اپنے کام پر نکل جاتے۔ یوں وہ پراجیکٹ رات کے کھانے اور صبح کے ناشتے تک ہی محدود رہا۔ میں نے بہر حال 1999 میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اُردو کر لیا۔ اویس باجوہ نے بھی ایم اے اُردو کی ڈگری حاصل کر لی۔ اسی طرح بیڈن روڈ لاہور پر جہاں نما اخبار کی عمارت کے بالائی حصے میں جو میرا رہائشی کمرہ تھا وہ ایک طرح سے ادبی بیٹھک بن چکی تھی۔ میرے دوست معروف شاعر ساجد گل اکثر وہاں آتے۔ محبوب الٰہی اور خالد ارشاد بھی ان دنوں ماہنامہ پلک کے ساتھ وابستہ تھے۔ لاہور کینٹ میں میرا ٹھکانہ اشتیاق احمد، جاوید سلہری اور سہیل رشید کے پاس ہوتا۔ اچھا دور تھا، اچھے لوگ تھے لائیو سٹاک ڈیپارٹمنٹ کے ایشین بنک کے پراجیکٹ میں ہم چار لوگ آڈیو ویژول آفیسر مقرر ہوئے۔ ان میں اقبال انجم، طارق جاوید، سجاد صدیقی اور راقم شامل تھے۔ بعد ازاں عبدالحمید گواریہ بھی شامل ہوئے۔ کیا شاندار وقت تھا جو ہم نے گزارا۔

مجھے سیاست اور سیاستدانوں سے خاص دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ بہت سے سیاستدانوں سے صحافی فرائض کے دوران ملاقاتیں ضرور رہیں۔ میری نظر میں سیاستدان تو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ہی تھے۔ اُن جیسے کھرے، حق گو، دلیر اور ثابت قدم رہنما تاریخ میں کم کم ہیں۔ اپنی منزل اور مقصد سے سچی لگن کسی نے سیکھنی ہو تو وہ قائد سے سیکھی جا سکتی ہے۔ جو وژن وہ پاکستان سے متعلق رکھتے تھے ہم اسی سے جڑے رہتے تو آج پاکستان دنیا کی جدید ترین اور خوبصورت مملکت ہوتا۔ بہت سی ادبی شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں انہیں قریب سے دیکھا۔ میری کتاب 'خوش باشیاں' بھی ادیبوں اور دیگر مشاہیر کے خاکوں پر مبنی ہے، میں نے جیسا ان کی شخصیات کو پایا اس کا اظہار اپنی تحریروں میں کر دیا۔ میری زندگی میں دو اہم ادبی شخصیات ایسی آئیں جنہوں نے میری شخصیت پر اثر ڈالا۔ ایک شخصیت پروفیسر سعید راشد ہیں جو ملٹری کالج جہلم میں میرے استاد تھے۔ گفتار و کردار قائداعظم، کردار ساز اور متعدد ایسی کتب میں جنہیں پڑھ کر انسان کا کردار روشن ہوتا ہے، کے وہ مصنف تھے۔ انہوں نے جو بھی لکھا وہ مقصدیت کی بناء پر لکھا۔

مجھے ناول پڑھنے کا شوق رہا ہے۔ بانو قدسیہ کا راجہ گدھ، عبداللہ حسین کے اداس نسلیں نے متاثر کیا۔ انگریزی میں پائیلو کوہیلو کا الکیمسٹ اور ایلف شفق کا 'فارٹی رولز آف لو' منفرد اسلوب میں لکھے ہوئے ناول ہیں۔ دونوں انگریزی ناول تصوف کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ دیگر اصناف میں مجھے خاکے،

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آپ بیتی اور طنز ومزاح سے متعلق تصانیف زیادہ پسند ہیں۔اچھی شاعری بھی ہانٹ کرتی ہے۔

مجھے کتابوں سے بے حد محبت ہے کہ کتاب سب سے بہترین دوست ہوا کرتی ہے۔کتاب جتنی اچھی ہو شخصیت پر اُتنا ہی خوبصورت تاثر چھوڑتی ہے اور کتابیں اگر ان شخصیات سے متعلق ہو جن کی عمر گلستان کی آبیاری میں گزری ہو' گڈمڈ اور بکھرے ہوئے اذہان کو بنانے اور سنوارنے میں گزری ہو' وہ جو معلم ہوں' مربی ہوں تو ایسی کتابیں یقیناً آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک قیمتی اثاثہ ثابت ہوتی ہیں کہ نئی نسل کے لئے ان کتابوں کے حرف حرف میں ایسے ایسے موتی پنہاں ہوتے ہیں کہ جنہیں تلاش کرنے کی جستجو دل میں گھر کر جائے تو ذہن شمع کی طرح روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔روشن ذہن رکھنے والے ہی خوبصورت قلب اور اوصاف کے حامل ہوا کرتے ہیں۔کسی بھی کامیاب انسان کے بارے میں جاننا اور اسے پرکھنا ہو تو اس کا اندازہ اُن کتب سے کیا جا سکتا ہے جو اس کے زیرِ مطالعہ رہی ہوں۔میں نے ذاتی طور پر راشد صاحب سے بہت Inspiration لی ہے۔ذاتی مسائل' ان کے کام کی کوالٹی پر کبھی اثر انداز نہ ہوئے۔ایسی خوش وضع شخصیت کہ ان کا دل بھی ان کے پیرہن کی طرح باصفا رہا۔دنیاوی حرص وہوس کی آلائشیں نہ کبھی ان کے مشن کے راستے میں حائل ہوئیں اور نہ ان کی انصاف پسندی کو مات دے سکیں۔پروفیسر سعید راشد 1927ء میں بریلی میں پیدا ہوئے' علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی 1950 میں ملٹری کالج میں درس و تدریس کا آغاز کیا ساری عمر یہیں گزار دی۔بیسیوں کتابیں لکھیں۔اُن کا اسلوب منفرد انداز کا حامل تھا۔1999 میں دارِفانی سے کوچ کر گئے لیکن وہ آج بھی اپنے شاگردوں کے دلوں میں شمع کی مانند زندہ وتابندہ ہیں۔شمع سے شمع یوں ہی جلا کرتی ہے۔

دوسری شخصیت ڈاکٹر اجمل نیازی ہے جن سے 1983 میں اسلامیہ کالج کینٹ میں شاگردی کا تعلق قائم ہوا اور ان کی وفات تک قائم رہا۔بعد میں شاگردی کا یہ تعلق دوستی میں تبدیل ہو چکا تھا۔پہلی مرتبہ 1985 میں وہ ہمیں ریڈیو پاکستان لاہور لے کر گئے۔میں نے وہاں ایک غزل پڑھی۔اسلام شاہ مرحوم اس پروگرام کے پروڈیوسر تھے اور اجمل نیازی میزبان تھے، مجھے اس کے چالیس روپے ملے جو میرے لئے بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔مجھے کالج میگزین' سرچشمہ' کا سٹوڈنٹ مدیر بھی ڈاکٹر اجمل نیازی ہی نے بنایا۔اسلامیہ کالج کینٹ سے وہ گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے میں اُنہیں وہاں بھی ملنے جایا کرتا۔وحدت کالونی لاہور میں اُن کے گھر کا میں ریگولر وزیٹر تھا۔اُن کے حوالے سے بہت سی یادیں ہیں۔ڈاکٹر اجمل نیازی کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جو شعر وادب کی دُنیا میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔اجمل نیازی میانوالی سے لاہور پڑھنے آئے اور پھر یہیں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے ہو کے رہ گئے۔ان کے والد تھانیدار تھے اس کے باوجود شریف آدمی اس لئے تھے کہ انہوں نے تھانیداری سے استعفٰی دے دیا تھا۔اجمل نیازی خوبصورت آدمی تھے اور خوبصورتیاں پسند کرتے تھے۔بعض خوبصورتیاں لفظوں کی صورت میں ان کے اندر سے پھوٹتی رہتی ہیں۔عورت کے بارے میں ان کے ریمارکس بھی اپنی جگہ خوب ہیں۔ایک دن کہہ رہے تھے ''اچھی بھلی عورت جب بیوی بنتی ہے تو وہ بلا بن جاتی ہے۔'' گویا عورت بُری نہیں اگر بیوی نہ ہو تو............!۔اجمل نیازی سے کسی نے پوچھا، ان دنوں کیا سرگرمیاں ہیں؟ کہنے لگے: سر کا تو پتہ نہیں بس گرمیاں ہی گرمیاں ہیں۔ان کی بے نیازیاں بعض اوقات لوگوں کو تڑپا کے رکھ دیتی تھیں۔اجمل نیازی خواب وخیال کی دُنیا میں مگن ایک شخصیت کا نام تھا۔ان کا خیال تھا کہ لتا منگیشکر ضرور جنت میں جائے گی کیونکہ اس نے اپنی گلوکاری کے ذریعے بہت سے لوگوں کا دل خوش کیا ہے۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر لتا جنت میں نہ جا سکی تو میں خود اُس کو جنت میں لے کر جاؤں گا۔میں نے کسی دوسرے کے لئے جنت کی اتنی شدید خواہش کرتے ہوئے اُن کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھا۔اجمل نیازی کے والد چونکہ پولیس آفیسر تھے لہٰذا مختلف لوگوں سے ان کا پالا پڑتا تھا۔ایک مرتبہ نواب زادہ نصراللہ خان ان کے والد سے ملنے گئے تو اجمل نیازی اور ان کے دیگر بہن بھائیوں نے نواب زادہ کی فارسی ٹوپی چارپائی کی اَدوائن سے باندھ دی۔نواب زادہ صاحب نے جاتے ہوئے ٹوپی اٹھانا چاہی تو ناکامی کا سامنا ہوا۔اس واقعہ کے بعد نواب زادہ صاحب نے اپنے پاس ہمیشہ دو ٹوپیاں رکھنا شروع کر دیں، ایک سر کے لئے دوسری حُقّے کے لئے۔اجمل نیازی انوکھے آدمی تھے۔کسی کی عزت کرتے تھے تو اس کی غیر موجودگی میں بھی کرتے۔بے عزتی پر آمادہ ہوتے تو سامنے بٹھا کر ایسی خبر لیتے کہ جن کی بے عزتی نہ ہو رہی ہو، وہ بھی محتاط ہو جاتے تھے۔

اجمل نیازی ادبی جنگل کے شیر تھے، وہ چاہتے تو کسی بات پر خوش ہو جاتے اور چاہتے تو ناراض ہو جاتے۔ایک مرتبہ ان کی کسی ادیب سے ہلکی پھلکی ناراضی چل رہی تھی۔ مجھے وہ ادیب کہیں ملا تو میں نے اُسے کہا: اجمل صاحب آپ کا بڑی محبت سے ذکر رہے تھے۔اجمل نیازی کو میرے اس جملے کا پتہ چلا تو بڑے پیچ پا ہوئے کہ مجھے کیا ضرورت ہے میں ایسے بندوں کا محبت سے ذکر کرتا پھروں۔اجمل نیازی کار چلا رہے ہوتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے ایف سولہ جہاز اڑا رہے ہوں۔ایک مرتبہ اُن کی گاڑی کہیں لگ گئی تو میں نے پوچھا: ''سر! گاڑی کہیں ماری ہے'' تو کہنے لگے ''کیوں اسیں نئیں مار سکدے'' (کیوں ہم گاڑی نہیں مار سکتے) ۔گویا ہر وہ کام جو دوسرے لوگ کرتے ہیں اجمل نیازی اُسے کرنا اپنا استحقاق سمجھتے تھے۔وہ دلیر آدمی تھے لہٰذا اپنے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

حصے کی محبتیں تو درکنار نفرتیں بھی چھین لیتے۔ استاد محترم نیازی صاحب کو شعر اور نثر دونوں پر ملکہ حاصل تھا۔ اُن کا سفرنامہ بھارت ''مندر میں محراب'' تو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''کوئی ہندو اپنی بیٹی کا جہاں بھی رشتہ طے کرتا وہ انکار کر دیتی۔ آخر اس نے تنگ آ کر اپنی بیٹی سے پوچھا: تو ہی بتا تجھے کیسا شوہر چاہئے؟۔ بیٹی نے اپنے لئے موزوں پتی (شوہر) کی جب ڈیڑھ دو سو صفات گنوائیں تو بوڑھا ہندو تنگ آ کر بولا: بیٹی تجھے پتی چاہے یا راشٹر پتی۔''

لاہور مجھے کئی نسبتوں سے عزیز ہے۔ 1983 سے لے کر 2000 تک تعلیم اور ملازمت کے کئی ماہ و سال وہاں گزارے۔ یوں لاہور روح میں رچ بس گیا۔ لاہور کے ساتھ محبتوں کے کئی پہلو ہیں۔ ایک مستند پہلو ڈاکٹر اجمل نیازی تھے جو نہ صرف فرسٹ ایئر میں میرے اُستاذِ گرامی تھے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک مربی، ایک رہنما اور ایک دوست کے طور پر سامنے آئے۔ میں گزشتہ بیس برس سے اب راولپنڈی میں ہوں تو کسی نہ کسی طور ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے اور اُن سے رابطہ بھی رہتا۔ وہ ان دنوں علیل تھے۔ ڈاکٹر صاحب کئی حوالوں سے جلالی آدمی تھے۔ اپنے غصے اور خوشی دونوں نہیں چھپا سکتے۔ اور ان کا برملا اظہار کرنے سے بھی کبھی نہیں چوکتے۔ جو دل میں آیا کہہ دیا۔ گویا وہ کبھی لگی لپٹی رکھنے والے شخص نہیں رہے۔ اسی لئے اُن کا شمار ایسے لوگوں میں رہا جو دوسروں سے ذاتی فائدے نہیں اٹھاتے بلکہ ذاتی منفعت کا حصول شائد ان کے لئے کبھی ترجیح ہی نہیں رہی۔ میں کالج کے زمانے میں ان کے پاس وحدت کالونی لاہور کے جس گھر میں جاتا تھا وہ وفات تک وہیں پر رہائش پذیر رہے۔ اب ان کا یہ گھر اُن کے بیٹے احسن نیازی کے نام ہے جو پنجاب گورنمنٹ میں آفیسر ہے۔ یہ وہی گھر ہے جس کی بیل دینے پر اکثر ڈاکٹر صاحب خود ہی دروازے کی چٹخنی کھولنے کے لئے سامنے موجود ہوتے تھے۔ اب جائیں تو ان کا بیٹا یا گھر کا کوئی دوسرا فرد دروازہ کھولتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی مغفرت فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

بہت سی سیاسی، عسکری اور ادبی شخصیات ہیں جن کے ساتھ میری یادیں وابستہ ہیں۔ دلدار پرویز بھٹی صاحب سے بھی کئی ملاقاتیں رہیں۔ دلدار پرویز بھٹی 30 اکتوبر 1994 کو اس وقت خالق حقیقی سے جا ملے جب وہ شوکت میموریل ہسپتال کی تعمیر کے سلسلے میں چندہ جمع کرنے امریکہ گئے ہوئے تھے۔ دلدار بھٹی ممتاز کمپیئر، ماہر تعلیم، کالم نگار اور فنکار ہی نہیں عظیم المرتبت انسان بھی تھے جو دوسروں کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے تو تڑپ اٹھتے اور ان کی ہر ممکن مدد کرتے۔ مجھے دلدار پرویز بھٹی کو انتہائی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کئی بیواؤں کے گھروں کے چولہے ان کی دی ہوئی امداد سے جلتے تھے۔ وہ نادار لوگوں کی مدد کرنے اور یتیم بچیوں کی شادی کروانے میں ہمیشہ معاونت کرتے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

رہے اور اپنی امارت کا یہ عالم تھا کہ رحلت کے وقت ان کے بینک اکاؤنٹ میں صرف دس ہزار روپے تھے۔

لاہور میں ایک شاعر کی بیٹی کی شادی کے موقع پر مختلف شاعر اور ادیب حضرات مدعو تھے۔ کسی ادیب نے دلدار بھٹی کی عدم موجودگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دلدار کو آج تو آنا چاہیے تھا' اس پر لڑکی کا باپ چپ نہ رہ سکا اس نے کہا: ''دلدار خود تو نہیں آیا لیکن میں نے آپ لوگوں کی آؤ بھگت کے لئے گوشت کی جو دیگیں پکوا رکھی ہیں' وہ دلدار کے پیسوں سے تیار ہوئی ہیں''۔ دلدار بھٹی جو بظاہر انتہائی تیز طرار دکھائی دیتے تھے' اندر سے اتنے ہی سادہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دلدار کا ایک دوست ان کا پلاٹ بیچ کر تقریباً دو لاکھ روپے ہضم کر گیا۔ دراصل وہ خود اتنے صاف آدمی تھے کہ انہیں کبھی دوسروں پر شک ہوتا ہی نہیں تھا۔

میں اور برادرم توفیق بٹ (معروف کالم نگار) اکثر چھٹی والے دن دلدار بھٹی کے ہاں چلے جایا کرتے۔ ایک دفعہ گئے تو انہوں نے مختلف چیزیں میز پر سجانا شروع کر دیں۔ جب سب چیزیں رکھ چکے تو کہنے لگے آؤ بھئی ناشتہ کر لیں۔ ہم نے کہا ''جی ہم تو ناشتہ کر کے آئے ہیں'' تو کہنے لگے ''میں گھنٹے دا قوالی کرن ڈیاں ساں' تسیں اس ویلے کیوں نئیں بولے''۔ (میں گھنٹے سے جو آپ کے لئے میز پر کھانے سجا رہا ہوں تو کیوں نہیں بتایا۔ کیا میں ''قوالی'' کر رہا تھا؟)۔ ان کی باتیں ایسی ہی مزے دار ہوتی تھیں۔ دلدار کے چاہنے والے انہیں کبھی نہ بھلا پائیں گے۔ میں نے عطاء الحق قاسمی' امجد اسلام امجد' ڈاکٹر اجمل نیازی' عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی' شوکت علی' طارق فاروق' حسین شاد اور دیگر احباب کو دلدار کے لئے دھاڑیں مار کر روتے ہوئے دیکھا۔ صاحب کتاب شاعر جناب انجم یوسفی مرحوم نے روتے ہوئے کہا کہ مجھے لگتا ہے میں نے یہ شعر دلدار کے غم میں لکھا۔

کرچی کرچی ہو گیا انجم اب کیا ہونا باقی ہے
آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی ہیں کتنا رونا باقی ہے

دلدار بھٹی کی بزلہ سنجی سے بھلا کون واقف نہیں۔ ایک مرتبہ ان کے ٹی وی پروگرام ''پنجند'' میں کسی آدمی نے سوال کا جواب دے کر گھی کا ڈبہ جیت لیا۔ اتفاق سے اس آدمی کے سر پر بال بالکل نہیں تھے' دلدار نے اسے دیکھتے ہی کہا ''ایہہ لیو گھیو دا ڈبہ کڈ او ڈا چیر کڈ کے آئے او تسیں'' (یہ لیں گھی کا ڈبہ آپ کتنی بڑی مانگ نکال کر آئے ہوئے ہیں)۔ دلدار اپنے دوستوں کا ادب کی حد تک احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ جناب عطاء الحق قاسمی کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ عطاء الحق قاسمی نے دلدار بھٹی کے کسی کالم کی تعریف کی تو دلدار نے اٹھ کر ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوئے کہا کہ آپ میرے کالم کی تعریف کر رہے ہیں تو وہ واقعتاً اچھا ہوگا۔

دلدار پرویز بھٹی کی تمام عمر لوگوں کی خدمت کرتے گزر گئی۔ انہوں نے ایک مرتبہ خود بتایا کہ ”مجھے جو پیسے آتے ہیں، میں نے جمع کرنے شروع کر دیئے تاکہ کوئی مکان وغیرہ خریدا جا سکے لیکن کچھ عرصے بعد مجھے پیسے آنے ہی بند ہو گئے۔ تب مجھ پر عیاں ہوا کہ اللہ مجھے نہیں بلکہ میرے ذریعے لوگوں کو دیتا ہے۔ لہٰذا میرا ان پیسوں پر کوئی حق نہیں۔ میں نے دوبارہ اسی طرح دوسروں کی مالی مدد شروع کر دی اور مجھے بھی پہلے کی طرح فنکشن ملنے لگے“۔ دلدار بھٹی کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے اپنی مرحومہ بہن کی بیٹی اور بیٹے کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ بھانجی کی شادی انہوں نے اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی۔ دلدار بھٹی کی زندگی محبتوں اور قربانیوں کا مرقع تھی۔ ان کی یاد آج بھی دلوں میں ایک تازہ خوشبو کی مانند بکھرتی اور نکھرتی محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر (پنجابی زبان کے ممتاز شاعر اور اداکار سہیل احمد (عزیزی) کے نانا) نے شاید دلدار جیسے لوگوں کے لئے ہی کہا تھا۔

لوکاں دے نال رکھ فقیرا ایسا بھین کھلون
کول ہوویں تے ہسن سارے نہ ہوویں تے رون

معاشرے میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو اپنے حصے کا کام اس لگن اور دیانت سے انجام دیتی ہیں کہ وہ معاشرے میں فخر بن جاتی ہیں۔ ڈاکٹر امجد ثاقب بھی ان شخصیات میں سے ایک ہیں۔ صوبہ پنجاب کے شہر کمالیہ میں پیدا ہونے والے امجد ثاقب نے ایم بی بی ایس کیا لیکن ڈاکٹری کے جھنجھٹ میں پھنسے رہنے کی بجائے سول سروسز جوائن کر لی۔ چند سالوں بعد ڈاکٹر امجد ثاقب کو سول سروسز بھی جھنجھٹ محسوس ہونے لگا تو انہوں نے اپنے لئے ایک ایسے سفر کا چناؤ کر لیا جس کے خدوخال ابھی واضح نہیں تھے نہ ہی اس کی منزل کا اس طرح سے تعین تھا۔ جس طرح ڈی ایم جی گروپ کو بطور اسسٹنٹ کمشنر جوائن کرنے والے کے سامنے ایک ”منزل“ ہوتی ہے کہ وہ کبھی وفاقی سیکرٹری کے طور پر ریٹائر ہوگا۔ ڈاکٹر امجد ثاقب نے افسری اور شاہانہ ٹھاٹ بھاٹ چھوڑ کر ”اخوت“ کی بنیاد ڈال دی اور اپنے ملک کے غریبوں اور بے کسوں کو کسبِ حلال پر اس طرح لگانے کا تہیہ کر لیا کہ جس سے ان کے وقار پر بھی کوئی آنچ نہ آئے اور ان کا گھر بھی چلتا رہے کہ انہیں دو وقت کی روٹی کے لئے دوسروں کی جانب نہ دیکھنا پڑے۔ ڈاکٹر امجد ثاقب نے اخوت کے پلیٹ فارم سے ضرورت مند شہریوں کو چھوٹے چھوٹے کاروبار کے لئے چند ہزار روپے کے قرضے دے کر انہیں نہ صرف اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ بلکہ انہیں اس قابل بنایا کہ وہ ملکی و قومی ترقی میں اپنا کوئی کردار ادا کر سکیں لوگوں نے اخوت سے حاصل کردہ قرضوں سے ملیاری کے سامان فروٹ اور سبزی کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ریڑھی کریانہ سامان سمیت سینکڑوں ایسے کاروبار کئے جن سے ان کا گھر کا خرچہ نکلنا شروع ہوا۔ قابلِ قدر امر یہ ہے کہ شہریوں نے نہ صرف اپنے گھر کے لئے منافع کمایا بلکہ اس رقم سے اخوت سے حاصل کردہ قرضہ کی رقم بھی واپس کی۔ اس طرح سے ان کی دلوں میں یہ احساس بھی اجاگر ہوا کہ وہ اپنی محنت اور جدوجہد کے بل بوتے پر اس مقام پر فائز ہوئے کہ ان کے گھر والوں کو عزت کی روٹی نصیب ہوئی ہے۔

ڈاکٹر امجد ثاقب کی کتاب اخوت کا سفر اس کا بخوبی احاطہ کرتی ہے کہ کس طرح انہوں نے اخوت کا سفر شروع کیا اور لحہ لحہ یہاں تک پہنچے اور وہ کون کون لوگ اور ادارے تھے جو ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور آج اخوت ملک کا ایک مستند اور معتبر ادارہ ہے۔ اس سے قبل صرف بنگلہ دیش کے محمد یونس کے گرامین بنک کی مثال دی جایا کرتی تھی لیکن اب اخوت کا حلقہ اثر اور خدمات کا دائرہ گرامین بنک سے چنداں کم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخوت کے مقاصد اور کاوشوں کو نہ صرف ملک میں بلکہ متحدہ عرب امارات اور امریکہ سمیت دنیا بھر کے دیگر ممالک میں سراہا گیا ہے۔ حال ہی میں اُنہیں ''ستارہ امتیاز'' ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ خدا کرے ڈاکٹر امجد ثاقب کی اخوت کا سفر یوں ہی رواں دواں رہے۔ کہ ڈاکٹر امجد ثاقب کا سفر'' سروری در دین ما خدمت گری است'' سے عبارت ہے۔

کسی دور میں لاہور کا ادبی منظر نامہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری کے تذکرے کے بغیر نامکمل محسوس ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ بھی میری خوب ملاقاتیں رہیں۔ لوگ انہیں ''مجاہدِ اردو'' ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری کے نام سے جانتے تھے۔ مجاہد اردو کا خطاب انہیں ڈاکٹر سید عبداللہ نے مال روڈ پر انگریزی کے سائن بورڈ توڑنے پر دیا تھا۔ اردو کو قومی زبان کا درجہ نہ دینے کی پاداش میں انہوں نے لاہور ائرپورٹ پر اس وقت کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی سٹاف کار کے بونٹ پر ایک مکا بھی رسید کیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بطورِ صدر پنجاب یونیورسٹی میں اپنا پہلا خطاب کیا تو ''مجاہدِ اردو'' اٹھ کھڑے ہوئے اور بھٹو سے کہا آپ صدرِ پاکستان ہیں لہٰذا قومی زبان اردو میں خطاب کریں۔ اس پر بھٹو نے کہا جناب یہاں فارن میڈیا کے لوگ آئے ہوئے ہیں ان کی سہولت کے لئے انگریزی میں تقریر کر رہا ہوں۔ اس پر مجاہد اردو نے انہیں بخوشی اجازت دے دی۔ لیکن تقریب ختم ہونے کے بعد انہیں خفیہ پولیس نے سائیڈ پر لے جا کر اپنے طریقے سے سمجھایا۔ مجاہد اردو کے ساتھ اس طرح کا سلوک لاہور ائرپورٹ پر ذوالفقار علی بھٹو کی گاڑی کو مکا مارنے پر بھی ہو چکا تھا لیکن جیسے ہی خفیہ پولیس کو ان کی نیک نیتی کا معلوم ہوتا انہیں چھوڑ دیا جاتا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

ان کے بہت سے واقعات مجھے یاد ہیں۔ایک مرتبہ مجاہد اردو جب حج کرنے گئے تو وہاں انہوں نے صرف ایک ہی دعا مانگی کہ رب تعالیٰ مجھے پاکستان کا صدر بنا دے۔کاش انہیں معلوم ہوتا کہ صدر بننے کے لئے دعا کافی نہیں ہوتی۔بہرکیف مجاہد اردو کے اندر کی یہ لگن تھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا، جب رفیق تارڑ صدر منتخب ہوگئے تو ان کے خلاف یا برخلاف ایک امیدوار ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری بھی تھے۔لیکن عدالت نے یہ کہہ کر کہ'' آپ جیسے لوگ عدالت کا وقت ضائع کرتے ہیں ان کے کاغذات مسترد کردیئے''۔ بقول مجاہدِ اردو واللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔وہ جیسے ہی عدالت سے باہر نکلے تو آگے''بی بی سی ''والے کھڑے تھے انہوں نے مجاہد اردو کی بیسیوں کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے خبریں چلائیں کہ اتنی کتابیں لکھنے کے بعد بھی کوئی صدارتی امیدوار نہیں ہوسکتا تو ایسا پاکستان ہی میں ہوسکتا ہے۔ظاہر ہے بی بی سی والوں نے مجاہدِ اردو کی کوئی بھی کتاب نہ پڑھی اور نہ ہی دیکھی تھی پھر بھی انہیں اچھا نہیں لگا کہ کوئی صاحبِ کتاب اس حق سے محروم کیوں رہے۔

صدر رفیق تارڑ کے مقابل الیکشن لڑتے ہوئے تو وہ اس حد تک پر یقین تھے کہ انہوں نے اپنی کابینہ بھی اناؤنس کر رکھی تھی۔ان کی کابینہ میں عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور طارق فاروق مرحوم وفاقی وزرا ہوتے۔جبکہ انہوں نے مجھے''پریس سیکرٹری ٹو پریزیڈنٹ''لگانا تھا۔یہ تو عرفان صدیقی صاحب کے نصیب تھے کہ رفیق تارڑ صدر بن گئے وگرنہ ان کی بجائے میں خود (یوسف عالمگیرین) ایوانِ صدر میں موجود ہوتا۔دلچسپ امر یہ ہے کہ انہوں نے جو کابینہ اناؤنس کی اور جو پورٹ فولیوز دیئے اس میں ایک''وزارتِ تعلیم برائے طلبہ'' بھی تھی۔طالبات کے افیئرز کا چارج جناب مجاہدِ اردو نے اپنے پاس رکھا تھا۔ان کا خیال تھا کہ صدر چونکہ''فادر آف دی نیشن''ہوتا ہے لہٰذا وہ یہ فرائض بہتر طور پر سرانجام دے سکتے ہیں۔مجاہد اردو تو حج کے موقع پر دعا مانگنے کے بعد صدارتی انتخابات میں کامیابی کے حوالے سے اس حد تک پر عزم تھے کہ وہ دوسری شادی کسی انتہائی پڑھی لکھی خاتون سے کر کے انہیں خاتونِ اول کا درجہ دینا چاہتے تھے لیکن شاید ان کی پہلی بیوی کو اس کی خبر ہوگئی ہو اور اس نے صدارتی انتخابات سے قبل ہی گھر میں مصلیٰ بچھا کر اپنا گھر اجڑنے سے بچانے کی دعائیں شروع کر دیں، یوں مجاہدِ اُردو بُری طرح ناکام ہوگئے۔

مجاہدِ اُردو جس سے زیادہ خوش ہوتے ان کو شادباغ کی ایک مخصوص دکان سے جلیبیاں بھی ضرور پیش کرتے۔ان کے بقول عطاالحق قاسمی اور منو بھائی کے بعد راقم تیسرا خوش قسمت تھا جس کو جلیبیاں تحفے میں ملیں۔شاید انہی جلیبیوں کی تاثیر ہے کہ میں کئی برس قبل لاہور سے راولپنڈی آ گیا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لیکن آج بھی قیادت کے فقدان کے معاملے پر میری نگاہ انتخاب 22 کروڑ عوام میں سے مجاہد اردو ہی پر پڑتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت محترمی عطاالحق قاسمی اور منو بھائی مرحوم کی بھی رہی ہوگی۔ مجاہد اردو کے ''ویل وشرز'' تو بہت رہے ہیں لیکن جب مقدر ساتھ نہ دے تو جلیبیاں بھی رنگ نہیں دکھاتیں۔

اسی طرح ڈاکٹر صفدر محمود جن کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہوا بھی ایک ایسی شخصیت تھے جو ہمیشہ وطن سے جڑے رہے۔ ڈاکٹر صفدر محمود تحریک پاکستان، قیام پاکستان اور پھر پاکستان کی تکمیل کے جاری مراحل کے چشم دید گواہ تھے۔ پاکستان افیئرز کے حوالے سے ان کی کتب ایک مستند حوالے کے طور پر یاد رکھی جائیں گی۔ ڈنگہ تحصیل کھاریاں میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر صفدر محمود کا یوں تو ضلع گجرات سے تعلق بنتا تھا لیکن ان کے مقصدِ حیات اور پاکستانی امور سے ان کے عشق نے انہیں پاکستان کے ہر گھر کا فرد بنا دیا تھا۔ وہ لوگوں کے دلوں میں زندہ تھے۔ نظریہ پاکستان اور پاکستان کے حوالے سے جب جب بعض لوگوں کی طرف سے شوشے چھوڑے گئے، وہ میدان میں کود پڑتے۔ وہ پاکستان پر حملے کو اپنی ذات پر حملہ قرار دیتے ہوئے حقائق کی بنیاد پر ایک ایک نقطے کا جواب دیتے اور لوگوں کے اذہان میں جو ابہام پیدا کئے جاتے وہ انہیں ختم کرنے میں کردار ادا کرتے رہے۔ تاریخ اور علوم پاکستان کے طالب علم ان کی تحاریر سے رہنمائی حاصل کرتے۔ ان سے ملنا ہمیشہ علم وشعور کا ذریعہ بنتا۔ وہ تعلقات میں جتنے وضع دار تھے اتنے ہی تحریر اور گفتگو میں بھی تھے۔ برادرم توفیق بٹ نے نوے کی دہائی میں جب ادبی تنظیم ''ہم سخن ساتھی'' بنائی تو ڈاکٹر صفدر محمود بہت باقاعدگی سے اس میں تشریف لاتے۔ جن دنوں وہ ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج لاہور کے ڈائریکٹر تھے، توفیق بٹ اور میں ان کے آفس بھی جاتے رہے۔ وہ ہمیشہ انہماک سے کام کر رہے ہوتے۔ ان کا یہ رویہ زندگی کے باقی معاملات میں بھی رہا اور وہ آخر دم تک قائداعظم کے قول کام، کام اور کام کی عملی تصویر بنے دکھائی دیئے۔ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کام کو شعار بنائے رکھا۔ وہ لاہور کی ایک معروف یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ملک کے ایک معروف اخبار میں کالم بھی لکھتے رہے۔ قومی اور بین الاقوامی ایشوز سے متعلق ان کی کتب بھی تواتر سے شائع ہوتی رہیں۔ کرنٹ افیئرز کا ڈائجسٹ بھی ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اس ڈائجسٹ کا مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے والوں کو شدت سے انتظار رہتا۔

میں بطور ایڈیٹر ماہنامہ ہلال میگزین ڈاکٹر صفدر محمود سے ہلال کے لئے مضامین بھی لکھواتا رہا۔ ان سے اس بابت طویل گفتگو بھی ہوتی۔ دفتری اوقات میں جب انہوں نے کبھی کال کرنی ہوتی تو پہلے وٹس ایپ پر کال کا وقت طے کرتے پھر ٹھیک اس وقت پر ان کی دفتر کے لائن نمبر پر کال

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آتی اور کہتے میں نے آپ سے تین باتیں کرنی ہیں۔ پہلی یہ، دوسری یہ اور تیسری یہ۔ گویا وہ فون پر فضول اور لمبی گفتگو سے پرہیز کرتے اور بات شروع کرنے سے قبل یہ طے کرتے کہ ان ان امور پر بات کرنی ہے تاکہ کال وصول کرنے والا بھی اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھنے کی بجائے جو ضروری بات ہے اسی پر توجہ مرکوز رکھے۔ بلاشبہ ڈاکٹر صفدر محمود جیسی شخصیات جہاں علم وشعور بکھیرتی ہیں وہ آئندہ نسلوں کے لئے تربیت کا باعث بھی بنتی ہیں کہ معاملات زندگی کو کس طرح سے چلایا جائے۔ ان کی درجنوں تصانیف ایسی ہیں جنہیں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا ان کی کتابوں کے تراجم ازبک، چینی، جرمن، بنگالی اور سندھی زبانوں میں کئے گئے۔ یوں وہ پڑھے جانے والے اور سراہے جانے والے مصنفین کے طور پر زندہ رہے۔ اب وہ ہم میں نہیں رہے لیکن ان کا کام اب بھی لوگوں کے سامنے ہے۔ بڑے اور خوش قسمت لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنے کام کی وجہ سے زندہ رہتے ہیں۔

ڈاکٹر صفدر محمود راوین تھے اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں راوینز کو پڑھاتے بھی رہے۔ جن دنوں وہ وہاں لیکچرار تھے سابق وزیراعظم نواز شریف بھی ان کے سٹوڈنٹ رہے۔ ڈاکٹر صفدر محمود بعدازاں مقابلے کا امتحان پاس کر کے سول سروسز میں چلے گئے اور جب نواز شریف وزیراعلیٰ پنجاب بنے تو ڈاکٹر صفدر محمود سیکرٹری ٹو چیف منسٹر تھے۔ وہ سول سروسز میں دیانت، میرٹ اور صاف گوئی کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ ان کا یہی وصف ان کی تحاریر میں بھی دکھائی دیا۔ بہرکیف سول سروسز میں بھی ان کی ایک منفرد شناخت رہی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ میرٹ پر معاملات چلانے پر زور دیا۔ پھر بھی کسی کا کوئی جائز کام ہوتا تو وہ ضرور مدد کرتے۔ روزنامہ جہاں نما لاہور کے چیف ایڈیٹر جناب طارق فاروق مرحوم اس واقعہ کے راوی ہیں کہ جب ڈاکٹر صفدر محمود سیکرٹری ٹو چیف منسٹر تھے وہ اُنہیں کسی کام کے سلسلے میں ملے اور بتایا کہ وہ گورنمنٹ کالج میں ان کے سٹوڈنٹ بھی رہ چکے ہیں۔ اتفاق سے طارق فاروق مرحوم بھی گورنمنٹ کالج لاہور میں اس وقت کے وزیراعلیٰ نواز شریف کے کلاس فیلو تھے۔ طارق فاروق مرحوم نے کسی کام کے سلسلے میں وزیراعلیٰ سے ملنے کی خواہش کی تو ڈاکٹر صفدر نے انہیں فوری وزیراعلیٰ سے ملوا دیا اور بتایا کہ طارق فاروق بھی گورنمنٹ کالج میں آپ ہی کی کلاس میں تھے۔ اس پر نواز شریف بہت خوش ہوئے اور طارق فاروق مرحوم کا جو جائز کام تھا وہ بھی کروا دیا۔ بلکہ جب طارق فاروق وزیراعلیٰ کے آفس سے باہر نکل رہے تھے وزیراعلیٰ نواز شریف نے ڈاکٹر صفدر محمود صاحب سے کہا ''صفدر صاحب ایناں دا کم ہُن کروا وی دینا'' (ان کا کام اب کروا بھی دیجئے گا)۔ گویا ڈاکٹر صفدر کی شخصیت لوگوں کے لئے ایک خیر کثیر کا باعث بھی رہی۔ انہوں نے تمام عمر شعور اور فہم تقسیم کیا۔ ظاہر ہے جس کے پاس جو ہوتا ہے وہ وہی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تقسیم کرتا ہے۔ جس کے پاس خیر ہوتی ہے وہ خیر ہی تقسیم کرے گا۔ محبتیں تقسیم کرے گا ایسے لوگوں دلوں کو اور لوگوں کو آپس میں جوڑنے والے ہوتے ہیں۔ ان کا پیغام ان کی تخلیقات کے ذریعے آگے چلتا رہے گا۔ ڈاکٹر صفدر محمود کی کتب یقیناً ان کے لئے کسی صدقۂ جاریہ سے کم نہیں ہیں۔ اللہ انہیں جزا دے اور جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

سابق وزیرِ اعظم جناب معراج خالد مرحوم کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بہت سادہ طبیعت اور صاف گو شخصیت تھے۔ ان میں تصنع اور خودنمائی بالکل نہیں تھی۔ ایک دفعہ ہم سخن ساتھی کی کوئی تقریب ''شیزان ہوٹل'' مال روڈ پر تھی تو میں نے اُنہیں لکشمی مینشن سے اُن کے گھر سے لے کر آنا تھا۔ میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا، وہ تیار ہو رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر ان کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا وہ آ گئے اور کہا چلئے فیر، میں نے کہا جی بالکل۔ ڈرائینگ روم سے باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ ان کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ میں نے پوچھا، سر! گاڑی کہاں کھڑی ہے۔ کہنے لگے ''چھڈو پراں کیہ کرنا اے گڈی نوں'' آ ؤ دونہویں جنے ٹر دے جانے آں اسیں بس ریگل چوک ای تے کراس کرنا اے''۔ (چھوڑو گاڑی کو کیا کرنا ہے۔ بس ہم دونوں پیدل چلتے ہیں، بس ریگل چوک ہی تو ہم نے کراس کرنا ہے)۔ یوں میں اور مہمان خصوصی سابق وزیر اعظم معراج خالد پیدل چلتے ہوئے شیزان ہوٹل پہنچے۔ سب ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ہوٹل پہنچتے ہی تقریب شروع ہوگئی۔

جہاں تک عسکری شخصیات کا تعلق ہے تو بہت سی عسکری شخصیات کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ زندگی رہی تو ان شخصیات پر تفصیل کے ساتھ اپنی یادداشتیں بیان کروں گا لیکن ایک ایسی عسکری شخصیت ضرور ہے جس نے میری ذات پر بہت گہرے نقوش چھوڑے۔ وہ تھے سابق کور کمانڈر لاہور لیفٹیننٹ جنرل (ر) محمد اسلم شاہ مرحوم۔ میں نے 31 مارچ 1985 میں کور ہیڈ کوارٹرز میں ان سے این سی سی کے بہترین کیڈٹ کی شیلڈ وصول کی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب عید کے مواقع پر صرف ایک میسج یا وٹس اپ کر کے لوگ بری الذمہ نہیں ہو جاتے تھے بلکہ عید کارڈ خریدے جاتے یا پرنٹ کروائے جاتے اور بڑے وقار کے ساتھ بھجوائے جاتے۔ میں بھی دوستوں اور اساتذہ کرام کو عید کارڈز بھیجا کرتا تھا۔ میں نے ایک عید کارڈ کور کمانڈر کو بھی بھجوا دیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان کا مجھے نہ صرف جوابی عید کارڈ آیا بلکہ اس میں عید کارڈ کے لئے باقاعدہ پر شکریہ بھی ادا کیا گیا۔ پھر کیا تھا ایک سیکنڈ ایئر کے بچے کے لئے ایسا اور کیا موقع ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد اُن کے ساتھ باقاعدہ خط کتابت شروع ہوگئی۔ ان کے کچھ خطوط شائد آج بھی میرے پاس محفوظ ہوں۔ اس میں اہم بات یہ ہے کہ جس کور کے وہ کور کمانڈر تھے اُسی کور کے انڈر کمانڈ ایک آرٹلری

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

بر گیڈ ہیڈ کوارٹرز میں میرے والد گرامی صوبیدار میجر تھے۔ میرا اپنا ایڈریس تو تھا کوئی نہیں اور میری تمام ڈاک میرے والد صاحب کی معرفت آیا کرتی۔ اور وہ شائد اپنے ہاتھ سے خط کا جواب لکھتے اور اس پر ایڈریس لکھ کر اُسے پوسٹ کرواتے۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ اُن کی پوسٹنگ منگلا کے کور کمانڈر کے طور پر ہوگئی ہے تو میں نے اُنہیں خط لکھا کہ میں ’کال آن‘ کرنا چاہتا ہوں۔ خط ملتے ہی کور کمانڈر سٹاف نے بر گیڈ ہیڈ کوارٹرز میں رابطہ کیا کہ ایس ایم محمود عالم صاحب کے بیٹے کو فلاں دِن اتنے بجے بجھوادیں، کور کمانڈر سے ملاقات ہے۔ ہوسکتا ہے افسران کا بھی ’’تراہ‘‘ نکلا ہو کہ یہ کیا کہانی ہے۔ ایک کالج سٹوڈنٹ کور کمانڈر سے مل کر کیا کرے گا۔ میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ اُن کے اے ڈی سی کیپٹن منشا نے مجھے چائے پلائی اور مجھے کور کمانڈر کے آفس میں بجھوادیا گیا۔ وہ مجھے مل کر خوش ہوئے، میرے والد صاحب کا حال چال پوچھا اور کہا کہ آپ پی ایم اے کے لئے اپلائی کر رہے ہیں تو میں اثبات میں جواب دیا، انہوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ میں اُن کے لئے ایک یادگاری شیلڈ بنوا کر لے گیا تھا جو ایکس کمانڈر این سی سی کی جانب سے تھی۔

میرے لئے وہ ملاقات ایک بھرپور ملاقات تھی، اتنے بڑے آفیسر کے ساتھ اُس کے آفس میں ملاقات وہ بھی انتہائی خوش گوار ماحول میں۔ اس کے بعد بھی میں اُن سے رابطے میں رہا۔ میں 1989 میں ایک دفعہ راولپنڈی کسی انٹرویو کے سلسلے میں آیا تو اُن کو کال کی۔ انہوں نے کہا انٹرویو کے بعد ریس کورس روڈ پر میرا گھر ہے آپ وہاں تھوڑی دیر کے لئے آئیں۔ میں حسبِ وعدہ اُن کے گھر پہنچا تو انہوں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ وہاں کچھ اور بھی سینئر افسران بیٹھے ہوئے تھے لیکن انہوں نے مہمان نوازی کے تقاضوں کے مطابق جس طرح ایک مہمان سے بات کرنا ہوتی ہے میری جانب رُخ کر کے مجھ سے باتیں کرتے رہے اور پوچھا کیا کر رہے ہیں۔ میں نے بتایا پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے جرنلزم کر رہا ہوں اور ساتھ بتایا کہ ایک اخبار میں پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہاں ہوں۔ اُنہوں نے اس بات کو appreciate کیا۔ کہنے لگے میں بھی اِن دنوں کبھی کبھار ایک انگریزی اخبار میں آرٹیکل لکھتا ہوں۔ آپ بھی لکھتے رہیں۔ محنت کرتے رہیں۔ پھر جب 2000 میں میں آئی ایس پی آر کے لئے سلیکٹ ہوکر آیا تو اُنہیں بتایا کہ میں راولپنڈی شفٹ ہوگیا ہوں، اُن سے وقت لے کر ملنے گیا تو انہوں نے پوچھا کس پوسٹ پر سلیکٹ ہو کر آئے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ایف پی ایس سی کے ذریعے گریڈ سترہ میں بطور انفارمیشن آفیسر جوائن کیا ہے تو کہنے لگے:

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

"I am happy to listen about your grade but don't stay in ISPR. Keep doing the Journalism may be at some stage you become an editior of The News or some other good newspaper"

(مجھے آپ کے گریڈ کے بارے میں سُن کر خوشی ہوئی ہے لیکن آپ مستقل طور پر آئی ایس پی آر میں نہ رہیے گا۔ جرنلزم کرتے رہیں شائد کسی وقت آپ دی نیوز یا کسی اور اچھے اخبار کے ایڈیٹر بن جائیں)

میں سمجھتا ہوں کہ ایسی ایڈوائس صرف ایسی شخصیت دے سکتی ہے جو آپ کو کسی شعبے میں بہت آگے بڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہو۔ اُن کا مشورہ ایک صاحبِ بصیرت اور دردِ دل رکھنے والے انسان کا مشورہ تھا۔ میں راولپنڈی ہی میں رہا، ایک آدھ مرتبہ آفس کے نمبر پر اُن کی کال بھی آئی۔ درمیان میں کچھ وقفہ آیا کہ میں بھی بچوں کی پڑھائی اور غمِ روزگار میں لگ گیا۔ میں نے شاید 2014 میں اُنہیں ہلال میگزین بجھوائے کہ وہ دیکھیں ہلال اب کس قدر بدل گیا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو کسی وقت اس کے لئے لکھیں بھی۔ دو روز بعد ان کے بیٹے جمال شاہ صاحب کی کال آئی کہ یوسف بھائی، ابو (جنرل اسلم شاہ) کی گزشتہ برس رحلت ہوگئی میں خبر سُن کر گُم سُم ہوگیا کہ مجھے راولپنڈی میں رہتے ہوئے اُن کی رحلت کی خبر نہ ہوئی۔ وہ ریس کورس قبرستان میں دفن ہیں، کبھی کسی جنازے پر جاؤں یا کسی قبر پر حاضری دینا ہو تو میں جنرل صاحب کی قبر پر کھڑے ہو کر اُن کی مغفرت کی دعا ضرور کرتا ہوں۔ اللہ کریم اُن کے درجات بلند فرمائے۔ بلاشبہ وہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں جو لوگوں کے ساتھ تعلق جوڑتے ہیں۔ شائد وہ دور بڑے لوگوں کا دور تھا۔ اپنے عہدوں کی رعونت اور تمکنت کی بنا پر لوگوں کو 'بلاک' کرنے والے لوگ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔

فروری 2016ء میں ہم سب کے خیر خواہ اور دوست ڈاکٹر احسن اختر ناز نے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔ جب ناز صاحب فوت ہوئے تو ڈاکٹر ثاقب ریاض کا تین حرفی میسج آیا ''ناز صاحب ڈائیڈ''، مجھے یوں لگا جیسے زمین ہل گئی ہو۔ جیسے اللہ کی دی ہوئی کوئی نعمت تھی جو ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گئی اور کرچی کرچی ہوگئی۔ لوگ نہیں رہتے بس یادیں رہ جاتی ہیں۔ لوگ جب زندہ ہوتے ہیں تو ہم اُن سے کم ملتے ہیں لیکن جب چلے جاتے ہیں تو دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں۔ معروف ادیب احسن اختر ناز جتنے ہنس مکھ، جملہ باز اور دوست نواز تھے' آخری وقت اتنا ہی پریشانی گزرا کہ شوگر کے مرض میں مبتلا رہے۔ رحلت کے کچھ عرصہ قبل ان کی ایک ٹانگ بھی کاٹ دی گئی لیکن بیماری

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پورے جسم میں سرایت کر چکی تھی۔ لاہور کے شیخ زید ہسپتال میں تھے جب ان کی ٹانگ کاٹی گئی' مجھے لاہور سے کسی دوست کا میسج آیا میں نے ڈاکٹر ناز کے فون پر کال کی، نمبر اٹینڈ نہ ہوا تو میں نے ایک ایس ایم ایس کر دیا اور اُن کی خیریت دریافت کی۔ ایس ایم ایس کا بھی فوری جواب نہ آیا لیکن اُس سے اگلے روز دوپہر کے وقت ڈاکٹر ناز کا محبت بھرا جواب آیا جس میں خیریت دریافت کرنے پر شکریہ ادا کیا گیا۔ ناز صاحب سراپا محبت تھے، سب کے ناز اٹھانے والے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ناز ڈاکٹر مسکین حجازی کی لڑی کے چند آخری موتیوں میں سے ایک تھے۔ ڈاکٹر مسکین حجازی سے بہت سے لوگوں نے بہت کام لئے۔ کچھ چاپلوسی بھی کرتے رہے' کچھ خوشامد' لیکن ڈاکٹر مسکین حجازی کا کمال تھا کہ وہ ہر کسی کے لئے خیر کثیر تھے انہیں جن کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوتا کہ یہ صرف کام نکلوانے کے لئے دائیں بائیں پھر رہے ہیں وہ اُن کے کام بھی کر دیتے۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز بھی ہر کسی کے لئے موجود ہوتے۔ یوں لگتا وہ سب ہی کے دوست تھے۔ جب ہم پنجاب یونیورسٹی میں ماسٹرز کر رہے تھے تو ناز صاحب یونیورسٹی کے پبلک ریلیشنز آفیسر تھے اور ایک آدھ مرتبہ ڈاکٹر شفیق جالندھری نے اُنہیں ہماری کلاس کو 'تعلقاتِ عامہ' پر لیکچر دینے کے لئے بھی مدعو کیا۔ اُن کا سٹائل ایسا تھا کہ پیریڈ کا وقت 'ہنسی خوشی' گزر جاتا۔ پھر جب وہ پی ایچ ڈی کر رہے تھے تو گوجرانوالہ کے کسی صاحب کے کتب خانے تک اُنہیں Access درکار تھی۔ جو صرف اُس وقت کے ڈی جی لائبریریز عبدالجبار شاکر کے ذریعے ممکن تھی۔ کالم نگار توفیق بٹ اُن دنوں چودھری اقبال جو وزیرِ تعلیم تھے کے سٹاف آفیسر تھے، اس نے چودھری صاحب سے کہہ کر میری ڈیوٹی بھی چودھری صاحب کے ساتھ لگوا رکھی تھی کیونکہ مجھے سی ایس ایس کے پیپرز دینے تھے اور لاہور میں رہنا تھا۔ ہم لوگ چونکہ چلڈرن کمپلیکس میں قائم دفتر میں بیٹھتے تھے تو شاکر صاحب سے اکثر وہاں ملاقات ہوتی۔ میں نے شاکر صاحب سے سفارشی چٹ حاصل کر کے ڈاکٹر احسن اختر ناز کے حوالے کی۔ اب عبدالجبار شاکر بھی اس دنیا میں نہیں ہیں اور ڈاکٹر احسن اختر ناز بھی نہیں رہے۔

دلدار بھٹی فوت ہوئے تو الحمراء ہال میں ہم سخن ساتھی نے اُن کی یاد میں تقریب منعقد کی سب نے اُنہیں یاد کیا' لیکن حنیف رامے مرحوم نے بڑی خوبصورت باتیں کیں اور کہا' آج دلدار نوں روندے اؤ اونہوں کِنا کوں جا کے مل دے سؤ' ان کا مطلب تھا کہ جو آج آپ کے پیارے ہیں اُنہیں جا کر ملیں' اُن سے رابطے میں رہیں کل خدانخواستہ وہ نہیں رہیں گے تو اُن کے لئے رونے کا کیا فائدہ؟ دلدار بھٹی تو سب کا دلدار تھا۔ اُنہیں لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز کی رحلت کی خبر لوگوں پر پہاڑ بن کر گری۔ اُنکے سیکڑوں دوست اور شاگرد غمزدہ تھے۔ احسن اختر ناز ایک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ادبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے والدِ گرامی جناب مجذوب چشتی مرحوم بہت زبردست شاعر تھے۔ اُن کی مزاحیہ شاعری اور منفرد انداز میں اُسے پیش کرنے کا ہنر اُنہی کا خاصہ تھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کی رہائشی کالونی میں اپنے پی آر او بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ توفیق بٹ اور میں اُنہیں کسی تقریب کا دعوت نامہ دینے جاتے تو وہ بغیر چائے پیئے نہ آنے دیتے۔ اُس وقت چائے کا مزہ اور بھی دوبالا ہو جاتا جب پنجاب یونیورسٹی کے پی آر او احسن اختر ناز ہاتھ میں چائے بسکٹ کی ٹرے اٹھائے ہوئے اپنے والد کے دوستوں (جو عمر میں احسن اختر ناز سے ظاہر ہے چھوٹے ہی تھے) کو چائے پیش کرتے۔ وہ اپنے والد سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُس کا صلہ اُنہیں یوں ملا کہ آج اُن کے سیکڑوں سٹوڈنٹس اُنہیں یاد کر کے اُن کے لئے مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں۔ یہی صدقہ جاریہ ہے جو اس دنیا سے جانے کے بعد اُن کے کام آئے گا۔

میرا 2013 میں اوپن یونیورسٹی میں ایم فل ماس کمیونیکیشن کے لئے Viva تھا۔ میں جب کمیٹی کے سامنے پیش ہوا تو احسن اختر ناز (جو کسی اور سٹوڈنٹ کے Viva کے لئے آئے ہوئے تھے لیکن وہ بھی اندر ہی تھے) کو بھی کمیٹی ممبر کے طور پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر فوراً سیٹ سے اٹھے اور بغلگیر ہوئے اور اندر بیٹھے ہوئے کمیٹی ممبران سے کہا، آپ نے اتنے سینئر رائیٹر، کالم نگار، شاعر اور صحافی کو ابھی تک ایم فل کی ڈگری نہیں دی ہوئی اور ساتھ ہی مخصوص سٹائل میں ایک دو جملے بھی پھینکے جس سے ماحول خوشگوار ہو گیا۔ موقع چاہے کوئی بھی ہو وہ کبھی کسرِ نفسی سے کام نہ لیتے اور وہ جو کہنا چاہتے برملا کہہ دیتے۔ ایسے لوگ یقیناً معاشرے میں خال خال تھے جو ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں۔ کسی نے اُن کی رحلت کی خبر پر کمنٹ کیا تھا کہ یہ ایک جنریشن کے جانے کا ٹائم ہے اور لوگ ایک ایک کر کے جا رہے ہیں۔ احسن اختر ناز کا شمار شائد ابھی جنریشن کے اُس گروپ میں نہیں ہوتا تھا کہ جن کو جانا ہے لیکن بیماری اور موت کب کسی کو پوچھ کر آتے ہیں جب یہ آتے ہیں اور آ کر چلے جاتے ہیں تو پیچھے رہ جانے والوں کو صدمے سے نڈھال کر دیتے ہیں اور عمر بھر کی تشنگی دے جاتے ہیں۔

بس باتیں چھڑتی ہیں تو ذہن میں کیا کیا یادیں تازہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ صحافت اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان میں دوستیاں بھی رہتی ہیں اور دشمنیاں بھی۔ صحافیوں اور سیاست دانوں میں تند و تیز جملوں کے تبادلے ہوتے ہیں تو کبھی کبھار شدید الزامات کی بوچھاڑ بھی ہو جاتی ہے۔ شاید 1999 کی بات ہے، آواری ہوٹل میں ملت پارٹی کے سربراہ سابق صدر فاروق لغاری کی پریس کانفرنس تھی راقم اُردو نیوز کے لاہور میں رپورٹر کی حیثیت سے کانفرنس کور کرنے کے لئے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

موجود تھا کہ جناب فاروق لغاری مرحوم نے کہا جن سیاستدانوں نے کرپشن کی ہے انہیں سمندر میں پھینک دینا چاہئے۔ اس پر سینئر صحافی برادرم سلمان غنی جوان دنوں شائد نوائے وقت سے منسلک تھے نے فوراً کہا پھر تو سارے سیاستدانوں کو سمندر میں پھینکنا پڑے گا۔ یہ جملہ جناب لغاری کے لئے بہت اچانک اور اچنبھا تھا۔ انہوں نے ذرا سا توقف کرتے ہوئے کہا، ہاں پھر تو بہت سے صحافیوں کو بھی اس پاداش میں سمندر میں پھینکنا پڑے گا۔ اس پر پریس کانفرنس میں موجود صحافی حضرات نے بھی ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

ایک اہم شخصیت نصر اللہ غلزئی بھی یاد آرہے ہیں۔ انہوں نے 15 مارچ 2009ء کو اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ نصر اللہ غلزئی مرنجاں مرنج طبیعت کے حامل، کھل کر قہقہہ لگانے والے اور بروقت جملہ کسنے والی ایک ایسی شخصیت تھے جو جلد ہی لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ وہ اخبار، ریڈیو، ٹی وی سمیت ہر میڈیم پر گہرا تجربہ رکھتے تھے ہفت روزہ زندگی اور ہفت روزہ تکبیر کے ساتھ رہے۔ پھر ثروت جمال اصمعی نے جب تکبیر گروپ سے الگ ہو کر کراچی سے ایک میگزین جاری کیا تو آپ اس کے لیے بھی لکھتے رہے۔ اس سے قبل ایک عرصہ تک وہ نوائے وقت میں لکھتے رہے۔ پنجاب یونیورسٹی شعبہ صحافت میں ہمارا سیشن 91-1989 تھا۔ تو انہوں نے کچھ عرصہ ہمیں ہمیں بطور وزیٹنگ پروفیسر پڑھایا تھا، یوں زمانہ طالب علمی سے ہی ان کے ساتھ ہمارا احترام کا تعلق پیدا ہو گیا جس میں مزید گہرائی تب پیدا ہوئی جب دسمبر 97ء میں پنجاب حکومت کی جانب سے ایشیائی ترقیاتی بینک کے ایک پراجیکٹ کو بند کئے جانے پر سینکڑوں لوگ بے روزگار ہو گئے تو ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں وہاں آڈیو یژول آفیسر تھا۔ انہی دنوں میرے ایک کلاس فیلو اور دوست ریاض الحق نے بتایا کہ لاہور میں ''اردو نیوز'' جدہ کے رپورٹر کی اسامی خالد منہاس کے جدہ جانے سے خالی ہوئی ہے۔ میں نے رؤف طاہر (مرحوم) جو خود بھی اردو نیوز کے آفس کے لیے سلیکٹ ہو چکے ہیں سے بات کر لی ہے اور نصر اللہ غلزئی صاحب جو بیورو چیف ہیں کہہ رہے ہیں کہ جلدی سے سی وی دے دیں تاکہ وہ اسے جدہ نیوز کے پاکستان بیورو چیف مقصود یوسفی کے ذریعے جدہ بھجوا سکیں۔ معروف اینکر جنید سلیم بھی ان دنوں اردو نیوز جدہ کے سعودی عرب آفس کے ساتھ منسلک تھے جبکہ اسلام آباد میں سعود ساحر بیورو چیف اور خالد عظیم رپورٹر تھے۔ بہرکیف نصر اللہ غلزئی صاحب کو مزنگ میں واقع اردو نیوز جدہ کے بیورو آفس میں سی وی دینے گیا تو انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا اور بہت خوش ہوئے۔ غلزئی صاحب نے کہا کہ یہ اپروول آتی رہے گی، آپ کل سے دفتر آنا شروع کر دیں۔ یوں میں اردو نیوز جدہ کے ساتھ منسلک ہو گیا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اردو نیوز جدہ میں میری تنخواہ چھ ہزار روپے تھی جبکہ میں اس وقت ایک مقامی اخبار میں پانچ ہزار روپے لے رہا تھا۔ یوں پورے ایک ہزار روپے کا فرق تھا جو ظاہر ہے میرے لیے بہت اچھا تھا۔ خیر میں نے اردو نیوز جدہ میں کام کرنا شروع کر دیا لیکن میرے ذہن میں جو ایک ''بیورو چیف'' اور ''باس'' کا تصور تھا نصر اللہ غلزئی صاحب اس سے قطعی مختلف نکلے۔ ان کی شخصیت اور کام کرنے کا انداز ہ یقیناً میرے لیے رہنمائی کا باعث تھا۔ وہ کبھی میری لکھی ہوئی خبر کی تصحیح نہ کرتے اور کہتے'' آپ لگن سے کام کرتے ہیں،آپ خبریں کراچی آفس بھجوادیا کریں''۔ میرے پاس چونکہ موٹر سائیکل نہیں تھی تو میں اکثر ان کی موٹر سائیکل پر ان کے ساتھ کسی پریس کانفرنس یا تقریب میں جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک فائیو سٹار ہوٹل کے باہر وہ موٹر سائیکل سٹینڈ پر کھڑی کر رہے تھے تو سٹینڈ والا لڑکا بھاگتا ہوا آیا کہ سر جی ٹوکن لے لیں۔ میں نے اسے انتہائی شائستگی سے بتایا کہ ہم صحافی ہیں اور آپ کے ہوٹل نے صحافیوں کے لیے الگ پارکنگ بنائی ہوئی ہے، لہذا ٹوکن کس بات کا؟ اس پر نصر اللہ غلزئی صاحب فورا بولے ''نہیں یار، میں موٹر سائیکل صحافیوں والے حصے میں کھڑی نہیں کرتا، ادھر یعنی نارمل پارکنگ میں ہی کھڑی کروں گا اور ساتھ ہی انہوں نے پانچ روپے لڑکے کو تھما دیے۔ پھر مجھے کہنے لگے: ''یوسف صاحب، اگر ہم صحافت میں اتنے سال گزارنے کے بعد بھی پانچ روپے نہیں خرچ کر سکتے تو پھر کیا فائدہ؟۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ کسی طرح وہ خوامخواہ کے ''صحافتی فوائد'' سے گریز کرتے۔ ان کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی ضروریات کا بھی خیال رکھتے۔

ایک دن مجھے کہنے لگے کہ اردو میگزین کے لیے آپ ادبی شخصیات کے انٹرویوز کر کے بھجوایا کریں۔ یوں میں نے ان کے حکم پر سب سے پہلے امجد اسلام امجد جو اس وقت ''اردو سائنس بورڈ '' کے چیئرمین تھے کا انٹرویو کیا۔ جب یہ انٹرویو جدہ بھجوانے لگا تو کہتے لگے کہ اگر آپ اپنے نام سے بھجوائیں گے تو وہ آپ کو اس کا معاوضہ نہیں دیں گے کہ یہ انٹرویو ہمارا اپنا رپورٹر کر رہا ہے تو اضافہ معاوضہ کس بات کا؟ جبکہ میں جانتا ہوں کہ اس میں آپ کی ''ایکسٹرا ایفرٹ'' بھی صرف ہوئی ہے تو آپ کو کچھ مالی فائدہ تو ہونا چاہیے لہذا آپ ان انٹرویوز کو کسی قلمی نام سے بھجوا دیا کریں تا کہ چیک اس کے نام سے آیا کرے۔ میں نے کہا کہ لیکن ''قلمی نام کا بینک اکاؤنٹ کیسے کھلواؤں''؟ اس پر وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ یار کسی دوست کے نام سے بجھوا دیا کریں۔ یوں میں نے امجد اسلام امجد، بشریٰ رحمٰن، اصغر ندیم سید اور مزاح نگار یونس بٹ کے انٹرویوز اپنے ایک دیرینہ دوست ناصر محمود کے نام سے بجھوائے جو شائع ہوئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جدہ میں بیٹھی ہوئی ٹیم نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

امجد اسلام امجد کے انٹرویو کی تعریف کی اور اس کا معاوضہ ایک ہزار روپے بھجوا دیا۔ اب ہوا یہ کہ نصر اللہ غلزئی صاحب نے جدہ والی ٹیم میں سے کسی دوست کو رزدارانہ انداز میں کہہ دیا کہ یار یہ انٹرویو نگار ہے تو اپنا یوسف عالمگیرین ہی، یہ ویسے کسی دوست کے نام پر انٹرویوز بھجوا رہا ہے۔ یوں جب اگلی بار انٹرویو کے لیے چیک آیا تو وہ پانچ سو روپے کا تھا جو یقیناً میرے لیے اچنبھے کی بات تھی۔ یوں میں نے چند انٹرویوز کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ اس پر وہ اکثر مسکراتے اور کہتے کہ یار غلطی ہوگئی، مجھے اس دوست کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔

میں 2000ء میں انٹر سروسز پبلک ریلیشنز (تعلقات عامہ پاک فوج) گیا تو یہاں لاہور سے جو شخص سب سے پہلے مجھے ملنے کے لیے تشریف لائے وہ یہ نصر اللہ غلزئی صاحب تھے۔ وہ جب بھی پنڈی آتے تو مجھ سے ضرور ملتے۔ بعد میں وہ پاکستان ریلویز ہیڈ کوارٹرز لاہور میں ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز ہو گئے۔ نصر اللہ غلزئی مرحوم ایک عظیم انسان تھے۔ ہمیشہ اپنے ملک اور نظریے کے ساتھ جڑے رہے۔ 1999ء جب بھارتی وزیر اعظم واجپائی لاہور آئے اور گورنر ہاؤس میں تقریب تھی تو بھارتی قومی ترانے پر جب سب لوگ کھڑے ہو گئے تو نصر اللہ غلزئی اپنے ایک دوسرے ساتھی صحافی سمیت بیٹھے رہے ۔ جیسے ہی ترانہ ختم ہوا تو امریکہ سے آئی ہوئی ایک بھارتی خاتون صحافی بھاگتی ہوئی غلزئی صاحب کے پاس پہنچی اور کہنے لگی کہ آپ ترانے پر کیوں کھڑے نہ ہوئے؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ میں بھارت کی انسانیت سوز اور پاکستان مخالف پالیسیوں کی وجہ سے اس کی بالکل عزت نہیں کرتا۔ صحافی نے پوچھا کیا آپ 47ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے؟ وہ بولے کہ ہاں میں اپنے خاندان کے متعدد افراد کے خون کی قربانی دے کر یہاں پہنچا تھا۔ اس کے بعد اس امریکی صحافی نے ایک امریکی اخبار میں غلزئی صاحب کا نام لکھ کر یہ رپورٹ شائع کی تو احساس تفاخر کے ساتھ غلزئی صاحب مجھے وہ رپورٹ دکھاتے ہوئے بہت خوش ہو رہے تھے۔

صحافت میں بہت سے لوگوں سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ کئی لوگوں کے ساتھ باقاعدہ کام نہیں کیا لیکن اُن کے تجربات اور رویوں سے آگاہی حاصل کی۔ لاہور کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ایک تقریب میں جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کے ہمارے سینیئر اور ہم جونیئرز گئے ہوئے تھے وہاں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر زیڈ اے سلہری سے ملاقات ہوئی۔ لڑکے ایک دائرے کی شکل میں اُن کے آس پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے اچانک سوال کیا:

Why are you doing Journalism to become PRO?,

میں نے فوراً کہا:

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Sir we are doing Journalism to become Z.A. Sulehri

اس پر انہوں نے میری طرف دیکھا اور مسکرائے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر اُن کے ساتھ ہوٹل کی لابی میں بیٹھا رہا۔ انہوں نے مجھے کیولیری گراؤنڈ میں واقع اپنے گھر کا فون نمبر اور ایڈریس بھی دیا کہ کبھی آیئے گا۔ میں نے ایک دفعہ فون کیا کہنے لگے آج اسلام آباد کے لئے نکل رہا ہوں دو چار دن میں واپس آ جاؤں گا پھر آپ ضرور تشریف لایئے گا۔ اُن کا تعلق موضع دیولی تحصیل شکرگڑھ (ضلع سیالکوٹ اب نارووال سے تھا۔) میجر جنرل (ریٹائرڈ) اے جی ممتاز جو میر نانی اور دادی دونوں کے فرسٹ کزن تھے نے راولپنڈی میں ملاقات کے دوران مجھے بتایا کہ زیڈ اے سلہری میری (جنرل صاحب) والدہ کی طرف سے ہماری برادری ہی کے تھے۔ پھر خود ہی بتانے لگے زیڈ اے سلہری نے بہت شفاف صحافت کی ہے۔ مال و دولت کے پیچھے نہیں لگے۔ میں نے کسی جگہ اُن کی بیٹی کا مضمون پڑھا جو انہوں نے اپنے والد زیڈ اے سلہری کے حوالے سے لکھا تھا کہ جب میری شادی تھی تو والدہ نے اُن سے پیسوں کا تقاضا کیا کہ اتنے خرچے ہیں، کیا ہوگا؟۔ اس پر انہوں نے کہا بس جو ہمارے پاس ہے اُسی کے اندر رہتے ہوئے فرض کی ادائیگی کرو۔ پیسے کی فراوانی بیٹیوں کے اچھے مستقبل کی ضمانت نہیں ہوا کرتی۔ زیڈ اے سلہری مرحوم جیسے صحافی جنہوں نے صحافت کو مشن سمجھ کر کیا ہو ہمیشہ ''ہانٹ'' کرتے ہیں۔

دورِ حاضر کا ایک موضوع سوشل میڈیا ہے۔ سوشل میڈیا آج سب سے زیادہ ڈسکس کیا جاتا ہے۔ میری اس کے متعلق رائے یہ ہے کہ سوشل میڈیا ایک پاور ہے۔ پہلے صرف پرنٹ میڈیا تھا۔ الیکٹرانک میڈیا کی مشروم گروتھ ہوئی تو یوں محسوس ہوا جیسے انفارمیشن کا ایک طوفان بپا ہو گیا ہے۔ بریکنگ نیوز کا کلچر چل نکلا۔ خبر ٹھیک نکل آئے تو اچھی بات۔ دوسری صورت میں چپکے سے بریکنگ نیوز کا ٹکر غائب کر دیا جاتا ہے۔ لیکن سوشل میڈیا جب سے آیا ہے اور جس طرح سے ہمارے ہاں سوشل میڈیا کا استعمال کیا جا رہا ہے اُس سے لگتا ہے ہمارا معاشرہ سوشل میڈیا کے اس فلڈ کے لئے تیار نہیں تھا۔ سوشل میڈیا پر ایک افراتفری اور آپا دھاپی دکھائی دیتی ہے۔ کوئی کسی کی نہیں سُن رہا۔ ہر کوئی اپنی دہائی جا رہا ہے۔ جس طرح سے ہمارے معاشرے کی سیاسی و سماجی روایات تبدیل ہوئی ہیں سوشل میڈیا بھی اُس کا عکاس دکھائی دیتا ہے سیاست میں رواداری، اعتدال اور برداشت کا عنصر موجود تھا۔ اب کچھ عرصے سے ایک دوسرے کی تذلیل اور تحقیر کا کلچر آ گیا ہے بلکہ باقاعدہ پنپ گیا ہے اس کے اثرات جہاں زندگی کے دیگر پہلوؤں پر پڑے ہیں وہاں سوشل میڈیا بھی اس سے نہیں بچ سکا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میری شادی جنوری 1995 میں ہوئی، میری وائف میری سیکنڈ کزن ہے۔ ان کی والدہ مرحومہ، میری مرحومہ والدہ اور والد صاحب (جو ماشاء اللہ بقیدِ حیات ہیں) کی خالہ کی بیٹی ہیں۔ میری مسز نے لاہور کالج فار ویمن سے ایم اے اسلامیات کیا تھا بعد ازاں بی ایڈ کیا۔ وہ ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہیں۔ میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بڑی بیٹی اسلام آباد کی یونیورسٹی سے بی ایس انگریزی کر رہی ہے جبکہ چھوٹی بیٹی ایف ایس سی کے بعد ابھی ایم ڈی کیٹ اور داخلے کے دیگر امتحانات دے رہی ہے۔ بیٹے نے ابھی حال ہی میں میٹرک کیا ہے اور انشاء اللہ آگے کسی کالج میں داخلہ لے گا۔ شادی ظاہر ہے ایسا ایونٹ ہوتا ہے کہ دوستوں کو بلایا جانا دُلہن کی سائیڈ سے لوگوں کو بلانے سے بھی زیادہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ میں نے شادی کارڈ کے ساتھ سیالکوٹ سے گاؤں پہنچنے تک کے لئے نقشے کی ایک کاپی بھی لف کی ہوئی تھی اور اس میں بارش کی صورت میں متبادل راستے کا روٹ بھی دیا ہوا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا میرے ولیمے پر واقعتاً بارش ہوگئی اور وہ بھی موسلا دھار بارش ہوئی۔ لاہور سے میرے کلاس فیلو اویس باجوہ، جونیئر علی رضا اُسی بارش میں "تِلکن" سے بچتے ہوئے پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ لائیوسٹاک ڈویلپمنٹ پراجیکٹ کے میرے دوستوں کا پروگرام بارش کی نظر ہوگیا، ڈاکٹر اقبال انجم بہرحال اپنے اہلِ خانہ سمیت ایک دن پہلے پہنچ گئے۔ ان کی فیملی اب ماشاء اللہ کینیڈا میں سیٹل ہے اور بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بہترین جابز کر رہے ہیں۔ دوستوں کی مین کھیپ برادرم توفیق بٹ لے کر آئے، انہوں نے اور بھائی جان طارق فاروق نے لاہور سے باقاعدہ ایک کوسٹر کروائی۔ اُن کا سیالکوٹ تک تو سفر یقیناً اچھا رہا لیکن جیسے وہ گاؤں والی سڑک کی طرف مُڑے اور پھر نہر کے کنارے کنارے کوسٹر مڑی اور تیز بارش کی وجہ سے دو تین مرتبہ کوسٹر پھسلی تو ڈرائیور کا صبر جواب دے گیا۔ اُس نے اُنہیں انتہائی مؤدبانہ گزارش کی کہ آپ اِدھر ہی اُتر جائیں میں آپ سے کرایہ بھی نہیں لیتا۔ اگر کوسٹر کو کچھ ہوگیا تو میں لاہور جا کر مالک کو کیا جواب دوں گا۔ بہرطور لاہور سے برادرم توفیق بٹ، بھائی جان طارق فاروق، بھابھی نازلی طارق، وقاص طارق (اب روزنامہ جہاں کے ایڈیٹر) آپا ریحانہ علیم مشہدی اور بہت سے دیگر دوست مجھے ان سب کو دیکھ کر دِلی مسرت ہوئی لیکن ظاہر ہے بارش کا ہونا نہ ہونا اور پھر کتنی ہونا اور کتنی نہ ہونا اس میں قدرت کا اختیار ہے۔

دوستوں کے لئے بہرطور گاؤں تک کا سفر ایک زحمت اور ایڈونچر بن گیا تھا۔ آج کل تو دیہاتوں میں ہر جگہ پکی سڑکیں بنی ہوئی ہیں زندگیاں آسان ہوگئی ہیں۔ تب حالات مختلف تھے۔ یوں وہ دوست جو اچھے موسم میں گاؤں کی ہریالی، نہریں اور درختوں سے بھرپور ماحول دیکھ کر خوش

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوتے وہ بارش کی صورت میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ گاؤں کی بعض بزرگ عورتوں نے مجھ پر یہ بھی ''الزام'' لگایا کہ بچپن میں جو بچے' ہانڈی چاٹتے' ہیں اُن کی شادی پر بارش ہوتی ہے۔ حالانکہ میں اوائل عمری اور پھر یونیورسٹی تک زیادہ ہاسٹل ہی میں رہا، وہاں میس کے چاچے'' ہانڈی چاٹنے '' والی یہ سہولت میسر نہیں ہونے دیتے۔ ان سے تو دوسری مرتبہ'' گریوی'' لینی مشکل ہو جاتی ہے۔ ہانڈی یا پتیلے کے قریب وہ کہاں جانے دیتے ہیں۔ بہر کیف یہ زندگی کے مختلف رنگ ہیں جو بعض ایونٹس کو یادگار بنا دیتے ہیں۔ آخر میں میری ایک غزل پیش خدمت ہے کہ۔

کیوں اتنی رکاوٹیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ
بے وجہ عداوتیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ

میرے اور اُس کے بیچ کہنے کو کچھ نہیں
چند ایک وضاحتیں ہیں میرے اور اس کے بیچ

راتوں کو ہوئی اس پہ اُٹھ اُٹھ کے شاعری
چند غزلی عبادتیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ

کچھ اس سے زیادہ کا تو دعویٰ نہیں مجھے
بیتی رفاقتیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ

گو ظاہراً تو آئی قیامت کوئی نہ پر
ہر دم قیامتیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ

سوچیں الگ تھیں، پھر بھی اکٹھے چلے تھے یوسفؔ
صدہا مسافتیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ

میری اب دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شخصی خاکوں پر مبنی کتاب خوش باشیاں 2008 میں شائع ہوئی جبکہ پنجابی شاعری کی کتاب' سُفنے' 2018 میں شائع ہوئی۔ پانچ کتابوں کے مسودے تیار ہیں۔ ان میں طنز و مزاح پر مبنی مضامین کی کتاب بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ میری شدید خواہش ہے کہ میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنی بھرپور طور پر یادداشتیں قلمبند کروں۔ میرے یادوں میں بہت سے تلخ و شیریں واقعات و حالات محفوظ ہیں جو ظاہر ہے وقت آنے پر ہی پیش کر سکوں گا۔ فی الوقت نہیں۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں چیف ایڈیٹر قومی ڈائجسٹ جناب مجیب الرحمٰن شامی، سینئر ایڈیٹر خالد ہمایوں صاحب اور آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرا اس قدر ''طویل انٹرویو'' کر ڈالا۔ آپ گزشتہ ایک سال سے جس مستقل مزاجی کے ساتھ اس ''نیک کام'' کے لیے میرے پیچھے پڑے رہے، میں اس ہمت پر آپ کو داد دیتا ہوں۔ اگر آپ بار بار اصرار نہ کرتے تو یقین جانیے کہ میں کبھی بھی اس انٹرویو کے لیے اتنا وقت نہ نکال پاتا۔ آپ سے ملاقات بھی نہایت خوشگوار رہی۔ میں ادارہ قومی ڈائجسٹ کے آپ تمام دوستوں کے لیے دعا گو ہوں۔ (قومی ڈائجسٹ۔ دسمبر 2021ء)

❖ ♌ ❖ ♌ ❖

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ادیب، کالم نگار، سول افسر

امیر نواز نیازی

کا سفرِ زیست

جناب امیر نواز نیازی ادب اور صحافت کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ ''گر تو برا نہ مانے'' کے عنوان سے فکاہیہ کالم لکھتے رہے۔ ان کا تعلق خطہ مردم خیز میانوالی سے ہے۔ انہوں نے اس وقت قومی اخبارات میں اپنے سحر طراز کالم کے ذریعے قارئین کا ایک وسیع حلقہ قائم کیا جب عطاء الحق قاسمی، وقار انبالوی اور عبدالقادر حسن جیسے قد آور کالم نگاروں کا طوطی بول رہا تھا۔ امیر نواز نیازی اپنے کالم میں مختلف قومی، سیاسی اور سماجی مسائل کو طنز و مزاح کا ''تڑکا'' لگا کر پیش کرتے تو قاری متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ سعد اللہ شاہ کے بقول: ''نیازی صاحب کے ہاں شگفتگی، برجستگی، طنز و مزاح اور بے ساختہ پن بدرجہ اتم موجود ہے اور خاص طور پر ان کی حب الوطنی حرف حرف سے ہویدا ہے۔ ان کا شمار ان چند لوگوں میں ہوتا ہے جو ملک کے حالات پر کڑھتے ہیں اور بے چین رہتے ہیں کہ ان کا اپنا لہو اس مٹی میں شامل ہے''۔ گزشتہ دنوں مجھے امیر نواز نیازی سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا تو پتا لگا کہ لاہور ہی میں مقیم ہیں لیکن اب بینائی کا نور گم ہونے سے لکھنا پڑھنا چھوڑ چکے ہیں۔ میں حاضرِ خدمت ہوا تو وہ ایسے پرتپاک انداز میں ملے کہ یوں لگا جیسے ان سے برسوں سے میل ملاقات ہے۔ اب تک ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کالم کے وسیلے سے انہیں چاہنے والوں کا ایک وسیع حلقہ میسر آیا ہے۔ نیازی صاحب کے ساتھ دو طویل نشستوں میں ان کی رودادِ زندگی قلمبند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے سوالات یوں ترتیب دیے کہ جواب میں مربوط یادداشتوں کی ایک کہکشاں سی بن گئی ہے۔ امید ہے اس کی تابانی سے قارئین ضرور لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

میں مؤرخہ 28 نومبر 1933ء کو میانوالی کے ایک گاؤں بلوخیل میں پیدا ہوا۔ میرا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ میرے والد صاحب کا نام رب نواز خان نیازی تھا جو پورے علاقہ میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سب سے تگڑے زمین دار تھے، علاقہ بھر میں انہیں نہایت عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ باوجود اس کے کہ میانوالی میں جائیدادوں کے تنازعات اور قتل و غارت گری کا معمول تھا لیکن ہمارے والد صاحب نے نہایت شریفانہ طبیعت پائی تھی اور کبھی کسی جھگڑے میں نہیں پڑے تھے۔انہوں نے ہماری تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ والد صاحب کا انتقال 1984ء میں ہوا۔ بلوخیل میں ہماری چار ہزار کنال زمین تھی جو چشمہ بیراج پاور پراجیکٹ میں آ گئی تھی اور اس کے عوض ہمیں علاقہ بیتو کلور کوٹ میں زرعی رقبہ الاٹ کیا گیا جہاں پر میرا اب زرعی فارم ہے۔ میرا بچپن اپنے علاقہ میں گزرا۔ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی اور 1949ء میں گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی شہر سے میٹرک اور 1952ء میں گورنمنٹ اصغر مال کالج راولپنڈی سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔
انہی دنوں میانوالی میں گورنمنٹ کالج بنا تو میں میانوالی آ گیا اور یہاں سے گریجوایشن کیا۔اس کے بعد پشاور یونیورسٹی سے ایم اے پولیٹیکل سائنس کے لیے داخلہ لیا اور چند ماہ بعد ہی پنجاب پبلک سروس کمیشن کی طرف سے سپیریئر فاریسٹ سروس کا اشتہار نظر سے گزرا تو میں نے بھی درخواست دے دی اور سلیکٹ ہو گیا۔ 1958ء میں فاریسٹ کالج اینڈ انسٹی ٹیوٹ ایبٹ آباد میں جس روز میری تربیت مکمل ہوئی اور میں پاس آؤٹ ہوا اسی دن فیلڈ مارشل ایوب خان نے ٹیک اوور کر کے پاکستان میں پہلا مارشل لائی راج قائم کیا۔

میں اللہ کا لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے بچپن سے اب تک میرے حصے میں صرف کامیابیاں اور کامرانیاں ہی لکھیں۔ ہم نے آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر میں خوشحالی دیکھی۔ جس وقت میں پڑھتا تھا تو میرا شمار ٹاپ سٹوڈنٹس میں ہوتا تھا۔ گھومنا پھرنا اور جنگلوں کی سیر کرنا مجھے بہت پسند تھا اور اللہ کا کرم دیکھیں کہ مجھے نوکری بھی ایسی ملی جس میں جنگلوں کی سیاحت ہی سیاحت تھی۔ میں نے محکمہ جنگلات کی سروس کے دوران مشرقی اور مغربی پاکستان کے بہت سے قدرتی جنگلات اور ہل ٹریکس کا خوب نظارہ کیا۔ چٹاگانگ، کھلنا، کشمیر اور پاکستان کا ایک ایک جنگل دیکھا اور فطری نظاروں سے محظوظ ہوا۔ مشرقی پاکستان میں سندر بن کے جنگلوں میں مَیں نے دنیا کا مشہور ترین دھاری دار رائل بنگال ٹائیگر دیکھا، جنگلی ہاتھی اور پتہ نہیں کیا کیا جنگلی حیات دیکھیں اور قدرتی مناظر سے جی بھر کر لطف اندوز ہوا۔ مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ ایڈونچر سندر بن کے جنگلات تھے۔ یہ ایک نہ بھولنے والا سفر تھا۔

سندر بن دنیا کا مشہور ترین مینگرو (Mangrove) فاریسٹ ہے۔ مینگرو ایسے درخت یا پودے کو کہا جاتا ہے جو صرف سمندر کنارے پایا جاتا ہے اور سمندر کے نمکین پانی ہی سے اس کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

افزائش ہوتی ہے۔سندر بن فاریسٹ بھی سمندر کنارے واقع ہے جو ایک خوفناک ترین جنگل ہے۔ یہاں کا رائل بنگال ٹائیگر دنیا میں اور کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ صرف سندر بن ہی کے جنگلات کا باسی ہے۔سندر بن کی لوکیشن ایسی ہے کہ وہ خلیج بنگال کنارے واقع ہے اور سمندر میں اٹھنے والی لہروں کے مدوجزر ہی سے وہ سیراب ہوتا ہے۔ یہ خوفناک جنگل خشکی میں ہے نہ پانی میں، بس تقریباً دلدلی علاقہ ہے اور ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ (Mud) ہے کہ انسان کا وہاں چلنا محال ہو جاتا ہے۔اس کا رقبہ بھی بہت زیادہ ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ہماری رہائش ایسی تھی کہ بانسوں کے ذریعے مچان بنا کر اوپر لکڑی کی جھونپڑیاں (Huts) بنائی گئی تھیں۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ دلدلی علاقے اور خوفناک رائل بنگال ٹائیگر کے خطرے کی وجہ سے ریسٹ ہاؤس اس طرح سے تعمیر کیا گیا ہے۔ مچان پر بنی ان جھونپڑیوں میں سندر بن فاریسٹ کا سٹاف بھی رہتا تھا۔ہمیں بتایا گیا تھا کہ رات کو بہت محتاط رہنا ہے اور ڈرنا بالکل نہیں کیونکہ رات کے وقت ٹائیگرز اکثر مچان کے نیچے اور دائیں بائیں آ کر خوفناک آوازیں نکالتے اور اپنا شکار تلاش کرتے ہیں۔ہم نے میزبانوں کی اس بات کو اتنا سیریس نہیں لیا لیکن جب رات سر پر آ گئی اور ہم سونے کے لیے لیٹے تو اچانک ٹائیگرز کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں، ٹائیگرز ہمارے ریسٹ ہاؤس کے اردگرد جمع ہو کر خوفناک آوازیں نکال رہے تھے اور یہ پہلی رات بہت بھاری گزری کہ ہم کہاں موت کے منہ میں آ پھنسے ہیں۔

ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ ٹائیگر کے متعلق عام طور پر کہا جاتا تھا کہ وہ وہاں کے مقامی لوگوں اور سٹاف کو کچھ نہیں کہتا لیکن دوسرے لوگوں پر حملہ کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ جوان ٹائیگر انسان پر کبھی حملہ نہیں کرتا، صرف بوڑھا ٹائیگر ہی انسان پر حملہ کر کے اسے کھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بتایا گیا کہ بوڑھا ٹائیگر اس لیے انسان پر حملہ کرتا ہے کیونکہ وہ پھرتیلے شکار کو پکڑنے کی طاقت نہیں رکھتا اور اس عمر میں انسان ہی اس کے لیے آسان شکار ہوتا ہے۔ہم نے اپنے میزبانوں مہربانوں سے یہ بھی پوچھا کہ بوڑھے ٹائیگر کی علامت کیا ہوتی ہے، کیونکہ عام آدمی تو ایک جوان اور بوڑھے ٹائیگر میں تمیز نہیں کر سکتا تو انہوں نے بوڑھے ٹائیگر کی واضح نشانی یہ بتائی کہ اس کی دُم پر سے بال مکمل طور پر جھڑ جاتے ہیں، چنانچہ بعد میں ہم نے خود بھی مشاہدہ کیا اور ہمیں جو بھی ایسے بال جھڑے ٹائیگر نظر آتے ہم پہلے ہی محتاط ہو جایا کرتے۔ میرا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ کُھلنا اور سندر بن کے بعض ایسے خطرناک مقامات بھی ہیں جہاں آج تک انسان نے رخ نہیں کیا۔ چٹا گانگ ہل ٹریکس اور جنگلات میں خوفناک اور دیوہیکل جنگلی ہاتھیوں کے ساتھ گزرے لمحے آج بھی میرے حافظے سے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

محو نہیں ہو سکے۔ کھلنا اور سندر بن کے بعد ہم ''کپتائی فاریسٹ'' میں بھی گئے، یہ بھی قدرتی جنگل ہے اور فطرتی حسن ہر قسم کی جنگلی حیات سے لبریز ہے۔ کپتائی فاریسٹ سے یاد آیا کہ جب ہم وہاں گئے تو ''کپتائی ڈیم'' تعمیر ہو رہا تھا، یہاں یہ بتا تا چلوں کہ پورے ایسٹ پاکستان میں جہاں جہاں بھی گئے ہمیں دور دور تک کوئی گدھا نظر نہیں آتا تھا تو ہمارا ایک دوست اکثر کہا کرتا: یار! لگتا ہے یہاں گدھے کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن جب ہم کپتائی ڈیم سائٹ پر گئے تو دیکھا کہ ہر طرف گدھوں کے ہی ریوڑ نظر آ رہے تھے اور ان کے ساتھ بہت زیادہ تعداد میں جو لوگ تھے وہ پٹھان تھے۔ ہم نے ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے، پوری دھرتی پر گدھا نظر نہیں آیا اور یہاں پر ہر طرف گدھے ہی گدھے ہیں تو ان صاحب نے بڑے مزے کی بات بتائی کہ یہاں سرنگیں کھودنے کے لیے جب بنگالی مزدوروں کو کام پر لگایا گیا تو وہ بہت بری طرح ناکام ہوئے اور آخر کار مغربی پاکستان کے ایک بڑے کنٹریکٹر کو اس کام کا ٹھیکہ دیا گیا تو وہ اپنے ساتھ صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) سے بڑی تعداد میں یہ گدھے اور پٹھان مزدور لے آیا اور اب بڑی کامیابی سے اس ڈیم پر کام جاری ہے۔ یہ بھی ہمارے لیے ایک بہت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا۔

ہم 1958ء میں بذریعہ ٹرین لاہور سے امرتسر گئے اور پھر وہاں سے بذریعہ ہوڑہ ایکسپریس کلکتہ (ہوڑہ کلکتہ کا ایک گاؤں ہے) اور پھر ایسٹ پاکستان میں ''کھلنا'' تک پہنچے۔ ہمیں ایسٹ پاکستان میں ٹرین پر سفر کرتے ہوئے بار بار اتر کر ٹرین تبدیل کرنا پڑتی کیونکہ وہاں ندی نالے اتنے زیادہ ہیں اور اس قدر بارشی ایریا ہے کہ بار بار ایک ٹرین سے اتر کر دوسری پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ مشرقی پاکستان میں میرے دن بہت ہی سہانے گزرے اور جب 1971ء میں مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوا تو میرے دل پر بہت زیادہ افسردگی چھا گئی کیونکہ وہ میرے خوابوں کی سرزمین تھی، اس پر گزرے شب و روز مجھے آج بھی بہت یاد آتے ہیں اور تڑپاتے ہیں۔

جہاں تک میرے لکھنے اور پڑھنے کے ذوق کی بات ہے تو جن دنوں میں میانوالی ڈگری کالج میں گریجوایشن کر رہا تھا تو کالج لائبریری سے کتابیں لے کر ان کا مطالعہ کرتا اور پھر آہستہ آہستہ میں نے اپنا مافی الضمیر ہلکے پھلکے اشعار کی صورت میں بیان کرنا شروع کیا۔ ان دنوں میں کالج کے بلیک بورڈ یا نوٹس بورڈ پر کوئی شعر لکھ دیتا تو وہ کئی کئی دن تک کالج کے لڑکوں کی زبان پر رہتا۔ یہ شاعری اساتذہ اور کچھ دوستوں کی اشعار کے ذریعے تصویر کشی پر مبنی ہوتی جو طلبہ میں سینہ بہ سینہ آگے چلتی۔ اس دور کے بہت سے اشعار تو میں بھول چکا ہوں تاہم چند ایک یاد ہیں جن کا میں اکثر مجلسوں میں ذکر کرتا ہوں۔ ان دنوں پاکستان نیا نیا بنا تھا، پروفیسر ظہور الحسن ارزش فارسی کے ہمارے استاد تھے اور تازہ تازہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بھارت سے ہجرت کر کے آئے تھے۔اردوان کی مادری زبان تھی اور فارسی ان کا اوڑھنا بچھونا۔ بہت عمدہ اور قادرالکلام شاعر تھے، اپنا کلام ترنم سے سنایا کرتے ۔انہیں اردو کے عظیم شاعر اور ادیب جوش ملیح آبادی کا بھی قرب حاصل رہا اور ان کا ذکر جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی ''یادوں کی برات '' میں بھی نہایت محبت کے ساتھ کیا ہے۔ارزش صاحب کی آواز جہاں بے حد سریلی تھی، وہاں بینجو (میوزک انسٹرومنٹ) بجانے کے بھی بہت ماہر تھے۔ دیکھنے میں بھی وہ گورے چٹے، ورزشی بدن، خوش پوش اور خوش مزاج، ہمیشہ ہنستے مسکراتے نظر آتے۔ پان کے وہ بہت رسیا تھے اور ان کے ہونٹوں کی مستقل لالی اس کی بھرپور غمازی کرتی تھی۔طلبہ میں وہ گھل مل جایا کرتے ،گپ شپ اور ہنسی مذاق کے بھی ماہر تھے اور اسی گپ شپ میں بعض اوقات لمبی لمبی بھی چھوڑ جاتے اور پکڑائی نہیں دیتے تھے۔تو میں نے شرارت کے طور پر ان پر نظم لکھ ڈالی جو کالج بھر میں مشہور ہوئی۔انہوں نے سنی تو مسکرا کر کہا شاباش لگے رہو۔ وہ نظم اگرچہ اب میں بھول گیا ہوں لیکن اس کا ایک آدھ شعر آج بھی مجھے یاد ہے۔شعر کچھ یوں ہے ۔

یہ ہیں ارزش، سراپا ورزش، پان سے ہونٹ سجاتے ہیں
اڈلٹریشن کے ہیں ماہر، سچ میں جھوٹ ملاتے ہیں

اسی طرح ایک زیدی صاحب ہسٹری کے پروفیسر تھے، کم گو تھے اور کسی حد تک سڑیل مزاج بھی۔ بہت کم فری ہوتے تھے۔سنیارٹی کے لحاظ سے ایک قاری صاحب کالج پرنسپل تھے تو زیدی صاحب وائس پرنسپل۔جس دن قاری صاحب چھٹی پر ہوتے تو زیدی صاحب پورے کالج میں خوب رعب جماتے پھرتے۔ان دنوں کالج کے پروفیسرز عام طور پر سائیکلوں پر کالج آتے جاتے تھے اور زیدی صاحب کے پاس بھی سائیکل تھی۔ زیدی صاحب کا سائیکل پر بیٹھنے کا انداز بھی منفرد تھا۔اس طرح اکڑ کر بیٹھتے تھے جیسے کوئی بچہ اپنی سلیٹ پر''1'' کا ہندسہ لکھتا ہے۔تو ان کے متعلق میں نے جو اشعار لکھے ان میں سے مجھے جو یاد ہیں وہ یہ ہیں ۔

یہ ہیں زیدی، گھر کے بھیدی، لنکا خوب ڈھاتے ہیں
''قاری'' ہوں جو چھٹی پر تو، خوب اکڑ کر آتے ہیں
بیٹھیں جب یہ سائیکل پر تو ''ایک نمبر'' بن جاتے ہیں

یہ اشعار کسی شرارتی طالب علم نے ان کے کلاس روم کے بلیک بورڈ پر لکھ دیے تو زیدی صاحب پڑھ کر مجھ پر، بہت برہم ہوئے اور میں ایک عرصہ تک ان سے نظریں چراتا رہا۔ دوسری طرف علم وادب سے گہری محبت کی ایک بڑی تحریک مجھے نوائے وقت سے بھی ملی جو ہمارے گھر میں باقاعدہ آتا تھا اور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہمارے گھر والے اور دیگر عزیز واقارب یہی اخبار بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ یوں وقت کے ساتھ ساتھ ''نوائے وقت'' ہی میری ترجیح بن گیا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب میں نے خود کالم لکھنا شروع کر دیئے۔

بعض لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کالم نگاری ادب ہی کی ایک صنف ہے کیونکہ اکثر لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے، یوں کالم کی کوئی مستقل اور ٹھوس تعریف موجود نہیں تو اس کے متعلق میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ بس میرا کام تو تھا لکھنا اب اسے کیا نام دیا جاتا ہے تو اس کا فیصلہ ادب پر گہری نظر رکھنے والوں نے کرنا ہے۔ تاہم اتنا عرض کرتا چلوں کہ عام طور پر ایک اخباری کالم کو ''لٹریری ان ہری'' (یعنی: تیزی میں لکھا ہوا ادب) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ایک ادبی مجلس میں مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ نے ایک طویل عرصہ تک اخبارات میں لکھا، لیکن آپ کی تحریروں میں کسی خاص سیاسی جماعت یا کسی دھڑے کی حمایت کا قطعی کوئی تاثر نہیں ابھرتا، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو میں نے برملا جواب دیا کہ میرا شروع سے یہی نقطہ نظر تھا کہ مجھے صرف پاکستان ہی کے لیے لکھنا ہے اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے کالموں میں کبھی کسی جماعت کی نمائندگی کا کردار ہرگز ادا نہیں کیا۔ دراصل کالج دور ہی میں مجھ میں طنزیہ اور مزاحیہ انداز سرایت کر گیا تھا۔ اصل میں مَیں یہ سمجھتا تھا کہ اپنی جو بھی بات کروں اس شگفتہ انداز سے کروں کہ تلخی کا اس میں کوئی نام ونشان نہ ہو، جو کسی کی طبیعت پر گراں گزرے۔ بس یہی سوچ کر میں نے یہ اسلوب اپنایا اور پھر اسی پر قائم رہا۔ ڈاکٹر اجمل نیازی نے ایک بار کسی ادبی محفل میں کہا تھا کہ امیر نواز نیازی سخت سے سخت بات بھی کر جاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ جاتا ہے کہ ''گر تو برا نہ مانے''۔ اب ظاہر ہے ایسے میں برا کون مانے گا۔

میانوالی کالج کے دنوں میں مَیں نے شاعری بھی بہت پڑھی اور ناول بھی بہت پڑھے۔ شعرا میں مجھے غالب اور فیض احمد فیض نے بہت متاثر کیا اور ناول کی دنیا میں نسیم حجازی میرے اعصاب پر چھائے رہے۔ اس دور میں تقریباً ہر پڑھے لکھے گھرانے میں بچوں کے ساتھ یہی مسئلہ تھا کہ والدین نصابی کتابوں کے علاوہ کسی کتاب کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے، مجھے بھی یہی معاملہ درپیش تھا لیکن بہر حال میں نے والدین سے چھپ چھپ کر نسیم حجازی کے ناول پڑھ لیے تھے۔ کالج کی ہر قسم کی سرگرمیوں میں بھی میں نے ضرور حصہ لیا۔ مجھے تقریر کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ایک بار مجھے انگریزی میں تقریر کرنے کو کہا گیا اور جب میں روسٹرم پر کھڑا ہوا تو طلبہ نے بہت زیادہ ہوٹنگ کی جس کی وجہ سے میں تقریر نہ کر سکا۔ اسی طرح طلبہ سیاست میں مَیں نے بس اس حد تک دلچسپی لی تھی کہ ایک بار سیکرٹری جنرل کا الیکشن لڑا اور ناکام ہوا، بس پھر طلبہ سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو گیا۔

جہاں تک میرے نثری مضامین لکھنے کی بات ہے تو میں کالج کے زمانے ہی سے لکھنے لگا تھا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کالج میگزین ''سہیل'' میں لکھنا شروع کیا اور پھر اس کا ایڈیٹر بھی بنا دیا گیا۔ بعدازاں ادارہ نوائے وقت کے رسالے ''قندیل'' میں لکھا، اسی طرح دورانِ ملازمت بھی اخبارات میں کالم لکھا کرتا۔ میرا پہلا کالم 1978ء میں اس وقت نوائے وقت میں شائع ہوا جب میں نے ممتاز ادیب وقار انبالوی کے مشہور زمانہ فکاہیہ کالم ''سرراہے'' کے جواب میں تین قسطوں میں کالم لکھا اور یہ نوائے وقت میں ''دیکھتا چلا گیا'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس پر وقار انبالوی نے نہایت اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے کالم میں خوبصورت تبصرہ کیا تو میرا حوصلہ اس قدر بڑھا جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ یوں تو میں طالب علمی کے زمانہ سے لکھتا رہا تاہم 1993ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مستقل کالم لکھنا شروع کیا۔ روزنامہ جنگ سے وابستہ ہوا اور میرا کالم ''گرتو برا نہ مانے'' کے عنوان سے جلوہ گر ہوا۔ میرا یہ طنزیہ و مزاحیہ کالم روزانہ شائع ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ کالم روزنامہ خبریں اور پھر نوائے وقت میں منتقل ہوگیا۔ درمیان کے کچھ عرصہ میں مجیب الرحمٰن شامی کے اخبار روزنامہ پاکستان کے لیے بھی لکھا۔ اور سب سے آخر میں دوبارہ روزنامہ نوائے وقت سے وابستہ ہوا اور 2008ء تک نوائے وقت ہی میں لکھتا رہا۔ پاکستان اخبار میں شامی صاحب اور قدرت اللہ چودھری کے ساتھ ہماری بہت گپ شپ رہتی۔ قدرت اللہ چودھری کو میں ایک ماہر اور مستند اخبار نویس اور علم دوست شخصیت تصور کرتا ہوں۔

میں نے کالج کے زمانہ سے لے کر 2007ء تک مسلسل لکھا اور پھر میرے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوئی کہ میری بصارت جواب دے گئی اور 2008ء میں نظر بالکل ختم ہوگئی تو میں نے نوائے وقت میں آخری کالم ''جب چراغوں میں روشنی نہ رہی'' لکھا۔ اس کالم میں میں نے اپنی بیماری کے متعلق لکھا تھا کہ یہ میرا آخری کالم ہے۔ اس کالم کے چھپنے کی دیر تھی کہ کئی دن تک میرے فون کی گھنٹیاں مسلسل بجتی رہیں اور پاکستان بھر سے قارئین نے مجھے بہت زیادہ کالیں کیں اور ہر طرح کی مدد کی آفر کیں۔ اس وقت مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میرے قارئین کا حلقہ تو بہت زیادہ ہے جو ٹوٹ کر مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ان تمام رابطہ کرنے والوں سے میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ جو بیماری مجھے لاحق ہو چکی ہے اس کا علاج تو امریکہ میں بھی نہیں ہے۔ بس آپ لوگ میرے لیے دعا کیجیے۔ جب میری آنکھیں بے نور ہوگئیں تو چند اشعار میری زبان سے جاری ہوئے جواب بھی زبان پر رہتے ہیں۔ اپنی ان مختصر یادداشتوں میں ان اشعار کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عنوان ہے: ''آنکھیں جو بے نور ہوئیں''۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرے خدا، ان آنکھوں سے کیا قصور ہوا
کہ دیدارِ یار مجھ سے دور ہوا
وہ جو روٹھ گئی بینائی مجھ سے
کیوں میرا جہاں، ناگہاں بے نور ہوا
سجا رکھا تھا، جو دل میں اپنے
وہ نقش یار، چکنا چُور ہوا
وہ نظارے جو دور ہوئے، سارے
جرم تو مجھ سے کوئی ضرور ہوا
جھائی نہیں دیتا کچھ بھی مجھ کو
میرے خدا، میں کس قدر مجبور ہوا
دن بھی لگے اب رات کی مانند
کٹھن یہ راستہ میرے حضور ہوا
دکھ تو یہ ہے، دکھ چھپاؤں کیسے
یہ حادثہ تو گلی گلی مشہور ہوا
میں بھی راضی برضا ہوں نیازیؔ
کہ ایسا ہی، خدا کو منظور ہوا

مجھے جن شگفتہ اہلِ قلم نے متاثر کیا ان میں مشتاق یوسفی اور کرنل محمد خان سرفہرست ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے دور کے ایک اہم ساتھی تھے سید خورشید گیلانی (مرحوم) میں ان کی خداداد صلاحیتوں کا بھی بہت معترف تھا۔ افسوس کہ انہیں عین شباب میں موت نے آلیا۔ اسی طرح زمانہ طالب علمی میں ایک پنڈی کے استاد تھے ظہورالحسن ارزش جن کا تفصیلی ذکر پہلے کر چکا ہوں ان سے بھی دوران طالب علمی متاثر ہوا۔ سیاستدانوں میں مجھے سب سے زیادہ نواب آف کالاباغ امیر محمد خان نے متاثر کیا۔ جن دنوں میں چھانگا مانگا جنگل میں بطور فاریسٹ افسر انچارج تعینات تھا، نواب آف کالا باغ ملک امیر محمد خان گورنر مغربی پاکستان تھے۔ نواب صاحب قدرتی جنگلات کے بے حد دلدادہ تھے، ہمارے پاس اکثر و بیشتر آتے رہتے۔ نواب صاحب کے حکم پر چھانگا مانگا کو پبلک پارک کے طور پر ڈیکلیئر کیا گیا اور انہوں نے بہت زیادہ کام بھی کروایا۔ ریسٹ ہاؤس، جھیل بنوائی اور دیگر اہم ڈویلپمنٹ ہوئی۔ ایوب خان بھی آتے تھے اور دیگر بہت سارے وفاقی اور صوبائی وزراء بھی۔ اکثر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پاکستانی فلموں کی شوٹنگ بھی وہیں پر ہوتی تھی اور بہت سے فن کاروں اور اداکاروں سے واسطہ بھی پڑتا تھا۔ایک مرتبہ سنتوش کمار آئے اور خوب محفل برپا ہوئی۔ملکہ ترنم نور جہاں اور ان کا بیٹا اکبر رضوی بھی آتے اور ان کے ساتھ بہت ملاقاتیں رہیں۔نواب آف کالاباغ کے ساتھ میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ایک مرتبہ نواب صاحب نے چھانگا مانگا آنا تھا اور ہم نے ان کے استقبال کی خوب تیاری کی۔جھیل میں موجود ایک کشتی پر ہم نے رنگ روغن بھی کروایا اور زبردست ڈیکوریشن کی،ابھی یہ رنگ خشک بھی نہیں ہوا تھا کہ نواب صاحب اچانک آگئے اور سیدھے جا کر کشتی پر بیٹھ گئے،جھیل کا ایک چکر لگایا اور جب وہ کشتی سے اترے تو ان کی شیروانی پر پیچھے سے مکمل رنگ لگ گیا۔اب ہم بہت پریشان ہوئے کہ انہیں کیسے بتائیں اور کیا کریں،کیونکہ کسی کو بھی ان کے جاہ وجلال کے آگے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔آخر کار ان کے ایک ذاتی ملازم نے قوت مجتمع کر کے ذرا ہمت سے کام لیتے ہوئے نواب صاحب کو بتایا تو انہوں نے حیرت انگیز طور پر بڑے تحمل سے اپنی شیروانی دیکھی اور صرف اتنا کہا:''اوے کم بختو!میری شیروانی کی مت ماردی''۔اسی طرح میں جب بھی نواب صاحب سے بات کرتا تو کہتا:''نواب صاحب اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں،ویسے آپ کے پاس جان کی امان ہے نہیں!''تو اس پر وہ مسکرا دیتے۔وہ اچھے وضع دار انسان تھے۔انہوں نے حکمرانی کا حق ادا کیا اور عوام کے حقوق کا حتی الوسع خیال رکھا۔ایک مرتبہ نواب صاحب ہمارے پاس چھانگا مانگا جنگل آئے تو ہم نے ان کے اعزاز میں گائیگی کی ایک محفل کا انتظام کیا۔مشہور فلمی پلے بیک سنگر منیر حسین نے نواب صاحب کی موجودگی میں فیضؔ احمد فیضؔ کے یہ اشعار گانے شروع کیے:

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے ،جسم و جاں بچا کے چلے

سنگر اپنی لہر میں یہ اشعار گائے جا رہا تھا،محفل عروج پر تھی اور ہم نے دیکھا کہ نواب صاحب کے چہرے پر کئی طرح کے رنگ آجا رہے تھے۔ان کے چہرے کے تیوروں سے ہم بہت ڈر رہے تھے کیونکہ وہ اچھے خاصے مسکراتے مسکراتے اچانک سیریس ہوگئے تھے لیکن منہ سے کچھ نہ بولے۔اس کے بعد وہ جب بھی ہمارے پاس آتے تو پہلے حکم یہی دیتے کہ بھئی!کسی قسم کی تقریریں یا شعروشاعری کی محفل سجانے کی ہرگز ضرورت نہیں۔اس سے ہم نے تو خدا کا لاکھ شکر ادا کیا کہ چلو ہمارا بھی فائدہ ہوا اور اس زائد سرکاری ڈیوٹی سے ہماری جان چھوٹ گئی۔یہاں ایک اور دلچسپ بات یاد آ گئی نواب آف

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کالاباغ ملک امیر محمد خان نے گورنری کا استعفیٰ فیلڈ مارشل ایوب خان کو پیش کیا اور گھر چلے گئے تو اس کے بعد ایک دن ملک فیروز خان نون ہمارے پاس گھومنے پھرنے چھانگا مانگا آئے۔ انہوں نے میرے آفس میں آویزاں ملک امیر محمد خان کی تصویریں دیکھیں تو کہنے لگے یار! اب یہ تصویریں اتار دو کیونکہ ایوب خان کو پتہ چل گیا تو وہ تمہاری ایسی تیسی پھیر دے گا (اس بات سے ہمارے حکمرانوں اور مقتدر طبقے کی کم ظرفی کا بھی بخوبی پتہ چلتا ہے) تو میں نے جواب دیا کہ ملک صاحب! امیر محمد خان تو ایک ہسٹری ہے اور ہسٹری کو کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال میں ذاتی طور پر امیر محمد خان کو بہت ہی ایماندار اور دلیر حکمران سمجھتا ہوں۔ میں جب تک چھانگا مانگا میں رہا وہ تصویریں وہاں لگی رہیں، میرے وہاں سے چلے آنے کے بعد وہ تصویریں اتار دی گئیں۔

خامیاں اور خوبیاں تو ہر بندے میں ہوتی ہیں اور یہ بشری تقاضا بھی ہے، نواب صاحب میں خامیاں بھی یقیناً ہوں گی لیکن ان کی خوبیاں ان کی خامیوں کی نسبت بہت نمایاں تھیں۔ ایک تو وہ کرپٹ اور عیاش حکمران قطعی نہ تھے، نماز روزہ کے پابند تھے اور حیادار' وضعدار انسان تھے۔ عوام دوست تھے اور تمام سرکاری محکموں کے افسران کو کہتے کہ اپنی ذمہ داریوں پر توجہ دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نواب صاحب بہادر بھی بہت تھے۔ چھ ستمبر 1965ء کی جنگ شروع ہوئی تو لاہور میں موجود تمام افسر شاہی بھاگ کھڑی ہوئی اور گاڑیاں تیزی سے لاہور سے باہر نکل رہی تھیں، اس وقت نواب صاحب مری میں تھے اور انہیں جنرل ایوب نے کہا کہ جنگ کی وجہ سے آپ اپنا آفس عارضی طور پر جوہر آباد میں قائم کر لیں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ فوری طور پر لاہور پہنچے تو راوی پل پر میں نے خود دیکھا کہ ساری گاڑیاں لاہور سے نکل رہی تھیں اور صرف نواب صاحب کی گاڑی لاہور میں داخل ہو رہی تھی۔ انہوں نے فوراً اعلان کیا کہ کوئی بھی ملازم یا افسر لاہور سے باہر نہیں جائے گا اور تمام دفاتر معمول کے مطابق کھلیں گے اور کام کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نواب امیر محمد خان کا دور بہت یادگار تھا جو آج بھی میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی قومی ذمہ داری کا بخوبی احساس تھا اور وہ عظیم لوگ تھے۔ نواب صاحب جب بھی ہمارے پاس آتے تو ہم سیکورٹی کا خاطر خواہ انتظام کرتے۔ ایک مرتبہ نواب صاحب کہنے لگے کہ میری سیکورٹی کی فکر بالکل نہ کیا کرو کیونکہ مجھے جو بندہ بھی مارے گا وہ باہر سے نہیں آئے گا، مجھے مارنے والا کوئی اپنا ہی ہوگا تو اس قدر سیکورٹی کا تکلف کیوں اٹھاتے ہیں۔ اور جب نواب صاحب اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوئے اور مجھے اس کی خبر ملی تو میرے کانوں میں ان کی یہی بات بار بار گونجنے لگی تھی کہ ''مجھے کوئی اپنا ہی مارے گا''۔

نواب آف کالاباغ سے یاد آیا کہ جن شخصیات کے ساتھ میرا تعلق واسطہ رہا اور جن کے کردار

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نے مجھے بے حد متاثر کیا ان میں نوائے وقت کے مالک اور ایڈیٹر مجید نظامی بھی سرفہرست ہیں۔ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ مصروفیت کے باوجود مجھے وقت دیتے اور گپ شپ لگاتے، بلکہ وہ اپنے ہر ملنے والے کے ساتھ یہی برتاؤ کرتے اور ملنے والے کو قطعی طور پر اپنی مصروفیت کا نہ بتاتے کہ میں مصروف ہوں اور پھر کسی وقت آیئے، میں جب ان کے آفس جاتا، وہ کام چھوڑ کر بھرپور وقت دیتے۔ جب کبھی ان سے ملنا ہوتا انہیں اس قدر شفیق وخلیق، نرم خو اور نرم دل پایا کہ جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان کا اندازِ گفتگو دھیما، ہشاش بشاش چہرہ اور اس پر ہر وقت سکون کی کیفیت ہوتی تھی۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے زمانے میں سرکاری دفتروں میں نوائے وقت کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا تو اس پابندی کی زد میں ہمارا ادارہ بھی آیا اور میں سرکاری ملازم ہونے کے باوجود باقاعدہ یہ اخبار منگوایا کرتا۔ اس ”حکم عدولی“ پر دو تین بار میری جواب طلبی بھی ہوئی لیکن نوائے وقت اور مجید نظامی سے میرا رشتہ نہ ٹوٹ پایا۔ مجید نظامی اسلام اور پاکستان کے سچے خیر خواہ تھے۔ پاکستان ستائیسویں رمضان کو معرض وجود میں آیا تو جنابِ نظامی کی قسمت دیکھیے کہ اسی مبارک رات کو ان کی وفات ہوئی۔

شخصیات کا تذکرہ چل نکلا ہے تو یہاں پر میں میانوالی کے ایک دُرِ نایاب سید نصیر شاہ کا ذکر نہ کروں تو سخت ناانصافی ہوگی۔ شاہ صاحب معروف شاعر، نثر نگار، محقق، دانش ور اور مذہبی سکالر تھے۔ وہ میانوالی جیسے پسماندہ خطے ہی میں بیٹھے رہے۔ وہ درحقیقت گدڑی میں چھپا ایک لعل تھا۔ سید نصیر شاہ صاحب کے جدامجد شیخ المشائخ سید جلال الدین جیلانی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے۔ وہ دین کی تبلیغ کرتے کرتے دریائے سندھ کے بالائی علاقہ کچھی میں چلے آئے اور یہاں انہیں میاں علی سے پکارا جانے لگا۔ میانوالی شہر انہی کے نام منسوب ہوا۔ سید نصیر شاہ اسی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ علم اور دانش کے بحرِ بے کنار تھے۔ ہمارے ایک دانش ور دوست تو انہیں اپنے عہد کا امیر خسرو کہتے تھے۔ بس وقت بھی بدل گیا اور بندے بھی بدل گئے، ان جیسے لوگ اب کہاں ہیں۔ اسی طرح سینئر صحافی مجیب الرحمٰن شامی، قدرت اللہ چودھری، اسد اللہ غالب وغیرہ سے اچھا تعلق رہا اور یہ اوریجنل لوگ ہیں۔ مجھے قدرت اللہ چودھری جیسے زیرک اخبار نویس اور دانش ور نے بھی بہت متاثر کیا۔ اسی طرح ایک نوجوان تھا سید خورشید احمد گیلانی، جو ایک عرصہ تک نوائے وقت میں ”قلم برداشتہ“ کے عنوان سے کالم لکھتا رہا اور میں اس کا کالم نہایت عقیدت سے پڑھتا تھا۔ اکثر ہماری محفلیں برپا ہوتیں جن کی یادیں آج بھی ماند نہیں پڑیں۔ گیلانی صاحب قلم کے بھی دھنی تھے اور خطابت کے بھی۔ وہ سیر حاصل گفتگو کا ملکہ رکھتے تھے۔ ان کی کتابیں علم وادب کا ایک زبردست سرمایہ قرار پائی ہیں۔ اردو ڈائجسٹ کے مدیر اور ممتاز صحافی الطاف حسن قریشی کے ساتھ بھی بہت تعلق

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

رہااور ہماری خوب علمی، ادبی اور سیاسی محفلیں جمتی تھیں۔

سابق آئی جی پنجاب سردار محمد چودھری سے کون واقف نہیں۔ میری اور چودھری صاحب کی عمر بھی قریب قریب ایک جتنی تھی۔ وہ بھی سرکاری نوکری کرتے رہے اور میں بھی۔ چودھری صاحب پولیس سروس میں اے ایس پی کے دروازے سے داخل ہوئے اور آئی جی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ چودھری صاحب کے ساتھ ہماری یاد اللہ تھی اور کئی بار ان کے گھر پر دوسرے دانش وروں کے ساتھ ساتھ مجھ جیسے "غیر دانش ور" کو بھی جانے کا موقع ملا۔ چودھری صاحب پولیس سروس میں پولیس پر سرداری کرتے رہے اور پھر ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد قلم قبیلہ میں شامل ہوئے اور اہل قلم پر بھی سرداری کی۔ وہ اچھے لکھاری تھے، ان کی چار پانچ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ چودھری صاحب بڑے رکھ رکھاؤ والے اور خاندانی آدمی تھے۔ یاروں کے یار تھے۔ انہوں نے برصغیر کو تقسیم ہوتے ہی نہ دیکھا بلکہ تقسیم کے موقع پر خاندان پر اور خود پر صعوبتیں ٹوٹتے دیکھی تھیں۔ وہ بھارت کے ضلع ہوشیار پور سے ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک گاؤں میں آ بسے تھے۔ انہوں نے نواز شریف کو بہت قریب سے دیکھا بلکہ وہ مختلف حیثیتوں میں نواز شریف کے بہت ہی قریب رہے اور ان کے رازداروں اور صلاح کاروں میں شامل تھے۔

جس وقت پاکستان بنا گو کہ میں بہت چھوٹا تھا اور ساتویں جماعت کا طالب علم تھا لیکن پھر بھی تحریک پاکستان کے حوالے سے بہت سی یادیں ہیں جو جگنوؤں کی طرح ذہن میں جگمگاتی ہیں۔ یہ 1946ء کا زمانہ تھا جب برصغیر میں آزادی کے نعرے گونج رہے تھے اور پاکستان موومنٹ اپنے عروج پر تھی۔ "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے مسلمانان ہند کا جز و ایمان بن چکے تھے۔ ہندو اور انگریز اس سیلاب کے آگے اپنے طور پر بند باندھنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ بڑے بڑے جلسے ہوتے، جلوس نکلتے، گولیاں چلتیں، لاٹھی چارج، پکڑ دھکڑ روز کا معمول تھا۔ میں ان دنوں گورنمنٹ ہائی سکول میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میری عمر کے لڑکے اور تو کچھ کر نہیں سکتے تھے، بس چھوٹی چھوٹی گلیوں اور کوچوں میں پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ عمر کچی تھی، سیاست کی باریکیوں سے نا آشنا تھے لیکن دل میں عقیدت اور محبت کی بنیادیں واضح طور پر پختہ تھیں۔ کیونکہ پاکستان ایک عقیدہ بن چکا تھا۔ ایک دن ہمارے سکول کے قریب سے مسلم لیگ کا جلوس گزرا جو ضلع کچہری کی طرف رواں دواں تھا۔ انگریز کا دور تھا اور کچہری انگریز کی طاقت اور ہیبت کی پہچان ہوا کرتی تھی۔ کچہری میں ضلع کے سیاہ و سفید کا مالک انگریز ڈپٹی کمشنر بیٹھا کرتا تھا اور وہاں پولیس کا سخت پہرا ہوتا تھا کہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ کسی جلوس کا اس طرف آنا ہی اپنی موت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن تحریک پاکستان کا یہ جلوس پورے جذبے سے اسی کچہری کی طرف روانہ تھا۔ جس وقت جلوس سکول سے آگے بڑھا تو مسلمان طالب علموں کی کثیر تعداد بھی ساتھ ہولی۔ ہم بھی اپنا بستہ اٹھائے جلوس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کم سنی تھی لیکن جذبہ صادق تھا۔ اپنے لیڈروں کی محبت دلوں میں موجزن تھی۔ جلوس جس وقت کچہری کی عقبی سمت میں پہنچا تو ایک خوبرو اور گوراچٹا نوجوان جو اس جلوس کا روح رواں تھا پروقار انداز میں آگے بڑھا تو فضا ''امیر عبداللہ خان روکھڑی، زندہ باد'' کے نعروں سے گونج اٹھی۔ یہ نوجوان مسلسل آگے بڑھتا گیا اور کچہری کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا عمارت پر لگے ''یونین جیک'' کے پاس جا پہنچا۔ یہ یونین جیک عمارت کی سب سے اونچی منڈیر پر نہایت تمکنت سے لہرا رہا تھا۔ یونین جیک کوئی عام جھنڈا نہ تھا بلکہ سلطنت برطانیہ کی عالمگیر حیثیت کا ایک نشان تھا جس کی عمل داری میں سورج بھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن آج چشم فلک نے وہ منظر دیکھا کہ ایک باہمت نوجوان نے غلامی کی اس علامت کو نفرت اور غصے سے اتار کر تار تار کر دیا تھا اور سب لوگ دم بخود ہو گئے تھے۔ پھر اس نوجوان نے جہاں سے انگریز کا جھنڈا اتارا تھا وہاں پاکستان کا علامتی جھنڈا لہرا دیا۔ اس جرم پر امیر عبداللہ خان روکھڑی کو پولیس نے گرفتار کیا اور انہیں چار سال قید کی سزا سنائی گئی لیکن جلد ہی پاکستان بن گیا اور یوں یہ سزا بھی کالعدم ٹھہری۔ میری آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھا اور یہ واقعہ آج بھی میرے دل ودماغ میں تروتازہ ہے۔

تحریک پاکستان کا ذکر کروں اور دختر پاکستان آپا خورشید نیازی کا ذکر نہ کروں، یہ کیسے ممکن ہے! آپا خورشید نیازی تحریک پاکستان کی ایک سربکف مجاہدہ تھیں۔ وہ میری خالہ زاد بہن اور عمر میں مجھ سے دس سال بڑی تھیں۔ آپا خورشید تحریک پاکستان کے معروف کارکن اور سینئر سیاستدان امیر عبداللہ خان روکھڑی کی بیگم ممتاز کی چھوٹی بہن تھیں۔ ہم انہیں آپا کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کی زندگی میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے اور جب میں ورق ورق پر نظر ڈالتا ہوں دل سے آواز آتی ہے: ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے''۔ جس وقت تحریک پاکستان زوروں پر تھی تو آپا کالج میں پڑھتی تھیں اور طلبہ تحریک کی روح رواں تھیں۔ آپا خورشید نیازی نے تحریک پاکستان کی معروف خاتون لیڈر بیگم جی اے خان کے ساتھ مل کر قیام پاکستان کی آواز اٹھائی تھی۔ انہوں نے قیام وطن کے بعد پاکستان میں ''گرل گائیڈ'' کے نام سے ایک تنظیم بھی بنائی۔ 1947ء میں وہ گریجوایشن کر چکی تھیں اور جب صوبہ سرحد کے پاکستان میں شامل ہونے یا نہ ہونے کے لیے ریفرنڈم کا مرحلہ پیش آیا تو آپا ان دنوں بھارتی شہر انبالہ میں تھیں۔ ان کے والد غلام محمد خان نیازی سرکاری ملازمت کے سلسلے میں وہیں مقیم تھے۔ آپا خورشید نے اس ریفرنڈم میں یوں حصہ لیا کہ اپنے تمام گھر والوں کو انبالہ سے ساتھ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لے کر پشاور پہنچیں اور اس ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں ووٹ ڈال کر اس کی بنیادوں میں اپنا حصہ ڈالا۔ ان دنوں انبالہ سے پشاور تک کا سفر آسان نہ تھا لیکن پاکستان کی محبت میں آپا خورشید نے ساری دشواریاں عبور کر کے پاکستان کو ووٹ دیا اور جب پاکستان بن گیا تو آپا اپنے گھر والوں سمیت انبالہ کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ کر لاہور آ گئیں۔ ان کی ان خدمات کے بدلے میں انہیں ادارہ تحریک کارکنان نظریہ پاکستان نے میڈل دینے کا فیصلہ کیا اور کچھ دوست جب انہیں یہ خوشخبری دینے پہنچے تو آپا خورشید نیازی راہی ملک عدم ہو چکی تھیں۔

قیام پاکستان کے فوری بعد میں اصغر مال کالج راولپنڈی میں داخل ہوا۔ مری ان دنوں انگریزوں کا بسایا ہوا ایک چھوٹا سا ہل سٹیشن تھا اور مری اس وقت ''مری'' نہیں تھی بلکہ اپنے پورے حسن اور جوبن پر تھی۔ آبادی خال خال اور ہر طرف گھنے جنگلات تھے۔ ہم بھی کبھی کبھار مری جا نکلتے۔ ایک روز جی پی او سے کشمیر پوائنٹ جاتے ہوئے راستے میں ایک گھر پر مولانا ظفر علی خان کی تختی لگی دیکھی تو رک گئے۔ دوسری طرف دیکھا تو مولانا بہ نفس نفیس سڑک کنارے لاٹھی ٹیکتے آ رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر جو پہلی نظر پڑی اور جو مسرت ہوئی وہ میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بصد عقیدت انہیں سلام کیا لیکن بات کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ مولانا ان دنوں بہت علیل تھے، چلتے چلتے رک جاتے یا کسی پتھر کا سہارا لے کر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد تو ہمارا معمول بن گیا اور ہم ان کو صرف ایک نظر دیکھنے کی غرض سے وہاں سے گزرتے اور انہیں مودبانہ سلام کر کے آگے بڑھ جاتے۔ یہ سلسلہ کئی دن یونہی چلتا رہا تو ایک روز مولانا نے ہمیں خود روک لیا اور پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو تو اپنی کم مائیگی کے بھرپور احساس سے میں صرف اتنا بتا سکا کہ بس جی ایک طالب علم ہوں۔ اس پر ان کے چہرے پر ایک عجب سے چمک اٹھی اور صرف مجھ سے اتنا کہا: ''سنو! پاکستان بن چکا ہے اور اب آپ ہی نے اس کا مستقبل سنوارنا ہے''۔ ان کے یہ چند الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔

میاں نواز شریف اور شہباز شریف کے والد محترم میاں محمد شریف مرحوم کے ساتھ ہمارا تعلق خاطر یوں قائم ہوا کہ وہ سبزہ و گل اور درختوں کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے اور یہی وجہ ہمارے درمیان رابطے کا سبب بن گئی تھی۔ جب نواز شریف پہلی مرتبہ وزیر اعظم بنے تو ایک روز میاں محمد شریف کے ایک صنعت کار دوست جو میرے بھی جاننے والے تھے کی معرفت پیغام ملا کہ میں میاں محمد شریف سے ان دفتر میں جا کر ملوں وہ کچھ مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ خیر میں ان کے ڈیوس روڈ پر واقع آفس میں گیا اور ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے نہایت پیار سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو میں دو روز بعد رائے ونڈ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

روڈ مانگا کے مقام پر ملوں جہاں وہ اپنے صنعتی کمپلیکس کا آغاز کرنے والے ہیں۔ میں دو روز بعد وہاں پہنچا اور دیکھا کہ ایک بے آب و گیاہ وسیع علاقہ اس مقصد کے لیے گھیرے میں لیا جا چکا ہے اور باقاعدہ حد بندی بھی ہو چکی ہے۔ آبادی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک خیمے میں باریش شخص اپنے آگے نقشہ پھیلائے ہوئے ہے۔ میں انہیں میاں شریف کا کوئی ملازم سمجھا اور اپنا تعارف کروایا تو اس نے نہایت انکسار کے ساتھ نقشے کی مدد سے ہمیں سبزہ زاروں اور درختوں کے لیے مخصوص مقامات کی نشاندہی کی۔ دوسرے روز مجھے پتہ چلا کہ وہ نواز شریف کے چھوٹے بھائی عباس شریف ہیں۔ عباس شریف بہت نیک اور ملنسار آدمی تھے۔ بعد میں مَیں جب بھی وہاں جاتا تو اکثر عباس شریف کسی ریڑھی والے سے کوئی چیز لے کر کھا لیتے اور مجھے بھی کھلاتے۔ عباس شریف اپنے والد کا بہت ہی احترام کرتے اور جونہی ان کی گاڑی آتی وہ لپک کر اس کا دروازہ کھولتے اور پھر نہایت مودبانہ انداز میں کھڑے ہو جاتے۔ میاں محمد شریف جب نہایت باریک بینی سے ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیتے تو ان کی دور بین نظریں چھوٹے سے چھوٹے نقص کو بھی دیکھ لیتیں جو بڑے بڑے انجینئرز بھی نہ دیکھ سکتے۔ میں نے میاں محمد شریف صاحب کو وقت کا بہت پابند پایا تھا۔ وہ مجھے جو بھی وقت دیتے عین اسی وقت پہنچ جاتے۔ انہیں جامن کے درخت اور پھل بہت زیادہ پسند تھے۔ ایک مرتبہ میاں صاحب موڈ میں تھے تو میں نے یونہی مذاق میں کہہ دیا کہ آپ یہاں سوت کا کارخانہ لگانے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی یہاں جامن کے درخت بھی لگانا چاہتے ہیں تو کارخانے کے مزدور جب یہ جامن کھائیں گے اور پھر وہی ہاتھ سوت کو لگائیں گے تو اسے داغدار کر دیا کریں گے۔ میں نے یہ گپ یونہی لگائی تھی لیکن میاں صاحب نے اسے سنجیدہ لیا اور آرڈر دیا کہ بس یہاں جامن کے درخت نہیں لگیں گے۔ میں نے انہیں بہت قریب سے شرافت اور دیانت کے اعلیٰ پیکر کے طور پر دیکھا تھا۔

لاہور کے ایک صاحب میجر رشید وڑائچ بھی تھے جن سے ہماری خاصی یادُاللہ تھی۔ وہ فوج میں رہے اور 1971ء میں مشرقی پاکستان میں جنگی قیدی بن کر بھارت کی قید میں رہے۔ قید کے بہت دردناک واقعات سنایا کرتے۔ میجر وڑائچ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کے بہت زیادہ مداح تھے۔ جہاں کہیں نیازی کا تذکرہ چھڑتا اور ان پر تنقید ہوتی تو میجر وڑائچ ان کا بھرپور دفاع کرتے۔ انہوں نے فوج میں جانے کے خواہشمند لوگوں کے لیے ایک اکیڈمی بھی کھول رکھی تھی۔ جب بھی ملتے جلدی میں ہوتے اور ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کٹھن مہم کے درپے ہیں۔ کچھ نہ کچھ بہر حال کرتے ہی رہتے۔ دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے ہر وقت مستعد رہتے۔ ان کا معمول تھا کہ صبح سویرے گھر سے کھانا اور چائے تیار کروا کر چوبرجی پہنچ جاتے اور وہاں بیٹھے مزدوروں کو اپنے ہاتھ سے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کھانا کھلاتے۔ وہ معرکہ حق و باطل میں فولاد تھے تو حلقہ یاراں میں ریشم کی طرح نرم۔ انہوں نے ایک حزب اللہ تحریک بھی بنا رکھی تھی اور عراق کے سابق صدر صدام حسین کی قدِ آدم تصویر لاہور نہر کنارے واقع اپنے گھر کی چھت پر لگا رکھی تھی جس پر ہر گزرنے والے کی نظر پڑتی۔ غرض میجر صاحب مرحوم عجب شخصیت کے مالک تھے۔

اپنے ملنے والے بے شمار لوگوں میں ایک باغ و بہار شخصیت سینئر صحافی کلیم اللہ ملک مرحوم کی بھی تھی۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کا اصل نام کریم اللہ تھا اور اپنے سحر طراز کلام کی وجہ سے کلیم اللہ مشہور ہو گئے تھے اور یہی نام ان کی پہچان بن گیا۔ وہ میانوالی کے رہنے والے تھے ہفت روزہ چٹان سے منسلک تھے۔ نوائے وقت، ماہنامہ تعلیم القرآن اور اردو ڈائجسٹ میں بھی باقاعدہ لکھتے۔ کلیم اللہ ملک مرحوم بلا کے کمپیئر اور مقرر تھے۔ میں کلیم اللہ ملک جیسے عظیم انسان کے متعلق یہی کہتا ہوں کہ: ''جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا''۔ یعنی کلیم اللہ ملک نے میانوالی میں ہی اپنا حلقہ محدود کر رکھا تھا وہ اگر لاہور جیسے شہر میں ہوتے تو ان کے اوصاف زمانے پر کُھلتے۔ وہ لاہور بھی آتے رہتے لیکن رہائش میانوالی ہی میں رکھی۔

زمانہ طالب علمی کے بہترین دوستوں کو یاد کروں تو ان میں ایک کیپٹن حمید اللہ سنبل شہید تھے۔ ہم ساتویں سے دسویں جماعت تک اکٹھے ہی پڑھتے رہے اور ہر وقت ساتھ رہتے۔ حمید اللہ کو آرمی میں جانے کا بہت شوق تھا اور ابھی وہ بی ایس سی کا طالب علم تھا کہ پی ایم اے میں اپلائی کیا اور سلیکٹ ہو کر کاکول پہنچ گیا۔ کاکول سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد اس نے کمانڈو کا خصوصی کورس بھی کیا۔ ستمبر 65ء کی جنگ سے پہلے وہ کیپٹن بن چکا تھا۔ مورخہ 6 ستمبر کو حمید اللہ سنبل کو چار جانباز ساتھی دیے گئے اور ایک انتہائی مشکل ٹاسک سونپا گیا کہ سیالکوٹ میں جسڑ کے مقام پر حملہ کر کے جسڑ پُل کو دشمن کے قبضے سے چھڑائیں۔ یہ مختصر دستہ چار روز تک مسلسل دشمن سے لڑتا رہا اور اسی کارروائی کے دوران میں حمید اللہ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ اپنی زندگی سے جڑی اہم باتوں، واقعات اور پراجیکٹس کو یاد کرتا ہوں جن میں کہیں نہ کہیں میرا کردار بھی کارفرما رہا تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں یہاں لاہور شہر کے عین وسط میں بہنے والی نہر کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ اس پراجیکٹ کی لینڈ سکیپنگ اور شجرکاری میرے دور میں بلکہ میری ہی نگرانی میں انجام پائی۔ یہ دو مرحلوں میں مکمل ہوئی۔ نہر کا پہلا مرحلہ 1964ء میں جیل روڈ سے لے کر دھرم پورہ پل تک ہم نے مکمل کیا اور دوسرا مرحلہ ٹھوکر نیاز بیگ تک ٹھیک دس سال بعد 1974ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ میں جب بھی اس نہر کے آس پاس سے گزرتا ہوں تو راحت محسوس ہوتی ہے اور لگتا ہے جیسے یہ نہر، یہ پودے اور درخت میرے بچے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوں کیونکہ ہر پودے اور درخت میں میری اور میری ٹیم کی عرق ریزی شامل ہے۔ محکمہ جنگلات سے وابستہ تقریباً ہر شعبے میں میرا کسی نہ کسی صورت میں حصہ رہا۔ فیلڈ میں بھی کام کیا اور انتظامی امور میں بھی۔ کچھ عرصہ فاریسٹ سکول گھوڑا گلی کا پرنسپل بھی رہا۔ میں نے اپنا کام حتی الوسع دلجمعی اور لگن سے کیا، یہ میں نہیں کہتا بلکہ میرے محکمہ کے لوگ کہتے ہیں اور مجھے آج بھی میرے جاننے والے اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں پنجاب کے گورنر جیلانی مرحوم تھے، وہ بہت ہی بھلے مانس اور ایماندار انسان تھے۔ جب میں ڈسٹرکٹ فاریسٹ آفیسر ڈیرہ غازی خان تعینات ہوا تو اس وقت وہ دورے پر آئے اور فورٹ منرو سیاحتی مقام کی بنیاد رکھی اور وہاں پر تیزی سے کام شروع کیا اور اسے پبلک پارک کے طور پر ڈیکلیئر کیا۔ اس سے قبل فورٹ منرو سرسبز و شاداب اور پہاڑی علاقہ تھا اور ہر طرف جنگل ہوتا تھا۔ گورنر جیلانی کی ذاتی دلچسپی سے اسے سیاحتی مقام کا درجہ ملا۔ فورٹ منرو میں تمام کام ہم نے ہی مکمل کروایا۔ اسی دور میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ گورنر جیلانی جس علاقے میں بھی دورہ کرنے جاتے اکثر بغیر پروٹوکول کے اچانک پہنچ جاتے اور جائزہ لیتے کہ کام کیسا ہو رہا ہے۔ ایک مرتبہ ملتان اور ڈیرہ غازی خان کے درمیان غازی گھاٹ پل تعمیر ہو رہا تھا کہ انتظامیہ میں کھلبلی مچ گئی کہ گورنر صاحب خفیہ دورے پر آ رہے ہیں جب جیلانی صاحب سائٹ پر پہنچے تو وہاں ہر طرف بیوروکریسی تھی اور کام تیزی سے جاری تھا۔ افسر شاہی نے گورنر کو بتایا کہ ہم تو معمول کے مطابق روزانہ ہی یہاں آتے ہیں اور کام کا جائزہ لیتے ہیں۔ خیر گورنر خاموش رہے اور کچھ دیر کے بعد ملتان چلے گئے۔ ملتان پہنچ کر انہوں نے اسی وقت پھر واپسی کی راہ لی اور غازی گھاٹ پل کے پاس پہنچ گئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں صرف مزدور کام کر رہے ہیں اور دور دور تک افسران بالا کا کوئی نام و نشان تک نہیں۔ اس پر گورنر جیلانی نے خوب بھڑاس نکالی اور افسران کی ''گوشمالی'' کی۔

گورنر جیلانی صاحب زبردست آدمی تھے۔ جس وقت میں ڈسٹرکٹ فاریسٹ آفیسر لاہور تعینات ہوا تو جیل روڈ لاہور پر واقع ریس کورس کے متعلق بیوروکریسی نے بہت زور لگایا کہ اس علاقے کو بھی ''جی او آر'' کا حصہ بنایا جائے، انہوں نے جیلانی کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانے اور انہوں نے یہاں پر خوبصورت پبلک پارک بنوا دیا جسے بعد میں ''جیلانی پارک'' کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ اسی طرح جیلانی پارک کے سامنے پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی بھی جیلانی مرحوم کی کاوش تھی۔ 2005ء میں پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں میری انجیو پلاسٹی ہوئی اور میں صحت یاب ہو گیا۔ میں ہسپتال سے ڈسچارج ہو رہا تھا تو مجھے جیلانی یاد آ رہے تھے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کہ انہوں نے مخلوق خدا کی خدمت کے لیے کیسا زبردست ادارہ قائم کیا، ویسے حق تو یہی بنتا تھا کہ اس ادارے کا نام بھی انہی کے نام پر رکھا جاتا۔اصل میں وہ کام کرنے والے لوگ تھے۔انہیں جو قومی ذمہ داری سونپی جاتی اسے پوری لگن کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ ایک بار جیلانی صاحب کوٹ مٹھن گئے تو وہاں بھی ایک بہت بڑے پبلک پارک کی بنیاد رکھی۔جیلانی کو درختوں، پارکوں اور جنگلات کا بہت شوق تھا اور جس ضلع اور مقام پر بھی جاتے وہاں ایک آدھ پارک ضرور بنوادیتے۔وہ کہتے تھے کہ درختوں اور پودوں سے معاشرتی فضا بہتر رہتی ہے جس کا انسانی صحت اور مزاج پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔جلو پارک لاہور بھی گورنر جیلانی کے دور میں ان کے حکم پر بننا شروع ہوا تھا۔ جس وقت جلو پارک میں کام جاری تھا تو ایک دن اچانک گورنر صاحب اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتے ہوئے وہاں جا پہنچے۔ان دنوں بارشیں بہت ہو رہی تھیں اور ہر طرف کیچڑ تھا، جلو پارک کے قریب پہنچ کر جیلانی صاحب کی گاڑی کیچڑ میں دھنس گئی، وہ مسلسل کوششیں کرتے رہے لیکن گاڑی نہ نکلی۔ وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے تو ان کی حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ یہ تو گورنر پنجاب ہیں۔یوں لوگوں نے مل کر ان کی گاڑی نکالی۔جلو کا علاقہ جنگل تھا اور جھاڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔اسے جیلانی نے ڈویلپ کروایا۔میرے ڈسٹرکٹ فاریسٹ آفیسر لاہور تعینات ہونے سے پہلے ہی وہاں کام شروع ہو چکا تھا۔میرے دور میں بھی کام عروج پر رہا اور بعد میں بھی وہاں ترقیاتی کام ہوتے رہے، بلکہ اب تک کام جاری ہے۔

1970ء کے الیکشن میں مجھے قصور میں پریزائڈنگ افسر تعینات کیا گیا تھا۔یہاں پر قومی اسمبلی کے امیدوار احمد رضا خان قصوری تھے جوان دنوں جوان تھے۔اس دور میں ہر طرف پیپلز پارٹی اور زیڈ اے بھٹو کا طوطی بول رہا تھا۔صحیح بتاؤں تو ان دنوں میری ہمدردیاں بھی پی پی اور قصوری کی جانب تھیں لیکن میں اللہ کے فضل و کرم سے آج بھی پرُسکون ہوں کہ میری ہمدردیاں ضرور اس پارٹی کے ساتھ تھیں لیکن ہم نے پولنگ میں کسی قسم کی کوئی ہیر پھیر نہیں کی اور شفافیت کو یقینی بنایا۔احمد رضا قصوری لڑکا تھا اور یہ اس کا پہلا الیکشن تھا اور اسے اپنی جیت کا قطعاً کوئی یقین نہ تھا۔جب رزلٹ آنا شروع ہوئے تو پورے حلقے میں احمد رضا خان قصوری اپنے لوگوں کو لے کر جلوس نکالنے اور احتجاج کرنے لگا کہ بہت دھاندلی ہو رہی ہے اور مجھے بھاری ووٹوں سے ہرا دیا جائے گا۔دراصل اسے اپنی شکست یقینی نظر آ رہی تھی۔وہ ہمارے پولنگ پر آیا تو مجھ سے بھی اس کی تو تکار ہوئی تو میں نے کہا کہ یار تم رزلٹ تو مکمل آنے دو پھر کوئی بات کرنا۔چنانچہ جب رزلٹ آیا تو وہ بھاری مینڈیٹ سے جیت گیا۔بعد میں وہ مجھے کہا کرتا تھا کہ اصل میں مجھے اپنی جیت کا کوئی اندازہ نہ تھا، اس لیے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں نے شور مچادیا تھا۔

1971ء ہی کا واقعہ ہے کہ بیدیاں کے مقام پر مجھے پاک فوج نے بلوایا اور کہا کہ اس علاقے سے سارے درخت کٹوادیں، ان دنوں پاک بھارت فوجیں آمنے سامنے تھیں۔ خیر میں نے ایک ٹھیکیدار کو کہہ کر وہاں سے درخت کٹوادیے ابھی درخت اٹھائے نہیں گئے تھے کہ پاک فوج نے اس علاقے میں بارودی سرنگیں بچھانا شروع کردیں اور بعد میں جب وہ ٹھیکیدار درخت اٹھانے گیا تو فوج نے کہا آپ واپس چلے جاؤ کیونکہ اب حالات بہت خراب ہو چکے ہیں۔ وہ ٹھیکیدار بہت پریشان حالت میں میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جناب میرا اتنا خرچ اٹھ گیا اور آپ مجھے فوجی درخت نہیں اٹھانے دیتے، چونکہ یہ سودا آپ نے کروایا تھا لہذا آپ میرے ساتھ چلیں۔ خیر ہم دونوں بیدیاں جا پہنچے تاکہ فوجی حکام سے اس کی سفارش کی جاسکے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جو فوجی حکام میری عزت کرتے تھے آج ان کا موڈ یکسر بدل چکا تھا اور ہمارے وہاں پہنچتے ہی انہوں نے کہا کہ آپ لوگ فوری طور پر یہاں سے نکل جائیں کیونکہ حالات بہت خراب ہونے جا رہے ہیں لیکن ہمیں ان کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے ہماری ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے کہ آپ فوری یہاں سے نکل جائیں۔ اب شام کے سائے پھیلنے لگے تھے اور پھر اچانک ہی بلیک آؤٹ شروع ہوگیا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ جب ہم موٹر سائیکل پر واپسی کی راہ لے رہے تھے تو عین اسی وقت اچانک جنگ چھڑ گئی اور دونوں طرف سے گولہ بارود کا آزادانہ استعمال شروع ہوگیا۔ یہ منظر دیکھ کر ہم پسینے میں شرابور ہوگئے کہ ہم کہاں پھنس گئے ہیں۔ خیر بڑی مشکل سے لاہور پہنچے تو ہر طرف اندھیرا تھا، سڑکیں اور گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ پھر کچھ دن کے بعد ہی سانحہ مشرقی پاکستان رونما ہوگیا۔ آج بھی مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اُدھر جنگ چھڑنے کو تھی اور اِدھر ہمیں اپنے درختوں کی پڑی ہوئی تھی۔

اپنی یادوں کو کریدنے بیٹھا ہوں تو یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ پاکستان کی کرکٹ ٹیم کا سابق کپتان مصباح الحق میرا بھتیجا ہے اور میرے کزن بھائی عبدالقدوس خان نیازی کا بیٹا ہے۔ عبدالقدوس خان اور میں اکٹھے ہی پلے بڑھے اور ایک ہی جگہ تعلیم حاصل کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مصباح الحق نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تو ان دنوں چونکہ میڈیا اتنا فاسٹ نہیں ہوا کرتا تھا اور لوگوں کو بہت سی باتوں کا فوراً پتا نہیں چلتا تھا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ مصباح الحق انضمام الحق کا بھائی یا کزن وغیرہ ہے۔ بلکہ ایک صاحب نے مجھے ہی کہہ دیا تھا کہ مصباح الحق انضمام الحق کا بھائی ہے۔ ان دنوں میں نوائے وقت میں کالم ''گرتو برا نہ مانے'' لکھتا تھا۔ میں نے مصباح الحق کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

متعلق لکھا تو لوگوں کو پتا چلا کہ وہ میانوالی کا ہے اور میرا بھتیجا ہے۔ مصباح کے والد عبدالقدوس خان نیازی اور میں راولپنڈی میں اکٹھے پڑھتے رہے۔ وہ ہاکی کے بڑے اچھے پلیئر تھے۔ مصباح کی والدہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین میانوالی کی پرنسپل بھی رہیں وہ بہت اچھی ایتھلیٹ بھی تھیں۔ مصباح الحق نے بھی شروع شروع میں سٹوڈنٹ دور میں ہاکی کھیلنا شروع کی، وہ اس کھیل میں بہت آگے نکلتا کیونکہ وہ ہاکی کا اچھا کھلاڑی تھا لیکن بعد میں وہ لاہور آیا تو یہاں اس نے کرکٹ کھیلنا شروع کی اور اپنا خوب نام کمایا۔ یہ ہمارے خاندان کا نہایت محنتی اور ذہین بچہ تھا اور محض اپنی محنت اور لگن کے بل بوتے ہی پر کرکٹ ٹیم کے کپتان کے اعلیٰ عہدے تک پہنچا۔ اس نے نہ صرف اپنا نام کمایا بلکہ پوری برادری اور پوری پاکستانی قوم کا نام روشن کیا۔

خزینہ علم وادب پبلشرز نے میرے کالموں، مضامین اور شاعری کو یکجا کر کے کتابی صورت دینے کا کام شروع کیا ہے۔ اب تک میری نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک شعری مجموعہ ہے اور باقی نثری مضامین ہیں۔ اللہ کے خصوصی فضل و کرم سے میرے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں امریکہ میں سیٹل ہیں اور باقی دو بیٹیاں لاہور میں ہیں۔ ماشاءاللہ میرے تمام بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور سبھی میں لٹریری ذوق موجود ہے۔ بس زندگی ایسی کٹ گئی کہ جیسے ایک خواب تھا۔ بقول کیفی بلگرامی:

اِک اِک قدم پہ رکھی ہے یوں زندگی کی لاج
غم کا بھی احترام کیا ہے خوشی کے ساتھ

(قومی ڈائجسٹ۔ اپریل 2019ء)

O......❄......O

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کالم نگار، صحافی، دانشور

عامر خاکوانی

کی سرگزشت

عامر خاکوانی کو اردو صحافت میں باقاعدہ آئے 25 برس ہو چکے ہیں۔ 1993ء میں ان کا پہلا کالم روزنامہ جنگ میں شائع ہوا اور اس کے بعد ان کے جنوں کا سلسلہ دراز ہو تا گیا۔ 1996ء میں اردو ڈائجسٹ جوائن کیا۔ روزنامہ ایکسپریس اور روزنامہ دنیا جیسے قومی اخبارات کی بانی ٹیم کا حصہ رہے۔ گزشتہ تین برس سے روزنامہ 92 نیوز میں بطور میگزین ایڈیٹر، کالم نگار کام کر رہے ہیں۔

عامر خاکوانی ایک سیلف میڈ انسان ہیں۔ انہوں نے برسوں کی ریاضت کے بعد صحافت اور کالم نگاری کی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ اپنے کالموں میں کئی نئے تجربات کیے اور اردو کالم کا کینوس وسیع کرنے کی کوشش کی۔ کرنٹ افیرز، ادب، تاریخ، تصوف، روحانیت، سیاست اور سماجی اشوز سے لے کر سپورٹس، دہشت گردی، اور موٹیویشنل موضوعات پر بہت لکھا۔ مختلف موضوعات پر ان کے مطالعہ کا میدان بے حد وسیع ہے۔ ان کے منتخب کالموں کے دو مجموعے ''زنگار'' اور ''زنگار نامہ'' شائع ہو چکے ہیں۔ شدت پسندی و عسکریت پسندی پر ایک تحقیقی کتاب زیر طبع ہے، انٹرویوز اور فکری مضامین پر مشتمل دو کتابیں بھی زیر طبع ہیں۔ میں جناب خاکوانی کا سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے اس سلسلے میں میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔ ان کے اس پیش قیمت بیانیے میں ایک اعتبار سے پاکستانی معاشرے، سیاست اور صحافت کی گزشتہ تین دہائیوں کی حشر بداماں تاریخ سمٹ آئی ہے۔ کئی گوشے تو خاصے چشم کشا ہیں۔ مجھے امید ہے قارئین لطف اندوز ہوں گے۔

O……❄……O

میں یکم جولائی 1971ء کو تحصیل احمد پور شرقیہ، ضلع بہاولپور میں پیدا ہوا۔ میرے نام کے ساتھ خاکوانی اس لئے لگتا ہے کہ میرا تعلق سرائیکی پٹھانوں کے قبیلے خاکوانی سے ہے۔ خاکوانی اپنے نام کے ساتھ ''سردار'' لکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر ہمارے اجداد کا تعلق افغانستان کے صوبہ ننگر ہار

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے علاقہ خوگیانی سے ہے۔خوگیانی سے لفظ خوگانی بنا، جو بگڑے بگڑتے خاکوانی ہوگیا۔اصل میں ہم معروف زئی پٹھان ہیں، مگر اب خاکوانی کی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔خاکوانیوں کا ایک حصہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہندوستان آیا، کچھ اس سے پہلے بھی آ چکے تھے۔ابدالی نے ریاست ملتان کی حکومت پٹھانوں کو سونپی۔سدوزئی اور خاکوانی ملتان کے نواب رہے ہیں۔ملتان کے آخری نواب مظفر خان سدوزئی کے ساتھ بعض خاکوانی کمانڈر بھی سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔نواب مظفر خان سدوزئی ٹیپو سلطان کی طرح کی ایک زبردست شخصیت تھے۔ وہ 80 سال کی عمر میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے، یہ بہادری اور دلیری کی ایک بہت بڑی مثال ہے کہ اس قدر بوڑھا انسان جذبہ ایمانی سے سرشار ہو کر باقاعدہ جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔ضلع مظفر گڑھ انہی کے نام سے منسوب ہے۔سکھوں کے دور میں پٹھانوں پر بڑا ظلم ہوا۔اسی وجہ سے بعد میں خاکوانیوں نے سکھوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا اور بعض نے انگریزوں سے سینکڑوں مربع زمین پائی، کچھ خاکوانی البتہ اس کے لئے بھی تیار نہ ہوئے۔وہ انگریزوں کو دشمن سمجھتے رہے اور جائیدادوں سے محروم رہے۔ہمارے بزرگوں سمیت بعض خاکوانیوں نے ریاست بہاولپور کا رخ کیا۔وہاں عباسی نوابوں نے ان جنگجوؤں کی قدر کرتے ہوئے کہا کہ ریاست بہاولپور کے نواب تو ہم ہی ہیں، آپ کو ہم نواب تو نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن آپ کو سردار کا ٹائٹل دیتے ہیں۔بہاولپور میں ایک زمانے میں صرف سید، پٹھان اور خود عباسی ریاستی فوج میں کمیشن لے سکتے تھے، ان کے سوا کسی اور کو اجازت نہیں تھی۔خاکوانی اور دیگر پٹھان ریاستی فوج کا حصہ رہے۔

میرے دادا حافظ غلام محمد خان نے 1936ء میں وفات پائی۔وہ اس وقت کے نواب آف بہاولپور کے قریبی ساتھی اور مشیر تھے۔حافظ غلام محمد خان صاحب معرفت بزرگ تھے۔ان کی بہت ساری کرامات مشہور ہیں۔میرے والد صاحب چھ سات سال کے تھے کہ دادا جان کا انتقال ہو گیا۔نواب بہاولپور ان کی بڑی قدر کرتے۔نواب صاحب نے ایک بار حافظ صاحب کو ایک چک (کئی سو مربع اراضی) دینے کی پیش کش کی۔حافظ صاحب میں کمال کا استغنا تھا۔انہوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا اور پیش کش مسترد کرتے ہوئے کہا کہ مجھے تو اپنی قبر کے لئے اراضی مل جائے، اسی کو غنیمت سمجھوں گا۔نواب صاحب نے ایک بار پھر اصرار کیا کہ حافظ صاحب اپنے بچوں کے لئے لے لیں، ان کے کام آئے گی۔حافظ صاحب نے اس پر فرمایا، ''میں اپنے بچوں پر بوجھ نہیں لادنا چاہتا، وہ اگر خود چاہیں گے، تو زمینیں بنا لیں گے۔'' ہم اپنے والد کو کہا کرتے کہ آپ کے والد گرامی نے اس ایک جملے کے ساتھ ہمیں ایک تگڑا زمیندار بننے سے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

محروم کر دیا۔ جس خاکوانی کو دیکھو، وہ زمیندار ہے، ایک ہمارا گھرانہ ہی ہے جس کے پاس زمین نہیں۔ والد ہمیشہ مسکرا کر کہتے کہ تمہارے دادا نے اللہ پر توکل کی جو دولت چھوڑی ہے، اس میں سے حصہ لے لو۔ دادا کی کئی کرامتیں بھی مشہور ہیں، ان کی قبر سے منسوب کئی کہانیاں قبرستان سے ملحق گھروں والے بھی بتاتے ہیں (واللہ اعلم بالصواب)۔ خاکوانی بنیادی طور پر تگڑے زمیندار ہیں لیکن ہمارا خاندان اس جاگیرداری سے دور رہا۔ لیکن یہ اللہ کا کرم رہا ہے کہ اس نے ہمیں کسی بھی شئے کا محتاج نہیں کیا اور ہمیں دنیا کی ہر نعمت سے نوازا۔

ہمارا گھرانہ روایتی طور پر بریلوی مسلک سے تعلق رکھتا ہے، خاندان کے بیشتر لوگ خواجگان تونسہ سے بیعت ہیں، والد صاحب خواجہ نظام صاحب تونسوی سے بیعت تھے، ہم بھائیوں کو انہوں نے بچپن میں خواجہ معین الدین تونسوی سے بیعت کرایا، تاہم بعد میں رابطہ نہیں رہا اور اس بیعت کو فالو نہیں کر پایا۔ خواجہ معین صاحب معروف صوفی بزرگ خواجہ سلیمان تونسویؒ کی اولاد میں سے ہیں اور ان کے والد کا نام خواجہ نظام الدین تھا۔ یہ سب بڑے اللہ والے لوگ تھے۔ خواجہ سلیمان تونسویؒ کو "پیر پٹھان" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ دراصل پٹھان تھے اور ہم خاکوانی بھی چونکہ پٹھان ہی ہیں تو اس لیے ہمارے بیشتر لوگ خواجگان تونسہ شریف کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔

میرے والد سردار ہاشم خان خاکوانی شہر کے سینئر وکیل تھے۔ وہ اپنے خاندان کے پہلے گریجوایٹ تھے۔ والد صاحب پہلے سکول ٹیچر تھے اور بعد میں ہیڈ ماسٹر بن گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ایل ایل بی کیا اور ہیڈ ماسٹری کی نوکری چھوڑنے کے لئے ڈائریکٹر تعلیمات کو درخواست دے دی۔ ڈائریکٹر نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ میرا نام سردار ہاشم خان خاکوانی ہے اور میں اپنے نام کے ساتھ 'سردار' لکھتا ہوں لیکن یہاں جو بھی آتا ہے وہ مجھے 'ماسٹر' کہہ کر پکارتا ہے اور میں اس ٹائٹل سے جان چھڑوانا چاہتا ہوں کیونکہ سردار کو چھوڑ کر مجھے ماسٹر کہلوانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ بس اس وجہ سے اباجی نے یہ نوکری چھوڑی اور وکالت شروع کر دی۔ جلد ہی ان کا شمار لاہور ہائی کورٹ کے سینئر وکیلوں میں ہونے لگا۔ والد صاحب بڑے دبنگ انسان تھے، ان کا بڑا رعب داب تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد تھا اور بڑے وجیہہ انسان تھے۔ جناح کیپ ان کی خاص شناخت تھی۔ بڑے خوش مزاج اور خوش لباس تھے۔ شگفتہ باتیں کرتے تھے اور انہیں کہانی سنانے کا ڈھنگ بھی آتا تھا۔ بات کرتے تو ایک سماں باندھ دیتے تھے۔ وہ گھنٹوں گفتگو کرتے تھے اور لوگ ان کے سحر سے نکل نہیں سکتے تھے۔ لوگ ان کی محفل میں بہت دلچسپی سے بیٹھتے تھے۔ وہ اپنی عزت نفس کے بارے میں بہت زیادہ حساس بھی تھے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

والد صاحب کا صوفیانہ مزاج تھا اور وہ اولیائے کرام کی بہت زیادہ قدر کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ توحید کے معاملے میں بھی بہت سخت تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ہمارے خاندان کے ایک بزرگ چشتیاں میں رہتے تھے۔ چشتیاں میں خواجہ نور محمد مہاروی صاحب کی درگاہ بھی ہے۔ وہ اسی درگاہ سے وابستہ تھے۔ وہ بزرگ ایک مرتبہ والد صاحب سے کہنے لگے کہ ہم تو قبر پرست ہیں تو والد صاحب کو ان کی یہ بات بہت بری لگی اور کہا کہ تم قبر پرست ہو گے میں تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ ہم بزرگوں اور اولیائے کرام کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں اور مزارات پر عقیدت کے ساتھ جاتے ہیں لیکن قبر پرستی کو نہیں مانتے۔ والد صاحب کردار کے بہت مضبوط انسان تھے اور ہمیں ہمیشہ یہی بات سمجھاتے کہ آپ کو اپنا کریکٹر بہترین بنانا چاہیے۔ بہاولنگر کے معروف سیاستدان عبدالستار لالیکا والد صاحب کے شاگرد تھے۔ عالم علی لالیکا بھی والد صاحب کے شاگرد تھے۔ یہ نواز شریف کا 1988ء کا دور تھا اور عبدالستار لالیکا نواز شریف کے پنج پیاروں میں شمار ہوتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے والد صاحب کو خط لکھا کہ میری کسی قسم کی ضرورت ہو، کوئی کام ہو تو بتایئے۔ ان دنوں ایک دوڑ چلی تھی کہ لوگ بڑے شوق سے اپنے بچوں کو نائب تحصیلدار اور پولیس میں اے ایس آئی بھرتی کروایا کرتے۔ اس زمانے میں لوگ دو لاکھ روپے رشوت دے کر یہ عہدے حاصل کرتے۔ یہ بڑی پرکشش سیٹیں سمجھی جاتی تھیں۔ میرے بھائی نے ایف اے کر لیا تھا، اس ملازمت کی شرط بھی اس وقت ایف اے تھی۔ انہوں نے والد صاحب کو کہا کہ آپ لالیکا کو کہہ کر مجھے نائب تحصیل دار لگوا دیں۔ اس پر والد صاحب کو بہت غصہ آ گیا اور کہنے لگے کہ تمہارا اس قدر چھوٹا لیول کیوں ہے کہ تم لوگ محض نائب تحصیل دار بننا چاہتے ہو، زیادہ سے زیادہ تحصیل دار بن جاؤ گے، بس۔ ہمیشہ ٹاپ لیول پر سوچو اور خود کو صدر پاکستان بنانے پر غور کرو۔ خواب دیکھنا ہے تو بڑا خواب دیکھو۔ تمہیں تو سی ایس ایس کر کے کم از کم 17 گریڈ میں جانا چاہیے۔

والد صاحب ہمیں بچپن ہی سے پی ایچ ڈی کے خواب دکھاتے تھے۔ والد صاحب میں نسلی تعصب تو بالکل بھی نہیں تھا لیکن پٹھانوں کے حوالے سے وہ کہا کرتے تھے کہ جو ہمارے اوصاف ہیں ہمیں ان پر قائم رہنا چاہیے اور شجاعت اور دلیری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ سخی اور مہمان نواز ہونا چاہیے اور ہمیں کسی قسم کی گھٹیا اور اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ وہ کرپشن کے بہت خلاف تھے اور بطور وکیل بہت کھرے، صاف شفاف رویہ رکھتے۔ یہ تصور بھی محال تھا کہ کوئی ان سے مالی یا کسی اور ترغیب سے غلط کام کرا سکے۔ وہ کہا کرتے تھے یہ خوبیاں ہمارے آباؤ اجداد کی ہیں جن پر ہمیں قائم رہنا چاہیے۔ جس طرح جوش ملیح آبادی ''پٹھونلی'' کہتے ہیں تو اسی طرح خاکوانی قبیلے میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بھی جو ''پٹھانگی'' ہے اس کی انا ہمارے اندر ہمیشہ رہتی ہے۔ والد گرامی کو اپنے حسب نسب کے حوالے سے ہمیشہ فخر رہا، مگر اس میں دوسروں کے لئے تحقیر کا جذبہ نہیں تھا، وہ نسب کو ہمیشہ ذمہ داری سمجھتے اور سو فی صد پورا اترنے پر زور دیتے۔

والد گرامی پکے مسلم لیگی تھی سیاسی طور پر ہمارا خاندان مسلم لیگ سے وابستہ تھا۔ 1977ء میں مَیں پانچ چھ سال کا تھا جب میرے چچا قومی اتحاد کا ساتھ دینے کی پاداش میں گرفتار ہوئے۔ اس زمانے میں ہمارے گھر میں روزنامہ وفاق آتا تھا۔ ہمارے خاندان کی ایک نظریاتی سیاسی کمٹمنٹ تھی۔ والد صاحب جنرل ضیاء الحق کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ افغانستان، کمیونزم وغیرہ کے معاملے میں جنرل ضیاء الحق کے اقدامات کو بہت سراہتے۔ والد صاحب کی ایک رائٹسٹ کے حوالے سے بھی شناخت تھی۔ وہ سادات کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور اگر کوئی کلائنٹ سید ہوتا تو اس کا خاص خیال رکھتے اور ان سے کیسوں کے معاملے میں کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔ والد صاحب ایک ایماندار وکیل تھے اور ان میں وکیلوں جیسی عادتیں نہ تھیں۔ والد صاحب کو اگر کوئی پیسوں کی پیش کش کر کے کہتا کہ فلاں کیس آپ کے پاس ہے اور آپ یہ رقم لے لیں اور تھوڑا ہاتھ ہولا رکھیں تو اس پر وہ سخت طیش میں آجاتے اور باقاعدہ ''جوتا'' اتار لیتے کہ آپ نے مجھے رشوت کیوں پیش کی ہے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ مجھے خواب میں حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کی زیارتیں ہوئی ہیں۔ وہ اہل بیتؓ کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرنے والے تھے۔ پھر ہم نے لاشعوری طور پر ان سے یہ چیزیں سیکھیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ والد صاحب کا ہم پر بہت زیادہ احسان تھا کہ انہوں نے اپنے کردار سے ہماری بہترین تربیت کی۔ والد صاحب کا انتقال بہاولپور وکٹوریہ ہسپتال میں 1992ء میں ہارٹ اٹیک کے سبب ہوا۔ اس وقت میں لاء کے پہلے سال کا طالب علم تھا۔

مائیں سب کی اچھی ہوتی ہیں، مگر مجھے لگتا ہے کہ میری ماں کی عظمت فزوں تر ہے۔ انہوں نے زندگی بھر قربانی اور ایثار سے کام لیا۔ رشتے جوڑنے کی کوششیں کرتی رہیں اور ہمیں بھی یہی سبق دیا۔ والد مرحوم کی جتنی خدمت والدہ نے کی، ایسا کم ہی دیکھنے کو ملا۔ میری والدہ محترمہ ترین پٹھان تھیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے ان کا تعلق تھا تاہم میرے بڑے ماموں امین ترین سینئر صحافی تھے، وہ کراچی شفٹ ہو گئے، والدہ کی رخصتی بھی کراچی سے ہوئی، وہ کراچی کو اپنا میکہ سمجھتی تھیں، کراچی مجھے اس وجہ سے بھی عزیز ہے اور ڈی آئی خان بھی۔ میری والدہ کی شادی 1968ء میں ہوئی، اس وقت بھٹو صاحب وزیر خارجہ تھے، وہ خود تو اس شادی میں نہیں آسکے تھے لیکن اس شادی میں بیگم نصرت بھٹو نے شرکت کی تھی۔ خاکوانیوں اور ترینوں میں آپس میں کافی رشتے ہیں۔ میرے نانا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ترین تھے، سرائیکی ترین پٹھان خاصی بڑی تعداد میں ہیں، اگر چہ ان کا تعلق پشین کے پشتون ترین قبیلے ہی سے ملتا ہے، تاہم ڈی آئی خان، ملتان، بہاولپور میں سرائیکی ترین ہی آباد ہیں۔ میری والدہ محترمہ سرائیکی بولتی تھیں۔ والدہ صاحبہ بہت عبادت گزار اور نرم مزاج خاتون تھیں۔ ماں تو ماں ہوتی ہے۔ میری ماں ایک مثالی خاتون تھیں۔ وہ نہ صرف ہم بچوں پر سب کچھ نچھاور کر دیتی تھیں بلکہ دیگر لوگوں اور خاندان کا بھی بہت خیال رکھتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں بچپن میں پیاز بالکل نہیں کھاتا تھا اور ہر ایسی چیز جس میں پیاز ہوتا تھا اسے نہیں کھاتا تھا۔ والدہ صاحبہ پورے گھر کے لیے الگ سالن بناتی تھیں اور میرے لیے الگ سالن بناتی تھیں۔ ماں جی بہت زیادہ تو پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن ان کا ادبی ذوق خوب تھا۔ انہوں نے پرانے وقتوں میں میٹرک کیا تھا۔ والدہ نے کچھ افسانے بھی لکھے تھے جو ''زیب النساء'' اور ''حور'' نامی پرچوں میں شائع ہوئے تھے۔ ان کی تحریر بڑی پختہ اور شگفتہ تھی۔ وہ خواتین کے ڈائجسٹ بڑے شوق سے پڑھتی تھیں۔ ماں جی کا انتقال 2 جون 2019ء میں ہوا۔ اس عظیم ہستی کے انتقال کے بعد زندگی میں ایک بہت بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ میں اپنی ماں جی کے بعد بالکل تنہا ہو گیا ہوں۔ شور تکلیف دیتا ہے، خاموشی سے ڈر لگتا ہے، بال الجھے رہتے ہیں اور ہر لمحہ اداسی کی کیفیت رہتی ہے۔ بس میرے پاس الفاظ نہیں کہ اپنی ماں جی کی شخصیت کا صحیح معنوں میں احاطہ کر سکوں۔

میرے ماموں امین ترین انگریزی زبان کے سینئر صحافی تھے۔ ان کی وفات پر روزنامہ نوائے وقت نے ایڈیٹوریل نوٹ لکھا تھا۔ 1937ء میں علامہ اقبال کی ہدایت پر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بنی تو اس کے سیکرٹری میرے ماموں تھے، حمید نظامی اس کے صدر تھے، مولانا عبدالستار خان نیازی بھی اس میں شامل تھے۔ تحریک پاکستان میں جب اسلامیہ کالج لاہور کے طلبا نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا تو اس میں میرے ماموں بھی شامل تھے۔ ماموں جان پنجاب یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ تھے۔ یہ اس زمانے کے گولڈ میڈلسٹ تھے جب پورے پنجاب اور خیبر پختونخواہ میں ایک ہی یونیورسٹی تھی۔ اسی زمانے میں ماموں جان کینیڈا چلے گئے، وہاں سے انہوں نے مزید تعلیم حاصل کی اور پلاننگ کمیشن پاکستان میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جلد ہی انہوں نے یہ جاب چھوڑ دی اور کراچی میں صحافت کا آغاز کیا۔ وہ بنیادی طور پر انگریزی زبان کے صحافی تھے۔ انہوں نے 1958ء میں پاکستان میں انگریزی زبان کا منفرد اخبار روزنامہ ''بینک انشورنس نیوز'' جاری کیا۔ پھر اردو ڈائجسٹ طرز کا ایک پرچہ ''پاکستان ڈائجسٹ'' نکالا۔ یہ ڈائجسٹ بھی انگریزی زبان میں تھا۔ پاکستان پوسٹ اخبار جاری کیا، اس کے بعد انہوں نے انگلینڈ سے ایک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اخبار ''ایشیانیوز'' نکالا۔ امین ترین کا ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے ساتھ اچھا تعلق تھا۔ انہیں بعد میں تحریک پاکستان ورکرز کی طرف سے گولڈ میڈل بھی دیا گیا تھا۔ یہ گولڈ میڈل میں نے ہی وصول کیا۔ پیپلز پارٹی کے شیخ رفیق احمد نے مجھے بتایا تھا کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے جس انداز سے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا وہ سب کچھ میرے سامنے ہے۔ شیخ صاحب نے میرے ماموں کا بھی ذکر کیا اور انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں نے تحریک پاکستان میں ان کی جدوجہد کا خود مشاہدہ کیا تھا۔

میرے بڑے بھائی طاہر ہاشم خاکوانی نے بھی وکالت کی، مگر پھر پچھلے چند برسوں سے وہ ملوں کی ایڈمنسٹریشن سے منسلک ہوگئے ہیں۔ ان میں جلال والد مرحوم والا ہے، مجھے اکثر طعنہ دیتے کہ تم میں پٹھانوں والی بات نہیں، پڑھ لکھ کر خراب ہوگئے ہو۔ بھائی سیاسی اعتبار سے پکے مسلم لیگی ہیں، زمانہ طالب علمی میں ایم ایس ایف کا حصہ رہے، اب شریف برادران کے اسیر ہیں۔ انہیں یہی شکوہ رہتا ہے کہ تم اپنے کالموں میں عمران خان کے لتے کیوں نہیں لیتے اور مسلم لیگی حکومت کے ''عظیم الشان کارنامے'' تمہیں نظر نہیں آتے۔ میں جواب میں یہی عرض کرتا ہوں کہ آپ کی عینک سے نہیں دیکھتا، اس لئے مجھے وہ کارنامے نظر نہیں آتے۔ جب وہ گھر آئیں تو ہماری گھنٹوں دھواں دھار بحث ہوتی ہے۔ موضوع دو ہی ہوتے ہیں: سیاست یا پھر کرکٹ۔ کرکٹ میں تو خیر اتفاق رائے رہتا ہے، مگر سیاست میں ہم متضاد موقف کے حامی ہیں۔ دو خاکوانی (چلئے مجھے نیم خاکوانی تصور کرلیں) جب بحث کریں تو کیسا شور ہوگا، اس کا اندازہ خاکوانیوں کو جاننے والا ہی کرسکتا ہے۔ اس کے باوجود کبھی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ اللہ بھائی کو زندگی، صحت کے ساتھ قائم رکھے، وہ میرے والد کی جگہ پر ہیں۔ میری دو بڑی بہنیں ہیں۔ کالم وہ کبھی کبھار ہی پڑھ پاتی ہیں، لیکن زبانی کلامی حوصلہ افزائی کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں۔ میرا ایک بھانجا محمد علی خاکوانی حال ہی میں مقابلے کا امتحان پاس کرکے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل بنا ہے۔ وہ سی ایس ایس کی تیاری کے سلسلہ میں چار سال میرے پاس لاہور رہا۔ اسے یہاں پر رہ کر کالم پڑھنے کی عادت پڑگئی، اب وہ کبھی کبھار کسی کالم کو پڑھ کر فون کرتا اور داد دیتا ہے۔ میرے ایک دو کالموں میں اس کے دوستوں کے حوالے سے بعض واقعات آگئے تھے، وہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ اس وقت تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ آپ نے میرے ان دوستوں کو اتنے غور سے دیکھا یا ان کی باتیں سنی تھیں۔

جب یہ اخبار نویس 1996ء میں قلم کا تیشہ کاندھے پر رکھے شہر لاہور میں وارد ہوا۔ اسے خوش قسمتی ہی کہیے کہ آتے ہی ایک قومی جریدے ''اردو ڈائجسٹ'' میں ملازمت مل گئی بلکہ ملازمت کا عندیہ لاہور آنے سے پہلے ہی دیا جاچکا تھا۔ ایک قریبی دوست کے ساتھ رہائش کا معاملہ بھی طے پا گیا۔ ایک دو ماہ تک جب معاملات بہتر ہونے لگے تو سوچا صوفیوں کے شہر میں ہوں اور کسی بابے کو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تلاش کرنا چاہیے جہاں سے کچھ فیض حاصل کیا جا سکے۔ انہی دنوں ممتاز مفتی کی کتاب ''الکھ نگری'' پڑھی تھی جس کا انتساب لاہور کے ایک صوفی سرفراز شاہ صاحب کے نام تھا۔ ان کی تلاش شروع کر دی۔ معلوم ہوا کہ 212 سی، جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتے ہیں اور جمعہ کے روز ان کی محفل بجتی ہے۔ اگلے جمعے ان کے ہاں جا پہنچا، کچھ ہی دیر انتظار کے بعد میری باری بھی آ گئی۔ شاہ صاحب کے قریب جا کر بیٹھا تو انہیں ایک نظر دیکھ کر حیرت ہوئی۔ سادہ شخصیت، کلین شیو، چہرے سے متانت اور سنجیدگی مترشح تھی، روایتی پیروں والا ان کا کوئی حلیہ نہ تھا۔ وضع قطع سادہ اور گفتگو شائستہ اور متین تھی۔ میں نے اپنے صحافتی کیریئر کے متعلق دعا کا کہا تو انتہائی مختصر جواب دیا کہ اللہ خیر کرے گا۔ اس کے بعد قریب پڑی ''ٹافی'' اٹھا کر دے دی، ہم نے وہ ٹافی منہ میں رکھی اور حیران ہو کر لوٹ آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا یہی طریقہ ہے۔ کسی سے لیتے دیتے کچھ بھی نہیں، جو آتا ہے اس کے لیے دعا کرتے ہیں۔ تعویز دیتے ہیں اور نہ کوئی وظیفہ بتاتے ہیں۔ محسوس ہوا کہ انہیں پیر بننے اور پیر کہلانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ بیعت لیتے ہیں اور نہ مرید بناتے ہیں بلکہ الٹا لوگوں کو پیروں سے ''گمراہ'' کرتے ہیں، کہتے ہیں اللہ پر بھروسہ کرو، اس کی رضا پر راضی رہو، پیروں کے پاس دعا کے لئے جانے کا کیا فائدہ۔ روحانیت پر ان کی سات کتابیں 'کہے فقیر، فقیر رنگ، فقیر نگری، لوح فقیر، نوائے فقیر، ارژنگ فقیر اور عرض فقیر شائع ہو چکی ہیں۔

سید سرفراز شاہ صاحب میرے روحانی والد اور مرشد ہیں۔ میری زندگی پر ان کے اثرات بے پناہ ہیں۔ شاہ صاحب اگر نہ ہوتے تو شاید صحافت اور کالم نویسی کے اس سفر میں کب کا ڈگمگا کر گر پڑتا۔ وہ اللہ والے ہیں، ان کی توجہ، محبت اور رہنمائی میرے ساتھ ہمیشہ رہی۔ جب چاروں اطراف سے تاریکیوں نے میرے اوپر یلغار کی، شاہ صاحب کی ذات کسی لائٹ ہاؤس کی مانند میرے سامنے موجود رہی، ان کی شخصیت سے پھوٹنے والی امید کی کرنوں نے گھٹا ٹوپ اندھیرے چاک کر ڈالے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس نیکی کا اجر ملا کہ شاہ صاحب کی صحبت نصیب ہوئی، یہ یقیناً میری والدہ کی دعائیں ہوں گی جو قبول ہوئیں اور رب تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں میں سے ایک کو میرے جیسے گناہ گار شخص کی رہنمائی، مدد کے لئے مقرر کر دیا۔ میں سرفراز شاہ صاحب کا از حد شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ زندگی صحت کے ساتھ ان کا سایہ میرے جیسے لوگوں پر قائم رکھے، آمین۔

میں نیواں میرا مرشد اُچا، اساں اُچیاں نال لگائی
صدقے تھیواں اُنہاں اچیاں تے، جنہاں نیویاں نال نبھائی

میرا بچپن احمد پور شرقیہ کے گلی کوچوں ہی میں گزرا۔ میں شرارتی بچہ نہیں تھا بلکہ بہت ہی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شریف تھا اور والدین کی ہر بات کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے والا تھا۔ والد صاحب ہماری پڑھائی اور تربیت کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ ان کا حکم تھا کہ مغرب کے بعد گھر سے باہر ہرگز نہیں نکلنا۔ آوارہ قسم کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کو بہت ناپسند کرتے۔ ایک مرتبہ میں لڑکوں کے ساتھ نہر پر نہانے کے لیے چلا گیا تو واپسی پر والد صاحب نے میری پٹائی کر دی تو اس کے بعد میں نہر پر کبھی نہیں گیا۔ میں نے سوچا کہ اگر نہر پر نہانے کے بعد مار ہی کھانی ہے تو اس سے بہتر ہے کہ بندہ گھر پر ہی نہا لے۔ ہمارے گھر میں پیسے کی بہت زیادہ ریل پیل اور خوشحالی تو نہیں تھی لیکن اللہ کے فضل و کرم سے تنگی بھی کسی قسم کی نہ تھی۔ والدین نے ہماری ہر ضرورت پوری کی۔ ہمیں اچھا کھلایا پلایا اور پہنایا اور اچھی تربیت کی۔ ہمارے گھر میں ریڈیو، ٹی وی کچھ بھی نہیں تھا۔ والد صاحب ان کے سخت خلاف تھے، وہ کہتے تھے اس سے وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ شاید اس لیے ہم پڑھ بھی گئے اور واقعی ہمارا وقت ضائع نہ ہوا۔

والد صاحب کا اچھا بھلا کتب خانہ تھا اور ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے ان سے کوئی بات پوچھی ہو اور انہیں اس کے متعلق معلومات نہ ہوں۔ گریجوایشن کی سطح کا میں نے انگریزی زبان کا جو بھی جملہ یا لفظ ان سے پوچھا انہوں نے مجھے فوری طور پر سمجھا دیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ ان کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ سکول کے دنوں میں جب مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت زیادہ شوق ہوا تو ان دنوں میں والد صاحب کے ساتھ بریلوی دیوبندی بحث بہت کیا کرتا تھا۔ ان دنوں ہمارے علاقے کی فضا بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس وقت ہمارے علاقے میں ان دونوں مکاتب فکر کے مابین بڑے مناظرے ہوا کرتے تھے اور مجھے بھی شوق پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوتے تھے جن پر ''مولانا منظور بھٹی کی للکار اور شمشاد سلفی کا فرار'' جیسی عبارتیں درج ہوتی تھیں۔ اسی طرح مولانا عبدالستار تونسوی صاحب کے مناظرے بھی عروج پر تھے۔ ایک مرتبہ میں نے والد صاحب کے ساتھ اس بات پر بڑی طویل بحث کی کہ جنازے کے بعد دعا نہیں مانگنی چاہیے اور یہ بدعت ہے۔ والد صاحب کا نقطہ نظر تھا کہ مرحوم کے لیے جتنی بھی دعا مانگی جائے اتنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ بحث زیادہ بڑھ گئی تو والد صاحب نے گھر والوں سے کہا کہ میں تم لوگوں کو وصیت کرتا ہوں کہ آپ نے میری نماز جنازہ کے بعد میرے لیے ضرور دعا کروانی ہے۔ انہوں نے قریب بیٹھے میرے بڑے بھائی سے کہا کہ تم لوگوں نے عامر کی بات نہیں ماننی اور میرے لیے دعا کروانی ہے۔ ویسے والد صاحب میں فرقہ واریت بالکل بھی نہیں تھی۔ ان کی بہت بڑی لائبریری تھی جس میں ہر مسلک اور ہر موضوع پر ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ میں نے ان کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لائبریری سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ ان کی لائبریری ہی سے میں نے شورش کاشمیری کے جریدے چٹان اور سید قاسم محمود کے شاہکار انسائیکلو پیڈیا کی فائلیں پڑھیں۔ والد مرحوم صوفی منش تھے، ان میں فرقوں کے حوالے سے تعصب بالکل نہیں تھا۔ یہی تلقین کرتے کہ بطور مسلمان شناخت بناؤ، بریلوی، دیوبندی کے چکر میں نہ پڑو۔ والد صاحب ہمیں کہا کرتے تھے کہ کسی بھی مسلک کو اپنے اوپر بوجھ نہ بناؤ۔ بس اپنی شناخت مسلمان کے طور پر بناؤ اور مسالک کے فروعی اختلافات میں مت الجھو۔ وہ کہا کرتے تھے کہ چلیں زیادہ سے زیادہ اتنا کر لیجیے کہ مسلمانوں میں ایک بنیادی تقسیم اہل سنت اور اہل تشیع کی ہے اس کے علاوہ کوئی تقسیم نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ بھی تقسیم اس لحاظ سے ہے کہ ان دونوں کی فقہ ہی مختلف ہے۔

میں نے گورنمنٹ صادق عباسی ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور صادق ڈگری کالج سے ایف ایس سی اور ڈبل میتھ، فزکس کے ساتھ گریجوایشن کی اس کے بعد کراچی اپنے ماموں کے پاس چلا گیا اور جامعہ کراچی میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ میرے ماموں مستقل طور پر کراچی میں رہتے تھے اور یہ شہر میرا ایک طرح سے ننھیالی شہر بنا ہوا تھا۔ میں نے جامعہ کراچی میں داخلہ لیا تو وہاں کے حالات بہت خراب تھے، امن وامان کی صورتحال بہت دگرگوں تھی۔ یونیورسٹی میں اکثر ہنگامے ہوتے، گولیاں چلتی تھیں اور لڑکے قتل ہوتے تھے۔ یہ 1992ء میں مہاجر طلبہ تنظیم پی ایم ایس او کا بدترین دور تھا۔ اس وقت کراچی میں زبردست فوجی آپریشن ہوا اور اس کے بعد ہی کچھ سکون ہوا۔ کراچی میں مختلف لائبریریوں میں جاتا تھا اور کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کیا کرتا۔ 1994ء میں نے ایل ایل بی کیا۔ لاء کرنے کے بعد میں واپس آیا تو پھر والد صاحب کے پاس بھی لاء ہی کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ والد صاحب لاہور ہائی کورٹ کے سینئر وکیل تھے۔ میں نے کچھ سینئر وکلاء کے ساتھ اپرنٹس شپ بھی کی۔ 1996ء میں مجھے اردو ڈائجسٹ لاہور میں الطاف حسن قریشی صاحب کے ہاں سب ایڈیٹر کی نوکری مل گئی، تب سے اب تک صحافت ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔

اپنے سکول کے اساتذہ کا ذکر خیر کروں تو ان میں ایک استاد رضاء اللہ خان صاحب تھے، بڑے محنتی اور اچھے انسان تھے۔ یہ مارتے بالکل بھی نہیں تھے اور ان کے پڑھانے کا انداز بہت اچھا تھا۔ وہ جو بھی مضمون پڑھاتے اس کی ٹیوشن کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ ایک استاد احمد شاہ صاحب تھے، میں ان سے ساتویں اور آٹھویں میں پڑھتا رہا، انہوں نے ہماری انگریزی زبان بہت مضبوط کی۔ نصر اللہ خان اور راشد صاحب بھی اچھے اساتذہ تھے، ایک خدا بخش عارف تھے۔ میں پڑھائی کے معاملے میں اچھا سٹوڈنٹ تھا۔ ٹاپ کرنے والا تو نہیں، مگر اوسط سے اوپر ہی تھا، تھرڈ ائیر میں سکینڈ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پوزیشن بھی لی، جس میں کالج کی طرف سے انعام بھی ملا۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا حنیف ندوی کی کتاب افکار ابن خلدون تھی۔ میرا پسندیدہ مضمون تو کوئی خاص نہیں تھا کیونکہ میں نے اپنے آپ کو بہت بعد میں ''ڈسکور'' کیا۔ یعنی میری اردو میں دلچسپی ہونی چاہیے تھے لیکن یہ چیز طالب علمی کے زمانے میں سامنے نہ آسکی۔ میٹرک میں میرے سب سے زیادہ نمبر اردو مضمون میں تھے۔ میں فرسٹ ڈویژن لینے والا طالب علم تھا۔ اس زمانے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کر لینا بہت بڑی بات سمجھی جاتی۔ ریاضی اور سائنس کے مضامین بھی میں نے بہت شوق سے پڑھے۔

میں کالج کے زمانے میں طلبہ سیاست میں فعال تو نہیں تھا، مگر ان دنوں طلبہ یونین کے الیکشن ہوئے، یہ بے نظیر بھٹو نے اپنی پہلی حکومت میں کرائے تھے، میں نے یونین انتخابات میں ایم ایس ایف کو سپورٹ کیا تھا حالانکہ اس کے مقابلے میں سرائیکی سٹوڈنٹس فیڈریشن تھی۔ میں اپنے آپ کو مسلم پاکستانی نیشنلسٹ کہتا ہوں، کسی حد تک سرائیکی قوم پرست بھی، مگر مثبت انداز میں۔ اپنی دھرتی اور اپنی ماں بولی کے ساتھ مجھے بہت محبت ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں کسی دوسری زبان یا نسل سے نفرت کرتا ہوں۔ میں زمانہ طالب علمی میں نواز شریف کو بہت پسند کرتا تھا۔ دلچسپ بات دیکھیں کہ میرے والد صاحب اینٹی پیپلز پارٹی تھے لیکن میری والدہ کی شادی میں بیگم نصرت بھٹو نے شرکت کی تھی۔ میرے والد صاحب میں وسعت ظرفی بہت تھی۔ 1977ء کے انتخابات میں والد اور پورا خاندان پی این اے کا حامی جبکہ والدہ پیپلز پارٹی کی جانب سے پولنگ ایجنٹ تھیں۔ والدہ پیپلز پارٹی کی حامی تھیں اور والد صاحب مسلم لیگ کے لیکن گھر میں اس حوالے سے کبھی ناخوشگواری پیش نہ آئی تھی۔ جب بھٹو صاحب کو پھانسی ہوئی اور روزنامہ وفاق میں سپر لیڈ لگی تو اس دن میری والدہ سارا دن روتی رہیں اور ہمارے گھر کھانا نہ پک سکا، والد بھی والدہ کے احترام میں خاموش ہی رہے، کوئی ایسا تبصرہ نہ کیا جو دل آزاری کا باعث بنے۔ یہ چیزیں میں نے لاشعوری طور پر اپنے گھر سے سیکھیں اور بعد میں اپنی عملی زندگی میں، اپنے گھریلو رشتوں میں اپنائی، الحمدللہ۔

یہاں میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ میرے اساتذہ بہت اچھے تھے، محنت کرنے والے تھے لیکن جہاں تک میرے ادبی اور صحافتی ذوق کا تعلق ہے اس میں براہ راست کسی استاد کا کردار نہیں تھا۔ بس صحافت اور اردو ادب کے متعلق میرا معاملہ ''تلمیذ الرحمٰن'' والا ہے۔ لاہور عملی صحافت شروع کرنے کے بعد کئی ساتھی صحافیوں نے پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم میں ماسٹر کیا، ڈیپارٹمنٹ والے حاضری کے معاملے میں رعایت بھی دے دیتے تھے، مگر میں نے داخلہ نہیں لیا۔ کبھی یہ کہا تو نہیں، مگر آج مان رہا ہوں کہ لاشعور میں کہیں یہ خیال دامن گیر تھا کہ کل کو اس کام کا کوئی استاد کہہ دے گا کہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یہ خاکوانی میرا شاگرد ہے۔ شاگرد ہونا کوئی بری بات نہیں مگر اصل شاگرد فکری طور پر ہوتا ہے یا جس کی تربیت کی جائے، کسی تعلیمی ادارے میں معمول کی ڈگری لے لینے سے حقیقی معنوں میں کوئی شاگرد نہیں بن جاتا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میری ادبی، علمی اور صحافتی زندگی میں ''سب رنگ ڈائجسٹ'' کا کلیدی کردار رہا ہے۔ میں نے سب رنگ بہت زیادہ پڑھا ہے اور اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس نے کئی نسلوں کی علمی اور ادبی تربیت کی ہے۔ میری مطالعاتی زندگی میں سب رنگ ڈائجسٹ کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اس کے لیجنڈری مدیر شکیل عادل زادہ کا میں بہت زیادہ مداح ہوں اور ان کا ممنون بھی ہوں۔ سب رنگ ڈائجسٹ نے اپنے قارئین میں ادبی ذوق پیدا کیا اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب سے بھی انہیں متعارف کرایا۔ پریم چند، منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی صاحب کو وہیں پہلے پڑھا۔ اسد محمد خان، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، انتظار حسین سے لے کر کئی بہت عمدہ، مگر نسبتاً غیر معروف لکھاریوں جیسے قاضی عبدالستار، ابوالفضل صدیقی، سید رفیق حسین، آغا اشرف، جیلانی بانو اور غیاث احمد گدی وغیرہ سے بھی تعارف ہوا۔ شوکت صدیقی کا شہرہ آفاق ناول جانگلوس وہیں پڑھا۔ شکیل عادل زادہ کے ناول ''بازی گر'' نے میرے اوپر سب سے گہرا اثر ڈالا۔ اس طلسماتی ناول کو درجن سے زیادہ بار پڑھ چکا ہوں، جی نہیں بھرا۔

زمانہ طالب علمی ہی سے میرا خیال تھا کہ وکالت کرنا ہے یا پھر صحافت۔ میں نے اردو ڈائجسٹ میں 6 فروری 1996ء میں بطور سب ایڈیٹر صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ساڑھے تین سال کے بعد روزنامہ جنگ جوائن کر لیا۔ جنگ میں تین سال کام کرنے کے بعد یکم جون 2002ء میں روزنامہ ایکسپریس جوائن کر لیا۔ میں ایکسپریس کے میگزین صفحات کا بانی ایڈیٹر تھا۔ روزنامہ ایکسپریس ہی میں مَیں نے فروری 2004ء کے اوائل میں ''زنگار'' کے عنوان سے مستقل کالم لکھنا شروع کیا۔ دس سال ایکسپریس میں کام کرنے کے بعد اگست 2012ء میں بطور میگزین ایڈیٹر، کالم نگار روزنامہ دنیا کی بانی ٹیم کا حصہ بنا۔ دنیا اخبار ہی میں میں نے ڈائجسٹ ایڈیشن شروع کیا جس کی پیروی بعد میں بہت سے اخبارات نے کی۔ پونے پانچ سال کے لگ بھگ دنیا اخبار میں کام کرنے کے بعد جنوری 2017ء میں روزنامہ 92 نیوز کی بانی ٹیم میں شامل ہوا۔ اب گزشتہ تین سال سے اسی اخبار میں بطور میگزین ایڈیٹر، کالم نگار کام کر رہا ہوں۔ دلچسپ بات ہے کہ میگزین ایڈیٹر ہونا میری مرکزی ملازمت ہے، مگر شناخت بطور کالم نویس ہی ملی۔ مجھے آج تک کبھی کسی نے میگزین ایڈیٹر کی بنیاد پر دعوت نامہ نہیں بھیجا یا ملنے کی خواہش نہیں کی۔ جو ریڈرشپ یا کسی حد تک فین شپ ہے، وہ کالموں کی وجہ سے ہے۔ اللہ نے کالم ہی عزت کا باعث بنائے، اگرچہ میرا یہ خیال ہے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کہ بطور میگزین ایڈیٹر میری کارکردگی بری نہیں رہی، بلکہ بعض کے نزدیک تو بہت اچھی رہی۔
میں نے اپنے کالموں میں کئی نئے تجربات کیےاور اردو کالم کے کینوس کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ کرنٹ افیرز پر بھی کالم لکھے لیکن خود کو محدود نہ کیا اور بہت سے دیگر موضوعات پر بھی لکھا۔ ان کالموں کی تازگی آج بھی برقرار ہے۔ میں نے ادب، تاریخ، تصوف، روحانیت، سیاست اور سماجی اشوز سے لے کر سپورٹس اور موٹیویشنل موضوعات پر بہت لکھا۔ ان کالموں کا انتخاب تین سال پیشتر ''زنگار'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ عسکریت پسندی، طالبانائزیشن اور اسلامی و جہادی تحریکیں بھی میرے پسندیدہ موضوع ہیں۔ ان موضوعات پر میری کتاب زیرِ طبع ہے۔ میرے کالموں کے انتخاب پر مشتمل ایک مجموعہ ''زنگار نامہ'' کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں گزشتہ آٹھ برسوں میں شائع ہونے والے صرف وہی کالم منتخب کیے گئے جن کی تازگی آج بھی برقرار ہے۔ یہ کالموں کا مجموعہ نہیں بلکہ بے رحم انتخاب ہے اور 900 سے زائد کالموں میں سے منتخب کئے گئے صرف 90 کالم ہیں۔ مجھے کتابوں سے بے حد محبت ہے۔ ارادہ ہے کہ اپنی پسندیدہ کتابوں پر الگ سے کتاب لکھوں۔

پہلا کالم 1993ء میں جنگ میں چھپا میرا پہلا کالم 1993ء میں شائع ہوا تھا۔ کالم لکھنے کی خواہش مگر اس سے بھی پرانی تھی۔ 1980ء کے عشرے سے ارشاد احمد حقانی جیسے لکھاریوں کے کالم پڑھتے پڑھتے لگتا کہ شاید اپنے ذہن میں میں خود بھی کالم لکھ رہا ہوں۔ مجھے 27 سال پہلے، کراچی کی وہ بھیگی صبح یاد آتی ہے جب میں اپنا پہلا کالم لے کر روزنامہ ''جنگ'' کے دفتر گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آٹھ اے کی بس میں بیٹھ کر ٹاور سے گزرتا میں آئی آئی چندریگر روڈ جنگ کے دفتر پہنچا۔ ہاتھ میں کالم کا لفافہ تھا۔ ریسپشن والے نے ادارتی سیکشن سے کسی کو بلانے سے صاف انکار کر دیا اور بولا کہ جو کچھ دینا ہے، ادھر ہی جمع کرا دیں۔ کالم جمع کرا کر میں واپس اپنے ماموں کے گھر آ گیا۔ اگلے روز صبح صبح اٹھ کر باہر گیراج میں گیا، جہاں ہاکر جنگ اور ڈان اخبار پھینک کر جاتا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اخبار کھولا اور پھر وہ منظر، وہ لمحہ...... دل میں گویا نقش ہو کر رہ گیا۔ میرا کالم ''ٹرائیکا کی آئینی وسیاسی حیثیت'' جنگ کے ادارتی صفحے کے اپر ہاف پر ارشاد احمد حقانی صاحب کے کالم کے ساتھ چھپا ہوا تھا۔ ناقابلِ یقین حیرت کے ساتھ میں نے کالم پڑھنا شروع کیا۔ صرف ایک لفظ تبدیل کیا گیا تھا، باقی ویسے ہی چھپا۔ آج بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ ایک طالب علم کا ریسپشن پر دیا گیا کالم جنگ جیسے بڑے اخبار میں کس طرح شائع ہو سکتا ہے، جبکہ وہاں ادارتی سیکشن کے پاس درجنوں کالم شائع ہونے کے انتظار میں رکھے ہوتے ہیں۔ ان دنوں جنگ کے ایڈیٹر ایڈیٹوریل ارشد امام تھے۔ انہی نے یہ کام

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کیا تھا۔ ارشد امام صاحب، میں آپ سے کبھی نہیں ملا، آپ کو یاد بھی نہیں ہوگا کہ میرا پہلا کالم آپ نے شائع کیا۔ یہ طالب علم مگر آپ کا ممنون ہے، رہے گا۔ اگر وہ کالم شائع نہ ہوتا تو شاید میری زندگی کا رخ مختلف ہوتا۔ شاید صحافی کے بجائے، میں قانون دان بن جاتا، جس کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

میں نے 1996ء میں اردو ڈائجسٹ جوائن کیا اور اس میں ساڑھے تین سال کام کرنے کے بعد بطور سب ایڈیٹر (نیوز روم) روزنامہ جنگ جوائن کر لیا۔ جنگ میں تین سال کام کرنے کے بعد 2002ء میں روزنامہ ایکسپریس جوائن کر لیا۔ فروری 2004ء میں روزنامہ ایکسپریس کے اس وقت کے ایڈیٹر (آج کل گروپ ایڈیٹر) ایاز خان نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا کہ آپ اپنا کالم شروع کریں، سلطان لاکھانی سے اپروول لے لی ہے۔ ان دنوں میں ایکسپریس کے شعبہ میگزین کا انچارج تھا۔ ایاز خان کی اس غیر متوقع بات پر حیرت سے انہیں دیکھ کر میں نے پوچھا کہ کس طرح ایسا ہو گیا؟ ایاز صاحب کا کہنا تھا کہ میگزین میں آپ کی تحریریں پڑھ کر میرا اور عابد عبداللہ (ڈائریکٹر آپریشنز) کا خیال ہے کہ آپ سے کالم لکھوانے چاہئیں۔ ابھی جا کر اپنے کالم کا عنوان سوچیں اور آج یا زیادہ سے زیادہ کل تک پہلا کالم دے دیں۔ اگلے روز سے میرے کالم ''زنگار'' کا آغاز ہو گیا۔ میں ایاز صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ کالم نگار بننے کے میرے خواب کو عملی حقیقت بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایکسپریس کے اس وقت کے ایڈیٹوریل انچارج (آج کل ایڈیٹر ایڈیٹوریل) لطیف چودھری نے بھی کمال خندہ پیشانی سے ہمارے کالموں کو برداشت کیا۔ میں ہمیشہ آخری لمحوں میں لکھتا۔ کاپی فائنل ہونے کا وقت سات بجے ہوتا تو میرا کالم چھ بجے سے پہلے انہیں نہیں پہنچتا تھا۔ اکثر ایسے ہوتا کہ صرف میری وجہ سے ادارتی صفحہ رکا ہوا ہے، لطیف چودھری ہمیشہ دھمکی دیتا رہا کہ کالم روک لوں گا، مگر ہمیشہ اکاموڈیٹ کیا۔ میں ان کا بھی ہمیشہ ممنون رہوں گا۔

میرا کالم ''زنگار'' شروع ہوئے ایک ہفتہ بیت گیا۔ دو تین کالم شائع ہو گئے۔ خیال آیا کہ اگر ہفتے میں دو تین دن کالم لکھنا ہے تو پھر کوئی تھنکر ز فورم جوائن کرنا چاہیے۔ اردو ڈائجسٹ کے زمانے میں اپنے سینئر محسن فارانی صاحب سے سی این اے (کونسل آف نیشنل افیئر ز) کے بارے میں سن چکا تھا کہ لاہور کے اس تھنک ٹینک کی ہر جمعہ کو نشست ہوا کرتی ہے، جس میں لاہور کے بہت سے سینئر صحافی، تجزیہ کار، دانشور شریک ہوتے ہیں۔ سینئر صحافی سید ارشاد احمد عارف اس کے کنویز اور روح رواں ہیں۔ وہ ان دنوں ''نوائے وقت'' کے ڈپٹی ایڈیٹر تھے۔ ان سے ملنے نوائے وقت جا دھمکا۔ شاہ صاحب اپنی روایتی خوش خلقی سے ملے، چائے پلائی، ازراہ تلطف سی این اے میں شمولیت کی درخواست قبول کی۔ دوران گفتگو ان سے اپنے کالم کے بارے میں پوچھا، مسکرا کر کہنے لگے، میں نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پڑھے ہیں۔ پوچھا کہ آپ کو کیسے لگے؟ چند لمحوں کے توقف کے بعد ارشاد عارف صاحب نے کہا، ''میرے خیال میں پچاس سال سے پہلے کالم نہیں لکھنا چاہیے کہ اس سے پہلے آدمی ''یک رخا'' سوچتا اور لکھتا ہے۔ کالم کے لئے ضروری ہے کہ لکھنے والا متوازن سوچ رکھتا ہو اور جامع انداز میں لکھے۔'' یہ الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی مانند کان میں اتر گئے۔ مجھے یقین ہے کہ چہرہ سرخ ہوگیا ہوگا، غصے اور جذبات کی ایک شدید لہر اٹھی، بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر مگر کسی قدر گستاخانہ لہجے میں میں نے کہا، جناب دو باتیں ہیں، پہلی یہ کہ میرے جیسے بے شمار نوجوانوں کو محسوس ہوتا ہے کہ کالم نگار ہمارے لئے نہیں لکھ رہے۔ اس لئے میں اپنے جیسے لوگوں کی آواز بلند کرنے کے لئے کالم نگاری کی طرف آیا ہوں۔ دوسرا اہم نے صحافت میں ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو ساٹھ، ستر سال کے ہو چکے ہیں، مگر نہایت یک رخی سوچ رکھتے اور اسی انداز میں لکھتے ہیں۔ یہ کہہ کر اٹھ آیا۔ غصہ مگر بہت آیا تھا۔ واپسی پر موٹر سائیکل چلاتے بار ہا یہ خیال آیا کہ یہ پرانے کالم نگار ہم جیسے نوجوانوں کو کالم لکھتے دیکھنا ہی نہیں چاہتے، انہیں خود تو سفید بال ہونے پر موقعہ ملا، ہمیں بھی بوڑھا کر کے قلم پکڑانا چاہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ واقعہ برسوں میرے ذہن میں چبھتا رہا، آج تک ذہن کے نہاں خانوں میں تمام تر جزیات کے ساتھ محفوظ ہے۔ دو فائدے مگر اس کے ہوئے، جس کا اس وقت اندازہ نہیں تھا۔ جب کالم لکھنے بیٹھتا ہوں، ایک ترازو سا نظروں کے سامنے آجاتا ہے، لکھتے ہوئے یہی احساس رہتا ہے کہ یک رخا نہ ہوجائے، تمام تر پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے جامع رائے دی جائے اور ہر ممکن طور سے توازن برقرار رکھا جائے۔

شاہ صاحب (ارشاد احمد عارف) سے سی این اے میں بہت سیکھا، انہوں نے ہمیشہ بڑی محبت، شفقت اور سلیقے سے سمجھایا، سکھایا، کبھی اپنے سینئر، بڑے ہونے کا احساس نہ ہونے دیا۔ اب جا کر سمجھ آئی ہے کہ جہاندیدہ صحافی نے ایک نوجوان پر جوش نئے کالم نگار کی حوصلہ شکنی نہیں کی، بلکہ بڑی بنیادی بات یوں سمجھائی کہ تا عمر وہ ساتھ چلے۔ آج بہت سے پڑھنے والے یہ پوچھتے ہیں کہ آپ اتنے توازن اور اعتدال سے کالم کیسے لکھ لیتے ہیں؟ ہارون الرشید صاحب نے ایک بار کہا، خاکوانی، لگتا ہے آپ ترازو ہاتھ میں رکھ کر کالم لکھتے ہیں۔ وجہ آج بیان کر دی۔ شکریہ ارشاد عارف صاحب، سی این اے کی محفلوں میں آپ سے بہت کچھ سیکھا۔ خاص کر دوسروں کی طویل تقریریں تحمل سے سننا اور مخالفانہ تنقید کو برداشت کرتے ہوئے شائستگی سے اپنا نقطہ نظر بیان کرنا آپ پر ختم ہے۔ ذاتی انکسار اور جونیئرز کی حوصلہ افزائی بھی ارشاد عارف صاحب میں کمال حد تک موجود ہے۔ سی این اے کی محفلوں میں گاہے حیرت بھی ہوتی تھی کہ اس قدر آؤٹ آف داوے جا کر کسی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نوجوان کی بے سروپا گفتگو سنی اوراس پر حوصلہ افزا مسکراہٹ نچھاور کی جا سکتی ہے، یہ شاہ صاحب کا خاصہ ہے۔

میرے کالم کا مستقل عنوان ''زنگار'' ہے۔ بہت لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ نام کیسے رکھا، کس نے تجویز کیا۔ یہ مشورہ غلام محی الدین کا تھا، میرے جنگ کے زمانے کے دوست اور ایکسپریس کے موجودہ میگزین انچارج غلام محی الدین۔ غلام محی الدین اور میں نے روزنامہ جنگ ایک ہی دن جوائن کیا تھا۔ یہ تعلق دوستی کے رشتے میں بدل گیا۔ ایکسپریس میگزین گیا تو جواد نظیر صاحب جو بانی ایڈیٹر تھے، ان سے محی الدین کو لانے کا بھی کہا۔ یوں غلام محی الدین ہمارے ساتھ ایکسپریس میگزین میں آ گئے۔ محی الدین ایک صاحب علم اور نہایت ذہین صحافی ہے، جس نے اپنے اوپر ایک سست الوجود، کاہل اور موٹی کھال والے شخص کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اس کے کرخت چہرے اور گھورتی ہوئی چھوٹی درشت آنکھیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص سونے کا دل کا مالک ہے۔ جو دوستوں پر لاکھوں لٹا دے اور پھر زندگی بھر مڑ کر دیکھے، نہ کبھی حوالہ دے۔ میں کبھی کالم نہ لکھ سکتا، اگر محی الدین جیسا دوست میسر نہ ہوتا۔ جس نے میگزین میں ایسا ٹینشن فری ماحول بنایا کہ یکسو ہو کر کام کر سکا۔ ہر کڑے وقت میں وہ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا رہا۔ ہر مشکل لمحے کو اپنی حوصلہ افزائی، فلک شگاف قہقہے اور زندہ جاوید مسکراہٹ سے آسان بنا دیتا۔ کالم کا نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو غلام محی الدین نے ''زنگار'' کا مشورہ دیا۔ ایکسپریس کے ایڈیٹر ایڈیٹوریل لطیف چودھری کے کالم کا عنوان سمت نما بھی محی الدین ہی نے تجویز کیا تھا۔ زنگار کی اصطلاح غالب کے ایک شعر سے لی گئی ۔شعر مجھے یاد نہیں رہتے، بڑی مشکل سے یہ یاد کیا۔ امید ہے کہ درست لکھا جائے گا۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

زنگار دراصل وہ مادہ ہے جو شیشے کے پیچھے مل دیا جائے تو وہ آئینہ بن جاتا ہے۔ یعنی زنگار'' ویو'' دکھاتا ہے، اس کے بغیر آپ آئینہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ اصطلاح مجھے پسند آئی، کالم کا عنوان رکھ لیا۔ پچھلے برسوں میں سینکڑوں لوگوں نے اس کا مطلب پوچھا ہے۔ عام لغت میں بھی یہ لفظ نہیں۔ درجنوں جلدوں پر محیط لغت کبیر دیکھنی پڑتی ہے اس کے لئے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ شرمندگی سے پوچھتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ پھر انہیں یہی شعر سنانا پڑتا ہے، کوئی سند پوچھ لے تو پھر یہی شعر سنا کر چپ کرانا پڑتا ہے۔

روزنامہ ایکسپریس میں عباس اطہر صاحب کے بطور گروپ ایڈیٹر آنے سے پہلے میں ہفتہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں دو تین کالم لکھا کرتا تھا، مگر ناغے ہو جاتے۔ شاہ صاحب نے پہلے تو میرا کالم بند کر دیا۔

عباس اطہر (شاہ جی) روایتی دھڑے بندی والے آدمی تھے، وہ ایکسپریس میں نئے نئے آئے، ان کے ساتھ عبداللہ طارق سہیل بطور ایڈیٹر تھے، شاہ جی توصیف احمد خان کے سخت مخالف تھے، ادھر ایکسپریس کے ان سے پہلے موجود ایڈیٹر ایاز خان اتفاق سے توصیف احمد خان کے دوست تھے، سو شاہ جی نے ایاز خان کو اپنی ہٹ لسٹ پر رکھ لیا۔ وہ برملا کہتے کہ میرے دشمن کا دوست میرا بھی دشمن ہے۔ اب میں چونکہ پہلے سے میگزین انچارج اور کالم لکھ رہا تھا اس لیے شاہ جی کا خیال تھا کہ اسے ایاز خان نے رکھا ہے تو یہ اس کے گروپ کا بندہ ہے۔ حالانکہ میرے جیسا شخص کبھی گروپنگ کا حصہ نہیں بنتا، مجھے دفتری سیاست سے ویسے ہی چڑ ہے۔ میں شاہ جی کی خواہ مخواہ کی مخالفت کا نشانہ بنا۔ انہوں نے میرا ایک کالم روک دیا اور طنزاً کہا، جیسا کہ اس زمانے میں پرانے صحافیوں کا طریقہ تھا کہ جس کالم کو مردود قرار دینا ہو، اسے کہتے کہ یہ کالم نہیں جواب مضمون (Essay) ہے۔ میرا کالم بھی شاہ جی نے جواب مضمون کہہ کر بند کر دیا۔

میں بڑا دلبرداشتہ ہوا سرفراز شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، دعا کی درخواست کی۔ سرفراز شاہ مسکرائے اور بولے کہ فکر نہ کریں۔ کچھ ہی دنوں میں یہی صاحب آپ سے ہفتے میں تین کالم لکھنے کا کہیں گے۔ پھر وہی ہوا، عباس اطہر صاحب نے مجھے بلا کر کہا، آپ کے انداز میں کہانی کا عنصر شامل ہے، اسی سٹائل میں کالم لکھتے رہو، چار دن جاوید چودھری لکھتے ہیں، تین دن آپ لکھو، اسی جگہ آپ کا کالم بھی شائع ہو گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چونکہ انہی دنوں حسن نثار ایکسپریس چھوڑ کر جنگ جا چکے تھے۔ جاوید چودھری صاحب کے جانے کی افواہ تھی۔ عباس اطہر صاحب نے سلطان لاکھانی صاحب کو کہا کہ چودھری صاحب چلے جائیں، تب بھی میں سنبھال لوں گا۔ انہوں نے مجھے جاوید چودھری کی جگہ پر اسی انداز میں کالم لکھنے کا کہا۔ شائد وہ مجھے متبادل کے طور پر تیار کرنا چاہ رہے تھے۔ شاہ جی کا کہنا تھا کہ میں جاوید چودھری کے انداز میں کہانی کے سٹائل میں کالم لکھوں۔ میرے لئے مشکل یہ آن پڑی کہ ایک ہی اخبار میں اسی جگہ پر ایک شخص کہانی کے انداز میں کالم لکھ رہا ہے اور میں بھی اسی انداز میں لکھوں گا تو صاف پتہ چلے گا کہ یہ جاوید چودھری کو کاپی کر رہا ہے۔ شاہ جی کا اصرار تھا کہ نہیں اسی انداز میں لکھو۔ میں نے آہستہ آہستہ ان کی ہدایات سے انحراف کرنا شروع کیا۔ ایک ٹیکنیکل طریقہ یہ نکالا کہ ان موضوعات کا انتخاب کیا، جن پر چودھری صاحب نہیں لکھتے تھے۔ جیسے طالبانائزیشن پر لکھنا شروع کر دیا۔ ان دنوں ملا فضل اللہ کا زور تھا۔ سوات میں فضل اللہ کے حامیوں کی کارستانیوں کے خلاف لکھنا شروع کیا اور پھر القاعدہ، افغان طالبان، ٹی ٹی پی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

وغیرہ پر بہت لکھا۔ اردو میں اس پر لکھنے والے بہت کم تھے، اس کی پذیرائی ہوئی۔ پھر کتابوں پر لکھا، ریسرچ آرٹیکل لکھے، نئے نئے آئیڈیاز پر لکھا۔ ان دنوں پڑھتا بہت تھا۔ گھنٹوں ایک کالم پر محنت کرتا۔ اس کا ثمر بھی ملا۔ چودھری صاحب کی ریڈرشپ بہت تھی، اسی جگہ چھپتا رہا تو میری بھی ریڈرشپ بننے لگی۔ کئی لوگوں نے بعد میں مجھے لکھا کہ ہم تو جاوید چودھری کو پڑھتے تھے، آپ کا کالم جس دن آتا تو غصے سے کہتے کہ یہ کہاں سے آ گیا، مگر پھر پڑھنا شروع کیا تو آپ کے بھی مداح ہو گئے۔

میری رفتار مطالعہ خاصی تیز ہے، اس کی وجہ شاید کرائے کی کہانیاں کم وقت میں پڑھ کر کم کرایہ ادا کرنے کی کوشش تھی لیکن وہ رفتار مطالعہ بڑھانے میں بہت مددگار نسخہ ثابت ہوا۔ ایک ہی رات میں ''علی پور کا ایلی'' پڑھ ڈالی تھی۔ مطالعہ کے لیے کسی خاص ماحول کی ضرورت نہیں ہے بس موقع ملے، جہاں ملے پڑھنے کی چیز موجود ہو تو پڑھ لیتا ہوں۔ اب تو سفر ہی کم ہو گئے ہیں ورنہ سفر میں بھی پڑھتا تھا، نوٹس لینے کی خواہش تو ہمیشہ ہی رہی لیکن لے نہ سکا، خواہش ہوتی ہے کہ کچھ اہم کتابوں کے نوٹس لیے جائیں۔ مطالعہ کے ضمن میں یہی خواہش ہے کہ بچوں میں یہ ذوق پروان چڑھے، اس مقصد کے لیے بچوں کے تمام رسائل گھر لگوا رکھے ہیں۔ ہمارے دور میں مطالعہ کے شوق کی ایک اہم وجہ تو یہ بھی بنی کہ گھر میں ٹی وی نہ تھا، وقت گزارنے کے لیے کتابیں ہی واحد سہارا تھیں۔ اب ٹی وی، کارٹون چینل، سوشل میڈیا، کمپیوٹر، وڈیو گیمز اور نجانے کتنے مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اب یہ مشکل ہے کہ ٹی وی پر انسان وقت کا بہت سا حصہ ان معلومات کو حاصل کرنے میں لگا دے جس کا شاید اس کی زندگی میں کوئی کردار ہے نہ ہوگا۔

اللہ کا شکر ہے کتابیں ہمیشہ ذوق وشوق سے خریدیں، لکھنے لکھانے کی وجہ سے تحائف بھی ملتے رہے لیکن کبھی کنجوسی نہیں برتی۔ جو کتاب جہاں سے ملی ضرورت ہوئی تو خرید لی، اس لیے پانچ، چھ ہزار کتابیں تو گھر میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس میں میرے لیے اہم کتابیں تو وہ ہیں جو مجھے محترم سرفراز احمد شاہ صاحب نے اپنے دستخط کے ساتھ دیں۔ کسی انسانی تصنیف کو انسان اس طرح پڑھے کہ وہ بالکل اس میں کھو جائے اور سب سے بے نیاز ہو جائے ایسا تو مشکل ہے۔ قرآن کے علاوہ شاید ہی ایسا ہو سکے۔ شاید خطبات اقبال اور کلیات اقبال ایسے کتابیں ہیں جن میں انسان کھو جائے۔ اس کے علاوہ شیخ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم کو پڑھنا اور سمجھنا کافی وقت طلب کام ہے، اس کے ساتھ کوئی حصن حصین جیسی ذکر، اوراد کی کتاب بھی ضروری ہے اور ستار طاہر کی کتاب اس لیے ضروری ہے کہ دنیا بھر کی کتابوں کا خلاصہ میرے سامنے ہو اور میں اس سے لطف اندوز ہوتا رہوں۔ ملاقاتوں کے بارے کسی نے درست کہا تھا کہ جن کو پڑھو ان سے ملنے سے گریز کرو کیوں کہ بعض

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اوقات اچھا تاثر نہیں ملتا۔ بہر حال وزیر آغا، اشفاق احمد صاحب اور شہزاد احمد سے ملاقاتیں رہیں۔ مختار مسعود صاحب کسی تقریب میں موجود تھے وہاں ان کی مجلس میں کچھ دیر بیٹھا۔ وہ کمال کے انسان ہیں۔ میرے خیال میں مطالعہ کے ذوق رکھنے والے حضرات کو چاہیے کہ بلوغ العرب اور عربوں کی تاریخ کا مطالعہ ضرور کریں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ ہمارا گھرانہ مسلم لیگی تھا لیکن جب 6 فروری 1996ء کو باقاعدہ صحافت میں آ گیا تو اس وقت سے لے کر آج تک میں بتدریج شریف فیملی سے متنفر ہوتا گیا۔ لاہور آ کر جب اہم حلقوں میں اٹھنا بیٹھا ہوا اور شریف فیملی کے متعلق بہت زیادہ منفی باتیں سننے کو ملیں تو ان سے الرجک ہو گیا۔ مجھے یہ بات تو سخت ناپسند تھی کہ یہ کہاں کا اصول ہے کہ بڑا بھائی پرائم منسٹر ہو اور چھوٹا بھائی پنجاب کا چیف منسٹر۔ یہ بات تو اخلاقی طور پر بھی درست نہیں کہ اہم عہدے اپنی ہی فیملی میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ رفیق تارڑ صاحب کو صدر پاکستان بنانے پر بھی مجھے ان کا یہ احمقانہ فیصلہ لگتا تھا یہ سارے اہم عہدے پنجاب ہی کے لیے کیوں ہیں۔ صدر اور وزیر اعظم کو پنجاب سے بنانے کے لیے کوئی جسٹی فکیشن ہی نہیں ہے۔ موٹر سائیکل پر ڈبل سواری پر پابندی لگی تو میں نے اس کو سخت ناپسند کیا، پھر مجھے زیادہ غصہ اس پر آیا جب شہباز شریف نے کہا تھا کہ جب تک میں وزیر اعلیٰ ہوں یہ پابندی برقرار رہے گی۔ مجھے آج بھی احساس ہوتا ہے کہ اس وقت لوگ اس پابندی سے بہت تنگ آ گئے تھے۔ پھر مجھے نواز شریف کی یہ بات بھی سخت ناپسند تھی کہ جب بھی اقتدار میں آتے سرکاری نوکریوں پر پابندی لگا دیتے۔ کچھ دنوں کے لیے پابندی ہٹا دی جاتی ہے اور اپنے لوگوں کو نوکریاں دے کر پھر پابندی لگا دی جاتی۔ پیپلز پارٹی آ کر نوکریاں دیتی تھی اور یہ نوکریوں پر پابندی لگاتے تھے۔

عمران خان ناکام رہے لیکن انہیں وقت ملنا چاہیے جہاں تک عمران خان کی بات ہے تو یہ مجھے بطور کھلاڑی تو ہمیشہ پسند رہے لیکن میں نے انہیں سیاست میں 2013ء کے بعد پسند کرنا شروع کیا۔ جب اس نے تبدیلی کا واضح نعرہ لگایا تو مجھے ان کا یہ وژن پسند آیا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ بندہ ریفارمز کی بات کر رہا ہے تو اسے موقع ضرور ملنا چاہیے۔ یہاں بتاتا چلوں کہ میں ہمیشہ ریفارمز کا حامی رہا ہوں اور انقلاب کا حامی کبھی نہیں رہا۔ میں بتدریج (Gradual) اصلاحات اور تبدیلی کا حامی ہوں۔ میرا جو تھوڑا بہت مطالعہ ہے اور جتنی میں سمجھ رکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ انقلاب ہمیشہ نقصان پہنچاتا ہے اور خاص طور پر پاکستان جیسے ملکوں میں تو یہ بہت نقصان دہ ہے۔ اس کے بدلے ریفارمز ہونی چاہئیں اور سٹرکچر بدلنا چاہیے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

عمران خان نے مایوس تو بہت کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسے پورا وقت ملنا چاہیے۔ دیکھیں کہ عمران خان میں کچھ ایسی خوبیاں جو آج بھی ان میں باقی ہیں۔ ان کی ذاتی ایمانداری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ کرپٹ نہیں ہے۔ کوئی بندہ بھی عمران پر کرپشن کا جھوٹا الزام بھی نہیں لگا سکتا۔ حالانکہ جھوٹا الزام تو کسی پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت بڑی کریڈیبلٹی ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے فلاں پوسٹ کے بدلے میں چار کروڑ روپے لے لیے۔ عمران پر اخلاقی الزام لگ جاتے ہیں اور لوگ بھی ان الزامات کو مان لیتے ہیں لیکن جہاں تک کرپشن کی بات ہے اس حوالے سے ان پر کوئی الزام نہیں لگا سکتا۔ یہ عمران میں ایک ایسی خوبی ہے جو مین سٹریم سیاست میں کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ جماعت اسلامی کے پاس یہ چیز ہے لیکن مین سٹریم پارٹی کوئی بھی ایسی نہیں ہے۔ عمران خان کو چیزوں کی سمجھ نہیں اور اس کی ناتجربہ کاریاں اس کی بڑی خامیاں ہیں۔ پھر اس کے دائیں بائیں بہت برے لوگ ہیں، اس کے پاس اچھی ٹیم تو بالکل بھی نہیں۔ یوں عمران خان اپنی ناتجربہ کاری اور بری ٹیم کی وجہ سے ہی قوم کو مایوس کر رہا ہے۔ بیوروکریسی میں بھی خامیاں ہوں گی لیکن تحریک انصاف کی اپنی نالائقیاں بھی ہیں۔ دیکھیں اس سے بڑی اور کیا نالائقی ہوگی کہ عثمان بزدار جیسے شخص کو پنجاب اور محمود خان جیسے بندے کو خیبر پختونخواہ کا چیف منسٹر بنا دیا گیا۔ ان لوگوں کی بالکل ایک فیصد بھی کپیسٹی نہیں اور یہ لوگ ان عہدوں کے ہرگز اہل نہیں۔ عثمان بزدار صاحب ساری زندگی بھی وزیراعلیٰ رہیں تو وہ لوگوں سے بات کرنا نہیں سیکھ سکیں گے۔

اکادمی ادبیات اور اس جیسے دیگر علمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ عمران خان کی ٹیم میں مجھے کوئی ایک بندہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جو انہیں بتا سکے کہ فلاں بڑے ادیب یا صحافی کی اتنی خدمات ہیں اسے ایوارڈ ملنا چاہیے۔ ہارون الرشید، ارشاد احمد عارف، شامی صاحب جیسے لوگوں کو پچاس پچاس سال تو صرف صحافت میں ہو گئے ہیں انہیں ایوارڈ دیے جا سکتے ہیں۔ ان سے بہت کم تجربہ رکھنے والے صحافیوں کو مسلم لیگ نے ایوارڈز دیئے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عمران کافی حد تک ناکام ہو چکا ہے اور ابھی مزید ناکام ہونے کا خطرہ بہرحال موجود ہے۔ لیکن اس کو اپنی ٹرم پوری کرنا چاہیے کہ شاید وہ قوم کو کچھ نہ کچھ ڈیلیور کر جائے۔ اگر یہ کچھ بھی ڈیلیور نہ کر سکا اور کچھ بہتر نہ کر سکا تو ہم اگلی بار اس کو سپورٹ نہیں کریں گے۔ جہاں تک بیوروکریٹس کی بات ہے تو میں نے آج تک کسی بھی بیوروکریٹ کو پسند نہیں کیا اور نہ ہی میرا کسی کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں جو بھی خرابیاں ہیں ان کی ایک بڑی ذمہ داری بیوروکریسی پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ہر دور کے حکمرانوں کو کرپشن کے محفوظ راستے یہی بیوروکریٹس دکھاتے ہیں۔ بیوروکریسی اگر صحیح کام کرے تو ملک میں بے شمار

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ میں نے عمران خان کے حق میں بھی لکھا اور اس کی غلطیوں پر شدید تنقید بھی کی۔ میں اس کے دھرنوں کے ہمیشہ خلاف رہا۔ میں ان کے غلط کاموں کو سپورٹ نہیں کر سکتا۔ تحریک انصاف میرے لئے ایک پولیٹیکل آپشن ہی ہے، مسلم لیگ ن کی طرح، میرے خیال میں ن لیگ کو متواتر مواقع دینے کے بعد تحریک انصاف کو موقعہ دینا بنتا تھا۔ اسے اب پورا موقعہ ملنا چاہیے۔ پرفارم نہ کر پایا تو اگلی بار ووٹ نہیں ملیں گے۔

میرا نواز لیگ اور پی پی کے حامی صحافیوں پر اعتراض ہی یہ ہے کہ اگر آپ کی نظر میں ان جماعتوں کی قیادت ٹھیک ہے تو کم از کم پھر ان کی غلطیوں پر بھی تو تنقید کریں۔ دیکھیں کہ ان سیاسی جماعتوں نے چھ، چھ سال تک بلدیاتی الیکشن نہیں کروائے لیکن یہ صحافی پھر بھی انہیں جمہوریت کا چمپئن قرار دیتے رہے۔ ان صحافیوں میں یہ ہمت کیوں پیدا نہیں ہو سکی کہ انہیں کہہ سکیں کہ بلدیاتی الیکشن کروانا ایک آئینی ذمہ داری ہے وہ کروائے جائیں۔ 2010ء سے 2016ء تک پی پی اور نواز لیگ نے الیکشن نہ کروائے لیکن کوئی بھی صحافی نہیں بولا۔ یہ کتنی بڑی زیادتی اور کس قدر بڑا ظلم ہے۔ پھر جب اپنے ہی لوگوں کو بلدیاتی الیکشنوں میں کامیاب کروایا تو انہیں ایک ٹکے کا بھی اختیار نہ دیا اور ایک روپے کے فنڈ بھی نہ دیے۔ یہ تو حالت ہے جمہوریت کی علمبردار جماعتوں کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ باتیں صحافیوں ہی کو ہائی لائٹ کرنا چاہیے تھیں۔ کیا ان صحافیوں کا حق نہیں بنتا تھا کہ وہ کہتے کہ جناب، جمہوریت کا ایک گراس روٹ لیول ہے اور بلدیاتی الیکشن جمہوریت کی پہلی سیڑھی ہے۔ عام سیاسی ورکر اور عام آدمی کا سیاستدانوں سے پہلا رابطہ ہی یونین کونسل لیول پر ہوتا ہے۔ لہٰذا بلدیاتی الیکشن بہت ضروری ہیں اور وقت پر ہونے چاہئیں۔

حال ہی میں ایک دوست نے بتایا کہ تحریک انصاف کے کسی سوشل میڈیا سیل میں یا کسی اور فورم پر ایسے صحافیوں کی لسٹ بنائی جا رہی تھی کہ جو اس کو سپورٹ کرتے ہیں۔ اس موقع پر ایک صاحب نے کہا کہ عامر خاکوانی کا بھی نام شامل کرنا چاہیے وہ بھی ہمارے سپورٹر ہیں۔ اس پر ایک صاحب نے کہا کہ ”آپ خاکوانی کو نہیں جانتے۔ وہ کسی بھی وقت پلٹا کھا سکتے ہیں۔ وہ ایک دو دھاری تلوار ہے جو کسی طرف بھی چل سکتی ہے“۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ سیاسی جماعتیں میرے متعلق یہ رائے رکھتی ہیں۔ لفافہ صحافیوں نے جرنلزم کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے، اپنے وقار کا خیال نہیں رکھا اور وہ حکومتوں کے ترجمان بنے ہوتے ہیں۔ مجھے تو اس پر خوشی ہوتی ہے کہ ہم اگر توازن کے ساتھ کسی جماعت کی حمایت کریں اور وہ ناخوش ہو کر ہمیں اپنی تقریبات میں نہ بلائے تو یہ ایک طرح سے اعزاز ہی ہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں قومی سیاست میں تحریک انصاف کے ساتھ جماعت اسلامی کو بھی سپورٹ کرتا ہوں کیونکہ جماعت اسلامی اصلاحات کی بات کرتی رہی ہے ۔ یہ واحد جماعت ہے جو اپنے اندر باقاعدہ الیکشن کراتی ہے اور اس میں موروثیت کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں ۔اس کی لیڈر شپ بدلتی رہتی ہے اور جتنے اچھے، کلین اور ایمان دار اور سادہ لوگ جماعت اسلامی نے پروڈیوس کیے ہیں اور اسمبلیوں میں پہنچائے ہیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔ جو بھی شریف اور محنتی آدمی ہوتا ہے جماعت اسلامی اسے آگے لے کر آتی ہے ۔دیکھیں کہ مولانا مودودی، میاں طفیل، قاضی حسین احمد، منور حسن اور سراج الحق اور دیگر بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے کردار کے حوالے سے کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا۔ میں تو جماعت اسلامی کو سپورٹ کرتا ہوں یہ اور بات کہ جماعت مجھے اپنا سپورٹر نہ سمجھے۔ دراصل ہمارے ہاں پارٹیاں غیر مشروط حمایت پر یقین رکھتی ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ سپورٹ نہ کی جائے بلکہ ان کی پالیسیوں کے آگے صحافی سرنڈر کر دے، تب وہ اسے اپنا سمجھتی ہیں۔ یہ ہم سے تو نہیں ہوتا بھیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کو ایک کریڈٹ تو جاتا ہے کہ انہوں نے عوام کو متحرک کیا۔ گراس روٹ لیول پر ورکرز، مزدور اور کسان کو متحرک کیا۔ ان کی بعض شخصی خوبیاں بھی ہیں۔ بطور سیاستدان ان میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہزاروں لوگوں اور اپنے ورکروں کے نام سے واقف تھے ۔ وہ عام کارکن کو بھی بائی نیم پکارتے تھے۔ لیکن ان کی ناکامی یہ ہے کہ انہوں نے ملک میں جمہوریت کا بیڑہ غرق کیا۔ مخالفین کو تشدد کا نشانہ بنایا اور انہیں راستے سے ہٹایا۔ صحافیوں کو جیلوں میں ڈالا ۔ مجیب الرحمٰن شامی اور الطاف حسن قریشی جیسے لوگوں کو جیلوں میں ڈالا ۔ حسین نقی جیسے لیفٹ کے کھرے شخص کو جیل میں ڈالا۔ نیپ پر پابندی لگائی ، جے یو آئی کو نقصان پہنچایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمد رضا خان قصوری کیس میں بھی وہ بہر حال شامل تھے ہاں انہیں پھانسی کی سزا نہیں ملنی چاہیے تھی۔ ایسی بے شمار ایویڈنسز موجود ہیں کہ بھٹو نے مخالفین کو قتل کروایا ہے۔ پھر دیکھیں کہ بھٹو صاحب جو اصلاحات لے کر آئے تھے وہ بہت بری طرح فلاپ ہوئیں۔ بھٹو کے ویژن کی یہ حالت تھی کہ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ سوشلزم ختم ہونے جا رہا ہے لیکن وہ سوشلزم کا پرچار کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی انڈسٹری کا بیڑہ غرق کر دیا اور بینک تباہ کر دیئے۔ یوں میں سمجھتا ہوں کہ بھٹو بطور سیاستدان تو بالکل ناکام رہے۔ ہاں بے نظیر بھٹو میں اپنے والد کی نسبت قائدانہ صلاحیتیں زیادہ تھیں۔ ان میں رعونت اور تکبر نہ تھا جبکہ بھٹو صاحب کے چہرے سے بھی رعونت نظر آتی تھی اور اب تک ان کے متعلق جو بھی پڑھا ہے اور سنا ہے وہ مجھے فرعون صفت لگے ہیں۔ پی پی کے اپنے لوگوں نے بھی ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں بہت زیادہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

رعونت تھی۔ بی بی میں یہ چیزیں نہ تھیں، وہ ایک سافٹ مائنڈڈ عورت تھیں اوران کی ورکرز سے محبت بھی بہت تھی۔مگر بعض چیزوں سے اوپر نہ اٹھ سکیں، وہ زرداری صاحب کوانتظامی معاملات میں مداخلت سے روک نہ پائیں، سندھ کارڈ تو بی بی نے بھی استعمال کیا، بی بی کی بڑی خامی یہ تھی کہ وہ پاکستانی سماج کے بنیادی فیبرک کو نہ سمجھ سکیں، انہیں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ پاکستان میں لوگ مذہب اور ختم نبوت ﷺ کے حوالے سے کس قدر حساس ہیں، جبکہ پاک بھارت تعلقات کو گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

زرداری صاحب تو بالکل صاف کریمنل اور کرپٹ انسان ہیں، ان کا تو سیاست سے کیا لینا دینا، وہ یہاں صرف کمانے ہی آئے۔ مجرمانہ سوچ کے ساتھ سیاسی چالبازیاں کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ آخری تجزیے میں زرداری بالکل ناکام رہے اور پیپلز پارٹی کو تباہ کیا۔ مجھے زرداری سخت ناپسند رہے ہیں اور مجھے ان سے ملنے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا۔ مجھے تو پیپلز پارٹی کے کلچر پر بہت افسوس ہوتا ہے کہ 27 دسمبر 2007ء کی شام پانچ بجے تک زرداری پیپلز پارٹی میں سب سے ناپسندیدہ ترین انسان تھا۔ہم جس پیپلز پارٹی والے سے بھی بات کرتے تھے وہ زرداری کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ زرداری کو بی بی نے پاکستان نہیں آنے دیا تھا، ان کے بارے میں طے ہو چکا تھا کہ وہ باقی عمر باہر رہ کر بچوں کا خیال رکھیں گے۔ انہوں نے بس بچے ہی کھلانے ہیں لیکن میں پیپلز پارٹی پر حیران ہوں کہ یہ شخص 27 دسمبر 2007ء کی شام پانچ بجے کے بعد پیپلز پارٹی کا اہم ترین لیڈر بن گیا۔ پیپلز پارٹی بھی اس لحاظ سے غلام ابن غلام جماعت ہے۔ یہ لوگ فکری طور پر غلام ہیں۔ ذاتی طور پر میری اس سے بڑھ کر کوئی تذلیل نہیں کہ میں ایک پولیٹیکل لیڈر کو سپورٹ کر رہا ہوں اور وہ مجھے آگے بیچ دے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بے نظیر بھٹو کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اپنی وصیت میں زرداری کو پی پی کا قائد نامزد کر دیتیں۔ یہ تو پارٹی کے ورکرز خود فیصلہ کرتے کہ کس کو قائد ہونا چاہیے۔ کیا یہ لاکھوں لوگ کوئی بھیڑ بکریاں ہیں کہ انہیں جدھر مرضی ہانک دیا جائے۔ پی پی ورکروں کی بھی حالت دیکھیے کہ ان کی زنجیر جسے مرضی پکڑا دی جائے وہ اسی کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ نتیجہ دیکھیے کہ زرداری جیسے شخص نے پی پی کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

بلاول زرداری مجھے اچھا لگا تھا کہ یہ ایک نوجوان ہے، پڑھا لکھا ہے اور خوش شکل ہے۔ یہ ہمیں اپنے بچوں جیسا لگتا ہے لیکن اس نے ابھی تک کوئی ایسی چیز ثابت نہیں کی کہ وہ آکسفورڈ سے پڑھ کر آیا ہے۔ اس کا کنٹری بیوشن تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سوائے بھٹو صاحب کی نقالی کے اس کے پاس بھی کچھ نہیں ہے اور وہ نقالی بھی ایسی ہے کہ جسے ہم مضحکہ خیز کہہ سکتے ہیں۔ جب یہ تقریر کرتے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہیں تو ہر فقرے پر مسکراتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ Sad جملے بھی مسکرا کر ادا کرتے ہیں۔ اردو کی تقریر میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے رٹے سے کام لیا ہوگا اور رومن میں لکھی تقریر پڑھ رہا ہے لیکن وہ انگریزی تو بہت اچھی بولتا ہے۔ وہ انگریزی گفتگو میں بھی ایسے جملوں پر ہنستا ہے جن پر رونا چاہیے۔ میرے خیال سے ان کو کسی نے بتا دیا ہے کہ تقریر میں ہمیشہ مسکرانا چاہیے تو وہ بس مسکراتے ہی رہتے ہیں۔ صوبہ سندھ سنبھالے ہوئے بلاول کو چھ سات سال ہو گئے ہیں اور کوئی ایک بھی ایسا شعبہ نہیں جس میں اس نے کوئی اصلاحات کی ہوں۔ ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ بلاول کی حالت یہ ہے کہ اس کے صوبے میں سب سے بری حالت بلدیاتی اداروں کی ہے۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ یہ جن مغربی اداروں میں پڑھ کر آیا ہے وہاں پر بلدیاتی ادارے کس قدر طاقت ور ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم اور صحت کے معاملے میں بھی اس کی کارکردگی زیرو ہے۔ یہ تو اپنے لاڑکانہ شہر ہی کو تبدیل نہیں کر سکا۔ ان کے پاس اتنے فنڈز ہیں اور یہ تبدیلی لانا چاہیں تو لا سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پاس دراصل وژن نہیں ہے چنانچہ یہ بھی روایتی سیاست کو لے کر چل رہا ہے۔ بلاول کی غیر سنجیدگی دیکھیں کہ زرداری کی بیماری کی بنیاد پر ضمانت ہوئی ہے اور یہ جلسے میں دھاڑ رہا تھا کہ ''آ گیا زرداری۔ شیروں کا شکاری''۔ یہ کس طرح کی فضول اور سطحی باتیں ہیں، ایک لیڈر کو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بلاول و آصفہ کا قومی سطح پر کوئی سیاسی مستقبل نہیں ہے۔ سندھ کے لیول پر چونکہ پی پی کے مقابلے میں کوئی اور پارٹی ہی نہیں تو یہ وہاں پر لوگوں کو بے وقوف بناتی رہے گی۔

مذہبی جماعتیں شروع سے ہی ناکام ہوتی آئی ہیں۔ خیبر پختونخواہ میں ایم ایم اے کو جو کامیابی ملی تھی وہ بھی حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ انہیں استعمال کیا گیا تھا۔ اصل میں مذہبی سیاست میں تضادات بہت ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن جیسی موقع پرست اور بدترین سیاست شاید ہی کسی نے کی ہو۔ مولانا نے جماعت اسلامی کو بھی اپنے اتحادوں میں شامل کر کے اس کی ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے۔ مذہبی سیاسی جماعتوں میں جماعت اسلامی ایک صاف ستھری جماعت ہے۔ اس کے پاس اچھے اور ایماندار لوگ ہیں لیکن اس کے پاس بھی وژن اور سیاسی بصیرت کی کمی ہے۔ نئے خیالات کی وہاں کوئی گنجائش نہیں، ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ حالیہ الیکشن سے پہلے جماعت اسلامی ایم ایم اے میں شامل ہوئی حالانکہ یہ بالکل غلط وقت پر غلط فیصلہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا فضل الرحمٰن کی جے یو آئی اور جماعت اسلامی میں کچھ بھی کامن نہیں ہے۔ مولانا کہتے تھے کہ فاٹا کا انضمام یہودی سازش ہے اور جماعت اسلامی اس کی حامی تھی۔ مولانا پانامہ کو بھی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سازش اور فراڈ کہتے تھے اور جماعت اسلامی اس کی حامی تھی کہ پانامہ کیس میں شامل 400 لوگوں کا مکمل احتساب ہونا چاہیے۔ جماعت اسلامی کہتی تھی کہ کرپشن بالکل ختم ہو اور مولانا کہتے تھے کہ کوئی کرپشن نہیں ہے یہ سب سازشی باتیں ہیں۔ یوں جماعت اسلامی اور جے یو آئی میں کچھ بھی مشترک نہیں۔ بس جماعت صرف چند سیٹوں کے چکر میں ایم ایم اے کا حصہ بن گئی اور اس سے اس کا سیاسی مستقبل داؤ پر لگ گیا۔ مذہبی جماعتیں اس لیے بھی سیاست میں ناکام ہیں کہ وہ جن اخلاقیات کا دعویٰ کرتی ہیں وہ خود پیش نہیں کر سکیں۔ مذہبی جماعتیں تضادات کا مجموعہ ہیں۔ ان جماعتوں کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ نوجوان نسل کے لیے کشش کا باعث نہیں بن سکیں اور انہیں کوئی پروگرام نہ دے سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی طور پر جو نظریاتی لوگ تھے وہ ان سیاسی جماعتوں کے بجائے جہادی تنظیموں، القاعدہ اور دیگر شدت پسند جماعتوں میں شامل ہو گئے۔ یہ بھی ان جماعتوں کے لیے بہت بڑا المیہ ہے۔ اس سے ہمارے ملک کو بھی بہت زیادہ نقصان پہنچا اور شدت پسندی میں اضافہ ہوا۔

میرے اندر ایک خامی رہی ہے کہ میں سیاسی طور پر کبھی ایکٹو نہیں رہا بلکہ میں سوشل ایکٹویسٹ بھی نہیں ہوں اور گھر پر ہی رہنے کا عادی ہوں۔ دفتر سے گھر، گھر سے دفتر اور بس کتابوں کا مطالعہ۔ اصل میں میرے کچھ ذاتی مسائل اس قدر رہے ہیں کہ مجھے وقت نہیں مل سکا۔ دوسرا سیاستدانوں کے متعلق سچ پوچھیے تو مجھے کبھی طلب نہیں رہی کہ میں ان کے پیچھے بھاگوں اور ان سے ملاقاتیں کرتا پھروں۔ مجھے یہ بالکل بھی اچھا نہیں لگتا کہ بطور صحافی اور کالم نگار ان کے پیچھے پھرتا رہوں اور ان کے نغمے گاتا رہوں جب ان کا کچھ وژن ہی نہیں ہے تو پھر میرے خیال سے ان کے پیچھے بھاگنا اپنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے اور یہ سخت صحافتی بددیانتی بھی ہے۔ کونسل آف نیشنل افیئرز نے ہماری کچھ ملاقاتیں میاں نواز شریف، منور حسن، یوسف رضا گیلانی وغیرہ سے کروائی تھیں لیکن سچ پوچھیں تو مجھے ان لوگوں میں وژن کی سخت کمی محسوس ہوئی ہے۔ عمران خان صاحب سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں بہت سی خامیاں ہیں مگر بہرحال تبدیلی کا نعرہ تو لگایا، باقی تو نعرہ بھی نہیں لگاتے۔ عمران خان شریف اور زرداری خاندان کی نسبت بہتر لگے۔ ہاں اگر انہوں نے بھی قوم کو مایوس کیا تو پھر میں ان کی حمایت بھی چھوڑ دوں گا۔ میں اس لیے بھی سیاستدانوں سے ملنے میں کتراتا ہوں کہ جب آپ ان کے ساتھ بہت زیادہ تعلق قائم کر لیتے ہیں تو پھر ان پر کھل کر تنقید کرنا اور ان کی کمزوریوں پر گرفت کرنا آپ کے خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے اگر کسی سیاستدان کے متعلق کوئی انفارمیشن بھی چاہیے تو میں کوشش کرتا ہوں کہ براہ راست رابطہ نہ کروں اور دیگر ذرائع سے اس کے متعلق جاننے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کی کوشش کروں۔

میں دورِ حاضر کی کسی بھی مذہبی شخصیت سے متاثر نہیں، ہاں مجھے صوفی سکالرز زیادہ پسند ہیں۔ میں مولانا مودودی صاحب اور امین احسن اصلاحی کا احترام کرتا ہوں، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر حمیداللہ کی تحریریں اچھی لگیں، مولانا مناظر احسن گیلانی اچھے لگے، آج کل مولانا تھانوی کی کتب پڑھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی کی محاضرات والی سیریز مجھے پسند ہیں، ان میں خاصا توازن ہے۔ علامہ یوسف قرضاوی کی دو کتابوں کے تراجم پڑھے، بہت اچھے لگے، اخوان کے بانی سید حسن البنا کی کتاب بھی اچھی لگی، سید قطب میں بھی بہت توانائی ہے۔ علامہ اسد کی تحریر اور خیالات مجھے اچھے لگے، علامہ اسد کو پسند کرتا ہوں۔ مولانا آزاد کو تفصیل سے پڑھا ہے، مولانا کی انشاپردازی کون قائل نہیں ہوگا، ان میں علمیت بھی ہے، مگر ایک خاص قسم کا تکلف تحریر میں ہے۔ مولانا آزاد کی سیاسی سوچ سے مجھے سخت اختلاف ہے، مجھے حیرت ہے کہ ان جیسا دانا شخص پاکستان کی مخالف صف میں کھڑا تھا۔ ان کے حامی مولانا آزاد کی پیش گوئیوں کا بہت ذکر کرتے ہیں، میں یہ سوچتا ہوں کہ جو شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ کانگرس اسے استعمال کرنے کے بعد دودھ میں گری مکھی کے مانند نکال کر پھینک دے گی، وہ بھارت میں شدت پسند ہندو خیالات کے عروج کے بارے میں اندازہ نہ کر پائے تو پاکستان کے بارے میں کیا انہوں نے پیش گوئی کرنی ہے۔ آخری تجزیے میں مولانا آزاد کی حیثیت ایک ناکام سیاستدان کی ہے۔

صوفی سکالرز میں میں سرفراز شاہ صاحب کے بہت قریب ہوں۔ یہ میرے مرشد ہیں۔ میری پہلی کتاب کا انتساب بھی انہی کے نام ہے۔ میں ان کا تفصیلی ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ پروفیسر احمد رفیق اختر اور احمد جاوید صاحب کا میں احترام کرتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں احمد جاوید صاحب سے نئی چیزیں سیکھوں۔ پروفیسر ہمایوں احسان صاحب ہمارے سی این اے کے ساتھی اور اعلیٰ پائے کے دانش ور اور سکالر ہیں۔ بہت ہی آؤٹ آف باکس سوچنا میں نے انہی سے ہی سیکھا ہے۔ ڈاکٹر عاصم اللہ بخش کا تجزیہ بہت اچھا ہوتا ہے، میں ان سے بہت متاثر ہوں۔ جس طرح کہتے ہیں کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے تو مجھے ڈاکٹر عاصم اللہ بخش اور پروفیسر ہمایوں احسان میں یہ مومنانہ فراست نظر آتی ہے۔

پاکستان کا نمبر ون مسئلہ میرے نزدیک کرپشن ہے۔ میں ان لوگوں کے خلاف ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ یہاں سیاسی عدم استحکام ہے اور کرپشن کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ جو بندہ یہ کہتا ہے کہ پاکستان میں کرپشن بڑا مسئلہ نہیں ہے وہ درحقیقت کرپشن کو سپورٹ کر رہا ہے۔ عام آدمی کو ہر معاملے میں جس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

چیز سے تکلیف پہنچتی ہے وہ کرپشن ہے۔ پولیس آپ کے ساتھ درست سلوک نہیں کرتی، ملزم رہا کر دیئے جاتے ہیں، آپ ہسپتال جاتے ہیں اور آپ کو دوانہیں ملتی، کسی بھی سرکاری دفتر میں جائز کاموں پر بھی پیسے طلب کیے جاتے ہیں۔ ہر شعبے میں ہمیں کرپشن ہی تنگ کر رہی ہے۔ کرپشن ہی کی وجہ سے جعلی دوائیاں بن رہی ہیں اور اسی وجہ سے دیگر جرائم ہو رہے ہیں۔ اس کے خاتمے کے لیے ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے رول آف لاء۔ قانون پر عمل درآمد سختی سے ہونا چاہیے۔ ہم کہتے ہیں کہ وار اگینسٹ ٹیررازم ہے۔ اسی طرح ''وار اگینسٹ لاء لیس نیس'' بھی ہونی چاہیے اور لاقانونیت کے خلاف جنگ ہونی چاہیے۔ کرپشن کوئی بھی کرے بھلے وہ نواز شریف ہو یا عمران سب کے خلاف بلاامتیاز کارروائی ہونی چاہیے۔ جو لوگ کرپٹ ہیں انہیں عبرت ناک سزائیں ملنی چاہئیں۔ پاکستان میڈیکل ڈینٹل کونسل بنا ہوا ہے۔ اس کو تیس چالیس سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے۔ مجھے بتایئے کہ اس ادارے کی طرف سے کسی ایک بھی ڈاکٹر کو سزا ملی ہے اور اس کا لائسنس کینسل کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے لاتعداد کیسز ہیں جب ایک مریض کا غلط آپریشن کر دیا گیا ہے لیکن ذمہ دار ڈاکٹر کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوئی۔

احتساب کے معاملے میں پوری قوم کو ایک ہونا ہوگا اور کرپٹ لوگوں کے خلاف بے رحم احتساب ہونا چاہیے۔ جہاں تک نیب کی بات ہے تو اس نے بھی قوم کو مایوس کیا اور یہ اپنی بہتر ساکھ نہیں بنا سکا۔ اس احتساب کی حالت یہ ہے کہ مسلم لیگ نواز کا جو بھی بندہ ذرا لاؤڈ بولتا ہے اس کے خلاف نیب فوری طور پر ایکشن لیتا ہے اور اس کے خلاف کرپشن کے کیس دائر کر دیئے جاتے ہیں، جو خاموش ہیں ان کے خلاف کوئی کیس نہیں۔ نیب کی سرگرمیاں ہی دراصل مشکوک ہیں۔ اب دیکھیں کہ گجرات کے چودھری صاحبان کا بھی تو دامن صاف نہیں لیکن یہ لوگ اقتدار میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے خلاف نیب کی کوئی سرگرمی نہیں ہے۔ ق لیگ کے اور بھی بہت سے رہنما ہیں جنہوں نے کرپشن کی ہے لیکن ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو رہی۔ میں تو کہتا ہوں کہ بی آر ٹی منصوبے کی ناکامی اور اس میں کرپشن پر سابق وزیر اعلیٰ خیبر پختونخواہ اور تحریک انصاف کے رہنما پرویز خٹک کے خلاف بھی کارروائی ہونی چاہیے۔ تحریک انصاف کے کرپٹ لوگوں کے خلاف بھی تو نیب کو ایکٹو ہونا چاہیے۔ ان کے بارے میں نیب کی خاموشی نے بہت ہی غلط تاثر پیدا کر دیا ہے۔ قانون میں اس قدر خامیاں ہیں کہ جو بھی کرپشن میں پکڑا جاتا ہے وہ جلد ہی چھوٹ جاتا ہے اور اس سے کچھ برآمد بھی نہیں کیا جاتا۔ مجھے احتساب کے حوالے سے کسی بھی جماعت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور میں بے رحم احتساب کا حامی ہوں۔ لیکن یہ بے رحم احتساب کب ہوگا، ایسا جلد ہوتا نظر نہیں آتا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

حج فارم میں سے ختم نبوت کی شق کے خاتمے پر حیران ہوں کہ اس معاملے پر کوئی شور نہیں اٹھا ۔میں ختم نبوت کے حوالے سے تمام قوانین کا زبردست حامی ہوں ۔میں سمجھتا ہوں کہ جتنا بھی اس حوالے سے انٹرنیشنل پریشر ہو ہمیں اپنے قوانین پر قائم رہنا چاہیے ۔ہاں اگر ان میں پروسیجر تبدیلی بھی کرنی ہو تو وہ مفتی تقی عثمانی صاحب، مفتی منیب الرحمٰن صاحب جیسے علمائے کرام سے مشاورت کر کے کرنی چاہیے اور اس کے لیے ایک بہترین پلیٹ فارم اسلامی نظریاتی کونسل بھی موجود ہے ۔کوئی بھی ایسا نیا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے ان قوانین پر زد پڑتی ہو ۔اگر حج فارم میں کوئی تبدیلی کی گئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ غلط کیا گیا ۔اس سے پہلے نواز شریف کے دور میں زاہد حامد نے جو کچھ کیا تھا میں نے اس کی بھی کھلی مخالفت کی تھی ۔اگر اس حوالے سے کوئی تبدیلی کرنی ہے اور کوئی ٹیکنیکل پرابلم ہے تو چھپ چھپا کر اس میں ترمیم واضافہ کرنے کے بجائے علمائے کرام کو اعتماد میں لے کر یہ کام کرنا چاہیے ۔اسلامی نظریاتی کونسل اسی کام کے لیے بنائی گئی ہے کہ اس کی سفارشات پر عمل کیا جائے ۔ختم نبوت ہمارا بنیادی عقیدہ ہے اور اس پر ہمیں بڑا واضح اور ٹھوس رہنا چاہیے ۔

میں نے بیرون ممالک زیادہ سفر نہیں کیے، مصر، نائیجریا، ترکی اور افغانستان جانے کا اتفاق ہوا ہے ۔مجھے یہ بھی سعادت نصیب ہوئی کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی تحریک اخوان المسلمون کے مرشد عام مہدی عاکف کا میں نے انٹرویو کیا ۔ان کے علاوہ ان کے نائب اعصام الریان، ڈاکٹر مرسی شہید کے مقابلے میں الیکشن لڑنے والے ایک بہت ہی بڑے لیڈر تھے ڈاکٹر ابوالمنعم عبدالفتوح اور دیگر لیڈروں کے بھی انٹرویوز کیے ۔ڈاکٹر ابوالمنعم عبدالفتوح (ان کا جیل ہی میں انتقال ہوا) ایک بہت ہی مقبول لیڈر تھے جنھوں نے مرسی کے مقابلے میں الیکشن لڑا اور بہت سے ووٹ حاصل کیے ۔یہ بعد میں اخوان سے الگ ہو گئے تھے اور انہوں نے مرسی کو سپورٹ کیا ۔اخوان کے مرشد عام کا مطلب ہے پوری دنیا میں اخوان کا ایک ہی مرشد عام ہے ۔انگریزی میں اسے ''جنرل گائیڈ'' کہا جاتا ہے ۔

مجھے اخوان المسلمون کی قیادت نے بہت متاثر کیا ۔ڈاکٹر مرسی سے بھی ملاقات ہوئی ۔غرض ہم اخوان المسلمون کی ٹاپ لیڈر شپ سے ملے اور بہت متاثر ہوئے ۔ان سے کافی سیکھنے کو ملا اور بہت سی غلط فہمیاں بھی دور ہوئیں ۔پاکستان کے متعلق ان کی رائے بہت اچھی تھی اور وہ پاکستانی عوام کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے لیکن انہوں نے زرداری صاحب پر بہت تنقید کی ۔اس وقت زرداری صدر تھے ۔مرشد عام نے کہا کہ مجھے بہت افسوس ہے کہ پاکستان ہمارا دوست ملک ہے اور اس پر ایک قاتل اور کرپٹ شخص کی حکمرانی ہے ۔اس بات پر مجھے حیرت ہوئی، مگر مہدی عاکف نے نہایت خلوص سے یہ بات کی تھی، ان کی آنکھوں میں نمی تھی ۔مصر میں اخوان المسلمون کے خلاف بہت زیادہ آپریشن کیے گئے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لیکن اسے ختم نہ کیا جا سکا۔ ہمیں اخوان کے ایک سینئر پروفیسر ڈاکٹر نے بتایا کہ میں ہفتے میں تین دن کام کرتا ہوں، تین دن دعوت کا کام کرتا ہوں اور صرف ایک دن گھر پر رہتا ہوں۔ آپ اس سے اندازہ لگا یئے کہ اخوان المسلمون میں کیسے وژنری لوگ پائے جاتے ہیں۔ اخوان المسلمون میں کارکن کی تربیت کا بہت عمدہ نظام ہے۔ میں نے مرشد عام سے سوال کیا کہ اخوان المسلمون کے بانی حسن البناء شہید تو ایک صوفی تھے تو کیا آپ بھی صوفی ہیں یا انقلابی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہم صرف پانچ فیصد سیاسی ہیں جبکہ اصل کام ہی دعوت کا ہے۔ نوے پچانوے فیصد اخوان سوشل ورکر اور ریفارمر ہیں۔ تعلیم ،تربیت اور دعوت کا کام کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ ہم انقلاب کے سخت خلاف ہیں اور یہ جعلی لفظ ہے۔ ہم تو ریفارمز کے حامی ہیں۔ ہم کرپشن کا خاتمہ اور حقیقی آزادی چاہتے ہیں۔ ہر شعبے میں ریفارمز ہونی چاہئیں۔

مصر میں خان یونس ایک مشہور مقام اور بازار ہے۔ ہم وہاں گئے تو راستہ بھول گئے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور ہمیں بڑے جوش وخروش سے ملے۔ حالانکہ ہر دور میں مصری حکومتیں پاکستان کے خلاف رہی ہیں لیکن عوام پاکستان سے محبت کرتے تھے۔ ٹیکسی میں بیٹھے تو ڈرائیور کو پتہ چلا کہ پاکستانی ہیں تو وہ ترنت بولا ''پاکستان۔ دی کنٹری آف اسامہ بن لادن''۔ (اس وقت ابھی اسامہ بن لادن کے خلاف ایبٹ آباد آپریشن نہیں ہوا تھا)۔ بعد میں ایک مشہور امریکی ادارے PEW نے مصر کے حوالے سے اپنی سروے رپورٹ میں کہا تھا کہ 87 فیصد مصری عوام اسامہ سے محبت کرتے تھے۔ اخوان المسلمون کے علاوہ وہاں کے عام شہری بھی امریکہ کے بہت مخالف ہیں۔ ہم جامعہ از ہر میں بھی گئے اور وہاں پر عصر کی نماز ادا کی۔ میرا مصر کا دورہ بہت اچھا رہا۔ سکندریہ کی تاریخی لائبریری دیکھی۔ ترکی دو بار جانا ہوا، پہلی مرتبہ 2011ء میں مجیب الرحمٰن شامی، عطاء الحق قاسمی اور رؤف طاہر کے ساتھ۔ ہمیں فتح اللہ گولن کی تنظیم کی جانب سے ترکی کا دورہ کروایا گیا تھا۔ افغانستان جانا ہوا تو حامد کرزئی، افغان صدر اشرف غنی، عبداللہ عبداللہ اور دیگر افغان لیڈروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔

بھارتی مسلمانوں کے بارے میں تو دیکھ رہا ہوں کہ جس طرح مودی حکومت آر ایس ایس اور دیگر ہندو شدت پسند تنظیموں کو سپورٹ کر رہی ہے اس سے انڈیا خود ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور کچھ روحانی پیش گوئیاں بھی ایسی رہی ہیں کہ انڈیا ساؤتھ سے ٹوٹ جائے گا۔ یہ جو شاہین باغ اور آسام کے ہنگامے ہو رہے ہیں تو اس پس منظر میں مجھے روحانی پیش گوئیاں درست ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔ انڈیا اپنے متعصبانہ رویوں ہی کی بدولت خودکشی کا ارتکاب کرنے جا رہا ہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ریاستوں کا نظام اس طرح نہیں چلا کرتا جس طرح مودی سرکار چلا رہی ہے۔ جہاں تک مقبوضہ کشمیر کا تعلق ہے تو اس حوالے سے بعض لوگ کہتے ہیں پاکستان کے اقدامات کافی نہیں ہیں لیکن میرا سوال یہ ہے کہ اب مزید پاکستان کشمیر کے لیے کیا کرسکتا ہے۔ ہم نے مسلح جدو جہد کر کے اور جہادی تنظیموں کو سپورٹ کر کے دیکھ لیا ہے اور اقوام متحدہ میں بھی احتجاج کر کے دیکھ لیا ہے۔ پاکستان تمام حربے آزما چکا ہے لیکن جب عالمی ضمیر ہی مردہ ہو جائے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان نے کافی کچھ کیا ہے اور کر بھی رہا ہے اور اس سے شکوہ کرنا درست نہیں۔ آپ مغربی ممالک کو ایک طرف رکھیں مسلم ممالک ہی کو دیکھ لیں سب ڈھیٹ بنے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی کشمیر کے حق میں بات کرنے کو تیار نہیں تو ایسے بے ضمیروں کے ضمیر کو جگانے کے لیے پاکستان کیا کرسکتا ہے۔ جس وقت مودی کشمیر میں بربریت کا مظاہرہ کر رہا تھا عرب امارات میں اسے ایوارڈ دیے جا رہے تھے۔ یہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی ناکامی ہرگز نہیں بلکہ مسلم اخلاقیات کی ناکامی ہے۔ خارجہ پالیسی کیا ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارا ہمسایہ ہی بے شرمی اور ہٹ دھرمی پر اتر آیا ہے تو اس کا کیا علاج کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی تو خارجہ پالیسی کی کامیابی ہے کہ ترکی اور ملائیشیا نے کھل کر کشمیر کاز کی حمایت کی ہے۔ او آئی سی کتنی بڑی تنظیم تھی جواب بالکل مردہ ہو چکی ہے۔ اب تو اس تنظیم کے باقاعدہ اجلاس بھی نہیں ہوتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسئلہ کشمیر پر پاکستان کو ناکام قرار دینے کے بجائے اسے امت مسلمہ کی ناکامی قرار دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

نائن الیون کے بعد جب پاکستان طالبان کے خلاف امریکی اتحادی بنا تو یہ دراصل پاکستان نے ڈبل گیم کی۔ اس نے شروع میں تو ملا عبدالسلام ضعیف اور ایک آدھ طالبان لیڈر کو امریکہ کے حوالے کیا لیکن بعد میں اس نے فیصلہ کیا کہ افغان طالبان اور قیادت کو پروٹیکٹ کرنا ہے اور انہیں امریکہ کے حوالے نہیں کرنا۔ پاکستانی فوج نے حقانی نیٹ ورک اور کوئٹہ شوریٰ کو بچایا اور انہیں گرفتار نہ ہونے دیا۔ ہمارے جو مذہبی لوگ اور مذہبی جماعتیں تھیں انہیں اس بات کا بالکل علم تھا کہ پاکستان ڈبل گیم کر رہا ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے یہ غلط کام کیا کہ فوج اور ریاستی اداروں کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا، صرف چھوٹے مفادات کی خاطر ایسا کیا گیا۔ مفتی نظام الدین شامزئی جیسے عالم نے بھی فتوے دیے کہ فوجیوں کے جنازے پڑھنا جائز نہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط بات تھی، جب مذہبی جماعتیں فوج کی ڈبل گیم سمجھ گئی تھیں تو انہیں پروپیگنڈہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سمجھنے والی بات یہ ہے کہ اس وقت جنرل پرویز مشرف یا کوئی بھی جنرل علانیہ طور پر تو یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم امریکہ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام میڈیا میں موجود کچھ لوگوں کو کرنا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

چاہیے تھا اور مذہبی طبقے کو اصل صورتحال سے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ یہ بات ان لوگوں کے ذریعے لیک کروائی جاتی کہ جن کی کوئی باقاعدہ حیثیت نہیں تھی۔ مثال کے طور پر قاضی حسین احمد جیسا شخص یہ کہہ دیتا ہے کہ نہیں ہماری فوج ''پراکسی آرمی'' نہیں اور یہ طالبان کی حامی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں نے الٹا یہ تاثر دیا کہ پاکستانی فوج امریکہ کی پراکسی آرمی ہے جس سے فوج کے خلاف نفرت بڑھی اور شدت پسندی میں اضافہ ہوا۔ یہ ہماری بنیادی غلطی تھی جس سے ہمارے ہاں شدت پسندی اور دہشت گردی بڑھی۔ پھر ٹی ٹی پی وجود میں آئی اور ان شدت پسندوں کو انڈیا جیسے ممالک نے بھی استعمال کیا۔ یہ سب افسوسناک ہے۔

میرے خیال سے سٹیٹ سے دو بڑی غلطیاں ہوئی ہیں: پہلی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے پاکستان کے مذہبی طبقے کو افغان طالبان قیادت کے ساتھ ڈائریکٹ کر دیا تھا۔ میں نے 1999ء میں کمانڈر الیاس کشمیری (یہ بعد میں مارے گئے تھے) کا انٹرویو کیا تھا جو اگست 1999ء کے اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر ہم کشمیر فتح کر لیتے ہیں تو ہم جونا گڑھ اور حیدرآباد کی طرف بڑھیں گے۔ میں ان کی باتوں سے سمجھ گیا تھا کہ یہ تو کوئی گلوبل ایجنڈا ہے جس پر یہ عمل پیرا ہیں۔ میں نے دوسرا سوال کیا کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ جب تک ریاست فتویٰ نہ دے جہاد نہیں ہوتا تو ان کا کہنا تھا کہ ہمارے امیر المومنین تو ملا عمر ہیں۔ میں ان کے جواب سے بڑا حیران ہوا کہ یہ خود تو پاکستانی ہیں اور پاکستان میں رہتے ہیں لیکن بات ملا عمر کی مانتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر کل کو پاکستان کے افغان طالبان کے ساتھ معاملات خراب ہو جاتے تو پھر یہ لوگ تو افغان طالبان کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر واقعی ایسے ہوا اور ایسے لوگوں نے پاکستان کے مقابلے میں افغان طالبان کو ترجیح دی جس سے حالات بہت خراب ہوئے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں الیاس کشمیری نے کہا تھا کہ مجھے عربوں نے افغانستان میں عسکری ٹریننگ دی۔ میں نے حماس اور القاعدہ کے لوگوں کے ساتھ رہ کر کام کیا ہے۔

حرکت الجہاد الاسلامی، حرکت المجاہدین، حرکت الانصار جیسی پاکستانی جہادی جماعتوں پر عربوں کا زیادہ اثر رہا ہے اور یہ جماعتیں افغانستان میں عربوں کے بہت قریب رہی ہیں۔ یہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی غفلت تھی کہ اس نے اپنے لوگوں کو اتنی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی جس سے بعد میں ہمارے اپنے لیے بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ میرا یہ نقطہ نظر ہے کہ جس طرح لشکر طیبہ کو الگ رکھا گیا اور اسے افغان طالبان کے قریب نہیں جانے دیا گیا تو اسی طرح دیگر جہادی تنظیموں کو بھی کنٹرول کیا جاتا۔

امریکہ طالبان معاہدے بارے میں میرا موقف یہ ہے کہ یہ طالبان کی واضح فتح اور امریکہ کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

واضح شکست ہے۔ طالبان نے اپنی بے پناہ جدو جہد سے ایک بہت بڑی طاقت کوشکست فاش دی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ معاہدہ کب تک رہتا ہے تو یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اس معاہدے کوخطرات تو بہت زیادہ لاحق ہیں لیکن اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ طالبان نے اپنے جذبہ ایمانی سے اٹھارہ سالہ طویل جدو جہد کے بعد امریکہ کو جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ طالبان کی یہ کامیابی کم نہیں ہے کہ انہوں نے بے سروسامانی کے عالم میں بغیر کسی بیرونی سہارے کے امریکہ کو بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس معاہدے کے بعد افغانوں میں پھر سے خانہ جنگی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی، یہ ایک الگ موضوع ہے۔ امریکہ طالبان سے واضح شکست کھا چکا ہے اور ہمیں طالبان کو یہ کریڈٹ دینا چاہیے۔

پاکستان کے مستقبل کے متعلق میرا نقطہ نظر بڑا واضح ہے کہ اس دھرتی کا مستقبل روشن ہے ۔(ان شاءاللہ) پاکستان ایک ''ڈیزائن آف نیچر'' کے تحت بنا ہے اور اس کے حالات جلد بہتر ہوں گے۔ ہر مشکل وقت میں اللہ نے غیب سے پاکستان کی مدد کی ہے۔ ہمارے پروفیسر ہمایوں احسان صاحب کہتے ہیں کہ اس خطے میں جب بھی ہسٹری اَن فولڈ ہوتی ہے اور جب بھی کروٹ بدلتی ہے اس میں پاکستان کا اہم رول ہوتا ہے۔ چاہے وہ افغانستان میں روس کی شکست ہو یا طالبان کے ہاتھوں امریکہ کی شکست، اس میں پاکستان کا اہم کردار ہوتا ہے۔ فوج کے سیاسی کردار کے متعلق میرا نقطہ نظر ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

پالیسیوں کے تسلسل میں میں اسٹیبلشمنٹ کو ایک حقیقت سمجھتا ہوں کیونکہ دنیا بھر میں اس کا وجود ہے، دراصل اسٹیبلشمنٹ پالیسیوں کے تسلسل کی علامت ہوتی ہے۔ امریکہ، انڈیا، انگلینڈ ہر جگہ یہی بات دیکھنے میں آتی ہے۔ مثلاً آپ دیکھیں کہ گزشتہ پچاس سال سے پاکستان کے چین کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں اور اس میں تسلسل رہا ہے چاہے بھٹو کی حکومت تھی یا ضیاء الحق، ایوب خان، نواز، زرداری اور عمران خان کی۔ چین کے ساتھ ہمارے تعلقات کبھی خراب نہیں ہوئے، اس لیے کہ یہ تعلقات اسٹیبلشمنٹ ہی کے استوار کردہ ہیں۔ یہی صورتحال ہماری سعودی عرب اور ایران کے ساتھ بھی ہے۔ عراق ایران جنگ میں پوری عرب دنیا عراق کے ساتھ تھی اور پاکستان پر دباؤ تھا کہ عراق کا ساتھ دیا جائے لیکن پاکستان ایران کے خلاف نہیں گیا۔ یمن کے مسئلے پر بھی یہی رہا کہ پاکستان نے اینٹی ایران سٹانس سے گریز کیا، یہ تسلسل اسٹیبلشمنٹ کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے۔ ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ اسٹیبلشمنٹ کو پیچھے رہ کر کام کرنا چاہیے اور اپنے گروپ اور اپنی سیاسی جماعتیں نہیں لانچ کرنی چاہئیں۔ پالیٹکس نہیں کرنی چاہیے اس سے ملک کو نقصان ہوتا ہے اسٹیبلشمنٹ کنٹروورشل ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے گروپس اور اپنے چکروں میں پالیٹکس نہیں کرنی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

چاہیے۔ میں بہت پرامید ہوں کہ وطن عزیز کے حالات بہتر ہوں گے اور تعمیر و ترقی کی منازل طے کرے گا۔ پاکستان میری محبت ہے اور یہ محبت مرتے دم تک قائم رہے گی۔ ان شاءاللہ۔

پاکستانی فوج کے متعلق عرض کردوں کہ میں ایک پرو پاکستان اور ''نیشنلسٹ'' ہوں۔ میں پاکستان اور مسلم امہ کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہوں۔ پاکستان اسلام کا ایک قلعہ ہے۔ پاکستان کی مضبوطی اسلام ہی کی مضبوطی ہے۔ پاکستان کے مفادات اور اسلامی دنیا کے مفادات ہم آہنگ ہیں۔ میں پاکستانی فوج کا زبردست حامی ہوں اور سمجھتا ہوں کہ فوج ہی اس ملک کی حفاظت کرنا جانتی ہے اور فوج نے بے پناہ قربانیوں سے یہ ثابت بھی کیا ہے۔ جہاں بھی پاکستان کی سلامتی اور سیکورٹی ایشوز کا مسئلہ آئے گا میں ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ اور فوج کے ساتھ کھڑا ہوں گا۔ میں پاکستانی فوج کے ''سٹریٹجک ڈیپتھ'' کو سپورٹ کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں اسے غلط سمجھا جاتا ہے، اس کا خواہ مخواہ تمسخر اڑایا جاتا ہے حالانکہ پاکستان کی سٹریٹیجک ڈیپتھ تھیوری جوابی ہے، یہ افغانستان میں بھارتی سٹریٹجک ڈیپتھ پیدا کرنے کی کوششوں کا جواب ہے۔ میں پاکستان کی نیوکلیئر پالیسی اور نیوکلیئر پروگرام کا زبردست حامی ہوں۔ سمارٹ بم اور جدید ویپن بنانے کا حامی ہوں اور اس خطے میں ''انڈین Hegemony'' کے خلاف جو پاکستانی فوج جدوجہد کررہی ہے، یہ بلاشبہ بہت ہی اہم ہے۔ فوج کے سیاسی کردار کے سوا اس کے ہر رول کو ہم سپورٹ کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیں چین، ایران، سعودی عرب سمیت تمام عالمی برادری کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کرنے چاہئیں لیکن سب سے پہلے اپنے قومی مفادات کو سامنے رکھنا چاہیے۔ ہمیں بے وقوف بالکل نہیں بننا چاہیے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا ایک مشہور قول ہے کہ ''ہم دھوکے کی ہزاروں صورتوں سے واقف ہیں لیکن ہم دھوکہ نہیں دیتے''۔ ہمیں بھی دوسروں کو دھوکا نہیں دینا چاہیے لیکن خود کو دھوکے سے بچانا تو چاہیے۔ چین ہمارا دوست ہے لیکن اس کے ساتھ معاہدوں میں بے وقوف نہیں بننا چاہیے اور ان کے مفادات کے لیے خود کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔ اب دیکھیں کہ ایران بہت برے حالات میں گھرا ہوا تھا۔ اس پر بہت سی پابندیاں تھیں، عالمی دباؤ تھا اور اس کی گیس کا کوئی بھی خریدار نہیں تھا۔ اس نے ہماری ساتھ گیس کی ڈیل کی ہے اور ان حالات کے باوجود انتہائی سخت ڈیل کی ہے جبکہ تاپی گیس معاہدہ ہمیں ایران معاہدے سے 10 فیصد سستا پڑا ہے۔ ایران نے اتنے سخت حالات کے باوجود بھی پاکستان کے ساتھ معمولی ٹکے کی بھی رعایت نہ کی اور اپنے مفادات کو عزیز رکھا۔ تو ہمیں بھی اپنے معاملات ویسے ہی چلانے چاہئیں۔ براہ کرم میری اس بات کو شیعہ سنی کے تناظر میں نہ دیکھیں، میں نے پاکستانی ہو کر بات کی ہے، ان معاملات پر غور کرنے والا پاکستانی شیعہ بھی یہی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بات کرے گا۔

عالمی شہرت یافتہ موٹیویشنل سپیکر ٹونی بیوزان سے ملاقات بھی میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ لاہور میں منعقدہ ایک سیمینار میں ٹونی نے پانچ گھنٹے تک اپنے نظریات اور تجربات شیئر کیے تھے۔ لاہور میں ایک سیمینار ہال میں آفیشل قسم کے سوٹ میں ملبوس سی ای اوز اور دیگر ٹاپ ایگزیکٹوز کے درمیان ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور جینز میں ملبوس یہ اخبار نویس یقیناً عجیب اور مختلف نظر آ رہا تھا لیکن یہ دیکھنے اور سوچنے کا یارا کسے تھا؟ ٹونی بیوزان کی گفتگو کے جادو نے ہر ایک کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ حیرت سے منہ کھولے، ہر ایک گورے بابے کو دیکھتا تھا جس کی حیران کن کمیونیکیشن نے سب کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ مائنڈ میپ تکنیک کے اس بانی نے دنیا بھر میں مائنڈ لٹریسی، کری ایٹو تھنکنگ اور سپیڈ ریڈنگ کے نئے دور کا آغاز کیا۔

تہتر سالہ ٹونی بیوزان کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ ان کی وجہ شہرت انسانی دماغ کو زیادہ سے زیادہ بہتر انداز میں استعمال کرنے کے لئے ان کی وضع کردہ تکنیکس اور میتھڈز ہیں۔ ٹونی نے وہ شہرہ آفاق مائنڈ میپنگ کی تکنیک دریافت کی جس نے مغربی دنیا کے ٹاپ کے تعلیمی اداروں، ملٹی نیشنل کارپوریشنز اور اہل دانش میں دھوم مچا رکھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چار سو سال پہلے اطالوی جینئس لیونارڈو جسے ان کی شہرہ آفاق تصویر مونالیزا کی وجہ سے شہرت ملی وہ بھی مائنڈ میپ کا طریقہ استعمال کرتے تھے۔ ٹونی بیوزان نے نہ صرف اس طریقہ کو باقاعدہ علم بنایا، سائنسی شکل دی بلکہ انسانی دماغ پر ریسرچ کر کے تخلیقی صلاحیت کو بہتر انداز میں استعمال کرنے کے طریقے ایجاد کیے۔ ٹونی بیوزان کے مائنڈ میپ نے بل گیٹس جیسے کارپوریٹ کنگ سے لے کر آئی بی ایم، جنرل موٹرز، بڑے بڑے بینکوں اور ہاورڈ، آکسفورڈ جیسی یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور دانشوروں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ بل گیٹس نے کہا تھا کہ مائنڈ میپنگ کرنے والے ہی ہماری انفارمیشن ٹیکنالوجی کو اگلی سٹیج پر لے جا رہے ہیں۔

ٹونی بیوزان 140 سے زائد کتابوں کا مصنف ہے۔ دنیا کی چالیس زبانوں میں ان کی کتابوں کے تراجم فروخت ہو چکے ہیں۔ مائنڈ میپنگ ان کا مرکزی کام تھا لیکن میموری اور سپیڈ ریڈنگ پر بھی ان کے کام کو دنیا بھر میں سراہا گیا۔ ان کی سب سے پہلی کتاب یوز یور ہیڈ (Use Your Head) اکتالیس سال قبل شائع ہوئی تھی۔ اس نشست میں ایک ایگزیکٹو نے ٹونی بزن سے سوال کیا کہ ہمیں ٹائم مینجمنٹ کے حوالے سے کوئی مشورہ دیں۔ بوڑھے ٹونی بزن نے مسکرا کر جواب دیا کہ وقت تو ہزاروں سال سے یہیں پر ہے، ہمیشہ رہے گا۔ وقت کی مینجمنٹ کی فکر چھوڑیں وقت اپنے آپ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کوخود ہی دیکھ لے گا۔آپ اپنے دماغ کی مینجمنٹ کریں۔ جب اپنے دماغ کو درست انداز میں استعمال کرنا، نئے طریقے سے سوچنا شروع کردیں گے تو باقی تمام مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

میں چونکہ 25 برس سے صحافت سے وابستہ ہوں تو ضروری سمجھتا ہوں کہ اس عنوان پر بھی اپنے کچھ خیالات کا اظہار کروں۔میرا خیال ہے کہ ایک صحافی کو ''دربار'' سے وابستہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے اور ایک صحافی کو کسی قسم کا سرکاری عہدہ بھی نہیں لینا چاہیے۔صحافی کا تعلق عوام کے ساتھ ہے اور وہ عوامی مسائل پر آواز اٹھاتے ہیں۔وہ عوام کے ترجمان ہیں۔صحافی کا کام یہ ہے کہ دربار کی طرف سے منہ پھیر کر عوام کی طرف منہ کرلے۔استقامت سے کام لینا چاہیے۔صحافت میں مشکل وقت آتا رہتا ہے اور انسان استقامت سے کام لے اور اللہ پر یقین رکھے تو وقت کٹ جاتا ہے۔ایک وقت تھا کہ لاہور شہر میں میرے پاس موٹر سائیکل بھی نہیں تھی اور میں بسوں، ویگنوں پر دھکے کھاتا تھا۔دو دو میل پیدل چلا کرتا تھا۔اب اللہ کریم نے سب چیزیں بہتر کردی ہیں اور الحمدللہ رزق حلال سے بہتر کی ہیں۔رزق حلال کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ میں تین بڑے میڈیا گروپس (ایکسپریس۔دنیا۔ 92نیوز) کی بانی ٹیم کا اہم حصہ رہا ہوں۔جنگ اخبار میں بھی کام کیا۔جب آپ ایک سینئر صحافی کے طور پر تسلیم کرلیے جاتے ہیں تو پھر آپ کے پاس مختلف مواقع آتے ہیں، ترغیبات آتی رہتی ہیں۔ہم تعلقات بھی بنا سکتے ہیں اور خود کو کیش کروا سکتے ہیں لیکن اپنے ضمیر کا اعتماد اور سکون ختم ہو جاتا ہے۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کوئی ایک بھی بندہ ایسا نہیں ہے جو میری طرف انگلی اٹھا سکے اور میرے کریکٹر پر بات کر سکے۔اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔کوئی بھی سیاست دان اور سیاسی پارٹی یہ دعویٰ نہیں کر سکتی ہے کہ ہم نے اس کو نوازا ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ ایک مشہور تابعی بزرگ حرم شریف میں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے تھے۔اس وقت کے خلیفہ آئے اور وہاں ان کے پاس بیٹھ گئے، وہ بزرگ اسی بے نیازی سے بیٹھے رہے، خلیفہ کے ایک وزیر نے ان سے کہا کہ امیر المومنین سامنے تشریف فرما ہیں اور آپ اسی طرح ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے ہیں تو اس پر انہوں نے بڑا ہی زبردست جواب دیا: ''ہاں میں ٹانگیں پھیلا سکتا ہوں کیونکہ میں نے اپنے ہاتھ سمیٹ رکھے ہیں''۔ جب آپ اپنے ہاتھ سمیٹ لیتے ہیں اور کسی کے آگے نہیں پھیلاتے تو آپ بادشاہ بن جاتے ہیں۔ مجھے آج تک کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ میں وزیروں مشیروں اور بیوروکریٹس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے اور وہی اپنے خزانوں سے دے رہا ہے۔

درباری صحافیوں نے ہماری صحافت کو بدنام کیا ہے۔یہ صحافی سیاسی جماعتوں کے پے رول پر ہیں اور انہی کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔چودھریوں، شریفوں وغیرہ کے اپنے صحافی ہیں جو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ان کی ناز برداری کرتے ہیں۔تحریک انصاف کے اردگرد بھی ایسے صحافی ہیں جو کچھ حاصل کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔میں نوجوان صحافیوں سے کہنا چاہوں گا وہ یہ بات اپنے دل میں بسالیں کہ جووہ چاہتے ہیں اللہ ان کوضرور دے گا لیکن اپنے صحافتی کردار کوداغ دار نہ کریں۔میں نے فوج کی ہمیشہ حمایت کی ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں کسی بھی فوجی عہدیدار اور آئی ایس پی آر کے قریب نہیں گیا۔آئی ایس پی آر کے کسی دفتر کا وزٹ تک نہیں کیا۔اگر مجھے کوئی بلاتا بھی ہے تو میں خودگریز کرتا ہوں۔میں اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ میں جو چاہوں لکھوں اور آزادانہ تجزیہ کروں۔جب آپ کسی کے قریب ہو جاتے ہیں تو پھر غیر جانبدارانہ تجزیہ نہیں کر پاتے۔

الیکٹرانک میڈیا پر جانے کی کوشش نہیں کی صحافت کے میڈیم کی بات کی جائے تو مجھے پرنٹ میڈیا پسند ہے اور مجھے نیوز چینلز پسند نہیں۔ٹی وی جرنلزم میں سٹریس بہت زیادہ ہے۔پرنٹ میڈیا میں تو پھر بھی گرین لائٹ آجاتی ہے لیکن الیکٹرانک میڈیا میں صرف ''ریڈ لائٹ'' یا زیادہ سے زیادہ ییلو لائٹ ہے۔وہاں پر مسلسل پریشر اور سٹریس رہتا ہے۔میرے نزدیک ٹی وی جرنلزم معیاری جرنلزم بھی نہیں ہے۔بریکنگ نیوز کلچر کا تو میں سخت مخالف ہوں۔سنسنی پھیلانا اور کسی کے پیچھے پڑ جانا یہ صحافت نہیں کچھ اور ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ٹی وی چینلز ایک عفریت بن چکے ہیں۔یہ ایک مونسٹر ہیں جن کو ہر لمحے ''راتب'' چاہیے اور گوشت چاہیے۔ان کا کام لوگوں کا خون پی کر اپنا پیٹ بھرنا ہے۔الیکٹرانک میڈیا کی قیمت بہت زیادہ ادا کرنا پڑتی ہے اور جب آپ بھی اسی کا حصہ ہوں گے تو آپ کو یہ سب کام کرنا پڑیں گے ورنہ آپ جلد ہی آؤٹ ہو جائیں گے۔

پرنٹ میڈیا میں مسائل تو بہت زیادہ ہے۔یہ بہت جلدی تو ختم نہیں ہوگا لیکن اسے شدید خطرات بہر حال لاحق ہیں۔مجھے لگتا ہے کہ ہمارے پرنٹ میڈیا میں اب تخلیقی صحافی نہیں رہے۔ اخبار کو جس انداز سے ایک نئے دور میں ڈھالنا چاہیے وہ آج تک نہیں ہو سکا۔اخبارات کو پرانے ہی انداز میں چلایا جا رہا ہے۔وہی بیانات کا انداز اور اسی قدیم انداز کی خبریں۔ہم نے اپنے اخبار میں کوشش کی ہے کہ اس میں سوشل میڈیا پر اچھا لکھنے والوں اور بلاگرز کو شامل کیا جائے۔اخباری صحافت کو بچانا ہے تو اس میں آپ کو نیا خون شامل کرنا پڑے گا اور ادارتی صفحات کا مزاج تبدیل کرنا پڑے گا،سٹائل بدلنا ہوگا۔روایتی صحافیوں کی بجائے نئے لوگوں کو آگے لانا ہوگا،خواتین کو موقع ملنا چاہیے۔سوشل میڈیا کو پرنٹ میڈیا کے ساتھ مکس کیا جائے،مگر سلیقے سے،یہ کام ہو تو پھر یہ بچ سکتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اخبارات کے پریزینٹیشن سٹائل کو تبدیل کرنا ہوگا۔خبروں کے سٹائل کو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بدلیں اور زیادہ سے زیادہ تجزیے شامل کیے جائیں۔اب تو جس دن اخبارات چھپتا ہے اس سے بہت پہلے ہی لوگوں تک خبریں پہنچ چکی ہوتی ہیں۔آپ اندازلگایئے کہ میرے جیسا بندہ جو کہ بچپن ہی سے اخبارات پڑھ رہا ہے، اب ایسا ہوتا ہے کہ اخبارات کی فائل بندھی رہ جاتی ہے اور اسے کھول کر دیکھ بھی نہیں پاتا اور مجھے معلومات کے حوالے سے کوئی فرق بھی نہیں پڑا کیونکہ یہ تمام معلومات پہلے سے مجھ تک پہنچ چکی ہوتی ہیں۔جب لوگ انٹرنیٹ پر مفت اخبارات پڑھ لیتے ہیں تو وہ پرنٹ اخبار کیوں خریدیں گے۔

سوشل میڈیا میں پوٹینشل تو بہت ہے لیکن گند میں بھی بہت زیادہ ہے۔اس کا حل یہی ہے کہ تمام فیک اکاؤنٹس بند کر دیے جائیں۔سوشل میڈیا پر کسی کی عزت اچھالنا اور بکواسیات کا کلچر بہت عام ہے جس سے بہت الجھن ہوتی ہے اور اس کی ساکھ متاثر ہو رہی ہے۔سوشل میڈیا نے بہت سے لکھنے والے پیدا کیے ہیں اور لوگوں کو اپنی آواز بلند کرنے کا اختیار دیا ہے۔سوشل میڈیا سے مین سٹریم میڈیا کی جو اجارہ داری تھی وہ اب ختم ہوگئی ہے۔اگر کسی اہم اشو پر مین سٹریم میڈیا بائیکاٹ کرتا ہے تو وہ اشو سوشل میڈیا پر سب سے زیادہ ڈسکس کیا جاتا ہے۔اب تو حکومتوں کے لیے سنسر شپ بہت مشکل ہوگئی ہے۔سوشل میڈیا پر منفی چیزیں بھی بہت ہیں لیکن مثبت چیزیں بھی ہیں۔

میں اپنے مطالعہ کے حوالے سے پہلے بھی ایک کتاب میں ذکر کر چکا ہوں۔قومی ڈائجسٹ کے قارئین کے ذوق کے لیے بتاتا چلوں کہ میری مطالعاتی زندگی کا پس منظر یہ ہے کہ میرے والد صاحب چونکہ انتہائی وسیع النظر مذہبی خیالات رکھنے والے انسان تھے اور ان کے پاس ایک وسیع لائبریری موجود تھی جس سے میں نے بھرپور استفادہ کیا۔میری مطالعاتی زندگی کی ابتدا کچھ اس طرح سے ہوئی کہ دوسری یا تیسری جماعت میں تھا، میرے بازو میں فریکچر ہوگیا اور میں بستر پر آپڑا، وقت گزاری کے لیے مجھے والد صاحب نے عمرو عیار اور ٹارزن کی کہانیاں لاکر دیں۔میں دو ماہ تک یہ کہانیاں پڑھتا رہا۔ سامری جادوگر، چلوسک ملوسک کی کہانیاں، اس کے بعد کرائے کی کہانیوں کی دکان نے تسکین ذوق کا سامان کیا۔جہاں سے مجھے طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ مل گئیں یہ فیروزسنز کی شائع کردہ چھوٹی چھوٹی کتب تھیں اور میں ان سے واقف ہوا۔اگرچہ ذرا بڑی عمر میں، میں نے داستان اور طلسم ہوش ربا کی بڑی کتابیں بھی پڑھیں لیکن واقفیت کا آغاز ادھر ہی سے ہوا اس کے کرداروں میں بہت دل چسپی پیدا ہوگئی تھی، لندھور پہلوان کا کردار جو 7 من وزن کا گرز زمین پر اچھالتا ہے اور عمرو عیار کا کردار، اس کے بعد عمران سیریز کا دور ہے، ابن صفی اور مظہر کلیم ایم اے، ان کو بہت دل چسپی کے ساتھ پڑھا اور میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے میرے اندر نیشنل ازم کا جذبہ پیدا کیا۔ان کے یہ کردار جس طرح ملک کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

محبت میں دشمن ملک کو ہدف بنائے اوران کی سازشوں کا مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں وہ جذبہ حب الوطنی کے لیے بہت مفید اثرات پیدا کرتا ہے کچھ حوالوں سے مجھے مظہر کلیم ایم اے پسند آئے۔ انھوں نے کچھ نئے کردار بھی ڈالے جیسے جوانا، ٹائیگر، کیپٹن شکیل۔ ان کرداروں نے مظہر کلیم کی تحریروں میں زیادہ دل چسپی بڑھائی۔ ابن صفی کی کرنل فریدی عمران سیریز سے زیادہ دل چسپ ہے۔ وہ خود بھی اس کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ابن صفی کی نثر زیادہ اچھی ہے۔ مظہر کلیم میں Thrill زیادہ ہے اور ابن صفی میں سسپنس زیادہ ہے۔ اس دور میں بچوں کے نامور مصنف اشتیاق احمد کی کامران اور انسپکٹر جمشید سیریز بھی میرے لیے متاثر کن رہیں۔

سکول کے زمانے ہی میں مجھے ڈائجسٹوں سے بھی واسطہ پڑ گیا تھا خصوصاً سب رنگ ڈائجسٹ، جس نے معیاری ادب کا چسکا پیدا کیا جو بعد میں افسانہ اور ناول پڑھنے کا سبب بن گیا۔ اس دور کی ایک اہم دل چسپی تاریخ اسلام تھی۔ جب میں ساتویں جماعت میں تھا۔ کچھ نصاب سے متعلق کتابیں ہاتھ آ گئیں۔ ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ نام، واقعات سب یاد ہو گئے۔ مجھے یاد ہے کہ اس دوران میرے ماموں امین ترین جن کا ذکر کر چکا ہوں انگریزی صحافت میں ان کا بڑا نام تھا، ان کی وفات پر نوائے وقت نے تعزیتی شذرہ بھی لکھا تھا، وہ احمد پور آئے، والد صاحب نے میری تعریف کی کہ اس کو تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔ انھوں نے برامکہ کے زوال کے اسباب پوچھے۔ انہیں شاید لگتا ہوگا کہ اسے نہیں معلوم ہوگا۔ میں نے پوری کتاب رٹی ہوئی تھی۔ نصابی کتب میں دیے گئے عروج و زوال کے سب اسباب گنوا دیے۔ وہ متاثر ہوئے اور میرا خیال ہے کچھ انعام وغیرہ بھی دیا۔ انہی دنوں تاریخ ہند بھی پڑھی، اس دور میں نسیم حجازی کے ناولوں سے واقف ہوا پھر باری باری سب پڑھ ڈالے۔ ''خاک اور خون'' سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس دوران ہی میں نے زندگی کی پہلی فلم بھی دیکھی جو حیدر علی پر بنائی گئی تھی، ٹیپو سلطان کا کردار بہت ہی متاثر کن تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر طالب علم اور نو جوان کو نسیم حجازی پڑھنا چاہیے۔ ہمارے ہاں ان کے بارے میں جو پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے وہ مناسب نہیں۔ نسیم حجازی کے ناولوں میں حب الوطنی، مضبوط کردار اور ملک و قوم کے لیے کچھ کر گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکیزہ جذبات اور محبت کا خوب صورت تصور پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی نثر بہت اعلیٰ ہے، انداز اور ابلاغ بہترین ہے۔ ان کے کردار مضبوط ہیں، بہادر، نڈر، پاکیزہ فطرت کے حامل نوجوان۔ ایسے کردار نوعمر لڑکوں کے رول ماڈل ہوتے ہیں، خاص کر طاقت اور بہادری اس عمر میں دل کو بھاتی ہے۔ محمد بن قاسم ہوں یا حیدر علی اور ٹیپو سلطان۔ یہ ہماری تاریخ کے جگمگاتے ستارے ہیں اور ہماری تاریخ کے یہ کردار اعلیٰ ظرف بھی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہیں۔ یہ کہا جاتا کہ نسیم حجازی کو پڑھنے سے شدت پسندی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، یہ بالکل ہی غلط ہے۔ فکشن سے شدت پسندی کبھی نہیں آتی۔ ویسے بھی دوسری زبانوں اور قوموں میں بھی تاریخی ناول موجود ہیں، سپر مین، ہرکولیس اور بھیم کے کردار ہندی اور مغربی ادب میں عام ملتے ہیں، ان پر فلمیں اور ٹی وی سیریلز بھی بن چکے ہیں۔ اگر ان سے شدت پسندی پیدا نہیں ہوتی تو نسیم حجازی کے ناولوں سے شدت پسندی کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ مسئلہ ایک ہی ہے، ہمارے سیکولر، لبرل لکھاری نسیم حجازی کو نفرت کی حد تک اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں اسلامی تہذیب اور اس طرز زندگی کو پیش کیا ہے، جس سے انہیں چڑ ہے۔ ایسا لائف سٹائل جہاں اخلاقی ضابطوں کی پابندی لازمی ہو، ہمارے ان لبرل دوستوں کو سخت ناپسند ہے۔ نسیم حجازی بیچارے اسی لئے نشانہ ستم بنتے ہیں۔ اس کے بعد اس دور کے ایک اور توانا لکھاری عنایت اللہ تھے ان کے ناول بھی پڑھے۔ خصوصاً ''داستان ایمان فروشوں کی'' صلاح الدین ایوبی کا کردار اسلامی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش کردار ہے، جس کو سب اپنے پرائے نہ صرف مانتے ہیں بلکہ ان کی عظمت کردار کے معترف بھی ہیں، عنایت اللہ مرحوم نے بڑی عمدگی سے اسے اپنے ناول میں پیش کیا۔ محلّہ اور گھریلو لائبریری کے ساتھ ساتھ خوش قسمتی سے ہمارے شہر میں بلدیہ کی ایک اچھی لائبریری بھی موجود ہے۔ مطالعہ کے ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ ایک نعمت ثابت ہوتی ہے۔ اور میں نے بھی اس سے خوب استفادہ کیا۔

www.currentnn.com

والد صاحب کی لائبریری میں ستر کے عشرے کے چٹان، افریشیا اور اردو ڈائجسٹ کی فائلیں مل گئیں۔ چٹان میں شورش کی تحریروں نے سحر زدہ کردیا تھا۔ اسی دوران میں سید قاسم محمود کے شاہکار اشاعتی سلسلہ سے واقف ہوا۔ ان کا ترجمہ قرآن شائع ہورہا تھا، شاہکار ترجمہ قرآن میں ہر آیت کے عربی متن کے ساتھ مولانا فتح محمد جالندھریؒ کا لفظی ترجمہ، مولانا مودودیؒ کا بامحاورہ ترجمہ اور علامہ عبداللہ یوسف علیؒ کا انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا۔ اب تو وہ ترجمہ قرآن اکٹھا بھی دستیاب ہے، ان دنوں ماہانہ قسطوں میں شائع ہورہا تھا۔ قرآن فہمی میں اس کا بڑا اچھا اثر مرتب ہوا، اور ترجمہ کے ساتھ پڑھنے کا ذوق وشوق بھی بڑھا۔ انگریزی ترجمہ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش بھی کی، میٹرک کی سطح کے لڑکے کی جتنی سمجھ بوجھ ہوسکتی ہے، ظاہر ہے اسی حساب سے یہ سب ہوا۔

میٹرک کے بعد ہونے والی تعطیلات کے زمانے میں مجھے اسلامی فکر کو پڑھنے کا موقع ملا، والد صاحب کے پاس بھی اسلامی فکر کے حوالے سے اچھی کولیکشن تھی اور مسالک سے قطع نظر وہ ہر طبقہ فکر کی کتابیں اپنے پاس رکھتے تھے اور مطالعہ بھی کرتے تھے۔ ادھر سے مجھے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

''تاریخ دعوت وعزیمت'' پڑھنے کا موقع ملا، مولانا علی میاں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے آج تک کی اسلامی تاریخ اور فکر کو بہت احسن انداز میں قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے، اس کتاب کی بدولت حسن بصریؒ، ابوالحسن اشعریؒ، امام غزالیؒ، عبدالقادر جیلانیؒ اور برصغیر سے متعلق شخصیات خصوصاً حضرت مجددؒ الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی فکر اور کام سے واقفیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے ان تمام کے بارے لکھا اور پھر ان کی کتب کا جائزہ اور ان سے اقتباس اس طرح سے دیے ہیں کہ ان کی فکر اور نظریات کی پوری تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے، ساتھ ہی ان کی نثر بھی بہت عمدہ ہے۔ ان کی دوسری اہم کتاب جو مجھے اس وقت ملی وہ ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش'' تھی، جس نے مجھے جدید دنیائے اسلام میں غیر ملکی قبضہ اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی مرعوبیت اور اس کے جواب میں اٹھنے والی تحریکوں سے متعارف کروایا۔ اس دوران شبلی نعمانیؒ کی سیرۃ النعمانؒ اور المامون وغیرہ بھی مطالعہ کیں۔ علامہ شبلی کی الفاروق برسوں بعد پڑھنے کا موقعہ ملا۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں خان آصف نے آئمہ اربعہ پر ایک طویل سلسلہ شروع کیا، بالخصوص امام ابوحنیفہؒ پر انھوں نے بہت تفصیل سے لکھا تھا، بہت اچھے آسان اور عام فہم اسلوب میں چاروں آئمہ کرام یعنی امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور اولیائے کرام کی زندگی کو انہوں نے بیان کیا۔ ایک شیعہ عالم ملا باقر مجلسی کی کتاب 14 ستارے جو کہ (شیعہ عقائد کے مطابق) 14 آئمہ معصومین پر تھی، وہ بھی ہاتھ لگی اور پڑھ ڈالی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس دوران مجھے قادیانی لٹریچر کی بھی ایک کتاب ہاتھ لگی۔ لیکن اس پر مرزا صاحب کی تصویر نے بہت ہی منفی تاثر چھوڑا، میں تصویر دیکھ کر ہی متنفر ہو گیا، افکار پڑھنا تو دور کی بات ہے۔

مسلم فکر میں جو تصوف کا مقام اور کردار ہے اس کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تصوف کی امہات الکتب خصوصاً کشف المحجوب، کشف القلوب وغیرہ پڑھیں۔ شاہ ولی اللہؒ کا ذکر رہ گیا تھا، انکی فکر نے جدید مسلم تھاٹس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تصوف کی بات ہو رہی تھی، جدید اسلوب میں سرفراز احمد شاہ صاحب کی بڑی اہم کتب ہیں۔ احمد رفیق اختر صاحب کا کام اہم ہے، ویسے تصوف کے ساتھ سیکولرازم کے خلاف انہوں نے قابل قدر کام کیا ہے۔ میں پروفیسر صاحب کا مداح ہوں، مگر وہ تصوف کے روایتی نظام کے آدمی بھی نہیں ہیں اگرچہ صوفی ہیں۔ حضرت مجدد الفؒ ثانی اور نقش بندی سلسلہ پر ان کی تنقید غیر مناسب اور بلا جواز ہے۔

جہاں تک فکری تربیت اور شخصیات کے اثرات کی بات ہے تو میں کہوں گا ایک کتاب جس نے مجھ پر سینکڑوں کتابوں اور افکار کے دروازے کھول دیے وہ ستار طاہر کی کتاب ''دنیا کی سو عظیم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کتابیں'' ہے۔ دنیا کے بڑے مذاہب، افکار، نظریات اور ادب کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو اس میں لکھنے سے رہ گئی ہو، ممکن ہے کہ علمی دنیا کے آدمی اس بات کو لائق توجہ و تبصرہ نہ سمجھیں لیکن میری نظر میں تو ایسی کتاب ہے کہ اس کا سستا ایڈیشن شائع کر کے ہر طالب علم کو دے دی جائے تو یہ ایک بڑی خدمت ہوگی۔ علم، معاشرہ اور ادب کی آپ کو اس میں قرآن پاک، بائبل، گیتا اور سقراط، افلاطون، ہومر، ابن خلدون سے لے کر شیکسپیئر، دوستوفسکی، ٹالسٹائی اور اقبال سب ملیں گے، ان کا تعارف ان کی کتابوں کے اقتباسات اور غرض کیا ہے جو اس کتاب میں نہیں ہے۔

اسلامی فکر میں نظریہ ارتقاء اور دیگر کچھ حوالوں سے سید قاسم محمود صاحب سے بھی میں نے بہت استفادہ کیا۔ نظریہ ارتقاء پر ان کے انسائیکلو پیڈیا والے مضامین بہت اچھے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے عبدالغفار عزیز صاحب نے سید قطب شہیدؒ کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' بھجوائی، اور میں نے اس کو بہت متاثر کن پایا۔ اسلوب دل نشیں، ادبی معیار بہت اعلیٰ، ایسے ہی طاہر القادری صاحب کا ترجمہ اس لحاظ سے بہت اچھا ہے کہ انھوں نے ترجمے میں کچھ رعائتوں کو ملحوظ خاطر رکھا، کسی آیت کی ایک سے زائد تعبیر و تشریح ملی تو یا کا لفظ لگا کر وہ سب دے دیئے گئے۔ یاد رہے کہ سیاسی اعتبار سے میں طاہر القادری صاحب کو ناپسند کرتا ہوں۔ اپنے ترجمہ قرآن میں انہوں نے اے رسول ﷺ کی جگہ اے حبیب مکرم ﷺ کا لفظ لکھا جو احترام اور محبت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ غامدی صاحب کا ترجمہ بھی پڑھا، ان کی فکر کا بغور مطالعہ کیا، غامدی صاحب شائستہ سکالر ہیں، اگرچہ ان کی بعض تعبیروں اور تفردات سے سخت اختلاف ہے۔ میں ترجمہ کے لیے عموماً مولانا مودودیؒ کا ترجمہ ہی پڑھتا ہوں۔ اس کے حواشی مجھے بہت پسند آئے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ میری زندگی پر سب سے زیادہ اثر کس قلم کار کا ہے تو یہ کہنا میرے لیے قدرے مشکل ہوگا کیوں کہ میں نے پڑھنے میں ہمیشہ کسی تعصب کو سامنے نہیں رکھا، بہت سی کتابوں اور فکر نے متاثر کیا لیکن کسی ایک کا اسیر نہ ہو سکا، مثلاً دینی فکر میں غامدی صاحب کے خیالات نے بہت چونکایا لیکن ان کے تصوف کے بارے خیالات بہت سخت اور کسی حد تک تعصب پر مبنی ہیں۔ ان کے بعض علمی تفردات متنازع ہیں، انہوں نے امت کے مجموعی موقف سے ہٹ کر بعض جگہوں پر اپنا الگ ہی ڈول ڈالا۔ ڈاکٹر حمید اللہ مجھے بہت پسند رہے ہیں، خطبات بہاولپور ان کا اہم کنٹری بیوشن ہے۔ مولانا مودودیؒ کی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' نے چونکایا ضرور لیکن میرے خیال میں انھوں نے روایت سے انحراف نہیں کیا، بلکہ روایتی تصورات کو جدید انداز اور اسلوب میں پیش کر دیا ہے۔ ان کا اسلوب بہت عمدہ ہے لیکن فکر روایتی ہی ہے۔ تاہم سید مودودیؒ کی بعض آرا سے اختلاف کے باوجود مولانا کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مولانا اصلاحی بھی متاثر کن سکالر ہیں۔ مولانا وحیدالدین خان کی داعیانہ سوچ، اعراض کا نظریہ میرے نزدیک اہم ہے لیکن ان کا بھارتی تعصب اور تاریخ کا تجزیہ قابل توجہ نہیں ہے، اسی طرح علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ پر ان کی تنقید بھی بلاجواز ہے۔ اہل دیوبند میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ بہت متاثر کن ہیں۔ سید ابوالحسن علی ندویؒ کے شائستہ علمی انداز نے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ اہل علم کو یہی اسلوب اپنانا چاہیے۔

اخوان المسلمون، احمد جاوید، فتح اللہ گولن، شرف الدین یحییٰ منیریؒ اخوان المسلمون کا دعوتی پہلو پر لٹریچر بہت متاثر کن ہے۔ پوسٹ ماڈرن ازم پر احمد جاوید صاحب کا مضمون بڑا اہم لگا۔ احمد جاوید صاحب تصنیف وتالیف کی طرف آتے تو کمال کر دیتے۔ امین احسن اصلاحیؒ ذرا روایت سے ہٹ کر ہیں۔ مقالات فراہی اس سے بھی زیادہ اہم ہیں، ان دونوں نے میرے روایتی فکر کو کافی حد تک تبدیل بھی کیا اور خیالات میں وسعت بھی پیدا کی۔ برصغیر میں مسلم بنیاد پرستی کے افکار کی بنیاد حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے خیالات پر رکھی گئی ہے۔ ان سے آگاہی کے لیے میں نے مکتوبات امام ربانی کا بھی مطالعہ کیا اور شرف الدین یحییٰ منیری صاحب کے مکتوبات صدی اور دوصدی بھی پڑھے۔ ''دین میں ترجیحات'' علامہ یوسف القرضاوی کی بڑی قابل ذکر کتاب ہے۔ فتح اللہ گولن کے بارے پروپیگنڈا ہو رہا ہے لیکن سیرۃ پر ان کی کتاب ''نور سرمدی'' بہت ہی اہم کتاب ہے۔

جعفر شاہ پھلواری ندوی کے مقالات بھی نئی فکر کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی کے محاضرات بہت اچھے اور معلوماتی لگے، وسیع النظر اور کھلے دل کے ساتھ تعصب سے پاک گفت گو اور ان کا مطالعہ اب میری پہلی ترجیح ہے۔ واصف علی واصف کو بھی پڑھا۔ الفاظ کا چناؤ اور بیان بہت ہی عمدہ ہے۔ محمد کاظم صاحب مرحوم کا میں بڑا مداح ہوں، اگرچہ انہوں نے اپنی کتاب اخوان الصفا اور دوسرے مضامین میں ایک شاندار مضمون لکھ کر میرے محبوب مصنف خلیل جبران کا سب تاثر ختم کر دیا، اخوان الصفا پر ان کا مضمون اہم ہے۔ اس طرح ان کی ''عربی ادب کی تاریخ'' اور ''مسلم فلسفہ عہد بہ عہد'' بھی بہترین کتابیں ہیں۔ کتابوں پر ان کے تبصرے بھی بہت اہم ہیں۔ خورشید رضوی صاحب کی ''عربی زبان وادب کی تاریخ'' بھی بڑی اہم کتاب ہے۔ علامہ محمد اسد کی تحریروں نے بھی میری فکری تربیت میں اپنا کردار ادا کیا ہے، خصوصاً ''روڈ ٹو مکہ''! اقبال کے خطبات کو دوبارہ پڑھنا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔

اردو فکشن میں مجھے تقریباً ہر اہم افسانہ نگار کو پڑھنے کا موقعہ ملا۔ ان کے مجموعے بھی پڑھے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں منٹو، بیدی، کرشن چندر، غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی کو اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں شمار کرتا ہوں۔ بیدی کی بعض چیزیں حیران کن ہیں، مگر کہیں کہیں بیدی مجھے متاثر نہیں کر سکا۔ منٹو کو پڑھتے ہوئے کہیں پر بھی مایوسی کا احساس نہیں ہوتا۔ کرشن چندر میرے خیال میں اوور ریٹیڈ افسانہ نگار ہیں، انہیں ترقی پسندوں نے اٹھانے کی کوشش کی، مگر بات بنی نہیں۔ کرشن چندر نے اپنے فن کو نظریے پر قربان کر دیا اور بہت سی آورد قسم کی پروپیگنڈہ ٹائپ چیزیں لکھیں، ان کے ناول آج بالکل ہی غیر متعلق ہو چکے ہیں، کوئی ذکر ہی نہیں کرتا، کرشن چندر کے پاس بہرحال اچھے افسانے اب بھی موجود ہیں۔ عصمت کا بھی یہی حال ہے، فیمنسٹ رائٹرز جیسے کشور ناہید وغیرہ انہیں بلند کرنے کی جتنی کوششیں کریں، کامیاب نہیں ہو پائیں گی۔ قرۃ العین حیدر کا فن البتہ نہ ماننے والوں کو بھی مجبور کر دیتا ہے۔ جیلانی بانو کی بعض چیزیں اچھی لگیں۔ نئے لکھنے والی خواتین میں طاہرہ اقبال اچھی ہیں، نیلوفر اقبال کے بعض افسانے کمال کے ہیں۔ خالدہ حسین نے البتہ متاثر نہیں کیا۔ ممتاز مفتی کا آپا بڑا افسانہ ہے، مگر مجھے مفتی کا ناول زیادہ اچھا لگا، میری مراد ''علی پور کا ایلی'' سے ہے۔ اشفاق احمد کا خاص سٹائل ہے، آپ انہیں نظرانداز نہیں کر سکتے۔ یہی معاملہ انتظار حسین کے ساتھ ہے۔ میں ذاتی طور پر اسد محمد خان کو بھی ہائی ریٹ کرتا ہوں۔ سید رفیق حسین، ابوالفضل صدیقی کے جانوروں کے حوالے سے تحریریں بہت عمدہ ہیں۔ سب رنگ میں ایک ناولٹ پڑھا تھا، نمبردار کا نیلا، اس کے مصنف سید محمد اشرف ہیں، ان کا یہ ناولٹ کمال کا ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے ان کا ناول ''آخری سواریاں'' پڑھا، اچھا لگا۔ بلونت سنگھ کی بعض چیزیں بھی کمال کی لگیں۔ منشا یاد کے افسانے مجھے اچھے لگے، اگرچہ میں علامتی افسانوں کا زیادہ مداح نہیں، مجھے کہانی ہی بھاتی ہے۔

ناولوں کی طرف آئیں تو پہلے میں مستنصر حسین تارڑ کا نام لینا چاہوں گا۔ اگرچہ میرے پسندیدہ دس ناولوں کی فہرست میں تارڑ صاحب کے ناولوں سے پہلے اور نام بھی ہیں، مگر تارڑ کے سحر نے مجھے سب سے پہلے متاثر کیا۔ ہمارے نقادوں اور اردو ادب والوں نے اس کو بہت نظرانداز کیا ہے، ان کے سفرنامے کو اگر ہم زیر بحث نہ لائیں، تب بھی ناول نگار کے طور پر تارڑ ایک دیو ہے۔ فکشن کے ابتدائی طالب علموں کو میرا مشورہ ہے کہ ''پیار کا پہلا شہر'' سے آغاز کرنا چاہیے۔ یہ بڑا سویٹ سا میلوڈی رکھنے والا ناول ہے۔ تارڑ کے زیادہ بڑے ناول اگرچہ بہاؤ، راکھ، ''خس وخاشاک زمانے ہیں۔ ویسے تو قربت مرگ میں محبت کے ساتھ ڈاکیہ اور جولاہا بھی قیامت خیز ناول ہیں۔ اگر اردو کے دس بڑے ناولوں کی فہرست بنائی جائے تو میری رائے میں تارڑ کے ناول ''بہاؤ'' خس وخاشاک زمانے'' اور ''راکھ'' ضرور اس میں شامل ہوں گے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

قرۃ العین حیدر بلاشبہ اردو کی بڑی ناول نگار ہیں ''آگ کا دریا'' جب پہلی دفعہ لائبریری سے جاری کروایا، پڑھ نہ سکا، بلکہ 15 منٹ بعد ہی جا کر واپس کر آیا تھا لیکن بعد میں پڑھا اور لطف بھی لیا۔ لیکن اس کی بجائے ''آخر شب کے ہم سفر'' نے زیادہ متاثر کیا۔ عبداللہ حسین کا اداس نسلیں اہم ہے، اگرچہ وہ خود ''باگھ'' کا بہت ذکر کرتے ہیں لیکن مجھے ''نادار لوگ'' باگھ سے زیادہ اچھا لگا۔ اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی کا ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' اردو کے بڑے ناولوں میں سے ایک ہے اور قاری کو مدتوں تک یاد رہنے والا ہے۔ بانو قدسیہ نے ایک درجن سے زائد اوسط درجے سے بھی کم تر درجہ کی کتابیں لکھیں لیکن ان کا ناول ''راجہ گدھ'' ایک بھرپور معنویت رکھنے والا کام ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے کوئی ناول قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کا ''دشت سوس'' بھی بہت اہم ناول ہے۔ ہمارے ہاں اس کا تذکرہ زیادہ نہیں ملتا، ان کے جس ناول ''تلاش بہاراں'' کو آدم جی ادبی ایوارڈ ملا، وہ مجھے زیادہ پسند نہیں آیا۔ ''علی پور کا ایلی'' اگرچہ سوانحی قسم کا ناول ہے لیکن بہت اچھا، اس کا ایک خاص ذائقہ ہے۔ نئے لکھنے والوں میں ایک قابلِ ذکر نام مرزا اطہر بیگ کا ہے، ان کا ناول ''غلام باغ'' قابلِ توجہ ہے، مرزا صاحب نے اردو ناول میں خاصے تجربے کئے ہیں، سائبر سپیس کا منشی دلچسپ ناول ہے، حسن کی صورتحال البتہ کچھ زیادہ تجرباتی ہے۔ عاصم بٹ کا ناول ''دائرہ'' اچھا ہے اگر اس میں غیر ضروری طور پر جنسی تلذذ پر مبنی چند مناظر حذف کر دیئے جائیں، ان کا دوسرا ناول بھید بھی دلچسپ ہے۔ خدیجہ مستور کے ناول آنگن کی تعریف بہت سنی لیکن مجھے اس نے متاثر نہیں کیا۔ یہ کسی نقاد کی رائے نہیں بلکہ ایک عام قاری کی حیثیت سے میری رائے ہے، آپ اس کو اہمیت دیں یا نہ دیں۔ میں ایک بار پھر تارڑ کا ذکر کروں گا اور ہر نئے پڑھنے والے کو مشورہ دوں گا ان کے ناول ''خس و خاشاک زمانے' قربت مرگ میں محبت' ڈاکیا اور جولاہا'' بہت مختلف انداز میں لکھے گئے طاقت ور اسلوب کے ناول ہیں۔ جس میں محبت اپنے طوفانی انداز میں آگے بڑھتی ہے۔ تارڑ کو اردو نقادوں نے بے رحمی سے نظر انداز کیا ہے، کچھ قصور تو ان کے پبلشر کا بھی ہے جنھوں نے ان کتابوں کو عام قاری کی دسترس ہی میں نہیں آنے دیا۔ احمد بشیر کا سوانحی ناول بھی اہم ہے، اسے بھی ناقدین نے نظر انداز کیا ہے۔

افسانے کے بارے میں پہلے بات ہو چکی ہے۔ منٹو کا انداز بڑا تیکھا ہے۔ وہ فی الواقع ایک بڑا افسانہ نگار ہے۔ لیکن فحاشی کا جو الزام ہے وہ تین چار افسانوں کی حد تک تو غلط نہیں، مثلاً بو جس نے پڑھا ہو، وہ اس میں منٹو کے بے حجاب اظہار کی کیا جسٹی فکیشن دے سکتا ہے! اس طرح تو خوشونت سنگھ کے کمپنی آف ویمن کو بھی ادبی شاہکار مان لیا جائے! منٹو مگر اردو کا سب سے ممتاز افسانہ نگار ہے۔ ایک زمانے میں اردو افسانہ کے 4 بڑے ستون کہے جاتے تھے منٹو، بیدی، عصمت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اور کرشن چندر۔ عصمت کے افسانے اس لحاظ سے تو اہم ہیں کہ اس سماج میں جہاں پابندیاں زیادہ تھیں، عورتوں کے بارے انھوں نے کھلے اور جرات مندانہ افسانے لکھے اس کے علاوہ ان میں کچھ خاص نہیں۔ کرشن چندر تو ترقی پسند تحریک کی نذر ہو گئے، پروپیگنڈا ادب اور صحافت میرے نزدیک اچھی روایت نہیں ہے۔ کرشن چندر کے پاس کئی عمدہ افسانے ہیں، لیکن اگر وہ پلاننگ کر کے لکھے جانے والے ترقی پسند افسانوں کی طرف نہ جاتے تو شائد زیادہ بہتر کام دے جاتے۔ بیدی کی بعض چیزیں تو بے مثال ہیں، مگر اس سے کہیں زیادہ اوسط سے بھی کم درجے کی۔ میرے خیال میں غلام عباس کو اردو کے تین چار بڑے افسانہ نگاروں میں شامل کرنا چاہیے، ان کا کرافٹ غیر معمولی ہے۔ انتظار حسین بھی بڑے افسانہ نگار ہیں۔ زاہدہ حنا، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کا بھی معاملہ کرشن چندر والا ہو گیا ہے۔ یہ سب پراپیگنڈا ادب کے لکھاری ہیں، ان میں آورد زیادہ ہے۔ پہلے سے طے کر کے لکھا جاتا ہے۔

افسانہ کے کچھ لکھاری جو بہت زیادہ معروف نہ ہو سکے ان میں قاضی عبدالستار، سید رفیق حسین بہت اہم ہیں ان کے افسانے بہت عمدہ ہیں۔ سید قاسم محمود کے کچھ افسانے بھی بہت کمال کے ہیں قاضی عبدالستار کا داراشکوہ پر ناولٹ بہت کمال کی چیز ہے۔ ابوالفضل صدیقی کا ''سرخا'' اور دوسرے افسانوں کو کون بھلا سکتا ہے۔ ہم نے صدیقی صاحب کو سب رنگ ہی میں پڑھا۔ احمد ندیم قاسمی بھی بڑے افسانہ نگار ہیں، تعداد کے اعتبار سے بہت اچھے افسانے قاسمی صاحب کے پاس موجود ہیں۔ انہیں نظر انداز کرنا تعصب ہی ہوگا۔ پنجاب کی معاشرت اور دیہی پس منظر میں بلونت سنگھ بھی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ جدید دور یعنی پچھلے بیس پچیس سال کے حوالے سے اسد محمد خان بہت اہم نام ہے۔ وہ آغاز سے ہی بہت کمال کی تحریریں لکھ رہے ہیں، جیسے ان کا پہلا افسانہ ''باسودے والی مریم'' بہت خوب صورت کہانی ہے۔ انتظار حسین ناول کی بجائے افسانہ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ علامتی لکھنے والوں میں رشید امجد پاکستان کے حوالے سے سرخیل ہیں، ان کے بعض افسانے چونکا دینے والے ہیں۔ ویسے پچھلے دنوں ایک دوست کے ذریعے سریندر پرکاش کو پڑھنے کا موقعہ ملا، وہ غیر معمولی علامتی افسانہ نگار ہیں۔ منشا یاد بھی مجھے اچھے لگے، نیر مسعود کے علامتی افسانے بھی اچھے ہیں، مگر ان کا ''طاؤس چمن کی مینا'' شاندار افسانہ ہے۔ جیلانی بانو بھی اچھا لکھتی ہیں۔ نیلوفر اقبال کو سب رنگ ہی میں پڑھا، آنٹی اور گھنٹی وغیرہ ان کے ہلا دینے والے افسانے ہیں۔ بعض چیزیں مظہرالاسلام کی بھی اچھی ہیں۔ ایم الیاس عمدہ افسانہ نگار ہیں، انہیں ان کا اصل مقام نہیں ملا، اختر رضا سلیمی کا ناول جندر بھی اہم ہے، ان کا تذکرہ نہیں کر پایا، اس لئے افسانے ہی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں کر دیا۔ ایک زمانے میں واجدہ تبسم کو بھی پڑھا، مگر ان کے ہاں جنسی تلذذ زیادہ ہے، اگر چہ بعض تحریروں میں حیدر آباد دکن کی معاشرت اچھی بیان کی۔

سوانحی ادب جس میں خاکے، آپ بیتی اور سوانح آتے ہیں۔ یہ بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ اس میں بہت کمال کی تحریریں لکھی گئی ہیں۔ خاکوں میں ایک سٹائل تو ہے ممتاز مفتی کا۔ اوکھے لوگ، انوکھے اولڑے وغیرہ۔ مفتی کمال کا فقرے باز ہے، ایسا کاٹ دار اور تیکھا انداز کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ احمد بشیر کے خاکوں کا مجموعہ جو ملے تھے راستے میں بہت پسند آیا۔ وجہ وہی صاف گوئی اور تیکھا اسلوب ہے۔ محمد طفیل نقوش کے خاکوں کا اپنا انداز تھا، دھیمے مگر تفصیلی خاکے، مجی وغیرہ۔ چند سال پہلے ملتان کے ڈاکٹر انوار احمد کے خاکوں کا مجموعہ پڑھا، دنگ رہ گیا۔ ایسی سفا کی کے ساتھ خاکہ لکھا جا سکتا ہے، کبھی سوچا نہیں تھا۔ بہت متاثر کن خاکے تھے۔

سوانحی ادب میں سب سے اہم گاندھی کی ''تلاش حق'' ایک متاثر کن کتاب ہے۔ نہرو کی ''تلاش ہند'' اور نیلسن منڈیلا کی آپ بیتی آہنگ اور جذبات سے بھرپور اور کچھ کر گزرنے کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ قائداعظم پر جتنی بھی کتب لکھی گئیں ان میں سٹینلے والپرٹ کی جناح ہی قابل ذکر کتاب ہے۔ اوریانا فلاسی کے سوانحی اور خاکہ نما انٹرویو بھی بہت کمال کی چیز ہیں۔ اور پھر اسی طرز پر لکھی گئی ہمارے دوست جناب رؤف کلاسرا کی کتاب ''ایک سیاست کئی کہانیاں'' بھی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ عالمی ادب کے حوالے، دلکش اقوال اور ان کی ہمارے ملکی حالات پر تطبیق کے لحاظ سے روئیداد خان کی ''پاکستان انقلاب کے دہانے پر'' اہم کتاب ہے۔ ویسے تو میں فیروز خان نون کی ''چشم دید'' اور چوہدری محمد علی کی ''ظہور پاکستان'' بھی پڑھ چکا ہوں، ایوان صدر میں سولہ سال ایم بی خالد کی دلچسپ کہانی ہے جو ہمارے اولین دور اقتدار کے لوگوں کے کرداروں کو سامنے لاتی ہے اور شہاب نامہ کو تو ہم نظرانداز کر ہی نہیں سکتے، اس میں ادب، آپ بیتی اور تاریخ کا بیان بہت دل نشین انداز میں آ گیا ہے۔ بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو لڑکپن یا اوائل عمری میں بہت متاثر کرتی ہیں۔ ان میں بعض تو غیر معمولی نثر پارے تھے۔ جیسے مولانا ابوالکلام آزاد کی غبار خاطر، تذکرہ وغیرہ۔ مولانا کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ محمد حسین آزاد کی آب حیات بھی مجھے بہت اچھی لگی، دو تین بار پڑھی۔ بعض کتابیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ایک زمانے میں پسند آئیں، بعد میں پڑھا تو حیرت ہوئی ہے کہ کس وجہ سے پسند آئی۔ ''یادوں کی برات'' مجھے ایک وقت بہت پسند آئی۔ بعد میں اپنے اوپر ہی حیرت ہوئی۔ اتنی مبالغہ آمیز اور غیر ضروری تفاخر سے بھری عشق بازی کے عامیانہ جملوں والی کتاب کو آخر کیوں پسند کیا، پست اور گھٹیا جملے بولنے والوں کے ساتھ جوش کی دل

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

چسپی حیرت انگیز ہے، ان کے نزدیک ہر فحش نگار اہم ہے۔

عمدہ نثر کے لحاظ سے شبلی نعمانی کی کتابیں اور خطوط غالب بھی بہت اہم ہیں۔ لیکن اردو نثر میں جس کتاب نے اپنے اسلوب کے اعتبار سے بہت متاثر کیا وہ مختار مسعود صاحب کی آواز دوست ہے، ان کی تیسری کتاب لوح ایام بھی بے مثال ہے لیکن ''آواز دوست'' ایسی کتاب ہے کہ آپ عمر کے جس حصہ میں اور جس کیفیت سے بھی پڑھیں گے آپ کے لطف کو دوبالا کر دے گی۔ ان کے انتقال کے بعد شائع ہونے والی کتاب حرف شوق بھی کسی سے کم نہیں۔ طنز و مزاح میں شفیق الرحمٰن کو پہلے پڑھا لیکن سب سے گہرا تاثر مشتاق احمد یوسفی ہی کا بنا۔ یوسفی صاحب کے بارے میں کیا عرض کیا جائے۔ چراغ تلے، زرگزشت، خاکم بدہن اور سب سے بڑھ کر آب گم، کمال کا لکھا انہوں نے۔ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ فقرے کی تراش خراش ان پر ختم ہے، اگرچہ کہیں پر آورد کا احساس بھی ہوتا ہے، آب گم میں چونکہ کہانی کا عنصر زیادہ ہے، اس لئے یہ زیادہ دلچسپ بھی لگی۔ ابن انشا اپنی بے ساختہ نثر کے باعث ہمیشہ اچھے لگے۔ اردو کی آخری کتاب، خمار گندم اور ان کے سفر نامے اوائل کالج کے زمانے ہی میں پڑھے، بڑا لطف ملا۔ محمد خالد اختر اردو کے انڈر ریٹیڈ مزاح نگار ہیں۔ مجھے ان کی تحریریں اچھی لگیں، خاص کر ''چاکی واڑہ میں وصال''۔ نئے افق کے نام سے ان کے مضامین کا مجموعہ، اگرچہ اس کا تذکرہ بہت کم ہوتا ہے لیکن یہ ایک قابل ذکر کتاب ہے۔ ''چچا عبدالباقی کی کہانیاں'' خالد اختر کا ایک خاص سٹائل ہے، وہ انگریزی میں سوچتے اور اسے اردو میں ڈھالتے ہیں، کہیں کہیں پر قاری چونکتا بھی ہے، مگر بعد میں وہ لطف لینے لگتا ہے۔ کرنل محمد خان کی ''بجنگ آمد'' اور ''بزم آرائیاں'' بھی کم دلچسپ نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ اگر ہم کچھ اردو کے کلاسیکل نثر نگاروں کا ذکر کریں تو میرے نزدیک محمد حسین آزاد کی آب حیات اور ''نیرنگ خیال''، شاہد احمد دہلوی کی اجڑا دیار، ملا واحدی کی ''دلی جو اک شہر تھا'' اگر کسی کو خاص دلی کی زبان پڑھنے کا ذوق ہو تو فرحت اللہ بیگ کے مضمون ''دلی کا آخری مشاعرہ'' اور ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی پڑھے۔ دیوان سنگھ مفتون کی ناقابل فراموش کا ذکر کروں گا، اخلاق احمد دہلوی بھی بہت اچھی نثر لکھتے تھے۔ اس حوالے سے اشرف صبوحی کا نام نہ لینا ظلم کے مترادف ہوگا۔ صبوحی صاحب دلی والے تھے اور دلی کی زبان لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

اردو کے علاوہ کچھ کچھ انگریزی اور کسی حد تک سرائیکی لٹریچر کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ سرائیکی میں خواجہ غلام فریدؒ کا تو قلب و ذہن پر بہت گہرا اثر ہے۔ ان کی شاعری اور افکار بہت ہی اہم ہیں، ان کے علاوہ رفعت عباس اور ڈاکٹر اشولال فقیر جدید نظم اور غزل لکھنے میں بہت ممتاز و منفرد ہیں۔ شاکر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شجاع آبادی پاپولر شاعروں میں آتے ہیں، مگر ان کے دوہڑے مجھے اچھے لگے۔ عبدالباسط بھٹی نے ''سانولے سلونے'' کے نام سے سرائیکی خاکے لکھے جو بلاشبہ بہت کمال کے ہیں۔ اگر ان کا اردو ترجمہ ہو تو اردو ادب میں بھی اچھا اضافہ ہو گا۔ سفیر لاشاری، ظفر لاشاری، اچھے ناول نگار ہیں۔ ناتھ جی سرائیکی کا بہت کمال ناول ہے۔ ملک عبداللہ عرفان نے لکھا ہے کہ اس کے بھی ترجمہ کی ضرورت ہے، احمد خان طارق کے دوہڑے بھی قاری پر گہرا تاثر مرتب کرتے ہیں۔

شاعری میں غالب، اقبال، اور فیض کو ہی میں نے دل لگا کر پڑھا اور پسند کیا، منیر نیازی، ناصر کاظمی، اقبال ساجد اور ظفر اقبال اچھے شاعر ہیں۔ ظفر اقبال نے شاعری میں تجربات بہت کیے ہیں۔ ان کے ہاں ندرت خیال بھی ہے، اور نئے نئے تجربات بھی، لیکن ان کا پرابلم بسیار نویسی ہے، کاش کہ انھیں بھی کوئی فضل حق خیر آبادی مل جائے جو کہ ان کے کلام کو چھانٹ کر دیوان غالب کی طرح ایک بہترین مجموعہ کلام سامنے لائے اور ظفر صاحب غالب کی طرح اس کی بات مان بھی جائیں۔ میرے خیال میں ''انتخاب میر'' میں بھی ابھی اور انتخاب کی ضرورت اور گنجائش باقی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ شاعر اچھے تھے، لیکن کچھ لابی ان کو چڑھانے اور زیر کرنے کے لیے سرگرم بھی رہی ہیں۔ جس طرح جوش صاحب کو چڑھانے کے لیے کراچی میں ایک لابی موجود تھی اس نے فیض صاحب کے مقابلے میں جوش کو لانے کی کوشش کی اور کچھ اسلامی فکر کے لوگوں نے بھی لیکن فیض کو پیچھے نہیں دھکیلا جا سکا۔ مجید امجد، ن م راشد، احمد جاوید کی نظم بہت پاورفل ہے، نثری شاعری میں ذی شان ساحل کا کوئی جواب نہیں ہے۔ نثری نظم میں افضال احمد سید قابل ذکر لگے۔

انگریزی میں گاڈ فادر بہت پسند آیا۔ فلم سے ناول زیادہ مزے دار لگا۔ سڈنی شیلڈن، اگاتھا کرسٹی، چارلس ڈکنز، پاؤلو کوئیلو کا الکیمسٹ، ڈی ایچ لارنس کے ناول، موسپاں کی کہانیاں اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں پڑھیں، خشونت سنگھ کے ناول جیسے Train to Pakistan، ''دلی'' بھی پڑھے۔ اس کے علاوہ دو اہم کتب inside Russia, Inside America بہت پسند آئیں۔ شیر باز مزاری کی آپ بیتی بھی بہت توجہ کے ساتھ پڑھی، بھٹو کی آپ بیتی بھی شاعرانہ طرز کی نثر ہے۔ عالمی ادب کی کچھ چیزیں انگریزی میں مگر زیادہ تر تراجم پڑھے۔ بڑے ناولوں میں تو ٹالسٹائی کا وار اینڈ پیس، دوستوفسکی کے برادرز کرامازوف، کرائم اینڈ پنشمنٹ کا نام لوں گا۔ گارشیا مارکیز نے مجھے بہت متاثر کیا۔ تنہائی کے سو سال، وبا کے دنوں میں محبت، ایک پیش گفتہ موت کی روداد وغیرہ کمال کے ناول ہیں۔ اورحان پاموک بھی حیران کن ہیں، مائی نیم از ریڈ، وائیٹ کیسل پڑھے، ابھی تک ان کے سحر سے باہر نہیں آ سکا۔ حوزے ساروگوما کے ناول کا ترجمہ اندھے لوگ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پڑھا۔ حیرت ہوئی کہ ایسے بھی لکھا جا سکتا ہے۔ میلان کنڈیرا کے تجربات نے بھی چونکایا ہے۔ عالمی ادب کا میرا مطالعہ محدود ہی ہے اور زیادہ تر تراجم کی مرہون منت۔ ترجمے میں ظاہر ہے اصل والی بات بالکل نہیں ہوتی، مگر نہ ہونے سے کچھ نہ کچھ ہونا بہتر ہی ہے۔

میرے کالم نویسی کے سفر میں اگرچہ دیر سے شامل ہوئی، مگر اس کا حصہ بہت اہم اور مرکزی ہے، وہ ہیں میری اہلیہ سعدیہ مسعود۔ سعدیہ کے غیر معمولی تعاون اور غیر مشروط، غیر متزلزل سپورٹ کے بغیر میری زندگی کبھی اتنی خوبصورت نہ ہو پاتی۔ کالموں کا انتخاب بھی شاید کبھی نہ ہو پاتا اور نہ ہی کچھ اور ممکن ہوتا۔ میں نے زندگی کا ایک حصہ کڑی مشکل میں گزارا ہے، اس کی تفصیل یہاں ممکن نہیں، پھر کبھی سہی، کئی بار ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچتا، بقول یار طرح دار کرامت بھٹی میرے کئی سال گویا ریزرا ایج (چاقو کی دھار) پر گزرے۔ مجھے لگتا ہے کہ صحافت اور زندگی کے دیگر کٹھن لمحات کو صبر سے کاٹنے کا اجر مجھے اپنی اہلیہ سعدیہ مسعود کی صورت میں ملا۔ اس نے زندگی میں محبتوں کے پھول کھلائے ہیں۔ سعدیہ کے والد افضل مسعود ایڈووکیٹ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ان کے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ وہ سرائیکی کے ممتاز قوم پرست رہنما اور ادیب تھے۔ پاکستان سرائیکی پارٹی کے بانی لیڈروں اور بیرسٹر تاج لنگاہ کے انتہائی قریبی ساتھی۔ سرائیکی پڑھنے، لکھنے اور بولنے کے وہ پرجوش حامی تھے۔ انہوں نے خوشونت سنگھ کے ناول ٹرین ٹو پاکستان کا سرائیکی میں ترجمہ بھی کر رکھا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کتاب ناچ گھر اور جی ایم سید کی ایک کتاب کو بھی سرائیکی میں منتقل کیا تھا۔ عام قوم پرستوں کے برعکس افضل مسعود صاحب نہایت متحمل مزاج اور اختلاف برداشت کرنے والے انسان تھے۔ ان سے میری گھنٹوں بحث ہوتی، مگر وہ مسکراتے رہتے، کبھی بات کو تلخی کی جانب نہیں جانے دیا۔ یہی وصف سعدیہ میں بھی ہے۔ پڑھنے لکھنے کا اسے شروع سے شوق رہا، شادی سے پہلے میرے کالم پڑھتی تھی اور بقول اس کے میرا مثبت انداز اور رجائیت پسندی اچھی لگتی تھی۔ سعدیہ میرے کالم چھپنے سے پہلے پڑھتی ہے اور مصیبت یہ ہے کہ وہ تحریر اور علم کے میدان میں رعایت کی زیادہ قائل نہیں۔ جو کالم اسے پسند نہیں آتا، صاف کہہ دیتی ہے کہ آج مزا نہیں آیا یا آج آپ کا استدلال مضبوط نہیں تھا۔ جو اچھے لگیں، ان کی ستائش بھی کرتی ہے۔ خود اس کا بھی کئی سال میڈیا سے تعلق رہا۔

سرائیکی ٹی وی چینل روہی میں بطور پروڈیوسر کام کیا، ریڈیو پاکستان میں بطور ایف ایم اینکر، ریسرچر کے باقاعدہ کام کیا، سرائیکی اور اردو شو چلاتی رہی۔ اس کی تحریر میں بڑی جان ہے، خاص کر جزیات بینی کمال کی ہے، مگر بچہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے لکھنے پر توجہ نہیں، اگرچہ میرا اس کے ساتھ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

وعدہ ہے کہ ان شاءاللہ ہم دونوں مشترکہ طور پر ایک ناول لکھیں گے۔ کب ایسا ہو پائے گا، یہ قدرت کی مہربانی پر منحصر ہے۔ اپنے چاروں بچوں، بیٹی لائبہ خاکوانی، بیٹوں صارم (پہلے اس کا نام عرصم تھا) خاکوانی، معز خاکوانی اور سات سالہ عبداللہ خاکوانی کا میرے کالموں میں حصہ ابھی تک کالم میں میری تصویر دیکھنے کی حد تک ہی ہے۔ بیٹی اب اپنی پسند کا کوئی کالم پڑھ لیتی ہے، منجھلے بیٹے معز کو تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی، ارطغرل ڈرامہ دیکھ دیکھ کر وہ ترک تاریخ، منگول تاریخ وغیرہ میں دلچسپی لیتا ہے اور کتابیں بھی پڑھنے لگا ہے۔ بچوں کا کالم والا صفحہ اٹھا کر تصویر دیکھنا اور ایک تفاخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے تکنا بھی اچھا لگتا ہے۔

بطور ایک میگزین ایڈیٹر اخبارات کا مطالعہ میری ضرورت ہے اس لیے میں عموماً سب ہی اخبارات پر ایک نظر ضرور ڈالتا ہوں۔ البتہ انگریزی میں صرف ڈان ہی دیکھتا ہوں۔ کالم کے لیے زیادہ تر نائنٹی ٹو نیوز، دنیا اور جنگ کے کالم تو ضرور دیکھتا ہوں، نوائے وقت میں صرف نصرت جاوید اور اسلم خان، انہیں نیٹ پر ہی پڑھ لیتا ہوں۔ ہارون الرشید صاحب اپنے اسلوب کے منفرد طرز کی وجہ سے ہمیشہ ہی توجہ کا مرکز رہے اور ارشاد حقانی صاحب مرحوم تو میرے پسندیدہ تجزیہ نگار تھے۔ ناجی صاحب کا کرافٹ کمال کا ہے، ان سے اتفاق کریں یا اختلاف، پڑھنا ضرور پڑتا ہے۔ عطاالحق قاسمی صاحب کے مزاحیہ کالم بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ جنگ میں ان کے علاوہ مسعود اشعر، رضا علی عابدی اور وجاحت مسعود کے کالم دیکھتا ہوں۔ بعض کالم تو اس لیے بھی دیکھنا ضروری ہوتے ہیں کہ ان کے دلائل کا رد اور نقطہ نظر کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے۔ ارشاد احمد عارف کے کالم جواب ''92 نیوز'' میں آ رہے ہیں پہلے سے بہت مختلف انداز میں لکھے گئے ہیں، اس لیے بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ جاوید چوہدری نے اردو کالم نویسی کو متاثر کیا ہے، مگر اب ان کے پاس شاید زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اپنی وفات سے پہلے پروین شاکر نے بھی جنگ میں کچھ کالم لکھے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو ضرور ایک معروف اور قابل ذکر کالم نگار ہوتیں ان کے یہ چند کالم بھی ان کی شاعری کی طرح پرکشش تھے۔ دنیا اخبار میں خورشید احمد ندیم کے کالم لازمی پڑھتا ہوں، وہ توازن اور دلیل کے ساتھ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ مکتوب یورپ کے نام سے بیرسٹر نسیم احمد باجوہ کو پڑھا، اچھا لگا۔ خالد مسعود صاحب بہت اچھا لکھ سکتے ہیں، اگر وہ وقت نکال پائیں۔ ایکسپریس میں نصرت جاوید کے کالم اچھے لگے تھے، اگرچہ بہت سے کالموں سے اختلاف ہوتا تھا۔ ایاز امیر ''اپنے اچھے دن'' غضب ڈھاتے ہیں۔ خلیل ملک مجھے ایک ایسے کالم نگار لگتے تھے جو حب جاہ کی وجہ سے پاور کوریڈورز میں چلے گئے، ورنہ ان میں ٹیلنٹ بلا کا تھا، ویسے وہ انڈر ریٹیڈ کالمسٹ ہی رہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ٹی وی پر پہلی بار مجھے پی ٹی وی کے ایک پروگرام میں جانے کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد بھی سرکاری ٹی وی پر کچھ پروگرام کئے۔ ایکسپریس نیوز شروع ہوا تو ایک پروگرام کالم کار کے نام سے چلتا رہا۔ اس میں عباس اطہر، ہارون الرشید اور عبدالقادر حسن مستقل ارکان کے طور پر موجود تھے، جبکہ چوتھے کے لئے ہر بار کسی نہ کسی کالم نگار کو بلایا جاتا۔ میں نے بھی بعض پروگراموں میں شرکت کی۔ وہ پروگرام یوٹیوب پر موجود ہیں، اس لئے اکثر کوئی نہ کوئی اس حوالے سے پوچھ لیتا ہے۔ سینئر صحافی سجاد میر صاحب نے نیوز ون لاہور سے اپنا صبح کا پروگرام شروع کیا تو مجھے خاصے پروگراموں میں بلایا۔ سجاد میر کا رویہ بھی ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ انہوں نے اپنے پروگرام میں میرے بیشتر کالموں کا فراخدلی سے ذکر کیا، جن سے اتفاق تھا، ان پر صاد اور بعض پر اپنے اختلافی کمنٹس بھی دیئے۔ ان جیسے کہنہ مشق کالم نگار اور صحافی کی جانب سے میرے کسی کالم کا حوالہ دیا جانا بھی بہت حوصلہ افزا لگتا۔ سجاد میر صاحب کے پروگرام میں شرکت ایک اور اعتبار سے مزے دار ہوتی کہ وہ ناشتہ کرائے بغیر نہیں جانے دیتے تھے۔ چینل ٹوئنٹی فور پر انہوں نے پروگرام کیا تو یہاں بھی ہفتہ دس دن میں ایک بار ضرور بلا لیتے۔ یہاں پر بھی وہی ناشتہ کا سلسلہ چلتا بلکہ کئی بار تو ناشتے کے بہترین مراکز میں لے جاتے۔ میر صاحب کا کھانے کا ذوق بہت عمدہ ہے، انہیں معلوم ہوتا ہے کہ دیسی ناشتہ فلاں جگہ ملتا اور انگریزی ناشتہ فلاں ریستوران میں ملتا ہے۔ نیوز ون کے دنوں میں تو جس روز میں صبح کے پروگرام میں شامل ہوتا، اس روز عمران خان کے بہنوئی اور جنگ کے کالم نگار حفیظ اللہ نیازی صاحب سی ٹی سی (کافی اینڈ ٹی کمپنی) کے مشہور روایتی ریستوران میں ناشتے پر مدعو کرتے۔ نیازی صاحب کی محبت نے ہمیشہ دل کو موہ لیا۔ اتنی شفقت، محبت اور عزت کے ساتھ وہ میرے کالموں کا ذکر کرتے کہ ان کی فراخدلی پر حیرت ہوتی۔

صحافت میں میرا کوئی ایسا Mentor اور گارڈ فادر تو نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ میں نے صحافت میں کئی لوگوں سے سیکھا ہے اور وہ اساتذہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا آغاز اردو ڈائجسٹ سے ہوا تو الطاف حسن قریشی اور ان کے برادر بزرگ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی سے اردو ڈائجسٹ کے دنوں میں بہت کچھ سیکھا۔ الطاف صاحب خاص طور پر جس طرح اپنی تحریر پر نظر ثانی کرتے، ایک مثالیت پسند لکھاری کی طرح بار بار اسے خوب سے خوب تر بنانے میں لگے رہتے، اس نے بڑا متاثر کیا۔ الطاف صاحب ہمارے استادوں کے استاد ہیں۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تو مبالغہ آمیز الفاظ میں سراہتے اور اس طالب علم کا خون سیروں بڑھانے کا موجب بنتے۔ یہی رویہ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کا ہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

الطاف حسن قریشی صاحب کی ایڈیٹنگ بہت شاندار ہے۔انہوں نے اردو ڈائجسٹ کے ایک خاص شمارے میں الطاف گوہر صاحب کی کتاب ایوب راج کے دس سال کی تلخیص کی، وہ کمال تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے گوہر صاحب نے خود وہ تلخیص کی ہو۔قریشی صاحب تحریر اور ایڈیٹنگ پر بہت زیادہ محنت کرتے تھے۔وہ مسودے کی ایڈیٹنگ اس انداز سے کرتے ہیں کہ صفحات پر ایک جال بچھا دیتے ہیں۔ سرخیوں کے اعتبار سے بھی ان کی بہت صلاحیت ہے۔ یہی چیز میں نے ہارون الرشید صاحب میں بھی دیکھی ہے۔ جب یہ روزنامہ دنیا میں ایڈیٹر تھے تو انہوں نے میرے کالم ایڈٹ کیے۔ ہارون الرشید کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر ایک اچھا سب ایڈیٹر ہی اصل صحافی ہے۔ایک بار ہارون صاحب نے بتایا کہ جب میں اخبار میں کالم بھیج چکا ہوتا ہوں تو اگلے روز شائع ہونے سے پہلے اسے دس مرتبہ پڑھتا ہوں، اگرچہ کوئی غلطی نظر آئے تو وہ تبدیل نہیں ہو سکتی، مگر آئندہ کے لئے وہ غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جو سیکھنا چاہیے۔ارشاد احمد عارف کو اچھا تجزیہ نگار اور کالم نگار سمجھتا ہوں۔وہ جس طرح کڑیوں کو جوڑ کر تجزیہ کرتے ہیں وہ انہی کا خاصا ہے۔ 92 میڈیا گروپ میں وہ بڑے عہدے پر ہیں اور اتنے بڑے عہدے پر آ کر انسان میں فرق آ جاتا ہے لیکن وہ اسی طرح درویش صفت انسان ہیں جیسے پہلے تھے۔ان کی اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے ماتحت لوگوں کی زندگی آسان بناتے ہیں ان پر دباؤ نہیں ڈالتے۔ میں نے ارشاد احمد عارف کے تجزیے اور ان کے تحریری اسلوب کو بڑی اہمیت دی ہے۔ان کا جو کرافٹ ہے اور جس انداز سے وہ چیزوں کو جوڑتے ہیں اس نے مجھے متاثر کیا۔ پانامہ کیس سے لے کر آج کل کے دنوں تک میں نے ان کے درجنوں تجزیے درست ہوتے دیکھے، مگر وہ کبھی کریڈٹ نہیں لیتے، حد سے حد مسکرا کر دیکھ لیا کہ وہ بات درست نکل آئی ناں۔ان میں صبر و تحمل بھی کمال کا ہے۔ بعض اوقات مختلف فورمز میں ایسی ایسی دھواں دھار بحثیں ہوتی ہیں لیکن ارشاد احمد عارف جس تحمل سے تنقید کو سنتے ہیں وہ انہی کا خاصا ہے۔ میں نے بہت کم لوگوں میں یہ چیز دیکھی ہے۔

اوریا مقبول جان نے بھی ہمیشہ اسی شفقت، محبت اور خلوص کا مظاہرہ کیا۔ان کی بعض آرا سے مجھے اختلاف رہا، کبھی ان کے نقطہ نظر سے ہٹ کر کالم بھی لکھا، مگر انہوں نے نہ کبھی برا منایا نہ کچھ کہا۔ ہمیشہ خوش دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ ملتے، بہت بار فون کر کے کالم کی داد دیتے اور سراہتے۔ اردو ڈائجسٹ میں ہی محسن فارانی صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ محسن فارانی بہت محنتی صحافی اور ادیب ہیں۔ افسوس ہے کہ فارانی صاحب کو ان کا صحیح مقام نہیں ملا لیکن وہ بہت بڑے سکالر ہیں۔ان کا یوں تو بڑا کام ہے کہ لیکن انہوں نے دارالسلام میں جو سیرت انسائیکلوپیڈیا پر کام کیا ہے وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اردو ڈائجسٹ میں ایک اور سینئر تھے امین اللہ وثیر، یہ بھی بڑے سکالر تھے اور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ یہ الطاف حسن قریشی صاحب کے بڑے اچھے دوست تھے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ روزنامہ جنگ میں نیوز روم میں سب ایڈیٹر کے طور پر کام شروع کیا، اس کے بعد روزنامہ ایکسپریس میں آ گیا اور یہاں تو مجھے کوئی سکھانے والا نہیں تھا بلکہ وقت نے ہمیں ہی انچارج اور پھر سینئر بنا دیا۔ جواد نظیر ہمارے سینئر ایڈیٹر تھے اور ان سے بہت کچھ سیکھا بھی۔ میں نے ارشاد عارف صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ ہمارا لکھاریوں کا ایک فورم سی این اے (کونسل آف نیشنل افیئرز) ہے۔ یہ گزشتہ اٹھارہ بیس سال سے کام کر رہا ہے۔ میں 2004ء میں اس کونسل کا باقاعدہ ممبر بنا۔ ایوان اقبال میں اس کی ہر ہفتے ایک نشست ہوتی ہے جس میں سیکھنے کو بہت کچھ ملتا ہے۔ اس میں بڑے اچھے لکھاری اور تجزیہ نگار ہیں۔ مجیب الرحمٰن شامی صاحب بھی ان میں شامل ہیں۔ غلام مصطفیٰ میرانی اس کے چیئرمین ہیں، سجاد میر، ڈاکٹر مغیث الدین جیسے لوگ اس میں شامل ہیں۔ یہاں پر میں نے پروفیسر ہمایوں احسان جیسے انسان سے بہت کچھ سیکھا۔ زمانہ طالب علمی میں جس کالم نگار اور تجزیہ نگار سے بہت متاثر رہا وہ ارشاد احمد حقانی مرحوم تھے۔ میں روزنامہ جنگ میں کام کرتا تھا اور حقانی صاحب سے ملاقات کر سکتا تھا لیکن میں اس معاملے میں ذرا گریزاں رہتا ہوں۔ میں نے مولانا صلاح الدین احمد کا ایک جملہ کہیں پڑھا تھا کہ جو لوگ آپ کے فیورٹ ہوں ان سے ملنے سے گریز کریں کیونکہ اس سے بت ٹوٹنے کا ڈر رہتا ہے۔ نذیر ناجی ایک بہت بڑا نام ہے۔ میں نے ان کے ساتھ روزنامہ دنیا میں بہت کام کیا ہے لیکن جب میں نے ان کے ساتھ کام شروع کیا وہ ان کا اینڈ تھا اور اب ان میں وہ چیز نہیں رہی تھی جس کی شہرت ہم نے سنی تھی۔ ظاہر ہے کہ عمر کا بھی ایک تقاضا ہوتا ہے اور جوں جوں عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے انسان کی صلاحیتیں معدوم ہوتی جاتی ہیں۔ یا شاید یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو بہت بڑا نام لگتا ہو وہ اتنا بڑا ہوتا نہیں ہے۔ ویسے جو ناجی صاحب کا پرانا دور تھا مجھے وہ بہت پسند تھا۔ ان کا کرافٹ بہت اچھا تھا۔ تحریر میں اللہ نے انہیں خاص ملکہ دیا تھا۔ وہ بڑا جامع کالم لکھتے تھے۔ بلکہ ایک دور میں تو مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ جاوید چودھری اور نذیر ناجی کے سٹائل کو مکس کر کے لکھا جائے تو ایک خوبصورت کالم بن سکتا ہے۔ دنیا میں یہ دیکھا کہ بطور گروپ ایڈیٹر نذیر ناجی پروور کرتو ہیں، مگر ان میں مزاحمت کی حس ختم ہو چکی تھی، وہ فائٹ نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرا انہیں پنجابی محاورے کے مطابق لائی لگ اور کانوں کا کچا دیکھا۔ دو تین لوگ تھے جن کا کام ہی ناجی صاحب کو مخبری کرنا تھا اور وہ مزے سے ان کی سرپرستی کرتے۔ ان کی یادداشت بھی بہت کم رہ گئی تھی، دو تین بار ایسا ہوا کہ کسی درخواست پر انہوں نے دستخط کر دیئے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مگر پھر بھول گئے اور کہنے لگے کہ نہیں میں نے تو نہیں کئے تھے، آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ایسے میں آدمی بھونچکا رہ جاتا ہے کہ اتنے سینئر آدمی کو اب کیا کہے؟ دنیا سے عدنان عادل کو انہوں نے بلا جواز نکلوایا اور اس کے لئے اڑ گئے، حالانکہ عدنان عادل قابل آدمی ہیں، ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔

جنگ کے نیوز روم میں عثمان یوسف کہتے سب ایڈیٹر کو علم دشمن ہونا چاہیے، ہم اپنی لکھی تحریریں ان سے چھپاتے تھے۔ خاور نعیم ہاشمی تخلیقی نیوز ایڈیٹر تھے، وہ سازشی بھی نہیں رہے، ویلنٹائن ڈے کے تصور کو انہوں نے مقبول بنایا تھا۔ صحافت میں کچھ نام ایسے ہیں جن کا بہت بڑا نام ہے لیکن وہ حقیقت میں بڑے تھے نہیں۔ یہاں پر میں عباس اطہر صاحب کی مثال بھی دے سکتا ہوں۔ یہ بہت بڑے گارڈ فادر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی خبریں اور سرخیاں تو بہت مشہور تھیں اور ان میں کچھ صلاحیتیں بھی تھیں۔ ان میں ایک بڑی صلاحیت یہ تھی وہ کہ بالکل زیرِ مطالعہ کے ساتھ لکھتے تھے۔ پڑھنا انہیں بالکل بھی پسند نہ تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ ایک اتنا بڑا کالم نگار اور صحافی ہے اور یہ مطالعہ بالکل نہیں کرتا۔ وہ کتابوں کو بالکل ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے اسسٹنٹ نے کسی موضوع پر انہیں کئی صفحات کے پرنٹ نکال دیئے، حیران ہو کر عباس اطہر بولے کا کا میں نے تو ساری زندگی اتنا نہیں پڑھا جتنی تم نے مجھے یہ فائل تھما دی ہے۔ کہنے لگے کہ بھائی دو چار سطروں کی سمری نکال کر دو بس وہی کافی ہے۔ مجھے عباس اطہر صاحب کی جو چیز سب سے بری لگی وہ بڑے ہی روایتی انداز میں سیاست کرتے تھے اور اپنے دھڑے بناتے تھے۔ وہ اس حوالے سے ایک دیہاتی مزاج رکھتے تھے۔ میرے خیال سے ایک اچھے صحافی کو ان چیزوں سے بہت بالاتر ہو کر سوچنا چاہیے اور ان سطحی چیزوں سے باہر آنا چاہیے۔

عباس اطہر میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر ایک سے بڑی بے تکلفی سے بات کرتے تھے۔ وہ بے تکلفی میں گالی بھی دے دیتے ہیں لیکن مجھے انہوں نے ہمیشہ عزت کے ساتھ پکارا۔ شاید انہیں میرے مزاج کا اندازہ ہو گیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں روزنامہ ایکسپریس میں عباس اطہر کا سنسر بہت بے رحم تھا۔ اس وقت تو اس کی بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ اس کا مجھے بہت فائدہ ہوا۔ پیپلز پارٹی کا دور تھا۔ عباس اطہر زرداری صاحب کے دوست تھے، انہوں نے اخبار میں ایک خاص اور بہت ہی سخت قسم کا سنسر نافذ کر دیا۔ آصف زرداری، سلمان تاثیر، رحمان ملک وغیرہ کے خلاف کچھ نہ چھپ سکتا۔ این آر او سمیت پیپلز پارٹی کی کرپشن کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا تھا۔ صرف ان کی حمایت میں لکھنا ممکن تھا۔ سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ عباس اطہر جعلی ڈگریوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھنے دیتے تھے۔ کیونکہ پیپلز پارٹی ان دنوں جعلی ڈگریوں کو ڈیفنڈ کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ جن

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کھلاڑیوں نے میچ فکسنگ کی تھی ان کے خلاف بھی ہم کچھ نہیں لکھ سکتے تھے۔ جوے کے خلاف کچھ نہیں لکھ سکتے تھے، اس کی ایک خاص وجہ ہے، لاہور کے صحافی یہ بات سمجھ جائیں گے۔ ان حالات میں میرے جیسوں نے یہ طریقہ نکالا کہ سیاست پر لکھنا ہی کم کر دیا۔ نئے ایریاز ڈھونڈے۔ لٹریچر، روحانیت، سپورٹس، پرسنالیٹی مینجمنٹ، کامیابی، سائنس، عسکریت پسندی، فلم وغیرہ پر کالم لکھنے لگا۔ یوں ان موضوعات پر لکھنے کی استعداد بہتر ہوتی گئی اور چونکہ اخبار میں زیادہ تر کالم سیاسی ہوا کرتے تھے، یہ ہلکے پھلکے انداز میں لکھے گئے غیر سیاسی کالم پسند کئے جانے لگے۔ ایک نئی ریڈر شپ میری بن گئی، جس کی محبت بعد میں بھی برقرار رہی۔

عباس اطہر (شاہ جی) کانوں کے بہت کچے تھے، ہم حیران ہوتے تھے کہ اتنا بڑا آدمی ہے اور اس قدر چھوٹی حرکتیں کرتا ہے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ خالی کیسٹ ہیں جو بھی سب سے پہلے اس کیسٹ کو بھر لے یہ اسی کی ہے۔ عباس اطہر صاحب کے پاس، بہت سے لوگ جا کر بیٹھتے تھے لیکن میں ان کے پاس زیادہ نہیں جاتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ میں بغیر کسی کام کے ان کے پاس کیوں جا کر بیٹھوں۔ کوئی ضرورت ہوگی تو جاؤں گا۔ عباس اطہر کو لوگ میرے متعلق کہا کرتے تھے کہ دیکھیں اس میں نخرہ بڑا ہے، آپ کے پاس آ کر نہیں بیٹھتا۔ لوگوں کو اپنی جاب کے تحفظ کے لیے اور اپنے خلاف پروپیگنڈے سے بچنے کے لیے مجبوراً شاہ جی کے پاس جا کر کچھ دیر بیٹھنا پڑتا تھا۔ میرے خیال سے یہ عادتیں کسی بڑے آدمی میں نہیں ہونی چاہئیں۔ ہم نے ایسی عادت نہ تو شامی صاحب میں دیکھی اور نہ ہی ارشاد احمد عارف صاحب میں۔ عباس اطہر صاحب جیسی خامیاں نذیر ناجی میں بھی ہیں۔ دنیا اخبار میں ایک لابی میرے خلاف متحرک رہتی تھی۔ ناجی صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ میرے کام کی تعریف کرتے تھے اور کبھی میرے خلاف لابی کا حصہ نہیں بنے۔ شاید انہیں میرا کام پسند آ گیا تھا۔ ویسے یہاں پر دنیا ٹی وی کے مالک میاں عامر محمود کی تعریف کرنا چاہوں گا، پانچ برسوں میں انہوں نے ایک بار بھی کوئی سخت جملہ نہیں کہا بلکہ ہر سالگرہ کی تقریب میں میرا نام لے کر تعریف کرتے۔ وہ شائستہ اور بڑے دل والے آدمی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ صحافی کا بڑا دل ہونا چاہیے۔ ویسے عباس اطہر صاحب کا میرے ساتھ مجموعی رویہ شفقت والا رہا۔ ان کا ایک خاص مزاج تھا، دوسروں کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے بات کرتے، ایک خاص شفیق انداز میں گالی بھی دے دیا کرتے۔ مجھے کبھی تم کہہ کر بھی نہیں پکارا، حالانکہ ہم ان کے بچوں سے بھی چھوٹے تھے، انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا مزاج مختلف ہے، انہوں نے گروپ ایڈیٹر ہونے کے باوجود شفقت آمیز انداز میں برتاؤ کیا۔ ایسا کبھی کچھ نہیں کہا، جس سے تکلیف پہنچے۔ انسان اپنی خامیوں، خوبیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، شاہ جی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس سے مستثنیٰ نہیں تھے، لیکن ان کے اوصاف نہ گنوانا بھی ناانصافی ہوگی۔ آج وہ مٹی اوڑھے تاج پورہ کے قبرستان میں سو رہے ہیں۔ شاہ جی! آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرے ریگولر کالم شروع کرائے، خاص جگہ دی، فری ہینڈ دیا، آپ کی وجہ سے ہی میں نے ''غیر سیاسی'' کالم لکھنا بھی سیکھ لیا۔ شکریہ۔ اللہ آپ کی روح کو سکون دے۔

عباس اطہر سرخی کے بادشاہ تھے۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ صدر صدام حسین کی پھانسی پر جو انہوں نے کالم لکھا تھا اس کی سرخی بڑی زبردست تھی اور ایسی سرخی ایک تخلیقی بندہ ہی نکال سکتا ہے۔ اس کالم کا عنوان تھا: ''یزید کی شہادت''۔ کیسی منفرد بات ہے کہ شہادت اور وہ بھی یزید کی۔ یعنی ایک ایسے بندے کی شہادت ہوئی جو بہت ہی متنازع تھا۔ ان کی کامن سینس بہت زیادہ تھی۔ وہ مطالعہ تو بالکل بھی نہیں کرتے تھے، زیرِ مطالعہ کے ساتھ لکھتے تھے اور کمال کر دیتے تھے۔ ان کا فہم بہت اچھا تھا۔ ان کے قارئین کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کا تو سرے سے مطالعہ ہی نہیں ہے۔

عباس اطہر کے بے رحم سنسر شپ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں نے نان پولیٹکل موضوعات پر لکھنا شروع کر دیا اور اس میں میری مہارت بہت بڑھ گئی۔ انہی دنوں میں نے پاکستان میں پروان چڑھنے والی عسکریت پسندی اور دہشت گرد تنظیموں پر بہت لکھا۔ میں نے طالبان کو بہت پڑھا اور ان کی تحریک پر تجزیے کیے۔ افواج پاکستان کے خلاف لڑنے والے دہشت گردوں اور شدت پسندوں پر تجزیے کیے کہ آخر اس کی کیا وجوہات ہیں۔ میرے ان تجزیوں کے حوالے سے ایک مرتبہ ہارون الرشید صاحب کے صاحبزادے کی شادی پر معروف عسکری تجزیہ نگار، آئی ایس آئی کے مشہور افسر اور افغان امور کے ماہر میجر عامر نے کہا تھا کہ ''اٹک پل کے اس پار پنجاب میں طالبانائزیشن پر سب سے زیادہ اور سب سے اچھا خاکوانی نے لکھا ہے''، اس میز پر سجاد میر اور کراچی کے صحافی محمد طاہر بھی بیٹھے تھے، وہ گواہ ہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ یہ سب میں نے اپنے تجزیے کی بنیاد پر لکھا تھا۔ میرے پاس تو کوئی خاص ذرائع بھی نہیں تھے، کوئی ایجنسی بھی سرپرستی کرنے والی نہیں تھی اور اس معاملے میں میرا کوئی گرو نہیں تھا۔ اس لیے میں نوجوان صحافیوں اور لکھاریوں سے کہتا ہوں کہ آپ بہت زیادہ محنت کریں تو آپ آگے نکل سکتے ہیں۔ میں جب بھی لکھتا ہوں تو بہت زیادہ مطالعہ کرتا ہوں۔ ہر قسم کی کتابیں پڑھتا ہوں اور عالمی اخبارات و جرائد کا بہت مطالعہ کرتا ہوں اور پھر اس پورے مطالعہ کو کیپسول کی صورت میں صرف ایک یا دو کالموں میں بیان کر دیتا ہوں۔ اکثر نوجوان پوچھتے ہیں کہ ہمیں مطالعہ کے لیے کتاب تجویز کر دیں۔ بھائی کوئی ایک کتاب کسی کے لیے بھی تجویز نہیں کی جا سکتی۔ یہ کوئی نسخہ اور سمری نہیں ہے کہ آپ کو بنا کر دی جائے اور آپ ایکسپرٹ ہو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جائیں۔اس کے لیے بہت زیادہ محنت اور ہر قسم کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

مجیب الرحمٰن شامی صاحب کی شخصیت میں مَیں نے بڑا حوصلہ اور اعلیٰ ظرف دیکھا ہے۔وہ نوجوانوں اور اپنے سے بہت جونیئرز کو بہت ہی زیادہ عزت دیتے ہیں۔یہ خوبی ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔شفقت اور حوصلہ افزائی کے حوالے سے مجیب الرحمٰن شامی صاحب سرفہرست ہیں۔ ایک زمانے میں میرا ان کے ساتھ پسند، ناپسند کا رشتہ تھا۔ان کی تحریر کا میں دیرینہ مداح تھا، کالم لکھنے کا ان کا اسلوب ہمیشہ سے پسند تھا۔شامی صاحب کی بعض آرا سے البتہ شدید اختلاف تھا۔ مجھے لگتا کہ رائیٹ ونگ کے ان جیسے لکھاریوں نے وقت گزرنے کے ساتھ رائیٹ ونگ کو بے آسرا چھوڑ دیا۔نوجوانی کا زمانہ تھا، شدت زیادہ تھی۔ جہاں موقعہ ملتا، شامی صاحب کے حوالے سے سخت الفاظ استعمال کرتا۔وہاں لازمی کرتا، جن کے بارے میں اندازہ ہوتا کہ وہ بات آگے پہنچا سکتے ہیں۔اس گھٹیا قسم کے عامیانہ رویے کے جواب میں مجیب الرحمٰن شامی کا رویہ یکسر مختلف اور نہایت مشفقانہ رہا۔ جہاں ملتے میرے کالموں کی تعریف کرتے ،حوصلہ افزائی کرتے اور دوسروں کے ساتھ اتنا فراخدلانہ تعارف کراتے کہ من ہی من میں شرمندگی ہوتی۔ایسا کئی بار ہوا کہ کالم نگاروں کی کسی تقریب میں میں حسب عادت پیچھے بیٹھ گیا، شامی صاحب نے دیکھا تو آواز لگا کر آگے بلایا اور سب کے ساتھ بھرپور تعارف کرایا۔اپنے ناشتے کی روایتی محفل میں بلا لینا اور کئی کالموں پر باقاعدہ فون کر کے فیڈ بیک دینا...... یہ سب ایسے کام تھے، جن کی وجہ سے میرے دل میں شامی صاحب کی عزت بڑھ گئی اور غصہ بتدریج تحلیل ہوتا گیا۔کئی بار مجھے لگتا ہے کہ شامی صاحب کی پذیرائی اور مقبولیت کی ایک وجہ ان کا حسن اخلاق بھی ہے۔

ہارون الرشید صاحب ایکسپریس سے وابستہ ہو چکے تھے۔کبھی کبھار دفتر آتے اور گروپ ایڈیٹر سید عباس اطہر کے کمرے میں بیٹھ کر سگریٹ پھونکتے رہتے، کبھی رائٹنگ پیڈ منگواتے اور نہایت تیز رفتاری سے آدھ پون گھنٹے میں کالم لکھ ڈالتے۔ان جیسا تیز اور پرفیکٹ لکھنے والا کم ہی دیکھا۔شاہ جی سے ان کی نوک جھونک بھی چلتی رہی، چائے کی چسکیوں، سگریٹ کے کش اور کاغذوں پر گری راکھ ہٹا کر وہ لکھتے رہتے۔ہم جیسے خاموشی، رشک اور عقیدت سے اس فسوں ساز قلم کار کو دیکھتے رہتے۔بات کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ایک دن شاہ جی (عباس اطہر) کے پی اے نے بتایا کہ ہارون صاحب نے آپ کے کالم کی بڑی تعریف کی اور شاہ جی کو کہا ہے کہ ایہہ منڈا عامر خاکوانی بڑا اچھا کالم لکھدا اے، آئیڈیاز اس کے اچھوتے ہوتے ہیں۔یہ سن کر حیرت ہوئی کہ چلو کسی سینئر کو تو تعریف کرنے کی ہمت ہوئی۔ایک دو دن بعد ہارون صاحب ہمارے میگزین سیکشن میں چلے آئے۔ بے تکلف انداز

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں گپ شپ کرتے رہے، چائے پی، سگریٹ پھونکی اور پھر چلے گئے۔ یہ ہارون الرشید صاحب سے اس خاکسار کے تعلق کا آغاز تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ نہایت محبت، شفقت سے ملتے۔ ایکسپریس چھوڑ کر جنگ چلے گئے، مگر محبت کا تعلق قائم رہا۔ میرا جو کالم اچھا لگتا اس کی تعریف کرتے، گاہے صبح فون کرکے کالم پر تبصرہ کرتے۔ ان کے اسلوب کا میں بڑا مداح تھا، جی چاہتا تھا کہ کہ ایسا اسلوب ہمارا بھی ہو، یہ مگر سمجھ آ چکی تھی کہ ویسا لکھنا ممکن نہیں۔ ہارون صاحب اپنے بے تکلف حلقے میں استاد ہارون یا استاد کے نام سے مشہور ہیں۔ ہمیں کبھی شاگرد بنانے کی کوشش نہیں کی، برابری کی سطح پر، شائستگی اور نہایت گرم جوشی سے ملتے۔ ہارون صاحب کی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے کبھی سٹائل بدلنے کا مشورہ نہیں دیا، وہ ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے، جس سے سیروں خون بڑھ جاتا۔ لاہور آتے تو ان دنوں نیشنل ہوٹل میں قیام رہتا۔ فون کرکے بلا لیتے اور پھر شام کو گھنٹوں گپ شپ رہتی۔ مختلف واقعات سناتے، پرانے صحافیوں کے قصے، اپنے تجربات، مختلف سیاسی، علمی شخصیات پر آرا۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔

عمران خان کی کتاب پر کام شروع کیا تو دو ڈھائی مہینے لاہور میں جم کر بیٹھ گئے۔ روزانہ کام ہوتا، شام کو بلا لیتے، ان کے نیاز مند کبھی حلیم، کبھی مچھلی اور کبھی کوئی اور خاص ڈش لے کر آتے، ہارون صاحب کم کھاتے ہیں، مگر کھانے کا بڑے رومانی انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے کشمیریوں کے بارے میں لکھا تھا کہ انہوں نے کھانوں کو بھی اپنے رومانس کا حصہ بنا لیا۔ ہارون صاحب کا بھی یہی انداز ہے، شیزان سے دیسی چوزہ کا شوربا، نشاط کی چانپیں، حاجی صاحب کی حلیم، غلام رسول کے چنے اور نجانے کہاں کہاں کے روایتی کھانوں کا ذکر کرتے اور اشتہا بڑھاتے ہیں، جب یہ آ جائیں تو چند لقمے لے کر سیر ہو جاتے ہیں، میٹھا البتہ مرغوب ہے، وہ منگوا کر رکھ لیتے اور ہر گھنٹے دو بعد ایک دو چمچے کھا لیتے ہیں۔ ہارون الرشید صاحب کے ساتھ درجنوں بلکہ بیسیوں شامیں گزریں۔ ان کے حوالے سے صحافتی حلقوں میں کئی افواہیں مشہور تھیں، یار لوگ ان کی شاموں کے بارے میں طنزیہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ تبصرے کرتے۔ میں تو خدا لگتی بات کروں گا کہ کبھی ایسا کچھ نہیں دیکھا۔ میں نے تو انہیں شام کو پروفیسر احمد رفیق اختر کی بتائی ہوئی تسبیحات پڑھتے دیکھا، تسبیح ہاتھ میں لئے وہ تصوف پر گھنٹوں بولتے رہتے، مزے کی بات ہے کبھی خود دعویٰ نہیں کیا کہ روحانیت حاصل ہوئی یا میرے اوپر کوئی روحانی واردات گزری۔ میرا مشاہدہ تو نہایت مثبت رہا، جس کی گواہی دے سکتا ہوں۔ ہارون صاحب سے ان ملاقاتوں، نشستوں میں بہت کچھ سیکھا۔ شکریہ ہارون صاحب، آپ نے ایک طالب علم کو ہمیشہ عزت دی، شفقت کے ساتھ پیش آئے اور کبھی دل شکنی نہیں کی۔

جاوید چودھری صاحب مجھے بطور کالم نگار بہت پسند ہیں۔ انہوں نے روایتی انداز میں کالم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لکھنے کے بجائے اس کے سکوپ کو بہت زیادہ وسعت دی ہے۔اس میں بہت زیادہ اضافے کیے ہیں۔ چودھری صاحب نے کالموں میں ایسا رنگ ڈالا ہےاور ایک ایسی روایت ڈالی ہے جس سے ہمارے لیے بھی آسانیاں پیدا ہوئی ہیں۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ ایسے کالموں پر ''بابے صحافی'' ناک بھوں چڑھاتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہے۔لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ جاوید چودھری صاحب کے اکثر کردار بات کرتے ہوئے قہقہہ کیوں مارتے ہیں۔کیا ہم اپنی زندگی میں بات بات پر یوں قہقہہ لگاتے ہیں، ہرگز نہیں۔لیکن چودھری صاحب کے کردار ہر بات پر قہقہہ ہی لگاتے ہیں بھلے وہ کتنی ہی افسردہ اور فکر انگیز بات کیوں نہ ہو۔چودھری صاحب سے مجھے دوسرا اختلاف یہ ہے کہ وہ اپنے کالموں کے آخر میں پاکستان کے حوالے سے بہت زیادہ مایوسی پھیلاتے ہیں اور دوسری قوموں کو قابل رشک قرار دیتے ہیں۔میرا یہ نقطہ نظر ہے کہ مایوسی کے بجائے امید پیدا کی جائے، فیک نہ ہو جینوئن امید اور اس کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔میرے خیال میں جاوید چودھری نے اردو کالم نگاری کو فائدہ پہنچایا مگر نقصان بھی کم نہیں پہنچایا، اتنی زیادہ بے بنیاد کہانیاں گھڑیں کہ اب ہم کوئی سچی کہانی بھی لکھیں تو قاری یقین نہیں کرتا۔چودھری صاحب نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی، مگر اسے گنوایا بھی، اگرچہ ڈیجیٹل میڈیا پر وہ آج بھی پاپولر ہیں۔یہاں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ذاتی طور پر میرے ساتھ جاوید چودھری صاحب کا رویہ ہمیشہ بہت اچھا رہا۔ ہمیشہ بہت اچھے سے ملے۔ ایک آدھ بار کسی سوشل میڈیا پوسٹ میں ان پر تنقید کی تو شکوہ بھی ایسے شائستہ انداز سے کیا کہ مجھے وہ پوسٹ فوری طور پر ہٹاتے ہی بنی، اس لئے ذاتی طور پر مجھے ان سے کوئی شکوہ نہیں بلکہ وہ مہربان رہے ہیں، میری یہ تنقیدی رائے ایک قاری کے طور پر ہے۔اسی طرح حسن نثار صاحب کا بڑا زبردست کرافٹ ہے۔لیکن ان میں بھی یکسانیت بہت زیادہ ہے۔وہ ایک ہی جیسے موضوع پر ایک ہی انداز میں لکھتے جا رہے ہیں۔حسن نثار کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ایک ہی کالم دس ہزار بار لکھ چکے ہیں۔اللہ ان کے قارئین پر رحم فرمائے۔ میں کہتا ہوں کہ اپنی ریڈرشپ کو سرپرائز دیا جائے اور عام موضوعات سے ہٹ کر کسی انوکھے موضوع پر بھی لکھا جائے۔میرا یہ بھی نقطہ نظر ہے کہ جذباتیت نہ پھیلائی جائے اور دلیل سے بات کی جائے۔بہت زیادہ مذہبی حوالے اور جذباتی باتیں نہ کی جائیں۔اخلاقی دلائل دیے جائیں۔میں نے کوشش کی کہ اپنے کالموں میں دلیل اور غیر جذباتی انداز میں بات کروں۔رؤف طاہر صاحب بھی ہمارے سی این اے کے ساتھی ہیں، نہایت دیانتدار، شریف النفس انسان۔ان کی یادداشت کمال کی ہے، اپنے کالموں میں ایسے ایسے حوالے دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔مسلم لیگ ن کے زبردست حامی، مگر کوئی ان کی دیانت داری پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ہمیشہ محبت سے ملتے ہیں اور اچھے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لفظوں میں پیٹھ پیچھے بھی یاد کرتے ہیں۔ ایسے لوگ صحافت میں کم ملتے ہیں۔

اخبار نویسوں میں کئی لوگ ایسے ہیں کہ ان کی شرافت، نجابت اور مطالعہ کا میں مداح رہا ہوں۔ مظفر محمد علی جنگ پبلشر کے انچارج تھے، نہایت شریف النفس شخص، جب بھی ملا نہایت محبت سے ملے۔ افسوس کہ زندگی کے آخری برسوں میں انہیں خاصی تکلیف سہنی پڑی۔ اسی طرح خالد ہمایوں صاحب کے ساتھ کبھی کام نہیں کیا، مگر ان کے مطالعہ، ذہانت اور تحقیقی ذوق کا قائل ہوں۔ لاہور میں پرانی کتابوں کے جوہریوں میں سے ایک وہ بھی ہیں، ان کی کتاب دوستی اور ذوق مطالعہ خوب ہے۔ محسن فارانی اردو ڈائجسٹ کے ڈپٹی ایڈیٹر تھے، ان کا کہیں اور بھی ذکر آیا، فارانی صاحب بہت اچھے، شریف آدمی ہیں، کمال درجے کے محقق، سکالر۔ افسوس کہ اردو روزنامہ صحافت میں وہ ایڈجسٹ نہ ہو سکے، آج کل وہ دارالسلام میں کام کر رہے ہیں، آج تک اسی سائیکل پر ہیں، درویش منش مگر علم کی دنیا کے حقیقی مسافر۔ فارانی صاحب کے لئے دل میں بڑی عزت ہے۔ جنگ کے نیوز روم کے دنوں میں جی آر اعوان صاحب کے ساتھ کام کیا، اعوان صاحب بڑے اچھے، شریف انسان ہیں، آج کل نوائے وقت کے میگزین انچارج ہیں۔ اچھا لکھتے ہیں، بدقسمتی سے میگزین جرنلزم کی طرف بڑی تاخیر سے آئے، نہایت دیانت دار صحافی۔ جنگ ہی میں طارق جاوید صاحب نیوز ایڈیٹر تھے، جلدی دنیا سے چلے گے، ان جیسا شریف، بھلا مانس شخص میں نے نہیں دیکھا۔ یاور عباس صاحب بھی جنگ کے نیوز روم میں تھے، بڑے بھلے مانس، اچھے صحافی۔ وہاں پر ڈے شفٹ میں عبدالرحمٰن جامی صاحب تھے، آج کل وہ ہمارے اخبار کے ادارتی سیکشن میں ہیں، جامی صاحب بڑے صاحب مطالعہ انسان ہیں۔

لاہور کے سفید بالوں والے پروفیسر۔ دانشور، قانون دان، پاکستان لا کالج کے بانی سربراہ پروفیسر ہمایوں احسان سے ملاقات سی این اے میں ہوئی۔ ان کے علم، دانش اور خاص کر آؤٹ آف باکس تھنکنگ نے بہت متاثر کیا۔ بہت سے معاملات میں ہمایوں صاحب سے آؤٹ آف باکس سوچنا سیکھا۔ ان کی گفتگو کے میں باقاعدہ نوٹس لیا کرتا۔ ایسے انوکھے نکات اٹھاتے کہ آدمی ششدر رہ جاتا۔ بلا مبالغہ وہ لاہور کے چند جینوئن دانشوروں میں سے ایک ہیں۔ ہمارے میڈیا اور انٹیلی جنشیا نے ایسے نابغہ روزگار شخص کی قرار واقعی قدر نہیں کی، ورنہ انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ ہمایوں صاحب کے میرے اوپر گہرے فکری اثرات پڑے۔

صحافی، اعلیٰ پائے کا انٹرویو نگار اور عمدہ تجزیہ کار۔ کرامت بھٹی ایکسپریس میگزین میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہمارے ساتھ تھے۔ بہ لحاظ منصب میں انچارج تھا، مگر بھٹی صاحب نے ایسا کمال کا دوستی کا تعلق بنایا کہ پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں بھی قطعی اثر نہیں پڑا اور دوستوں والی قربت، گہرائی اور خلوص بھی برقرار رہا۔ کرامت بھٹی ان لوگوں میں سے ہیں، جن کے بغیر زندگی کا تصور محال سا لگتا ہے۔ آج کل وہ نجی کاروبار میں الجھ گئے ہیں، مہینوں ملاقات نہیں ہوتی، مگر لگتا ہے جیسے ہر لمحے کا ساتھ چل رہا ہے۔ میرے جیسا سست آدمی دفتر سے نکلنے کا روادار نہیں تھا، کرامت بھٹی ہی مجھے کھینچ کر لے جاتا۔ کبھی ہمایوں احسان کے پاس، کبھی ڈاکٹر عاصم یا ڈاکٹر اظہار ہاشمی سے ملاقات اور ایک زمانے میں شام کو حیدر فاروق مودودی کی محفل میں شرکت، ہر ماہ جناب کے ایم اعظم کے عشائیہ میں شرکت اور ان کی گفتگو سے لذت کشید کرنا۔ کرامت نے کالموں کے حوالے سے ہمیشہ نہایت مفید اور کارآمد مشورے دیئے، جو کالم پسند نہیں آیا، اس پر بے لاگ تبصرہ کرتا بلکہ بے رحمی کی حد تک سیدھا تبصرہ۔ ہر کچھ عرصے کے بعد ایک الگ میٹنگ کرتا، جس میں نشاندہی کی جاتی کہ کہاں کہاں کمزوری رہی، کون سی تحریر بہتر تھی اور کیسے مجموعی تاثر اچھا بنایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کرامت بھٹی جیسے مخلص دوست اور نقاد کے بغیر میرے کالموں میں ایک آنچ بلکہ شائد کئی آنچوں کی کسر رہ جاتی۔ کالم کی ایڈیٹنگ کرامت کی شاندار تھی، لفظوں کو یوں کفایت کے ساتھ برتتا اور خاص تاکید ہوتی کہ قاری کے لئے سانس لینے کی گنجائش (Breathing Space) برقرار رکھی جائے۔

ڈاکٹر عاصم تعلیم کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں، مگر انہوں نے میڈیکل کی پریکٹس نہیں کی، سول سروس کا امتحان پاس کر کے ملازمت نہیں کی اور وہ ٹیکسٹائل کے بزنس سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر عاصم اللہ بخش سے میری ملاقات اخوت کے بانی ڈائریکٹر اور معروف سماجی رہنما ڈاکٹر اظہار ہاشمی نے کرائی۔ ڈاکٹر اظہار ہاشمی اور ڈاکٹر امجد ثاقب کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے، جو کئی اعتبار سے میرے محسن ہیں، ہر کڑے وقت میں ساتھ کھڑے ہونے والے اور ان کی شخصیات میں وہ خلوص، کمٹمنٹ اور دردمندی ہے کہ چند منٹ ساتھ رہنے والا بھی سوشل سروس کرنے کا سوچنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر امجد ثاقب، ڈاکٹر اظہار ہاشمی اور ہمایوں احسان سب اخوت کے بانی ڈائریکٹرز ہیں، میری خوش قسمتی کہ سب سے فیض یاب ہوا، ان کی محبتوں کا قرض دار ہوں۔ بات ڈاکٹر عاصم اللہ بخش کی ہو رہی تھی، وہ لاہور کے جینوئن دانشوروں میں سے ایک ہیں۔ قدیم وجدید پر ان کی گہری نظر ہے۔ باقاعدہ صوفی نہ ہونے کے باوجود صوفی منش، قرآن پر گہری نظر، اقبال حرز جان، فلسفہ، مغربی علوم پر گہری نظر اور سیاسی وسماجی مسائل کا نہایت عمدہ تجزیہ...... ان کی بنیادی خصوصیات میں شامل ہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر عاصم کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ مومن کی فراست سے کیا مراد ہے۔ان کا بہت سے معاملات میں تجزیہ اور آرا بعد میں یوں درست ثابت ہوئیں جیسے وہ صاحب کشف ہوں اور ان کا کشف درست نکلا۔ڈاکٹر عاصم سے بہت کچھ سیکھا۔میرے کالموں اور میری فکر پر ان کے نہایت گہرے، ان مٹ اثرات مرتب ہوئے۔خاص کر توازن، دلیل اور اعتدال کی خصوصیات ان سے مکالمہ کر کے سیکھیں۔

یہ نوجوان ایکسپریس میں پہلے عباس اطہر صاحب کے اسسٹنٹ کے طور پر آیا، پھر میگزین کا حصہ بنا۔محمود الحسن سے زیادہ کتاب دوست اور مطالعہ کا شائق کم ہی دیکھنے کو ملا۔ مجھے شروع ہی سے محمود چھوٹے بھائیوں کی طرح اچھا لگا۔ پڑھنے کا بے پناہ جنون تھا، کتابیں اس کے پاس بہت تھیں، آدھی سے زیادہ تنخواہ انہی پر خرچ کرتا۔پھر اسے دوسروں کو پڑھوانے، علمی مدد کرنے کا بھی جنون تھا۔ آپ کسی موضوع پر لکھنا چاہ رہے ہیں، اس سے ذکر کر بیٹھیں، دیوانہ وار مدد کے لئے متحرک ہو جائے گا، اپنی لائبریری سے ریفرنس بکس ڈھونڈ لائے گا، کہیں سے کوئی حوالہ، نیٹ سے کوئی اور حوالہ، اس کا بس نہیں چلتا کہ دوسروں کی زندگی کس طرح آسان بنا دے۔محمود نہ ہوتا تو میرے کئی کالم نہ لکھے جا سکتے۔اس کی کتابوں کی متواتر اور آزادنہ سپلائی ہمیشہ جاری رہی۔

کالم نویسی کے تجربے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ لکھنا ایک پیکیج ڈیل ہے، جس میں کئی لوگ معاون ثابت ہوتے ہیں، اگرچہ کریڈٹ انہیں نہیں مل پاتا، فرنٹ پر ایک ہی لکھاری یا کالم نگار ہوتا ہے، مگر قدرت کا اپنا ایک نظام کام کرتا اور کئی لوگوں کو اس کے قریب کر دیتا ہے، ان کی معاونت، حوصلہ افزائی اور مدد سے مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔کم از کم میرے معاملے میں تو ایسا ہی ہوا۔سی این اے کے دوستوں کے علاوہ میرے میگزین کے ساتھیوں نے بڑا ساتھ دیا۔نیوز روم سے ایک صاحب ملک فیض بخش صاحب تھے، جو ہمارے پاس میگزین میں تشریف لاتے اور ہمیشہ کھل کر حوصلہ افزائی کرتے، بعد میں وہ ادارتی شعبہ کا حصہ بن گئے۔ابتدا کے دنوں میں جب لکھنے والے پر عدم اطمینان اور بے یقینی کی کیفیت طاری ہوتی ہے، ملک فیض بخش انہی دنوں میں امید، حوصلہ افزائی کا لائیٹ ہاؤس بن کر آتے اور امید بندھا کر چل دیتے۔ورنہ نیوز روم کے بیشتر لوگ، حتیٰ کہ میگزین کے ایک ابتدائی ساتھیوں کا رویہ نہایت حوصلہ شکن تھا۔وہ یوں تاثر دیتے جیسے کبھی میرا کوئی کالم پڑھا ہی نہیں۔پڑھ لیتے تو کسی کو فیڈ بیک دینے کی توفیق نہ ہوتی۔یہی حال پریس کلب میں تھا۔معلوم نہیں صحافتی کمیونٹی میں اس قدر حسد اور منفی سوچ کیوں ہے؟ البتہ پریس کلب میں دو سینئر صحافی ایسے تھے، جنہوں نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ایک مشرق کے سابق ایڈیٹر عزیز مظہر مرحوم اور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دوسرے قریشی صاحب۔ عزیز مظہر کیفے ٹیریا میں بیٹھے ہوتے تو اپنی میز پر بلا لیتے۔ ایک دن کمال مہربانی سے کہنے لگے کہ آپ نے ایکسپریس میں جو مباحث چھیڑے ہیں، ان میں وہی رنگ اور چمک نظر آئی جو کسی زمانے میں زینو (صفدر میر) نے لکھے تھے۔ یہ بات سن کر میرا اعتماد جس قدر بڑھ گیا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ صفدر میر لیجنڈری صحافی تھے، ان سے میرا کیا موازنہ ہو سکتا ہے، مگر عزیز مظہر صاحب کا یہ حوصلہ افزائی کا انداز بھلا لگا۔ عزیز مظہر صاحب برسوں پہلے چلے گئے، ملک فیض بخش کا چند ماہ پہلے انتقال ہوا، بڑا دکھ ہوا۔ بشیر واثق اور عبیداللہ عابد۔ ابتدائی دنوں میں تو نہیں، مگر بعد میں میگزین سیکشن میں بشیر واثق، عبیداللہ عابد وغیرہ بھی حصہ بنے۔ یہ نوجوان پڑھنے لکھنے والے تھے، عبید عابد کا تعلق جمعیت سے رہا تھا، اس سے بڑی بحثیں چلتی رہتیں۔ بشیر واثق نے خاص کر میرے ایک نجی معاملے میں بہت مدد کی اور پریشانیوں کے ایک فیز میں بڑا ساتھ دیا۔ اس کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔

اکثر نئے لکھنے والے مجھ سے کہتے ہیں کہ ان کی تحریروں کی اصلاح کروں۔ اس حوالے سے میں نئے لکھنے والوں سے کہوں گا کہ بھئی سچی بات یہ ہے کہ کالم نگاری میں اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ اس میں استاد شاگرد والا روایتی معاملہ نہیں چلتا۔ یہ شاعری نہیں کہ جس کی اصلاح کی جا سکے۔ کسی کے پاس وقت نہیں اور خاص طور پر میرے جیسا پروفیشنل اخبار نویس غریب آٹھ گھنٹے ملازمت کرے، اپنے کالم کی بھی فکر کرے اور شاگردوں کی اصلاح بھی کرے، ظاہر ہے یہ ممکن نہیں۔ ہمارا مشورہ یہی ہے کہ صحافت اور کالم نگاری میں کسی مینٹور کو ڈھونڈنے کے بجائے خود زیادہ سے زیادہ محنت کی جائے اور اچھے مصنفین کو پڑھا جائے، ان سے سیکھا جائے۔ جتنا آپ کا مطالعہ ہوگا اتنا ہی فائدہ ملے گا۔

آخر میں کچھ فلمی ذوق کی بات بھی ہوئی۔ میں فلموں کا قائل ہوں۔ یہ انسانی جذبات اور شخصیت کے اندرونی تضادات سے روشناس کراتی ہیں۔ فکشن بھی یہی کام کرتی ہے۔ مگر بعض جگہوں پر فلم زیادہ موثر انداز سے چیزیں دکھاتی ہیں۔ ابتدا میں تو فلموں کے متعلق میرا ذوق عام سا تھا۔ وہی جیمز بانڈ کی فلمیں، ایکشن، تھرلز وغیرہ پسند تھیں۔ ہمارے گھر میں 1990ء تک ٹی وی نہیں تھا۔ جب میں نے گریجوایشن کر لیا تو ٹی وی آیا۔ والد صاحب کا نقطہ نظر تھا کہ ٹی وی بچوں کی پڑھائی پر اثر انداز ہوتا ہے اور پڑھائی سے توجہ بھٹکا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اسی کے عشرے والی بھارتی فلمیں نہیں دیکھیں۔ امیتابھ بچن کا عروج، کشور کمار کے گانے وغیرہ نہ دیکھ سن سکا۔ دوست ذکر کرتے تھے لیکن میں ان سے اجنبی رہا۔ بہت بعد میں شعلے اور ایک آدھ اس زمانے کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

مشہور فلم ریکارڈ درست رکھنے کے لیے دیکھ لی۔ ٹی وی ڈرامے بھی اس زمانے میں نہیں دیکھے۔ کسی عزیز کے گھر پر کبھی دیکھ لیا تو دیکھ لیا۔ جب میں 1996ء میں مستقل لاہور آ گیا تو یہاں پر چند ایک ایکشن فلمیں سینماؤں میں دوستوں کے ہمراہ دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر ایک ایسے دوست ملے جنھوں نے آرٹ فلموں کی طرف متوجہ کیا۔ ہاسٹل میں سرگودھا کے ڈاکٹر مجید انجم میرے دوست تھے۔ یاد رہے کہ ہم دونوں ہی آؤٹ سائیڈر کے طور پر رہ رہے تھے۔ ڈاکٹر مجید نے مجھے گلزار کے جادو سے متعارف کروایا۔ شیام بینیگل اور دیگر معروف بھارتی آرٹ فلم ڈائریکٹرز کی فلمیں دکھائیں۔ گلزار کی اجازت، موسم، ناجائز، ماچس وغیرہ جیسی فلمیں دیکھیں۔ سمیتا پاٹیل، شبانہ اعظمی، فاروق شیخ، نصیر الدین شیخ کی مختلف فلمیں، کمال ہاسن کی پشپک مجھے آج بھی یاد ہیں۔ بعد میں ہالی ووڈ کی فلمیں دیکھتا رہا۔ پھر بعد میں فیس بک گروپ ''مووی پلینٹ'' کی وجہ سے فلم کا تناظر وسیع ہوا۔ ادھر ''ٹورنٹ'' سے فلمیں ڈاؤن لوڈ کرنے کا اندازہ ہوا تو ایک نئی دنیا سامنے آئی۔ ابتداء میں چند نام ور اداکاروں کو فالو کیا۔ ان کی فلمیں نیٹ پر سرچ کر کے دیکھتا رہا۔ مارلن برانڈو، الپچینو (دونوں کی فلم گاڈ فادر میری آل ٹائم فیورٹ ہے)، رابرٹ ڈی نیرو، ٹام کروز، لیونارڈو ڈی کیپریو، بریڈ پٹ، میٹ ڈیمن، جولیا رابرٹس، میرل سٹریپ وغیرہ کی فلمیں تو میں نے تلاش کر کر کے دیکھیں۔ دراصل ایک بڑا اداکار عام طور پر بڑے پراجیکٹ کا حصہ ہی بنتا ہے۔ رابرٹ ڈی نیرو کے کریڈٹ پر ریجنگ بل، گڈ فیلاز، ہیٹ، ائرش مین وغیرہ، اور جیسے الپچینو نے گاڈ فادر کی تینوں فلموں میں کام کیا۔ سکارفیس، ڈیولز ایڈووکیٹ، آئرش مین وغیرہ جبکہ ڈی کیپریو کے کریڈٹ پر بہت سی مشہور فلمیں ہیں۔ ٹائی ٹینک، کیچ می اف یو کین، ایوی ایٹر، شٹر آئی لینڈ، گینگز آف نیویارک، انسیپشن، وولف آف وال سٹریٹ، ڈی پارٹیڈ، جینگو ان چینڈ، بلڈ ڈائمنڈ، ریئیویننٹ، (اس پر آسکر ایوارڈ دیا گیا)۔ ونس اپاؤن اے ٹائم ان ہالی ووڈ وغیرہ۔ بریڈ پٹ نے بھی کئی مشہور فلموں ٹرائے، ان گلوریس باسٹرڈ، سیون، فائٹ کلب، دی کیوریس کیس آف بنجمن بٹن، میٹ جو بلیک، مسٹر اینڈ مسز سمتھ، وغیرہ دیکھیں۔

میٹ ڈیمن نے گڈ ول ہنٹنگ جیسی فلم سے آغاز کیا اور پھر جیس بورن سیریز سے نام کمایا، دی مارٹین، ڈی پارٹیڈ، فورڈ بمقابلہ فراری جبکہ رسل کرو (گلیڈی ایٹر، رابن ہڈ، انسائیڈر، اے بیوٹی فل مائنڈ فیم) اور ٹام ہینکس (کاسٹ اوے، فارسٹ گمپ، سیونگ پرائیویٹ ریان، ڈاونچی کوڈ، دی ٹرمینل، دیپوسٹ، چارلی ولسن وار فیم) اور پھر کسی نے ڈینئیل ڈے لیوس کا بتایا تو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس کی مشہور فلمیں گینگز آف نیویارک، دین دیئر از بلڈ، ان دی نیم آف فادر، فینٹم تھریڈ وغیرہ دیکھیں۔ اسے عظیم ترین اداکار کہا جاتا ہے۔ اس نے تین آسکر ایوارڈ جیتے ہیں۔ اسی طرح ڈینزل واشنگٹن ایک کمال اداکار ہے اسے بھی دو آسکر مل چکے ہیں۔ ٹریننگ ڈے، میلکم ایکس، فینسز، امریکن گینگسٹرز، گلوری، بک آف ایلی، ڈیجاوو، فلاڈیلفیا، منچورین وغیرہ مشہور فلمیں دیکھیں۔ جارج نکولسن کی فلمیں دیکھ کر میں متحیر رہ گیا۔ بڑے پائے کا اداکار ہے۔ ون فلیواوورا ے ککوز نیسٹ، ایز گڈ ایز اٹ گیٹ، ڈی پارٹیڈ، فیو گڈ مین، بکٹ لسٹ وغیرہ دیکھیں۔ میں نے جن فلموں کا ذکر کیا ہے یہ تو میں نے خود دیکھی ہیں۔ ورنہ ان بڑے اداکاروں کی اور بھی بہت سی فلمیں ہیں۔ مجھے شروع سے ایپک یعنی رزمیہ فلمیں پسند ہیں۔ جنگوں پر بنی تاریخی فلمیں پسند ہیں۔ بریو ہارٹ، الیگزینڈر، ٹرائے، کنگ آرتھر، ہنڈرڈ، رائز آف ایمپائر، سنچورین، کنگڈوم آف ہیون، پیٹریاٹ وغیرہ دیکھیں۔ اسی طرح جدید جنگوں پر بنی فلمیں سیونگ پرائیویٹ ریان، ہیکسا ریج، برج آن ریورکوائی، پلاٹون، امریکن سنائپرز وغیرہ دیکھیں۔ ٹیکساس کے بیک گراؤنڈ میں کاؤبوائے سٹائل کی ویسٹرن فلمیں بھی اچھی لگتی ہیں۔ گڈ بیڈ اینڈ اگلی، ونس اپان اے ٹائم ان ویسٹ یا نیٹ فلیکس کی سیریز گاڈ لیس وغیرہ اچھی لگیں۔ گاڈ فادر، گاڈ فیلاز، آئرش مین، امریکن گینگسٹرز جیسی کرائم ایکشن فلمیں بھی اچھی لگیں۔

پھر بتدریج مجھے یہ سمجھ آئی کہ ڈائریکٹر اداکار سے بھی اہم ہے۔ فرانسس فورڈ کپولا، مارٹن سکورسیس، انگمار برمن، سرجی لیون، سپیل برگ، کیو برک، جیمز کیمرون، کرسٹوفر نولان، سپائیک لی، کوئین برادرز، راب رائنز، گونز لیز کوئنٹن ٹارن ٹینو، صغر فرہادی وغیرہ اچھے ڈائریکٹر ہیں۔ ان سب کا اپنا ایک سٹائل ہے۔ اب میری دلچسپی سیزنز میں بھی پیدا ہو چکی ہے۔ گیمز آف تھرون پسند آیا۔ مگر ترک ڈرامہ ارطغرل نے حقیقی معنوں میں نشہ ڈال دیا۔ اس کا اپنا ایک مزا ہے۔ اسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ ترکوں نے کمال انداز میں تاریخ، فکشن کے ساتھ اسلامی تہذیب، رہن سہن کو بھی دکھایا ہے۔ بچوں کی تربیت کے حوالے سے اسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ ایک اور ترک ڈرامہ جو صوفی مزاج لیے ہوئے ہے۔ وہ یونس ایمرے ہے۔ یہ بھی پسند آیا۔ یونس ایمرے ترکی کے مشہور صوفی شاعر اور دانا تھے۔ یہ مولانا روم کے ہم عصر ہیں۔ لیکن انہیں ترکی سے باہر زیادہ شہرت نہ مل سکی کیونکہ انہوں نے مقامی زبان میں اظہار کیا۔ مارکو پولو، ہاؤس آف کارڈز، وائی کنگز ایسی مقبول سیزنز ہیں جنہیں ہر کوئی دیکھ رہا ہے۔ مجھے بھی وقت ملے تو دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے پی ٹی وی کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پرانے ڈرامے بہت پسند ہیں آج کل کے ڈرامے نہیں اچھے لگتے۔ آج کل کے ڈراموں میں ہر جگہ ایک ہی انداز کا رونا دھونا یا پھر سازشیں۔ میں انٹرٹینمنٹ چینل بالکل نہیں دیکھتا۔ نیوز چینلز بہت کم دیکھتا ہوں۔ زیادہ تر وقت سپورٹس چینلز کو دیتا ہوں۔

بھارتی فلموں کا تذکرہ رہ گیا، میں ان کا مخالف نہیں، اچھی فلمیں جہاں بھی ہوں دیکھ لینی چاہئیں۔ بھارت میں آرٹ فلموں کا دور شاندار تھا، مگر اب کئی ایسے ہدایت کار ہیں جو کمرشل اور آرٹ کو ملا کر تجربات کر رہے ہیں جیسے وشال بھردواج، اس نے شیکسپیئر کے تین شاہکار ڈراموں پر تین فلمیں بنائیں، میکبتھ پر مقبول، اوتھیلو پر اوم کارہ جبکہ ہیملٹ پر حیدر بنائی۔ مقبول میں عرفان خان اور تبو تھے، اوم کارہ میں اجے دیوگن، کرینہ کپور، سیف علی خان جبکہ حیدر علی شاہد کپور، تبو اور کے کے مینن کی فلم تھی۔ انوراگ کیشب کے گینگز آف واسع پور بنا کر ہر ایک کو چونکایا، ان کی فلمیں مختلف ہوتی ہیں۔ رام گوپال ورما کی ستیا بھی ٹرینڈ سیٹر تھی، اس سے منوج واجپائی جیسا اداکار سامنے آیا۔ میں عرفان خان کا مداح ہوں، اس نے اپنے آپ کو ہر کردار میں منوایا ہے۔ عامر خان بھی مجھے پسند ہے، اس کی فلمیں کئی بار دیکھی جا سکتی ہیں، تھری ایڈیٹ، تارے زمین پر، پی کے، رنگ دے بسنتی، لگان وغیرہ۔ سلمان خان کا فین نہیں، مگر وہ مجھے شخصی طور پر بہتر لگتا ہے۔ شاہ رخ خان کی دل والے دلہنیا لے جائیں گے اور کبھی خوشی کبھی غم ایک سے زیادہ بار دیکھی، مگر شاہ رخ معلوم نہیں مجھے کیوں گھٹیا اور موقع پرست آدمی لگتا ہے جس نے اپنا گروپ بنا کر اپنی برتری بنائی۔ سلمان خان اور عامر خان ون مین آرمی ہیں۔ عامر خان نے اپنا ٹی وی شو سے بہت متاثر کیا۔ مشکل سے ہندی نام والے اس شو کو دیکھ کر سیکھنا چاہیے۔ میں ان چند بدنصیب لوگوں میں سے ہوں جو دلیپ کمار کے ڈائی ہارڈ فین نہیں۔ میرے نزدیک امیتابھ بچن دلیپ کمار سے بڑا اداکار ہے، اس نے بہت زیادہ اور بہت ورسٹائل کردار کئے اور اپنے آپ کو ابھی تک ان رکھے ہوئے ہے، دلیپ صاحب تو چالیس سال پہلے ہی سائیڈ پر ہو گئے، وہ نئے زمانے کے ساتھ نہیں چل پائے۔

مجھے اپنے صحافتی سفر کے دوران بہت کچھ تلخ و شیریں دیکھنا پڑا۔ تلخ کم اور شیریں زیادہ۔ اللہ کا خاص کرم ہے کہ کالم نگاری کے سفر نے بے پناہ مسرتوں اور خوشیوں سے ہم کنار کیا۔ ایک چھوٹے سے پسماندہ شہر کے رہنے والے لڑکے کو اللہ کریم نے قلم کے ذریعے ہزاروں، لاکھوں لوگوں تک پہنچایا۔ بے شمار نئے لوگ حلقہ محبت میں شامل ہوئے۔ دور دراز شہروں، قصبات، دیہات اور اوورسیز پاکستانیوں کی جانب سے جب محبت بھرے میسج، ای میلز اور سوشل میڈیا پیغامات آتے ہیں تو یہی احساس ہوتا ہے کہ اللہ ہی ہے جو ہم جیسوں کا بھرم رکھتا ہے۔ اسی نے عزت دی اور وہی آگے بھی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سرخرور کھے گا۔(ان شاء اللہ)۔ میں آخر میں نوجوان اور باذوق صحافی عبدالستار اعوان کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ اس نوجوان نے بڑی لگن اور محبت کے ساتھ میرے خیالات ونظریات اور میری زندگی کے اہم شب وروز محفوظ کر دیئے ہیں۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ اتنے طویل انٹرویو اور بعض دیگر مواد کو ایسی خوبصورتی سے ملا کر یہ جامع انٹرویو بنا دے گا۔ میانوالی جیسے پسماندہ علاقے سے ابھر کر آنے والا یہ نوجوان ان شاء اللہ بہت آگے جائے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین۔(قومی ڈائجسٹ۔ مئی 2020ء)

O......❄......O

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اینکر، کالم نگار، اخبار نویس

ایثار رانا

کی دلچسپ یادیں

ایثار رانا نے لڑکپن کی دہلیز پر قدم رکھا تو گھر کے ہر فرد کو بقا کی جنگ میں مصروف پایا۔ وہ خود بھی اس جنگ میں بے اختیار کود پڑے۔ پہلے دن کی کمائی والدہ کی ہتھیلی پر رکھی تو وہ ورطۂ حیرت میں پڑ گئیں کہ نوعمر ایثار کے اندر سے ایک نوجوان ایثار اچانک کیسے نکل آیا۔ روئیں روئیں سے دعائیں نکلیں، اُنھی دعاؤں سے ایثار کو نیا عزم اور نیا حوصلہ ملا۔ اپنی دنیا آپ تعمیر کرنے کا عہد کر لیا۔ ترقیوں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ ایثار نے صحافت کو اپنی تگ و تاز کا محور و مرکز بنا لیا۔ آج کل وہ روزنامہ پاکستان میں گروپ ایڈیٹر (کوارڈی نیشن) کے منصب پر فائز ہیں اور روزنامے کو نکھارنے اور اُجالنے کے لیے ساری توانائیاں بروئے کار لا رہے ہیں۔ ان کی زندگی کی کہانی سخت کوشی کے لازوال جذبے کی کہانی ہے۔ ہم نے رانا صاحب کے ساتھ چند نشستیں کر کے ان کی کتابِ زندگی محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیجیے ان کی کہانی انھی کی زبانی پڑھیے۔

○......❄......○

میں مورخہ 4 اپریل 1963ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ میرے والدین قیام پاکستان کے بعد 18 اگست 1947ء کو بھارتی ریاست 'الور' کے گاؤں مارکھ پور سے ہجرت کر کے لاہور آئے۔ والد صاحب کا نام اسحاق رانا تھا اور وہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ذاتی ملازم تھے۔ والد محترم کو ریاست الور میں نہایت عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ ایک صاف گو انسان تھے۔ والدین لاہور میں کچھ عرصہ قیام کے بعد کراچی چلے گئے اور میری پیدائش وہیں پر ہوئی۔ والد صاحب نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ وہ دلی کے تعلیم یافتہ تھے، ان کی آواز بہت گرج دار تھی۔ والدین ہجرت کے وقت دلی سے لاہور تک جس ٹرین میں آئے تھے اس میں سکھوں اور ہندوؤں نے گھس کر بہت قتل عام کیا تھا۔ میرے ابا جی، پیاری ماں جی اور بھائی مشتاق نے یہ قتل عام اپنی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آنکھوں سے دیکھا تھا۔ والد محترم جب یہ مناظر بیان کرتے تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور ہم یہ داستان سن کر کانپ کانپ جاتے۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ایک ڈرائیور تھے جن کا نام آزاد تھا، میرے والد صاحب ان کے اسسٹنٹ تھے۔ ایک مرتبہ والد صاحب نے قائداعظمؒ کی گاڑی کسی گاڑی سے ٹکرا دی تو محترمہ فاطمہ جناح نے انہیں نوکری سے نکال دیا تھا۔ ایک موقع پر کسی جلسے میں والد صاحب کی ملاقات قائد سے ہوئی تو انہوں نے کہا: اسحاق! آپ کہاں چلے گئے ہو؟ والد صاحب نے جواب دیا کہ مجھے تو محترمہ فاطمہ جناح نے نوکری سے نکال دیا تھا۔ اس پر قائد نے کہا کہ نہیں، آپ دوبارہ ڈیوٹی پر آ جائیں۔ والد صاحب ہمیں قائد کی بہت سی باتیں بتاتے تھے۔ وہ کہتے کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ حسن کے بہت دلدادہ تھے۔ خود بھی نفاست پسند تھے اور لباس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اپنے ملازمین کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت ہی اچھا ہوتا۔

والد صاحب جب ہجرت کر کے لاہور پہنچ گئے تو یہ بات آج بھی ریکارڈ پر ہے کہ انہوں نے کسی قسم کی جائیداد کا کلیم نہ کیا اور نہ ایوان تحریک کارکنان پاکستان یا کسی اور ادارے کی طرف سے دیئے جانے والے میڈلز کے لیے کوئی تگ و دو کی۔ جب ہم انہیں کہتے کہ آپ نے جائیداد کے لیے کوئی دعویٰ کیوں نہ کیا تو وہ جواب دیتے کہ میں نے صرف پاکستان اور مسلمانوں کے لیے یہ جدوجہد کی اور اپنا گھر بار لٹایا تھا۔ اب مجھے کسی طور پر یہ زیب نہیں دیتا کہ میں جائیداد کے لیے دعویٰ کر دوں۔ ہم کچھ عرصہ لاہور رہے اور پھر کراچی میں ''علی واین'' نامی گاؤں میں چلے گئے، یہ گاؤں روہڑی اور سکھر کے درمیان تھا۔ والد صاحب کراچی میں محنت مزدوری کرنے لگے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ میری پیدائش 4 اپریل 1963ء کو کراچی میں ہوئی۔ جب میں چار سال کا ہوا تو ہم پھر سے لاہور آ گئے اور والد صاحب نے اخبار مارکیٹ میں بطور ہاکر کام کرنا شروع کیا۔ اس وقت مشہور زمانہ فلمی رسالے، مصور، ممتاز اور چترالی کی نیوز ایجنسی والد صاحب کے پاس تھی۔ اخبار فروش یونین کے تاحیات صدر اور لاہور کی معروف شخصیت چودھری رشید مرحوم والد صاحب کے بہت قریبی دوست تھے۔ لاہور میں میرے پھوپھا شمشاد ملک بھی ان دنوں نوائے وقت کے ایجنٹ تھے۔ نوائے وقت، سیارہ ڈائجسٹ اور مصور نامی پرچے انہی کے پاس تھے۔ ملک شمشاد مرحوم کی اولاد اب بھی اسی کام سے وابستہ ہے۔

میرے دو بھائی ہیں: مشتاق ناز اور شاہنواز رانا۔ شاہنواز رانا ممتاز صحافی اور دن نیوز ٹی وی کے سینئر اینکر ہیں۔ لاہور پریس کلب کی گورننگ باڈی کے ممبر بھی رہے اور نعت خوان بھی بہت اچھے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہیں۔ میری دو بہنیں تھیں۔ بڑی بہن شہناز بیگم انتقال کر گئیں اور دوسری قمر جہاں ہیں۔ میں یہاں بتاتا چلوں کہ قیام پاکستان کے وقت ہمارا تقریباً پورا خاندان بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تھا اور یہ لوگ لاہور، خیر پور، کراچی، روہڑی، سکھر، ٹنڈو اللہ یار وغیرہ میں آباد ہوئے۔ ہمارا پورا خاندان ایک ساتھ پاکستان آیا تھا جبکہ میرے والدین الگ سے آئے تھے۔ میرے ماموں اور اب ان کی اولاد کراچی ہی میں مقیم ہیں۔ ہمارے خاندان کے کچھ لوگ ہجرت کے دوران شہید بھی ہوئے۔

میری ماں جی کا نام اختری بیگم تھا۔ وہ بہت ہی سادہ اور عظیم خاتون تھیں۔ انہوں نے ظاہری طور پر تو کسی سکول میں تعلیم حاصل نہ کی تھی لیکن وہ کمال کی ''تعلیم یافتہ'' تھیں۔ ان کا ادبی ذوق بہت اعلیٰ تھا اور انہیں اقبالؒ کے اشعار شکوہ جواب شکوہ، غالب اور میر کے بہت سے اشعار ازبر تھے۔ والدہ صاحبہ کی اردو بہت اچھی تھی اور ان کا تلفظ زبردست تھا، جب وہ اردو بولتی تھیں تو کانوں میں رس گھولتیں۔ لوگ ان کی اردو سن کر اپنا تلفظ درست کرتے تھے۔ وہ موسیقی کی بہت دلدادہ تھیں، میں نے موسیقی میں ان کا بہت جذبہ دیکھا۔ پھر یہی چیز مجھ میں بھی منتقل ہوئی۔ بس علم و ادب اور صحافت کے حوالے سے میری پہلی تربیت گاہ یہی والدہ کی گود تھی۔ میں نے زندگی بھر اپنی والدہ سے بڑھ کر کوئی بھی سٹریٹ فارورڈ اور راست گو انسان نہیں دیکھا۔ اس نہایت محترم ہستی کا انتقال 2000ء میں اور والد صاحب کا انتقال 2006ء میں ہوا۔

میری تعلیم کا آغاز لاہور میں باغ منشی لدھا کے علاقے میں واقع نوید ماڈل سکول سے ہوا۔ یہ علاقہ بھر میں اس وقت کا بہترین سکول تھا۔ اس دور میں بھی وہاں ٹاٹ یا دریوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ طالب علم کرسیوں پر بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ اس وقت تعلیم میں کاروباری سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ میری عمر اس وقت تقریباً پانچ سال تھی۔ میں نے اے، بی، سی سے آغاز کیا۔ سکول کا پہلا دن آج بھی یاد ہے جو مجھ پر بہت بھاری تھا۔ جب والد صاحب مجھے چھوڑ کر واپس جا رہے تھے تو میں بہت پریشان ہوا اور میرا دل بوجھل ہونے لگا۔ مجھے استاد اپنے ساتھ اندر لے گئے اور انہوں نے میرا دل بہت بہلایا اور اس قدر پیار دیا کہ میرا دل سکول میں لگ گیا اور پھر میں سکول کے ماحول ہی میں گم ہو گیا۔ میں نے سکول میں اپنی منفرد شناخت بھی جلد ہی بنالی اور نصابی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ میں تقریریں بھی کرتا اور نظمیں بھی سناتا۔ میں نے پرائمری تک تعلیم اسی سکول سے حاصل کی اور پھر چھٹی کلاس سے اسلامیہ ہائی سکول موہنی روڈ میں داخل کروا دیا گیا۔ اسلامیہ ہائی سکول میں میرے اساتذہ مشتاق صاحب، شعیب الدین صاحب، اعجاز رسول صاحب اور ہیڈ ماسٹر اظہار الحق قریشی صاحب تھے، یہ سب نہایت شفیق لوگ تھے۔ وہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لوگ اپنے پیشے کے ساتھ بہت مخلص تھے اور ایک جذبے کے تحت پڑھایا کرتے۔ مجھے چونکہ ادبی ذوق اپنی والدہ محترمہ کی طرف سے ورثے میں ملا تھا لہٰذا میں نے سکول میں بھی مختلف ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا دورِ حکومت تھا۔ اب تو ابلاغ عامہ کے بہت زیادہ ذرائع آگئے ہیں، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا ہے اور پھر سوشل میڈیا نے لوگوں کی معلومات تک رسائی کو بہت آسان کر دیا ہے لیکن ان دنوں میڈیا بہت ہی کمزور تھا اور عوام کی اطلاعات اور خبروں تک رسائی بہت ہی مشکل تھی۔ ایک دو قومی اخبار تھے اور ایک سرکاری چینل پی ٹی وی تھا۔ ان دنوں ٹی وی سیٹ بھی خال خال گھروں میں ہوا کرتے تھے۔ رنگین ٹی وی اگر کسی نے لے لیا ہوتا تو اسے دیکھنے کے لیے لوگ جوق در جوق آیا کرتے تھے۔ عام طور پر بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی ہی دیکھا جاتا۔ ایک دن میں نے بھی بھٹو صاحب کی تقریر کسی ٹی وی پر سن لی تو مجھے ان کے الفاظ اور جملے اس قدر اچھے لگے کہ میں نے فوراً ان کا انداز کاپی کرنا شروع کر دیا اور بھٹو صاحب کا انداز اور الفاظ میرے ذہن سے چپک کر رہ گئے۔ چونکہ میں ایک مزدور کا بیٹا تھا اس لیے بھی بھٹو صاحب کے الفاظ مجھ پر بہت زیادہ اثر کر گئے تھے کہ وہ مزدور اور ایک عام طبقے کی بات کر رہے تھے۔ پھر ایک دن میں نے سکول کی بزمِ ادب میں بھٹو صاحب کے انداز میں خطاب کر ڈالا تو مجھے سکول میں بھٹو صاحب کے نام سے لڑکوں نے پکارنا شروع کر دیا۔ میری یہ تقریر ایسی ''کلک'' ہوئی کہ سکول کے طلبہ مجھے کہتے کہ وہ بھٹو جا رہا ہے تو میں خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ یہ میرا شہرت کا پہلا تجربہ تھا اور پہلی بار واضح محسوس ہوا کہ شہرت کتنی مزیدار چیز ہوتی ہے۔

جب میں گیارہ برس کا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ والد صاحب ہماری خاطر دو دو جگہ پر مزدوری کرنے جاتے ہیں۔ دن کو وہ ایک آفس میں چپڑاسی کا کام کرتے تھے اور شام کے وقت لکشمی چوک اور بیڈن روڈ پر سائیکل پر فلمی میگزین فروخت کرتے، تو اس وقت میری سوچ نے انگڑائی لی کہ مجھے اپنے والد کا ہاتھ بٹانا چاہیے اور ان کا بازو بننا چاہیے۔ پھر میں نے یہ کیا کہ مصور، ممتاز اور چترالی نامی فلمی میگزین جو پرانے ہو جاتے تھے اور بچ جاتے تھے تو یہ وزن کے حساب سے ردی میں بکتے تھے۔ میں یہ پرانے میگزین لے کر گھر آتا تھا اور ان کے اوراق درست کرتا، انہیں تہہ لگاتا اور انہیں فروخت کرنے کے لیے نکل جاتا۔ اس طرح میں نے سڑکوں اور بازاروں میں چل پھر کر رسالے بیچنے شروع کر دیے۔ پہلے دن بڑے بھائی شاہنواز رانا نے میری ہیلپ کی اور ہم نے مل کر پرانے رسالوں کی ترتیب لگا کر انہیں درست کیا۔ میں انہیں اٹھا کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ان دنوں ہمارا گھر مینار پاکستان کے سامنے ایک کچی آبادی سادھی گنگا رام کے پاس تھا۔ میں پہلے دن گھر سے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میگزین اٹھائے ٹیکسالی سے ہوتا ہوا ہیرا منڈی آیا اور اس وقت کے معروف ''ملک تھیٹر'' کے قریب کھڑا ہو کر اپنے حواس اور اپنی سانسیں مجتمع کرنے لگا کیونکہ آج میں ایک بھرے چوراہے میں کھڑے ہو کر اپنی زندگی کی پہلی آواز لگانے لگا تھا جو میرے لیے ظاہر ہے ایک بہت مشکل کام تھا۔ پھر میں نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے جو پہلی بلند آواز لگائی وہ یہ تھی: ''فلمی رسالے لے لو۔ مصور اور ممتاز رسالے لے لو''۔ پہلے آدمی نے جو رسالہ خریدا وہ ''ممتاز'' تھا۔ اس وقت اس کی قیمت ایک آنہ تھی۔ (یاد رہے کہ اس وقت چھ پیسے کا ایک آنہ ہوتا تھا)۔ اس دن میں نے کل آٹھ رسالے فروخت کیے اور جب پیسے لے کر گھر گیا اور پیاری ماں کو دیے تو وہ بہت حیران ہوئیں اور کہنے لگیں، اس معصوم بچے میں سے اچانک ایک جوان کیسے پیدا ہو گیا کہ اس نے اتنا بڑا کام کر دکھایا۔

اس کے بعد میں نہ رکا اور یہی کام مستقل شروع کر دیا۔ یوں میری جدوجہد کا ایک عملی آغاز ہو گیا۔ میں صبح اٹھ کر اخبار مارکیٹ جو کہ لوہاری گیٹ کے قریب تھی وہاں جاتا۔ وہاں سے اخبار لے کر راوی چوک جاتا جو کبھی بسوں کا اڈہ تھا، میں بسوں میں اخبار فروخت کرتا۔ اس کے بعد میں گھر آتا اور کپڑے بدل کر بھاگم بھاگ سکول پہنچ جاتا جو ہمارے گھر سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ یہ سلسلہ کئی سال تک یونہی چلتا رہا۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں مختلف کارخانوں میں کام کرتا تھا۔ اس دور میں لوہے کی چوڑیاں بنانے کا کاروبار عروج پر تھا، میں بھی ایک کارخانے میں کام پر لگ گیا۔ وہیں میری ملاقات سید حضرت علی شاہ صاحب سے ہوئی جنہوں نے میرا بہت حوصلہ بڑھایا اور ان کی شفقت آج بھی جاری ہے۔ یوں میں صبح اخبار بیچتا، دن کو چوڑیاں بناتا، اس کے ساتھ ساتھ پڑھتا بھی تھا۔ اس طرح گرمیوں کی چھٹیوں میں تین کام کرتا اور شام ہوتے ہی بے سدھ ہو کر بستر پر گر پڑتا۔ میرا بدن اس وقت ٹوٹ رہا ہوتا اور میں جلد نیند کی آغوش میں جا پہنچتا۔ یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس ساری مزدوری کے دوران یہ معمول رہا کہ سکول کے حوالے سے میں کبھی سستی نہ دکھاتا اور اللہ کے فضل سے کبھی تعلیم سے غافل نہیں رہا۔ میں ایک ریگولر طالب علم کے طور پر ہی پڑھتا رہا اور میں بیماری کے نام پر بھی کبھی چھٹی نہ کرتا تھا۔ میں اپنی کلاس میں پوری طرح ایکٹو رہتا، مجھے اساتذہ کرام ایک لاپروا لیکن نہایت ذہین طالب علم قرار دیتے۔ انہی دنوں ایک بار اس دور کے ممتاز سیاستدان معراج خالد جو اس وقت صوبائی وزیر تھے ہمارے سکول آئے تو ان کی موجودگی میں ہیڈ ماسٹر اظہار الحق قریشی صاحب نے مجھے حکم دیا کہ بیٹا، اٹھو اور بھٹو صاحب کی تقریر سناؤ۔ میں نے جب تقریر سنائی تو معراج خالد نے مجھے فرطِ جذبات سے گود میں اٹھا لیا، انہوں نے مجھے بہت پیار دیا اور وہ بچہ جو ایک آنے کا میگزین فروخت کرتا تھا اسے انہوں نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پورے پچاس روپے انعام دیے۔ وہ پچاس روپے میرے لیے ایسے ہی تھے جیسے آج کسی غریب بچے کو اچانک پانچ لاکھ روپے پکڑا دیے جائیں۔ اس سے میری خوشی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں نے وہ پچاس روپے جیب میں ڈالے اور جیب پر ہاتھ رکھ کر گھر کے لیے بھاگ کھڑا ہوا اور اس وقت اپنی جیب سے ہاتھ ہٹایا جب میں گھر پہنچ گیا۔ یہ میری ان دنوں کی سب سے بڑی کمائی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ماسٹر قریشی صاحب ڈسپلن اور سکول کے نظم وضبط کے بہت پابند تھے اور اس حوالے سے بہت زیادہ سختی کیا کرتے تھے۔ وہ ہمیں بیالوجی پڑھاتے، ان کا انداز اتنا خوبصورت ہوتا تھا کہ مجھے آج بھی بیالوجی کے سبق یاد ہیں۔ میرے سکول یونیفارم کی ایک ہی شرٹ تھی، وہ اس قدر بوسیدہ ہوگئی تھی کہ جگہ جگہ سے پھٹ گئی۔ انہیں دنوں میرے ایک دوست نے مجھے ایک کلرفل شرٹ دے دی جس پر عظیم باکسر محمد علی کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس پر لکھا تھا: "Catch me if you can"۔ جب میں سکول پہنچا تو ہیڈ ماسٹر ایک رنگ برنگی شرٹ دیکھ کر شدید غصے میں آگئے اور مجھے مرغا بنا دیا۔ انہوں نے میری پٹائی بھی کی، وہ مجھے کہہ رہے تھے کہ تم نے شرٹ پر لکھا ہوا ہے نا کہ "Catch me if you can" تو لو یہ دیکھو میں نے تمھیں کیچ کر لیا ہے۔ اسی دوران آدھی چھٹی کی گھنٹی بجی تو میری جان چھوٹ گئی۔ بعد میں میں ہاتھ منہ دھو کر قریشی صاحب کے کمرے میں جا پہنچا اور انہیں شرٹ کا ماجرا سنایا کہ میرے پاس یونیفارم والی شرٹ پھٹ گئی ہے اور یہ ایک دوست نے دی ہے۔ جب انہیں ساری صورتحال کا معلوم ہوا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان دنوں ایک این جی او سکولوں میں غریب بچوں میں مفت یونیفارم تقسیم کرتی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس غیر سرکاری تنظیم کو میرے متعلق بتایا تو مجھے اس کی طرف سے نئی سکول یونیفارم مہیا کر دی گئی۔

اسلامیہ ہائی سکول موہنی روڈ لاہور سے میں نے مختلف انٹر سکولز تقریری مقابلوں میں خوب حصہ لیا۔ اسی سکول سے میں نے 1978ء میں میٹرک کیا۔ اس کے بعد میری جدوجہد زیادہ عملی صورت اختیار کر گئی۔ ہوا یوں کہ میرے ایک پھوپھا تھے رانا محمد اکرم مرحوم، وہ اس دور میں اخبار مارکیٹ میں کام کرتے تھے۔ ان کے پاس مختلف گھروں میں اخبار ڈلیور کرنے کے لیے آرڈر آتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ سڑکوں پر اخبار بیچنے کے بجائے گھروں میں اخبار ڈلیور کیا کرو اور انہوں نے مجھے ایک تنخواہ آفر کی جو مجھے زیادہ سوٹ ایبل لگی اور یوں میں لکڑ منڈی سے داخل ہو کر سبزی منڈی، ٹرک سٹینڈ اور توحید کالونی کے گھروں میں اخبار پہنچانے لگا۔ اس کے بعد میں نے ایک اور کام یہ شروع کیا کہ ٹرک سٹینڈ پر گڈز ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن کے دفتر میں بطور چپڑاسی نوکری کر لی۔ صبح اخبار گھروں میں ڈالتا، دن کو چپڑاسی کی نوکری کرتا اور شام کو ایک ٹیوشن پڑھاتا۔ اس سے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گھر کے مالی حالات قدرے بہتر ہونے لگے۔ بڑے بھائی شاہنواز رانا بھی اپنا کنٹری بیوشن ڈالتے تھے اور یوں گھر کے حالات سدھرنے لگے۔ اسی دوران میں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کیا۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ ایف اے میں میری دو بار انگلش میں کمپارٹ آئی کیونکہ میں پڑھائی کو مکمل وقت نہیں دے پاتا تھا۔ لیکن بہر حال میں نے دل نہیں ہارا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ کمپارٹ میری نالائقی یا عدم دلچسپی کی وجہ سے نہیں بلکہ میری بے حد مصروفیت کی وجہ سے آئی اور میرے پاس پڑھنے کے لیے وقت ہی نہیں بچتا۔ پھر مجھے کوئی پڑھانے والا بھی نہ تھا۔

بہر حال میں نے ایف اے کا امتحان پاس کر ہی لیا۔ اسی دوران ایسا بھی ہوا کہ اکثر شام کو گھر سے پکوڑے بنوا کر سڑکوں پر فروخت کیا کرتا تھا اور جو بھی رقم ملتی وہ اپنی والدہ کو لا کر دے دیتا۔ میں ایک روپیہ بھی ضائع نہیں کرتا تھا اور اپنی محنت سے کمائی گئی رقم سیدھا والدہ محترمہ کی ہتھیلی پر رکھتا۔ انٹر میڈیٹ کے بعد دل میں سمایا کہ مجھے بی اے کرنا ہے۔ کتابیں خریدنے کی تو ہمت نہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ سکول کے پورے دور میں بھی میری یہ حالت رہی کہ رزلٹ آنے کے بعد میں اس خیال میں لگ جاتا کہ مجھے کم قیمت پر سیکنڈ ہینڈ کتابیں کہاں سے ملیں گی اور کون مجھے مفت کتابیں دے سکتا ہے۔ بی اے میں بھی مجھے ایسے ہی حالات کا سامنا تھا۔ تاہم اب اس میں قدرے بہتری یہ آئی کہ میں گیٹ تھرو گائیڈز اور گیس پیپرز خریدنے کی پوزیشن میں آ گیا اور مجھے جب بھی کچھ موقع ملتا میں ان پر نظر ڈال لیتا۔ ایک اہم ترین بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایسا ہر گز نہ تھا میرے ان حالات نے میرے اندر ہنسنے اور خوش رہنے کی حس ختم کر دی ہو۔ نہیں نہیں بلکہ میں سدا ہی ہنس مکھ اور خوش رہنے والا انسان تھا۔ میرے خیال سے شاید میں دوسرے بچوں سے زیادہ اپنی زندگی کو محسوس کرتا اور انجوائے کرتا تھا۔ میں نے در در پھر کر اور گلی کوچے، سڑکیں چھان کر لوگوں کے چہرے پڑھ لیے تھے اور زمانے کو پرکھنے میں طاق ہو چکا تھا۔ یہ بھی عجیب بات ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کے خاص فضل و کرم سے میں ہمیشہ نمایاں لوگوں کا منظورِ نظر رہا۔ ان میں مرد و خواتین اور لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ میں اپنی خوبصورتی پر بھی خوب رشک کرتا اور جب ذرا بڑا ہوا تو لڑکیوں نے بھی مجھ میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ میری بس عادت تھی کہ سڑک پر کھڑے ہو کر اخبار بیچ رہا ہوتا یا اچھے کپڑے پہن کر کسی لڑکی سے محوِ گفتگو ہوتا، میں نے ہر حالت میں زندگی سے انجوائے کرنا سیکھ لیا تھا۔ دل ہارنا اور حالات پر کڑھنا میری سرشت میں نہ تھا۔

ان دنوں آزاد کشمیر میں صدارتی انتخابات کا خوب غلغلہ تھا اور آزاد کشمیر کے راجا افراسیاب خان (جو سپریم کورٹ کے جج بھی رہے) بھی صدارتی الیکشن لڑ رہے تھے۔ انہوں نے لاہور سے ایک ایسی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ٹیم ہائیر کی جس نے آزاد کشمیر کے مختلف شہروں میں ان کی حمایت میں سٹیج ڈراموں کے ذریعے ان کی کمپین چلانا تھی۔ مجھے اس پروگرام میں شرکت کرنے کا موقع یوں مل گیا کہ میرے بڑے بھائی مشتاق ناز ان سٹیج ڈراموں کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔ اس طرح میں نے آزاد کشمیر کے مختلف شہروں میں بطور ایکٹر ڈراموں میں حصہ لیا جس سے میرے اندر اعتماد کو مزید پنپنے کا موقع میسر آیا۔
اس کے بعد اخبار کے ذریعے معلوم ہوا کہ فلمی ہدایت کار عزیز اثرؔی (مرحوم) ایک فلم بنا رہے ہیں جس کے لیے انہیں وحید مراد کے بچپن کے رول کے لیے ایک چائلڈ سٹار کی ضرورت ہے۔ اداکاری میں میرا اعتماد تو پختہ ہو چکا تھا چنانچہ میں بڑے بھائی کے ساتھ ان کے پاس جا پہنچا، انہوں نے میرا آڈیشن لیا اور میں نے یہ آڈیشن پاس کر لیا اور مجھے بچپن کا رول مل گیا۔ اس کے بعد اثری صاحب نے مجھے سو روپے دیے اور کہا کہ آپ ان پیسوں سے وحید مراد کی فلمیں دیکھو اور ان کا انداز، ان کے جملے، ان کی باڈی لینگویج وغیرہ کاپی کرنے کی بھرپور کوشش کرو اور خوب مشق کرو۔ کراچی میں والد صاحب کے پاس ناز سینما کی کینٹین کا ٹھیکہ تھا۔ ناز سینما وحید مراد کے والد صاحب کا تھا۔ ان دنوں وحید مراد کی فلمیں بہت لگتی تھیں۔ میں اکثر والد صاحب کے ساتھ سینما جاتا اور میرے کانوں میں وحید مراد کے ڈائیلاگ، ایکٹنگ اور احمد رشدی کے گانے گونجتے رہتے۔ وحید مراد کی فلمیں، ارمان، ہیرا اور پتھر وغیرہ میں نے اتنی بار دیکھیں کہ مجھے ان کا ایک ایک سین یاد ہے۔ تاہم عزیز اثرؔی کی فلم جن کا نام انہوں نے ''میرے جیون ساتھی'' رکھا تھا ریلیز نہ ہو سکی اور وہ ڈبوں ہی میں بند ہو کر رہ گئی۔

بی اے کی تیاری کے دوران ہی میں نے بڑے بھائی کے حکم پر گڈز ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن میں چپڑاسی کی نوکری چھوڑ دی اور بھائی صاحب نے مجھے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخل کروا دیا۔ میں نے وہاں پر نفسیات اور اسلامیات پڑھی۔ ایک بار ہم ایک سروے کے لیے جو اساتذہ کے کنڈکٹ پر ہم کر رہے تھے مینار پاکستان کے قریب سہیل ماڈل سکول گئے جس کی پرنسپل صاحبہ کا نام انسب سروشؔ تھا۔ ہم نے وہاں پر اساتذہ کے ساتھ ایک سیشن کیا۔ اس سیشن کو میں کنڈکٹ کر رہا تھا تو انسب سروشؔ مجھ سے بہت متاثر ہوئیں۔ میں اب بھی صبح اخبار فروخت کرتا تھا۔ ایک دن میں سڑک پر کھڑا اخبار بیچ رہا تھا کہ سروشؔ صاحبہ کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے مجھے یوں اخبارات فروخت کرتے دیکھا تو بہت پریشان ہو گئیں۔ کچھ دیر کے بعد ان کا چپڑاسی آیا کہ میڈم آپ کو بلا رہی ہیں۔ جب میں وہاں گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ اس سے کتنی رقم کما لیتے ہیں، جب میں نے انہیں ایک لم سم اماؤنٹ بتائی تو وہ کہنے لگیں جب میں اتنے پیسے آپ کو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دے دوں تو کیا آپ یہ اخبار فروشی چھوڑ کر ٹیچنگ کر لیں گے۔؟ میں نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔انہوں نے کہا پھر آپ ابھی سے پڑھانا شروع کریں۔ میں نے کہا کہ آج کے یہ اخبار فروخت کرلوں تو آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔اس پر سروشؔ صاحبہ نے کہا کہ آپ یہ تمام اخبارات مجھے فروخت کر دیں اور گھر جائیں، یوں انہوں نے مجھ سے تمام اخبارات لے لیے اور میں نے ایک سکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔وہ ایک عظیم محسن خاتون تھیں جواب بھی یاد آتی ہیں تو میرے دل سے ان کے لیے دعا نکلتی ہے۔انہی دنوں اس سکول میں تین ماہ کی گرمیوں کی تعطیلات ہوگئیں تو سکول کے سٹاف نے احتجاج شروع کر دیا کہ ہمیں ان تین ماہ کی تنخواہ بھی دی جائے۔میں بھی احتجاج کرنے والوں کے ساتھ سرفہرست تھا۔اس پر لوگوں نے مجھے کہا کہ بھائی آپ کی نئی نئی نوکری لگی ہے اور آپ بے حد مجبور بھی ہو اگر آپ کو نوکری سے نکال دیا گیا تو کیا کرو گے؟ میں نے کہا کہ نہیں میں اصولی بات پر اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا ہوں اور احتجاج ہمارا حق ہے۔بہر حال ہمارا احتجاج رنگ لایا اور سکول کی انتظامیہ نے ہمیں تنخواہ دے دی اور اس کے ساتھ ہم تمام لوگوں کو نوکری سے فارغ کر دیا۔تین ماہ کی تنخواہ 2400 روپے ملی تو یہ اس وقت ایک بہت بڑی رقم تھی، میں نے گھر جا کر اپنی والدہ کو کہا کہ بتائیں آپ کو کتنے پیسوں کی ضرورت ہے،تو انہوں نے ہنستے ہوئے اپنی طرف سے بہت بڑی رقم جانتے ہوئے کہا کہ مجھے دوسو روپے دے دو۔میں نے ان پر پانچ پانچ اور دس دس کے نوٹ پھینکنے شروع کر دیے تو وہ ہنسنے لگیں۔

یوں میں نے ایک ایک کر کے 2400 روپے ان کے سر پر ڈال دیے۔ماں جی خوشی سے پھولا نہیں سما رہی تھیں کہ اتنے نوٹ کہاں سے آ گئے۔بہر حال میں ریلوے روڈ کے اسلامیہ کالج میں ریگولر ایجوکیشن جاری نہ رکھ سکا اور بعد میں پرائیویٹ طور پر بی اے کا امتحان دیا۔پرائیویٹ امتحان سے فراغت کے بعد ایک دن میں مینار پاکستان چوک میں اخبار فروخت کر رہا تھا کہ میرے ایک دوست منور رمضان نے اچانک آ کر مجھے اطلاع دی کہ رزلٹ آ گیا ہے اور تم پاس ہو گئے ہو۔میں اس پر اتنا خوش ہوا جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔انہی دنوں جب میں ایک پرائیویٹ سکول میں بھی پڑھاتا تھا اور اخبار بھی بیچتا تھا تو میرے بڑے بھائی شاہنواز رانا جو ان دنوں نوائے وقت کراچی میں نیوز ایجنٹ تھے انہوں نے مجھے فوری طور پر کراچی بلوایا اور میرا داخلہ اردو آرٹس کالج میں ایم اے جرنلزم میں کروا دیا۔اس وقت داخلے کی مدت تو ختم ہو چکی تھی اور مجھے نوائے وقت کراچی کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر نیر علوی صاحب کی سفارش پر یہ داخلہ ملا۔یہاں بھی میں نیو چالی کے علاقے میں نوائے وقت اخبار سیل کرتا تھا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کراچی سے میری زندگی میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ میرے کزن انجم رانا جو اس وقت جاپان میں تھے، انہوں نے میرے بھائی کو کہا کہ ایثار رانا کو میرے پاس جاپان بھیج دیں۔ کیوں کہ یہ ایک اچھا موقع ہے، جاپان نے اعلان کیا ہے کہ وہ انٹری ختم کر کے ویزا شروع کرنے لگا ہے۔ لہذا آپ ویزا شروع ہونے سے پہلے ہی ایثار کو بھیج دیں۔ چونکہ میں ابتدا ہی سے محنت اور مشقت کا عادی ہوں اور میں نے ہمیشہ اپنے بڑوں کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے۔ یوں میں نے والدین اور بڑے بھائی کے حکم پر رخت سفر باندھا، ارجنٹ پاسپورٹ بنا اور جاپان روانہ ہوا۔ ہمارا پہلا پڑاؤ منیلا میں ہوا۔ وہاں ایک دو دن قیام کے بعد امریکن ایئر لائن' نارتھ ویسٹ ایئر لائنز کے ذریعے ہم جاپان پہنچے۔ یہ جاپان میں پاکستانیوں کے داخلے کا آخری دن تھا اور جاپانی حکام پاکستانیوں کے پاسپورٹ اٹھا اٹھا کر پھینک رہے تھے۔ ایسے میں میرا بھی دل ڈر گیا کہ میرے ساتھ کیا ہوگا لیکن چونکہ میں امریکی شہریوں کے بیچ میں واحد پاکستانی تھا اور ان کے ساتھ جاپان پہنچا تھا تو یوں میرے ساتھ جاپانی حکام نے کوئی غلط رویہ اختیار نہ کیا۔ جاپانی حکام نے کچھ سوالات وغیرہ کیے اور میرا نوے دن کا ویزا لگ گیا۔

یوں جاپان میں میری زندگی کا ایک دلچسپ دور شروع ہوا۔ جاپان پہنچنے کے اگلے روز مجھے ایک جاپانی نے کہا کہ آپ میرے گھر کے فرش پر لگا کارپٹ اکھاڑ دو تو میں تمہیں ایک ہزار ین مزدوری دوں گا جو اس وقت پاکستانی 1300 روپے بنتے تھے۔ مجھے ایک دن میں اتنی بڑی رقم نظر آئی تو میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ یہ تو خاصا مشقت طلب کام ہے۔ میں نے زندگی میں محنت مزدوری تو کی تھی لیکن اس طرح کے مشکل کام کا تجربہ قطعاً نہ تھا۔ بہر حال میں نے شام تک جیسے تیسے کر کے یہ کام مکمل کر دیا، اپنی مزدوری لی اور رہائش گاہ پر آ گیا۔ جس وقت اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو تھکن کی وجہ سے میری بہت بری حالت تھی۔ اسی تھکن کی وجہ سے جب میں واش روم میں گیا تو وہاں گر پڑا جس سے مجھے چہرے اور سر پر چوٹیں آئیں۔ باہر کے ممالک میں زندگی گزارنا ایک جہد مسلسل ہے، وہاں آرام نام کی کوئی چیز نہیں اور ہر شخص ایک مشین کی طرح کام میں جتا ہوا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایک منٹ کو پیسوں کے حساب سے کیلکولیٹ کرتا ہے۔ ہم آٹھ دس پاکستانی ایک فلیٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اگلے دن سب لوگ کام پر چلے گئے تو میں وہاں اکیلا رہ گیا کیونکہ میں کام پر جانے کے قابل نہ تھا۔ مجھے شدید چوٹیں آئی تھیں اور بخار ہو گیا۔ شام کو جب میرا کزن انجم آیا تو اس نے مجھے کھانا اور دوائیں لا کر دیں۔ ایک دن دوپہر کو میں اپنی رہائش گاہ پر تقریباً بے یار و مددگار پڑا تھا کہ اسی دوران میری آنکھوں سے آنسو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بہنے لگے کہ یا اللہ! میں کہاں پھنس گیا ہوں ابھی میں نے اللہ سے یہ التجا ختم نہ کی تھی کہ دیکھا کہ ایک لڑکا میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ بھارتی ہے، اس کا نام محمد لکی ہے اور وہ کسی رہائش کی تلاش میں ہے۔ میں نے اسے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ رہ سکتے ہو تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے اسی وقت مجھے کھانا کھلایا، میرے زخم دھوئے اور مرہم پٹی کی۔ وہ لڑکا بہت ہی ملنسار اور خیال رکھنے والا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ اللہ نے میری غیب سے مدد فرمائی ہے۔ کیونکہ اس کا فرمان ہے کہ اگر تم مجھے پکارو تو میں تمہاری پکار کو ضرور سنتا ہوں۔

جاپان میں میرا قیام صرف آٹھ ماہ رہا۔ میں نے ان آٹھ ماہ میں محنت مزدوری کی، پرنٹنگ پریس میں کام کیا اور کنسٹرکشن کے کاموں میں حصہ لیا۔ جاپان میں ہم نے ایک آٹھ منزلہ عمارت بھی بنائی تھی۔ اب میں اس وقت کا تصور کرتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں کہ میں نے کیسے اتنی سخت مزدوری کر لی تھی۔ کیونکہ آج سوچتا ہوں تو قطعی طور پر یقین نہیں آتا کہ میں نے مزدوری بھی کی ہے۔ جاپان میں میں نے یہ مشاہدہ بھی کیا کہ پاکستان کی نسبت وہاں کے لوگ زیادہ محنت اور جذبے سے کام کرتے ہیں اور خواہ مالک ہو یا نوکر سب مل کر کام کرتے ہیں۔ ہم جاپان میں سینٹرل ٹوکیو میں رہتے تھے۔ ایک دن انجم نے کہا، ہم سارا دن کام کرتے ہیں تو کیوں نہ آج کہیں گھومنے پھرنے چلیں اور ہم پہلی مرتبہ شن جی کوشی گئے جو جاپانیوں کی کلچرل ایکٹیویٹیز کا اس وقت گڑھ تھا، وہاں پر مختلف کلبس تھے اور رات کو روشنیوں کا ایک خوبصورت منظر تھا۔ جو ٹیکنالوجی آج ہم لاہور میں دیکھتے ہیں وہ میں نے پہلی بار وہاں دیکھی۔ میں نے وہاں پہلی بار رات کے وقت ڈیکوریٹڈ لائٹنگ دیکھی، فاؤنٹین دیکھے اور بہت محظوظ ہوا۔ وہاں ایسے بل بورڈز دیکھے جو آج ہم تیس سال بعد لاہور میں دیکھتے ہیں۔ میں اور انجم ایک کلب میں گئے جہاں پر لوگ ڈانس کر رہے تھے اور وہسکی پی رہے تھے۔ میں نے اپنے لیے اورنج جوس کا آرڈر دیا۔ میرے سامنے ایک خوبصورت لڑکی تھی جو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی کیونکہ میں خوبصورت اور گول مٹول سا لڑکا تھا، کچھ دیر کے بعد اس لڑکی نے پیچھے سے آ کر میرا کندھا تھپکا اور انگلش میں مجھے کہا کہ کیا آپ میرے ساتھ ڈانس کرو گے؟ میں نے کہا کون کمبخت آپ کو انکار کر سکتا ہے۔ کیو کیو ساری رات میرے ساتھ رقص کرتی رہی۔ اس لڑکی کا نام کیو کیو تھا۔ وہ لڑکی اس بات پر حیرت زدہ تھی کہ میں اورنج جوس کیوں پی رہا ہوں تو انجم نے اسے کہا کہ یہ الکوحل (شراب) نہیں پیتا اور اسے جوس ہی پسند ہے۔ کیو کیو جاپان کی نیشنل سوئمنگ ٹیم کا حصہ تھی۔ کیو کیو کے ساتھ بعد میں میری بہت دوستی رہی، وہ ایک ہنس مکھ اور خیال رکھنے والی لڑکی تھی۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ ہم رات کے وقت اپنے فلیٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ سیکیورٹی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

فورسز نے ہماری رہائش کو گھیرے میں لے لیا اور ہوٹر بجنے لگے اور ایک آپریشن کلین اپ کے ذریعے مجھے گرفتار کر لیا گیا، مجھے اس لیے گرفتار کیا گیا تھا کیونکہ میرے ویزے کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ لیکن پولیس کا ایکشن ایسا تھا کہ میں ایسے محسوس کرنے لگا تھا کہ جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو۔ پولیس مجھے گرفتار کر کے اوتے ماچی جیل لے گئی۔ میں ایک ہفتے جیل میں رہا۔ میرے پاس ریٹرن ٹکٹ تھا تو انہوں نے کہا کہ ہم آپ کا ٹکٹ کنفرم کروا دیتے ہیں۔ میں نے جیل حکام سے کہا کہ یہاں پر اور بھی بہت سے پاکستانی قیدی ہیں ان میں اور آپ میں بہت زیادہ کمیونی کیشن گیپ ہے اس لیے مجھے ایک پل کا کردار ادا کرنے دیں اور مجھے ان پاکستانیوں کی ٹکٹوں وغیرہ کا انتظام کرنے دیں تو پھر آپ مجھے پاکستان بھیج دیجیے گا۔ اس طرح میں نے جیل میں رہ کر وہاں پر قید پاکستانی قیدیوں کے مسائل میں بھی دلچسپی لی اور جاپانی حکام سے گزارش کر کے انہیں حل کروانے کی کوشش کے لیے آواز بھی اٹھائی۔ ایک ہفتہ کے بعد حکام نے مجھے ہتھکڑی لگائی اور اوتے ماچی جیل سے ایئر پورٹ تک لایا گیا اور جہاز میں بیٹھنے کے بعد جب جہاز نے اڑان بھرنے کی ٹھانی تو میری ہتھکڑی کھولی گئی۔ اس دوران ایئر پورٹ پر اور پھر جہاز میں لوگ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کوئی بہت بڑا کریمنل اور انڈر ورلڈ کا آدمی ہے۔ لوگوں کی نظروں میں خوف بھی تھا۔ یوں میں پاکستان پہنچا دیا گیا اور یہاں پھر میری زندگی نے نئی کروٹ لی اور زندگی کا ایک اہم اور روشن باب شروع ہوا۔ بڑے بھائی شاہنواز رانا بہت سے اخبارات میں کام کرتے رہے اور ایک منجھے ہوئے صحافی ہیں۔ ان کے مجھ پر بہت زیادہ احسانات ہیں۔ وہ میرے مستقبل کے بارے میں زیادہ فکرمند رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے جو شفقت دی وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

یہ 1990ء کی بات ہے کہ بھائی صاحب نے کہا: لاہور سے ایک نیا اخبار روزنامہ پاکستان اپنی شاندار اشاعت کا آغاز کرنے جا رہا ہے آپ وہاں ضرور اپلائی کر دو۔ انہیں ٹرینی لڑکوں کی ضرورت ہے۔ میں نے اپریل 1990ء میں روزنامہ پاکستان میں اپلائی کر دیا لیکن معلوم ہوا کہ ٹیسٹ اور انٹرویو کی تاریخ گزر چکی ہے تو مجھے بے حد مایوسی ہوئی۔ میں یہاں ایک شخصیت کا نام بھول رہا ہوں۔ اللہ ان کے گھر پر ہمیشہ اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے۔ اس شخصیت نے میرے حالات دیکھ کر اور میرا مایوس چہرہ دیکھ کر مجھے کہا: آپ ٹیسٹ دیں میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کا کام بن جائے۔ میں نے ٹیسٹ دیا تو ان صاحب نے اسے پچھلی تاریخوں میں اندراج کر کے رکھ دیا۔ اس کے ایک ہفتہ بعد مجھے کال آ گئی اور کہا گیا کہ آپ کا ٹیسٹ پاس ہے اور آپ فلاں دن انٹرویو کے لیے حاضر ہوں۔ جب میں روزنامہ پاکستان کے دفتر پہنچا تو اس وقت سینئر صحافی ضیا شاہد، رانا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

طاہر، عثمان یوسف، بیدار بخت اور علمدار شاہ صاحب انٹرویو لے رہے تھے۔ انٹرویو کے دوران ضیا شاہد صاحب نے کہا کہ آپ کے ان لاز کا تعلق تو نوائے وقت سے ہے اور ہمارا تو نیا اخبار ہے اور ہم کوئی ایسا رسک نہیں لیں گے کہ نوائے وقت کا کوئی بندہ اپنی ٹیم میں شامل کر لیں۔ اس پر عثمان یوسف صاحب نے کہا کہ آپ جائیں ہم آپ کو پھر کسی دن بلائیں گے۔ یہ سن کر میں ایک بار پھر بہت مایوس ہو گیا۔ میں نے ضیا شاہد صاحب سے کہا کہ میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ مجھے سیلیکٹ کرتے ہیں تو شاید میں میرٹ پر رکھا جانے والا پہلا آدمی ہوں گا۔ وہ یہ بات سن کر مسکرائے تو اس پر علمدار شاہ صاحب نے کہا، اس لڑکے کو رکھ لیں یہ بڑے کام کا ہے۔ چنانچہ مجھے سیلیکٹ کر لیا گیا اور میری پہلی تنخواہ 2360 روپے بتائی گئی تو بہت زیادہ خوشی ہوئی کیونکہ یہ تنخواہ میری سوچ سے بھی زیادہ تھی۔ یوں میں نے روزنامہ پاکستان جوائن کر لیا اور پھر یہیں سے میرے صحافتی کیریئر کا آغاز ہوا اور میں ترقی کی منازل طے کرتا گیا اور آج میں اس پر فخر محسوس کرتا ہوں جب مجھے لوگ سینئر صحافی اور ایڈیٹر کہہ کر پکارتے ہیں۔

روزنامہ پاکستان کے مالک اکبر علی بھٹی مرحوم کو میں اخباری دنیا کا محسن قرار دیتا ہوں۔ انہوں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ہماری تنخواہیں ہماری سوچ سے بھی زیادہ مقرر کیں۔ یہ اردو اخبارات میں انہوں نے ایک نئی طرح ڈالی جس کے بعد دیگر اخبارات بھی مجبور ہوئے کہ وہ اپنے کارکنوں کو مناسب تنخواہیں دیں۔ انہیں یہ بھی کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے اخبارات کی بوسیدہ حالت، غیر معیاری پرنٹنگ اور ٹوٹے پھوٹے دفاتر کا کلچر یکسر تبدیل کر ڈالا اور اخباری دفتر کو ایک اہم مقام دیا۔ بھٹی مرحوم نے بطور ہیڈ روزنامہ پاکستان کا ایک ایسا ماحول بنایا جو پرنٹ میڈیا میں پہلے نہیں تھا، انہوں نے ایک صاف ستھرا اور بہتر ماحول دیا۔ ابھی اخبار مارکیٹ میں نہیں آیا تھا اور اس کے لیے تیاریاں عروج پر تھیں، سٹاف ہائر کیا گیا تھا اور دیگر انتظامات کیے گئے۔ پاکستان اخبار میں ہماری پہلے تین ماہ تک خوب صحافتی ٹریننگ کی گئی اور پھر اس کے بعد اللہ کے فضل و کرم سے اخبار مارکیٹ میں آیا تو اس نے پورے ملک کی اردو صحافت میں ایک دھوم مچا دی۔ تین ماہ کی ٹریننگ کے بعد جب اخبار مارکیٹ میں آیا تو مجھے ضیا شاہد صاحب نے میٹرو پولیٹن کا صفحہ (لاہور کی مقامی خبروں کا صفحہ جسے سٹی پیج بھی کہا جاتا ہے) دیا اور پھر کچھ دن کے بعد مجھے انچارج سٹی ڈیسک بنا دیا گیا۔ اخبار کی اشاعت سے قبل ہماری سینئر صحافیوں کی طرف سے اس قدر سخت تربیت ہوئی کہ جب اخبار مارکیٹ میں آیا تو ہم باقاعدہ ایک منجھے ہوئے صحافی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

اسی دوران ایک دن مجھے کسی صاحب کا فون آیا، انہوں نے انیس رانا جو کہ سینئر صحافی رانا طاہر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے چھوٹے بھائی تھے سے بات کرنی تھی لیکن کال غلطی سے مجھے مل گئی تو فون کرنے والے نے کہا کہ انیس رانا صاحب! مبارک ہو آپ کی جاب کنفرم ہو گئی ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو ایثار رانا بات کر رہا ہوں تو اس پر ان صاحب نے کہا کہ سوری میں نے تو انیس رانا سے بات کرنی تھی لیکن آپ کو بتادوں کہ جن پانچ لوگوں کو کنفرم کیا گیا ہے ان میں آپ بھی شامل ہیں۔ اپنی اس کامیابی پر میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ پھر کچھ دن کے بعد میری تنخواہ جو بطور ٹرینی 2300 روپے تھی بڑھا کر 5300 روپے کر دی گئی۔ یہ تنخواہ اتنی زیادہ تھی کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے روزنامہ پاکستان میں دن رات ایک کر کے اپنا ایک معیار اور مقام بنایا۔ ہم میں سیکھنے کی لگن اس قدر زیادہ تھی کہ ہم دن رات کام کرتے تھے۔ اکبر بھٹی، ضیا شاہد، عثمان یوسف، بیدار بخت اور علمدار شاہ صاحب جیسے لوگ میرے عظیم محسن ہیں۔ سٹی ڈیسک یعنی میٹروپولیٹن صفحے کا انچارج بنا تو ایک بار پھر علمدار شاہ صاحب نے مجھے خوب تربیت دی۔ علمدار صاحب میرے مینٹور تھے اور انہوں نے میرے صحافتی کیریئر میں بہت مدد کی۔ میری ساری صحافتی ٹریننگ اور گرومنگ روزنامہ پاکستان میں ہوئی۔ روزنامہ پاکستان کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد ضیا شاہد نے روزنامہ پاکستان چھوڑ دیا اور وہ اپنا اخبار روزنامہ خبریں لانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ میں چونکہ گردش ایام کا مارا تھا اور اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اپنے مستقبل کے حوالے سے میرے اندر خوف ختم ہو چکا تھا۔ مجھے کسی نے کہا کہ آپ خبریں جوائن کر لیں۔ میں یہاں بتاتا چلوں کہ میرا ضیا صاحب سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ بس ایک بار ایسا ہوا کہ انہوں نے 'ریڈرز ڈائجسٹ' سے کہانیاں نکال کر ہم ٹرینی لڑکوں میں تقسیم کی تھیں کہ آپ ان کو ترجمہ کر کے مجھے دکھائیں۔ میرے پاس بھی ایک کہانی آئی تو میں نے لفظ بہ لفظ اس کا اردو ترجمہ کرنے کے بجائے ایک کنسیپٹ قائم کر کے اپنے طور پر ایک کہانی لکھ دی تو ضیا صاحب نے جب وہ ترجمہ اور اصل کہانی پڑھی تو مجھے بلایا اور کہا کہ مین آئیڈیا تو وہی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے لیکن یہ ترجمہ بہر حال نہیں ہے۔ میں نے انہیں جواب دیا: میں نے سوچا کہ بجائے لفظ بہ لفظ ترجمہ کر کے وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ کہانی کا آئیڈیا بیان کر دوں۔ ضیا شاہد اس پر مسکرائے اور کہنے لگے، اس کا مطلب ہے کہ آپ نے تو بڑا تخلیقی کام کیا ہے اور آپ تو بہت اچھا لکھتے ہو۔ بس وہ واحد تعلق تھا جو میرا ضیا صاحب سے قائم ہوا۔ یوں روزنامہ پاکستان میں ایک سال کام کرنے کے بعد میں نے روزنامہ خبریں جوائن کر لیا۔ یہ 1994ء کی بات ہے۔ 26 ستمبر کو خبریں کا اجراء ہوا اور میں نے اکتوبر میں اسے جوائن کر لیا۔ میں روزنامہ خبریں میں بطور سب ایڈیٹر گیا اور وہاں سٹی صفحے کا انچارج بنایا گیا۔

اس وقت خطاطی اور کتابت اپنے آخری سانس لے رہی تھیں۔ اخباری دنیا میں کمپیوٹر آ چکا تھا،

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

خبریں تو کمپیوٹر پر ٹائپ ہوتی تھیں لیکن سرخیاں خطاط ہی لکھا کرتے تھے۔ میں نے میٹرو صفحے کی اپنے طور پر کافی تبدیلیاں کیں، اسے کلرفل بنایا۔ اسے سنجیدہ زبان و بیان سے نکال کر عوامی رنگ دے دیا۔ اس کی سرخیوں کو ایک نیا نکھار دیا۔ میرے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ میرا یہ کام کہیں نوٹ کیا جا رہا ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ضیا شاہد اور عباس اطہر مرحوم جیسے نامور لوگ میرے اس کام کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ عباس اطہر مرحوم کی سرخیوں کو ملک بھر میں مقبولیت حاصل تھی۔ بطور نیوز ایڈیٹر ان کا ایک بہت بڑا نام تھا۔ عباس اطہر ان دنوں نوائے وقت میں تھے اور اس کے بعد انہوں نے خبریں جوائن کر لیا اور انہیں شام کے اخبار ''نیا اخبار'' کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ جہاں ضیا شاہد کے کہنے پر عباس اطہر صاحب نے خبریں میں اپنا مشہور زمانہ کالم ''کنکریاں'' لکھنا شروع کیا۔ خبریں میں میں نے بہت عرصہ کام کیا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ بیدار بخت وہاں کے چیف نیوز ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے مجھے مین ڈیسک پر بلا لیا، پھر میں نے سب ایڈیٹر کے طور پر مین ڈیسک پر کام شروع کیا۔ ایک دن بیدار بخت نے مجھے اور عظیم نذیر کو کہا کہ بعض اوقات میٹنگ کے سلسلے میں مجھے ضیا صاحب بلا لیتے ہیں تو پیچھے سارا کام رک جاتا ہے تو آپ تمام سب ایڈیٹرز میں خبریں ڈسٹری بیوٹ کر دیا کریں۔ یہ میرے لیے دلچسپ مرحلہ تھا لیکن میں کنفیوز بھی تھا۔ اگلے دن بیدار صاحب میٹنگ میں چلے گئے تو ٹیبل پر خبروں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ اب میں اور عظیم نذیر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، عظیم نذیر نے تو خبریں تقسیم کرنے میں پس و پیش سے کام لیا لیکن میں نے جلدی سے اٹھ کر خبروں کا ڈھیر تمام لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

بیدار صاحب جب آئے اور انہوں نے دیکھا کہ ٹیبل خالی ہے تو وہ حیران رہ گئے۔ ان کے پوچھنے پر لوگوں نے بتایا کہ ایثار رانا نے خبریں تقسیم کر دی ہیں۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس وقت ڈیسک پر بڑے بڑے نام تھے، جن میں سہیل ظفر، اطہر عارف، اعجاز گیلانی، طاہر بٹ، عارف قریشی صاحب، وغیرہ تھے۔ ان حضرات کا تجربہ میری عمر سے بھی زیادہ تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ایک لڑکا خبریں تقسیم کر رہا ہے تو وہ اس لیے بھی خاموش رہے کہ یقیناً خبروں کی تقسیم ایک حساس معاملہ ہے اور کوئی بلنڈر رہا تو ہمیں ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے گا۔ بہرحال بیدار صاحب آئے تو انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ ایک سال بعد جلو پارک میں روزنامہ خبریں کی سالگرہ کے موقع پر ایک پارٹی کا انعقاد کیا گیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو خوشنود علی خان اور ان کے دیگر ساتھی مذاق مذاق میں لوگوں کو اٹھا اٹھا کر تالاب میں پھینک رہے تھے۔ میں تو بچ گیا لیکن انہوں نے بیدار بخت کو پانی میں پھینکنے کی کوشش کی تو وہ ناراض ہو کر پارٹی سے چلے گئے۔ چونکہ میں بیدار صاحب کا بہت زیادہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

احترام کرتا تھا اور ان کا شاگرد بھی تھا تو میں بھی ان کے ساتھ واپس چلا آیا۔ جب ہم بیدار صاحب کے گھر پہنچے تو انہوں نے کہا: آپ لوگ پارٹی اٹینڈ کریں کیونکہ اس سے آپ کو نقصان ہوگا۔ میں اپنے معاملات خود دیکھ لوں گا تم لوگ اپنا فیوچر خراب نہ کرو۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی تو میر شکیل الرحمٰن سے کافی پہلے ہی بات ہو چکی ہے۔ ''جنگ'' میں جانے کی۔ بعد میں مَیں ضیا صاحب کے گھر ماڈل ٹاؤن گیا تو ان کے گھر کے سامنے خبریں کی سالگرہ کے سلسلے میں ایک میوزک کنسرٹ ہو رہا تھا۔ میں ضیا شاہد صاحب سے ملا تو انہوں نے تھوڑی سی ناراضی کا اظہار کرنے کے بعد مجھے حکم دیا کہ آپ پروگرام کی کمپیئرنگ کرو۔ اس وقت میرے ساتھ ایک معروف کمپیئر خاتون سیمی زیدی تھیں۔ ہم نے اچھی طرح پروگرام کنڈکٹ کیا اور بعد میں ضیا شاہد نے مجھے شاباش دی۔ عدنان شاہد مرحوم نے بھی بہت تعریف کی۔ اس وقت امتنان شاہد بہت چھوٹے تھے۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ کچھ سب ایڈیٹرز جو بیدار بخت کے ساتھ آ گئے تھے انہیں نوکری سے فارغ کر دیا گیا ہے لیکن ضیا شاہد نے مجھے میری کارکردگی کی بنا پر فارغ نہ کیا۔ ضیا شاہد اخبار کی بہت سخت چیکنگ کرتے تھے، ایک ایک سرخی، خبر اور تصویر پر غور کرتے اور غلطی پر عملے کی خوب سرزنش کرتے۔ ہم جتنی بھی کوشش کرتے تھے آخر کوئی نہ کوئی غلطی نکل ہی آتی تھی تو پھر غلطی کرنے والے کے ساتھ جو ہوتا تھا وہ اتنا برا ہوتا تھا جتنا کہ گوانتاناموبے کے قیدیوں کے ساتھ سلوک ہوتا ہے۔

خیر، اگلے دن طاہر پرویز بٹ بطور چیف نیوز ایڈیٹر بیٹھ گئے اور انہوں نے کام شروع کر دیا۔ وہ میرے بھائیوں کی طرح تھے، وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ ایک دن طاہر پرویز بٹ کسی ایمرجنسی کی وجہ سے ڈیوٹی پر نہ آ سکے تو مین ڈیسک کے تمام لوگ پریشان تھے کہ آج خبریں کون دیکھے گا۔ میں نے اٹھ کر خبریں تقسیم کیں اور اخبار تیار کر کے بھجوا دیا۔ اگلے دن جب اخبار آیا اور ضیا شاہد کو علم ہوا کہ طاہر پرویز بٹ ڈیوٹی پر نہیں تھے تو انہوں نے کہا کہ اگر چیف نیوز ایڈیٹر نہیں آئے تو پھر یہ صفحات کس نے تیار کیے۔ وہاں موجود سینئر لوگوں نے جو یہ چاہتے تھے کہ میری بے عزتی ہو اور میرے ساتھ بہت برا ہو، ضیا شاہد سے کہا کہ یہ سارا ایثار رانا کا کام ہے۔ اس پر انہوں نے مجھے بلایا اور علیحدگی میں میری بہت حوصلہ افزائی کی کہ تمہارا کام اچھا ہے۔ پھر اس کے بعد جب چیف نیوز ایڈیٹر موجود نہ ہوتے تو میں ہی اخبار دیکھنے لگا۔ اس کے بعد میری کارکردگی اور لگن دیکھتے ہوئے ضیا شاہد نے مجھے نیوز ایڈیٹر کا عہدہ دیا، پھر ڈپٹی ایڈیٹر بنایا اور اس کے بعد مجھے خبریں کا جوائنٹ ایڈیٹر بنایا گیا۔ ان دنوں خبریں جیسے قومی اخبار کا جوائنٹ ایڈیٹر ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس وقت زیادہ تر انگریزی کی نیوز ایجنسی کی خبریں آیا کرتی تھیں اور ابھی اردو نیوز ایجنسیاں اس قدر نہیں آئی تھیں۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ان انگریزی خبروں کا اردو میں ترجمہ کیا جاتا تھا اور میں جب سینئرز کو خبریں دیتا تو وہ مجھے بروقت واپس نہیں کرتے تھے تاکہ کاپی لیٹ ہو جائے اور میری کارکردگی پر حرف آئے۔ اس کا مجھے جلد ہی ادراک ہو گیا اور میں نے نوجوانوں کی ایک ٹیم بنائی اور میں انہیں خبریں دے دیتا جو بروقت بنا دیتے تھے۔

خبریں کی وجہ سے صحافت جو ایک خاص قسم کے ایک سٹیٹس کو کا شکار تھی وہ ٹوٹا۔ ضیا شاہد صاحب نے بڑا نام کمایا اور مجھے اس پر فخر ہے کہ خبریں کی شناخت، اس کی تیز سرخیاں، اس کا جارحانہ لے آؤٹ، اس کی انسپکشنز۔ اس سب میں میرا بہت اہم اور بنیادی حصہ تھا۔ بقول ضیا شاہد، عباس اطہر کے بعد اگر وہ کسی کی سرخی سے متاثر تھے تو وہ میرا ہی نام لیتے۔ یہ جو آج کل اخبارات کی سرخیوں میں 'ونڈو' کا رجحان ہے، اس کا آغاز کرنے والوں میں میرا نام بھی ہے۔ اخبارات میں لیڈ کے اوپر جو مختلف 'ونڈوز' لگائی جاتی ہیں اور یہ لکھا جاتا ہے کہ فلاں صفحے پر تفصیلی خبر ملاحظہ کریں اس کا آغاز روزنامہ دن سے پہلی بار میں نے ہی کیا۔ خبریں میں مَیں نے تین سال تک کام کیا۔ ان تین سالوں میں میں نے بہت کچھ سیکھا اور میرے کام میں نکھار آیا۔ میں خبریں آفس میں دوپہر کو تین بجے آتا اور لیٹ نائٹ گھر جاتا تھا، پھر صبح ہوتے ہی میں اخبارات کی فائل کا انتظار کرتا تھا جو میرے گھر آتی تھی۔ میں وہ سارے اخبارات پڑھ کر رپورٹنگ کے لیے ان کے فالو اَپس، نئے آئیڈیاز لکھ کر اپنے دروازے کے نیچے رکھ دیتا تھا تو ضیا شاہد اپنا ڈرائیور بھیج کر وہ فالو واپس منگوا لیتے تھے، پھر یہ فالو واپس میٹنگز میں ڈسکس کیے جاتے اور 'خبریں' کو بہتر سے بہتر کرنے کے لیے کوشاں رہتے۔ اس طرح میرا حصہ رپورٹنگ، نیوز روم اور ہر جگہ موجود رہا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ شدید سردیوں کے موسم میں کاپی بھیج کر رات کو تین بجے گھر کے لیے نکلا تو ایم اے او کالج کے کونے پر 'بن پلسترا' اور چائے کا ایک ہوٹل تھا جہاں بہت سے صحافی رات کو فارغ ہونے کے بعد بیٹھ جاتے اور چائے پانی کے ساتھ ساتھ گپ شپ بھی لگاتے۔ یوں ہم اپنی تھکن اتارتے تھے اور فریش ہونے کی کوشش کرتے۔ میری اس وقت شادی نہیں ہوئی تھی اور میں لاپروا سا لڑکا تھا۔ وہاں پر خاور نعیم ہاشمی، زبیر احسان، عبدالجبار ثاقب، عظیم نذیر اور دیگر بہت سے اخبار نویس آتے۔ میں نے وہاں پر ایک بچہ دیکھا جو شدید سردی میں برتن دھو رہا تھا اور اس کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ شدید سردی میں ہم نے تین تین سویٹر پہن رکھے ہیں اور تم ننگے پاؤں نلکے کے نیچے بیٹھے ہو تو تمہیں سردی نہیں لگتی؟ تو اس نے ایک جملہ کہا: ''باؤ جی، ٹھنڈ کنوں نئیں لگدی'' (باؤ جی، سردی کسے نہیں لگتی)۔ یہ جملہ میرے دماغ سے چپک گیا کیونکہ اس جملے میں بہت زیادہ بے بسی اور بے چارگی تھی۔ میں اسی بچے کو سوچتا ہوا گھر پہنچا اور مجھے نیند نہ آئی۔ اگلے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دن میں نے دفتر میں پہنچ کر زندگی کا پہلا کالم لکھا جس کا عنوان تھا: ’’ٹھنڈ کنوں نئیں لگدی‘‘۔

اس وقت حسن نثار صاحب کا عروج تھا اور وہ ادارتی صفحہ تیار کرتے تھے۔ ان کے جارحانہ کالموں نے معاشرے میں ایک آگ سی لگا دی تھی اور ان کے پڑھنے والوں کا ایک نہایت وسیع حلقہ قائم ہو گیا تھا۔ میرا یہ کالم حسن نثار نے دیکھا تو شاید میں پہلا کالم اچھا نہیں لکھ سکا اور انہوں نے وہ کالم مسترد کر دیا اور مجھے بلا کر کہا کہ آپ ابھی مزید مشق کرو اور مطالعہ کرو۔ کچھ دن کے بعد ضیا شاہد کی اہلیہ یاسمین شاہد نے وہ کالم دیکھ لیا تو انہوں نے ضیا شاہد سے کہا، لڑکے نے اتنا اچھا کالم لکھا ہے یہ کالم چھپنا چاہیے۔ اس پر ضیا شاہد نے مجھے کہا: حسن نثار یہ کالم مسترد کر کے یہ کہہ چکے ہیں کہ آپ مزید محنت کرو۔ میں نے کہا کہ جی بالکل ٹھیک ہے میں مزید محنت کروں گا۔ لیکن اگلی صبح جب اخبار آیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میرا وہ کالم چھپا ہوا تھا، یہ دیکھ کر میری اس قدر حوصلہ افزائی ہوئی جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہاں سے میری کالم نگاری کی ابتدا ہوئی اور وہ سردی میں کانپتا ہوا بچہ آج تک میرے کالموں اور تجزیوں کی انسپائریشن ہے اور آج تک میں اسی بچے کو مختلف شکلوں میں اپنے اردگرد پاتا ہوں۔ دراصل مجھے اس بچے میں اپنا ہی چہرہ نظر آ گیا تھا۔ اس لیے وہ بچہ آج تک میرے اردگرد ہے اور میں آج تک اسی کو مطمئن کرنے اور اسی کی آواز آگے پہنچانے کے لیے کالم لکھتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے ریگولر کالم لکھنا شروع کر دیا۔ دراصل ہم جیسے لوگ خودرو پودوں کی طرح ہوتے ہیں تو میں نے بہت سوچا کہ اپنے کالم کا عنوان کیا رکھوں۔ آخر کار سوچتے سوچتے اپنے کالم کا مستقل عنوان ’’پریشر گروپ‘‘ رکھا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک کالم نگار معاشرے میں ایک پریشر گروپ کی طرح ہوتا ہے جو حکمرانوں اور بالا دست طبقے کے اوپر ایک پریشر ڈویلپ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اسی عنوان سے لکھنا شروع کیا اور آج تک اسی عنوان سے لکھ رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک پریشر گروپ ہیں جو سیاستدانوں اور طاقتوروں اور بالا دستوں پر ایک پریشر ڈویلپ کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے جن لوگوں نے پریشر ڈویلپ کرنا تھا اب تو وہ خود ہی بکاؤ مال بن گئے ہیں اور وہ عوامی اور قومی مفادات سے زیادہ ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں اور معاشرے کا المیہ ہے کہ جب دانشور اپنی ذات کا غلام بن جاتا ہے تو پھر پورا معاشرہ ہی طاقتور کا غلام بن جاتا ہے۔

اسی دوران میری شادی ہوئی جو اپنے ہی رشتہ داروں میں ہوئی۔ ضیا شاہد نے مجھے کہا کہ آپ کی شادی کے کیا انتظامات ہیں تو میں نے کہا کہ میں اپنا ولیمہ اپنے گھر کے پاس کچی آبادی میں کروں گا تو انہوں نے کہا کہ بھائی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ روزنامہ خبریں کا جوائنٹ ایڈیٹر کچی آبادی میں ولیمہ کرے۔ اس وقت لٹن روڈ پر لاہور پیلس کے نام سے ایک شادی ہال تعمیر ہو رہا تھا۔ ان دنوں شادی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہالوں کے کلچر کا آغاز ہو رہا تھا۔ 'لاہور پیلس' کے مالک ملک اقبال تھے۔ ضیا شاہد نے انہیں فون کر کے کہا کہ ایثار رانا کا ولیمہ آپ کے شادی ہال میں ہوگا تو ملک صاحب نے کہا ابھی تو شادی ہال تعمیر ہو رہا ہے۔ ضیا شاہد نے کہا کہ مجھے نہیں پتہ بس ایثار رانا کے ولیمے کی جگہ یہی ہوگی۔ یوں ضیا شاہد کی مہربانی سے ایک اچھا ولیمہ ہوگیا۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے ضیا شاہد کی دی ہوئی ایڈوانس تنخواہیں اور اپنی شادی کی ساری سلامی ملک اقبال صاحب کے حوالے کرنا پڑی۔ ابھی میں خبریں میں ہی کام کر رہا تھا کہ شور اٹھا کہ امریکہ سے آئے ہوئے ایک صاحب محمود صادق روزنامہ دن کی اشاعت کا آغاز کرنے جا رہے ہیں۔ میں نے وہاں پر بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ ضیا شاہد نے بہت کوشش کہ میں انہیں نہ چھوڑوں تو میں نے ان کو بتایا کہ میں بہت سی وجوہ کی بنا پر شدید ذہنی دباؤ میں ہوں۔ کیونکہ کام کا بہت پریشر تھا اور پھر ضیا شاہد کا خوف بھی بہت رہتا تھا جس سے میں پریشان رہنے لگا تھا۔ محمود صادق صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بے شمار آئیڈیاز رکھنے والے ایک پرعزم اور حوصلہ مند انسان ہیں۔

میں نے 1997ء میں روزنامہ دن جوائن کرلیا۔ جب میں خبریں چھوڑ رہا تھا تو بہت دوستوں نے کہا کہ خبریں نے آپ کو بہت عزت دی ہے اب آپ اسے نہ چھوڑیں لیکن میں نے انہیں کہا کہ جو اللہ ایک اخبار فروخت کرنے والے مزدور کو اتنی عزت دے سکتا ہے تو وہ باقی جگہوں پر بھی اس کے ساتھ ضرور کھڑا ہوگا۔ میں نے روزنامہ دن جوائن کیا تو سینئر صحافی توصیف احمد خان ہمارے ایڈیٹر تھے۔ وہ نہایت شفقت کرنے والے ایڈیٹر تھے تاہم ان کی محمود صادق سے زیادہ کیمسٹری نہ مل سکی اور انہوں نے استعفاد دے دیا۔ ابھی تک اخبار کے اجراء کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور اخبار مارکیٹ میں نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد اخبار نکلنے میں تھوڑے ہی دن رہ گئے تو طاہر مجید کو بطور ایڈیٹر اخبار نکالنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ چونکہ میں بہت ایکٹو تھا اور میں نے خبریں اور ضیا شاہد کی مار کھائی ہوئی تھی تو مجھ میں ہر وقت آگے بڑھنے اور چیلنجز سے نپٹنے کا بہت شوق تھا۔ یہ بات طاہر مجید صاحب کو پسند نہ تھی۔ انہوں نے محمود صادق سے کہا کہ ایثار رانا کو ذرا کنٹرول کریں تو محمود صادق نے مجھے کہا کہ آپ طاہر مجید کو کام کرنے دیں اور آپ ان کے اسسٹنٹ کے طور پر ان کے پیچھے چلیں۔ مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا لہذا میں نے ہامی بھر لی۔ تاہم اخبار کے نکلنے سے چند دن پہلے ہی طاہر مجید نے استعفاد دے دیا۔ ان کے بعد محمود صادق نے مجھے کہا، اب مجھے کسی کو بھی ایڈیٹر نہیں لینا آپ ہی یہ اخبار نکالیں گے۔ اس وقت دن میں میرے ساتھ زاہد رفیق، ناصر شیرازی اور احسن تقویم تھے۔ روزنامہ دن کے ایڈمنسٹریٹر ملک لیاقت تازہ تازہ وہاں آئے تھے اور ماشاءاللہ جوان رعنا اور بہت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

فٹ تھے۔

اسی طرح شریف وارثی جیسا بڑا نام ہمارے ساتھ تھا۔نعیم مصطفیٰ اور نصیر وا ہگہ ہمارے ساتھ تھے۔حافظ شفیق الرحمٰن ہمارے ادارتی صفحہ کے انچارج تھے اور یوں ہم ایک مضبوط ٹیم کے ساتھ اللہ کا نام لے کر روزنامہ دن مارکیٹ میں لے آئے۔

روزنامہ ''دن'' نے آتے ہی ملک بھر میں ایک تہلکہ مچادیا تھا اور اسے بے حد مقبولیت ملی۔اس کا حلقہ قارئین دیکھتے ہی دیکھتے وسیع ہوتا گیا۔روزنامہ دن نے اخبارات کی ان دنوں جو ''پرائس وار'' تھی اس میں تمام بڑے بڑے بت گرادیے۔اخبارات کی پوری اکانومی 'دن' کو سامنے رکھ کر پھر سے طے کی گئی۔اس پرائس وار میں جنگ،نوائے وقت اور خبریں جیسے قومی اخبارات شامل تھے۔اس وقت تمام بڑے اخبارات نے 'دن' کو فالو کیا۔ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ 'دن' کا جو ہم نے پلان کیا تھا اسے یوں تقسیم کیا تھا کہ چار صفحات کے انچارج زاہد رفیق، چار صفحات کے انچارج احسن تقویم، ناصر شیرازی اور آٹھ صفحات کا انچارج میں تھا۔جب اخبار لانچنگ کے قریب تھا اور میں نے ڈمی نکال کر یہ طرح ڈالی کہ لیڈ کے اوپر پانچ 'ونڈوز' بناتے تھے اور سٹوری کی سرخی یا تصویر دے کر ساتھ یہ لکھ دیتے تھے کہ تفصیلات فلاں صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

انہی دنوں یہ ہوا کہ روزنامہ جنگ سے کچھ لوگ ہمارے پاس آئے اور انہوں نے 'دن' جوائن کر لیا۔یہ لوگ اخبار نکلنے سے چند روز پیشتر وہاں سے واپس جنگ میں چلے گئے۔اور یہ بات سب کو معلوم تھی کہ جنگ کے کچھ لوگ صرف یہ دیکھنے آئے کہ 'دن' اخبار کس انداز سے نکالا جا رہا ہے۔اس کا ثبوت یہ ملا کہ ہمارے اخبار کے نکلنے سے پہلے ہی ہم نے جو 'ونڈوز' والی ایک نئی ترکیب نکالی تھی اسے جنگ اخبار نے اپنا لیا اور ہم نے اپنے اخبار کا جو سکیچ بنایا تھا جنگ نے وہی کاپی کر لیا۔اس سے ہم سب کو بہت دکھ ہوا لیکن اس سے مجھے یہ خوشی ضرور ہوئی کہ میری کوئی چیز اتنی اچھی اور منفرد ضرور ہے کہ اسے کوئی اخبار چوری بھی کر سکتا ہے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں جوان تھا اور خوبرو بھی تھا تو بطور ایڈیٹر مجھے لوگ دیکھ کر بہت حیران ہوتے کہ یہ کم عمر شخص اتنا پختہ اور سنجیدہ اخبار کیسے نکال سکتا ہے۔انہی دنوں اس وقت کے وفاقی وزیر اطلاعات مشاہد حسین سید نے ہمارے دفتر کا دورہ کیا اور جب انہوں نے اخبار کی سرکولیشن دیکھی تو حیران رہ گئے۔بس وہیں سے شاید میری بدبختی شروع ہوگئی۔انہوں نے محمود صادق کو کہا کہ حکومت آپ کی سرکولیشن کو ایڈمائر کرتی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ مل کر چلیں۔مجھے نہیں پتہ چلا کہ کیا وجہ بنی لیکن بہرحال میں اگلے دن آفس آیا تو مجھے پتہ چلا کہ میں اب ایڈیٹر نہیں ہوں اور قدرت اللہ چودھری صاحب کو ایڈیٹر بنا دیا گیا ہے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اور میرے دوست نوید چودھری بھی ان کے ساتھ ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب 'دن' کو پورے ملک کا ایک بڑا اخبار تسلیم کر لیا گیا تو پھر شاید ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک سینئر اور سلجھے ہوئے چہرے والے کو بطور ایڈیٹر لایا جائے، کیونکہ اس کیٹگری پر ایثار رانا فٹ نہیں ہو رہا تھا۔ ایثار رانا میں جتنی مرضی صلاحیتیں ہوں اور جتنی مرضی اس نے محنت کی تھی لیکن شاید ایثار رانا حکومتی ضروریات پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ شاید یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت اپنی مرضی کا ایڈیٹر لانا چاہتی تھی اور میری کسی سیاسی جماعت یا سرکاری ادارے سے کوئی وابستگی نہ تھی۔ بہرکیف یہ صدمہ میرے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ تھا میں اس کا سامنا نہ کر سکا، شدید بیمار پڑ گیا اور کچھ عرصہ بیڈ پر ہی رہا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اچانک اس طرح بے روزگار ہو جاؤں گا۔ شاید مجھے کسی جرم کی سزا مل گئی تھی۔ روزنامہ دن میں مَیں نے تین سال تک کام کیا۔ جب میں بیمار تھا تو میرے پاس رائے حسنین طاہر جو آج کل دن ٹی وی پر ایک پروگرام کرتے ہیں آئے اور کہا کہ مسعود شورش چٹان اخبار پھر سے نکالنے لگے ہیں اور میں نے آپ کی وہاں بطور ایڈیٹر بات کر لی ہے۔ رائے حسنین میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہیں۔ میں یہ مژدہ جانفزا سن کر بیماری کے باوجود بیڈ سے چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور ان کے ساتھ مسعود شورش کے پاس پہنچ گیا۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑی بات تھی کہ میں ایک تاریخ ساز اخبار کا ایڈیٹر بن رہا ہوں۔ مسعود شورش بہت ہی اچھے انسان تھے، بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے۔ تاہم کچھ حالات کی وجہ سے مجھے یہ پرچہ چھوڑنا پڑا اور لانچنگ سے پہلے ہی میں نے اسے چھوڑ دیا۔ ان دنوں ایک اخبار روزنامہ آزاد کا بھی بہت چرچا تھا جس کے ایڈیٹر ممتاز صحافی اطہر مسعود تھے۔ انہوں نے استعفا دے دیا تو میں نے بطور ایڈیٹر ''آزاد'' جوائن کر لیا۔ وہ اخبار بہت اچھا بن گیا اور کامیاب ہوا۔ اخبار کے مالک شیخ محمود تھے جو جماعت اسلامی سے وابستہ تھے۔ ان کا گولیوں ٹافیوں کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ شیخ صاحب نے اخبار پر بہت پیسہ لگایا لیکن اسے سہار نہ سکے اور یہ بند ہو گیا۔ پھر یہ اخبار ضیا شاہد نے خرید لیا۔ میری یہ صحافتی زندگی یوں ہی گزرتی رہی۔

ایک دن ضیا شاہد نے مجھے بلا کر کہا کہ خوشنود علی خان اور ان کے درمیان علیحدگی ہو گئی ہے اور اب ہم اسلام آباد سے خبریں نکالنا چاہ رہے ہیں۔ عدنان شاہد اسلام آباد میں موجود ہیں آپ وہاں فوری طور پر پہنچیں تا کہ ہمارا اخبار نکل سکے۔ میں اسلام آباد پہنچ گیا۔ اس وقت کے نامور کامرس رپورٹر ارشد خان بھی میرے ساتھ تھے۔ یہ ہمارے بہت اچھے ساتھی تھے جو آج کل کینیڈا میں ہوتے ہیں۔ اسلام آباد میں میں نے عدنان شاہد کو بہت قریب سے دیکھا۔ بہت نفیس انسان تھے، بہت زیادہ محبت کرنے والے تھے۔ وہ ضیا شاہد کے بالکل برعکس نہایت ٹھنڈے مزاج اور نرم گفتگو کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مالک تھے۔انہیں بہت ہی کم غصہ آتا تھا۔وہ گٹار بہت اچھا بجاتے اور میں گاناگاتا تھا،ہم ان کے گھر پر ہی رہے۔ایک ہی کمرے میں سوتے اوران کا کچن استعمال ہوتا۔وہ مجھے اپنے بھائی کی طرح عزیز رکھتے تھے۔

میں اسلام آباد ہی میں تھا کہ ایک دن مجھے سینئر صحافی اطہر مسعود کا پیغام ملا کہ میر شکیل الرحمٰن آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ یہ میرے لیے ایک اہم خبر تھی کہ اتنا بڑا آدمی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔انہوں نے مجھے ریٹرن ٹکٹ بھیجا کہ آپ فوری طور پر لاہور پہنچیں۔ میں میر شکیل الرحمٰن سے ملا تو انہوں نے کہا کہ ہم جنگ گروپ کی طرف سے ایک شام کا اخبار روزنامہ ''انقلاب'' نکال رہے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کے ایڈیٹر ہوں۔ میں ویسے بھی لاہور سے دور رہنے کی وجہ سے بہت اداس تھا، میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور بطور ایڈیٹر 'انقلاب' جنگ گروپ جوائن کر لیا۔ یہ میری زندگی کا خوبصورت ترین زمانہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا سکون اور خوشی کبھی نہیں دیکھی۔ایک تو وہاں پر جاب سیکیورٹی تھی۔ میر شکیل الرحمٰن کا انتہائی پروفیشنل رویہ تھا۔ پھر جنگ گروپ سے کچھ ایسے لوگ میری زندگی میں آئے جن کی یادیں اور پرچھائیاں تاعمر میرے ساتھ رہیں گی۔انقلاب تھا تو شام کا اخبار لیکن اس کی کریڈبلٹی بہت اعلیٰ تھی اور سیاسی ،سماجی حلقوں میں اس کی بے حد مقبولیت تھی۔

روزنامہ انقلاب سے بہت خوبصورت اور حسین یادیں وابستہ ہیں۔میں نے جنگ گروپ میں سات سال کام کیا۔اس کے بعد میری زندگی میں ایک تبدیلی آئی اور میں نے محسوس کیا کہ اب پرنٹ میڈیا اور اخبارات کا مستقبل اتنا روشن نہیں رہا اور الیکٹرانک میڈیا کی جانب آنا چاہیے۔ میں نے امتنان شاہد کے کہنے پر بطور ڈائریکٹر نیوز چینل فائیو جوائن کیا۔میرا الیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن یہ بہر حال کرنا ہی کرنا تھا اور یہ چھلانگ مارنا ہی تھی۔چینل فائیو ہم نے ہی لانچ کیا۔اس کا شروع میں بہت ہی اچھا رزلٹ رہا اور میں نے اس کی بہتری کے لیے کوشش کی اور اس کی بہتر ریٹنگ بھی آنا شروع ہوگئی اور وہ اچھی رفتار سے آگے بڑھنے لگا تو انہی دنوں پھر مجھ پر اچانک مشکل وقت آن پڑا۔

ہوا یوں کہ مجھے پیغام ملا کہ مجید نظامی صاحب آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔نظامی صاحب جیسا صحافتی دنیا کا ایک بڑا نام مجھ سے ملنا چاہتا تھا تو میرے لیے یہ نہایت مسرت کا مقام تھا۔میں ان کے پاس حاضر ہوا تو انہوں نے کمال شفقت سے کہا کہ آپ ہمارے ہاں ''وقت'' نیوز چینل میں بطور ڈائریکٹر نیوز آجائیں۔اس وقت ان کے ساتھ رمیزہ نظامی بھی موجود تھیں۔میرے لیے تو یہ بہت بڑی سعادت تھی کہ میں نظامی صاحب کے زیر سایہ کام کروں۔نظامی صاحب نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میری جاب کنفرم کرتے ہوئے کہا کہ آپ ایک ہفتے میں اپنے سابق ادارے کے ساتھ معاملات نمٹا لیں اور ہمارے پاس آ جائیں۔ میں نے ضیا شاہد سے گزارش کر کے چینل فائیو سے استعفا دے دیا اور جب نوائے وقت میں نظامی صاحب کو فون کیا تو اس وقت نوائے وقت کے چیف اکاؤنٹنٹ اعظم بدر تھے ان سے بات ہوئی۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ مجھے مسلسل ٹال رہے تھے۔ آخر ایک دن میں نے ان سے کہا کہ جناب آپ مجھے اصل صورتحال سے آگاہ کر دیں آپ کیوں مجھے ٹال رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اب نظامی صاحب کا ارادہ تبدیل ہو گیا ہے اور آپ کہیں اور نوکری تلاش کر لیں۔ یوں میں چینل فائیو کی ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا اور نوائے وقت سے بھی مجھے کورا جواب مل گیا تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور میں ایک بار پھر بحرانوں کی زد میں آ گیا۔ میں نے انہیں کہا کہ میرے ساتھ ایسا کیوں کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اصل صورتحال میرے علم میں نہیں تاہم اب آپ کو یہاں جاب نہیں دی جا رہی۔ کچھ روز میں بے حد کرب اور تکلیف میں رہا اور پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس وقت معروف کاروباری اور سیاسی شخصیت میاں عامر محمود نے اپنا نیوز چینل 'دنیا' نکالنے کی تیاری شروع کر دی۔ میں نے ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے کمال شفقت سے کہا کہ آپ ہمارے پاس آ جائیں۔ جس وقت میاں عامر محمود لاہور کے میئر تھے اور میں انقلاب کا ایڈیٹر تھا ان کے اور میرے درمیان ایک برادرانہ تعلق قائم ہو گیا تھا۔ اس طرح میں نے دنیا ٹی وی بطور ایگزیکٹو ڈائریکٹر جوائن کر لیا۔ یہ وہ دور تھا جب دنیا ٹی وی میں بجلی کا انتظام بھی صحیح نہیں تھا۔ چینل لانچ نہیں ہوا تھا اور اس کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ یہاں میں نے دو سال تک کام کیا، اس دوران مجھے الیکٹرانک میڈیا کو صحیح طریقے سے سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ہمیں انگلینڈ سے کچھ لوگوں نے آ کر الیکٹرانک میڈیا کی خوب ٹریننگ دی اور ایک سوفٹ ویئر Orad کی تربیت دی۔ دنیا ٹی وی کا یہ سوفٹ ویئر الیکٹرانک میڈیا کی دنیا میں مہنگا ترین سوفٹ ویئر تھا جو ہمیں استعمال کرنا تھا۔ یہاں مجھے جدید کمیونیکیشن سیکھنے کا بہترین موقع میسر آیا۔

اس دوران میں مَیں نے تین ایم ڈی اور چار ڈائریکٹر نیوز بھگتائے۔ یہاں میرا سب سے اچھا وقت ایم ڈی ہارون پاشا کے ساتھ گزرا۔ پاشا صاحب ایک نفیس انسان تھے۔ وہ اس سے قبل شریف فیملی کے مالی معاملات دیکھتے رہے تھے، انہیں فنانس کا وسیع ترین تجربہ تھا۔ اس کے بعد اشرف عظیم باقاعدہ ایم ڈی کے طور پر سامنے آئے۔ وہ ایک نہایت سلجھے ہوئے اور شریف النفس آدمی تھے۔ وہ تمام کارکنوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تاہم وہ میاں عامر کی رفتار کے ساتھ نہ چل سکے اور انہوں نے نوکری چھوڑ دی۔ اس کے بعد فیصل شیر جان آئے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ فیصل شیر جان دنیائی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

وی نکالنے نہیں بلکہ دنیائی وی کو ڈیلے کرنے کے ایجنڈے پر آئے تھے۔انہوں نے اپنے سے بہت نیچے والے کارکنوں سے لڑائیاں پیدا کیں۔لایعنی میٹنگز کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا جس کے بعد انہیں بھی فارغ کر دیا گیا۔ان کے بعد نوید کاشف آئے جو دنیا میں ایچ آر منیجر کے طور پر آئے تھے لیکن انہوں نے اپنی ذہانت اور محنت سے خود کو ایم ڈی کے لیے اہل ثابت کر دکھایا۔

نوید کاشف نے ایک ایک شعبے کو سمجھا اور محنت کی۔وہ اپنی اسی لگن کے نتیجے میں آج دنیائی وی میں ایم ڈی کے طور پر کام کر رہے ہیں۔وہ بہت اچھے آدمی ہیں اور دوستوں کے دوست ہیں۔اس دوران دنیائی وی میں بطور ڈائریکٹر نیوز سرور منیر راؤ (سابق ڈائریکٹر نیوز پی ٹی وی) آئے اور چند دنوں بعد وہ بھی واپس چلے گئے۔سرور منیر راؤ کے بعد عامر غوری آئے جنہیں خاص طور پر لندن سے بلوایا گیا تھا تاہم وہ بھی چینل لانچ کرنے میں ناکام رہے کیونکہ انہیں چینل لانچ کرنے کے لیے بنیادی ٹیکنیکل باتوں کا ہی علم نہ تھا۔دراصل دنیائی وی کا سارا بوجھ اس وقت سہیل جاوید مرحوم، عزیز احمد، محمد عادل اور عارف حمید بھٹی نے اٹھایا ہوا تھا۔بطور ڈائریکٹر نیوز ایم ابصار عالم آئے۔انہیں بھی ٹی وی کو لانچ کرنے کی تکنیک کا علم تو نہ تھا تاہم وہ ایک اچھے منیجر ضرور تھے جنہوں نے نیوز روم کو اچھے طریقے سے مینج کیا اور ویسے بھی دنیائی وی کو اتنے دن گزر چکے تھے کہ اب وہ خود بخود لانچنگ کے قریب پہنچ گیا تھا۔پھر وہ دن آیا کہ جب دنیائی وی سکرین پر نمودار ہوا۔مجھے یہ فخر ہے کہ دنیائی وی کا پہلا جملہ جو معروف اینکر جاوید اقبال نے بولا تھا وہ میرا لکھا ہوا تھا۔

دنیائی وی میں جتنا عرصہ بھی رہا نائٹ شفٹ میں رہا کیونکہ جو بھی ڈائریکٹر نیوز آتا تھا اسے میری یا تو شکل پسند نہ آتی تھی یا پھر وہ میرے مضبوط صحافتی بیک گراؤنڈ سے بھی خائف ہوتا تھا۔اس کے پاس بہترین راستہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے نائٹ شفٹ میں بھیج دے۔نائٹ شفٹ میں بھیجنے سے ایک تو میں مین لائن سے ہٹ جاتا تھا اور دوسرا میٹنگز کے اندر خبر پر بحث کے دوران انہیں میری وجہ سے خفت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔کیونکہ خبر اور خبر کے ذرائع پر ظاہر ہے وہ مجھ سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔میں نائٹ شفٹ میں تھا تو صبح آٹھ بجے والا نیوز بلیٹن تیار کرنا بھی میری ذمہ داری ہوتی تھی۔میں یہ کرتا تھا کہ صبح کے اخبارات کا مطالعہ کر کے یہ بلیٹن بالکل نئے انداز میں پیش کرتا تھا، یوں خوش قسمتی سے اس نیوز بلیٹن کی ریٹنگ آنا شروع ہوگئی اور تمام چینلز میں ہمارا یہ بلیٹن ہٹ ہونے لگ گیا جس پر ایک دن میاں عامر محمود نے ابصار عالم سے پوچھا کہ نائٹ شفٹ کا انچارج کون ہے تو انہوں نے میرا بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ابصار عالم بھی دنیائی وی چھوڑ گئے اور ان کے بعد اویس توحید آئے۔وہ ایک نامور ڈائریکٹر نیوز تھے لیکن میں نے ان میں قوت فیصلہ بہت کمزور دیکھی جس کا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں برملا اظہار بھی کرتا تھا۔ اولیس توحید کے ایک اسسٹنٹ تھے جو کنٹرولر نیوز کے طور پر کام کرتے تھے۔ سٹاف کو گالیاں دینا ان کا لائف سٹائل تھا میں اس پر انہیں بارہا منع کرتا تھا کہ خواتین کی موجودگی میں ایسی زبان استعمال نہ کیا کریں۔ ایک دن بہت ساری خواتین بیٹھی تھیں تو انہوں نے وہی زبان استعمال کی۔ میں نے انہیں منع کیا تو وہ مزید بگڑ گئے، اس پر میں نے انہیں تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ مارنا ایک بہت بڑا بم تھا جس پر پورے دنیا ٹی وی میں شور مچ گیا۔ اس وقت کے ایم ڈی یوسف بیگ مرزا نے اس کا سخت نوٹس لیا اور مجھے معطل کر دیا۔ میاں عامر اس وقت امریکہ میں تھے تو انہوں نے وہاں سے حکم دیا کہ ایثار رانا کو فارغ نہیں کرنا میں آ کر فیصلہ کروں گا۔ میاں عامر نے واپس آ کر مجھے بحال کر دیا تاہم مجھے ایک کمرہ اور ٹیبل دے کر سپیشل اسائمنٹس دینا شروع کر دیں۔ کچھ عرصہ بعد میں نے میاں عامر کو اپنا استعفا پیش کر دیا جس میں مَیں نے واضح لکھا کہ میری تنخواہ بہت زیادہ ہے اور میں جو کام کر رہا ہوں وہ بہت ہی کم اہم ہے اس لیے میں اپنے آپ کو مطمئن نہیں کر پا رہا مجھے اجازت دی جائے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ میرے بہت سے دوستوں نے کہا کہ یہ تو کوئی وجہ نہیں ہے نوکری چھوڑنے کی۔ میں نے انہیں کہا کہ میرا ضمیر مطمئن نہیں ہے۔ یوں 2008ء میں میں نے دنیا ٹی وی بھی چھوڑ دیا۔

میرا یہ صحافتی سفر ایسے ہی کٹتا رہا اور میں نے اس دشت کی بہت خاک چھانی۔ میں دن ٹی وی میں گیا۔ پھر میں دوبارہ خبریں میں آ گیا اور یہیں سے چودھری اکرم جو اس وقت وزیراعلیٰ پنجاب عثمان بزدار کے مشیر اور ہمارے بہت ہی اچھے دوست ہیں نے مجھے کہا کہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مجاہد کامران کو ڈائریکٹر میڈیا کی اشد ضرورت ہے تو میں نے پنجاب یونیورسٹی میں بطور ڈائریکٹر کام شروع کر دیا۔ جس روز میں پہلی بار یونیورسٹی بطور ڈائریکٹر جا رہا تھا تو مجھے یاد آیا کہ میں کبھی کبھار یونیورسٹی کے گیٹ نمبر ایک پر اخبار کا ضمیمہ بھی بیچتا رہا ہوں اور میری بہت بڑی خواہش تھی کہ کبھی میں یونیورسٹی کو اندر سے دیکھوں اور پھر اللہ نے اس یونیورسٹی کے باہر آواز لگا کر اخبار بیچنے والے کو اس کا ڈائریکٹر بنا دیا۔ یہاں میں نے دو سال تک کام کیا۔ یہاں میرا نیم سرکاری ادارے میں کام کرنے کا پہلا تجربہ تھا۔ اب نہ مجھ پر صبح اٹھ کر لاشعوری خوف تھا کہ آج کے اخبار میں میری کیا غلطی ہو گی یا ٹی وی کی کیا غلطی ہو گی۔ میں بھرپور نیند کے مزے لیتا اور ایک افسر کی طرح آفس جاتا۔ میں نے مجاہد کامران وائس چانسلر کے ساتھ مل کر اپنی ذمہ داریاں انجام دیں۔ اس دوران میں نے پنجاب یونیورسٹی میں بہت سے ادبی اور ثقافتی پروگرام منعقد کروائے۔ مجید نظامی صاحب کو جب خصوصی طور پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی تو میں نے ان کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب کا انعقاد

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کروایا۔اسی طرح میں نے کالم نگاروں، ادیبوں، صحافیوں اور دانش وروں کو متوجہ کیا اور پنجاب یونیورسٹی کے امیج کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ یہاں اہم بات یہ بتاتا چلوں کہ میں سمجھتا تھا کہ شاید صحافیوں میں بہت زیادہ پالیٹکس، بلکہ غیر اخلاقی پالیٹکس ہے لیکن یونیورسٹی میں مَیں نے یہ مشاہدہ کیا کہ صحافیوں سے زیادہ اس قوم کے اساتذہ میں اخلاقی گراوٹ ہے۔میری آنکھوں کے سامنے اساتذہ کی لڑائیاں ہوئیں، ایک دوسرے کو گالیاں دی جاتیں اور اساتذہ پر لڑکیوں کے حوالے سے سیکنڈل بنائے جاتے تھے۔ مجھے دوستوں نے کہا کہ جب آپ کمرے میں اکیلے ہوں اور اگر کوئی لڑکی یا خاتون آئے یا تو آپ باہر چلے جائیں یا کسی اور کو اپنے پاس بلوالیں۔ میں نے کہا کہ ایسا کیوں ہے تو بتایا گیا کہ یہاں کی روایت ہے کہ جب بھی کسی کو ذلیل کرنا ہوتو اس پر اس طریقے سے خواتین کا الزام لگوادیا جاتا ہے اور اسے بدنام کر دیا جاتا ہے۔ بہت سے ایسے واقعات ہوئے کہ بلاخذ خواتین بھیجی گئیں اور پھر الزام لگا کر کوئی سکینڈل کھڑا کر دیا گیا۔ میں نے ایک صحافی کی نظر سے اس بات کا بھی مشاہدہ کیا کہ بعض خواتین اساتذہ کو اپنی خوبصورتی کا بہت زیادہ احساس تھا اور وہ اس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال بھی کرتی ہیں۔مجاہد کامران کی سنڈی کیٹ کمیٹی میں بہت ساری تعداد تو ایسی خواتین کی تھی جوان کی منظور نظر تھیں اور ان کے آس پاس رہتیں۔

مجاہد کامران کے متعلق میرے مشاہدات یہ ہیں کہ وہ ایک زندہ دل،خوش ذوق، بلا کے ذہین اور بہادر تھے۔میں نے ان کے ساتھ رہ کر مینجمنٹ سیکھی۔دو سال میں یونیورسٹی میں رہا تو میں نے نوٹ کیا کہ چونکہ میں ایک خالص صحافی تھا تو صحافی کے پاس بھلے کھانے کو کچھ نہ ہو لیکن اس میں ایک ایٹی چیوڈ ہوتا ہے۔یہ چیز آہستہ آہستہ مجھے کھائے جارہی تھی کہ یونیورسٹی میں جو بھی بڑے سیاسی حضرات آتے تھے وہ انتظامیہ کے لیے بڑے اہم ہوتے تھے اور انتظامیہ ان کے آگے بچھ بچھ جاتی تھی۔میں مجاہد کامران کے ساتھ ہوتا تھا تو مجھے یہ بات کھلتی تھی کہ بطور ایڈیٹر جو لوگ میرا استقبال کرتے تھے آج مجھے ان کے لیے کھڑا ہونا پڑ رہا ہے۔لیکن بہر حال میں نے اس سے اپنا تزکیہ نفس بھی کیا۔اسی دوران میرے خلاف بہت سی سازشیں بھی ہونے لگیں۔میرے اسسٹنٹ کا نام تھا خرم شہزاد۔مجھ سے پہلے وہ یونیورسٹی میں بطور پی آر او کام کر رہے تھے۔خرم شہزاد چونکہ یونیورسٹی کی پوری نفسیات جانتے تھے تو انہوں نے میرے خلاف سازشوں کا جال بننا شروع کیا۔وہاں پر کچھ لوگ ایسے تھے جو ان سازشوں میں اس کے ساتھ تھے۔ایک پولیس کا حاضر سروس سپاہی تھا جس کے متعلق کہا جاتا کہ مجاہد کامران اس کی ہر بات مانتے ہیں۔خرم شہزاد اور سپاہی آپس میں مل کر میرے خلاف سازشیں کرنے لگے۔میرے ساتھ دوسرا مسئلہ یہ پیش آیا کہ جو ایجوکیشن رپورٹرز تھے وہ پی آر او آفس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں بڑے دھڑلے سے آتے تھے تو تمام پی آر او آفس ان کی خدمت میں پیش پیش ہوتا تھا لیکن میں چونکہ ایک ایڈیٹر تھا اس لیے میں انہیں اس طرح سے نہیں دیکھتا تھا۔ انہیں بے جا پروٹوکول نہیں دیتا تھا اور انہیں رپورٹر کے طور پر ہی ڈیل کرتا۔ یوں ان کی جو جائز اور ناجائز خواہشیں جو پہلے پوری ہوتی تھیں وہ میرے آنے سے بالکل دم توڑ گئیں۔ یہ رپورٹرز بھی اس سازش میں حصہ بن گئے اور میرے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا گیا۔ ایک دن میرے دوست چوہدری اکرم جن کی سفارش پر مجھے یہ جاب ملی تھی کا فون آ گیا کہ میں مجاہد کامران کے پاس بیٹھا ہوں اور مجاہد صاحب آپ سے خوش نہیں ہیں تو میں نے کہا کہ آپ مجاہد کامران کو کہہ دیں کہ میرا ابھی سے استعفا سمجھیں اور میں کل سے آفس نہیں آؤں گا۔ اس طرح میں نے پنجاب یونیورسٹی سے استعفا دے دیا۔ میرا کنٹریکٹ ڈھائی سال کا تھا لیکن میں نے دو سال بعد ہی ریزائن کر دیا۔ دراصل میں سمجھتا تھا کہ چونکہ میرے دوست چوہدری اکرم کی وجہ سے ہی مجھے یہ نوکری ملی تھی اور اب اگر چوہدری اکرم ہی یہ جملہ کہہ رہا ہے تو اب مجھے اخلاقی طور پر اور اپنے دوستی کے رشتے کو دیکھتے ہوئے یہاں سے چلے جانا چاہیے اور اپنے ایک اچھے دوست پر بوجھ نہیں بننا چاہیے۔

جہاں تک پنجاب یونیورسٹی میں طلبہ سیاست کی بات ہے تو میں شروع ہی سے اسلامی جمعیت طلبہ کا مخالف رہا اور اس کے ساتھ میرا نظریاتی اختلاف ہے، میں نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے جمعیت سے مار بھی کھائی تھی۔ میں چونکہ تھوڑا سا لبرل بھی ہوں تو میں جماعت اسلامی اور جمعیت کو پسند نہیں کرتا لیکن میں یہ بھی کہوں گا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی میں جمعیت نہ ہو تو وہاں پر بے حیائی کے ایسے ایسے مناظر دیکھنے میں آئیں جو شاید یورپ میں نظر آتے ہیں۔ میرا لبرل اور روشن خیال ہونا اپنی جگہ پر ہے لیکن میرے اندر بہر حال اسلام پر یقین رکھنے والا ایک شخص بھی موجود ہے۔ میرے دور میں بلوچ طلبہ تنظیموں اور جمعیت کے درمیان لڑائیاں بھی ہوئیں جس میں میں نے صلح صفائی کا کردار ادا کیا۔ کچھ عرصہ فارغ رہنے کے بعد میں نے وسیم قریشی اور میاں طاہر کا ویلیو ٹی وی جوائن کیا جو ان دنوں لانچ ہو رہا تھا۔ یہ اچھا چینل چلا لیکن بعد میں پیسے کی کمی کی وجہ سے یہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ اس کے بعد میں ظہیر الدین بابر مرحوم کے سٹار ایشیا چینل میں آ گیا۔ یہ ایک سٹی چینل تھا لیکن اس کے حالات پہلے دن ہی سے برے تھے۔ ظہیر الدین بابر ایک جواں دل انسان اور یار باش آدمی تھے اور اسی یار باشی کی وجہ سے اس چینل کو بہت سے مسائل بھی پیش آئے۔ سٹار ایشیا میں صرف تین چار ماہ ہی کام کیا اور تنخواہ کی عدم ادائیگی کی وجہ سے مجھے یہ بھی چھوڑنا پڑا۔ تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے میں سٹار ایشیا چینل کی گاڑی بھی اپنے ساتھ لے آیا اور مالکان کو کہا کہ جب تک آپ تنخواہ نہیں دیں گے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں گاڑی واپس نہیں کروں گا، بہرحال پھر کچھ دوست بیچ میں پڑے اور یوں یہ معاملہ حل ہوا۔ سٹار ایشیا کے بعد پھر وہی میں تھا اور بے روزگاری تھی۔

میں ایک صحافی تھا اور اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اتنا زیادہ بینک بیلنس تھا کہ اپنا کوئی کاروبار شروع کر سکتا چنانچہ میں پھر اسی دشت کی سیاحی میں بھٹکتا ہوا کسی اور ادارے کی تلاش کرنے لگا۔ کچھ عرصہ بے روزگار رہا اور انہی دنوں روزنامہ 92 نیوز اخبار کی اشاعت کی تیاریاں ہونے لگیں تو میں نے اس کے مالکان سے رجوع کر لیا سینئر صحافی اور ہمارے بہترین دوست خاور نعیم ہاشمی نے میری ملاقات اس اخبار کے مالک میاں رشید سے کروائی۔ مجھے محسوس ہوا کہ مالکان مجھے اپنے اخبار میں رکھنا چاہتے ہیں، چونکہ ان دنوں صفر کا مہینہ چل رہا تھا تو مجھے پتا چلا کہ اس مہینے میں میاں رشید کسی قسم کا کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی گئیں۔ ادھر آئے روز میرے مالی حالات خراب ہونے لگے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے کچن چلانے کے لیے اپنی اہلیہ کے کچھ زیورات فروخت کر کے گزارا چلانا پڑا۔ میں یہاں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ نے مجھے زندگی کا ایسا ہمسفر دیا ہے جس نے قدم قدم پر میرا بھرپور ساتھ دیا۔ اگر ان حالات میں مجھے بیگم کا بھرپور ساتھ میسر نہ آتا تو شاید میں دل ہار جاتا۔ میں نے اب یہ سوچنا شروع کر دیا کہ مجھے کسی قومی اخبار میں صرف کالم لکھنا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ کسی نیوز چینل پر کوئی پروگرام شروع کرنا چاہیے۔ ایک دن کسی پروگرام میں میری ملاقات سینئر صحافی اور ہمارے نہایت محترم مجیب الرحمٰن شامی سے ہوگئی تو میں نے ان سے صرف اتنا کہا کہ میں آپ کے اخبار کے لیے مستقل کالم لکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں عمر مجیب شامی سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گا۔ میں ان دنوں بہت زیادہ پریشان تھا کہ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ ایک ایڈیٹر ہے اور سینئر صحافی ہے جبکہ میرے مالی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں۔ کچھ دن کے بعد میں نے پھر شامی صاحب کو میسج کیا کہ جناب میں تو آپ کے مریدین میں سے ہوں۔ آپ تو بہت سے لوگوں کو نوازتے ہیں اور میں تو ہمیشہ نیت باندھ کر آپ کے پیچھے کھڑا ہوتا ہوں۔ اس پر ان کا بڑا محبت آمیز میسج آیا کہ آپ ایک دو دن صبر کریں۔ خیر دو دن کے بعد مجھے روزنامہ پاکستان کے آفس سے عبد الغفور کا فون آیا۔ انہوں نے کہا عمر مجیب شامی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں اگلے دن عمر مجیب کے پاس پہنچا۔ میرا خیال یہی تھا کہ انہوں نے مجھے کالم کے لیے بلایا ہے لیکن جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں مستقل طور پر جوائن کیوں نہیں کر لیتے۔ اسی دوران مجھے 92 نیوز اخبار کے ہیومن ریسورس سے بھی فون آ گیا کہ آپ آ کر کام شروع کریں تو میں اس وقت شدید تذبذب کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کیفیت سے دوچار ہوگیا کہ اب کس طرف جاؤں۔ 92 نیوز کا سیلری پیکیج بہت اچھا تھا اور روز نامہ پاکستان میں مجھے شامی صاحب جیسے بڑے آدمی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔

اس موقع پر میں نے پاکستان فریڈم موومنٹ کے چیئرمین خواجہ ہارون سے راہنمائی مانگی۔ خواجہ صاحب، میرے بڑے بھائیوں کی طرح ہیں۔ وہ ایک درد دل رکھنے والے غیرت مند پاکستانی ہیں۔ جو ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ایک دن مانگا اور اگلے روز مجھے کہا کہ آپ آنکھیں بند کر کے پاکستان جوائن کرلیں اس رات میں نے اللہ سے التجا کی کہ میں کوئی ایسا فیصلہ کر پاؤں جو میرے حق میں بہتر ہو۔ اگلی صبح جب اٹھا تو میرا پختہ ذہن بن چکا تھا کہ مجھے'پاکستان'ہی میں جانا چاہیے۔

یہ بتا تا چلوں کہ میں شامی صاحب کو جانتا تو بہت پہلے سے تھا، انہیں پڑھتا اور سنتا آیا تھا۔ ان کے ساتھ تعارف بھی تھا لیکن ابھی تک ان کے ساتھ مل کر کام نہیں کیا تھا۔ میں نے 31 دسمبر 2016ء کو جب روز نامہ پاکستان میں بطور گروپ ایڈیٹر ذمہ داری سنبھالی تو مجھے معلوم ہوا کہ شاید میرے اور شامی صاحب کے سیاسی نظریات میں بہت زیادہ فرق ہے۔ کیونکہ کچھ لوگ تو مجھے کامریڈ اور سرخا بھی کہہ کر پکارتے تھے۔ میں نے پاکستان اخبار میں اپنے نظریات کے پرچار میں زبردست کالم لکھے تو مجھے بہت زیادہ لوگوں نے کہا کہ آپ شامی صاحب کے اخبار میں اتنا دھڑلے سے لکھتے ہیں تو ان کی طرف سے آپ کو کبھی روکا تو نہیں گیا۔ آج اور اس وقت تک بھی مجھے شامی صاحب نے کسی بھی کالم کے حوالے سے کوئی روک نہیں لگائی بلکہ بہت سے کالموں کے متعلق تو وہ مجھ سے ڈسکشن بھی کرتے ہیں اور ازراہ تفنن بہت سے جملے بھی کہہ جاتے ہیں جو میرے لیے مشعل راہ ہوتے ہیں۔ میں نے شامی صاحب کی یہ بات ہمیشہ کے لیے پلے باندھ لی کہ ہم جو مرضی لکھیں ایک تو وہ مکمل طور پر ادب کے دائرے میں ہونا چاہیے۔ دوسرے، کسی کی تضحیک کا پہلو اس سے نہیں نکلنا چاہیے اور تیسری بات یہ کہ ہم جو لکھیں پھر اس کی پوری ذمہ داری بھی اٹھانے کی پوزیشن میں ہوں اور صرف ہواؤں میں تیر نہ چلاتے رہیں۔

شامی صاحب اکثر مجھے کہتے ہیں کہ آپ اس مکھی کی طرح ہو جو صرف گند پر ہی بیٹھتی ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ مکھی کا یہ اعزاز ہے کہ وہ گند پر بیٹھ کر ہمیں متوجہ کر دیتی ہے کہ یہاں پر گند ہے اور اسے صاف ہونا چاہیے۔ شامی صاحب میرے کالموں پر تو اپنی قیمتی آراء دیتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے جس وقت ان کی طرف سے بلاوا آتا ہے تو سچی بات ہے کہ مجھے جتنی بھی آیات اور وظائف یاد ہیں میں پڑھتا ہوا جاتا ہوں۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ آج اخبار میں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہوگی جس کی وجہ سے انہوں نے مجھے طلب کیا ہے۔ وہ میری غلطیوں پر ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے ہیں لیکن اس ڈانٹ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ڈیپٹ میں سب سے زیادہ روشن پہلو یہ ہوتا ہے کہ اس میں کہیں بھی تضحیک کا پہلو نہیں ہوتا اور کہیں ایسا نہیں لگتا کہ وہ مالک ہیں اور میں ملازم ہوں بلکہ ایسا لگتا ہے ایک باپ کسی غلطی پر اپنے بچے کو سمجھا رہا ہے۔ان کے سمجھانے کا انداز نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ جب بھی وہ کسی غلطی کی نشاندہی کرتے ہیں تو میں ان سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر ہی اٹھتا ہوں۔

ماضی میں مجھے بہت سے مالکان سے واسطہ پڑا جن کی تعداد بہت زیادہ ہے تاہم میں مختصر طور پر چار پانچ لوگوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کا اثر میری زندگی اور میرے پروفیشن پر بہت زیادہ پڑا۔ مجیب الرحمٰن شامی صاحب کا ذکر تو اوپر گزر چکا ہے۔ان کے علاوہ بتاتا چلوں کہ میرے پہلے مالک اکبر علی بھٹی مرحوم تھے۔وہ پرنٹ میڈیا کے ایک محسن تھے۔انہوں نے پرنٹ میڈیا ورکز کے حالات بدلے۔اس کے بعد ضیا شاہد میرے استاد ہیں۔ضیا شاہد نے میرے جیسے ایک زیرو کو اٹھا کر ہیرو بنا دیا۔میری گرومنگ وہیں سے ہوئی۔ مجھے مشکل سے مشکل حالات میں کام کرنے کا ہنر سکھایا۔میر شکیل الرحمٰن کے ساتھ میں نے آٹھ سال تک کام کیا۔ان سے زیادہ میں نے پروفیشنل مالک نہیں دیکھا۔انہوں نے جب بھی مجھ سے بات کی صرف پروفیشنل انداز میں بات کی۔ یہاں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا ہے کہ ایک مرتبہ میر صاحب کا مجھے فون آ گیا، کہنے لگے رانا صاحب! آپ اداکاروں کو چھاپتے ہیں، ان کے انٹرویوز شائع کرتے ہیں لیکن اتنے بڑے بڑے جید لوگ پاکستان میں موجود ہیں آپ انہیں جگہ نہیں دیتے آپ کیسے ایڈیٹر ہیں کہ آپ وقت کے بڑے لوگوں کو اکاموڈیٹ نہیں کرتے۔اب میں انہیں کہنا چاہ رہا تھا کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ اخبار کو بہتر بنا سکوں لیکن میر شکیل الرحمٰن بولے جا رہے تھے اور مجھے بات کرنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔اس کے بعد فون بند ہو گیا۔ میں اسی تجسس میں تھا کہ آخر کیا ہوا کہ میر صاحب اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ چند ہی لمحوں بعد پھر ان کا فون آ گیا تو وہ کہنے لگے کہ بھائی ایک صاحب میرے سامنے تشریف فرما تھے اس لیے مجھے آپ کو کچھ کہنا پڑا لیکن سچی بات یہ ہے کہ آپ ایڈیٹر ہیں اور آپ اخبار کے لیے جو بہتر سمجھتے ہیں وہی شائع کریں۔ وہ جب بھی بات کرتے ایک پروفیشنل مالک کی طرح بات کرتے۔اس کے بعد میاں عامر محمود کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔وہ ایک باحوصلہ انسان ہیں۔ وہ بڑے سے بڑا نقصان ہونے پر بھی جبین شکن آلود نہیں کرتے تھے۔ان کے پاس بیٹھ کر کئی لوگوں نے بھاری تنخواہیں لیں اور کام کچھ نہ کیا لیکن میاں عامر محمود نے ایسے لوگوں کو بھی حوصلے سے برداشت کیا۔ یہ ان کے حوصلے کا ہی صلہ ہے کہ آج ان کا چینل وطن عزیز کا ایک بڑا ٹی وی چینل شمار کیا جاتا ہے۔دن گروپ کے محمود صادق کے ساتھ کام کیا جو بہت دلچسپ تجربہ رہا۔ان کے پاس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس قدر آئیڈیاز ہیں کہ ایک عام اور سست رفتار آدمی ان کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ میں انہیں ایک سیماب صفت ایڈیٹر اور مالک کہتا ہوں جن کے پاس آئیڈیاز کا ایک طوفان ہے۔ وہ پاکستان میں سوفٹ ویئر کے حوالے سے پائینئر ہیں۔ انہوں نے سوفٹ ویئر کے حوالے سے پاکستان کے لوگوں کو بہت زیادہ تعلیم دی اور میں تو انہیں کمپیوٹر اور سوفٹ ویئر کی دنیا کا سر سید کہتا ہوں۔

میں نے بہت سے میڈیا ہاؤسز میں کام کیا لیکن مجھے جو عزت اور مقام روزنامہ پاکستان میں ملا وہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ شاید میرا تیس سالہ صحافتی کیریئر ایک طرف ہے اور یہ تین سال ایک طرف ہیں۔ اس میں بڑا کریڈٹ شامی صاحب اور ان کے بیٹے عمر مجیب شامی کا ہے جنہوں نے مجھے کبھی پابندیوں میں نہیں گھیرا۔ بہت سارے موقع ایسے آئے کہ اگر شامی صاحب چاہتے تو مجھے اگنور کر سکتے تھے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں کہ ایک مرتبہ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور میں ایک تقریب تھی تو انتظامیہ نے سٹیج پر صرف دو کرسیاں شامی صاحب اور اوریا مقبول جان کے لیے رکھیں۔ جب شامی صاحب سٹیج پر آئے تو انہوں نے انتظامیہ سے کہا کہ بھائی ایثار رانا کی کرسی کہاں ہے؟ تو میں نے سامنے سے کہا کہ جی میں تو صرف آپ کو سنوں گا تو انہوں نے کہا کہ نہیں ایسا ہوگا۔ انہوں نے انتظامیہ کو کہا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ ایثار رانا ایک سینئر صحافی ہیں۔ یوں انہوں نے سٹیج پر کرسی لگوا کر مجھے اپنے ساتھ بٹھایا۔ وہ تب تک نہیں بیٹھے جب تک تیسری کرسی نہیں لگا دی گئی۔ میں نے بہت مہربان مالک دیکھے ہیں لیکن جو انداز شامی صاحب کا ہے وہ شاید میری زندگی میں کبھی نہیں آیا۔ بار ہا ایسا ہوا کہ مختلف تقاریب میں انہوں نے مجھے آواز دے کر اپنے پاس سٹیج پر بلایا۔ جتنی عزت شامی صاحب نے مجھے دی تو مجھے پہلی مرتبہ حضرت علیؓ کا قول عملی طور پر سمجھ میں آیا کہ وہ فرماتے ہیں: ''بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جس کی صحبت میں کوئی بھی آدمی خود کو چھوٹا محسوس نہ کرے''۔ شامی صاحب کے بیٹے عمر مجیب شامی، عثمان شامی اور علی شامی بہت اچھے لوگ ہیں۔ انہوں نے کبھی ہمارے ساتھ ملازموں جیسا برتاؤ نہیں کیا۔ ان حضرات نے بطور ایڈیٹر مجھے مکمل طور پر آزادی دی کہ میں جس طرح بھی اخبار چلاؤں وہ مداخلت ہرگز نہیں کرتے۔ یوں اس خوبصورت فضا میں مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ عمر مجیب شامی جب بھی میری کوئی اخبار میں غلطی پکڑیں تو کہتے ہیں کہ چلیں اس پر توجہ دیں اور اب مزید آگے بڑھیں۔ آئندہ غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں لیکن دراصل وہ بڑے آدمی ہیں۔ عثمان شامی روزنامہ پاکستان کی ویب سائٹ میں نت نئی جدت لا رہے ہیں۔ صحافت میں میں ضیا شاہد، میر شکیل الرحمٰن، مجیب الرحمٰن شامی، نذیر ناجی، عباس اطہر اور حسن نثار جیسے لوگوں سے بہت متاثر ہوں۔ نذیر ناجی عصر حاضر کے ان چند کالم نگاروں میں ہیں جو آج بھی اپنی روایتی کالم نگاری

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے ساتھ ایک انفارمیشن دیتے ہیں اور جو ماضی میں کالم نویسی کا ایک سنہرا دور تھا ناجی صاحب اس کے امین ہیں۔ سیاست دانوں میں سب سے زیادہ متاثر ذوالفقار علی بھٹو سے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے پاکستانی سیاست پر جو نقوش ثبت کیے ہیں وہ کبھی مٹائے نہیں جا سکیں گے۔ بڑا لیڈر وہی ہوتا ہے کہ جسے تاریخ وقفے وقفے سے یاد کرتی رہے۔ بھٹو وہ آدمی ہے جس کو اس کے دشمن بھی تسلیم کر رہے ہیں کہ وہ واقعی بہت بڑا آدمی تھا۔ میں انہیں محض ایک سیاستدان نہیں بلکہ ایک عظیم قومی لیڈر قرار دیتا ہوں۔ لوگ کچھ بھی کہیں اور کسی کی نجی زندگی کے معاملے میں جو بھی رائے دیں دے سکتے ہیں کہ یہاں کوئی بھی پارسا نہیں ہے۔ غلطیاں اور کمی کوتاہیاں ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ اصل چیز یہ نہیں ہے کہ کون سا حکمران کتنی پابندی سے نماز پڑھتا ہے۔ نماز پڑھنا اس کا ذاتی معاملہ ہے لیکن عوام اور ملک کے لیے وہی حکمران بہتر ہوگا جو عام لوگوں کی فلاح کے لیے کام کرے گا اور بھٹو نے ایسا کیا۔ بھٹو نے اس قوم کو ایک سمت دے دی ہے اور جو راہ وہ متعین کر کے دے گئے اسے کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔ عمران خان ہو یا نواز شریف، شہباز شریف یا کوئی اور بھٹو ہی پاکستان کی پارلیمان کا اصل ہیرو ہے۔

میں نے جو بھی کتابیں پڑھنا تھیں وہ میں نے اپنے تعلیمی دور ہی میں پڑھ لیں۔ مثلاً فیض، فراز، اقبال، ساحر، غالب وغیرہ کو خوب پڑھا۔ اسی طرح سب افسانہ نگاروں منٹو، عصمت چغتائی، غلام عباس، کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کو پڑھا۔ اس کے بعد میں نے یہ فلسفہ اپنایا کہ اب مجھے اس سے زیادہ کسی کو نہیں پڑھنا کہ میں کسی کے نظریات کی پرچھائیں اپنی تحریروں پر نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے جو نظریات ہیں وہ میرے اپنے ہی ہیں اور ان پر کسی کی چھاپ نہیں۔ ہاں اگر میں کسی مصنف اور تخلیق سے متاثر ہوا تو وہ ابن صفی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر اور بلکہ دنیا بھر میں ابن صفی جیسا فکشن نگار نہیں گزرا۔ میں ان کا اس حد تک فین ہوں کہ آج بھی میری لائبریری میں ان کی نگارشات کا مکمل ریکارڈ موجود ہے۔

جہاں تک فلمی اداکاروں اور فنکاروں کی بات ہے تو مجھے وحید مراد سے ویسے بھی بہت عشق تھا اور وہ میرے پسندیدہ ترین اداکار تھے۔ ان کے علاوہ مجھے کشور کمار، مہدی حسن، احمد رشدی، رفیع ،لتا بہت پسند ہیں۔ رفیع کے گیت مجھے آج بھی نہیں بھولے۔ وہ نچلی سروں میں بھی ایسے ہی خوبصورت گاتے جیسے وہ اوپر کی سروں میں گاتے ہیں۔ اللہ نے انہیں کمال کی آواز سے نوازا تھا۔ اسی طرح مہدی حسن خان نے جس طرح اردو غزل کو پوری دنیا میں متعارف کروایا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے بعد غلام علی، پنکج ادہاس، انوپ جلوٹا وغیرہ نے بھی اچھا کام کیا اور میرے خیال سے موجودہ دور میں ہری ہرن سے اچھا سنگر کوئی نہیں ہے۔ ہری ہرن ہمارے ماضی کے موسیقی ورثے کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ایک عظیم یادگار ہیں۔ اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کو اپنا تیس سالہ دورِ صحافت کیسا لگتا ہے۔ پچھتاوا ہے یا فخر؟ میں کہتا ہوں کہ ایک شعر ہے۔

بنے گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

تو مجھے اور کام ہی نہیں آتا اور میرا اوڑھنا بچھونا، سونا اور میرا رونا ہنسنا سب صحافت ہی ہے تو اب میں اس پر پچھتاؤں یا فخر کروں تو اس سے کیا ہوگا۔ مجھے تو جو خواب آتے ہیں وہ بھی خبروں اور تجزیوں کی شکلوں میں آتے ہیں۔ مجھے سوچ بھی خبروں کی صورت میں آتی ہے اور میں صحافت میں اس قدر رچ بس گیا کہ میرے لیے ہر چیز ایک خبر ہے۔ میرے لیے ہر چیز ایک اخبار کی سرخی یا نیوز چینل کی بریکنگ نیوز ہے۔ دوست اور قارئین یہ بھی سوال کرتے ہیں کہ آپ طنزیہ اور مزاحیہ لکھتے ہیں اور بالکل سنجیدہ کیوں نہیں لکھتے تو عرض کردوں کہ میں نے بہت زیادہ سنجیدہ لکھا ہے۔ میں تو نوحے لکھتا رہا ہوں۔ میں ایسے کالم بھی لکھتا رہا ہوں کہ اس کے بعد میں خود بھی دھاڑیں مار کر روتا تھا اور بہت بے چین رہتا تھا۔ جن کے لکھنے کے بعد میں کئی کئی دن تک اسی کیفیت میں رہا اور دکھ اور کرب کی فضا قائم رہی۔ میں نے ایک کالم لکھا تھا جس کا عنوان تھا: ''میں مر چکا ہوں''۔ یہ کالم ایک ایسی خبر کے متعلق تھا جو یہ تھی کہ داتا دربار کے قریب فٹ پاتھ پر ایک نوجوان کی لاش تین دن پڑی رہی جو نشے کی حالت میں مردہ پایا گیا تھا۔ میں نے اس پر کالم لکھا اور خود کو اس کی جگہ پر رکھا۔ جو وہ نوجوان مرنے سے پہلے محسوس کرسکتا ہے وہ سارا کچھ میں نے محسوس کیا۔ اس کے بعد کئی دن تک میں ڈپریشن میں رہا۔ اس کے بعد مجھے باقاعدہ سائیکوتھراپی کرانا پڑی۔ بعد میں مَیں اس نتیجے پر پہنچا کہ دکھ، تکالیف اور پریشانیاں تو اس معاشرے کا حصہ ہیں، لوگ پہلے ہی بہت پریشان ہوتے ہیں تو مزید میں انہیں رلا دیتا ہوں۔ میں نے پھر سوچا کہ کیوں نہ میں ہنستے ہنستے چٹکی بھروں، روتے روتے کسی کو کچھ کہنے کے بجائے بہتر ہے کہ آپ مزاح کے انداز میں کسی کو چٹکی بھریں تو وہ زیادہ اثر رکھتی ہے۔ میں نے طنزیہ و مزاحیہ انداز 2016ء میں روزنامہ پاکستان میں آکر اختیار کیا اور اس سلسلے کا میرا پہلا کالم تھا'' آہوئی آہو'' اور یہ اس قدر ہٹ ہوا کہ پورے پاکستان سے لوگوں نے بہت زیادہ سراہا۔ شامی صاحب اور ہمارے ایک سینئر ترین کالم نویس ہیں کرنل غلام جیلانی خان' انہوں نے بہت زیادہ سراہا۔ کرنل صاحب نے تو اس پر ایک کالم بھی لکھا۔ اس کے بعد میں نے یہی اسلوب اختیار کرلیا۔ لیکن یہاں یہ بتاتا چلوں کہ اس اسلوب میں بھی جب میں کالم میں کوئی لطیفہ یا کوئی مزاحیہ جملہ لکھ رہا ہوتا ہوں تو معاشرے کے دکھ اور کرب کو محسوس کررہا ہوتا ہوں۔ میری دانست میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے مسائل کی ایک بڑی وجہ آج کا دانشور ہے۔ جسے میں دانش ور سمجھتا ہی نہیں ہوں۔ ہم نے دانش مندی کے نام پر ایسے غلط ماڈل تیار کیے ہیں جو شکل سے محمد بن قاسم ہوتے ہیں لیکن ان کا اندر راجہ داہر جیسا ہے۔ یہ شکل سے بڑے مسیحا لگتے ہیں لیکن اندر سے لٹیرے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے نظریات اور خیالات کو اس بری طرح سے بیچا ہے کہ مجھے اگر ان کی عزت کا تعین کرنا پڑے تو شاید میں ایک طوائف کو ان سے زیادہ عزت دوں گا۔ ان لوگوں نے ہمیشہ دو نمبر اور لٹیروں کو ہیروز کے طور پر پیش کر کے قوم کو گمراہ کیا۔

میری زندگی رومانس سے بھرپور ہے۔ میں لوگوں سے محبت کرتا ہوں۔ آج بھی میرا دل سولہ سال کی طرح دھڑکتا اور مچلتا ہے۔ اگر محبت اور رومانس کا مطلب صرف خواتین سے محبت لیا جاتا ہے تو یہ غلط ہے۔ محبت تو ایک لافانی اور آفاقی جذبے کا نام ہے۔ محبت تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں بہر حال کوئی شک نہیں ہے کہ صنفِ نازک میں مَیں آج بھی دلکشی محسوس کرتا ہوں۔ میری زندگی بہت سارے ناموں سے مزین ہے میں یہاں ایسی خواتین کے نام بالکل بھی نہیں لوں گا کیونکہ اللہ تعالیٰ پردے کو پسند فرماتے ہیں۔ ویسے بھی محبت ایک ایسے جذبے کا نام ہے جس میں استحصال اور خود غرضی نہیں ہوتی۔ میں بہت خوش قسمت انسان ہوں کہ میری زندگی میں بہت سے محبت کرنے والے لوگ آئے اور آج بھی لوگ مجھے چاہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے کہ لوگ آپ کو چاہتے ہیں اور آپ بھی لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں پر میں یہ ضرور کہوں گا میری بہترین دوست میری اہلیہ ہے، جس نے میری تمام تر خرابیوں کے باوجود ہر حال میں میرا ساتھ دیا اور مجھے بے حد محبت دی۔

میری اب تک تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں کئی زیرِ طبع ہیں۔ ”جب پاکستان واپس ملے گا“ یہ کالموں کا مجموعہ ہے۔ دوسری کتاب سانحہ لال مسجد کے متعلق ہے جو ”سانحہ لال مسجد۔ مجرم کون“ کے عنوان سے شائع ہوئی۔ تیسری کتاب ”چار ماہ گیارہ دن“۔ یہ سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ افتخار چوہدری اور عدلیہ کے حوالے سے ہے۔ میری ان تینوں کتابوں کا انتساب پاکستان کے عوام کے نام ہے۔ مجھے اس بات پر بھی فخر ہے کہ میں نے تقریباً پنجاب کی اہم یونیورسٹیوں میں صحافت کے طالب علموں کو پڑھایا ہے۔ میرے لیے شاندار لمحات وہ تھے جب میں نے انڈین پنجاب یونیورسٹی میں صحافت پر لیکچر دیا۔ اس دن پٹیالہ کے سینئر صحافی، دانش ور اور بیوروکریٹس اور تمام اہم سیاستدان موجود تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں پر میرے ساتھ کراس کوئسچن بھی شروع ہو جائیں گے۔ بہر حال میں نے پاکستان کا مقدمہ لڑا اور اپنا موقف مدلل انداز میں پیش کیا کہ قیامِ پاکستان کے وقت سکھوں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نے مشرقی پنجاب سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے ساتھ انتہائی غلط سلوک کیا تھا۔

میں مجموعی طور پر پاکستان کے سیاستدانوں کو اچھا نہیں سمجھتا اور نہ کسی بڑی سیاسی شخصیات کے ساتھ میری کوئی یادداشتیں وابستہ ہیں۔ ہاں ایک دو اہم واقعات ضرور ہیں جو بیان کر دیتا ہوں۔ ایک بار آصف زرداری نے سینئر صحافیوں کو کھانے پر بلایا تو میں بھی ان میں شامل تھا۔ میں نے ان سے بے نظیر کے قتل کے متعلق ایسا سوال کیا کہ اس کا وہ جواب نہیں دینا چاہتے تھے۔ میں نے پھر وہی سوال کر دیا تو وہ جواب گول کر گئے، خیر میں اپنے سوال پر اڑا رہا اور بعد میں جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور آصف زرداری ہمیں الوداع کرنے آئے اور میں ان سے ہاتھ ملانے لگا تو انہوں نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑ لیے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنس کر کہا کہ ایثار رانا! کیا آپ ابھی تک اپنے سوال پر قائم ہو تو میں نے ان سے کہا کہ جس طرح آپ مجھے دھمکی دے رہے ہو تو اس کے بعد تو میں بہرحال اپنے سوال پر قائم نہیں رہوں گا۔ اس پر وہ ہنسنے لگے لیکن اس کے بعد یوں ہوا کہ زرداری صاحب نے پھر مجھے اپنی کسی بریفنگ میں نہیں بلایا۔ اسی طرح ایک بار نواز شریف جب عدلیہ کی آزادی کے حوالے سے تحریک شروع کرنے لگے تو انہوں نے صحافیوں کو بلایا۔ میں بھی وہاں موجود تھا تو میں نے ان سے سوال کر دیا تو میاں صاحب نے اس کا جواب نہیں دیا۔ جب دوبارہ میں نے وہی سوال کیا تو ایک صاحب نے پیچھے سے آکر مجھے پکڑ کر زبردستی کرسی پر بٹھا دیا۔ یہ اس قدر شدید جھٹکا تھا کہ میں گرتے گرتے بچا۔ اس کے بعد نواز شریف نے بھی مجھے دوبارہ کسی پروگرام میں نہیں بلایا۔

عمران خان کے ساتھ میری وابستگی 23 سال پرانی ہے۔ میں پی ٹی آئی کے آغاز کے دنوں میں ان کے بہت قریب تھا اور ان کا میڈیا میں ہی چلاتا تھا۔ 1997ء کے الیکشن میں ان کا میڈیا انچارج میں ہی تھا۔ عمران خان پر بہت سے برے وقت آئے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ سیتا وائٹ کیس میں ہم ان کے ساتھ کھڑے تھے اور ایک دن اچانک کہیں سے دلشاد بیگم والا ایشو سامنے آگیا جس سے ملک میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ معاملہ بھی کسی طرح میں نے حل کیا تھا لیکن بہرحال میں اس کی کسی بھی طرح سے ذمہ داری لینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ایک مرتبہ زمان پارک میں عمران خان نے مجھے بلا کر جمائمہ خان سے ملوایا اور انہیں کہا کہ آپ ایثار رانا کا فون نمبر لے لو اور اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو تو ان سے رابطہ کر لیا کرو۔ جب عمران خان نے لاہور میں تاریخی جلسہ کیا اور ان کے گھر میں سینٹرل کمیٹی کا اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں طے ہونا تھا کہ عمران خان صبح کیا خطاب کریں۔ عمران خان کا ڈرائنگ روم بھرا ہوا تھا تو انہوں نے ایک ایک کا نام لے کر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کہا کہ مجھے کیا تقریر کرنی چاہیے۔ منصور صدیقی جو عمران خان کے بہت قریبی تھے وہ مجھے عمران خان کے پاس لے گئے تو اس پر عمران خان نے کہا کہ ایثار رانا ہماری سینٹرل کمیٹی کا ممبر تو نہیں ہے لیکن میں ان سے بھی رائے لوں گا۔ تو اس وقت میں نے خان صاحب کو یہ تجویز دی کہ آپ اپنی تقریر میں عالمی ایشوز اور بڑے بڑے قومی مسائل کو چھیڑنے کے بجائے عام مزدوروں، جھگیوں میں رہنے اور بھوک کے مرنے والوں کے حقوق کی بات کیجیے گا۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ اس سال کتنے لوگوں نے بھوک کی وجہ سے خودکشیاں کی ہیں تو اس پر انہوں نے کہا کہ آپ یہ سارے فگرز لکھیں اور تقریر کا حصہ بنائیں پھر انہوں نے اس پر تقریر بھی کی۔ میرے تین بیٹے اذان رانا، ایمان رانا اور حطیم رانا ہیں اور دو بیٹیاں دعا اور صوم ہیں۔ بس یہ تھی 1963ء سے 2019ء تک میری زندگی کی ایک داستان جسے میں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں میں فانی بدایونی کے اس شعر پر اپنی بات ختم کروں گا کہ

اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

(قومی ڈائجسٹ۔ جون 2019ء)

O……❄……O

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نامور ادیب، مصنف، بریگیڈیئر (ر)

صولت رضا

کی حیرت انگیز یادیں

معروف ادیب بریگیڈیئر (ر) صولت رضا کی محبت ہے کہ انہوں نے مجھے طویل وقت دیا اور اپنی یادداشتیں قلمبند کروائیں۔ وہ اسلام آباد میں تھے اور میں لاہور میں۔ میں روزانہ کی بنیاد پر انہیں مسلسل ''تنگ'' کرتا رہا۔ سوالات ترتیب دے کر انہیں سینڈ کرتا رہا اور وہ جواب میں مجھے اپنی یادیں باتیں لکھ کر ارسال کرتے رہے۔ یوں ایک بہترین کہانی وجود میں آ گئی۔ جناب صولت رضا نے مختلف فوجی اور سیاسی ادوار کو بہت قریب سے دیکھا۔ قومی ڈائجسٹ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ صولت رضا کی یادداشتیں پہلی بار اس کے صفحات پر شائع ہوئیں۔

www.currentnn.com

بریگیڈیئر (ر) صولت رضا 6 اکتوبر 1952ء کو سید رفاقت حسین کے ہاں پشاور میں پیدا ہوئے۔ جو ایک سرکاری ملازم کے طور پر وہاں متعین تھے۔ ابتدائی تعلیم ڈی پی نیشنل سکول ٹیونیشیا لائنز کراچی سے حاصل کی۔ ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن لاہور سے میٹرک، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے انٹرمیڈیٹ، اسلامیہ کالج سول لائنز سے بی اے اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے صحافت کیا۔ 1971ء میں پاک آرمی جوائن کی اور پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے تربیت حاصل کی۔ پاسنگ آؤٹ کے بعد توپ خانہ کی ایک یونٹ ''23 فیلڈ رجمنٹ آرٹلری'' میں تعینات کیے گئے۔ اکتوبر 1973ء میں ان کی خدمات مستقل طور پر پاک فوج کے شعبہ تعلقات عامہ ''انٹر سروسز پبلک ریلیشنز'' کے حوالے کر دی گئیں۔ جولائی 2003ء میں آئی ایس پی آر سے بطور بریگیڈیئر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ صولت رضا نے اپنی کتاب ''کاکولیات'' سے بہت شہرت پائی۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن 1975ء میں شائع ہوا اور اس کا 27 واں ایڈیشن 2012ء میں شائع ہوا۔ یہ معلوم ایڈیشنز کی تعداد ہے جو مصنف کے پبلشر نے شائع کیے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کے ''نامعلوم ایڈیشنز'' کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں زیرِ تربیت ایک

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کیڈٹ کی دلچسپ آپ بیتی ہے۔ پیش لفظ میں ممتاز ادیب بریگیڈیئر صدیق سالک نے لکھا: ''کیپٹن صولت رضا سنگلاخ فوجی زمین سے پھوٹنے والا ایک تازہ چشمہ ہے۔ اسی زمین سے پھوٹنے والے کئی چشمے مثلاً کرنل فیض احمد فیض، میجر چراغ حسن حسرت، میجر جنرل شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان اور میجر ضمیر جعفری پہلے ہی دریا اور پھر سمندر بن چکے ہیں۔ صولت رضا میں بھی چشمہ سے سمندر بننے کی صلاحیت موجود ہے''۔ لیجیے ان کی زندگی کی دلچسپ یادیں انہی کی زبانی سنتے ہیں۔ (کاوش و ترتیب: عبدالستار اعوان)

❍......❄......❍

میری پیدائش پشاور میں ہوئی جہاں میرے والد گرامی سید رفاقت حسین سرکاری ملازمت کے سلسلے میں تعینات تھے۔ قومی شناختی کارڈ کے مطابق میری تاریخ پیدائش چھ اکتوبر 1952ء ہے۔ بچپن کی ابتدائی یاد میں پشاور کے بجائے مشرقی پاکستان کا شہر ''کومیلا'' حاوی ہے۔ شہر کے قریب ہی چھاؤنی کا علاقہ تھا جس کے رہائشی علاقے میں واقع سرکاری کوارٹر میں سے ایک میں ہم رہتے تھے۔ ہم میں والد، والدہ اور میرے سمیت تین بچے تھے۔ دو بہنیں مجھ سے چھوٹی تھیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اسکول جانے کی عمر میں نہیں تھا۔ لہٰذا گھر پر ہی مقیم تھے۔ والد صاحب پشاور سے تبدیل ہو کر کومیلا چھاؤنی آ گئے تھے۔ ان کی ملازمت ملٹری انجینئرنگ سروسز (ایم ای ایس) کے سول سٹاف میں تھی۔ بچپن کی انمٹ یادوں میں گھر کے سامنے سرسبز میدان، شدید بارش، گھنے درخت، پرندوں کی دن بھر چہچہاہٹ اور صبح سویرے گائے کے دودھ کا گلاس پینا شامل ہے۔ اے بی سی اور الف انار، ب بکری کا قاعدہ بھی تھا۔ ایک اور خاص بات یہ کہ ڈھاکہ کے گلاب جامن تھے۔ والد صاحب جب بھی سرکاری کام کاج سے ڈھاکہ جاتے تو واپسی پر ہمارے لیے گلاب جامن ضرور لایا کرتے تھے۔ گلاب جامن کے بارے میں والدین کی گفتگو کے دوران پتہ چلا کہ ابا جی (والد گرامی) کا نام ''رضی کے ابا'' ہے۔

رضی میرا گھریلو نام تھا۔ یوں امی جان والد گرامی کو ''رضی کے ابا'' کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ کومیلا (مشرقی پاکستان) میں دو برس گزارنے کے بعد ''رضی کے ابا'' کی کراچی پوسٹنگ ہوگئی۔ ان کا دفتر ویسٹ وہارف کے قریب تھا لیکن رہائش کے لئے سرکاری کوارٹر ٹیونیشیا لائنز میں الاٹ ہوا تھا۔ یہ 1956ء کا ذکر ہے۔ کوارٹر ٹیونیشیا لائنز کراچی میں رہائش پذیر اکثریت سرکاری ملازمین کی تھی۔ یہ انگریز دور کی تعمیر کردہ بیرکس تھیں جنہیں رہائش گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہر گھر دو بڑے کمروں، صحن، برآمدوں، کچن، واش روم وغیرہ پر مشتمل تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے سڑک کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس پارسینٹ پیٹرکس سکول کی سپورٹس گراوَنڈ تھی جہاں صرف اسکول کے طلبہ ہی داخل ہو سکتے تھے۔اس گراؤنڈ کے اردگرد ہزاروں جھگیاں تھیں جہاں مہاجرین مقیم تھے۔مَیں کوارٹر ٹیونیشیا لائنز میں واقع ڈی پی نیشنل ہائی سکول میں جماعت اول میں داخل ہوا۔ پہلے روز امی جان نے لکیر دار پاجامہ اور ململ کا سفید کرتا پہنایا۔ تختی اور بستہ تھما کر میرے تایازاد بھائی توقیر مہدی کے حوالے کیا کہ اسے کلاس میں چھوڑ آؤ۔ کلاس میں بیٹھے چند سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ توقیر بھائی کو جاتا دیکھ کر واپس ان کے پیچھے پیچھے گھر آ گیا۔ والدہ محترمہ بہت ناراض ہوئیں۔ابھی ڈانٹ ڈپٹ ہو رہی تھی کہ والد گرامی گھر تشریف لائے۔انہوں نے اسکول کے بھگوڑے کی ایسی دھنائی کی جو آج بھی نہیں بھولتی۔ چھترول سے فارغ ہو کر انہوں نے توقیر بھائی سے کہا کہ اسے دوبارہ کلاس میں بٹھا کر آؤ۔ اب کبھی سکول سے نہیں بھاگے گا۔ واقعی سکول تو کیا ہم کبھی کالج یا یونیورسٹی کی کلاس سے بھی غیر حاضر نہیں رہے۔

کوارٹر ٹیونیشیا لائنز کے قریب جیٹ لائنز اور جیکب لائنز ہیں۔ جیکب لائنز میں میرے نانا سید رفیق احمد قیام پذیر تھے جو وفاقی حکومت کے محکمہ مالیات میں ملازمت کرتے تھے اور قیام پاکستان کے بعد دیگر مسلمان ملازمین کے ساتھ دہلی سے ہجرت کر کے کراچی آ گئے تھے۔ نانا جی ابتداء سے ہی دہلی میں مقیم تھے۔ انہوں نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا۔ میری والدہ محترمہ بتایا کرتی تھیں کہ پاکستان آنے والی ٹرین میں سفر کے دوران مسلسل بے پناہ مسرت اور ایک انجانے خوف کی کیفیت ہم پر طاری رہی تھی۔ والدہ بیان کرتیں کہ کس طرح ہم نے خون کے دریا عبور کر کے یہ وطن حاصل کیا تھا۔ والدہ صاحبہ بتاتی تھیں کہ ہم نے خود پاکستان کا پرچم بنایا اور اسے ٹرین کے انجن پر لہرا دیا تھا۔ میرے نانا جان ہمیشہ قومی لباس ہی زیب تن کرتے تھے۔ شیروانی، جناح کیپ، کرتا اور پاجامہ ہی پہنا کرتے۔ گھر میں اردو کا رواج تھا۔ البتہ جب پنجاب سے رشتہ دار آتے تو گھر میں پنجابی ہی کی گونج سنائی دیتی تھی۔ دراصل ہمارے خاندان کا تعلق ضلع نارووال کے ایک قدیم گاؤں سنکھترہ سے ہے جو اب تحصیل ظفروال میں شامل ہے۔ آغاز میں ضلع سیالکوٹ تھا۔ سنکھترہ کے سادات خاندان سے تعلق رکھنے والے مختلف خاندان بسلسلہ ملازمت و کاروبار وغیرہ پاکستان کے مختلف شہروں میں مقیم ہو گئے۔ ایک دو نسل کے بعد وہیں کے ہو رہے۔ نانا جی کا خاندان پہلے ''دہلی والے'' کہلاتے پھر ''کراچی والے'' ہو گئے۔ نانا جی ریٹائر ہوئے تو میرے اکلوتے ماموں سید سعید الحسن لاہور میں واپڈا ہیڈ کوارٹرز میں تعینات تھے۔ لہذا ''کراچی والے'' کچھ عرصے بعد ''لاہور والے'' ہو گئے۔ سنکھترہ سے آبائی تعلق رکھنے والے متعدد گھرانے اندرون سندھ آباد ہیں اور ان کی گھریلو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

زبان سندھی ہے۔ بیرونی ممالک بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ اکثر تقریبات میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ تاہم گاؤں میں ان کی آمد سیاح کے طور پر ہوتی ہے کیونکہ آبائی گھر مسمار ہو چکے ہیں یا اردگرد کے مقامی افراد نے قبضہ کرلیا ہے۔ ہمارے آبائی گاؤں کے حوالے سے سید نذیر نیازی اپنی کتاب ''اقبال کے حضور'' میں رقمطراز ہیں کہ: ''ایک روز علامہ اقبالؒ نے اپنے خاندان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ان کے آباؤ اجداد نے قبول اسلام کے بعد کشمیر سے ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں سنکتھرہ ہجرت کی اور برسوں یہاں مقیم رہے''۔ سنکتھرہ میں قیام کے دوران ایک بار کسی غیر مسلم جاگیردار نے سادات خاندان کے سربراہ سے کہا کہ وہ اپنے سید ہونے کا ثبوت پیش کرے۔ جاگیردار کا اصرار تھا کہ سادات کو آگ نقصان نہیں پہنچاتی لہذا بزرگ سید کو اپنا نسب صحیح ثابت کرنے کے لیے آگ کے الاؤ میں بیٹھنا ہوگا۔ جاگیردار کے حکم پر آگ روشن کی گئی۔ بزرگ سید ایک سبز عبایا اوڑھ کر آگ میں بیٹھ گئے۔ سیکڑوں افراد جاگیردار کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب آگ سرد ہوئی تو بزرگ قرآنی آیات کی تلاوت فرماتے ہوئے زندہ موجود تھے۔ اس واقعہ کے بعد جاگیردار معافی کا طلب گار ہوا اور اپنے خاندان اور دیگر ہم ذات لوگوں کو تلقین کی کہ سادات کے ساتھ عزت و تکریم کے ساتھ پیش آئیں اور محلّہ سادات میں ننگے پاؤں داخل ہوا کریں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ بزرگ سید نے ان کے خاندان کو خصوصی دعا دی اور وہ سیالکوٹ شہر چلے گئے جہاں کاروبار کی بدولت حالات بہت بہتر ہوئے، اس کے ساتھ تعلیم اور علم کے میدان میں بھی خاندان کے افراد ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ علامہ اقبال کے خاندان کے حوالے سے ہمارے بزرگ بھی مختلف اجتماعات میں واقعات بیان کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھے تھے۔

ڈی پی نیشنل ہائی سکول لائنز ایریا کراچی میں کلاس نہم تک تعلیم حاصل کی۔ کلاس نہم کا امتحان بھی بورڈ کا تھا۔ بدقسمتی سے امتحان شروع ہونے سے ایک ماہ قبل مجھے ٹائی فائیڈ نے آگھیرا۔ شدید بخار اور تکلیف کے باعث موزوں تیاری نہ ہوسکی۔ رول نمبر سلپ مل چکی تھی۔ اس دوران والد گرامی کو کراچی سے لاہور پوسٹنگ کا حکم نامہ مل گیا طبیعت ذرا سنبھلی تو امتحان میں شرکت کا فیصلہ کرلیا۔ طارق روڈ کے قریب ایک سرکاری سکول سنٹر تھا۔ نانا جی مجھے روزانہ کمرہ امتحان تک پہنچاتے اور پرچہ مکمل ہونے تک باہر برآمدے میں بیٹھے رہتے تھے۔ میں ان کی بڑی بیٹی کا بڑا بیٹا تھا۔ یوں ننھیال پیار اور شخصیت کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک دو پرچے بخار کی کیفیت کے باعث مکمل نہ ہوئے۔ جماعت نہم کا نتیجہ اعلان سے قبل واضح تھا۔ لاہور پہنچے تو عارضی قیام ماڈل ٹاؤن میں مقیم والد گرامی کی بڑی ہمشیرہ کے ہاں کیا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ابھی لاہور چھاؤنی میں سرکاری گھر الاٹ نہیں ہوا تھا۔ مجھے ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن میں جماعت دہم میں داخل کرادیا گیا، نہم اور دہم کا امتحان ایک ساتھ ہوتا تھا لہٰذا اسکول میں دہم اور اسکول کے باہر نہم کی تیاری شروع ہوگئی۔ یہ سن ساٹھ /باسٹھ کا ماڈل ٹاؤن تھا۔ انتہائی پر سکون بستی، جہاں سب جان پہچان والے خاندان آباد تھے۔ آم، جامن کے درختوں کی بہتات اور ایف سی کالج نہر کے پانی کی روانی۔ ماڈل ہائی سکول سی بلاک کے ایک پرائیویٹ گھر میں قائم تھا۔ انگریزی کے ماسٹر خدابخش صاحب تھے۔ ان کا جلال بہت مشہور تھا، دو تین مرتبہ میرے ہاتھ بھی بید زنی کا نشانہ بنے۔ ایک مرتبہ کلاس سے نکل کر سکول کی گھنٹی بجادی تو پکڑے گئے اور سیدھے ماسٹر خدابخش کے روبرو رضاکارانہ اقبال جرم کے باوجود خوب دھنائی ہوئی۔

ماڈل ٹاؤن میں کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کے لیے وسیع وعریض گراؤنڈ موجود تھے۔ ہم نے بھی جی بلاک میں کرکٹ ٹیم بنارکھی تھی۔ بہرحال ماڈل ٹاؤن سے بہت خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ والدصاحب کو جب لاہور چھاؤنی میں گھر ملا تو میں میٹرک پاس کر چکا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈی پی نیشنل ہائی سکول لائنز ایریا کراچی اور ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن لاہور کے اساتذہ کرام کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ یقین جانیے کہ جس دل جمعی اور استقامت کے ساتھ اساتذہ ہم ایسے طالب علموں کی تعلیمی استطاعت بڑھانے کے لیے کوشاں رہتے تھے، وہ ہر لحاظ سے مثالی رویہ تھا۔

سکول کے بعد اسلامیہ کالج ریلوے روڈ مرکز نگاہ تھا۔ سبز پاکستانی کلر کا کوٹ، گرے رنگ کی پتلون، سفید شرٹ اور گرین وائٹ ٹائی۔ اس ڈریس کی اپنی ہی ایک شان تھی۔ لاہور چھاؤنی سے اومنی بس سروس کی ڈبل ڈیکر بس ریلوے سٹیشن تک آتی تھی۔ اسٹیشن سے کالج تک پیدل راستہ طے ہوتا تھا۔ کالج بروقت پہنچنے کے لیے گھر کے قریب بس سٹاپ پر پہنچتے تھے۔ ڈبل ڈیکر بس میں اوپر کی منزل میں کھڑکی کے پاس بیٹھنے کا جنون تھا۔ بس کارڈ بنا ہوا تھا۔ راستے میں دو تین کلاس فیلو بھی بس میں سوار ہوتے تھے۔ یوں آخری سٹاپ ریلوے سٹیشن سے کالج تک پیدل مارچ کی بوریت ختم ہوجاتی تھی۔ بغیر ٹکٹ سفر کا تصور نہیں تھا۔ لاہور اومنی بس بہت بڑی سہولت تھی۔ بعد میں جی ٹی ایس بس سروس کی طرح یہ سروس بھی لاپتہ ہوگئی اور ہمارے ایسے کئی ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں بہترین اساتذہ موجود تھے۔ انگریزی پروفیسر اقبال صاحب جبکہ اردو ڈاکٹر احرار نقوی پڑھاتے تھے۔ میں آرٹس میں سوکس اور اکنامکس کا طالب علم تھا۔ غیر نصابی سرگرمیاں اور سپورٹس عروج پر تھے۔ کالج کے وائس پرنسپل مولانا علم الدین سالک کا سراپا تو آج بھی گیٹ پر بلیک رول تھامے نظر آتا ہے۔ شیروانی اور شلوار میں ملبوس جناح کیپ پہنے ہر آنے والے طالب علم کو شیر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہ اگر آنکھیں چار ہو جائیں تو خون کی روانی رک جائے۔ کالج ڈریس میں معمولی کوتاہی بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ تاخیر سے آنے والوں کے لیے جواب طلبی کے لمحات مزید ''اذیت ناک'' تھے۔ کالج آئے چند ماہ گزرے ہوں گے کہ گورنمنٹ کالج لاہور سے کرکٹ فائنل میچ کی نوبت پہنچ گئی۔ اقبال پارک میں معرکہ برپا تھا تو یہی پروفیسر علم الدین سالک صاحب طلباء کے ساتھ کالج ٹیم کا حوصلہ بڑھانے میں پیش پیش تھے۔ گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج کے مابین سپورٹس کے معرکے ہر لحاظ سے بین الاقوامی معیار کے ہوتے تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم، ٹیموں کا چناؤ اور میدان میں مکمل وابستگی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔ کسی کالج کے لیے شکست تو ناممکنات میں تھی۔ ریلوے روڈ کی ٹیم کالج کی گراؤنڈ میں ہی نیٹ پریکٹس کرتی تھی۔ کبھی کبھار میں بھی بالنگ یا باؤنڈری کے باہر جاتی ہوئی گیند اٹھانے پر از خود ہی مامور ہو جاتا تھا۔ لیکن میرے لیے بیٹنگ کرنا بہت مشکل تھا۔ دراصل کلاس کے طالب علم اور میدان کے طالب علم دو مختلف ''راہیں'' تھیں۔

میرے خاندانی پس منظر اور حالات میں کرکٹ محض مشغلہ تھا۔ والد صاحب بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بہترین سامان خرید کر دیا تھا۔ لیکن اولین ترجیح تعلیم ہی تھی۔ اتوار کرکٹ کے لیے مختص تھا۔ لاہور چھاؤنی کی شاید ہی کوئی گراؤنڈ رہ گئی ہو جہاں ہم نے دن بھر کرکٹ نہیں کھیلی۔ البتہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی ٹیم میں شمولیت خواب ہی رہا۔ اس زمانے میں سلیکشن کا معیار بہت بلند تھا اور گورنمنٹ کالج لاہور سے مقابلے کے باعث میرٹ کو اہمیت حاصل تھی۔ تقریباً ایسا ہی ماحول گورنمنٹ کالج میں تھا۔ وہاں بھی سپورٹس کے میدان میں پیش قدمی کے لیے سخت محنت مطلوب تھی۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے دور کا ایک اہم واقعہ انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ تھا جو کالج گراؤنڈ میں منعقد ہوا۔ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مہمان خصوصی تھے۔ انجمن کے صدر سید محسن شاہ (جسٹس نسیم حسن شاہ کے والد گرامی) اور دیگر اکابرین ڈائس پر موجود تھے۔ مجھے دیگر ہم جماعت طلبا کے ہمراہ سٹیج کے نزدیک بٹھایا گیا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کو دوسری مرتبہ بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل کراچی میں قیام کے دوران ایوب خان کو برطانوی ملکہ ایلزبتھ کے ہمراہ کھلی کار میں ڈرگ روڈ (موجودہ شاہراہ فیصل) سے گزرتے دیکھا تھا۔ ہم گورا قبرستان کے ساتھ فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ ایک کھلی کار میں جو معمول سے کم رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی، ایوب خان اور ملکہ برطانیہ سوار تھے۔ ایوب خان بلند قامت، سرخ وسپید چہرہ اور اس پر شاندار وردی کی چمک۔ قریب ملکہ برطانیہ خوبصورت گڑیا کی مانند ہم رکاب تھیں۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مجھے یاد ہے کہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے صدر پاکستان نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے طلبا کی تحریک پاکستان میں گرانقدر خدمات کوخراج تحسین پیش کیا۔ انہوں نے اپنی مادر علمی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بھی بڑے فخر کے ساتھ ذکر کیا۔ انجمن حمایت اسلام کے کامیاب جلسے کی خوشی میں کالج میں دو روز کی تعطیل کا اعلان کیا گیا جسے ہم نے فیلڈ مارشل ایوب خان کی جانب سے تحفہ قرار دیتے ہوئے فلک شگاف نعرے بازی کی۔ میرا 1962-1964ء کا سیشن تھا۔ اساتذہ کرام سلیبس مکمل کرانے کی سعی میں مصروف تھے۔ ہماری توجہ کے اصل مراکز کرکٹ گراؤنڈ اور حبیبیہ ہال تھے۔ کالج کی غیر نصابی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ حبیبیہ ہال میں ہفتہ وار اہم شخصیات کے لیکچرز میں حاضری لازمی تھی۔ ایک اور واقعہ یاد آیا۔ چوک دال گراں میں پٹھورے چنے کا ٹھیلا تھا۔ میں کالج سے واپسی پر چندمنٹ کے لیے رکتا اور ہلکی پھلکی پیٹ پوجا کر کے پیدل اسٹیشن روانہ ہو جاتا تھا۔ ایک روز یہ نیک عمل انجام دے رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے کان مروڑتے ہوئے انگریزی میں ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ یہ ہمارے انگریزی کے پروفیسر اقبال صاحب تھے جو سائیکل پر دھرم پورہ سے کالج آتے تھے۔ انہوں نے کالج یونیفارم میں ٹھیلے پر لنچ تناول کرنے پر غم و غصے کا اظہار کیا۔ اگلے روز کلاس میں بھی نشست سے کھڑا کر کے دوبارہ جھاڑ پلائی۔ قریب تھا کہ ایک دو بید بھی رسید کر دیتے لیکن انہیں رحم آ گیا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد فطری ترجیح اسلامیہ کالج سول لائنز تھا۔ لازمی انگریزی کے ساتھ اکنامکس اور پولیٹیکل سائنس اہم مضامین تھے۔ اس کالج میں بھی دو برس 1966-1967ء بھرپور طور پر گزرے۔ پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ پروفیسر گلزار محی الدین تھے جب کہ ہمارے کلاس لیکچرار پروفیسر محمد سرور تھے۔ انگریزی پروفیسر ایرک سپرئین اور پروفیسر امین مغل ایسے ماہر اساتذہ کے حوالے تھی۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ ہو یا سول لائنز، فیکلٹی ممبران کی اکثریت کی صلاحیت، قابلیت اور تدریس سے لگاؤ بہت مثالی تھا۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان کا دیدار نصیب ہوا تو اسلامیہ کالج سول لائنز میں ایوب خان کے ناراض ساتھی اور سابق وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو سے مصافحہ قسمت میں لکھا تھا۔ بھٹو صاحب لاہور میں پیپلز پارٹی کے قیام کے سلسلے میں قیام پذیر تھے۔ ہمارے ایک پرجوش ساتھی راشد بٹ (مرحوم) نے کالج انتظامیہ سے ضد کر کے بھٹو صاحب کو کالج مدعو کرنے کی ٹھان لی۔ یہ پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کا فنکشن تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو اپنی شعلہ بیانی اور مخصوص انداز تخاطب کے باعث عوام میں روز بروز مقبول ہو رہے تھے۔ خاص

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

طور سے نوجوان ان کے شیدائی تھے۔ اسلامیہ کالج سول لائنز کے وسیع لان میں شامیانہ نصب کیا گیا۔ صدر شعبہ پروفیسر گلزار محی الدین خود نگرانی کر رہے تھے۔ راشد بٹ کی خوشی دیدنی تھی۔ بھٹو صاحب تشریف لائے۔ خطبہ استقبالیہ کے بعد پر جوش خطاب شروع ہو گیا۔ میں ڈائس کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ کر بھٹو صاحب کی تقریر سن رہا تھا جو بین الاقوامی مسائل اور مستقبل کی سیاست کا احاطہ کر رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس اجتماع میں بھٹو صاحب نے بیگم زاہدہ خلیق الزمان پر پھبتی کسی جو آئندہ کئی دن تک اخبارات میں موضوع بحث رہی۔ بھٹو صاحب کامیاب جلسے کے بعد اسلامیہ کالج سول لائنز سے روانہ ہو گئے اور راشد بٹ کو اساتذہ اور طلبہ سے مبارکباد وصول کرنے کے لیے چھوڑ گئے۔

گریجوایشن کے بعد ایم اے (ماسٹر ڈگری) میں داخلے کا مرحلہ تھا۔ میری دلچسپی وکالت اور صحافت کی جانب تھی۔ وکالت سے پسندیدگی کا سبب قائداعظم محمد علی جناح کی مثالی شخصیت تھی۔ ہمارے گھر میں بچپن سے روزنامہ اخبار آتا تھا۔ شاید گوشت، سبزی یا کسی اور شئے کا ناغہ ہو جائے لیکن اخبار کا کبھی ناغہ نہیں ہوا تھا۔ مشرقی پاکستان میں بھی والد صاحب باقاعدگی سے نوائے وقت لاہور بذریعہ ڈاک منگوایا کرتے تھے۔ تب مجھے پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا لیکن ''نوائے وقت'' کی پیشانی تصویر کی صورت میں آج بھی یاد ہے۔ کراچی پہنچے تو روزنامہ انجام شروع ہو گیا۔ اپنی بساط کے مطابق ہجے کر کے خبریں پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ نانا جی کے گھر جیکب لائنز میں ''ڈان'' اخبار کا بسیرا تھا۔ کراچی سے والد صاحب کی پوسٹنگ لاہور ہو گئی تو ''انجام'' کی جگہ روزنامہ مشرق نے لے لی۔ مشرق ایک مکمل اخبار تھا۔ اس کے بانی عنایت اللہ نے جدید خطوط پر نئی طرز کے روزنامے کی بنیاد رکھی جو بے حد کامیاب رہی۔ خبریں، اداریے اور کالم، فیچر، تصاویر اور سب سے بڑھ کر کئی رنگوں میں پرکشش اشاعت۔

قصہ مختصر کہ میں نے لاء کالج اور شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس میں داخلے کے لیے فارم پر کر دیئے۔ لاء کالج سے انٹرویو کی کال آ گئی۔ دوسری جانب شعبہ صحافت میں پہلے تحریری امتحان ہوا اور اس کے بعد انٹرویو کا مرحلہ درپیش تھا۔ تحریری امتحان پاس کرنے کے بعد انٹرویو کی قطار تھی، جب میری باری آئی تو میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی کتاب ''فن صحافت'' اور اپنے چند شائع شدہ مضامین تھامے صدر شعبہ صحافت کے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب کے ساتھ مسکین حجازی، جناب وارث میر، جناب مہدی حسن اور جناب محی الدین احمد تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے مضامین پر سرسری نگاہ ڈالی جو ''نوائے وقت'' کے تعلیمی صفحے میں شائع ہوئے تھے۔ محترم وارث میر نے ''فن صحافت'' کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کہ کل فیروز سنز سے یہ کتاب خریدی ہے اور ابھی پہلا باب ہی پڑھا ہے۔ بہر حال انٹرویو ختم ہوا۔ میں باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب بڑھا اور جان بوجھ کر اپنی رفتار آہستہ کر دی، دروازے سے نکلتے ہوئے مجھے جناب عبدالسلام خورشید کی آواز سنائی دی ''میرا خیال ہے چل جائے گا'' باقی تمام محترم ممبران نے جی جی کہا۔ اب میں پورے اطمینان کے ساتھ شعبہ صحافت سے گھر روانہ ہوا۔ دو روز بعد کامیاب امیدواروں کی فہرست نوٹس بورڈ پر چسپاں تھی اور دس بارہ طلباء و طالبات کے بعد میرا نام بھی تھا۔ کل پچیس سلیکٹ ہوئے تھے جن میں تیرہ طالبات اور بارہ طلباء تھے۔

1969-70ء کے سیشن میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں داخلے سے قبل پروفیسر وارث میر سے میری شناسائی نہیں تھی۔ یہ شعبہ اب ترقی کی کئی منازل طے کر چکا ہے اور شعبہ ابلاغیات (ماس کمیونی کیشن) کہلاتا ہے۔ خیر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ تحریری امتحان اور انٹرویو کے مراحل کامیابی سے طے ہو گئے اور ہم ایک روز سیاہ گون پہن کر ایم اے صحافت کی کلاس میں داخل ہوئے تو کامرانی کے احساس سے حد نگاہ تک فضا چکا چوند تھی۔ اساتذہ کرام میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صدر شعبہ تھے، جو اپنی قابلیت، تجربے اور صحافتی اثر و رسوخ کے باعث سایہ دار شخصیت کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر مسکین حجازی، وارث میر، پروفیسر مہدی حسن اور پروفیسر محی الدین نمایاں تھے۔ پروفیسر محی الدین کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور بنگلہ دیش کے وجود میں آتے ہی وہ ڈھاکہ واپس چلے گئے۔

والد صاحب کا اصرار تھا کہ میں وکالت یا ایم اے پولیٹیکل سائنس کی ڈگری حاصل کر کے مقابلے کے امتحان سی ایس ایس میں قسمت آزمائی کروں، ادھر ہم پر ''مخلوط'' صحافت کا جادو چل چکا تھا۔ شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی میں داخلے کے بعد زندگی کے شب و روز بدل گئے۔ کرکٹ سے فاصلے بڑھ گئے۔ شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس میں انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کی عمارت کی بالائی منزل میں تھا۔ کلاس روم کے برآمدوں سے نہر دکھائی دیتی تھی۔ ہمارے زمانے میں نہر کے اُس پار سڑک تھی۔ شعبہ صحافت اور نہر کے مابین ایک سرسبز میدان تھا جہاں ہم آف پیریڈ میں منڈلی جمائے رکھتے تھے۔ نہر کنارے واقع ٹی سٹال بھی ہماری سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا جہاں ہاف سیٹ یا فل سیٹ چائے پر کئی گھنٹے ''لیفٹ رائٹ'' کرتے رہتے تھے۔ یہ لیفٹ رائٹ عسکری نہیں بلکہ نظریاتی تھی۔ دایاں بازو اور بایاں بازو کی تقسیم در تقسیم نے یونیورسٹی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سیاسی نظریاتی اور فکری بحث مباحثہ میں طلباء و طالبات کی مختصر تعداد ہی ''ملوث'' تھی۔ اکثر کے کلاسز کے بعد مشاغل کچھ اور ہی نوعیت کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تھے۔ یونیورسٹی کیفے ٹیریا فاصلے پر تھا وہاں خاص مواقع پر ہی بزم دوستاں سجا کرتی تھی۔

پنجاب یونیورسٹی میں دو برس کا قیام لاتعداد خوشگوار یادیں اور سحر انگیز لمحات سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ ناخوشگوار واقعات کا بھی ایک سلسلہ ہے۔ یہ دنیا کی دھوپ چھاؤں ہے جس کا اصل ادراک عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ شعبہ صحافت میں ابھی جان پہچان کے دور ہی سے گزر رہے تھے کہ ایک روز استاد مکرم پروفیسر مسکین علی حجازی نے مجھے اور ہم جماعت اجمل ملک مرحوم (سابق ڈائریکٹر محکمہ تعلقات عامہ خیبر پختونخواہ) کو چیئرنگ کراس کے بس سٹاپ پر کھڑے دیکھ کر اپنی کار روک لی۔ ہم سمجھے کہ شاید کار میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے لہذا دھکا وغیرہ لگانا ہو گا۔ انہوں نے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سروس روڈ سے ہوتے ہوئے شاہ دین بلڈنگ کے قریب کار پارک کر دی۔ حجازی صاحب گاڑی سے باہر آئے اور ہم دونوں کو اپنے ہمراہ نوائے وقت کے دفتر لے گئے۔ تب نوائے وقت شاہ دین بلڈنگ سے شائع ہوتا تھا۔ بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے فرمانے لگے کہ کلاسز ختم ہونے کے بعد ادھر ادھر گھومنے کے بجائے عملی صحافت سیکھو، زندگی میں کام آئے گی۔ نوائے وقت میں سینئر نیوز ایڈیٹر سید ظہور عالم شہید (مرحوم و مغفور) تشریف فرما تھے۔ انہوں نے چند سوالات کیے اور ہم دونوں کو سینئر سب ایڈیٹر ممتاز ملک صاحب کے حوالے کر دیا جنہوں نے اے پی پی کی انگریزی کریڈ ترجمے کے لیے ہمارے آگے بڑھا دی۔ اب اجمل ملک کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہم چھ بجے سے نو بجے شب کا فلم شو الفلاح سینما میں دیکھنے کے لیے ''زادہ راہ'' ہمراہ لائے تھے۔ ادھر حجازی صاحب نے عملی صحافت سیکھنے پر مامور کر دیا تھا۔ بہر حال کسی طرح نصف شب تک خبریں ترجمہ کرتے رہے اور پورے نیوز روم میں ہماری قابلیت کی قلعی وقفے وقفے سے کھلتی گئی۔

''اوئے تہاڈے استاد کیہ پڑھاندے نیں۔ تسی تے دو لائناں لکھ نئیں سکدے''۔

''تہانوں انٹرویو دا پتہ نئیں''۔

کسی نے آواز لگائی کہ ''فارغ کر دوان دونوں کو''۔

آخر کار ظہور عالم شہید صاحب نے فیصلہ سنایا کہ کل سے شام چھ بجے باقاعدہ آنا ہو گا۔ اپرنٹس کے دو سو روپے ماہانہ ملتے ہیں۔ رات دو بجے تک ڈیوٹی ہو گی۔ شاہ دین بلڈنگ سے باہر آئے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہم نے کرایہ بانٹ کر رکشا لیا اور نیو کیمپس پہنچ گئے۔ اپرنٹس سب ایڈیٹر دو سو روپے ماہوار اور رات دو بجے تک ڈیوٹی۔ کبھی اجمل ملک لڑکھڑا جاتا اور کبھی میں مایوسی کا شکار ہو جاتا تھا۔ دن نکلا۔ ہوسٹل سے کلاس روم پہنچے تو پروفیسر حجازی صاحب نے سلام کا جواب دینے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے بعد کہا کہ دوسو روپے ماہانہ کافی ہوں گے۔ شاباش۔ اور ہماری شب بیداری کا مژدہ پوری کلاس کو سنا دیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم سے پہلے بھی کچھ طالب علم جن میں توصیف احمد خان اور محمد علی چراغ شامل تھے اخبارات میں ہم سے بہتر اپرنٹس شپ مشاہرہ پر کام کر رہے تھے۔ نوائے وقت کا کنٹرول دوبارہ بیگم حمید نظامی صاحبہ نے سنبھال لیا تھا اور جناب مجید نظامی نوائے وقت کو خیر باد کہنے کے بعد روزنامہ ندائے ملت کا اجراء کر چکے تھے۔ یوں شعبہ صحافت کے طلبا و طالبات کی کثیر تعداد کو عملی صحافت میں قسمت آزمائی کے مواقع میسر آ گئے۔ شب بیداری کے باعث کلاس میں آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ تاہم دماغ سو رہا ہوتا تھا۔ اس کیفیت میں متعدد بار اساتذہ کرام کے تند و تیز ریمارکس کا سامنا بھی رہا۔ یہ محض ابتدائی ایام کی کیفیت تھی۔ آہستہ آہستہ ہمارے نوائے وقت میں قدم جمنا شروع ہو گئے۔ میں باقاعدگی سے ''کیمپس ڈائری'' لکھتا تھا جس میں یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی تقریبات، تعلیمی مسائل اور دیگر امور کا تذکرہ شامل تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ شعبہ صحافت سے باہر بھی پذیرائی مل رہی ہے۔ جان پہچان کا دائرہ دیگر شعبہ جات میں وسیع ہونے کے باوجود ہماری ''جان'' شعبہ صحافت ہی میں تھی۔

اس وقت فیلڈ مارشل ایوب خان کے خلاف متحدہ حزب اختلاف کی ملک گیر تحریک کامیاب ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں فیلڈ مارشل ایوب خان کی جگہ تازہ دم جنرل آغا محمد یحییٰ خان کسی رکاوٹ کے بغیر ایوان اقتدار میں داخل ہو گئے۔ پورے ملک میں امن وامان بحال ہو گیا اور وطن عزیز کے نئے سربراہ نے منصفانہ اور جماعتی انتخابات کا اعلان کر کے عوام کے دل جیت لیے۔ لیکن یہ کس کو معلوم تھا کہ شفاف ترین انتخابات کے نتائج ہی ملک کو دولخت کر دیں گے۔ اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے در و دیوار بھی ''ایشیا سرخ'' اور ایشیا سبز'' کے نعروں سے گونجتے تھے۔ کلاس رومز میں اسلام، سوشلزم اور نیشنل ازم کے حوالے سے بہت بحثیں ہوتی تھیں۔ شعبہ صحافت میں بھی یہ معرکہ زوروں پر تھا۔ انہی دنوں یونیورسٹی یونین کے انتخابات سر پر آ گئے۔ زبردست معرکہ برپا تھا۔ صدر کے لیے حافظ ادریس (اسلامی جمعیت طلبہ) اور لیفٹ الائنس کے حمایت یافتہ جہانگیر بدر (این ایس ایف / این ایس او وغیرہ) کے مابین سخت مقابلہ ہوا۔ حافظ صاحب کامیاب ہو گئے۔ نائب صدر سید تنویر عباس تابش اور جنرل سیکرٹری عبدالحفیظ خان منتخب ہوئے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے حامی امیدوار واضح برتری سے جیت گئے لیکن ہارنے والے امیدواروں نے دھاندلی کا الزام لگایا اور ہنگامے شروع ہو گئے۔ ہر طرف ''حق اور باطل'' کا ایک معرکہ برپا تھا۔ نوبت مار کٹائی، وائس چانسلر کی رہائش گاہ پر حملے اور پھر فوجی عدالت تک جا پہنچی۔ حافظ محمد ادریس اور جہانگیر بدر کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ووٹوں میں ایک سو کا فرق تھا جو بار بار گنتی کے باوجود برقرار رہا۔ بہر حال ہنگامے ختم نہ ہوئے۔ وائس چانسلر علامہ علاء الدین صدیقی وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے لاء کالج کے پرنسپل پروفیسر امتیاز علی شیخ کی سربراہی میں کمیٹی قائم کردی۔ رات گئے وائس چانسلر ہاؤس میں چند طلباء نے ہنگامہ آرائی کی، پولیس آگئی، گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ ملک میں مارشل لاء نافذ تھا۔ کیس ملٹری کورٹ کے سپرد کر دیا گیا۔ پولیس نے دونوں جانب کے سرکردہ طلبہ کو گرفتار کر لیا تھا۔ ملٹری کورٹ نے ایک ایک برس کی سزا سنادی۔ چند بری بھی ہوئے ان میں منتخب جنرل سیکرٹری عبد الحفیظ خان اور میرے ہم جماعت اجمل ملک بھی شامل تھے۔ ملٹری کورٹ میں سماعت کے دوران وائس چانسلر علامہ علاؤ الدین صدیقی سمیت متعدد اساتذہ کرام اور طلبہ کو گواہی کے لیے طلب کیا گیا۔ ملٹری کورٹ کے سربراہ لیفٹیننٹ کرنل آفریدی تھے جو دوران سماعت ملزمان اور گواہوں سے نوک دار سوالات پوچھتے تھے۔ خاص طور پر ان کا یونیورسٹی کے حالات پر تبصرہ بہت عرصہ تک زیر بحث رہا کہ غریب والدین بچوں کو یہاں پڑھنے لکھنے کے لیے بھیجتے ہیں، ہتھکڑیاں لگا کر عدالتوں میں چکر کاٹنے کے لیے نہیں۔

موصوف نے وائس چانسلر سے بھی یونیورسٹی میں ہنگامہ آرائی، یونین سازی اور تعلیم کے دورانیہ کے بارے میں بھی سوالات کیے۔ شعبہ صحافت کے صدر ڈاکٹر عبد السلام خورشید اور مسکین علی حجازی صاحب بھی حاضری رجسٹر اٹھائے عدالت میں آئے اور یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ جب ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی اس وقت طالب علم کلاس رومز میں تھے۔ سزا یافتہ طالب علم کچھ عرصہ لاہور جیل میں رہے پھر انہیں مختلف جیلوں میں منتقل کر دیا گیا۔ ابتلاء کے اس ناقابل فراموش دور میں پروفیسر وارث میر نے طالب علموں کو راہِ راست پر لانے کی بھرپور کوشش کی۔ یونین سازی کا سارا جوش و خروش ختم ہو چکا تھا۔ چند روز بحث مباحثہ ہوا، اساتذہ کرام اور طلبہ و طالبات کی تمام تر توجہ دوبارہ پڑھائی پر مرکوز ہوگئی۔

ہمارے زمانہ طالب علمی میں پنجاب یونیورسٹی کے بوائز ہاسٹل کی تعداد کم تھی۔ لہذا کرائے کے چند گھروں میں عارضی انتظامات کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ماڈل ٹاؤن لاہور میں تھا۔ وارث میر صاحب اس عارضی ہاسٹل کے وارڈن بھی رہے۔ ماڈل ٹاؤن سے براستہ ''بے آباد'' گارڈن ٹاؤن سے پنجاب یونیورسٹی جاتے سائیکل سوار وارث میر کی نظر میں ہم تین چار پیدل طالب علم آتے تو وہ سائیکل سے اتر کر پیدل سفر شروع کر دیتے۔ شارٹ کٹ کے لئے ہم یونیورسٹی کے سرسبز کھیتوں میں داخل ہو جاتے۔ اس زمانے میں آہنی جنگلے نہیں لگے تھے۔ یوں وارث میر صاحب کی ہمراہی ہی میں ہماری اوپن کلاس ہو جاتی تھی۔ وارث میر صاحب کی عالمانہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

فصاحت کے دوران ''لیس سر'' اور جی سر کے ساتھ کھیت کی پگڈنڈی پر استادِ مکرم کی سائیکل کو سنبھالے رکھنا اہم مرحلہ ہوتا۔ سائیکل کا ہینڈل توصیف احمد خان (آج کل سینئر صحافی) کے پاس ہوتا اور پچھلا پہیہ کیریئر کی مدد سے میرے کنٹرول میں تھا۔ یوں ہم آدھ پون گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد یونیورسٹی پہنچ جاتے جہاں موجود چپڑاسی میر صاحب کی سائیکل کو احتیاط کے ساتھ پارک کر دیتا۔ اس زمانے میں صدر شعبہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید بھی تھری پیس سوٹ پہن کر سائیکل چلاتے ہوئے یونیورسٹی آیا کرتے تھے۔

پروفیسر وارث میر ہماری کلاس کو لینگوئج اینڈ لٹریچر (زبان اور ادب) پڑھاتے تھے۔ ان کے لیکچر دلچسپ، معلوماتی اور موضوع سے ہم آہنگ ہوتے تھے۔ بھرپور تیاری کے بعد کلاس میں داخل ہوتے ہی چھا جاتے تھے۔ انداز خطیبانہ تھا۔ لیکن ہمارے سوالات کے جواب مشفقانہ لہجے میں عنایت فرماتے۔ کلاس میں طالبات کی اکثریت تھی اور آغاز میں ابتدائی دو قطاریں ان کے لیے مخصوص ہو گئیں۔ لڑکے تیسری قطار میں باادب انداز میں براجمان ہوتے تھے۔ میر صاحب لیکچر کے دوران زیادہ تر تیسری قطار ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے۔ لیکن چند ہفتوں کے بعد جب قطاریں تتر بتر ہو گئیں تو میر صاحب کی نگاہ میں سب یکساں ہو گئے۔ جلد ہی میر صاحب کا ہماری کلاس سے دوطرفہ ابلاغ استوار ہو گیا تو زیادہ کھل گئے۔

پروفیسر وارث میر بنیادی طور پر ایک غیر نصابی ٹیچر تھے۔ انہیں احساس تھا کہ طالب علموں کے نزدیک سلیبس کی اہمیت صرف پینتالیس منٹ کے پیریڈ تک محدود ہے لیکن نصاب میں سے ابھرنے والے بظاہر غیر نصابی سوالات کی مدت حیات کا تعین مشکل ہے۔ انہوں نے بھری کلاس میں ایسے موضوعات پر بھی اظہار رائے کی جرات کی جنہیں بعض اساتذہ حفظ ماتقدم کے طور پر نظر انداز کر جاتے تھے۔ پروفیسر وارث میر صاحب کا آبائی تعلق شہر اقبالؒ سیالکوٹ سے تھا لیکن انہوں نے اس تعلق پر کبھی فخر یا تاسف نہیں کیا۔ دراصل انہیں اقبالؒ کے شہر کی نسبت اقبالؒ کی فکر سے زیادہ عقیدت اور لگاؤ تھا۔ میرے خیال سے وارث میر صاحب نظریاتی لحاظ سے سچے اور بھرپور پاکستانی تھے۔ انہوں نے کلاس روم یا غیر نصابی اجتماعات میں طالب علموں کے سامنے کسی ''ازم'' کا پرچار نہ کیا تاہم سیاسی، معاشی اور سماجی نظریات پر کھل کر گفتگو فرمایا کرتے۔ سقوط ڈھاکہ کے سانحہ نے ہر پاکستانی کی طرح انہیں بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس سانحہ کے بعد جمہوری تماشے اور مارشل لاء کے حبس میں پرورش پانے والی مافوق الفطرت سیاسی مخلوق نے انہیں زک پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ میں 1973ء سے پاک فوج کے محکمہ تعلقات عامہ آئی ایس پی آر سے منسلک تھا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

1981ء کے اوائل میں میری تعیناتی لاہور ہوگئی اور یوں استاد محترم وارث میر صاحب سے ملاقات کے مواقع زیادہ ملنے لگے۔ ایک روز میں ڈیوس روڈ پر واقع ایک اخبار کے دفتر میں کسی خبر یا تصویر وغیرہ کی اشاعت کے لئے نیوز روم میں بیٹھا تھا کہ شعبہ صحافت کے ایک اور سابق طالب علم اظہر زمان بھی آ گئے۔ یہ اس وقت لاہور میں امریکی اطلاعاتی مرکز (یوایس آئی ایس) میں تعلقات عامہ کے افسر تھے۔ ہم دونوں اپنے فرائض سے فارغ ہو کر سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ پروفیسر وارث میر صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ حسب معمول گرم جوشی سے پیش آئے۔ حال احوال پوچھتے ہوئے اخبار کے دفتر سے باہر آئے تو اظہر زمان نے امریکی اطلاعاتی مرکز کی گاڑی میں یونیورسٹی کیمپس پہنچانے کی پیش کش کی۔ میرے پاس آرمی کی جیپ تھی۔ میں نے بھی مودبانہ انداز میں اصرار کیا۔ وارث میر صاحب نے ہم دونوں کی جانب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور فرمانے لگے کہ تم دونوں نے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ کچھ توقف کے بعد ہم سے ہاتھ ملایا اور تیزی سے ایک آٹو رکشے کی طرف بڑھے اور اس میں سوار ہو کر یونیورسٹی روانہ ہوگئے۔ ہم دونوں سکتے میں آ گئے اور انہیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

میری پڑھائی اور نوکری کی سمت ایک تھی۔ کبھی کبھار رپورٹنگ کی ڈیوٹی بھی مل جاتی تو اندازہ ہوتا تھا کہ فیلڈ میں نیوز رپورٹر کی کس قدر اہمیت ہے۔ خاص طور سے 1970ء کے قومی انتخابات میں لاہور کے مختلف حلقوں کے بارے میں خصوصی رپورٹس کی تیاری کے لیے سینئر رپورٹرز کے ہم رکاب رہے۔ یہ میرا ایک انتہائی مفید تجربہ تھا۔ ایک روز ہم چند دوستوں نے مشرقی پاکستان کی ''غیر سرکاری سیر'' کا پروگرام بنایا۔ بنیادی وجہ حالات کا بچشم خود جائزہ لینا تھا۔ یہ چھ رکنی وفد تھا جس میں شعبہ صحافت کے طالب علم ارشد علوی، اجمل ملک، مقبول احمد، فاروق خان، فلسطینی طالب علم سلیمان اور میں شامل تھے۔ ہم چھ طالب علموں نے پہلے زادِ راہ جمع کیا جس میں سب سے زیادہ حصہ لاہور کی ایک اہم سماجی شخصیت رانا نذر الرحمٰن کا تھا۔ انہوں نے ہماری کاوش کو بہت سراہتے ہوئے ڈھاکہ میں بھی اپنی کمپنی کے ذریعے رہائش کا انتظام کر دیا۔ مشرقی پاکستان کا یہ دورہ بیک وقت معلوماتی اور تفریحی تھا۔ ہم نے ڈھاکہ سے کاکس بازار بذریعہ سڑک سفر کیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں طلبہ و طالبات کی جانب سے دیئے گئے ایک استقبالیہ میں بھی شریک ہوئے۔ دوستانہ ماحول میں تلخ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ ایک موقع پر چند طلبا نے ''بنگلہ بنگلہ'' کے نعرے لگائے۔ ہم نے اردو رسم الخط میں بنگلہ زبان کے چند دل موہ لینے والے جملے لکھ رکھے تھے، یہ جملے جونہی ہال میں گونجے تو سب نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ قیام کے دوران رات گئے بازاروں میں گھومنا معمول تھا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ابھی مجیب، بھٹوتناؤ کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ مارشل لاء نافذ تھا لیکن سیاسی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ اخبارات من پسند صحافت کر رہے تھے۔ جمہوریت کی بحالی کا نعرہ سیاست اور صحافت میں یکساں موجزن تھا۔ ہم تقریباً دس روز مشرقی پاکستان میں رہے، تب ذہن میں دور دور تک یہ خوف اور شائبہ تک نہیں تھا کہ یہ سرسبز خطہ ایک برس کے بعد حتمی جدائی کے سفر پر گامزن ہو جائے گا۔ واپسی کے بعد میں نے نوائے وقت اور ہفت روزہ چٹان میں روداد سفر تحریر کی۔ ایک مضمون میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں ''بنگلہ دیش'' کے نعرے کا ذکر بھی کیا۔ اس کے علاوہ کرنافلی کے ریسٹ ہاؤس کے قریب واقع سکول کے بنگالی بچوں کی مدھر آواز میں علی الصبح پاک سرزمین شاد باد کی گونج کو بھی بیان کیا گیا۔

مشرقی پاکستان کے کامیاب دورے کی پوری یونیورسٹی میں دھوم تھی۔ اساتذہ یا طلبہ و طالبات میں سے کوئی علیحدگی کے خدشات کا اظہار کرتا تو ہم اپنے دورے کی سحر انگیز روداد بیان کرنا شروع کر دیتے تھے، شاید حالات کو ہم سرسری انداز میں دیکھ رہے تھے۔ 1970ء کے قومی انتخابات سر پر تھے۔ لاہور میں متعدد معرکہ ہائے حق و باطل برپا تھے۔ پیپلز پارٹی کے بانی اور چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے جلسے جلوس مغربی پاکستان میں پرہجوم ہوتے تاہم انہوں نے مشرقی پاکستان کو نظر انداز کئے رکھا۔ یہی حال عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن کا تھا جو مشرقی پاکستان کے طول و عرض میں اپنی سیاسی حاکمیت قائم کر چکے تھے۔ انتخابات میں ایک تیسرا فریق اسلام پسند جماعتیں تھیں جن میں سرفہرست جماعت اسلامی تھی جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں انتخابی مہم جاری رکھے ہوئے تھی۔ انہوں نے ''شوکت اسلام'' کے بینر تلے زبردست جلسے جلوس کئے اور ریلیاں نکالیں۔ انتخابات مکمل ہوئے تو وطن عزیز کو ایک تشویشناک مینڈیٹ کا سامنا تھا۔ سیاسی لحاظ سے ملک واضح طور پر دو اکائیوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ صدر پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل آغا محمد یحییٰ خان شفاف انتخابات کا کریڈٹ لے رہے تھے، بعض سیاسی دانشور صورتحال کو ملک کے مستقبل کے لئے ''منفی'' قرار دے رہے تھے۔ جنرل یحییٰ خان نے عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن کو مستقبل کا وزیر اعظم قرار دے دیا تھا۔ یہ صورتحال سیاسی لحاظ سے پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے لئے ناقابل قبول تھی۔

انہوں نے پہلے دبے لفظوں اپنے خدشات کا اظہار کیا اور کچھ عرصے بعد سخت موقف اپنایا جس کا مقصد قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس سے قبل بعض سیاسی معاملات پر اکثریتی پارٹی عوامی لیگ سے ''بھاؤ تاؤ'' کرنا تھا۔ مزید برآں بھٹو صاحب نے پنجاب کے شہریوں کو خوش کرنے کے لئے بھارت مخالف بیانات دینے شروع کر دیئے تھے۔ اس دوران بھٹو صاحب ڈھاکہ بھی گئے جہاں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

انہوں نے پارٹی کے سینئر اراکین کے ہمراہ عوامی لیگ کے وفد سے مستقبل کے سیاسی ڈھانچے پر بات چیت کی، وفد کی قیادت شیخ مجیب الرحمٰن کر رہے تھے۔ یہ مذاکرات 24 جنوری 1971ء سے 29 جنوری 1971ء تک جاری رہے۔ 30 جنوری 71ء کو لاہور ایئر پورٹ پر انڈین ایئر لائنز کا مسافر بردار طیارہ لینڈ کر گیا جس کے بارے میں بتایا گیا کہ اسے کشمیری مجاہدین اشرف اور ہاشم نے اغوا کیا ہے اور مطالبات تسلیم ہونے تک مسافر رہا نہیں ہوں گے۔ یہ غیر معمولی صورتحال تھی۔ بھارتی حکومت سیخ پا تھی، لاہور کے عوام کا جوش وخروش عروج پر تھا۔ پیپلز پارٹی کے چیئر مین بھٹو صاحب بھی کشمیری ہائی جیکرز سے ملاقات کے لئے ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ انہوں نے نیک خواہشات کا اظہار کیا، بھٹو صاحب کی ہائی جیکرز سے ملاقات نے ان کی مقبولیت میں زبردست اضافہ کر دیا۔ اخبارات کے فرنٹ صفحات تصویروں سے بھر گئے۔ دوسری جانب عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمٰن نے اس واقعے پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے مسافروں کی رہائی کی اپیل کی۔ ایئر پورٹ پر صورتحال گھمبیر تھی۔ سیکورٹی ادارے بھی الرٹ تھے تاہم حکومت کسی براہ راست ایکشن کے حق میں نہ تھی۔ ہاشم اور اشرف لاہوریوں کی آنکھ کا تارا بن گئے تھے۔ میں بھی اخبار کی جانب سے رپورٹنگ کی ڈیوٹی پر مامور تھا۔ ہائی جیکروں نے پہلے مسافروں کو خیر سگالی کے طور پر رہا کر دیا۔ یہ اقدام انسانی بنیادوں پر اٹھایا گیا تھا کیونکہ مسافروں میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔

بعد ازاں اس مسافر بردار جہاز کو ہائی جیکروں نے آگ لگا کر تباہ کر دیا۔ بھارتی حکومت نے اس کارروائی کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مسافر بردار جہازوں کو بھارتی فضائی حدود کے استعمال سے روک دیا۔ یوں پاکستانی مسافر بردار جہاز سری لنکا کے راستے ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) جاتے تھے۔ ہائی جیکرز ہاشم اور اشرف لاہور ایئر پورٹ پر آپریشن کے بعد ایک کھلے ٹرک پر سوار ہوئے اور لاہور کی شاہراہوں پر لاکھوں کے جلوس میں ہاتھ ہلا ہلا کر عوامی جذبات کا جواب دے رہے تھے۔ لاہور میں عجب کیفیت تھی۔ انہیں میکلوڈ روڈ کے ایک ہوٹل میں لے جایا گیا جہاں مقامی کشمیری قیادت نے انہیں خوش آمدید کہا۔ یہ کشمیری رہنما مقبول بٹ کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے پہلی پریس کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ کچھ عرصہ بعد ہاشم، اشرف اور مقبول بٹ کے بارے میں متضاد خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ کچھ سیاسی حلقے اسے بھارتی انٹیلی جنس کی کارروائی قرار دے رہے تھے تاکہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے مابین فضائی رابطے کو پرخطر اور طویل بنا دیا جائے۔ بھارت اپنے مشن میں کامیاب دکھائی دیا۔

ہم 1970ء کے انتخابات کے بعد سہانے سیاسی خواب دیکھ رہے تھے لیکن دشمن 71ء کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آغاز ہی سے 1965ء کی جنگ میں ناکامی کا بدلہ لینے کے لئے طویل منصوبہ بندی کر چکا تھا۔70ء کے انتخابات کے نتائج کو دشمن نے اپنے حق میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ بدقسمتی سے دونوں بڑے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو دو قبائلی سرداروں کی مانند آمنے سامنے آ گئے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن پر لاکھ الزام لگائے جاتے ہیں لیکن سیاسی حقائق ان کے حق میں تھے۔ عوامی لیگ پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی اسے حکومت بنانے کا مکمل اختیار اور حق تھا۔ بھٹو صاحب عوامی لیگ سے نصف سے بھی کم نشستیں حاصل کرنے کے باوجود بنگالی قیادت کو للکار رہے تھے۔ یوں وطن عزیز کو سیاسی آتش فشاں کا سامنا تھا۔ مارشل لاء حکومت آزادانہ اور غیر جانبدارانہ الیکشن کرانے پر پھولے نہیں سما رہی تھی لیکن انتخابات کے نتائج پر عمل درآمد کروانے کے معاملے میں فیصلہ کن کردار ادا نہ کر سکی۔ صدر جنرل یحییٰ خان نے متعدد بار شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقاتیں کیں لیکن انہیں "ربط باہمی" پر قائل نہیں کر سکے۔ مشرقی پاکستان روز بروز "آگ بگولہ" ہو رہا تھا۔ دشمن کے سہولت کار، آلہ کار اور کئی مقامات پر براہ راست بھارتی اہلکار بھیس بدل کر مشرقی پاکستان داخل ہو چکے تھے۔ ان کو امن وامان کے مسائل بڑھانے کی ڈیوٹی سونپی گئی تھی تا کہ فوجی دستے اندرونی سلامتی کی ڈیوٹی پر تعینات کئے جائیں۔ صدر یحییٰ خان نے صورتحال کا درست ادراک کئے بغیر ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا مجوزہ اجلاس ملتوی کر دیا۔ اس سے قبل بھٹو نے مغربی پاکستان کے شہروں میں بڑے جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے ڈھاکہ اجلاس میں شرکت کرنے والوں کو جارحانہ انداز میں دھمکیاں دیں۔ پیپلز پارٹی کی جانب سے احمد رضا خان قصوری واحد ایم این اے تھے جنہوں نے بھٹو صاحب کے اس فیصلے کی کھلم کھلا مخالفت کی اور اسے ملک دشمنی کے مترادف قرار دیا۔ احمد رضا قصوری کے اس رویے کے باعث ان کی بھٹو صاحب سے ذاتی کشمکش کا آغاز بھی ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں احمد رضا خان قصوری کے مطابق ان کے والد پر لاہور میں آتشیں اسلحہ سے حملہ کیا گیا۔ جس میں نواب محمد احمد خان جانبر نہ ہو سکے۔ احمد رضا قصوری نے قتل کی ایف آئی آر میں بھٹو صاحب کو مرکزی ملزم نامزد کر دیا۔ بعدازاں جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت کے دوران اس ایف آئی آر کی بنیاد پر بھٹو صاحب کو قتل کے مقدمے کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں سزائے موت ہو گئی۔

ہماری تاریخ کے بعض واقعات اپنے دامن میں عجیب پس منظر کے حامل ہیں۔ مشرقی پاکستان میں حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ دونوں بڑی سیاسی جماعتیں انتخابات میں واضح کامیابی کے باوجود ابھی تک پری الیکشن موڈ میں تھیں۔ قائدین کے اشتعال انگیز بیانات سے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کشیدگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ مارچ 71ء میں قومی اسمبلی کا مجوزہ اجلاس ملتوی ہونے کے بعد مشرقی پاکستان کے شہریوں کو یقین ہو گیا کہ جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے اقدامات سے پاک فوج کا وقار اور کریڈیبلٹی شدید متاثر ہوئے۔ بھٹو صاحب اپنے ہدف یعنی ہر قیمت پر اقتدار کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے، تاہم پاک افواج کو بھٹو صاحب کی ''جیت'' کا راستہ ہموار کرنے کے لئے بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ 1971ء میں سال بھر کے واقعات اس حقیقت کے غماز ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کی باہمی کشمکش نے مشرقی پاکستان میں قیام پذیر شہریوں اور پاک افواج کو شدید نقصان پہنچایا۔ مشرقی پاکستان میں لاکھوں بنگالی دربدر ہوئے۔ آپریشن ''سرچ لائٹ'' کے باعث بھارت کے سرحدی علاقے میں پناہ گزین ہو گئے۔ بھارت پہلے ہی سے تیار تھا۔ مکتی باہنی کے نام سے دستے تیار کئے گئے جنہوں نے پاکستان آرمی کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں میں حصہ لیا۔ مارچ 71 کے بعد بھی جنرل آغا محمد یحییٰ خان اور اس زمانے کی ملٹری ہائی کمان کو صورتحال کا صحیح ادراک نہیں ہو سکا تھا۔ انہوں نے اقتدار عوامی لیگ کے حوالے کرنے کے بجائے بھٹو صاحب کے ایجنڈے کو پروان چڑھانے کے لیے اپنے ادارے کی عزت، نیک نامی اور شہرت داؤ پر لگا دی۔ یہ تاریخی حقائق ہیں۔

بدقسمتی سے 71ء کے سانحہ کے بعد بھی بھٹو، ملٹری الائنس برقرار رہا اور مغربی پاکستان کو پاکستان تصور کرتے ہوئے اقتدار بھٹو صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کارِ خیر میں لیفٹیننٹ جنرل گل حسن اور پاک فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل رحیم خان پیش پیش تھے۔ سیاست کے عجب انداز ہیں کہ بھٹو صاحب نے اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے بعد سب سے پہلے لیفٹیننٹ گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان کو غیر تقریبی انداز میں رخصت کیا۔ مشرقی پاکستان میں غیر یقینی صورتحال کی طوالت میں وہاں پر تعینات لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خان کی حکمت عملی کو بھی کافی عمل دخل رہا۔ سانحہ ڈھاکہ کے بعد یہ بات زبان زدِ عام تھی کہ جنرل یحییٰ خان کو مشرقی پاکستان میں جب جنرل ٹکا خان کی ضرورت تھی تب لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خان کو بھیج دیا۔ موصوف مزاجاً دانش ور اور عملاً صلح جو قسم کی شخصیت تھے۔ سنا ہے کہ انہیں چار پانچ زبانوں پر عبور تھا۔ کتابوں کے دلدادہ تھے۔ بنگالی زبان بھی جلد سیکھ لی تاکہ شیخ مجیب الرحمٰن اور دیگر بنگالی رہنماؤں سے گفتگو میں آسانی رہے۔ بدقسمتی سے جب صاحبزادہ یعقوب علی خان کو بنگالی زبان پر عبور حاصل ہوا تب بنگالی عوام نے ان کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں ''موجود'' بعض بھارتی فوجی افسروں نے بعد ازاں اعتراف کیا کہ 1970ء کے انتخابات کے دوران ہی بھارت نے اپنے مقاصد کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

حصول کے لئے سیاسی اور عسکری اقدامات شروع کر دیئے تھے۔ بدقسمتی سے اسلام آباد تمام تر معلومات کے باوجود مناسب جوابی اقدامات سے گریزاں رہا۔ محض آرمی آپریشن سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں متحدہ پاکستان کے حامی عناصر میں زیادہ تر جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور نظام اسلام پارٹی سمیت دیگر ''اسلام پسند'' تنظیموں کے اراکین شامل تھے۔ ان کے علاوہ غیر بنگالی افراد کی کثیر تعداد شامل تھی۔ متحدہ پاکستان کے حامیوں پر بھارت نواز عناصر نے ظلم وتشدد کی انتہاء کردی۔ ان میں سے کئی آج بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ 71ء کے واقعات کو بنیاد بنا کر عوامی لیگ کی ''بدلہ پالیسی'' کے باعث آج تک پھانسیاں جاری ہیں۔ اردو بولنے والے بھی تختۂ مشق بنے۔ یہ زیادہ تر غیر منقسم ہندوستان کے صوبہ بہار سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں منتقل ہوگئے تھے۔ انہیں بدترین قسم کے سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ متحدہ پاکستان کی محبت میں انہوں نے متعدد بار ہجرت اور موت کو گلے لگایا۔ آج بھی ڈھاکہ کے قرب وجوار میں بہاری کیمپ کے مقیم اسلام آباد کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ آنے والی نسلوں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہے اور بنگلہ دیش کو ہی اپنا وطن سمجھ کر گھل مل گئے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں جاری جنگ کا ایک باب 16 دسمبر 1971ء کو اختتام پذیر ہوا۔ پاک افواج کی ایسٹرن کمانڈ نے لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کی قیادت میں بھارت اور بنگلہ دیش (مکتی باہنی) کی مشترکہ کمان کے حکم پر ہتھیار رکھ دیئے کیونکہ مزید جنگ جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بھارت واضح برتری کے ساتھ تمام محاذوں پر موجود تھا۔ پاکستانی افواج کے لڑاکا دستے 35 ہزار کے لگ بھگ تھے۔ اس کے علاوہ سول آرمڈ فورسز اور پولیس اور رضا کار وغیرہ بھی تھے۔ جنگی قیدیوں کی تعداد 90 ہزار تھی جنہیں مرحلہ وار بھارت منتقل کر دیا گیا۔

جنگ ستمبر 65ء کے دوران عوام کو خوش کرنے کے لئے ایسی کہانیاں عام کر دی گئی تھیں کہ جن میں بیان کیا جاتا تھا کہ فلاں پل پر جب دشمن کے جہاز بمباری کر رہے تھے تو ان کے پائلٹس نے دیکھا کہ سبز چوغے والے بابے بم کیچ کر کے ادھر ادھر پھینک رہے تھے۔ ایک روز سینکڑوں شہری ایک ہسپتال میں بھارتی فوج کے ان گرفتار زخمی فوجیوں کو دیکھنے کے لیے امڈ آئے جن کے بارے میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ ان کے جسموں پر تلوار سے زخم آئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹروں نے بڑی مشکل سے لوگوں کو قائل کیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یوں ہم جناتی کہانیوں کا من وسلویٰ نوش جاں کر کے میٹھی نیند سو رہے تھے کہ 1971ء سر پر آن پہنچا۔ سیاسی اور ابلاغی میدان میں ہماری تیاری صفر تھی۔ لہٰذا دنیا بھر میں ہماری رسوائی ہوئی اور سبق یہ ملا کہ سیاسی، عسکری، معاشی اور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ابلاغی حقائق سے آنکھیں بند کر کے فاتحانہ پیش قدمی کی امیدیں کرنا خود فریبی کے مترادف ہے۔

میں 1971ء کے آغاز ہی میں پنجاب یونیورسٹی سے فارغ ہو چکا تھا اور نوائے وقت سے ''برطرف''۔ دراصل جنرل یحییٰ خان کے دور میں صحافیوں کی ایک ملک گیر ہڑتال ہوئی تھی اور مطالبات اور مسائل وہی قدیمی جو آج تک چلے آ رہے ہیں۔ نوائے وقت میں ہم محترم سید ظہور عالم شہید کے ''پیروکار'' تھے۔ وہ عملی صحافت میں ہمارے لیے استاد کے درجے پر فائز تھے۔ ہڑتال کے دوران اخبار کی انتظامیہ نے متعدد سرگرم ورکرز کو نکال باہر کیا جن میں اجمل ملک اور میں (صولت رضا) سرفہرست تھے۔ صحافیوں کی برطرفی کے بعد لاہور میں صحافیوں کے دو اخبار جاری کئے گئے۔ ایک روزنامہ ''جاوداں'' تھا جسے ظہور عالم شہید اور ان کے قریبی رفیق جناب بشیر احمد ارشد کی سربراہی حاصل تھی۔ میں اور اجمل لک روزنامہ جاوداں میں آ گئے۔ دوسرا اخبار روزنامہ آزاد تھا جس کے کرتا دھرتا محترم عبد اللہ ملک، جناب حمید اختر، نذیر ناجی صاحب اور عباس اطہر صاحب تھے۔ ابھی مشرقی پاکستان الگ نہیں ہوا تھا اور اخبارات بھی متحدہ پاکستان ہی کی صحافت میں مصروف تھے۔ معاشی لحاظ سے یہ بڑا کڑا وقت تھا۔ ہم زیادہ تر پیدل چلتے اور روزنامہ جاوداں کو کامیاب کرنے کے لئے رپورٹر، سب ایڈیٹر اور کبھی کبھار ضمیمہ نکلتا تو ہاکر کے فرائض بھی انجام دینا شروع کر دیتے تھے۔ ایک جانب اساتذہ سے عقیدت اور احترام کا رشتہ تھا تو دوسری حقیقت خالی جیب تھی۔ ایک روز میرے والد صاحب نے خوب لتاڑا۔ پروانہ ملازمت پر تنخواہ چار سو پچیس روپے درج تھی لیکن کئی ماہ سے محض ایک ماہ یا پندرہ دن کی تنخواہ کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ دوست احباب سے ادھار لے کر کام چل رہا تھا۔ والد صاحب کو تشویش تھی کہ میں تنخواہ کی رقم اجاڑ رہا ہوں۔ کیونکہ 71-1970ء میں یہ معمولی پیسے نہیں تھے۔ ''رضی کے ابا'' یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے کہ کرہ ارض پر کوئی نوکری ایسی بھی ہو سکتی ہے جہاں صبح سے شام تک کام کرنے کے باوجود تنخواہ نہ ملتی ہو۔

بہر حال ایک روز رات گئے اجمل ملک اور میں پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے میکلوڈ روڈ اور ایبٹ روڈ کے سنگم پر واقع ایک دال چاول کے ٹھیلے پر گئے اور ایک پلیٹ کا آرڈر دے دیا۔ ساتھ دو چمچ بھی طلب کئے۔ ٹھیلے والے نے ہماری طرف دیکھا اور کہنے لگا تم دونوں یہ ساتھ والے اخبار سے ہو؟ کیونکہ اس اخبار سے جو بھی یہاں آتا ہے وہ ایک پلیٹ کے ساتھ دو چمچ مانگتا ہے۔ شاید ایک روپے کی پلیٹ تھی۔ ہم دونوں نے خاموشی سے چاول کھائے اور دوبارہ اخبار کا رخ کیا۔ رہائش کے لئے سجاد میر کا کمرہ تھا جہاں ہم زمین پر بستر لگا کر کمر سیدھی کرتے۔ خوش قسمتی سے میر صاحب

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کی سخاوت کے باعث ہفتے میں دو تین مرتبہ گوالمنڈی کا ناشتہ یارات گئے مچھلی کباب تناول کرنے کے مواقع مل جاتے تھے۔

اکتوبر 1971ء میں وطن عزیز جنگی ماحول سے گزر رہا تھا۔ مشرقی پاکستان سے ''خوش گوار'' اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ شورش زدہ علاقوں پر بظاہر کنٹرول ہو چکا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خان کے بعد بھرپور آپریشن کے لئے لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کو ایسٹرن کمانڈ کی کمان دی گئی تھی۔ انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود حالات پر عسکری برتری حاصل کر لی تھی۔ لیکن بھارتی اثر ورسوخ کا مکمل قلع قمع نہ کیا جا سکا کیونکہ مقامی آبادی کی اکثریت متحدہ پاکستان کے ساتھ اپنا ناطہ توڑ چکی تھی۔

جنرل ٹکا خان کے بعد جنرل نیازی کو کمان دی گئی، انہوں نے بھی جاری پلان ہی پر عمل درآمد کو فوقیت دی۔ بات جنگی ماحول کی ہو رہی تھی۔ مغربی پاکستان بالخصوص لاہور میں فاتحانہ کیفیت تھی، ظاہر ہے کہ خبریں یکطرفہ انداز میں نمایاں کی جا رہی تھیں۔ ہم تین چار دوستوں نے آرمی میں کمیشن کے فارم داخل کر دیئے۔ اجمل ملک شامل نہیں تھے۔ انہوں نے صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخواہ) کے صوبائی محکمہ اطلاعات میں ملازمت کے لئے درخواست دائر کی تھی۔ کمیشن کے ابتدائی امتحانات میڈیکل وغیرہ لاہور ہی میں ہوئے۔ آخر کار دسمبر 1971ء کے پہلے ہفتے میں آئی ایس ایس بی کو ہاٹ کی کال آ گئی۔ آئی ایس ایس بی کوہاٹ میں چار روز قیام رہا متعدد نوعیت کے فنی، نفسیاتی اور کسرتی امتحانات کا سامنا رہا۔ فائنل انٹرویو میں بورڈ کے سربراہ نے پوچھا کہ ایم اے جنرلزم اور ورکنگ جرنلسٹ فوج میں کیا کرے گا؟ میں نے گفتگو کے دوران محسوس کیا کہ میرے روایتی جوابات سے اراکین مطمئن نہیں ہیں اور بار بار اصرار کر رہے تھے کہ اگر فوج میں آنا ہی تھا تو زیادہ سے زیادہ گریجوایشن کے بعد درخواست دے سکتے تھے۔ یہ ایم اے جرنلزم تو ''مس فٹ'' ہوگا۔ انٹرویو ختم ہونے کے قریب تھا کہ میں نے واضح کہا کہ اگر اخبار کی ملازمت میں باقاعدہ تنخواہ ملتی رہتی تو میں کبھی کمیشن کے لیے اپلائی نہ کرتا۔ میرا موقف سنتے ہی اراکین نے مزید سوال داغ دیئے۔ میرے جوابات ان کے لیے حیران کن اور ناقابل فہم تھے۔ بہر حال ''تھینک یو'' کی آواز آئی اور میں ناامیدی کی کیفیت سے باہر آ گیا۔ اس زمانے میں آئی ایس ایس بی کے رزلٹ سے کوہاٹ ہی میں آگاہ کر دیا جاتا تھا۔ فائنل انٹرویو گیارہ بجے صبح ہوا اور نتائج کا اعلان چھ بجے شام کیا گیا۔ ہال میں تقریباً دو سو امیدوار تھے۔ صرف کامیاب امیدواروں کے نمبر اور نام پکارے جا رہے تھے۔ ہال میں میرا نمبر اور نام گونجا تو یقین نہیں آیا۔ کسی نے کمر پر زور سے ہاتھ مارا تو میرے اوسان بحال

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوئے اور ڈائس پر ایستادہ افسر سے کامیابی کا لیٹر وصول کیا۔ اگلے روز گھر ماڈل ٹاؤن لاہور واپسی ہوئی تو ہر طرف فضا سوگوار تھی۔ سقوط ڈھاکہ رونما ہو چکا تھا۔ 16 دسمبر 71ء ہماری قومی اور ملی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا' مجھے کسی نے نہ مبارکباد دی اور نہ شاباش۔ ہر طرف اداسی، غم اور حسرت و یاس کا بسیرا تھا۔ میرے والدین کی مشرقی پاکستان سے بے پناہ خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ والدہ کے آنسو رکنے میں نہ آرہے تھے۔ ایسے عالم میں گھر والوں نے مجھے پی ایم اے کاکول روانہ کیا۔

لاہور ریلوے سٹیشن پر والد گرامی اور اکلوتے ماموں سعید الحسن نے الوداع کہا۔ ٹرین علی الصبح حویلیاں ریلوے سٹیشن پر پہنچی۔ پی ایم اے کی بسیں موجود تھیں۔ سامان سر پر اٹھایا اور بس کی چھت پر مل جل کر ترتیب دیا۔ یہ ''ابتدائے عشق لیفٹینی'' تھا۔ آگے بے شمار اندوہناک امتحانات منتظر تھے۔ پاکستان بھارت کی جنگ اور سقوط ڈھاکہ کے باعث دو سالہ تربیتی کورس کا دورانیہ کم کر کے دس مہینے کر دیا گیا تھا۔ اب دن رات ٹریننگ پروگرامز جاری تھے، پی ایم اے میں کیڈٹ کے شب و روز کو میں نے 1975ء میں کتابی صورت میں شائع کیا، اس کتاب کا نام'' کاکولیات'' ہے، اس کے اب تک 30 مصدقہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ غیر مصدقہ ایڈیشنوں کی تعداد کے بارے میں کچھ لکھنا ممکن نہیں۔ کاکولیات کی اشاعت کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ دراصل یہ ایک کیڈٹ کے تربیتی دور کے بارے میں پہلی کتاب تھی جو منظر عام پر آئی۔ اشاعت کے بعد اس پر اعتراضات بھی ہوئے اور اجازت نامے کی طلبی تک بات جا پہنچی۔ کاکول میں کیڈٹ لائف کے بارے میں میرا پہلا مضمون پاک فوج کے ترجمان ماہنامہ ''ہلال'' (اُس وقت ہفت روزہ) میں ''روٹ مارچ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ہلال کے ایڈیٹر اکرام قمر صاحب نے باوجود میری کوشش کے مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے نہیں دیا۔ ایک کے بعد دوسری قسط اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ یوں کاکولیات کا تقریباً متن ہلال میں شائع شدہ تھا لہٰذا اجازت نامے کی پوچھ گچھ تکنیکی بنیاد پر ناکام رہی تاہم اسے حتمی ناکامی سے دوچار کرنے میں آئی ایس پی آر میں لیفٹینینٹ کرنل سید تحصیل احمد (مرحوم و مغفور) کا بھی ہاتھ تھا جنہوں نے واضح الفاظ میں کتاب کی اشاعت کے لئے کلیئرنس سرٹیفکیٹ جاری کر دیا۔ اس حوالے سے مزید تفصیلات تو میں ''آئی ایس پی آر میں قیام کی رُوداد' کے بیان میں پیش کروں گا۔

میرے خیال سے میری کتاب ''کاکولیات'' کی موجودگی میں پی ایم اے کے شب و روز یہاں دہرانے کا فائدہ نہیں البتہ یہ ذکر ضروری ہے کہ ہمارا کورس 19 اگست 1972ء کو پاس آؤٹ ہوا۔ میں ایبٹ آباد سے لاہور گھر پہنچ گیا اور چند روز کے بعد الاٹ شدہ یونٹ 23 فیلڈ رجمنٹ میں شامل ہونے کے لیے سیالکوٹ چھاؤنی روانہ ہو گیا۔ ابھی پاک بھارت جنگ سیز فائر کے مراحل

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے گزر رہی تھی۔ یونٹ سیالکوٹ کے محاذ پر تعینات تھی، میرے علاوہ سیکنڈ لیفٹیننٹ جاوید اقبال اور سیکنڈ لیفٹیننٹ سعید اصغر کو بھی 23 فیلڈ رجمنٹ میں تعینات کر دیا گیا تھا۔ یہ یونٹ فوج میں ''گنز آف واہگہ'' کے تعارفی نام سے بھی پہچانی جاتی ہے۔ اس یونٹ نے ستمبر 1965ء کی جنگ میں لاہور کے محاذ پر حملہ آور دشمن کے خلاف پہلا گولہ فائر کیا تھا۔ لاہور کی جنگ میں توپ خانے کا کردار بہت اہم اور کسی حد تک فیصلہ کن بھی تھا۔

یونٹ میں زیادہ مدت قیام نہیں ہوا۔ ینگ آفیسرز آرٹلری کورس کے لئے نوشہرہ جانے کا حکم صادر ہو گیا۔ میرے ہمراہ سیکنڈ لیفٹیننٹ جاوید اقبال اور سیکنڈ لیفٹیننٹ سعید اصغر بھی تھے۔ ہم ایک ساتھ عازم نوشہرہ ہوئے جہاں تعلیم و تربیت کا ایک کٹھن مرحلہ منتظر تھا۔ میرے لئے تو یہ مرحلہ انتہائی سنگین تھا کیونکہ میں نے کبھی سائنس نہیں پڑھی تھی۔ ابتداء ہی سے آرٹس مضامین کا طالب علم تھا۔ پی ایم اے پاسنگ آؤٹ سے قبل کیڈٹس سے پسندیدہ یونٹ کے بارے میں دریافت کیا جاتا ہے۔ میں نے 23 فیلڈ رجمنٹ کی چوائس لکھ دی کیونکہ اس یونٹ میں میرے تایازاد بھائی سید ثمر مہدی میجر کے رینک پر فرائض انجام دے رہے تھے۔ نوشہرہ جانے سے پہلے یونٹ میں ابتدائی تربیت کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ہم میں سے سعید اصغر سب سے زیادہ لائق نوجوان افسر تھا۔ اس نے یونٹ کے انسٹرکٹرز کو متاثر کیا۔ جاوید اقبال کو بھی شاباش مل جاتی تھی، البتہ میرے بارے میں انسٹرکٹر حوالدار کا خیال تھا کہ ''سر! آپ تو یونٹ کے نام پر ایک بوجھ ہی ثابت ہوں گے، ہم دعا ہی کر سکتے ہیں''۔ اس افسردگی کے ماحول میں آرٹلری سکول نوشہرہ میں رپورٹ کی تو دن میں تارے نظر آ گئے۔ شانے پر ایک پھول آویزاں تھا لیکن ''رگڑے'' کے لحاظ سے کیڈٹ لائف کا دور پھر لوٹ آیا تھا۔ کلاس رومز میں میجر رینک کے انسٹرکٹر تھے جن کے لیکچر اکثر سر کے اوپر ہی سے گزر جاتے تھے۔ البتہ پریکٹیکل کے دوران ہاتھ پاؤں مار لیتا تھا۔ ابھی تین ماہ ہی گزرے تھے اور تربیتی رگڑا عروج پر تھا کہ سہ پہر کی ''ٹی بریک'' کے موقع پر ایک ہم جماعت کہیں سے پکوڑے سموسے لے آیا۔ اخباری کاغذ کا لفافہ تھا۔ بہت دنوں بعد اخبار کا ٹکڑا دکھائی دیا۔ میں نے سموسے رکابی پر رکھ دیئے اور اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ اچانک میری نظر ایک اشتہار پر گئی جس میں پاک افواج کے لئے پی آر اوز کی اسامیاں مشتہر کی گئی تھیں۔ مطلوبہ تعلیم ایم اے صحافت تھی۔ میں نے اخباری ٹکڑا سنبھال لیا اور اگلے روز اشتہار میں دیئے گئے پتے پر ایک خط لکھ دیا۔ ایک ہفتے بعد جواب آ گیا اور ہمراہ آرمی کمیشن کا فارم تھا۔ میں نے کسی سے مشورہ کئے بغیر فارم پُر کیا اور روانہ کر دیا۔ چند روز گزر گئے کہ ایک دن کلاس میں آواز گونجی کہ سیکنڈ لیفٹیننٹ صولت رضا کو کمانڈنٹ بلا رہے ہیں۔ یہ بلاوا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

انتہائی تشویشناک تھا۔ میں پی آر او کے فارم وغیرہ بھول چکا تھا۔ کمانڈنٹ کے دفتر میں عسکری ضوابط کے مطابق پہنچایا گیا۔ سامنے لیفٹیننٹ کرنل غلام حسین قائمقام کمانڈنٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی جس کے دوران ہر دوسرے جملے کے بعد فرما رہے تھے کہ تم فوج میں رہنے کے قابل نہیں ہو۔ کبھی کمیشنڈ افسر بھی دوبارہ کمیشن کے لئے اپلائی کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ سر مجھے یہ فارم جی ایچ کیو کی متعلقہ برانچ نے بھیجے تھے۔ میں نے خط میں خود کو سیکنڈ لیفٹیننٹ لکھا تھا۔ قائمقام کمانڈنٹ کی آواز گونجی کہ ''کوئی کلرک ہوگا تمہاری طرح کا......اب ہم تمہارے خلاف ضابطے کی کارروئی کریں گے''۔ ایک انکوائری افسر مقرر کر دیا گیا ہے۔ تم اپنا تحریری بیان 24 گھنٹے میں جمع کروا دو، اینڈ گیٹ آؤٹ!

قائمقام کمانڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل غلام حسین کی بھرپور خاطر تواضع کے بعد سیکنڈ لیفٹیننٹ صولت رضا جب کلاس میں واپس پہنچے تو انسٹرکٹر میجر گلزار پہلے سے تیار تھے۔ انہوں نے نصاب کی تدریس ترک کر کے غیر نصابی انداز میں رہی سہی کسر پوری کر دی۔ انہوں نے پوری کلاس کو یہ مژدہ سنایا کہ ''تمہاری صفوں میں ایک کالی بھیڑ موجود ہے جس نے آج سارے توپچی افسروں کی ناک کٹوا دی ہے۔ یہ آئی ایس پی آر میں پی آر او بھرتی ہونا چاہتا ہے۔ بھرتی سے پہلے بھرکس بنائیں گے''۔ بہرحال کسی طور لنچ بریک ہوئی تو عارضی طور پر جان میں جان آئی۔ میں کمرہ میں واپس آیا اور اپنے ایک ہم جماعت سے مشورہ کیا جو ایل ایل بی تھے تو انہوں نے انکوائری کا جواب تیار کرنے میں مدد کی جس میں یہ دلیل نمایاں کی گئی کہ خط کتابت سرکاری دفاتر کے مابین ہوئی ہے۔ اس میں افسر سے دانستہ نہیں بلکہ سہواً غلطی کا احتمال موجود ہے۔ چند ماہ کی ملازمت کو مدنظر رکھتے ہوئے درگزر کر دیا جائے، آئندہ افسر محتاط رہے گا۔ انکوائری افسر ایک سینئر انسٹرکٹر میجر تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی بھرپور ''گولہ باری'' کریں گے لیکن موصوف بڑی شفقت سے پیش آئے۔ دفتر میں موجود ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جو ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کے لئے اعزاز کی بات تھی۔ انہوں نے واجبی سی تنبیہ کی جو شاید فائل کا پیٹ بھرنے کے لئے لازمی تھی۔ اس کے بعد فائل ایک جانب رکھ کر فرمانے لگے کہ ''تمہارا موقف درست ہے۔ آپ بیسک کورس میں جو عرصہ رہ گیا ہے اسے مکمل توجہ کے ساتھ مکمل کریں اور یونٹ واپس جا کر دوبارہ کوشش کرنا۔ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں ایک مرتبہ غلطی کی معافی ہے۔ وہ تو تم کو مل گئی ہے''۔

آرٹلری سکول نوشہرہ میں باقی وقت آرام اور اطمینان سے گزرا۔ کورس مکمل ہوا تو ہم تینوں سیکنڈ لیفٹیننٹ واپس سیالکوٹ چھاؤنی پہنچے جہاں سے ''اگلے مورچوں'' پر پہنچایا گیا۔ ابھی جنگ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دسمبر 1971ء کے بعد سیز فائر کا مرحلہ جاری تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ زیرِ زمین مورچے روشن تھے تاہم توپوں کے مورچے کیموفلاج کئے گئے۔ رات کے اندھیرے میں دور یا نزدیک سے ہری بھری جھاڑی کا گمان گزرتا تھا۔ ہم تینوں باوردی حالت میں سیکنڈ لیفٹیننٹ زیرِ زمین آفیسرز میس میں داخل ہوئے تو ڈنر کا وقت قریب تھا۔ یونٹ کے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل غلام مرتضیٰ دیگر افسروں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ انہوں نے ہم تینوں کو خوش آمدید کہا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے نرم الفاظ میں شدید اظہار برہمی کیا۔ یونٹ کو آرٹلری سکول نوشہرہ سے میرے کارنامے کی اطلاع مل چکی تھی۔ فرمانے لگے ''تمہاری حرکت ایک دھبہ ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ''گنرآف واہگہ'' جیسی یونٹ کا سیکنڈ لیفٹیننٹ کسی اور جگہ جانے کا سوچے گا''۔ ان کے الفاظ گرم سیسے کی مانند میرے کان میں گر رہے تھے۔ کمانڈنگ افسر کا یہ موڈ دیکھ کر باعزت خاموشی ہی بہتر تھی۔ اچانک سی او کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا: آپ کھانا کھائیے میں اپنے مورچے میں جارہا ہوں۔ یہ واضح اظہار ناراضی تھا۔ ان کے جانے کے بعد یونٹ کے دیگر افسروں نے بھی حصہ بقدر جثہ ''تواضع'' کی۔ میرے ساتھ اخبارات اور میڈیا کی شان میں بھی ''سپاس نامے'' پیش کئے جارہے تھے۔ اپنی رجمنٹ، یونٹ اور آرم (عسکری شعبے جیسے آرٹلری، انفنٹری، آرمرڈ وغیرہ) پر فخر کرنا ہر فوجی کی شان اور فرائض منصبی کا جزو شمار ہوتا ہے۔ یہ کیفیت اسے میدان جنگ اور زمانہ امن میں بے تکان مصروف عمل رکھتی ہے۔

چند روز تک میرے ساتھ ''حسن سلوک'' جاری رہا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ منفی جذبات سرد پڑ گئے۔ یونٹ کے کچھ حصے چھاؤنی منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ میں ایک روز اگلے مورچے سے چھاؤنی کی جانب آرہا تھا، بارش کے باعث کھیت کھلیان پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ کچے راستے اور پگڈنڈیاں کیچڑ سے اٹ گئے تھے۔ جیپ ڈرائیونگ دشوار سے دشوار تر ہو رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ اگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ ڈرائیونگ مشکل ہے تو ٹھہر جاتے ہیں۔ بارش رکنے کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا ''سر! آپ نئے آئے ہیں۔ یہ پنجاب کی بارش ہے۔ جھڑی لگ گئی ہے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہیں''۔ حدِ نظر تک دیہات کے رہنے والے بھی کام کاج میں مصروف دکھائی دیئے۔ اس دوران میں نے پگڈنڈی پر ایک بچہ دیکھا، عمر پانچ چھ برس ہوگی۔ وہ ہماری جانب سرپٹ بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ڈرائیور کو بھاگتے ہوئے بچے کی نشاندہی کی، بچہ پگڈنڈی کے کنارے بمشکل رُکا اور فوجی انداز میں ہمیں سیلوٹ کیا۔ میں نے بھی سکھلائے ہوئے طریقے سے ناقابل فراموش سیلوٹ کا جواب دیا۔ جی چاہا کہ جیپ روک کر بچے سے ہاتھ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ملاؤں۔ بات چیت کروں لیکن جیپ آگے نکل گئی تھی۔ بچہ پگڈنڈی کے کنارے کھڑا ہاتھ ماتھے پر اٹکائے شاید جیپ کے نظروں سے اوجھل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ سلیوٹ میری نگاہوں میں جم گیا۔ چھاؤنی پہنچا، کام کی مصروفیت کے باوجود بچے کا بلند ہوتا ہوا ہاتھ اور کیچڑ میں پگڈنڈی پر دوڑ لگا کر آرمی جیپ کے قریب آنا مجھے محسوس ہوا کہ سولہ دسمبر 71ء کی ہزیمت عارضی ہے۔ قوموں کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ خیال آیا کہ جنگ اُحد کا نتیجہ جنگ بدر سے مختلف تھا لیکن اس کے باوجود ''خندق'' کی تیاری ہوئی اور مسلمانوں نے حتمی فتح کے لئے تمام دشواریوں پر قابو پالیا۔ ہمیں بھی اپنے حوصلے بلند رکھتے ہوئے جامع حکمت عملی کے ساتھ منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ پاکستان بھارت کے درمیان شملہ معاہدے کے بعد افواج کی مرحلہ وار واپسی شروع ہوگئی تھی، میری یونٹ بھی سیالکوٹ چھاؤنی واپس آ گئی۔ یوں ''زمانہ امن'' کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔ صبح صبح پی ٹی کے لئے تیاری، وقفے کے بعد پیریڈ، دفتری امور کی انجام دہی، لنچ اور ڈریس تبدیل کر کے سپورٹس گراؤنڈ میں خود کو سینئرز اور جونیئرز کے سامنے خود کو سب سے زیادہ چاق و چوبند ظاہر کرنا۔ مغرب کے بعد میس لائف جہاں ڈسپلن پہلے اور ڈنر بعد میں میسر تھا۔ یہ ایک نوجوان کنوارے افسر کے شب و روز تھے۔ اس زمانے (1972-1973ء) میں موبائل فون نہیں تھے۔ کسی ایک افسر کے پاس موٹر سائیکل ہوتی تھی۔ ذاتی موٹر کار شاید صرف کمانڈنگ افسر کی تھی۔ سیالکوٹ چھاؤنی واپس آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ لیفٹیننٹ کرنل غلام مرتضیٰ ''پوسٹ آؤٹ'' ہو گئے اور ان کی جگہ لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین کو تعینات کر دیا گیا۔ کمانڈنگ افسر کی تبدیلی کے باعث یونٹ میں تازہ دم کیفیت عود کر آئی۔ ہر کوئی کمانڈنگ افسر کے احکامات کا منتظر تھا۔ انہوں نے یونٹ کے افسروں سے دفتر میں انفرادی ملاقاتیں شروع کیں، جب میری باری آئی تو میں خاصا پریشان تھا۔ پوسٹ آؤٹ ہونے والے کمانڈنگ افسر نے خاصی ''گوشمالی'' کر دی تھی۔ بس یونٹ سے ٹھڈے مار کر نکالنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ سی او (کمانڈنگ افسر) کے آفس کے باہر کھڑے چاق و چوبند جوان نے پکارنے کے انداز میں کہا ''سر! سی۔ او یاد کر رہے ہیں''۔ یہ سنتے ہی میں نے امید اور غیر یقینی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ خود کو سی۔ او آفس میں ''دھکیل'' دیا۔

میں نے سلیوٹ کیا ہی تھا کہ لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین نے بلند آہنگی کے ساتھ وعلیکم السلام کہا اور اپنی نشست سے کھڑے ہو کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ یہ سب میرے لیے غیر متوقع تھا۔ انہوں نے جب ''پلیز سٹ ڈاؤن'' کہا تو مجھے یقین نہیں آیا کیونکہ کمیشنڈ افسر بننے کے بعد سی۔ او آفس میں پہلی مرتبہ یہ آواز سنی تھی۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ انہوں نے انگریزی میں پوچھا: ''گرین ٹی، ملک ٹی یا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کافی؟'' میں سمجھا کہ اب میرا جواب سن کر زوردار قسم کا ''گیٹ آؤٹ'' بلند ہوگا۔ خیر! گرین ٹی پر اتفاق ہوگیا۔ انہوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ بات کرتے ہوئے کہا: ''مجھے تمہارے بارے میں سب معلوم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے دیانتداری سے بات کی ہے۔ آئی ایس پی آر ہی تمہارے لیے مناسب رہے گا اور تم زیادہ بہتر انداز میں خدمات انجام دے سکتے ہو لیکن جب تک یونٹ میں موجود ہو اپنے فرائض پوری توجہ اور اخلاص کے ساتھ انجام دینے ہیں۔ سینئرز سے سیکھنے کی کوشش کرو۔ جونیئرز کے ساتھ ایک معلم کی مانند برتاؤ کرو۔ اس کے علاوہ یونٹ لائبریری کی دیکھ بھال بھی کرو گے۔ تازہ بھرتی ہونے والے جوانوں کی تعلیمی استعداد کا جائزہ ضروری ہے۔ کچھ کے مسائل شاید تمہاری طرح ہوں''۔

یہ جملہ بہت معنی خیز تھا۔ یوں لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین سے پہلی ملاقات نے خوف، بے یقینی اور پیشہ وارانہ تنہائی کا ازالہ کر دیا۔ اب میں یونٹ کا فعال رکن تھا۔ مجھے توقع تھی کہ ایک روز آئی ایس پی آر سے طلبی کا پروانہ ضرور آئے گا اور بنجارہ اپنی کتابیں اور اخبارات لاد کر راولپنڈی روانہ ہو جائے گا۔ کمانڈنگ افسر کی حوصلہ افزائی رنگ لائی۔ میں نے سرحدی گاؤں کے بچے کا یادگاری سلیوٹ یاد کیا اور اسے ایک مضمون میں ڈھال کر پاک فوج کے ترجمان جریدے ''ہلال'' کو روانہ کر دیا۔ تب یہ ہفت روزہ تھا اور یونٹ میں بآسانی دستیاب ہوتا تھا، صفحات تیس بتیس ہوتے تھے۔ بلیک اینڈ وائٹ اشاعت تھی۔ زیادہ تر عسکری نوعیت کی سرگرمیوں کے بارے میں خبریں، تصاویر اور مضامین نمایاں ہوتے تھے۔ میرا مضمون ''سلیوٹ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ کے رینک کے ساتھ یہ میرا پہلا اور آخری مضمون ہے جو ہلال میں شائع ہوا۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ انہوں نے پچاس روپے انعام کے ساتھ یونٹ کے اجتماع میں پڑھنے کا حکم بھی صادر کیا۔ بعدازاں ہلال سے بھی تیس روپے اعزازیہ موصول ہوا۔ یونٹ اجتماع میں تمام افسر، جونیئر کمیشنڈ افسر اور جوانوں کی موجودگی میں مجھے اپنا مضمون پڑھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ کمانڈنگ افسر نے اپنی تقریر میں خوب تعریف کی۔ میں اللہ کریم کا شکر ادا کر رہا تھا۔ چند ہفتے سے مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یونٹ میں ''گناہ کبیرہ'' کے مرتکب کی مانند شب و روز گزر رہے تھے۔ اچانک کمان تبدیل ہوئی اور ایک شخصیت کی بدولت پسند کی شاہراہ پر گامزن ہو گیا۔ یونٹ میں میرے دونوں کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل غلام مرتضیٰ اور لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین آج دنیا میں موجود نہیں ہیں، اللہ کریم ان کے درجات بلند فرمائیں۔ آمین۔

کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل غلام مرتضیٰ ''فل کرنل'' کے عہدے تک پہنچے۔ دو تین مرتبہ ان

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے راولپنڈی میں ملاقات ہوئی۔ سراپا گنر آفیسر (Gunner Officer) تھے۔ پیشہ وارانہ لحاظ سے دیانتدار اور ہر معاملے میں مکمل پرفیکشن چاہتے تھے۔ بے پناہ خوبیاں تھیں جن سے ان کے سینئرز اور جونیئرز مستفید ہوتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد فیصل آباد میں مقیم تھے۔ ایک روز گھر سے باہر چہل قدمی کر رہے تھے کہ موٹر سائیکل سوار دو افراد نے چھینا جھپٹی کی کوشش کی۔ ان سے گتھم گتھا ہو گئے، ایک رہزن نے فائر کیا اور موقع ہی پر واصل بحق ہو گئے۔ اللہ کریم غریق رحمت فرمائیں۔ آمین۔

دوسرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین ریٹائرمنٹ کے بعد آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے ایک پروجیکٹ کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ ڈیوٹی پنو عاقل چھاؤنی کے گردونواح میں تھی۔ انہوں نے پیشہ وارانہ مہارت اور حکمت عملی سے اپنے فرائض انجام دیے۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین سے براہ راست یا بالواسطہ رابطہ رہا۔ کراچی سے نوے کی دہائی کے وسط میں واپس آئی ایس پی آر راولپنڈی تعینات ہوا تو کبھی کبھار ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو جاتا تھا۔ عارضہ قلب کے باعث آرمڈ فورسز انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی (آر ایف آئی سی) راولپنڈی میں زیر علاج رہے۔ جب کبھی ڈاکٹر سے چیک اپ کے لئے تشریف لاتے تو آئی ایس پی آر بھی آتے تھے۔ دفتر کے ساتھیوں کو علم تھا کہ کرنل حسین میرے کمانڈنگ افسر رہ چکے ہیں۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی میرے آفس میں ''ہٹو بچو'' کا ماحول ہو جاتا تھا۔ میں انہیں روز اول کا پروٹوکول دیتا تھا اور محض سیکنڈ لیفٹیننٹ بن کر آداب بجالاتا تھا۔ ایک روز آفیسر واش رومز کی جانب گئے۔ میں ڈی جی آئی ایس پی آر کے آفس میں تھا کہ میرا پی اے بھاگتا ہوا آیا اور ہانپتے ہوئے کہنا لگا ''سر! آپ کے سی۔ او صاحب واش رومز میں موجود ہیں اور غصے کی حالت میں کہہ رہے ہیں کہ اپنے بریگیڈیئر کو ابھی بلاؤ۔ ادھر بلاؤ'' میں سمجھا کہ خدانخواستہ پھسل نہ گئے ہوں۔ لہٰذا ڈی جی سے اجازت لے کر فوراً واش رومز کی جانب بھاگا۔ قریب گیا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔ کرنل محمد حسین غصے کے عالم میں تھے، میں جونہی سیکنڈ لیفٹیننٹ کے انداز میں پیش ہوا تو انہوں نے برسنا شروع کر دیا۔ دفتر کے دیگر باوردی اور سول اہلکار بھی سن رہے تھے۔ الفاظ ایسے تھے کہ کبھی پہلے کمانڈنگ افسر نے نہیں بولے ہوں گے۔ کہنے لگے: ''یہ واش رومز کی کیا حالت ہے۔ تم سارا دن کرسی پر بیٹھے رہتے ہو۔ کبھی چکر بھی لگا لیا کرو۔ اپنی شکل کبھی واش رومز کے شیشے میں بھی دیکھ لیا کرو کہ صحیح دکھائی دے رہی ہے یا نہیں''۔ میں نے سر کہہ کر کچھ کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے بلند آواز میں خاموش کرا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ آج خاموشی سے سن لیا جائے۔ بزرگ ہیں اور ہر معاملے کو اپنے زمانے کے معیار پر جانچ رہے ہیں۔ مزید میرا دفتر خالص فوجی بھی نہیں تھا،

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یہاں ڈسپلن بھی ''ملی جلی'' کیفیت ہی میں نافذ رہتا ہے۔ بہر حال بہت مشکل سے غصہ ٹھنڈا ہوا۔ مجھے ان کی صحت کی فکر تھی۔ عارضہ قلب کے مریض کو زیادہ غصہ اور ٹینشن نقصان دہ ہوتی ہے۔ واش رومز سے میرے دفتر تک آتے آتے انہوں نے عسکری دفاتر میں صفائی کی اہمیت پر مختصر مگر جامع نکات بیان کیے۔ بہر حال اس روز موڈ بہت آف تھا۔ بمشکل سبز چائے کے چند گھونٹ انڈ یلے اور واپس واہ چھاؤنی روانہ ہو گئے جہاں ریٹائرمنٹ کے بعد قیام پذیر تھے۔

یہ سارا واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ فوج میں سینئر جونیئر کا ربط باہمی صرف ملازمت کے دورانیہ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ یہ تا حیات ایک بلا عنوان رشتے داری ہے جس سے خون اور پسینے کی مہک آتی ہے۔ آیئے دوبارہ سیالکوٹ چھاؤنی چلتے ہیں۔ یونٹ میں معمول کے شب و روز گزر رہے تھے۔ ایک دن پی ٹی کا پیریڈ جاری تھا کہ اچانک ایڈ جوٹنٹ (کیپٹن) گراؤنڈ میں آئے اور مجھے طلب کر کے ''ناقص کارکردگی'' پر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ میں حیران و پریشان تھا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے اور بھی افسر اٹھک بیٹھک میں مصروف ہیں۔ فزیکل ٹریننگ جاری ہے۔ یہ مجھے کیوں بآواز بلند پی ایم اے گراؤنڈ کے ''نقرئی الفاظ'' سے نوازا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ لنچ بریک اور سپورٹس پیریڈ تک جاری رہا۔ اللہ بھلا کرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین کا کہ انہوں نے سپورٹس پیریڈ کے اختتام پر جب لیموں پانی کا دور چل رہا تھا مجھے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ تمہارا آئی ایس پی آر کے ساتھ عارضی ڈیوٹی کا حکمنامہ موصول ہو گیا ہے۔ اسی ہفتے راولپنڈی رپورٹ کرنی ہے۔ یہ خوشخبری سن کر اوسان بحال ہوئے جو صبح سے ڈانٹ ڈپٹ کے باعث بار بار خطا ہو رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ حکمنامہ سگنل کی صورت میں صبح موصول ہو گیا تھا۔ ایڈ جوٹنٹ عسکری روایات کے مطابق یونٹ سے رخصتی کا ''پہلا بلاوا'' پر عمل پیرا تھے۔ آئی ایس پی آر روانگی کی خوشی اپنی جگہ لیکن 23 فیلڈ رجمنٹ سے پیشہ وارانہ علیحدگی کا دکھ اور افسوس بیان سے باہر تھا۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے یونٹ میں شمولیت اختیار کی۔ اب لیفٹیننٹ تھا۔ ایک برس سے زائد کا عرصہ گزرا۔ محاذ پر رہے۔ ٹریننگ کے لئے شب و روز بھاگ دوڑ کی۔ عملی مظاہرے ''ٹلہ رینج'' میں ہوئے۔ سینئر افسروں، جونیئر کمیشنڈ افسروں اور جوانوں سے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے واقعات سنے۔ دل میں خواہش ابھرتی کہ کاش ہمیں بھی ایسے مواقع میسر آئیں کہ پاک سرحدوں کی جانب بڑھتے ہوئے دشمن کے سر پر توپوں سے آگ برسائیں اور اس کے ناپاک عزائم ملیامیٹ کر دیں۔ آئی ایس پی آر میں عارضی تعیناتی کا حکمنامہ موصول ہونے کے بعد چند روز یونٹ میں اس انداز میں گزرے کہ ہر لمحہ ''الوداعی'' تھا۔ یونٹ میں ''بڑا کھانا'' ہوا۔ مصافحہ اور معانقہ کا دور چلا۔ گرم جوشی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے یہ لمحات زندگی بھر کا عظیم سرمایہ بن گئے۔

ایک روز سیالکوٹ سے راولپنڈی کی بس میں سوار ہوا۔ ایک ٹرنک رنگ سیاہ اور بستر بند ہمراہ تھے۔ لیاقت باغ راولپنڈی کے بس اڈے پر پہنچے تو دن ڈھل چکا تھا۔ ٹرنک پر بستر بند رکھے ہلال روڈ جانے کے لئے کسی سواری کے انتظار میں تھا۔ ایک ٹانگے والا قریب کی سواری سمجھ کر آمادہ ہوگیا۔ صدر بازار سے ہوتے ہوئے ہلال روڈ پہنچے۔ آئی ایس پی آر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ ابھی مغرب میں کچھ وقت تھا کہ میں دفتر کی حدود میں داخل ہوگیا۔ صرف دو کمروں سے روشنی آ رہی تھی۔ ایک کمرے میں داخل ہو کر اپنا تعارف کروایا تو جواب آیا بیٹھ جائیں ابھی شبیر صاحب آتے ہیں۔ دس منٹ کے بعد ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی پنجابی میں چلانا شروع کر دیا، یہ ٹانگے پر کون آیا ہے؟ باہر گھوڑے نے پیشاب کر دیا ہے اور کوچوان بھی غائب ہے۔ یہ کیا تماشا ہے (اردو ترجمہ میرا ہے)۔ میں نے تعارف کروایا کہ ''لیفٹیننٹ صولت رضا، فرام 23 فیلڈ رجمنٹ، رپورٹنگ فار ڈیوٹی اِن آئی ایس پی آر''۔ ''کون لیفٹین، میں نہیں جانتا۔ ادھر کوئی جگہ نہیں، کس نے بھیجا ہے۔ یہ پیشاب کون صاف کرائے گا۔ ابھی ڈائریکٹر صاحب (بریگیڈیئر) آ گئے تو کون جواب دے گا''۔ یہ ڈانٹ ڈپٹ سن کر حواس باختہ ہونے کے قریب تھا کہ قریب بیٹھے ہوئے چپراسی نے مجھے کہا ''آپ کے پاس کوئی کاغذ ہے تو شبیر صاحب کو دکھاؤ''۔ اب پتہ چلا کہ یہ شبیر صاحب ڈیوٹی کلرک ہیں اور شام کو دفتر میں ''آل اِن آل'' ہوتے ہیں۔ یونٹ سے روانگی کا پروانہ ''آل اِن آل'' کے سامنے رکھا لیکن مزاج یار پر گھوڑے کی فطری لغزش سوار تھی۔ چند لمحات شش و پنج میں گزرے۔ لمبا سانس لیا تو ''رگِ لیفٹینی'' نے پھڑکنا شروع کر دیا۔ ''میری کسی افسر سے بات کروائیں'' میں نے کہا۔ یہ جملہ تو گھوڑے کی ناگوار حرکت سے بھی زیادہ آتشیں ثابت ہوا۔ شبیر صاحب کا موڈ مزید آف ہوگیا۔ بہرحال ایک قریبی آفس میں ٹیلی فون دکھائی دیا۔

میں نے وہاں سے میجر سید عقیل احمد کو کال ملائی۔ انہوں نے میرا نام سنتے ہی کہا کہ ہاں میاں کب پہنچے؟ کیسے پہنچے؟ کہاں ہو؟۔ سر! میں آئی ایس پی آر دفتر میں موجود ہوں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ ایک صاحب کہہ رہے ہیں ''آئی ایس پی آر میں لیفٹین کا کوئی کام نہیں واپس یونٹ چلے جاؤ''۔ جواب میں قہقہہ بلند ہوا، کہنے لگے ''گھبراؤ نہیں۔ میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں''۔ میجر سید عقیل احمد رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے۔ سکوٹر پر سوار مسکراتے ہوئے جونہی دفتر میں پہنچے میں نے کرایہ دے کر کوچوان کو رخصت کیا۔ میجر عقیل ابھی کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ شبیر صاحب نے گھوڑے کی ناگوار حرکت کے بارے میں آہ و بکا شروع کر دی۔ میجر عقیل مسلسل مسکراتے رہے اور کہا ''غم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نہ کرو، جو ہونا تھا ہو گیا، صبح تک سب خشک ہو جائے گا۔ جانور کا کیا ہے۔ پریڈ میں ڈائس کے سامنے تمام تر کوشش کے باوجود گھوڑے لید کر دیتے ہیں، اب کیا کریں"۔ انہوں نے یہ کہہ کر شبیر صاحب کو رخصت کیا اور میری جانب متوجہ ہو گئے۔ آرڈی ننس لال کرتی میں رہائش کا انتظام کروایا۔ میس پہنچا تو ایک تنگ و تاریک چھوٹا سا کمرہ منتظر تھا۔ چند روز میں یونٹ سے "مددگار" بھی باقی ساز وسامان کے ساتھ پہنچ گیا تو رہن سہن بہتر ہو گیا۔ بیس روپے مہینے پر سائیکل کرایہ پر مل گئی۔ یوں آرڈی ننس میس لال کرتی سے ہلال روڈ تک باوردی حالت میں سائیکلنگ کا لطف اٹھانے لگا۔ یہ اکتوبر 1973ء کا ذکر ہے۔ سائیکل رواں رکھتے ہوئے سینئرز کو سلیوٹ کرنا اور جونیئرز کو سلیوٹ کا جواب دینا ایک علیحدہ مشقت تھی۔ اسے رواں سائیکل پر انجام دینا پریکٹس کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ خیر! اس فرض کی خاصی پریکٹس سیالکوٹ چھاؤنی میں کر چکے تھے، لہٰذا راولپنڈی میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ آئی ایس پی آر میں لیفٹیننٹ کی حیثیت سے "دوڑے چل" کی کیفیت طاری رہی۔ اور ہاں سب سے دلچسپ آئی ایس پی آر کے سربراہ بریگیڈیئر فضل الرحمٰن سے پہلا انٹرویو تھا۔ ان کا تعلق آرمرڈ کور سے تھا۔ انہیں بریگیڈیئر عبدالرحمٰن صدیقی (اے آر صدیقی) کی جگہ تعینات کیا گیا تھا۔ یہ تبدیلی جنرل ٹکا خان نے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ سنبھالتے ہی کی تھی۔ بریگیڈیئر اے آر صدیقی نے آئی ایس پی آر میں کیپٹن کی حیثیت سے کمیشن حاصل کیا تھا۔ اس سے قبل اہم اخبارات سے بھی منسلک رہے تھے۔ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد متعدد کتابیں بھی تحریر کیں۔

آئی ایس پی آر میں میری آمد سے قبل بریگیڈیئر فضل الرحمٰن تعینات ہو چکے تھے۔ مجھے عسکری ضوابط کے مطابق ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ آفس ٹیبل پر میری فائل تھی۔ میں پی ایم اے کا کول کے انداز میں زمین پر پاؤں مار کر سیلوٹ پیش کیا جس سے موصوف متاثر ہوئے اور فرمانے لگے کہ "تم تو پکے سولجر ہو۔ پی ایم اے میں ٹریننگ لی ہے۔ آرٹلری سکول نوشہرہ سے ینگ آفیسرز کورس بھی کر لیا ہے۔ یہ آئی ایس پی آر میں کیا لینے آئے ہو؟ فوراً یہاں سے "دفع" ہو جاؤ، یونٹ واپس چلے جاؤ۔ یہ بوسیدہ لکڑیوں کا ڈھیر ہے جو کسی کام کا نہیں (سب کچھ بزبان انگریزی اور وہ بھی میدان جنگ کے بادشاہ کے انداز میں) واضح رہے کہ عسکری روایات کے مطابق گھڑسوار (ٹینک دستہ) بادشاہ اور پیدل دستہ (انفنٹری) ملکہ تصور کئے جاتے ہیں۔ دونوں کا ملاپ میدان میں کامیابی کی کنجی ہے۔ یو آرمرڈ کور سے تعلق رکھنے والے افسر اور جوان اکثر بادشاہ کا انداز اور مزاج اپنائے رہتے ہیں۔ بریگیڈیئر فضل الرحمٰن مسلسل عسکری فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہے تھے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مجھے محسوس ہوا کہ آفس سے باہر نکلتے ہی مجھے یونٹ واپسی کا حکم نامہ مل جائے گا۔ موصوف سانس لینے کے لئے رکے تو میں نے کہا کہ سر! میں نے ایم اے صحافت کیا ہوا ہے، اس لیے آئی ایس پی آر کی جانب رخ کیا ہے۔ اس پر انہیں مزید طیش آ گیا، انہوں نے ایک اور لاجواب قسم کی ڈانٹ پلائی اور کہا کہ ایم اے جرنلزم کے بعد فوج میں منہ اٹھائے کیوں آئے ہو، تمہاری پی ایم اے کا کول اور آرٹلری سکول نوشہرہ میں ٹریننگ پر جو خرچ ہوا ہے وہ تم سے وصول کیا جائے گا۔ چلو اپنی شکل گم کرو اور مجھے دوبارہ نظر مت آنا (بزبان انگریزی)۔

کانپتے ہونٹوں اور لڑکھڑاتی ٹانگوں کے ساتھ باہر نکلا اور سیدھا آئی ایس پی آر کے روایتی افسر سکوارڈن لیڈر (بعد میں ونگ کمانڈر) ایم ایم افضل کے آفس میں داخل ہو گیا۔ اب میرا پیمانہ صبر بھی لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے بریگیڈیئر فضل الرحمٰن کے احکامات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے سن کر زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگے: ''اوئے آرام سے بیٹھ۔ بابا ہر ایک سے یہی بات کرتا ہے''۔ کل سے کیپ دفتر میں رکھ، ڈھیلے ڈھالے انداز میں سلام دعا کیا کرو۔ یہ پاؤں اٹھا کر سیلوٹ کرنا بند کرو۔ یہ پبلک ریلیشنز کا آفس ہے کوئی پریڈ نہیں ہو رہی ہے۔ اخبار پڑھو، کتاب لائبریری سے ایشو کرواؤ، مضمون لکھو۔ پرانے پریس ریلیز پڑھو۔ تصویروں کی البم دیکھا کرو۔ خود کو آئی ایس پی آر والا سمجھو۔ اب پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا''۔

ونگ کمانڈر افضل کی باتوں سے حوصلہ ہوا۔ میجر سید عقیل احمد بھی معمولی کارکردگی پر اعلیٰ درجے کی تھپکی دیا کرتے تھے۔ ابھی میری تعیناتی عارضی تھی لہٰذا ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ آج کوئی غلطی ہوئی یا ڈائریکٹر نے دیکھ لیا تو واپسی کا پروانہ مل جائے گا۔ اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اک روز 1971ء کے جنگی قیدیوں کی واہگہ راستے واپسی کا شور بلند ہوا۔ آئی ایس پی آر لاہور کے آفس کو مزید مضبوط کرنا تھا۔ مجھے راولپنڈی سے ''شکل گم کرو'' حکم مل گیا اور آخری جنگی قیدی کی واپسی تک لاہور آفس سے منسلک کر دیا گیا۔ لاہور میں آئی ایس پی آر کا دفتر مین روڈ گلبرگ میں ایک پرائیویٹ بنگلے میں تھا۔ صبح واہگہ سرحد پر جنگی قیدیوں کی کوریج اہم ڈیوٹی تھی۔ لاہور آفس کے نگران کیپٹن محمد ارشد بعض سرکاری معاملات کے باعث آفس نہیں آ رہے تھے، لہٰذا دن رات سرکاری ''مشق سخن'' جاری تھی۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں والدین مقیم تھے لیکن میرا زیادہ وقت آئی ایس پی آر آفس ہی میں بسر ہوتا تھا۔ واہگہ سرحد پر جنگی قیدیوں کے آخری گروپ کی واپسی کے موقع پر خصوصی تقریب ہوئی۔ اس گروپ میں سینئر فوجی اور سول افسر شامل تھے۔ سب سے آخر میں (سابق) ایسٹرن کمان کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے سرحد پار کی اور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

استقبالیہ قطار سے ہاتھ ملاتے ہوئے روانہ ہوگئے۔

میں نے صدیق سالک کو سب سے پہلے واہگہ کی سرحد پر ایک جنگی قیدی کے روپ میں دیکھا تھا۔ انہوں نے چند لمحے پہلے سرحد عبور کر کے طویل قید سے رہائی حاصل کی تھی اور آئی ایس پی آر کا ''نو آموز لیفٹیننٹ'' پی آر او ڈھاکہ میجر صدیق سالک (بعد میں بریگیڈیئر) کا استقبال کرنے میں مصروف تھا۔ وہ اپنے ہمراہ سقوط ڈھاکہ اور بھارتی قید کا آنکھوں دیکھا حال لائے تھے جسے انہوں نے پھر ''ہمہ یاراں دوزخ''، ''وٹنس ٹو سرنڈر'' اور ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' جیسی کتابوں میں قلمبند کیا۔ ان کے نزدیک ابھی مشرقی پاکستان کی کہانی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے دوٹوک انداز میں لکھ رہے تھے۔ Pakistan Needs Politics اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی، اس انگریزی کتاب کا مسودہ مبینہ طور پر لاپتہ ہوگیا۔ اس کے علاوہ سالک صاحب ایک سیاسی ناولٹ ''وارننگ'' بھی لکھ رہے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد یہ مسودہ بھی مفقود الخبر ہوگیا۔

اس وقت وفاق اور صوبے میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1970ء کے انتخابات کی بنیاد پر عنانِ اقتدار سنبھالی تھی۔ تقریباً روزانہ ہی پیپلز پارٹی کے ایک دو صوبائی وزراء جنگی قیدیوں کے استقبال کے لیے سرحد پر موجود ہوتے تھے۔

لاہور کی ڈیوٹی انجام دے کر واپس راولپنڈی پہنچا تو اٹک قلعہ میں جاری فیلڈ کورٹ مارشل کی سرکاری کوریج کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ دو صحافی اے پی پی کے محمد عزیز صاحب اور پی پی آئی کے رمضان عادل صاحب مستقل اٹک قلعہ میں قیام پذیر تھے تاہم آئی ایس پی آر کا ایک افسر صبح اٹک قلعہ جاتا تھا، کورٹ مارشل کی کارروائی کے بعد دونوں صحافی حضرات پریس رپورٹس تیار کرتے تھے جنہیں عدالتی نوک پلک پر کھنے کے لئے کسی ایک کورٹ ممبر کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ ممبر کی منظوری کے بعد یہ پریس ریلیز آئی ایس پی آر کے سربراہ بریگیڈیئر فضل الرحمٰن دیکھتے تھے، سب سے آخر میں پریس رپورٹس پرنسپل انفارمیشن آفیسر (پی آئی او) کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ دو روز کے وقفے کے بعد یہ رپورٹس جاری ہوتی تھیں۔ شنید تھی کہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو متن کی منظوری دیتے تھے۔

ایک روز میں تاخیر سے اے پی پی اور پی پی آئی کے نمائندگان کی رپورٹس لے کر پی آئی او افضال زیدی صاحب کے دفتر پہنچا تو وہ تاخیر سے آنے پر سخت برہم ہوگئے، کہنے لگے: ''پی ایم آفس سے کئی مرتبہ کال آئی ہیں۔ رپورٹس کا انتظار ہو رہا ہے''۔ انہوں نے شدت جذبات میں کچھ نہ کچھ اگل دیا۔ اب آیئے فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کی جانب۔ یہ کارروائی اٹک قلعے میں جاری تھی جہاں گرفتار شدہ فوجی افسر مقید تھے۔ ان میں بریگیڈیئر ایف بی علی، بریگیڈیئر عتیق احمد، بریگیڈیئر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

واجد علی شاہ، کرنل علیم آفریدی، میجر طارق پرویز، میجر نادر پرویز، میجر اشتیاق آصف، کیپٹن اظہر سمیت 25 کے لگ بھگ افسر تھے۔ یہ بھٹو صاحب کی حکومت کے خلاف بغاوت کی منصوبہ بندی کے الزام میں کورٹ مارشل کا سامنا کر رہے تھے۔ چند چوٹی کے وکلاء جن میں منظور قادر، بیرسٹر اعتزاز احسن اور ایس ایم ظفر بھی شامل تھے وکلاء صفائی تھے۔ فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کے سربراہ میجر جنرل محمد ضیاء الحق (بعد میں چیف آف آرمی سٹاف اور صدر پاکستان) تھے، دیگر ممبران میں بریگیڈیئر جہانداد، بریگیڈیئر رحمت علی شاہ بخاری، کرنل محمد اقبال اور میجر مظفر حسین عثمانی تھے۔ کارروائی کے دوران عسکری انداز میں ٹی بریک کا وقفہ ہوتا اور بعد میں لنچ آفیسر میس میں تھا جس میں میجر جنرل محمد ضیاء الحق اور دیگر کورٹ ممبران اور کبھی کبھار بیرسٹر اعتزاز احسن بھی موجود ہوتے تھے۔ دونوں صحافی حضرات کے ہمراہ میں بھی ''لنچ گروپ'' کا باقاعدہ ممبر تھا۔ یہ فری لنچ نہیں تھا۔ ہر مہینے بل کی ادائیگی ڈائننگ ممبر کی ذمہ داری تھی۔ صحافی حضرات کے بل کی ادائیگی آئی ایس پی آر کے ذمہ تھی۔ اٹک سازش کیس میں ملوث فوجی افسران، کورٹ ممبران اور صحافی حضرات کے لئے آئی ایس پی آر کا افسر راولپنڈی سے رابطہ کا قابل اعتماد ذریعہ تھا۔ لنچ ٹیبل پر میجر جنرل محمد ضیاء الحق بے تکلفانہ گفتگو کے باعث سب کا دل موہ لیتے تھے۔ ایک روز مَیں میس کے برآمدے میں کھڑا تھا تو کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے: ''راولپنڈی کی ایک ڈیوٹی ہے، اگر ناگوار نہ گزرے تو انجام دے دیں''۔ ظاہر ہے ایک لیفٹین کے لئے ناگواری کا آپشن نہیں تھا۔ فرمایا کہ ''مال روڈ راولپنڈی کے پاس میری وردی موجود ہے، وہ آپ کل اٹک فورٹ آتے ہوئے لے آئیں''۔ میں نے رائٹ سر کہا اور انگشت شہادت پر دھاگہ باندھ لیا کہ کہیں واپسی پر جیپ میں سوتا نہ رہ جاؤں اور ''ٹو سٹار وردی'' راولپنڈی ہی میں رہ جائے۔ بہر حال شام ہی کو اسماعیل ٹیلرز سے وردی حاصل کر لی۔

اگلے روز علی الصبح وردی دونوں ہاتھوں سے تھام کر پہلے دفتر پہنچا اور پھر سرکاری جیپ میں اٹک قلعہ روانہ ہو گیا۔ لیفٹین کی قسمت میں دوسری جنگ کی دھتکاری ہوئی جیپ تھی جس میں ایک لیفٹین ایک میجر جنرل کی وردی تھامے سوار تھا۔ جیپ جگہ جگہ رکتی، کھانستی اور ڈولتی ہوئی اٹک قلعہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہوئی۔ میں نے سب سے پہلے وردی کو میجر جنرل محمد ضیاء الحق کے روم میں پہنچایا، جہاں ان کا اردلی مزید پذیرائی کے لئے موجود تھا۔ یہ ڈیوٹی انجام دینے کے بعد کورٹ روم میں داخل ہوا تو مقدمے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ پریس کے لئے تین کرسیاں وکیل استغاثہ کے ساتھ تھیں۔ ملزم لیفٹیننٹ اظہر نے ایک روز سیاہ مارکر سے Press سے پہلے De لکھ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کرا سے Depress بنادیا جو مقدمے کے اختتام تک جوں کا توں رہا۔ لیفٹیننٹ اظہر سابق کور کمانڈر اور سابق گورنر لیفٹیننٹ جنرل محمد اظہر خان کے صاحبزادے تھے۔ کامیاب وردی مشن کے بعد اپنی نشست پر بیٹھا ہی تھا کہ میجر جنرل محمد ضیاء الحق سے آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے سر جھکا کر کامیابی کا اشارہ دے دیا۔ لنچ ٹیبل پر انہوں نے شکریے کے انبار لگا دیئے۔ اب ہمیں بھی ''بڑوں'' کی گفتگو میں مصرع ''طرح'' اٹھانے اور کبھی ''مقطع'' ٹھونسنے کی ہمت ہونے لگی۔ میجر جنرل محمد ضیاء الحق اپنے مخاطب کو ہمیشہ نام کے ساتھ ''صاحب'' کہہ کر گفتگو کا آغاز کرتے۔

پریس رپورٹس کا متن اکثر بریگیڈیئر جہانداد خان چیک کیا کرتے تھے۔ یہ بعد میں لیفٹیننٹ جنرل کے رینک تک پہنچے۔ کور کمانڈر راولپنڈی اور گورنر سندھ بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد راولپنڈی میں شفا آئی ہسپتال کی بنیاد رکھی اور خود کو اس کے لئے وقف کر دیا۔ یہ ہسپتال آج آنکھوں کے امراض کا مثالی شفاخانہ ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل جہانداد کی قبر ہسپتال کے احاطے میں موجود ہے۔ ایک اور بریگیڈیئر رحمت علی شاہ بخاری تھے، کبھی کبھار وہ بھی متن دیکھتے تھے۔ طویل القامت تھے۔ ایک روز دونوں رپورٹس پڑھ رہے تھے کہ روشنی کے لئے لیمپ آن کرنا چاہا تو کرنٹ محسوس ہوا۔ انہوں نے شدت سے آواز بلند کی جسے سن کر باہر گارڈ اندر آ گیا۔ قریب تھا کہ مجھ پر حملہ آور ہوتا کہ بریگیڈیئر بخاری نے اشارے سے لیمپ کی طرف اشارہ کیا۔ اب الیکٹریشن کی تلاش شروع ہوئی۔ انہوں نے رپورٹس میری طرف پھینکیں اور میں چپ چاپ جیپ کی طرف بھاگا۔ بریگیڈیئر بخاری میجر جنرل کے رینک تک پہنچے۔ دوران سروس بہاولپور میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ ایک اور ممبر میجر مظفر حسین عثمانی لیفٹیننٹ جنرل کے رینک میں کور کمانڈر کراچی تعینات رہے۔ (ان کا حال ہی میں انتقال ہوا)۔

میجر جنرل محمد ضیاء الحق سے اٹک سازش کیس کے زمانے کی علیک سلیک تا حیات قائم رہی۔ اس حوالے سے آگے مزید ذکر آئے گا۔ بہر حال فیلڈ جنرل کورٹ مارشل نے اپنے فیصلے میں ایک ملزم میجر طارق پرویز کو بری کیا اور دیگر تمام ملزم افسران کو مختلف المیعاد سزائیں سنا دیں۔ میجر طارق پرویز لیفٹیننٹ جنرل کے رینک سے ریٹائر ہوئے۔ کور کمانڈر کوئٹہ رہے، سزا یافتہ اکثر افسر جنگ آزما تھے۔ فوج میں ان سے منسوب واقعات میں بہادری، دلیری اور دشمن کو ٹھکانے لگانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ متعدد کو وار میڈل بھی ملے ہوئے تھے۔ یہ افسر مبینہ طور پر سمجھتے تھے کہ دسمبر 1971ء کی ہزیمت کے اصل کردار اور ذمہ دار سیاستدان تھے جنہوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فوج کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ذوالفقار علی بھٹو کا کردار مجرمانہ ہے۔ انہوں نے مارچ 1971ء میں قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس کا بائیکاٹ کر کے مشرقی پاکستان میں بھارتی ایجنٹوں اور علیحدگی پسندوں کو سیاسی لحاظ سے ایک بنیاد فراہم کی تھی جس کے بعد کھل کر بنگالی مخالفین ، اردو پنجابی بولنے والوں اور وفاقی اداروں کے اہلکاروں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ عورتوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ملزم افسروں کے خیال میں سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو بھی شیخ مجیب الرحمٰن کی طرح پابند سلاسل کر کے نئے سرے سے انتخابات کرانے چاہئیں تھے۔ یہ گروپ جنرل آغا محمد یحییٰ خان اور ان کے ساتھیوں کے بھی سخت خلاف تھا۔ مقدمے کا لب لباب یہ تھا کہ یہ افسر انقلابی حکومت قائم کر کے من مانی کرنا چاہتے تھے۔

اٹک سازش کیس کی ڈیوٹی ختم ہوئی تو کچھ عرصہ راولپنڈی ہی میں سرکاری اور غیر سرکاری مٹر گشت میں صرف ہوا۔ اس دوران بلوچستان میں آرمی کی پیشہ وارانہ اور اندرونی سلامتی سے متعلق سرگرمیوں کی معمول کی تشہیر کی ذمہ داری بھی ادا کی۔ آئی ایس پی آر میں ''لیفٹیننٹ'' کو ڈیڑھ برس سے زائد عرصہ ہو گیا تھا۔ ایک روز معلوم ہوا کہ مجھے کیپٹن کے رینک پر ترقی کے لیے جی۔ ایچ۔ کیو کے متعلقہ شعبے سے خط کتابت شروع کر دی گئی ہے۔ کیپٹن کا رینک ملتے ہی لاہور یا کوئٹہ میں سے کسی ایک شہر میں تعیناتی کی جائے گی۔ لاہور کا ذکر آتے ہی بے اختیار ''آمین'' زبان پر جاری ہو جاتا تھا۔ قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کوئٹہ کے لئے پہلے میجر محمد غازی الدین کا نام طے شدہ تھا تاہم لاہور کی صحافتی اہمیت کے پیش نظر انہیں لاہور اور مجھے کوئٹہ تعینات کر دیا گیا۔ سب سے اہم ذمہ داری کوئٹہ میں آئی ایس پی آر کا مستقل آفس قائم کرنا تھا۔

اس سے قبل راولپنڈی سے افسر اور دیگر اہلکار عارضی ڈیوٹی پر فرائض ادا کرتے تھے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان کی صوبائی حکومت برطرف کر دی تھی۔ وزیر اعلیٰ عطاء اللہ مینگل سڑک پر تھے اور پورے بلوچستان میں پیپلز پارٹی کے بانی کی نافذ کردہ ''جمہوریت'' کا راج تھا۔ مری اور مینگل قبائل سراپا احتجاج تھے۔ اس مرحلے پر متعدد بلوچ اور پختون رہنماؤں کو گرفتار کر کے مختلف جیلوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اندرونی سلامتی کی بحالی کے لئے پاک فوج کو مناسب اقدامات انجام دینے کی ہدایت کی۔ کراچی کور کا ٹیکٹیکل ہیڈ کوارٹر کوئٹہ منتقل کر دیا گیا۔ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اکبر خان اس آپریشن کی قیادت کر رہے تھے۔

میرے کوئٹہ پہنچتے ہی ابلاغی مصروفیات کا انبار تھا۔ ''نفسیاتی جنگ'' کے دو ماہر افسر بھی ہمارے دفتر سے بالواسطہ منسلک کر دیئے گئے۔ ایک رینک سینئر تھے لہٰذا انہیں بھی ''سر، سر'' کہنا پڑتا تھا۔ بہر حال بلوچستان میں آئی ایس پی آر افسر کی حیثیت سے مری، بگٹی اور مینگل قبائل کے زیر نگیں علاقے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دیکھے اور وہاں کے عوام سے ملنے کے وسیع مواقع حاصل ہوئے۔شاید عام حالات میں یہ سہولت حاصل نہ ہوتی۔فوجی دستے دور دراز علاقوں میں نامساعد حالات کے باوجود سرگرم تھے۔فراریوں اور شورش میں ملوث افراد کی سرکوبی کے ساتھ ساتھ ترقیاتی سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔سڑکیں، سکول، شفاخانے اور تھانے ناپید تھے۔نامساعد حالات کے باوجود فوج کے افسر اور جوان دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔آرمی کی کور آف انجینئرز اور میڈیکل کور نے مثالی لگن اور ایثار کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے۔مری ایریا خاص طور سے دشوار گزار مقامات اور سخت کوش افراد پر مشتمل ہے۔بعض مقامات پر فوجی دستوں اور سول آرمڈ سروسز کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تاہم ریاست سے کون کب تک لڑ سکتا ہے، سیکڑوں کی تعداد میں شورش پسند گرفتار ہوئے۔اکثر ''حالات حاضرہ'' سے قطعاً نابلد اپنے سردار کے ''غلام'' تھے۔جو حکم ملا سر تسلیم خم کر دیا۔میں بھی اپنی ٹیم کے ساتھ ''میدان عمل'' کے قریب قریب ہی تھا۔مری علاقے کا اہم قصبہ ''کوہلو'' بریگیڈ ہیڈ کوارٹر تھا۔بریگیڈیئر محمد عثمان حسن (ستارہ جرات) کمان کر رہے تھے۔بریگیڈیئر میجر (بی ایم) میجر سلیم حیدر اور سٹاف افسر تھری کیپٹن ضرار عظیم تھے۔برسبیل تذکرہ یہ بھی سن لیجیے کہ بعد ازاں میجر سلیم حیدر اور کیپٹن ضرار عظیم دونوں لیفٹیننٹ جنرل کے رینک پر ریٹائر ہوئے۔کمانڈر بریگیڈیئر محمد عثمان حسن ایک دلیر، جفاکش اور پیشہ وارانہ دیانت کے حامل افسر تھے۔میں سب سے جونیئر ''محو حیرت'' ایک چھوٹے سے خیمے میں ''مقید'' تھا۔اکیلا زیادہ دُور جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔کمانڈر جیپ میں علاقے کے دورے پر اپنے ہمراہ لے جاتے تھے۔فوٹوگرافر اور کیمرہ مین اپنا کام کرتے اور مجھے مقامی افراد سے بات چیت کا موقع مل جاتا تھا۔رات گئے بریفنگ کا سیشن گرین ٹی کے ساتھ جاری رہتا تھا۔اب میں نے بھی گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔

بریگیڈیئر کمانڈر کے پاس علاقے کے بارے میں وسیع معلومات تھیں۔مقامی افراد بھی ملنے آتے رہتے تھے۔ایک روز میں نے کمانڈر سے کہا کہ آپ روزانہ ڈائری لکھا کریں۔اردو میں لکھیں تو اور بھی بہتر رہے گا۔کہنے لگے، لکھنا نہیں آتا۔میں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے، آپ ہر ہفتے گھر خط لکھتے ہیں۔انہوں نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا وہ لکھنا بہت ضروری ہے، ورنہ تم سمجھتے ہو۔''میں نے کہا نہیں سر! میں غیر شادی شدہ ہوں''۔یوں بات چیت ختم ہوگئی۔میں نے اٹھتے ہوئے کمانڈر کو تجویز دی کہ سر! مناسب ہوگا کہ اگر آپ روزانہ خط کے انداز میں ڈائری لکھنا شروع کر دیں۔انہیں یہ تجویز پسند آئی۔بریگیڈیئر عثمان حسن نے تقریباً روزانہ واقعات قلمبند کرنا شروع کر دیے۔آپریشن مکمل ہونے کے بعد یہ ڈائری ایک کتاب بعنوان ''بلوچستان۔ماضی، حال اور مستقبل''

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کراچی سے شائع ہوئی۔اس کتاب کو خاصی پذیرائی ملی۔اخبارات اور جرائد میں تبصرے بھی شائع ہوئے۔اکثر مبصرین کے نزدیک اس کتاب کی بدولت بلوچستان کے ''شورش زدہ'' علاقوں کے حالات اور واقعات سے براہ راست آگاہی ہوئی۔کمانڈر کی ڈائری لکھنے کے اوقات غیر متوقع ہوتے تھے۔شاعر کی مانند جب مصرع ذہن میں آیا لکھنے بیٹھ گئے۔یہ صورتحال آپریشن میں سرگرم بریگیڈ کے سٹاف آفیسر کے لئے ناقابل قبول تھی۔میجر سلیم حیدر اور کیپٹن ضرار عظیم تمام تر شفقت اور ملنسار رویے کے باوجود کبھی کبھار مجھ پر ناراض ہوجاتے کہ تم نے کمانڈر کو کس کام پر لگا دیا ہے۔اچانک ایک رجسٹر کھول کر لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔اور ہم فائل پر دستخط کے انتظار میں سوکھ رہے ہوتے ہیں۔میرا اپنے سینئرز کو ایک ہی جواب تھا کہ سر! تاریخ مرتب ہو رہی ہے۔اطمینان رکھیں۔

یاد آیا! بریگیڈیئر عثمان حسن ریٹائر ہونے کے بعد بلوچستان میں صوبائی سیکرٹری کے عہدہ پر بھی تعینات رہے اور انہوں نے مزید دو کتب بھی مرتب کیں۔ بلوچستان کے مسائل، ترقیاتی منصوبہ بندی اور دیگر معاملات پر انہیں خاصا عبور تھا۔دراصل بلوچستان کا شاید ہی کوئی علاقہ ایسا ہو جسے انہوں نے بچشم خود ملاحظہ نہ کیا ہو۔یہ معلومات وفاق کے لیے بہت بڑا اثاثہ تھیں۔مری ایریا میں حالات بہتر ہوئے تو مَیں دوبارہ کوئٹہ واپس آ گیا۔اس دوران ہفت روزہ ''ہلال'' راولپنڈی میں ''بلوچستان نامہ'' اور ''براستہ بلوچستان'' کے عنوان سے متعدد مضامین تحریر کیے۔

اکتوبر 1975ء میں والدین نے مجھے لاہور طلب فرمایا۔ چندروز کے بعد اپنی بارات کے ساتھ لطیف آباد نمبر 3 حیدرآباد کی جانب گامزن تھا۔میری اہلیہ والدہ گرامی کے بڑے بھائی کی دختر نیک اختر ہیں۔اہلیہ کے ایک بھائی طویل عرصہ تک مینٹل ہسپتال حیدرآباد (المشہور پاگل خانہ گرو بندر) میں میڈیکل افسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ہم بھی بچپن اور لڑکپن میں تعطیلات گزارنے ''گرو بندر'' آیا کرتے تھے جہاں ڈاکٹر صاحب کے بنگلے کے اردگرد وسیع و عریض میدان کھیل کود کے لئے موزوں تھے۔ڈاکٹرز کالونی سے آگے وارڈز تھے جہاں ذہنی امراض میں مبتلا افراد کو بیماری کی سنگینی کے مطابق مختلف وارڈز میں رکھا گیا تھا۔ایک وی آئی پی وارڈ بھی تھا۔یہ اعلیٰ خاندانوں اور بااثر افراد کے لئے مخصوص تھا۔ہمیں یاد ہے کہ ایک بھاری بھرکم شخصیت دس پندرہ افراد کے جلو میں چہل قدمی کرتے ہوئے دکھائی دیتی تھی۔ہم نے بھائی ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک پیر صاحب ہیں۔نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ پاگل خانے میں زیر علاج ہیں۔مریدن میں ''زیارت'' کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔میری اہلیہ کے ایک اور بڑے بھائی نے نیشنل ہسپتال لطیف آباد نمبر 3 کے قریب ہی گھر خرید لیا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تھا۔ میری بارات اسی گھر میں گئی۔ لاہور واپسی ٹرین ہی سے تھی۔ شادی کے لئے بمشکل پندرہ روز کی چھٹی ملی تھی۔ یہ دن شادی کے شور شرابے ہی میں گزر گئے۔ اس افراتفری میں کوئٹہ واپسی اور وہاں سے دو روز کے وقفے کے بعد دوبارہ اندرونی سلامتی کے فرائض انجام دینے والے فوجی دستوں کے ساتھ اگلے مورچوں پر خبر اور تصویر کے لئے سرگرداں ہو گئے۔ عجب صورتحال کا سامنا تھا۔ ایک سیاستدان کے فیصلے کے مطابق قومی فوج اور دوسرے سیاستدان کے حکم پر ''شورش پسندوں'' نے ایک دوسرے کو نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ پاکستان کی جغرافیائی حدود میں برپا تھا۔ دکھ کی بات ہے کہ گرفتار ہونے والے پچانوے فیصد شورش پسند ارد گرد کے ماحول ہی سے بے خبر تھے۔ سردار ہی ان کے لیے زمین و آسمان تھا۔ بلوچستان کے یہ علاقے اگر پاکستان میں شامل تھے تو انہیں ترقی کے ان ثمرات سے بہرہ مند ہونا چاہیے تھا جس سے دیگر علاقے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ بدقسمتی سے اس حوالے سے سیاسی عزم ناپید نظر آیا۔ مقامی سیاسی قائدین ایک دوسرے کے درپے تھے۔ مری اور مینگل علاقے میں آپریشن شروع ہوا تو نواب اکبر بگٹی نے بھٹو صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے تمام اقدامات کی حمایت کر دی۔ مجھے یاد ہے کہ فوجی آپریشن کے حق میں اکبر بگٹی صاحب نے کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ میں ولولہ انگیز خطاب کیا۔ بھٹو صاحب ہر لحاظ سے بلاشرکت غیرے پاکستان کے حکمران تھے۔ پیپلز پارٹی ذاتی جماعت تھی جس میں کسی کو اختلاف رائے کی جرات نہیں تھی۔ رہی سہی کسر جنرل ٹکا خان کی تعیناتی نے مکمل کر دی تھی۔ بھٹو صاحب نے پاک آرمی کے آخری کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کو ''غیر روایتی'' انداز میں رخصت کر کے جنرل ٹکا خان کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کر دیا تھا۔ موصوف اس سے قبل مشرقی پاکستان میں بھٹو صاحب کے ''سیاسی عزم'' کی ''عسکری انداز'' میں تکمیل کر چکے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جنرل ٹکا خان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ راولپنڈی سے الیکشن لڑا اور ناکام ہوئے۔ پارٹی کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔ فوج کے سابق سربراہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے موچی دروازہ لاہور کے باہر پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے درمیان ''حواس باختہ'' دیکھا۔

جنرل ٹکا خان کی ریٹائرمنٹ کے دن قریب آ رہے تھے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ایک اور ٹکا خان کی تلاش درپیش تھی۔ اس حوالے سے چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ کئی نام گردش میں تھے تاہم ویٹو بھٹو صاحب کے پاس تھا۔ چند روز شش و پنج میں گزرے۔ ایک دن کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اکبر خان اور دیگر افسران ڈنر کے بعد ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف تھے۔ کور کمانڈر نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ہاں بھائی، پی آر او، پریس کی کیا خبر ہے؟'' میں نے بے ساختہ جواب دیا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کہ ''سر! دعا کریں نیا آرمی چیف فوج ہی سے ہو''۔اس بات پر خاموشی چھائی گئی۔ پھر ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔ ''کیا مطلب؟'' کئی آوازیں آئیں؟۔ میں نے کہا: ''بھٹو صاحب سے غیر معمولی فیصلہ متوقع ہے۔ وہ خود آرمی چیف بن کر کور کمانڈرز کے ذریعے فوج کو پیشہ وارانہ طور سے مصروف رکھ سکتے ہیں''۔ سب نے میری بات کو قہقہوں میں اڑا دیا۔

جنگ 1971ء کے بعد فوج کے بارے میں پیپلز پارٹی کی جانب سے نازیبا پروپیگنڈے کا سلسلہ جاری تھا۔ جنرل ٹکا خان نے اس رویے کو نظر انداز کئے رکھا۔ مشرقی پاکستان کے حوالے سے بے سروپا باتیں ''فیڈ'' کی جارہی تھیں۔ دراصل بھٹو صاحب کی حکمت عملی یہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں ہزیمت کا تمام تر بوجھ فوج ہی پر رہے اور جذباتی قوم کے سامنے پلٹن میدان میں سرنڈر کی تصاویر اور فلمیں پیش کر کر کے سیاسی رہنماؤں کے براہ راست ملوث ہونے کو اذہان سے نکال دیا جائے۔

بہر حال ایک روز کور کمانڈر ملتان لیفٹیننٹ جنرل محمد ضیاء الحق کی جنرل ٹکا خان کے بعد آرمی چیف مقرر ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ بھٹو صاحب نے تقریباً آٹھ لیفٹیننٹ جنرلز کو نظر انداز کر کے جنرل ضیاء الحق کو اس اہم عسکری منصب کے لئے منتخب کر لیا۔ کوئٹہ کے ''کور ٹیکٹیکل ہیڈ کوارٹرز'' میں سناٹا تھا۔ تقرر غیر متوقع تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد اکبر خان کو آرمی چیف تعینات ہونے کی بہت امید تھی۔ شاید انہیں جنرل ٹکا خان نے بھی امید دلائی تھی۔ اس وقت کے کور کمانڈر پشاور لیفٹیننٹ جنرل عبدالمجید ملک نے ریٹائرمنٹ کے بعد لکھی گئی کتاب ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' میں نئے آرمی چیف کے تقرر کے بارے میں ذاتی معلومات درج کی ہیں۔ ان کے مطابق وزیر اعظم بھٹو نے متعدد بار کہا کہ وہ انہیں آرمی چیف بنانا چاہتے ہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل عبدالمجید ملک رقمطراز ہیں کہ انہیں بھی لیفٹیننٹ جنرل محمد ضیاء الحق کی ترقی اور تقرر پر حیرت ہوئی۔ نئے آرمی چیف کے تقرر کے اعلان کے بعد لیفٹیننٹ جنرل محمد اکبر خان نے فوری طور پر ریٹائرمنٹ کے لئے درخواست دے دی جو منظور کر لی گئی۔ کور میں الوداعی تقریب ہوئی۔ ایک ہیلی کاپٹر میں رخصت ہونے والے کور کمانڈر اپنے زیر کمان افسروں اور جوانوں کو ''خدا حافظ'' کہنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں بھی اپنی ٹیم کے ہمراہ موجود تھا۔ روایتی تقاریر میں نئے آرمی چیف کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے لیفٹیننٹ جنرل محمد اکبر خان کراچی واپس پہنچ گئے جہاں اختتامی الوداعی تقریب کا اہتمام تھا۔ قائمقام کور کمانڈر میجر جنرل جہانزیب ارباب کو مقرر کر دیا گیا۔

جنرل ہیڈ کوارٹرز میں آرمی چیف کا منصب سنبھالنے کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق پہلے دورے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پر کوئٹہ تشریف لائے۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اٹک قلعے میں فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کے سربراہ میجر جنرل محمد ضیاء الحق کے ذہن میں لیفٹیننٹ صولت رضا کی پہچان موجود ہے۔ کوئٹہ ایرپورٹ پر تازہ دم آرمی چیف جہاز سے اترے، سینئر آرمی افسروں کی استقبالیہ قطار جہاز کی سیڑھیوں کے ساتھ موجود تھی۔ ڈیوٹی پر موجود جونیئر افسر ایک فاصلے پر کھڑے تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق سینئر افسروں سے مصافحہ کر کے جونہی فارغ ہوئے تو ان کی نظر جونیئر افسروں کی جانب اٹھی اور مجھے فاصلے سے ہی پہچان لیا۔ ''صولت صاحب، آپ کہاں؟'' یہ آواز غیر متوقع تھی۔ قائمقام کور کمانڈر نے کہا کہ سر! یہ میرا پی آر او ہے۔ آئی ایس پی آر افسر ہے۔ اب جنرل ضیاء الحق کی باری تھی، انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اٹک قلعے کی یادیں تازہ کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے اپنے سٹاف افسر سے کہا کہ ''بلوچستان میں قیام کے دوران کچھ وقت صولت صاحب کے لیے رکھنا ہے۔ میں نے گپ شپ کرنی ہے''۔ آرمی چیف کے یہ ارشادات میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئے۔ دفتر پہنچا تو دو تین صاحبان میرے دفتر کی تزئین و آرائش کے غم میں مبتلا تھے۔ یہ دفتر ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے سب سے زیادہ ''نظر انداز'' حصے میں واقع تھا۔ جس کے ایک حصے میں بلیک اینڈ وائٹ تصاویر بنانے کے لیے ڈارک روم بھی تھا۔ چند گھنٹوں میں نیا قالین، فرنیچر، رنگ اور روغن اور معلوم نہیں کیا کیا گیا۔ دیواروں پر جہاں مستقل داغ دھبے تھے وہاں پر وال پیپرز چسپاں کر دیئے گئے۔ معاملہ کیا ہے؟ ایک جوان نے بتایا کہ سر! نئے آرمی چیف آپ کے دفتر میں آ رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ چیف کا ملاقات کا حکم دفتر کے دورے کی افواہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

راولپنڈی آفس سے بھی کالز موصول ہو رہی تھیں۔ سب پوچھ رہے تھے کہ آرمی چیف نے اور کیا بات کی۔ شروع سے بتاؤ؟ کیا ہوا، وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ ''عزت سادات'' بحال ہو گئی۔ بلوچستان کے حوالے سے واقعات بہت ہیں۔ آرمی چیف کی تبدیلی کے باوجود آپریشن کی کیفیت برقرار تھی۔ کوئٹہ میں خاص سرگرمی نہیں تھی۔ البتہ رات آٹھ اور نو بجے کے درمیانی حصے میں ایک دو مرتبہ بم دھما کہ ضروری ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ مشکوک افراد پکڑے بھی گئے لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ بلوچ رہنما اس کارستانی کی ذمہ داری افغانستان سے آنے والے ''غیر پاکستانی'' عناصر پر ڈالتے تھے۔ اس کے برعکس پختون قائدین کا اصرار تھا کہ بلوچ قوم پرست ہیں جو پہاڑوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ کوئٹہ میں ایک خاموش قبیلہ ہزارہ قوم کا بھی ہے جو اپنے مخصوص رسم و رواج اور نسلی شناخت کے باعث ایک الگ تھلگ مقام رکھتا ہے۔ یہ میں اپنے زمانے 70 ویں اور 80 ویں دہائی کی بات کر رہا ہوں۔ اب تو حالات بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔ میرے نزدیک کراچی کے بعد

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کوئٹہ سب سے زیادہ کثیرنسلی شہر ہے۔کم از کم دس مختلف نسلی پس منظر کے حامل خاندان برسوں سے مقیم ہیں۔سیاسی میدان میں مقابلہ بھی بلوچ اور پختون مفادات کی رسہ کشی ہے۔البتہ فلاحی اقدامات کے ہونے یا نہ ہونے سے ہرنسل کا فرداور خاندان متاثر ہوتا ہے۔

ایک اور واقعہ جو ذہن سے کبھی محو نہ ہوسکا وہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹواور جنرل محمد ضیاءالحق کے مابین کوئٹہ کی ایک آفیسر میس میں دلچسپ مکالمہ تھا۔بھٹوصاحب بلوچستان کے دورے پر تھے۔ آرمی چیف جنرل محمد ضیاءالحق اور چیف آف جنرل سٹاف جنرل عبداللہ ملک بھی ان کے ہمراہ تھے۔ میس میں لنچ تھا جس میں گریژن کے کچھ اورافسر بھی تھے۔بھٹوصاحب اپنے مخصوص انداز میں تشریف لائے۔نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر جنرل (ر) ٹکا خان بھی ہمراہ تھے۔ابھی لنچ کی باضابطہ کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی۔جوان افسر بھٹوصاحب کے گرد گھیرا ڈالے ان کی قادرالکلامی سے مستفید ہورہے تھے کہ بھٹوصاحب کے آبدار نے ''مشروب مغرب'' سے بھرا گلاس ان کی خدمت میں پیش کیا۔انہوں نے اردگرد دیکھا، ہرطرف خاموشی تھی۔کسی نے آواز لگائی کہ آرمی میس میں ''نوش جاں'' کرنے پر پابندی ہے۔''کس نے لگائی ہے؟'' بھٹوصاحب کی گرج سنائی دی۔''ویئر اِز ضیاء؟''۔ضیاء کہاں ہے؟۔جنرل محمد ضیاءالحق کچھ فاصلے پر مہمانوں کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔انہیں اطلاع دی گئی کہ وزیراعظم یادفرمارہے ہیں۔وہ فوراً حاضر ہوگئے۔جی سر! بھٹوصاحب نے پابندی کے بارے میں دریافت کیا تو بولے کہ میس میں ''نوش جاں'' کرنے پر پابندی جنرل ٹکا خان کے دور سے ہے۔بھٹوصاحب نے اپنا گلاس لہراتے ہوئے کہا:''میں تو پی رہا ہوں''۔اس موقع پر جنرل ضیاءالحق نے وزیراعظم کو تاریخی جملہ کہا کہ'' Sir!You are above the law''(جناب آپ قانون سے بالاتر ہیں۔) یہ جملہ سن کر بھٹوصاحب پھولے نہیں سمارہے تھے، سب نے قہقہہ لگایااور بات آئی گئی ہوگئی۔

بڑے عہدوں پر متمکن شخصیات کی گفتگو، بدنی بولی اورنشست وبرخاست میں خیراورشر کے پہلوموجود رہتے ہیں۔دیکھنے اور سننے والوں کیلئے نصیحت، وصیت اورعبرت کا سامان ہوتے ہیں۔ کاش بروقت غور کرلیا جائے! کوئٹہ میں سلسلہ ہائے روز وشب میں اتار چڑھاؤ معمول تھا۔سردیاں خاص طور سے کڑاامتحان تھیں۔کوئٹہ قدرتی گیس سے محروم تھا۔لہذا پتھر کوئلہ سے کام چل رہا تھا۔ سیاسی سطح پر کوئی خاص ہلچل نہیں تھی کہ اچانک سات جنوری 1977ءکووزیراعظم بھٹو نے اعلان کیا کہ سات مارچ 77ءکو عام انتخابات ہوں گے۔دس مارچ 77ءکو قومی اسمبلی تحلیل کر دی گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی مخالف جماعتوں نے مولانا مفتی محمود کی قیادت میں نو جماعتوں نے انتخابی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اتحاد قائم کر لیا اور ''ہل'' کے انتخابی نشان کے ساتھ حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ پیپلز پارٹی کا نشان حسب سابق تلوار تھا۔ وطن عزیز میں ایک بار پھر معرکہ حق و باطل بر پا ہوا۔ سات مارچ 77ء کو انتخابات منعقد ہوئے۔ سرکاری اعلان کے مطابق پاکستان پیپلز پارٹی نے 155 اور پاکستان قومی اتحاد نے 35 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ کل نشستیں 200 تھیں۔ پاکستان قومی اتحاد نے نتائج تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بھٹو حکومت کے خلاف ملک گیر تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ کوئٹہ اور بلوچستان کے دیگر شہروں، قصبات وغیرہ میں بھی جلسے جلوس اور ریلیاں نکلنے لگیں۔ ان علاقوں میں جمعیت علمائے اسلام کے رہنما اور کارکن زیادہ سرگرم تھے۔ کوئٹہ میں بھی قومی اتحاد کے جلوس نکلتے، کبھی کبھار پختون اور بلوچ رہنما بھی جناح روڈ پر نعرہ بازی کرتے دکھائی دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ پانچ جولائی 1977ء کو سارے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ بھٹو صاحب اور دیگر سیاسی رہنماؤں کو حراست میں لے کر نظر بند کر دیا گیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ فضل الٰہی چودھری بدستور صدر پاکستان کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے دباؤ کے باوجود صدارت سے استعفیٰ نہ دیا۔

بلوچستان مارشل لاء زون ڈی تھا۔ پہلے میجر جنرل ایس ایم اے عباسی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ مجھے زون ڈی کے پی آر او کے فرائض انجام دینے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ میجر جنرل عباسی سخت گیر اور کم گو کمانڈر تھے۔ معمول کے مطابق پریس ریلیز کی منظوری خود کو کٹہرے میں کھڑا رکھنے کے مترادف تھی۔ انہیں متن سے زیادہ ٹائپنگ کے معیار اور فائل کے رنگ وغیرہ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ عسکری امور کی انجام دہی کے معاملے میں بے پناہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ ان کا فوج میں بہت احترام تھا۔ بہاولپور کے شاہی خاندان سے تعلق کے باعث مخصوص مزاج رکھتے تھے۔ میجر جنرل عباسی جلد ہی مارشل لاء کی ڈیوٹی سے سبکدوش ہو گئے اور میجر جنرل عبداللہ سعید کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون ڈی مقرر کیا گیا۔ وہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے کمانڈنٹ بھی رہ چکے تھے۔ یہ ہماری کیڈٹ شپ کا دور تھا۔ لہٰذا جب پہلی ملاقات میں انہیں معلوم ہوا کہ میں ان کے دور میں کیڈٹ رہا ہوں تو ''پلیز سٹ ڈاؤن'' کہہ کر پی ایم اے کی یادیں تازہ کرنے لگے۔ میری کتاب ''کاکولیات'' کا پہلا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا لیکن ابھی میجر جنرل عبداللہ سعید کے علم میں نہیں تھا۔ ''کاکولیات'' کی اعزازی کاپی پیش کی۔ بہت خوش ہوئے اور یوں زون ڈی کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ساتھ ربط باہمی استوار ہو گیا جو کسی بھی پریس رابطہ افسر کے لئے لازم ہے کہ وہ سب سے سینئر شخصیت کا مزاج آشنا ہو اور ان کے اہداف کو بھرپور انداز میں سمجھ بھی سکے تاکہ متعلقہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ناظرین، سامعین اور قارئین تک بیانیہ پہنچ سکے۔

کاکولیات کا ذکر آیا تو ہفت روزہ ہلال کا ذکر ضروری ہے۔ یونٹ میں قیام کے دوران صرف ایک مضمون ''سلیوٹ'' ہلال میں شائع ہوا تھا۔ آئی ایس پی آر میں تعیناتی کے بعد ہفت روزہ ہلال کے آفس میں موقع ملتے ہی ''تحصیل شعور و آگہی'' کے لئے مصروف ہو جاتا تھا۔ اکرام قمر صاحب ایڈیٹر تھے اور محمد یونس صاحب ڈپٹی ایڈیٹر تھے۔ ادارتی عملے میں رشید اختر صاحب اور محمد افضل تحسین سرگرم تھے۔ میں نے ''روٹ مارچ'' کے عنوان سے پی ایم اے میں گزرے ایام کو یاد کیا اور تین اقساط میں ایک تربیتی مشق کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ اکرام قمر صاحب کی خدمت میں مسودہ پیش کیا۔ انہوں نے اصلاح کے بعد اسے شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ اکرام قمر صاحب بے پناہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ انہیں ادب، صحافت اور نثر نگاری پر مکمل عبور تھا۔ الفاظ کے پس منظر سے بھی آگاہ تھے۔ تلفظ کے معاملے میں بھی حساس تھے۔ ٹیلی فون پر اگر کوئی ''ہلال'' کے بجائے ''حلال'' کا دفتر کہتا تو معذرت غلط نمبر کہہ کر فون بند کر دیتے تھے۔ ان کی شخصیت کا چند سطور میں احاطہ ممکن نہیں۔ ''کاکولیات'' کو منطقی انجام تک پہنچانے میں اکرام قمر صاحب کا ہاتھ ہے۔ پی ایم اے کے بارے میں میرے مضامین قسط وار شائع ہو رہے تھے۔ اگر تاخیر ہو جاتی تو برساتی چھتری ہاتھ میں لیتے، مجھے آئی ایس پی آر کے دفتر میں تلاش کر کے جلی کٹی سناتے۔ ان کا اصرار تھا کہ پی ایم اے کیڈٹ کے بارے میں پہلی مرتبہ ''مشق سخن'' جاری ہے، اسے منقطع نہیں ہونا چاہیے۔ جلد از جلد مکمل کر و تا کہ کتاب شائع کی جائے۔ ''کاکولیات'' کے باعث فوج اور ادبی حلقوں سے بھی حوصلہ افزائی کے اشارے ملے۔ آرمی میں کمیشن کے خواہشمند نوجوانوں کی دلچسپی خوش آئند تھی۔ مداحوں کے خطوط اور ٹیلی فون وغیرہ سے بہت مسرت محسوس ہوتی تھی۔

بلوچستان میں میجر جنرل عبداللہ سعید کی زیر کمان امن و امان کی بحالی، ترقیاتی سرگرمیاں اور مارشل لاء ضوابط کے تحت ملٹری کورٹس کے فیصلوں کی تشہیر میں دن رات صرف ہو رہے تھے۔ کبھی کبھار منفی صورتحال پر قابو پانے کے لیے شب بیداری کی نوبت بھی آ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ کوئٹہ کے سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (بریگیڈیئر) کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے کوئٹہ کے ''مخصوص بازار'' پر پولیس وغیرہ کے ذریعے چھاپہ مارا اور وہاں مصروف تمام مرد و عورتوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اگلے روز مجھے حکم دیا گیا کہ ایک اہم کارروائی کی گئی ہے۔ اس کی بھرپور تشہیر ہونی چاہیے۔ جنرل ضیاء الحق کے حوالے سے اسلام پسندی کی رَو چل پڑی تھی۔ ہر چھوٹا بڑا سرکاری افسر اور اہلکار ایسا عمل بجا لانے کے لیے کوشاں رہتا تھا کہ جس کی انجام دہی کے بعد اس کی ''اسلام پسندی'' کا شہرہ ہو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جائے۔ کوئٹہ کے سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دفتر پہنچا تو گراؤنڈ میں پچاس ساٹھ عورتیں منہ چھپائے بیٹھی تھیں، معلوم ہوا کہ ان کے ہمراہ گرفتار مرد جیل بھیج دیے گئے ہیں۔ البتہ بریگیڈیئر صاحب گرفتار خواتین کو موجودہ زندگی ترک کر کے نیک راہ اپنانے کی تلقین کریں گے۔ قبل اس کے کہ میں کچھ عرض کرتا۔ موصوف آفس سے باہر آ گئے اور انہوں نے دینی احکامات بیان کرنے شروع کر دیئے۔ خواتین سر جھکائے خاموشی سے سن رہی تھیں۔ بریگیڈیئر صاحب نے تقریر کا اختتام اس بات پر کیا کہ آپ سب کو موجود سلسلہ ترک کر کے شادیاں کرنی چاہئیں۔ یہ بات کہنے کی دیر تھی کہ ایک بلند قامت خاتون جو قائدانہ صلاحیتوں سے مالا مال تھی۔ بریگیڈیر صاحب کو اپنی جانب متوجہ کر کے کہنے لگی کہ ''آپ نے بہت اچھی باتیں کی ہیں۔ واقعی ہم سب کو شریفانہ زندگی گزارنی چاہیے۔ سب سے اچھی تجویز شادی کی ہے۔ کاش گھومنے پھرنے والے مردوں میں سے کوئی ہم سے شادی بھی کر لے تو سارا مسئلہ حل ہو جائے۔ شادی ایک نیک عمل ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس نیکی کا آغاز میرے ساتھ شادی سے کریں اور اپنے ماتحتوں کو حکم دیں کہ وہ بھی زمین پر بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے کسی ایک سے شادی کر لے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ آپ کو دوبارہ ہمارے بازار میں پولیس بھیجنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی''۔

خاتون کی تقریر ختم ہوئی۔ چند لمحے سناٹا رہا۔ اب سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے جواب دینا تھا۔ وہ صرف یہ کہہ کر آفس میں چلے گئے کہ ''ان سب کو جیل بھجوا دیا جائے''۔ میں نے مارشل لاء ہیڈ کوارٹر زون ڈی میں اعلیٰ افسران کو ساری روداد سنائی۔ بات میجر جنرل عبداللہ سعید تک بھی پہنچی۔ ان کا حکم تھا کہ یہ روداد کسی اخبار میں نہیں آنی چاہیے۔ انہوں نے آئندہ کے لیے فلاحی، اصلاحی اور تبلیغی اقدامات کے لیے رہنما کمیٹی بنادی تاکہ انفرادی نوعیت کی کارروائیوں کی روک تھام کی جا سکے۔

بلوچستان میں آئی ایس پی آر افسر کی حیثیت سے چار برس سے زائد عرصہ قیام کیا۔ زیادہ وقت کوئٹہ میں ہی گزرتا رہا تھا۔ اندرون بلوچستان کے شہر، قصبے اور دیہات بھی قریب سے دیکھے۔ خاص طور سے لوگوں کے مسائل اور درپیش مشکلات سے آگہی ہوتی۔ کچھ ہی عرصے میں وسیع حلقہ احباب جن میں زیادہ تر صحافی، ادیب اور اساتذہ شامل تھے ذہنی اور سماجی پذیرائی کے لیے ترتیب پا چکا تھا۔ جناح روڈ پر بک لینڈ کتابوں کی مشہور دکان میں سلیم بخاری صاحب کی صورت میں برادرانہ ماحول میسر تھا۔ ساتھ زیدی فوٹو گرافر خوش آمدید کہنے کے لیے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ زیدی صاحب مدت تک کوئٹہ میں آئی ایس پی آر کے لیے بھی پیشہ وارانہ خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد میں میرے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اصرار پر مستقل سرکاری فوٹو گرافر تعینات کر دیے گئے۔ کوئٹہ سے واپس روالپنڈی پوسٹنگ کے احکامات موصول ہوئے تو چند روز طبیعت ملول رہی۔ اس شہر سے ہماری بے پناہ خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ ذاتی اور سرکاری لحاظ سے گرم سرد حالات سے گزرنا ہوا۔ کبھی کبھار پانی میں ڈبکی بھی لگی، یہ سب زندگی کے حصے ہیں۔ اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ کوئٹہ میں بسر کئے شب و روز آج بھی تنہائی میں گدگداتے ہیں۔ اس شہر میں ہی ہماری بیچلر لائف کا خاتمہ ہوا۔ شادی شدہ افسر کی حیثیت سے سرکاری فرائض کی انجام دہی ایک علیحدہ "واردات" ہے۔ زندگی میں اچانک ایک ایسی شخصیت سے احکامات موصول ہونا شروع ہو جاتے ہیں جہاں حکم عدولی کی گنجائش نہیں۔ سرکار احکامات پر عمل درآمد کے عوض تنخواہ دیتی ہے جبکہ گھر کی حکومت کو تنخواہ دے کر احکامات وصول کرتے ہیں۔ میرے بعد آئی ایس پی آر کوئٹہ میں میجر بشیر کیانی تعینات کیے گئے۔ انہیں ریڈیو جرنلزم کا وسیع تجربہ تھا۔ ایم اے صحافت پنجاب یونیورسٹی ہی سے کیا تھا۔ ہم سے پہلے فارغ التحصیل ہوئے تھے۔

آئی ایس پی آر ڈائریکٹوریٹ پہنچتے ہی معمول کے فرائض کی ادائیگی شروع ہو گئی۔ بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی سربراہ تھے۔ یہ آئی ایس پی آر میں کیپٹن کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے۔ اس سے قبل "پاکستان ٹائمز" میں خدمات انجام دیں۔ یوں آئی ایس پی آر کو کچھ "وقفے" کے بعد ایک ایسا سربراہ میسر آ گیا تھا جو تعلقات عامہ، انگریزی اردو جرنلزم اور ابلاغ کے شعبے کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ صحافت کی دنیا کے بڑے چھوٹے "تفضّل بھائی" کہتے نہیں تھکتے تھے۔ بریگیڈیئر صدیقی جونیئرز کے لیے معلم کا درجہ رکھتے تھے، ہم سے ہمیشہ ایک مشفق استاد کی مانند برتاؤ کیا۔ انہیں آئی ایس پی آر کی عمارت، دفاتر، گاڑیوں وغیرہ سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے ان کے دور میں کبھی وسیع پیمانے پر دفاتر کی مرمت وغیرہ ہوتے نہیں دیکھی تھی۔ انہیں ورثے میں جو سٹاف کار ملی اسی پر ہی اپنی سروس مکمل کی۔ دفتر کے قریب ہی ایک آفیسرز میس میں قیام پذیر تھے۔ رینک کے لحاظ سے پروٹوکول کے عادی نہیں تھے۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو شاید فوٹو گرافر یا کیمرہ مین کی موٹر سائیکل پر بیٹھنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ یہ ہم ایسے جونیئر کیپٹن انہیں دن میں ایک دو مرتبہ بریگیڈیئر ہونے کا احساس دلاتے تھے۔ واقعات کی ایک طویل فہرست ہے۔ تاہم چند ایک کا ذکر ہی مناسب ہوگا۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ابلاغی محاذ کافی حد تک آئی ایس پی آر کے حوالے کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد میجر جنرل مجیب الرحمٰن سیکرٹری اطلاعات مقرر ہوئے تو ہم پر کارکردگی کا دباؤ کم ہو گیا۔ کرنل صدیق سالک (بعد میں بریگیڈیئر) ان کے پریس سیکرٹری تھے، یوں آئی ایس پی آر کی ایک اور بلند قامت شخصیت کی خدمات بھی جنرل محمد ضیاء الحق کو حاصل تھیں۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہمارے دفتر سے روزانہ پریس سمری جایا کرتی تھی۔اس میں اخبارات، الیکٹرانک میڈیا، جرائد وغیرہ سے اہم مضامین، خبریں اور دیگر معلومات درج ہوتی تھیں۔ جنرل محمد ضیاءالحق ذاتی طور پر بھی اہم اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے۔اداریے اور کالم بھی پڑھتے تھے۔ یہ صورتحال سمری تیار کرنے والے عملے کے لیے ''پریشان کن'' تھی کہ کہیں اہم کالم، اداریہ یا خبر سمری سے رہ نہ جائے۔جنرل محمد ضیاءالحق کبھی کبھار اس جانب اشارہ کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ جنرل محمد ضیاءالحق کے صف اول کے تمام مدیروں، صحافیوں اور ادیبوں سے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔اس ربط باہمی میں بھی بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کا اہم کردار تھا۔ مارشل لاء حکومت کے باوجود ''فرینڈلی پریس'' کی موجودگی سے ہمارا کام نسبتاً آسان تھا۔راولپنڈی میں قیام کے دوران 23 مارچ کو منعقد ہونے والی پاک افواج کی مشترکہ پریڈ اہم ترین ایونٹ تھا۔راولپنڈی ریس کورس گراؤنڈ میں یہ شاندار تقریب منعقد ہوتی تھی۔آئی ایس پی آر کی براہ راست ذمہ داری پریڈ گراؤنڈ، پی ٹی وی اور ریڈیو پاکستان کے ذریعے رواں تبصرے (کمنٹری) کا انتظام تھا۔ بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کی نگرانی میں یہ ڈیوٹی ''دوآتشہ'' تھی۔ایک ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کو کمنٹری کے مندرجات سے مطمئن رکھنا، انہیں ''آل اوکے'' سن کر یہ اطمینان ہوتا تھا۔گراؤنڈ میں پریڈ کمانڈر کے اپنے احکامات تھے۔ان پر عمل درآمد کے سوا چارہ نہیں تھا۔کیپٹن کی حیثیت سے دو مرتبہ کمنٹری کی ذمہ داری میں ہاتھ بٹانے کا موقع ملا۔پی ٹی وی کے اظہر لودھی صاحب اور خالد حمید صاحب کہنہ مشق اور ہر دم تیار ایسی خصوصیات کے حامل تھے۔ صبح شام ریہرسل جاری تھی۔فوجی دستوں کی پریڈ کے ساتھ کمنٹری باکس سے بھی آنکھوں دیکھا حال سنایا جاتا تھا۔ہمارا اصل امتحان فائنل ریہرسل تھی جس کے اختتام پر کمنٹری کے بارے میں منفی تبصرے سن کر ہشاش بشاش دفتر واپس آنا بھی فرائض میں شامل تھا۔ دراصل بریگیڈیئر صدیقی ناموافق حالات میں بھی مطمئن رہتے تھے۔23 مارچ پریڈ کے بعد جنرل محمد ضیاءالحق کمنٹری ٹیم کو آرمی ہاؤس مدعو کرتے تھے اور یہ ملاقات پریڈ کے فوراً بعد طے تھی۔ایک مرتبہ اظہر حمید لودھی، خالد حمید اور بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کے ہمراہ آرمی ہاؤس کے برآمدے میں انتظار کر رہا تھا کہ جنرل محمد ضیاءالحق برآمدہ ہی میں آ گئے۔ بید کی کرسیاں تھیں اور سامنے میز پر سیون اپ کی بوتلیں رکھ دی گئیں۔جنرل محمد ضیاءالحق نے ابھی پریڈ کی یونیفارم تبدیل نہیں کی تھی۔شاندار پریڈ کے بعد بہت خوش نظر آ رہے تھے۔انہوں نے اظہر لودھی اور خالد حمید کی بھی خوب تعریف کی۔

بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کو بھی شاباش دی اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے: ''یہ بتایئے کہ سب سے اچھی پریڈ کس دستے نے کی تھی؟'' میری رائے سے قبل ہی پنجاب رجمنٹ، فضائیہ اور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آرمرڈ کور، بحریہ وغیرہ کے نام بلند ہونے لگے۔ اس حوالے سے بحث میں سیون اپ کا وقفہ آیا تو میں نے ''بوائے سکاؤٹس'' کے دستے کی تعریف کی۔ جنرل محمد ضیاء الحق کہنے لگے ''وہ کیسے؟'' میرا جواب تھا کہ سر! بوائے اسکاؤٹس کسی آرمی فارمیشن سے نہیں ہیں۔ سکولز کے طالب علم ہیں۔ آپ نے ان کا سلامی دیتے ہوئے جوش وخروش دیکھا ہوگا۔ میرے خیال میں ان کی سب سے زیادہ حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ کل انہیں پریڈ میں شامل دیگر دستوں کے ساتھ کھانے پر مدعو نہیں کیا گیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے فوراً اپنے اے ڈی سی کو طلب کیا اور اس حوالے سے احکامات دیئے۔ ''بڑا کھانا'' کے موقع پر جنرل محمد ضیاء الحق جب بوائے سکاؤٹس دستے کے ڈائننگ ایریا میں آئے تو انہوں نے بلند آواز سے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ بچو! آج آپ ان انکل کی وجہ سے آئے ہیں۔ انہوں نے کل آپ کی پریڈ کی بہت تعریف کی۔ شاباش، ویلڈن۔

ایک اور واقعہ بیرون ملک دورے سے متعلق ہے۔ ایک روز بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کی جانب سے ارجنٹ بلاوا موصول ہوا۔ گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا، لہٰذا سائیکل ہی پر دفتر بھاگا۔ ہانپتے کانپتے آفس میں داخل ہوا۔ ڈائریکٹر آفس کی لائٹس ''آن'' تھیں۔ حاضری دی تو بریگیڈیر صدیقی نے ایک فائل میری جانب سرکا دی۔ جنرل محمد ضیاء الحق کے ہمراہ پریس پارٹی کی فہرست تھی اور آخر میں سبز قلم سے کیپٹن صولت رضا لکھا ہوا تھا۔ یہ اضافہ جنرل صاحب نے خود کیا تھا اور حکم نامہ بریگیڈیئر صدیقی کے نام تھا۔ کہنے لگے پاسپورٹ ہے؟ میرا جواب تھا، نہیں۔ کہنے لگے شناختی کارڈ ہے؟ ''جی نہیں''۔ شیروانی ہے؟ ''جی نہیں''۔ طبیعت کے برعکس بریگیڈیر صدیقی صاحب میری جانب سے مسلسل نہیں نہیں سن کر برہم ہوگئے اور انتہائی شستہ لہجے میں ڈانٹ ڈپٹ کرنا شروع کر دی۔ دو روز بعد روانگی ہے۔ تم نہ گئے تو جنرل محمد ضیاء الحق کو کون جواب دے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔ قصہ مختصر رات گئے پاسپورٹ، شناختی کارڈ کے فوری حصول کے لئے رشید اختر صاحب (نائب مدیر ہلال) کو ذمہ داری دی گئی۔ اسی طرح دو شیروانیاں بھی ٹرائل کے لیے منگوائی گئیں۔ ایک تنگ اور دوسری ڈھیلی ڈھالی۔ ''بس آپ جہاز پر بیٹھ جانا۔ میں کوئی اور عذر نہیں سننا چاہتا''۔ صدیقی صاحب نے فیصلہ کن انداز میں حکم صادر فرمایا۔

جنرل محمد ضیاء الحق ترکی، قطر، اردن، بحرین اور عمان (Oman) کے دورے پر جا رہے تھے۔ جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ جنرل محمد ضیاء الحق، بیگم ضیاء الحق اور ذاتی سٹاف کے اراکین داخل ہوئے۔ بریگیڈیر (تب کرنل) صدیق سالک بھی ہمراہ تھے۔ جہاز پرواز کر گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق وی آئی پی کیبن سے باہر آئے اور انہوں نے سفر میں شامل رفقاء

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے فرداً فرداً ہاتھ ملانا شروع کر دیئے۔ پریس پارٹی کی جانب آئے تو گرمجوشی نمایاں تھی۔ میں سب سے آخر میں ایک سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جنرل محمد ضیاء الحق سب سے ملتے ہوئے ہماری جانب آئے اور مجھے دیکھتے ہی کہا: ''صولت صاحب بھی ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔ سالک! اس پر نظر رکھنا۔ واپس بھی لے کر جانا ہے''۔ ان کی اس بات پر قہقہہ گونجا اور مجھے کرنل صدیق سالک نے اشارہ سے طلب کر لیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق جونہی کیبن میں واپس گئے، سالک صاحب نے جواب طلبی شروع کر دی۔ ''تم کیسے آئے ہو، تمہارا نام تو لسٹ میں نہیں تھا''۔ سر! مجھے کچھ معلوم نہیں، بریگیڈیئر صدیقی نے پرسوں رات احکامات پاسپورٹ اور شیروانی حوالے کی تھی۔ حکم تھا کہ جہاز میں سوار ہو جاؤ! سالک صاحب بولے ''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' میں نے جواب دیا: ''سر! میں سمجھا کہ آپ کے کہنے پر میرا نام شامل کیا گیا ہے''۔ میرے اس جواب کے بعد طویل خاموشی طاری ہوگئی۔ چند لمحے توقف کے بعد کہنے لگے آپ کہیں گم نہ ہو جانا، تمہیں ساتھ واپس لے کر جانا ہے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا حکم ہے''۔ آخری جملے کا لہجہ نوکدار تھا۔ دس روزہ دورے میں ترکی میں زیادہ قیام تھا۔ استنبول کی شہرہ آفاق مسجد میں تبرکات کی زیارت کرائی گئی۔ خاص طور پر جبہ مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے دیکھ کر عجب کیفیت طاری تھی۔

جنرل محمد ضیاء الحق کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ دل سے دعائیں جاری تھیں۔ میرے دل میں اچانک لاہور کا خیال آ گیا۔ ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے لاہور جانا ہے''۔ بس یہ جملہ ادا ہوا تھا کہ سب نے دوسری جانب حرکت شروع کر دی۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے چند منٹ توقف کیا اور کہنے لگے کہ مغرب کی نماز پڑھ کر ہی آگے جائیں گے۔ شاید سرکاری پروگرام میں نماز شیڈول نہیں تھی۔ لہٰذا میزبان چند لمحے پریشان دکھائی دیئے۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے پی ٹی وی کے سینئر کیمرہ مین اسلم خان سے کہا ''خان صاحب، اذان دیجیے۔ نماز بھی آپ ہی پڑھائیں گے''۔ اسلم خان صاحب نے اللہ اکبر کی صدا بلند کی، ابھی اذان مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ایک کلین شیو ترک امام تشریف لائے۔ نماز مغرب سب نے ادا کی۔ نوافل کے بعد مسجد سے باہر آئے تو سینکڑوں کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ اللہ اکبر۔ پاکستان...... پاکستان...... کے نعرے بلند ہونے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر جنرل محمد ضیاء الحق ایک گاڑی کی چھت پر چڑھ گئے اور والہانہ انداز میں تقریر شروع کر دی۔ انگریزی میں ترک عوام کے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔ ترکی میں پاکستان کے ساتھ دلی وابستگی کے مناظر جا بجا نظر آئے۔ پاکستانی صدر کی تقریر ختم ہوئی تو تالیوں اور نعروں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جس کی گونج آج بھی ان لمحات کی یاد کے ساتھ سنائی دیتی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہے۔قطر، بحرین اور اومان میں میزبانی کا منفرد انداز تھا۔سرکاری اور ذاتی تحائف کے انبار تھے لیکن عوام ندارد۔

ہمارے وفد میں روزنامہ مہران سکھر کے ایڈیٹر سید سردار علی شاہ بھی شامل تھے۔علالت کے باوجود خوش گفتار اور ہنس مکھ رہنے پر مصر تھے۔قطر میں وفد اراکین کے لیے سیکورٹی کارڈ تقسیم کیے جا رہے تھے۔میں شاہ صاحب کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔متعلقہ میزبان افسر نے ایک نام پکارا ''سید نذیر مسیح''۔شاہ صاحب چونکے، یہ کون ہے؟میں نے بتایا کہ صدر مملکت کے ذاتی سٹاف میں ہیں ''لیکن یہ سید کیسے ہوگیا؟''میں نے بتایا کہ شاہ صاحب، پاکستان کی لغت میں ''سید'' نہیں ہیں۔یہ عربی کا کمال ہے، انہوں نے جناب کا ترجمہ کیا ہے۔اب نذیر مسیح صاحب کو ''سید'' کے ساتھ کارڈ مل گیا جسے دکھا کر وہ پاکستان میں ریٹائرمنٹ کے بعد تعویز گنڈے کا بزنس آسانی سے جاری کر سکتے ہیں''۔شاہ صاحب میری بات سن کر ملول ہوگئے اور میزبان افسر کے بارے میں ''ادارتی'' لہجے میں گفتگو شروع کردی۔اتنے میں گرم قہوہ آ گیا۔ہم نے دو تین چسکیاں لے کر موضوع بدل دیا۔

اردن میں پروٹوکول شاہی تھا۔یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پاکستان اور اردن جڑواں بھائی ہیں۔میزبان اور مہمان یک جان دو قالب دکھائی دیے۔اردن سے اومان جانا تھا۔کسی نے یہ خبر اڑا دی کہ پہلے عمرہ کرنے سعودی عرب جائیں گے۔شام سے پہلے واضح تردید ہوگئی۔اومان میں ہمارا قیام مختصر رہا۔بلوچستان سے ملتے جلتے جغرافیائی خدوخال دکھائی دے رہے تھے۔پاکستان کے حوالے سے ہر ملک میں خوش آمدید، بھرپور پذیرائی اور عزت و وقار کا سماں تھا۔واپسی پی۔آئی۔اے کے خصوصی طیارے کے ذریعے تھی۔حسب سابق جنرل محمد ضیاء الحق، بیگم صاحبہ اور سینئر سٹاف ممبرز اگلی نشستوں پر تشریف فرما تھے۔ جہاز کی پرواز وطن عزیز کی جانب جونہی ہموار ہوئی تو صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے وفد میں شامل سرکاری اور میڈیا کے نمائندوں سے ''الوداعی'' مصافحہ شروع کر دیا۔ایڈیٹر، رپورٹر، کیمرہ مین، لائٹ مین سمیت کوئی شخص چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے تعلقات عامہ کی خصوصی شعاعوں سے محفوظ نہیں تھا۔آئی ایس پی آر کی ٹیم سب سے آخر میں موجود تھی۔میری جانب ہاتھ بڑھایا۔میں نشست سے کھڑا ہوگیا۔کہنے لگے ''تشریف رکھیے۔سنائیے، کیسے رہا یہ سفر؟''۔میں نے حسب معمول دو چار فقروں میں تعریف کر دی۔میری بات ختم ہوئی تو کہنے لگے کہ ''ہلال'' میں تاثرات ضرور لکھئے گا''۔میں نے رائٹ سر کہا اور جانے کیوں میں نے کہہ دیا کہ ''سر! میرے لائق کوئی خدمت؟'' دراصل پبلک ریلیشنز کی ڈیوٹی ادا کرتے ہوئے بعض جملے اور الفاظ روزمرہ بول چال کا حصہ بن جاتے ہیں۔جانے انجانے میں پی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آراو موقع محل دیکھے بغیر گنگناتا رہتا ہے۔ میری بات سن کر جنرل محمد ضیاء الحق ایک لمحے کے لیے رکے اور اپنا مخصوص قہقہہ بلند کیا۔ کیپٹن کے کاندھے کو تھپتھپایا اور ''تھینک یو۔ تھینک یو'' کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ آئی ایس پی آر میں میرے سینئر اور ''رہنما'' کرنل صدیق سالک (بعد میں بریگیڈیئر) بھی یہ مکالمہ سن رہے تھے۔ انہوں نے صدر صاحب کے جاتے ہی مجھے اپنی نشست کے قریب طلب فرمایا اور کہا کہ ''مسٹر! یہ کیا کہہ رہے تھے آپ؟ ایک کیپٹن آرمی چیف اور صدر مملکت کو کہہ رہا ہے کہ سر! میرے لائق کوئی خدمت؟۔ تم جانتے ہو کس سے بات کر رہے تھے، صدر پاکستان، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور آرمی چیف سے۔ ہوش میں تو ہو؟ بریگیڈیئر صدیق سالک بنیادی طور پر ایک ادبی شخصیت تھے۔ ان کا بات چیت اور مکالمے کا انداز منفرد تھا۔ موقع محل دیکھ کر ہم بھی ''درباری انداز'' میں لطف اٹھایا کرتے تھے۔ تاہم اس روز وہ مجھے سنجیدہ دکھائی دیئے۔ ان کی سرزنش یقیناً سبق آموز تھی۔ عسکری زندگی کے سفر میں کئی بار ایسا ہوا کہ ہم نے کسی بڑے سینئر کو جنرل محمد ضیاء الحق سمجھ کر لطیف پیرائے میں گفتگو کی کوشش کی تو منہ کی کھائی۔ جس کے بعد منہ کا زاویہ اور ذائقہ تبدیل کرنے میں کافی وقت صرف ہوا۔ تب بریگیڈیئر صدیق سالک کی نصیحت یاد آتی تھی۔ ہمیشہ کندھے اور کالر پر رینک دیکھ کر ہی ''مشق سخن'' کی جرات کرتا تھا۔

راولپنڈی واپس پہنچتے ہی ہم تاثرات لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ''اخوت کا سفر'' کے عنوان تلے متعدد اقساط میں سفرنامہ ہفت روزہ ہلال میں شائع ہوا۔ دوست احباب، کورس میٹ، کولیگ حاشیہ آرائی میں مصروف ہو گئے۔ اکثر ہماری صدارتی سفر پیمائی سے لاعلم تھے۔ اس دوران بریگیڈیئر صدیق سالک نے اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا کہ لکھا تو تم نے خوب ہے لیکن یہ ''اخوت کا سفر'' صحیح کتابت نہیں ہوا۔ میں نے گھبرا کر ہر زاویے سے کتابت دیکھی، اخوت کا سفر ہی لکھا تھا۔ میں سفرنامے میں استنبول میں قیام کا حال لکھ رہا تھا تو آنکھوں کے سامنے جبہ مبارک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لمحات آ گئے۔ دعا دل سے کئی بار دہرائی گئی۔ ہفتے دس روز بعد شمارہ شائع ہو گیا ابھی شاید تقسیم کے مراحل سے گزر رہا تھا کہ متعلقہ دفتر سے اطلاع ملی کہ مجھے لاہور تعینات کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ چند روز میں باقاعدہ احکامات جاری ہو جائیں گے۔ یوں میجر کا رینک بھی مل جائے گا۔ لاہور میں آئی ایس پی آر کے تجربہ کار اور میرے سینئر افسر میجر محمد غازی الدین تعینات تھے۔ انہیں پی آر او مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر پنجاب کی اضافی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی تھی۔ لاہور پہنچا تو میجر غازی نے ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ یہ آپ کا شہر ہے۔ میڈیا میں پہلے سے آپ کی علیک سلیک ہے۔ آپ پنجاب یونیورسٹی شعبہ صحافت سے فارغ التحصیل ہیں۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کلاس فیلوز اور ڈیپارٹمنٹ فیلوز کے دائرے موجود ہیں لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل سردار ایف ایس لودھی اپنے نام کے انگریزی ہجوں کے بارے میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ بہت مشکل سے اپنی گردن بچائی ہے۔ میجر محمد غازی الدین ہمارے ڈائریکٹر بریگیڈیئر تفضل حسین صدیقی کے پسندیدہ افسر تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل کے رینک سے ریٹائر ہوئے۔ بہت محنتی، فرض شناس اور ملنسار طبیعت کے مالک تھے۔ بدقسمتی سے راولپنڈی میں بریگیڈیئر صدیقی کے ساتھ بعض غلط فہمیوں کے باعث نیوی کے پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ میں تعینات کر دیئے گئے۔ کراچی یونیورسٹی کے جرنلزم ڈیپارٹمنٹ سے فارغ التحصیل تھے۔ یوں ان کا بھی وسیع حلقہ احباب تھا۔ ان میں ایک اہم خوبی معمول کی تقریبات کے پریس ریلیز کی قبل از وقت تیاری تھا۔ وہ غیر سرکاری پریس نمائندوں کو پیشہ وارانہ لحاظ سے ہمیشہ ''زیر دام'' ہی رکھتے تھے۔ یہ نمائندے تقریب کے چائے کھانے یا خوش گپیوں میں مصروف ہوتے تو میجر غازی الدین پہلے سے تیار شدہ پریس ریلیز کی نوک پلک زمانہ حال کے مطابق درست کر کے اسے اخبار یا نیوز ایجنسی کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ ہم نے ان سے بہت سیکھا لیکن دفتر کے ڈرائیورز یا نائب قاصد وغیرہ کے سامنے سینئر موسٹ افسر کی ''زبانی گوشمالی'' سے ہمیشہ پرہیز کیا کیونکہ یہ عادت میجر غازی کے لیے باعث آزار ثابت ہوتی۔

بات جنرل لودھی کی ہو رہی تھی۔ لیفٹیننٹ جنرل سردار ایف ایس لودھی انگریزی میں Lodhi کے بجائے Lodi لکھا کرتے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اخبارات میں بھی ان کے پسندیدہ ہجے کے ساتھ نام شائع ہونا چاہیے۔ میرے لیے یہ بھی ایک بہت بڑا امتحان تھا۔ خاص طور سے ''پاکستان ٹائمز'' میں ڈیسک پر موجود قدآور صحافیوں کو Lodi لکھنے پر آمادہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ دو تین مرتبہ اگر پسندیدہ ہجے شائع نہ ہوئے تو لاہور سے چھٹی ہو جائے گی۔ اللہ خوش رکھے پاکستان ٹائمز کے نیوز ایڈیٹرز اور سب ایڈیٹرز کو۔ انہوں نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ ان میں سے چند ایک مارشل لاء سے ذہنی لحاظ سے ''برسر پیکار'' بھی تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل سردار ایف ایس لودھی کچھ عرصہ بعد گورنر بلوچستان تعینات ہو گئے۔ یوں تعلقات عامہ کا ایک بڑا امتحان جس میں تمام تر کوشش اور کاوش کے باوجود فیل ہونے کے خدشات لاحق تھے ہمارے کورس سے ''منہا'' ہو گیا۔

لیفٹیننٹ جنرل لودھی زیادہ عرصہ گورنر نہیں رہے۔ انہوں نے حلف اٹھانے کے بعد مجھے کوئٹہ سے لاہور فون کیا اور ہدایت کی کہ کوئٹہ میں جو بھی سیٹ اپ ہے انہیں بتا دو کہ میرے نام کے ہجے درست شائع ہونے چاہئیں۔ کوئٹہ میں چار برس سے زائد ڈیوٹی ادا کی تھی۔ بلوچستان کے ڈائریکٹر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پبلک ریلیشنز،ممتاز شاعر،ادیب عطا شاد تھے۔میں نے انہیں فون کیا،حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ ابھی گورنر ہاؤس سے آ رہا ہوں۔کسی نے نام کے ہجے کا ذکر نہیں کیا۔میں نے کہا کہ ''سر! عسکری راز ہے۔اپنوں ہی سے کہلوانا تھا''۔آپ کی مہربانی ہوگی ورنہ مجھے لاہور سے کوئٹہ طلب کر لیں گے۔جنرل لودھی کو منصب سنبھالے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ایک روز ضروری میٹنگ کے لئے اسلام آباد آ رہے تھے کہ خراب موسم کے باعث طیارہ گر کر تباہ ہو گیا۔جہاز کا عملہ اور گورنر بلوچستان کے اے ڈی سی جاں بحق ہو گئے ، لیفٹیننٹ جنرل لودھی زندہ بچ گئے لیکن شدید زخمی تھے۔علاقے میں موجود ایک چرواہا بچے نے جہاز کو گرتے ہوئے دیکھ لیا،وہ گاؤں سے بھاگا اور چند بڑوں کو بلا لایا۔انہوں نے شدید زخمی گورنر کو ٹرالی میں ڈالا اور قریبی شفاخانے کی جانب روانہ ہو گئے۔راستے میں انہیں تیل اور ہلدی کا محلول پلاتے اور زخموں پر لگاتے رہے۔قصہ مختصر موسم ٹھیک ہوتے ہی ہیلی کاپٹر پہنچا اور جنرل لودھی کو ملٹری ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔مدت کے بعد مکمل صحت یاب ہوئے۔کراچی میں قیام پذیر ہو گئے اور مختلف تعلیمی اداروں میں انٹرنیشنل ریلیشنز پر لیکچر دیا کرتے تھے۔دو برس ہوئے ان کا انتقال ہوا۔حق مغفرت کرے!

لاہور میں قیام کے دوران لیفٹیننٹ جنرل اسلم شاہ کے زمانے میں بھارت کی جانب سے حملے کا خطرہ بڑھ گیا۔افواج چھاؤنی سے سرحدی علاقوں کی جانب کوچ کر گئیں۔بھارتی آرمی چیف جنرل سندر جی نے حملے کے لیے تہیہ کیا ہوا تھا۔راجیو گاندھی بھارت کے وزیر اعظم تھے۔لاہور میں مشہور تھا کہ 1965ء کی مانند بھارت لاہور پر قبضے کی پوری کوشش کرے گا لیکن اس مرتبہ اصل ہدف سندھ ہے۔بھارت کے خیال میں سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کے باعث سندھ کے بعض علاقوں میں ریاست مخالف جذبات موجود ہیں جن سے مشرقی پاکستان کی مانند فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔بہر حال طویل داستان ہے۔پاکستان کے حکمران جنرل محمد ضیاء الحق تھے جنہوں نے دہلی میں راجیو گاندھی کو حملے کی صورت میں تا قیامت بربادی کا مژدہ سنا دیا تھا۔یوں حملے کی کیفیت میں کمی آ گئی۔لاہور میں مورچہ زن پاک فوجیوں کے جذبات ہمیشہ کی طرح سربلند تھے۔انہیں علم تھا کہ اس علاقے کی ایک ایک انچ کی حفاظت جزو ایمان ہے۔

بھارتی حملے کا خطرہ ٹل گیا۔دونوں ممالک کی افواج زمانہ امن کی پوزیشن پر واپس آ گئیں تو لاہور چھاؤنی میں بھی معمول کی سرگرمیاں،تقریبات اور چہل پہل کا آغاز ہو گیا۔فورٹریس سٹیڈیم میں ہر سال منعقد ہونے والے ہارس اینڈ کیٹل شو کی پبلسٹی،گراؤنڈ کمنٹری اور مجموعی میچ کی شب و روز حفاظت آئی ایس پی آر کی ذمہ داری تھی۔کہنے کو یہ میلہ مویشیاں تھا لیکن اس میں انسانوں کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شرکت تعداد کے لحاظ سے مویشیوں سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ جانوروں کی مانند ہر ٹائپ کا انسان اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے موجود ہوتا تھا۔ ظاہر ہے اخبارات کب تک روزانہ ایک ہی انداز کی خبر فرنٹ پیج کی زینت بنائیں گے۔

راولپنڈی کی یوم پاکستان پریڈ 23 مارچ کے بعد ذہن سے اتر جایا کرتی تھی لیکن لاہور کا میلہ مویشیاں دس روز تک شب و روز پیشہ وارانہ صلاحیتوں اور تعلقاتِ عامہ کا ایک امتحان تھا۔ گراؤنڈ کمنٹری کی نگرانی کے لئے لازم تھا کہ کمنٹری کرنے والے حضرات ہماری مرضی کے ہوں۔ اس میدان میں ریڈیو پاکستان کے عزیز الرحمٰن کمال کی شخصیت تھے، بھاری بھرکم آواز ،میلہ مویشیاں کے تمام صوتی اور بصری تقاضے پورے کرتے ہوئے جب فورٹریس سٹیڈیم میں گونجتی تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا تھا۔ میلے کے تماشے کئی گھنٹوں پر محیط تھے۔ عزیز الرحمٰن کی انرجی بحال رکھنے کے لئے ہم چائے، کافی اور سینڈوچ وغیرہ سکرپٹ کے ساتھ ساتھ حاضر رکھتے تھے۔ ایک حد تک یہ سلسلہ چلتا تھا لیکن سٹینڈ بائی کمنٹریز کو بھی لانچ کرنے کی نوبت آ جاتی تھی۔ یہ مرحلہ خاصا اعصاب شکن تھا۔ ہم چند لمحوں کے لئے چُوک گئے تو ڈائس کے سامنے سے گزرنے والے گھوڑے، خچر کی بجائے دوآبہ کی بھینس کی خصوصیات پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ تو کمال ہی ہو گیا۔ انتظامیہ کی ایک اہم ترین شخصیت نے دباؤ ڈال کر ایک مشہور ٹی وی اداکار کو کمنٹری باکس میں بھیج دیا۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ آئی ایس پی آر کا سکرپٹ نہیں پڑھیں گے اور رواں تبصرہ کریں گے۔ کھلی آنکھ کے ساتھ ہم نے بہت منت سماجت کی کہ جناب آپ فلم ڈرامے میں بھی سکرپٹ کے مطابق ہی ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ یہ بھی زندہ ڈراما ہی سمجھ لیں۔ سٹیڈیم میں اہم ترین ملٹری اور سول شخصیات اور شہر لاہور کے اکابرین، رؤسا اور اخبارات کے نمائندے موجود ہیں۔

بہرحال انہوں نے جب واک آؤٹ کی دھمکی دی تو ہم بھی خاموش ہو گئے ،میلہ مویشیاں کا ایک اہم ایونٹ ڈاگ ریس تھی۔ اس میں تربیت یافتہ کتے ،اپنے مالک کے اشاروں پر تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ریس کا دورانیہ مختصر، لہٰذا رواں تبصرہ کرنے والے کو پلک جھپکنے کی ہی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ اداکار کمنٹریز کو ہر طرح سے بریف کیا گیا۔ سٹیڈیم کے بائیں جانب سے کتے نکلے، اب کمنٹریٹر کو بھی ان کے ساتھ آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے رہنا چاہیے تھا۔ ریس میں شریک کتے کی کمر پر شوخ رنگ کا کپڑا پہنا دیا جاتا ہے جس پر مخصوص نمبر لکھا ہوتا ہے۔ اچانک کمنٹریٹر نے نمبر کے بجائے کمر پر رنگدار پہناوے کو ''واسکٹ'' کہنا شروع کر دیا۔ تقریباً چلانے کے انداز میں: ''نیلی واسکٹ والا آگے، باواجی! واسکٹ دوسرے نمبر پر اور یہ کالی واسکٹ نے بھی زور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لگایا اور سب سے آگے، کمال کر دیا"۔ اور اسی سے ملتے جلتے دیگر فقرے بھی بولتے چلے گئے۔ ہم نے اشاروں سے بات سمجھانے کی کوشش کی تو آواز مزید اونچی کر کے پکارنے لگے: "تین نمبر واسکٹ سب سے آگے، چھ نمبر واسکٹ مشکل میں ہے"۔ نیچے وی آئی پی سٹینڈ سے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ شکر ہے کہ خاکی رنگ کے پہناوے کے ساتھ کوئی دوڑ میں شریک نہیں تھا ورنہ ہم فورٹریس سٹیڈیم سے سیدھا ملٹری ہسپتال ہی جاتے۔ بہر حال تقریب ختم ہوتے ہی ہماری طلبی ہو گئی۔ اس مرتبہ سول ملٹری کی مشترکہ ڈانٹ ڈپٹ نے دن میں تارے دکھا دیے، جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت تھی۔ تقریبات میں اکثر صف اول کے مدعوئین کو شلوار، قمیض اور واسکٹ ہی زیب تن کرتے تھے۔ ہمیں وارننگ کے ساتھ یہ مژدہ بھی سنایا گیا کہ واسکٹ والی بات بہت اوپر تک جائے گی، تم اپنی خیر مناؤ۔ میں نے دفتر پہنچتے ہی بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کو روداد سنائی۔ پہلے تو انہوں نے خوب انجوائے کیا، جب قہقہہ ختم ہوا تو فرمانے لگے کہ دیکھو بھئی! ذمہ داری تو آپ کی تھی، اچھا جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب کل کی تیاری کرو اور کمنٹری باکس کو بند کر کے تالا لگا دیا کرو تا کہ سفارشی اندر نہ آئے۔ رات گئے معلوم ہوا کہ کسی وی آئی پی نے کور کمانڈر کو بھی تحریری رپورٹ کی ہے۔ یوں صورتحال بہت سنگین ہے۔ چند روز کھینچا تانی رہی۔ عزیز الرحمٰن کے منظور شدہ اعزازیہ کے حصول میں بھی دشواری آئی۔ معاملے میں ویٹو کور ہیڈ کوارٹرز کے پاس تھا لہٰذا انہیں ادائیگی کر دی گئی۔

کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اسلم شاہ دھیمی طبیعت کے حامل تھے۔ کھرے عسکری، معاملہ فہم اور مشفقانہ انداز میں برتاؤ کے قائل تھے۔ ایک روز ابھی میں اخبارات کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دفتر میں ڈائریکٹ فون کی گھنٹی گونجنے لگی۔ یہ ہیڈ کوارٹر کا اندرونی مواصلاتی نظام کا حصہ تھا۔ لائن پر کور کمانڈر تھے۔ پوچھنے لگے کہ کوئی خاص خبر ہے؟۔ میں نے دو تین معمول کی خبریں پڑھنا شروع کیں تو ٹوکا۔ نہیں کوئی اور خبر۔ میں نے کہا کہ نہیں سر۔ دوسری جانب سے آواز آئی۔ کمال ہے مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ آج کی سب سے بڑی خبر یہ ہے کہ فیض احمد فیض گزر گئے۔ آپ میرے دفتر میں آیئے۔ کور کمانڈر کی فیض احمد فیض کی وفات میں دلچسپی سے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ الٰہی ماجرا کیا ہے۔ میں سمجھا کہ شاید دور نزدیک کے رشتہ دار ہوں۔ بہر حال دو تین اخبار تھامے، حاضر ہوا تو بات آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ کے آئی ایس پی آر کے افسر تھے۔ آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ جنازہ میں شرکت کریں۔ میں نے کہا کہ سر! اس معاملہ میں راولپنڈی سے حکم موصول نہیں ہوا۔ دفتری اوقات میں ممکن نہیں۔ میری بات مکمل ہوئی تو کہا کہ میں شرکت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ میری رائے کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ سر! وردی میں مناسب نہیں ہوگا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اور بہتر ہوگا کہ راولپنڈی میں بات کر لیجیے۔ کور کمانڈر کچھ دیر خاموش رہے ''اچھا وردی تبدیل کریں۔ آدھ گھنٹے بعد ہم دونوں پرائیویٹ کار میں ماڈل ٹاؤن لاہور جائیں گے۔ ایک پھولوں کی چادر کا بھی انتظام کریں، قبر پر رکھنے کے لیے''۔

اب یہ ایک نیا امتحان تھا۔ سٹاف کی مدد سے انتظامات مکمل کیے۔ گھر سے شلوار قمیض اور واسکٹ منگوائی۔ کور کمانڈر کے اے ڈی سی نے پرائیویٹ کار کا انتظام کر دیا تھا۔ میں کور کمانڈر کے ہمراہ جی بلاک ماڈل ٹاؤن گراؤنڈ میں تھا۔ ابھی نماز شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم ایک جانب کھڑے تھے۔ میرے کچھ دوست احباب علیک سلیک کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد گورنر پنجاب کے ملٹری سیکرٹری کرنل یعسوب ڈوگر نے جو باوردی تھے مجھے ہاتھ کے اشارے سے طلب کیا۔ مجھے ساکت دیکھ کر وہ خود آگے بڑھے تو کور کمانڈر کو دیکھ کر سیلوٹ کیا اور انہیں پہلی صف میں لے جانے پر اصرار کرنے لگے۔ شرکاء کی اکثریت کے لئے کور کمانڈر اسلم شاہ کو عام لباس میں پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ مجھ سے چند ایک رپورٹرز نے دریافت کیا تو میں نے بتا دیا۔ اگلے روز اخبارات میں کور کمانڈر کی فیض احمد فیض صاحب کے جنازے میں شرکت کی خبریں شائع ہوئیں تو لیفٹیننٹ جنرل اسلم شاہ نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے، میں تو ذاتی حیثیت سے گیا تھا۔

ماڈل ٹاؤن سے واپسی کے دوران کور کمانڈر نے فیض احمد فیض کی شاعری اور زندگی کے بارے میں معلوماتی گفتگو کی۔ میں نے راولپنڈی سازش کیس میں مرحوم کی شرکت کا قصہ چھیڑا تو کہنے لگے کہ شاید: ''محفل آرائی'' کے باعث وہ دھر لئے گئے تھے۔ اصل میں اہم ترین کردار میجر جنرل اکبر خان آزادی کشمیر کے حوالے سے ایک اہم اور نمایاں نام تھا۔ ان سے فیض احمد فیض ملتے جلتے ہوں گے''۔ لیفٹیننٹ جنرل اسلم شاہ نے ریٹائرمنٹ کے بعد راولپنڈی میں سکونت اختیار کی۔ اہم مواقع پر انگریزی اخبارات میں معلوماتی مضامین لکھتے رہے۔ اللہ کریم ان کی مغفرت فرمائیں۔ آمین

لاہور میں سرکاری فرائض کی ادائیگی کے علاوہ ذاتی مصروفیات بھی تھیں۔ اخبارات اور جرائد میں کبھی بغیر کام کے چلے جانا، اپنے کلاس فیلوز اور دوستوں کے ساتھ گپ شپ، عزیز رشتہ داروں سے ملاقاتیں، میل جول وغیرہ۔ سب سے بڑھ کر والدین اور بھائی بہن ماڈل ٹاؤن میں مقیم تھے۔ ان کے ہاں بھی کبھی تنہا اور اکثر اپنی فیملی کے ہمراہ حاضری ایک مستقل فریضہ تھا۔ عموماً نماز جمعہ والد گرامی کے ہمراہ ماڈل ٹاؤن ہی میں ادا کی جاتی تھی۔ لاہور آئے ابھی ایک برس ہی ہوا تھا کہ والدہ محترمہ شدید علیل ہو گئیں۔ بہت تاخیر سے ذیابیطس تشخیص ہوئی۔ چند ماہ کی مسلسل علالت کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بعد انتقال فرما گئیں۔ یہ میرے لیے شدید جذباتی دھچکا تھا۔ انہیں جی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور کے قبرستان میں سپردخاک کیا گیا۔ والدہ محترمہ کے انتقال کے بعد کافی عرصہ تک مجھے پیدل سڑک پار کرنے میں دشواری کا سامنا رہا۔ دور سے آتی ہوئی گاڑی اپنے قریب محسوس ہوتی تھی۔ یوں سڑک پر بے چارگی کے عالم میں کھڑا رہتا تھا۔ کسی نے گلبرگ لاہور کے ایک ڈاکٹر کا ایڈریس دیا۔ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ آپ والدہ کے انتقال کے بعد شدید ذہنی صدمے سے دوچار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کچھ ادویات اور چند مشورے دیئے۔ بہرحال زندگی کے معمول پر آنے میں کچھ وقت لگا تاہم والدہ کی کمی آج بھی روزِ اول کی مانند محسوس ہوتی ہے۔

لاہور میں مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے آفس کا بھی دس پندرہ روز کے بعد چکر لگتا رہتا تھا۔ اب یاد نہیں کہ شامی صاحب کے جریدہ ''بادبان'' میں کالم لکھنے کا خیال کیسے آیا کہ قلمی نام سے مہینے میں دو تین کالم شائع ہونا شروع ہو گئے۔ عنوان تھا ''تادمِ تحریر'' اور قلمی نام رضی بن رفاقت تھا۔ رضی کے نام سے والدین اور قریبی عزیز بلاتے تھے اور رفاقت میرے والد گرامی کا نام تھا۔ یہ راز صرف شامی صاحب ہی کو معلوم تھا۔ کبھی کبھار شائع شدہ متن میں ''گڑبڑ'' ہو جاتی تو شامی صاحب سنبھال لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جنرل محمد ضیاء الحق لاہور تشریف لائے۔ ان کے چند روزہ دورے میں فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (رشید صدیقی گروپ) کی تقریب میں شرکت میں شامل تھے۔ دراصل صحافتی یونینز دو تین گروپوں میں تقسیم تھیں۔ ایک کی قیادت رشید صدیقی کر رہے تھے، اس گروپ کے متحرک اراکین میں چودھری غلام حسین اور شاہد اسلم شامل تھے۔ دوسرا با اثر گروپ منہاج برنا سے منسوب تھا۔ اس میں نثار عثمانی ایسے سرکردہ صحافی شامل تھے۔ رشید صدیقی نے جنرل محمد ضیاء الحق کو الحمراء آرٹس کونسل کے وسیع و عریض ہال میں خطاب کی دعوت دی تھی جس کو بھرنے کے لیے غیر صحافتی افراد کو بھی مدعو کیا گیا۔ میں اور بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی ایسے ہی غیر صحافتی افراد کی صف میں بیٹھے تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق مصروفیات کے باعث تاخیر سے تقریب میں پہنچے تو ہال تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھا۔ ایک دو مقررین نے مہمان خصوصی کی تاخیر سے آمد کو بھی موضوع بنایا۔ ایک صاحب نے یہاں تک کہہ دیا کہ آپ کے انتظار میں ہم پیشاب تک روکے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ ہمارے قائد رشید صدیقی کسی کو ہال سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے رہے۔ بہرحال تقریب ختم ہوئی۔ میں نے اگلے روز ایک کالم جسے مزاحیہ ہی کہا جا سکتا تھا لکھ کر مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس کالم میں تقریب کے حوالے سے بقول شخصے ''غیر سنجیدہ'' سطور رقم کی گئی تھیں۔ چند جملے میزبان اور کچھ مہمان خصوصی کے شایانِ شان نہیں تھے۔ ''بادبان'' کا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شمارہ شائع ہوا تو میرے کالم کے حوالے سے صحافتی حلقوں میں ''آہ وفغاں'' سنائی دینے لگی۔ دراصل منہاج برنا اور نثار عثمانی کے ہم نوا صحافیوں نے کالم کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں وسیع پیمانے پر تقسیم کیں۔ اب رشید صدیقی کے ساتھی ''رضی بن رفاقت'' کی تلاش میں تھے۔ کسی طور کُھرا مجھ تک پہنچ گیا۔ انہوں نے بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی اور کرنل صدیق سالک (بعد میں بریگیڈیئر) کو میری شکایت کی اور کالم کو جنرل محمد ضیاء الحق کی شخصیت پر براہ راست حملہ قرار دے دیا۔ مجھے تفضّل حسین صدیقی نے راولپنڈی سے کال کی اور کالم کے بارے میں افواہوں کی تصدیق چاہی۔ بریگیڈیئر انتہائی نستعلیق اور رکھ رکھاؤ والی شخصیت تھے۔ کہنے لگے کہ ''یہ کالم آپ نے لکھا ہے؟''۔ میں نے بھی احترام کے ساتھ عرض کی کہ ''سر! آپ سرکاری طور پر پوچھ رہے ہیں؟'' فرمایا: ''جی۔ سرکاری طور پر ہی پوچھ رہا ہوں۔ معاملہ بہت سیریس ہے''۔

میرا جواب تھا کہ ''سر! یہ میں نے نہیں لکھا۔ کسی رضی بن رفاقت کی تحریر ہے''۔ ان کی آواز گونجی ''سید صاحب سنیے، ذاتی طور پر بتائیے''۔ یہ مختلف انداز تھا۔ میں نے فوراً اقرار کیا اور کہا کہ سر! آپ کو یاد ہوگا کہ ہال میں کیسی گفتگو ہو رہی تھی۔ کیا وہ سب کچھ مہمان خصوصی کے شایان شان تھا؟۔ بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی نے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے صدر مملکت کو مشورہ دیا تھا کہ وہ صحافیوں کے ایک گروپ کی تقریب میں شرکت نہ کریں، وغیرہ وغیرہ۔ تھوڑی دیر بعد صدر مملکت کے پریس سیکرٹری صدیق سالک فون پر تھے۔ ''میجر صولت رضا، آپ نے تو کمال کر دیا۔ امام (جنرل ضیاء الحق) نے بھی پڑھا ہے اور محظوظ ہوئے ہیں''۔

میں چند روز ڈپریشن اور گومگو کی حالت میں رہا۔ دس پندرہ روز کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق دوبارہ لاہور آئے۔ میں بھی آئی ایس پی آر ٹیم کے ہمراہ ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ صحافیوں میں چودھری غلام حسین بھی دکھائی دے رہے تھے۔ علیک سلیک ہوئی۔ اتنے میں جنرل ضیاء الحق آگئے۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر کہنے لگے: 'چودھری صاحب آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے پاس وردی میں بھی کالم لکھنے والے موجود ہیں''۔ یہ ذومعنی جملہ سن کر میں نے باوردی سول کالم نگاری سے توبہ کر لی۔ یہ حقیقت ہے جنرل محمد ضیاء الحق مارشل لاء حکمران ہونے کے باوجود کافی حد تک آزادی اظہار برداشت کرتے تھے۔ اخبارات اور کتب کا مطالعہ ان کی عادت ثانیہ تھی۔ یوں ان میں ایک بااخلاق سامع کی خصوصیات بھی موجود تھیں۔ انہیں بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی اور بریگیڈیئر صدیق سالک کی صورت میں اعلیٰ پائے کے صحافتی اور ادبی پس منظر رکھنے والی شخصیات کی مخلصانہ آراء سے مستفید ہونے کا موقع بھی ملتا تھا تاہم وہ خود بھی فن ابلاغ کے ماہر تھے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں عسکری، سیاسی اور ابلاغی محاذ پر منفرد کارنامے انجام دیئے جنہیں محض مارشل لاء حکومت کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے سانحہ بہاولپور کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق کے ''غیر سیاسی'' کارنامے پس پردہ چلے گئے۔ میاں محمد نواز شریف نے جنرل محمد ضیاء الحق کے سیاسی ورثے کو اپناتے ہوئے عام انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ عرصے سے انہوں نے دیگر آرمی چیفس کیساتھ اپنے مربی اور محسن کو بھی آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بیرونی محاذ پر بھارت جنرل محمد ضیاء الحق سے سب سے زیادہ خائف تھا۔ شاید ان کے پاس پاک افواج کی تیاری کے حوالے سے رپورٹس موجود ہوں گی۔

افغانستان میں سوویت یونین کی براستہ پاکستان شکست کے بعد بھارت کو اندیشہ تھا کہ اب ''تربیت یافتہ'' مسلمان جتھے کشمیر سمیت متعدد ریاستوں کو بھی آزاد کرائیں گے یا کم از کم بھارت کے زیر اثر نہیں رہنے دیں گے۔ بنگلہ دیش میں بھی اس حوالے سے خوش آئند سیاسی اور عسکری تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ڈھاکہ میں پاکستان کا اثر و نفوذ بڑھ رہا تھا۔ بھارت میں سکھ برادری کے ساتھ جنونی ہندوؤں نے جو کچھ کیا، اس کے اثرات بھارت کے حق میں نہیں تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق خطے کی صورتحال کا مکمل ادارک رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے متعدد بار پاک افواج کی تربیتی مشقوں کے معائنہ کے بعد افسروں اور جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا کہ ''ہم نے سقوط ڈھاکہ کا بدلہ لینا ہے۔ آج نہیں تو کل، اور کل نہیں تو پرسوں، یہ ہو کر رہے گا۔ اور بھارت کے ساتھ وہی کچھ کیا جائے گا جو اس نے ہمارے ساتھ مشرقی پاکستان میں کیا''۔

انہوں نے علمی سطح پر بھی سٹیک ہولڈرز کو مطمئن رکھنے کی پالیسی اختیار کی ہوئی تھی۔ یوں پاکستان کو معاشی، سیاسی اور عسکری شعبوں میں مدھم ہی سہی تاہم تسلسل کے ساتھ آگے بڑھنے کے مواقع میسر تھے۔ میں آج بھی سمجھتا ہوں کہ جنرل محمد ضیاء الحق کو منظر سے ہٹانے میں دشمن کا ہاتھ تھا۔ ایسے قتل عموماً اس انداز میں کئے جاتے ہیں کہ لہو کی لکیر تک باقی نہیں رہتی۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

بات لاہور سے شروع ہوئی اور جنرل محمد ضیاء الحق کی شخصیت، کارنامے اور سانحہ بہاولپور کا ذکر درمیان میں آ گیا۔ ان کی قومی خدمات کو محض ''مارشل لاء حکمران'' کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لاہور میں فرائض منصبی معمول کے مطابق جاری تھے۔ زندہ دلوں کے شہر میں چھ برس سے زائد ہو گئے تھے۔ کسی اور شہر میں پوسٹنگ کی آرزو تھی، نہ ہی امید۔ ہمارا ابھی لاہور سے جی بھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز بریگیڈیئر صدیق سالک کی کال آئی کہ آپ گورنر ہاؤس لاہور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تشریف لائیے، ضروری بات ہے۔ وہ جنرل ضیاء الحق کے ساتھ لاہور آئے ہوئے تھے۔ میں سمجھا کہ رات گئے کوئی ابلاغی ڈیوٹی ہوگی یا تقریر وغیرہ کے لیے ٹاکنگ پوائنٹس کی تیاری ہوسکتی ہے۔ بھاگم بھاگ پہنچا تو مغرب ہوچکی تھی۔ بریگیڈیئر صدیق سالک لاؤنج میں بیٹھے اخبارات کا مطالعہ کررہے تھے۔ ''آپ نے کل کراچی جانا ہے دو تین ہفتے کے لئے۔ پھر ہم مستقل انتظام کرلیں گے''۔ انہوں نے رسمی گفتگو میں وقت ضائع کیے بغیر بات واضح کردی۔ میں حیران ہوا۔ کراچی میں ہمارے ایک کہنہ مشق ساتھی میجر بشیر کیانی بخیر وخوبی اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ سالک صاحب نے بتایا کہ پی آر او آفس کی گاڑی میں ایک کلرک ملٹری ڈیری فارم سے دودھ کے کوپن خریدنے گیا تھا۔ گاڑی ڈیری فارم کے گیٹ پر دودھ تقسیم کرنے والے سرکاری خچر ریڑھے سے جاٹکرائی۔ خچر زخمی ہوگیا اور اس بنیاد پر انتہائی اہم اور فوری رپورٹ جاری کی گئی ہے۔ کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل احمد شمیم خان نے واقعہ کا نوٹس لیتے ہوئے آئی ایس پی آر افسر کو کراچی سے فوری تبدیل کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

اس وقت بریگیڈیئر صدیق سالک ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کے فرائض ادا کررہے تھے۔ بریگیڈیئر تفضل حسین صدیقی مدت ملازمت پوری کر کے ریٹائرڈ ہوگئے تھے۔ قصہ مختصر، زبانی آرڈر لے کر گھر واپس آیا تو اہلیہ نے پوچھا خیریت سے طلبی ہوئی تھی؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''میرا لاہور گواچا''۔ میری اہلیہ کا تعلق لطیف آباد حیدرآباد سے ہے، لہٰذا انہیں کراچی جانے کی خوشی تھی۔ بہرحال حکم کی تعمیل میں اگلی شب کراچی ایئرپورٹ کے باہر کھڑا گاڑی کا انتظار کررہا تھا۔ میجر بشیر کیانی نے ہلکے پھلکے انداز میں واقعہ کی تفصیل بیان کی اور میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ کراچی میرے لیے انجان شہر نہیں تھا۔ روشنیوں کا شہر ہمارے قائداعظم کا شہر۔ میرا بچپن، لڑکپن اسی شہر میں بسر ہوا تھا۔ اب بھی لاتعداد رشتہ دار، دوست احباب اور خیر خواہ اس شہر میں مستقل رہائش پذیر ہیں۔ یہ سوچ کر دل کو تسلی دیتا ہوا آفس میں حاضر ہوگیا۔ لیفٹیننٹ جنرل احمد شمیم خان کی شہرت ایک سخت گیر اور عسکری نظم وضبط کے پابند کمانڈر کی تھی۔ ان سے پہلی رسمی ملاقات یک طرفہ ہی تھی۔ دراصل کراچی کور کے چیف آف سٹاف بریگیڈیئر ظفر اقبال قریشی لاہور میں بریگیڈیئر کمانڈر رہ چکے تھے۔ مجھے جانتے تھے لہٰذا انہوں نے کور کمانڈر کو بریف کردیا تھا۔ دو تین دن ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ ویسے بھی عارضی ڈیوٹی پر تھا۔ ایک روز کراچی کے اخبارات سے اپنی دانست میں اہم خبریں اور کالم وغیرہ ایک فائل میں پریس بریف لکھ کر کور کمانڈر کی خدمت میں پیش کردیئے۔ چند روز کے بعد حکم ملا کہ نو بجے پریس بریف کی فائل کے ساتھ خود حاضر ہوا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کرو۔ یوں اخبارات کے ساتھ کراچی کور کی ''ہائی کمان'' سے بھی براہ راست علیک سلیک کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چند روز بعد وزیراعظم محمد خان جونیجو کوٹری کے قریب تربیتی مشقیں دیکھنے آرہے تھے۔ یہ پہلا امتحان تھا۔ کور کمانڈر کی خواہش تھی کہ بھرپور کوریج ہونی چاہیے۔ اس زمانے میں صرف پی ٹی وی کا نیوز بلیٹن ہی نوکری بنانے یا بگاڑنے کا سبب ہوتا تھا۔ اخبارات میں کوریج کا وزن علیحدہ تھا۔ بہرحال ٹیم کے ساتھ کوٹری پہنچا۔ وزیراعظم تشریف لائے اور ایک ٹینک نما گاڑی میں سوار ہوکر مشقوں کا معائنہ کیا۔ ہمارے کیمرہ مین اور فوٹوگرافر چابکدستی کا مظاہرہ کررہے تھے۔ میں نے پی ٹی وی پر سپیشل رپورٹ کے لئے ان کے پریس سیکرٹری سید انور محمود سے سفارشی رقعہ لیا اور واپس کراچی روانہ ہوگیا۔ اس روز وزیراعظم جونیجو کی اور بھی بہت سی مصروفیات تھیں۔ سید انور محمود کی چند سطور نے کام دکھایا جس میں وزیراعظم کی خواہش کا ذکر تھا۔ رات خبرنامہ کے بعد پی ٹی وی پر نصف گھنٹہ کی سپیشل رپورٹ آرمی کی تربیتی مشقوں کے بارے میں تھی۔ رپورٹ کیا ٹیلی کاسٹ ہوئی، کور کمانڈر نے بھرپور شاباش کے ساتھ آئی ایس پی آر ٹیم کو نقد انعام سے بھی نوازا۔

اس اعلیٰ کارکردگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے کراچی کے ساتھ آئی ایس پی آر افسر کے طور پر مستقل تعینات کردیا گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل احمد شمیم خان کا عرصہ کمانڈ نسبتاً پرسکون ہی رہا۔ ہفتے میں اکا دکا واقعات رپورٹ ہوتے تھے۔ ظاہر ہے صوبہ سندھ سے اطلاعات موصول ہوتی رہتی تھیں۔ پنوعاقل چھاؤنی کی تعمیر کے حوالے سے معاملات زیر بحث رہتے تھے۔ اس کے علاوہ کالاباغ ڈیم کی تعمیر ایک ایسا موضوع تھا جس پر سندھ کے بعض رہنما تو تکرار پر اتر آئے تھے۔ بدقسمتی سے فنی نالج بہت کم تھا، صرف ایک نان ایشو ہی کو ایشو بنالیا گیا تھا۔ سندھی زبان میں شائع ہونے والے اکثر اخبارات اور جرائد بھی اس حوالے سے یکطرفہ مضامین ہی شائع کرتے تھے۔ کبھی کبھار صوبے کے مسائل پر سندھی اخبارات یکساں اداریہ بھی شائع کرتے تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل احمد شمیم خان مدت ملازمت مکمل کرکے راولپنڈی روانہ ہوگئے اور ان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کو تعینات کردیا گیا۔

لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کو راولپنڈی میں قیام کے دوران جوائنٹ سروسز ہیڈکوارٹر میں دیکھا تھا۔ تب وہ فل کرنل یا بریگیڈیئر تھے اور جنرل رحیم الدین خان سینئر سٹاف افسر تھے۔ انہوں نے چارج سنبھالتے ہی انفرادی ملاقاتیں اور زیر کمان یونٹس کے دورے شروع کردیئے۔ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کرکٹ کے شیدائی تھے، خود بھی ہفتے میں ایک دوبار سپورٹس کٹ میں گراؤنڈ میں نظر آتے تھے۔ باؤلنگ نامور فاسٹ باؤلر فضل محمود کی مانند کرتے تھے۔ واک وغیرہ اس کے علاوہ تھی۔ انہیں بے جا پروٹوکول سے بھی ''عقیدت'' نہیں تھی۔ گھر سے صرف ایک سٹاف

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کار، ساتھ ملٹری پولیس کی جیپ اور کوئی ہٹو بچو کی صدا نہیں ہوتی تھی۔ راستے میں تمام ٹریفک سگنلز پر کار رکتی تھی۔

شاہراہ فیصل پر ملٹری پولیس جنرل ضیاء الحق کے موقع پر دکھائی دیتی تھی۔ سانحہ بہاولپور کے موقع پر لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کور کمانڈر کراچی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سہ پہر کے وقت مجھے زاہد حسین (سینئر رپورٹر) روزنامہ جنگ کی کال آئی اور پاکستان ون ایئر کرافٹ کے بارے میں دریافت کیا۔ مجھے صحیح صورتحال کا علم نہیں تھا۔ آئی ایس پی آر فون کیا تو پتہ چلا کہ بریگیڈیئر صدیق سالک بھی جنرل محمد ضیاء الحق کے ہمراہ بہاولپور کے قریب عسکری مشقوں کے علاقے میں ہیں۔ کچھ دیر بعد کور ہیڈ کوارٹرز سے ہدایت آئی کہ فوراً آفس پہنچیں۔ کور کمانڈر بھی اپنے آفس میں موجود تھے۔ سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا، حکم ملا کہ تمام افسر اپنے دفاتر میں موجود رہیں اور لائٹس آف نہیں کی جائیں گی۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی المناک رحلت پر پوری قوم اور خاص طور پر افواج پاکستان حد درجہ سوگوار تھیں۔ باوردی افراد ہی جنرل محمد ضیاء الحق کی عسکری خدمات کا صحیح ادارک کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ غیر فوجی افراد بھی انہیں عقیدت کے ساتھ یاد کر رہے تھے۔ رات گئے تک لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز اپنے آفس میں مقیم رہے۔ ظاہر ہے ہمیں بھی ڈیوٹی پر رہنا تھا۔ خواہ رات ایسے ہی بیت جائے۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی رحلت کے بعد وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ آرمی چیف تعینات ہو گئے۔ صدر مملکت کا عہدہ جناب غلام اسحاق خان نے سنبھال لیا۔ عام انتخابات قریب آ گئے۔ کراچی میں مقامی جماعتوں نے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ الطاف حسین کی زیر قیادت ایم کیو ایم خاص طور سے سرگرم تھی۔ ان کے کارکنان اپنے اپنے علاقوں میں سیاسی کم انتقامی روپ میں زیادہ دکھائی دے رہے تھے۔ اس طرز عمل سے دیگر سیاسی جماعتیں خاص طور سے پاکستان پیپلز پارٹی سب سے زیادہ مشتعل تھی۔ الزام تھا کہ ایم کیو ایم ''سرکاری سرپرستی'' میں کراچی، حیدرآباد اور دیگر بڑے شہروں میں پیپلز پارٹی کی برتری کو چیلنج کر رہی ہے۔ خاص طور سے لسانی تفریق کی بنیاد پر اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ متعدد بار امن و امان کے مسائل پیدا ہوئے۔ فوج کو سول انتظامیہ کی مدد کے لیے طلب کیا گیا۔ اندرون سندھ سے تعلق رکھنے والے قوم پرست سندھی بعض اوقات پیپلز پارٹی کے کندھے پر بندوق رکھ کر مخالفین کو زک پہنچاتے تھے۔ لسانی بنیاد پر لڑائی جھگڑے معمول بن گئے۔ خاص طور سے تعلیمی اداروں میں یہ روگ پریشان کن حد تک سرایت کر گیا تھا۔ پیپلز پارٹی میں تقریباً تمام لسانی اکائیوں کی نمائندگی تھی۔ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کے دور میں سندھ کے شہروں میں بڑھتے ہوئے تشدد کی روک تھام کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لیے متعدد اقدامات کئے گئے۔ کور ہیڈ کوارٹرز میں سیاسی رہنماؤں کی آمد و رفت بڑھ گئی۔

کراچی میں اے پی ایم ایس او (آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن) اور پی ایس ایف (پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن) کی باہمی آویزش سے تعلیمی اداروں کا ماحول پراگندہ ہو چکا تھا۔ ایک مرحلے پر دونوں تنظیموں نے ایک دوسرے کے حامی اور سرکردہ نوجوانوں کو اغواء کرنا شروع کر دیا۔ اغواء کنندگان کو مخصوص ٹارچر سیلز میں پہنچایا جاتا تھا جہاں انتہائی اذیت کے لیے ساز و سامان موجود تھا۔ شہر میں آہ و بکا مچی ہوئی تھی۔ والدین اور اساتذہ سخت پریشان تھے۔ اس مرحلے پر لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز نے سول انتظامیہ کی امداد کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں متحارب گروپوں اور ان کی سرپرست سیاسی جماعتوں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے سینئر رہنماؤں کو کم از کم ''زخمی قیدیوں'' کے تبادلے پر آمادہ کر لیا۔ اس نیک کام کے لئے آئی ایس پی آر آفس کے سامنے پارکنگ کی جگہ منتخب کی گئی۔

اس سے قبل رات بھر مذاکرات ہوتے رہے۔ شرائط پیش ہو رہی تھیں۔ یقین دہانیاں مانگی جا رہی تھیں، کور کمانڈر نے بات چیت کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے بریگیڈیئر معید کو ذمہ داری دے دی تھی۔ میں بھی بھاگ دوڑ میں مصروف تھا، کیونکہ پریس کو خبر مل گئی تھی کہ کور ہیڈ کوارٹرز میں رات گئے لائٹس آن ہیں۔ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کی سینئر قیادت جمع ہے۔ اس زمانے میں موبائل فون کی افراط نہیں تھی، پیغام رسانی کے لیے ''پیجر'' استعمال ہوتے تھے۔ میں نے فجر تک تو ''نو کمنٹس'' سے کام چلایا۔ چند ایک کی منت سماجت کی۔ اگلے روز صبح کے اخبارات میں چونکا دینے والی خبر تھی۔ اس دوران حتمی تحریری معاہدہ تیار ہو گیا۔ دونوں مقبول سیاسی جماعتوں کے سینئر رہنما آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے میرے دفتر میں جمع ہو گئے جہاں ان کے لیے گرما گرم ناشتہ تیار تھا۔ ان رہنماؤں میں پیپلز پارٹی کے راشد ربانی صاحب اور ایم کیو ایم کے ایم این اے اسلم صاحب تھے۔ یہ شخصیات آج دنیا میں نہیں ہیں۔ اللہ مغفرت فرمائیں۔ آمین

معاہدے کے مطابق ''زخمی قیدی'' کور ہیڈ کوارٹرز پہنچنا شروع ہو گئے۔ میرے کولیگ مسرور عباس جعفری فوٹو گرافر نے ریکارڈ کے لیے تصاویر اتارنا شروع کر دیں۔ پہلے اعتراض ہوا کہ یہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہے لیکن سورج نکل چکا تھا اور باوردی فوجی بھی ارد گرد دکھائی دے رہے تھے۔ لہٰذا احتجاج خود بخود دم توڑ گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز نے دفتر طلب کر کے کہا ''پی آر او! کوئی خبر، تصویر وغیرہ اخبار میں نہیں آنی چاہیے''۔ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لئے رہائش گاہ پر چلے گئے۔ رات بھر جاگتے رہے۔ صبح کے اخبار جماعتوں کے ''قیدیوں'' کے تبادلے کی خبر سے خالی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تھے۔اب کراچی کے شام کے اخبارات کی باری تھی جو دوپہر تک شائع ہو جاتے تھے۔میں نے از خود خبر تیار کی اور چند تصاویر کے ساتھ صرف ''قومی اخبار'' تک پہنچادی۔یہ کراچی کا مقبول ترین شام کا اخبار تھا۔الیاس شاکر صاحب اور مختار عاقل کی ادارت میں یہ اخبار شائع ہوتا تھا۔چند گھنٹوں بعد چیختی، چنگھاڑتی سرخیوں کے ساتھ اخبار جب عام ہوا تو کراچی دم بخود رہ گیا۔روشنیوں کے شہر میں سیاست کے نام پر اس قدر نفرت آمیز واردات جس کے باعث سینکڑوں نوجوان زندہ نہ مردہ حالت میں ہسپتالوں میں کراہ رہے تھے۔ایم کیو ایم اپنے زخمیوں کو عباسی شہید ہسپتال اور پیپلز پارٹی نے قریب ہی جناح ہسپتال کا رخ کیا۔میں نے تمام زخمی نوجوان طالب علموں کو اپنے دفتر کے سامنے پارکنگ ایریا میں اترتے دیکھا تو کلیجہ منہ کو آگیا۔ایسا ہولناک منظر شاید کبھی دیکھا ہو۔ زیادہ تر اردو بولنے والے بچے تھے۔ایم کیو ایم کے علاوہ کچھ پیپلز پارٹی کی ذیلی تنظیم پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن تھے۔چند ایک کے مخصوص اعضاء مخالفین نے ٹارچر سیل میں ڈرل کر دیئے تھے۔اس کے علاوہ مخالف کی کمر اور چھاتی پر ڈرل مشین سے من پسند تنظیم کا نام کندہ کر دیا۔ اس عمل سے تکلیف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شام کے اخبار ''قومی اخبار'' میں خبر کی اشاعت کو بات چیت میں شریک سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرنے والے فوجی افسروں نے پسند نہیں کیا۔اب میری ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں دوڑ لگ گئی۔میں سکھلائے ہوئے طریقہ کار کے مطابق ''سر! چیک کرتا ہوں'' کی گردان جاری کئے ہوئے تھا۔کچھ دیر بعد کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کے آفس میں طلبی ہوگئی۔کور ہیڈ کوارٹرز کے سینئر افسر بھی موجود تھے۔میں پہنچا تو فضا ''ابر آلود'' تھی۔ظاہر ہے کہ سب متفق تھے کہ میجر صولت رضا نے خبر رکوانے کا فرض دیانت داری سے ادا نہیں کیا۔جنرل آصف نواز نے ذرا تلخ اونچی آواز میں کہا ''پی آر او! یہ سب کیا ہے؟''۔میرا جواب واضح تھا کہ ''سر! یہ خبر میں نے تصویروں کے ساتھ خود پہنچائی ہے''۔کور کمانڈر نے سوال کیا ''کوئی ٹھوس دلیل؟''۔میں نے جواب دیا ''سر! یہ میرا ایک پروفیشنل کے طور پر آرمی کے امیج کی سربلندی کی خاطر مناسب فیصلہ تھا۔ تشدد اور لاقانونیت میں ملوث افراد اور گروہوں کی پردہ پوشی بھی شریک جرم ہونے کے مترادف ہوگی۔دونوں جماعتوں کے بات چیت میں شریک رہنماؤں نے میرے دفتر میں پرتکلف ناشتہ کیا ہے۔آپس میں دوستانہ ہنسی مذاق دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ دو تین روز کے وقفے سے ان دونوں جماعتوں نے یہ سانحہ بھی فوج کے ذمہ ڈال دینا ہے کیونکہ بچے ہمارے عقوبت خانوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ہم نے کور ہیڈ کوارٹرز سے اٹھائے ہیں وغیرہ وغیرہ''۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز نے میری معروضات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ''ٹھیک ہے خبر روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔تم نے درست فیصلہ کیا ہے۔حقیقت لوگوں کے سامنے آنی چاہیے''۔

میٹنگ برخاست ہوگئی۔ میں اپنے آفس واپس پہنچا ہی تھا کہ رپورٹرز کی یلغار ہوگئی اور اگلے روز صبح کے اخبارات سیاسی جماعتوں کی ذیلی تنظیموں کے کارہائے نمایاں سے بھرے ہوئے تھے۔اداریے اور کالم اس کے علاوہ تھے۔شہر کی صحافت ایم کیوایم اور پیپلز پارٹی سے لرزہ براندام تھی لیکن مذکورہ ٹارچر سیل کے حوالے سے خبروں کی اشاعت کے لیے صحافیوں کی استقامت قابل تحسین تھی۔

سانحہ بہاولپور کے بعد پاک فوج کی کمان جنرل مرزا اسلم بیگ نے سنبھال لی تھی۔سینٹ کے چیئرمین غلام اسحاق خان صدر مملکت کے عہدے پر متمکن ہو گئے۔عام انتخابات کی تیاری عروج پر تھی اور تمام سیاسی جماعتیں کمر کس رہی تھیں۔ایسے عالم میں سندھ کی سیاست میں الاؤ روشن ہونا شروع ہو گئے۔متعدد لسانی،نظریاتی،علاقائی اور فقہی دائرے پھیلتے اور ایک دوسرے میں ضم ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔کراچی میں الطاف حسین کی ''زیر نگرانی'' ایم کیوایم ہر لحاظ سے سیاسی اور انتظامی پنجے گاڑھ چکی تھی۔تعلیمی اداروں کی دیواریں اور کلاس رومز میں ''مہاجر سیاست'' کا بول بالا تھا۔دوسری جانب سندھی بلوچی پنجابی اور پختون اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے کارنر میٹنگز وغیرہ کر رہا تھا۔پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی کی سیاست کے منفرد انداز تھے۔ان جماعتوں کے اجتماعات میں لسانی یا فرقہ وارانہ نمود و نمائش نہیں تھی۔پیپلز پارٹی کراچی اور دیگر شہری علاقوں میں اپنا ''سراپا'' غیر لسانی رکھتی ہے تاہم سندھ کی حد تک بھرپور سندھی دکھائی دینا سیاسی ضرورت بھی ہے۔یہ کیفیت اندرون سندھ کے ووٹر کو پارٹی نشان ''تلوار'' یا ''تیر'' کے ساتھ منسلک رکھتی ہے اور وہ آنکھ بند کر کے ''ٹھپہ'' لگا دیتا ہے۔کراچی اور حیدرآباد میں خاص طور سے تناؤ میں اضافہ ہو رہا تھا۔قانون نافذ کرنے والے ادارے بالخصوص آرمی اندرونی سلامتی کی ڈیوٹی کی بنیاد پر کسی ناگہانی صورتحال اور شورش کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔جنرل مرزا اسلم بیگ متعدد بار سندھ کے دورے پر آئے۔انہوں نے کراچی،حیدرآباد اور دیگر مقامات پر تعینات جوانوں سے ملاقات کی اور خطابات کیے۔انہیں دھیمے لہجے میں سخت بات کہنے کا ملکہ حاصل ہے۔ان کی پیشہ وارانہ امور پر گفتگو بھی عالمی تناظر میں ہوتی ہے۔ان کے دور میں ''ضرب مومن'' نامی بھرپور عسکری مشق کی بدولت پاک افواج کے پیشہ وارانہ امیج کو مہمیز ملی۔مشن میں شریک افسروں اور جوانوں کی صلاحیت،اہلیت اور اعتماد میں قابل تحسین حد تک اضافہ ہوا۔آرمی چیف نے مشق کے دوران اپنی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تقاریر میں ''دشمن'' اور پاکستان کے بدخواہوں کو واضح پیغام دیا کہ کسی قسم کی ''نان سینس'' برداشت نہیں کی جائے گی۔ ''ضربِ مومن'' کی ایک بات یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کے سینئر اور نوجوان نمائندگان کی بھرپور شرکت تھی۔ اس حوالے سے آئی ایس پی آر نے اپنے سربراہ بریگیڈیئر ریاض اللہ کی زیرِ صدارت وسیع انتظامات کئے تھے۔ بریگیڈیئر صدیق سالک کی سانحہ بہاولپور میں شہادت کے بعد جنرل مرزا اسلم بیگ نے انفنٹری رجمنٹ کے بریگیڈیئر ریاض اللہ کو آئی ایس پی آر کا ڈائریکٹر مقرر کیا۔ یہ ایک غیر متوقع فیصلہ تھا جبکہ فوج میں ''لنگر گپ'' کچھ اور تھی۔

یہاں بتاتا چلوں کہ آئی ایس پی آر سربراہ بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کی ریٹائرمنٹ کے بعد بریگیڈیئر صدیق سالک نے ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کا چارج سنبھالا تو میں اس وقت آئی ایس پی آر لاہور میں تعینات تھا۔ پورے دفتر میں خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی۔ یہ کیفیت غیر متوقع نہیں تھی، سٹاف کو معلوم تھا کہ مزاجِ یار بچپن سے ''عاشقانہ'' ہے۔ میرے ایک رفیق کار نے راولپنڈی سے کانپتی ہوئی آواز میں اطلاع دی کہ بریگیڈیئر سالک نے آئی ایس پی آر کی کمان سنبھال لی ہے اور انہوں نے بڑے سخت احکامات جاری کیے ہیں۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ ابھی یہ احکامات لاہور نہیں پہنچے'' میرا جواب سن کر موصوف بولے ''آپ خوش نہ ہوں۔ عن قریب ریجنل دفاتر کی شامت آنے والی ہے''۔ میں نے جواب دیا کہ بھائی ہمارا کیا ہے، پہلے ایک گگلی بالر کا سامنا کرتے رہے۔ اب فاسٹ بالر آ گیا ہے تو سر پر ہیلمٹ پہن لیتے ہیں اور باہر جاتی ہوئی تیز گیند سے فاصلہ رکھیں گے۔ دو چار روز کی بات ہے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا''۔ اگلے روز ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے صبح ڈائریکٹر کے پی اے کی فون پر آواز سنائی دی: ''سالک صاحب آپ سے بات کریں گے''۔ پی اے نے لائن تھرو کی تو سالک صاحب فون پر تھے۔ میں نے تقریباً نعرہ لگاتے ہوئے کہا ''السلام علیکم سر، بہت بہت مبارک ہو''۔ دوسری جانب سے آواز آئی۔ ''وعلیکم السلام، شکریہ۔ میجر صولت رضا آپ نے ہیلمٹ خرید لیا ہے؟'' ایک لمحے کے لیے تو میں سناٹے میں آ گیا۔ جی سر، جی سر۔ ساڑھے سات بجے سے پہن کر بیٹھا ہوں سر۔ میرا جواب سن کر ادیب صدیق سالک ڈائریکٹر آئی ایس پی آر پر حاوی ہو گیا۔ فون پر ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا تو میرے اوسان بحال ہوئے۔ میں نے خوشامدانہ لہجے میں ایک اور فقرہ آگے بڑھایا۔ ''سر! آپ کی کمان میں آغاز سے ہی مخبری کا نظام بہت اعلیٰ دکھائی دیتا ہے'' سالک صاحب کب چوکنے والے تھے۔ فوراً بولے ''فی الحال اس شعبے میں پہلے سے تعینات سٹاف سے استفادہ کر رہا ہوں، لہٰذا آپ زیادہ محتاط رہیں''۔ بریگیڈیئر صدیق سالک نے فوج میں کمیشن سے شہادت تک مثالی محنت، جذبے اور جوان مردی کے ساتھ اپنے فرائض ادا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کئے ۔انہوں نے زندگی کا ہر لمحہ بھرپور انداز میں بسر کیا۔صدیق سالک بنیادی طور پر ایک دیانتدار قلم کار تھے۔سرکاری ملازمت کے مخصوص تقاضوں کے باوجود انہوں نے قاری سے کبھی بے وفائی نہ کی۔وہ محنت پر یقین رکھتے تھے،فوج میں ترقی کی منازل طے کرتے رہے۔کیپٹن،میجر،لیفٹیننٹ کرنل،فل کرنل اور بریگیڈیئر۔اس کے بعد بھی مزید ترقی کی راہیں کھلی تھیں لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا اور وہ 17 اگست 1988ء کو جام شہادت نوش کر گئے۔صدیق سالک کی پوری سروس ایک ڈٹ جانے والے پروفیشنل کی ہی رہی۔ان کی شہادت کے بعد آئی ایس پی آر ایک ”بے بس یتیم“ کی مانند تھا۔سب کی نظریں صدیق سالک کی کرسی پر تھیں لیکن محض کرسی پر بیٹھنے سے کوئی صدیق سالک نہیں بن سکتا تھا۔عبوری دور میں چند ایک نے کوشش کی لیکن منہ کے بل گرے۔کچھ عرصہ بعد بریگیڈیئر ریاض اللہ ڈائریکٹر آئی ایس پی آر تعینات کر دیئے گئے۔ان کا بنیادی تعلق فوج کی ایک پیادہ رجمنٹ سے تھا اور عہدہ سنبھالنے کے لیے پوری سروس میں پہلی مرتبہ آئی ایس پی آر کے دفاتر تشریف فرما ہوئے۔ان کی تعیناتی سے پیشہ وارانہ بے بسی کا دورانیہ طویل تر ہوتا گیا اور میڈیا کی نظروں میں آئی ایس پی آر باوردی مزاج (ہیومران یونیفارم) کا سب سے اہم منبع بن گیا۔ان حالات میں صدیق سالک کی کمی بے حد محسوس کی گئی۔

آئی ایس پی آر کے سربراہ بریگیڈیئر ریاض اللہ خان بعد میں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی پا گئے۔ریاض اللہ خان راولپنڈی سازش کیس کے مرکزی کردار سابق میجر جنرل محمد اکبر خان سے بے حد متاثر تھے۔ان کیا خیال تھا کہ بری فوج نے جو نمایاں لڑاکا آفیسر پیدا کیے ہیں،ان میں سب سے نمایاں میجر جنرل اکبر خان اور جنرل ٹکا خان ہیں۔ریاض اللہ خان مرحوم ان دونوں جنرل آفیسرز کے بارے میں ٹی وی اور سینما کے لیے فلم بنانے کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔میں میجر جنرل ریاض اللہ خان مرحوم کے دور میں آئی ایس پی آر کراچی میں تعینات تھا۔یہ 1988ء سے 1991ء کا ذکر ہے۔میجر جنرل ریاض اللہ خان جب کراچی تشریف لاتے تو صحافیوں،قلم کاروں اور جنرل صاحب کے درمیان دلچسپ اور معنی خیز گفتگو سے لطف اندوز ہونے کی سعادت نصیب ہوتی۔ایک مرتبہ کسی تیکھے قلم کار نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا کہ”کاش!لیاقت علی خان کے خلاف راولپنڈی سازش کیس میں ملوث تمام افراد کو فائرنگ سکواڈ کے حوالے کر دیا جاتا تو وطن عزیز سیاسی لحاظ سے صراط مستقیم پر گامزن رہتا“۔پرکشش شخصیت اور دھیمے لب و لہجے کے مالک میجر جنرل ریاض اللہ خان سے یہ قیمتی مشورہ برداشت نہ ہوسکا اور انہوں نے پھر اپنے مخصوص ”عسکری انداز“ میں اس قلم کار کی خوب خبر لی۔میجر جنرل ریاض اللہ خان بنیادی طور پر انفنٹری سے تعلق

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

رکھتے تھے۔ صدیق سالک کی شہادت کے بعد جنرل اسلم بیگ نے آئی ایس پی آر کی کمان انہیں سونپ دی۔ انفنٹری کے ٹو سٹار جنرل اور کراچی کے تیکھے قلم کار کے درمیان بحث سے مجھے کراچی میں فوج کا تعلقات عامہ بھسم ہوتا دکھائی دیا۔ بہر حال بڑی مشکل سے فائر بندی ہوئی۔ اس روز مجھے اپنے ڈائریکٹر جنرل کی روالپنڈی سازش کیس کے مرکزی کردار کے ساتھ دلی عقیدت کا احساس ہوا۔ بہر حال میجر جنرل ریاض اللہ خان کی رحلت تک مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم کے درپے عسکری شخصیت میجر جنرل اکبر خان کو جنرل ٹکا خان کے ساتھ ایک فلم میں کیسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ خیر جگر کے جان لیوا سرطان نے میجر جنرل ریاض اللہ مرحوم کو مہلت نہ دی اور ان کی المناک وفات کے ساتھ ہی مجوزہ فلم داخل دفتر کر دی گئی۔ میجر جنرل ریاض اللہ خان مرحوم کی رحلت کے بعد چند روز اسی شش و پنج میں گزرے کہ اب ان کی جانشینی کا شرف کون حاصل کرتا ہے۔ ایک رائے یہ تھی کہ آئی ایس پی آر کے بریگیڈیئر ایس ایم اے اقبال کو سربراہ تعینات کر دیا جائے گا لیکن آخر کار قرعہ فال میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ کے نام نکلا جو بنیادی طور پر کور آف انجینئرز سے تعلق رکھتے تھے۔

پرکشش شخصیت کے حامل میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ کو انگریزی لکھنے اور بولنے میں مہارت حاصل تھی۔ شستہ اردو میں مافی الضمیر بیان کرتے، البتہ اردو لکھنے اور پڑھنے کی جانب طبیعت مائل نہ تھی۔ جنرل آصف نواز نے آرمی چیف کا عہدہ سنبھالتے ہی اپنے پیش رو جنرل مرزا اسلم بیگ کی میڈیا پالیسی میں خاصی ترامیم کیں۔ انہوں نے سیاسی حکومت کے متوازی ابلاغی نظام کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے پبلسٹی میں ٹھہراؤ کی ہدایات جاری کیں۔ یوں آئی ایس پی آر میں بھی قدرے سکون آ گیا۔ میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ کو ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر تعینات ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ ایک روز دفتر پہنچتے ہی مجھے طلب فرمایا۔ عموماً گفتگو اور ہدایات کے لیے لہجہ میں نرمی ہوتی تھی لیکن اس صبح ناگواری نمایاں تھی۔ فرمانے لگے کہ یہ تمہارے اخبارات والے دوست رات کو آرام کیوں نہیں کرنے دیتے، رات کو کیوں فون کرتے ہیں۔ گزشتہ رات کوئی صاحب مجھے نیند سے بیدار کرنے کے بعد گپ شپ پر اصرار کر رہے تھے۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کیا کام کرتے ہیں تو فرمانے لگے کہ اگلے ہفتے پڑھ لینا کہ میں کیا کام کرتا ہوں سب معلوم ہو جائے گا۔ ان صاحب کا نام جنرل صاحب کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ چند روز بعد کراچی کے ہفت روزہ تکبیر میں سعود ساحر کی ڈائری شائع ہوئی جس میں انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ''آئی ایس پی آر کے نئے سربراہ صحافیوں سے پوچھتے ہیں کہ آپ کیا کام کرتے ہیں''۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

8 جنوری 1993ء کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ میں نے ڈی جی آئی ایس پی آر کو اطلاع دینے کی کوشش کی۔ تب موبائل فونز کا زمانہ نہیں تھا۔ ڈی جی آئی ایس پی آر اسلام آباد سے بمشکل دستیاب ہوئے جہاں وہ کسی تقریب میں شریک تھے۔ اطلاع سنتے ہی سکتے میں آ گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ دفتر تھے۔ ان کے پاس آرمی چیف کے انتقال کی مصدقہ خبر تھی۔ اب پریس ریلیز کی تیاری اور دیگر امور کو ترتیب دینے کا مرحلہ تھا۔ آرمی ہاؤس کے دروازے کھول دیئے گئے۔ رات بھر تعزیت کرنے والے آتے رہے۔ رات گئے قائم مقام آرمی چیف لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف چودھری نے چارج سنبھال لیا۔ چندروز بعد صدر پاکستان غلام اسحاق خان نے لیفٹیننٹ جنرل عبدالوحید کاکڑ کو جنرل کے رینک پر ترقی دے کر چیف آف آرمی سٹاف تعینات کر دیا۔ جنرل عبدالوحید کاکڑ نے کمان سنبھالتے ہی سندھ میں جاری اندرونی سلامتی کے آپریشن پر مرحلہ وار نظر ثانی شروع کر دی جس سے آپریشن کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ نے بری فوج وقار برقرار رکھنے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے صحافیوں اور ایڈیٹروں سے رابطوں کے ذریعے عسکری موقف پیش کیا۔

آمدم برسر مطلب۔ میں بات کر رہا تھا کہ بریگیڈیئر صدیق سالک کی شہادت کے بعد بریگیڈیئر ریاض اللہ کو آئی ایس پی آر کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ ہوسکتا ہے کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی نافذ کردہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے کسی سینئر جرنلسٹ کو اس عہدے پر تعینات کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ نامور صحافی اور ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر جناب زیڈ اے سلہری کو فیلڈ مارشل ایوب خان نے کرنل کا عہدہ دے کر آئی ایس پی آر کا سربراہ مقرر کر دیا تھا۔ ہمارے سینئرز کے بقول سلہری صاحب زیادہ عرصہ اس عہدہ پر قائم نہیں رہے کیونکہ اس زمانے کی ''ہائی کمان'' کو لمبے بال رکھے اور وکٹورین انگریزی لکھنے اور بولنے والا ''کرنل'' ایک جنرل یا فیلڈ مارشل سے براہ راست ہدایات لینا پسند نہیں تھا۔ شاید کرنل سلہری بھی ذہنی لحاظ سے ''لیس سر'' کے پابند نہیں تھے۔

بریگیڈیئر ریاض اللہ نے عہدہ سنبھالتے ہی جنرل مرزا اسلم بیگ کی ہدایات کے مطابق میڈیا سے قریبی تعلقات استوار کرنے کا چیلنج قبول کر لیا۔ کراچی میں اولین دورے پر تشریف لائے تو میں ایئرپورٹ پر استقبال کے لیے موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مخصوص لہجے میں کہنے لگے ''صولت صاحب! میں عارضی ہوں، سالک کے بعد اب تمہارا نمبر ہے''۔ بریگیڈیئر ریاض اللہ کا یہ فصیح و بلیغ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جملہ آج بھی کان میں گونجتا ہے تو دنیا کی بے ثباتی پر یقین اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ دراصل موصوف یہ کہنا چاہتے تھے کہ بریگیڈیئر سالک کے بعد اب آئی ایس پی آر آپ "لوگوں" کے سپرد ہے۔ میں محض عارضی طور پر سربراہ ہوں۔ پہلی "شنوائی" کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ کسی خاکی وی آئی پی کے ساتھ سی ون تھرٹی (C-130) میں بیٹھا کلمہ شہادت کا ورد کر رہا ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ بریگیڈیئر ریاض اللہ بھی ہم جیسے ہو گئے۔ صحافیوں سے براہ راست ملاقات کے حوالے سے بہت حساس تھے۔ کراچی جب بھی تشریف لاتے تو کمانڈر روشن (پی آر او پاک نیوی) کے ساتھ مل کر مجھے ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کو "مصروف" رکھنے کے لئے دن رات ایک کرنا ہوتا تھا۔ اخبارات کے دفاتر میں میل ملاقات، سیمینار اور دفتر میں بالمشافہ ملاقاتیں ترتیب دینا "مشق سخن" سے زیادہ مشقت تھی۔ ہم ایسے ڈائریکٹر صاحبان اس کے عادی تھے جو ہمیں اپنے دوستوں کے روبرو پیش کرتے تھے۔ اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ آئی ایس پی آر کے سربراہ کو میڈیا میں لئے لئے پھر رہے ہیں۔ تعارف کے لیے ان کے ایک قابل فخر فوجی ہونے کی حیثیت سے زمانہ امن و جنگ میں کارہائے نمایاں مزید نمایاں کر کے بیان کرتے تھے۔ اب قلم کار یا صحافی کبھی ہمارا منہ تکتے تھے اور اکثر "باس" کا جو کسی لمحے بھی دور رس نتائج کے حامل سوال یا جواب کا منبع بن سکتے تھے۔ بریگیڈیئر ریاض اللہ صاف گو، دیانتدار اور لگی لپٹی رکھے بغیر دوٹوک گفتگو کے عادی تھے، ظاہر ہے کہ ایک باوقار اور باصلاحیت سینئر فوجی افسر کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کراچی کے اخبارات میں بذات خود جانے پر اصرار کرتے تھے۔ میں سٹاف کار میں جاتے ہوئے انہیں یاد کرایا کرتا تھا کہ جس اخبار میں جائیں اس کی تعریف ضرور کریں۔ میری درخواست پر بہت مشکل سے راضی ہوئے۔ کہنے لگے: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں کسی اخبار کا مطالعہ ہی نہ کروں اور اس کی تعریفیں شروع کر دوں"۔ ایک مرتبہ سخت لہجے میں مجھے خاموش کروانے کی کوشش کی۔ میں نے دوبارہ کہا: "سر! یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ ہم ہر صحافی، ادیب اور میڈیا سے منسلک شخص اور ادارے کی تعریف کرتے رہیں خواہ "دل" راضی نہ بھی ہو"۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ چند لمحے توقف کے بعد کہا: "یہ بات مجھے پہلے معلوم ہوتی تو کبھی تمہارے ڈائریکٹوریٹ میں نہ آتا۔ مجھے چیف (جنرل اسلم بیگ) نے یہ نہیں بتایا جو تم کہہ رہے ہو"۔ اس کے بعد انہوں نے سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے میڈیا کے "کاروباری" کردار پر تفصیلی لیکچر دیا۔

بریگیڈیئر ریاض اللہ کی "جارحانہ" تعلقات عامہ مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ اندرون سندھ کے پریس کلبز میں پہلی مرتبہ فوج کا موقف توجہ کے ساتھ سنا گیا اور یہ تاثر کہ فوج صرف پنجابی اور اردو بولنے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

والوں کے پریس کو فوقیت دیتی ہے، بہت حد تک ختم ہو گیا۔ سندھی اخبارات سے براہ راست تعلق استوار ہوا۔ ان کے نوک دار رویے میں کمی آ گئی۔ میں نے اپنے دفتر میں مددگار کے طور پر ایک سندھی بولنے والے سپاہی کو اٹیچ کیا ہوا تھا جو مجھے سندھی اخبارات سے اہم خبریں پڑھ کر سناتا تھا۔ یوں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کو سندھی پریس سے آشنائی میں مدد ملی۔ کبھی کبھار کسی اجتماع میں جنرل آصف نواز سندھی اخبارات کے مالکان سے ان کے اخبارات میں شائع ہونے والے مواد کے بارے میں گفتگو کرتے تو حیرانی قابل دید ہوتی۔ بعد میں سب کو معلوم ہو گیا کہ آئی ایس پی آر کراچی انگریزی اردو کے ساتھ سندھی اخبارات و جرائد سے بھی متاثر ہو چکا ہے۔ میں آج بھی سمجھتا ہوں کہ قومی سطح پر تمام پاکستانی زبانوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ کاش فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے زمانے میں قائم کردہ نیشنل پریس ٹرسٹ کو یہ مشن سونپا جاتا کہ سندھی، بلوچی، براہوی، پنجابی، سرائیکی، ہندکو، پشتو اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے جرائد اور کتابوں وغیرہ کو ٹھوس مالی امداد کے ذریعے توانا رکھا جائے۔ این، پی ٹی نے منافع بخش اخبارات کو تحویل میں لے کر نظری لحاظ سے ''بددیانتی'' پر مبنی اقدامات کیے جس کے باعث روز اول ہی سے ایک اہم قومی ادارہ مشکوک ہو گیا اور آخر کار اپنے ساتھ مقبول ترین اخبارات کو بھی لے ڈوبا۔

''ضرب مومن'' مشق کے لئے کراچی سے نامور ایڈیٹر، سینئر صحافی اور تعلقات عامہ کے شعبے سے منسلک شخصیات شریک ہوئیں۔ ''میدان جنگ'' پہنچنے سے قبل ہی ناگہانی صورتحال کا سامنا ہوا۔ ہم کراچی سے فیصل آباد جانے کے لیے پی آئی اے کے مسافر بردار طیارے میں سوار ہوئے۔ ابھی بمشکل پندرہ بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ پائلٹ نے اعلان کیا کہ بعض آپریشنل وجوہات کے باعث ہم واپس کراچی جا رہے ہیں۔ اس اعلان کے ساتھ ہی جہاز کے عملے میں بھگدڑ مچ گئی۔ بوڑھے مسافروں کو آگے آنے کی ہدایت کی گئی، اب ایک اور اعلان ہوا کہ ہم بہت جلد نیچے اترنے والے ہیں۔ آپ سب پاؤں سے جوتے اتار دیں۔ نکٹائی کھول دیں، کالر اونچے کر لیں، منہ سے مصنوعی دانت نکال لیں۔ ایمرجنسی لینڈنگ ہوگی۔ ہاتھ ٹانگوں کے نیچے لے جائیں۔ سر گھٹنوں پر رکھ دیں (مرغا پوزیشن)، بچوں کو باندھ لیں وغیرہ وغیرہ۔ اور ساتھ ہی جہاز ڈگمگایا۔ مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔ بچوں نے رونا شروع کر دیا۔ ایک ایئر ہوسٹس نے ایمرجنسی گیٹ کے پاس قاضی اسد عابد (عبرت) اور سجاد میر (حریت) کو بٹھایا اور یہ ہدایت کی کہ جہاز رکتے ہی ایمرجنسی گیٹ کھول دیں۔ مجھے یاد ہے کہ پورے جہاز میں آہ و بکا تھی اور تیزی سے لینڈنگ کی طرف گامزن تھا۔ جہاز کے پہیے زمین پر لگے تو سکون ہوا۔ اب رخ ویران رن وے کی جانب تھا۔ جہاز رکا تو شوٹ کھل گئیں اور مسافر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پھسل کر نیچے اترنے لگے۔ ایک اور ایمرجنسی گیٹ کھلا تو ہم نے ونگ پر چھلانگ لگا دی، مجھ سے پہلے بیرسٹر ثمن خان (کالم نگار) بھی اسی راستے سے نکل کر جہاز کے ونگ پر کھڑے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کسی نے کال کر کے اطلاع دی تھی کہ جہاز میں ''بم'' ہے، لہٰذا یہ ساری کارروائی کی گئی ہے، یوں ہماری ''عسکری'' مشق کا آغاز دوران پرواز ہی ہو گیا۔ تین چار گھنٹے کراچی ایئرپورٹ پر ہی قیام کیا گیا۔ جہاز کلیئر ہوا تو دوبارہ روانگی کا حکم ملا۔ ہمارے گروپ میں شامل میرے سابق ڈائریکٹر بریگیڈیئر (ر) تفضل حسین صدیقی اور سینئر کالم نگار ایم۔ ایچ۔ عسکری نے دوبارہ سفر سے معذرت کر لی۔ رات گئے فیصل آباد ایئرپورٹ پر اترے، وہاں سے آرمی کوچز میں ''میدان جنگ'' کی جانب روانہ ہو گئے۔ علاقے میں ابتدائی بریفنگ کے بعد ایک سپیشل ٹرین میں سوار کرایا گیا تاکہ دونوں متحارب افواج بلیو لینڈ اور فاکس لینڈ کے مابین جنگ کے حوالے سے نقل و حرکت اور مختلف زاویے سے عسکری اقدامات کا بچشم خود معائنہ کر سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اہل قلم کے لئے یہ ایک منفرد تجربہ تھا۔ مشق کے دوران صحافیوں کو مختلف نوعیت کے ہتھیاروں اور عسکری آلات سے بھی روشناس کروایا گیا۔ ضرب مومن کی کہانی بہت طویل ہے تاہم ایک واقعہ کا ذکر کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ کراچی سے ہمارے دوست رپورٹر قیصر محمود صاحب بھی رپورٹنگ ٹیم کا حصہ تھے۔ انہیں ایک انفنٹری یونٹ کے ساتھ منسلک کیا گیا تھا تاکہ اگلے مورچوں سے آنکھوں دیکھا حال رپورٹ کر سکیں۔ ان کا بیان ہے کہ رات گئے کسی مقام پر مورچہ زن تھے۔ انہیں ایک انفرادی خیمہ ملا ہوا تھا کہ تھکن کے باعث آنکھ لگ گئی۔ یونٹ کو جنگی احکامات کے تحت سورج نکلنے سے قبل کہیں اور منتقل ہونے کے احکامات مل گئے۔ یونٹ کے اہلکاروں نے قیصر محمود صاحب کو جگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ وہ اپنے چھوٹے خیمے جس میں ایک شخص ہی سما سکتا ہے، سوئے رہ گئے۔ جب زیادہ دھوپ نکلی تو آنکھ کھلی تو ہر طرف ویرانہ تھا۔

بہرحال انہیں میری ہدایت یاد تھی کہ ''ایمرجنسی یا گم ہو جانے کی صورت میں زمین پر بچھائی گئی ٹیلی فون تار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیں۔ کوئی نہ کوئی ''برسرپیکار'' آرمی یونٹ مل جائے گی۔ قیصر محمود صاحب بھی گرتے پڑتے سہ پہر کے بعد ایک آرمی یونٹ جا پہنچے جہاں انہیں متحارب فوج کا ایک اہلکار سمجھ کر تحویل میں لے لیا گیا۔ بہرحال افسر کے روبرو پیش کیا گیا تو راز کھلا کہ یہ فرائض منصبی میں بری طرح ملوث صحافی ہے۔ جب ہمیں اطلاع ملی تو بریگیڈیئر ریاض اللہ کی اجازت سے قیصر محمود کی پوسٹنگ اسی یونٹ میں کر دی گئی جس نے انہیں تحویل میں لیا تھا۔ ضرب مومن مشق کو منعقد ہوئے کئی برس بیت گئے ہیں، قیصر محمود صاحب کا یہ واقعہ اس لیے ذہن میں دوبارہ نمایاں ہو گیا کہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

چند ہفتے قبل ہی قیصر محمود صاحب کینسر کے موذی مرض کے باعث انتقال کر گئے ہیں۔مرحوم زندہ دل، بااصول اور ملنسار شخصیت تھے۔اللہ کریم مغفرت فرمائیں۔آمین

جنرل اسلم بیگ کی ریٹائرمنٹ قریب آ رہی تھی۔ نئے آرمی چیف کے لیے اسمائے گرامی کے مابین دوڑ شروع ہو گئی۔فیصلہ وزیراعظم محمد نواز شریف کی تجویز پر صدر مملکت غلام اسحاق خان نے کرنا تھا۔صاحب الرائے شخصیات کے خیال میں لیفٹیننٹ جنرل حمید گل ہی مناسب چوائس تھے۔ تاہم لڑاکا عسکری شعبے سے تعلق رکھنے والے تمام تھری سٹارز ''امیدوار'' تصور کئے جاتے ہیں۔یعنی انفینٹری، آرٹلری اور آرمرڈ کور وغیرہ براہ راست لڑاکا شعبے تصور ہوتے ہیں۔(یہ اور بات ہے کہ میاں محمد نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف کو بیرون ملک سفر کے دوران منصب سے ہٹانے کے بعد لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین کا انتخاب کیا تھا جو کہ انجینئرز کور (یعنی غیر لڑاکا گروپ) سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ فیصلہ بھی روایات سے ہٹ کر تھا اور اسی سے ایک نئی بحث نے جنم لیا)۔

جنرل مرزا اسلم بیگ کی ایکسٹینشن کی افواہ بھی پھیلی لیکن یہ بات واضح کی گئی کہ آرمی چیف اس کے حق میں نہیں ہیں، دوسری جانب سیاسی حلقے وثوق سے یہ بات کہہ رہے تھے کہ وزیراعظم نیا آرمی چیف تعینات کرنا چاہتے ہیں۔آئی ایس پی آر کے سربراہ بریگیڈیئر ریاض اللہ کا خیال تھا کہ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کے آرمی چیف تعینات ہونے کے امکانات زیادہ ہیں کیونکہ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل مخصوص پس منظر رکھتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ سیاسی قیادت ایک خالص پیشہ وارانہ پس منظر رکھنے والے جنرل آفیسر کو ترجیح دے۔ایک روز چند سینئر افسروں کی موجودگی میں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز نے یہ سوال مجھ سے دریافت کیا کہ میں نے بریگیڈیئر ریاض اللہ کی بات کو آگے بڑھایا تو ماحول خوشگوار ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ فضاء میں تناؤ موجود تھا۔شاید اسی وجہ سے نئے آرمی چیف کا اعلان جنرل اسلم بیگ کی ریٹائرمنٹ سے کافی پہلے کر دیا گیا۔لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کے دفتر اور گھر میں مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔کراچی کور میں الگ مسرت وانبساط کی کیفیت تھی۔ جنرل آصف نواز کو آرمی چیف کا منصب سنبھالنے سے قبل کچھ مدت کے لئے چیف آف جنرل سٹاف کے آفس میں فرائض انجام دینے تھے۔انہوں نے جنرل ہیڈکوارٹرز پہنچتے ہی جن افسران اور عملے کو رپورٹ کرنے کی ہدایت کی ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔کراچی میں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل عارف بنگش مقرر ہوئے تھے، انہوں نے میری راولپنڈی روانگی کا ''حکم نامہ'' پڑھتے ہی کہا کہ فوراً روانہ ہو جاؤ۔ایک مرتبہ پھر آئی ایس پی آر ڈائریکٹوریٹ کے در و دیوار منتظر تھے۔اس برس میرا نام میجر سے لیفٹیننٹ کرنل کے لئے پروموشن بورڈ میں بھی شامل تھا۔یہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آرمی کیریئر میں کسی افسر کے لئے بہت اہم اور قیمتی لمحات ہوتے ہیں۔ معمولی کوتاہی یا لغزش برسہا برس کی دن رات محنت پر پانی پھیر سکتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ کراچی میں معاملات کافی حد تک ازبر ہوگئے ہیں، آرمی چیف اور وہ بھی جنرل آصف نواز کے ساتھ ''پریس رابطہ افسر'' کی نوکری دودھاری تلوار کے مترادف ہے۔ میری حیدرآباد ''ڈومی سائیلڈ'' بیگم اور کراچی میں پلے بڑھے ''اردو سپیکنگ'' بچے اور کچھ نہیں تو راولپنڈی کی سردی کو تو تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ بہر حال پہلے میں اکیلا ہی ''رپورٹنگ فار ڈیوٹی'' گنگناتا نئے آرمی چیف کے آفس جا پہنچا۔ ٹیم ترتیب دی جارہی تھی۔ مجھے جنرل آصف نواز نے کرنل عزیز احمد خان کے ساتھ فرائض انجام دینے کی ہدایت کی۔ کرنل عزیز آرمی ایجوکیشن کور میں انگلش لینگوئج کے انسٹرکٹر تھے اور طویل عرصہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں گراں قدر خدمات انجام دے چکے تھے۔ جنرل مرزا اسلم بیگ سرکاری رہائش گاہ سے اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہوگئے تھے۔ لہٰذا جنرل آصف نواز منصب سنبھالتے ہی آرمی چیف کی سرکاری قیام گاہ میں رہائش پذیر ہوگئے جہاں ایک مختصر سی تقریب ہوئی۔ دستے نے سلامی دی اور جنرل آصف نواز نے مختصر خطاب کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس عمارت میں انہوں نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور میں ایک کیپٹن کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے تھے۔ جنرل آصف نواز کا تعلق بھی پنجاب رجمنٹ کی شیر دل بٹالین سے تھا۔ پہلے دن فرمان امروز جاری کیا گیا جس میں نئے آرمی چیف نے واضح کہا: ''ایک سپاہی کی شان صرف اس کے اپنے پیشے میں مہارت حاصل کرنے میں ہے۔ ہمیں صرف سپاہی بن کر رہنا ہے، اس میں کسی اور کردار کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ پاکستان صرف ایک ملک ہی نہیں ایک نظریہ ہے اس لیے اس کی حفاظت ایک قومی اور پیشہ وارانہ فریضے سے بڑھ کر ایک مذہبی فریضہ ہے۔ یہ ہم سب کا ایمان ہے''۔ جنرل آصف نواز نے مزید ہدایت کی کہ اپنی زندگیوں کو قرآن اور رسول کریم ﷺ کی سنت کے مطابق گزاریئے۔ اسلام کو اپنی زندگی بنا لیجیے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول یاد رکھیں: ''خبردار ایک لمحے کے لیے بھی کسی انسان کی خوشنودی کے لئے اللہ تعالیٰ کی ناراضی مول نہ لو''۔

یہ فرمان امروز آرمی یونٹس اور دیگر اداروں میں خصوصی اجتماعات کے دوران پڑھ کر سنایا گیا۔ جنرل آصف نواز علی الصبح بیدار ہونے کے عادی تھے اور آٹھ بجے صبح اپنے آفس میں موجود ہوتے تھے۔ یوں ایک لحاظ سے سٹاف اور دیگر عملے کو تیاری کے لیے ایک گھنٹہ قبل ہی چوکس رہنا ضروری تھا۔ یہ طریقہ کار کراچی میں کور کمانڈر کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ میں ساڑھے آٹھ بجے صبح تک پریس بریف اور اخبارات سے اہم خبروں کے تراشے ''بقلم خود'' تیار کر کے پہنچا دیتا تھا۔ بعض ''شب

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بیدار'' افسر نیم خوابیدہ حالت میں آنکھ ملتے ہی بھاگم بھاگ دفتر پہنچا کرتے تھے۔ دوسری جانب دوپہر دو بجے گھر واپسی کے لیے سٹاف کار تیار ہو جاتی تھی۔

ان کا خیال تھا کہ دفتر میں مقررہ وقت سے زیادہ ٹھہرنا نظام میں پیچیدگی لاتا ہے۔ افسر کو چاہیے کہ فیملی اور سپورٹس کے لیے بھی وقت نکالے۔ زیادہ ضروری کام ہے تو گھر سے دوبارہ آفس آ جائے۔ آرمی چیف کے اے ڈی سی نے مجھے کہا کہ آپ مشورہ دیں کہ جی ایچ کیو آٹھ بجے کے بعد آیا کریں کیونکہ آرمی چیف کے آفس اور دیگر ملحقہ دفاتر کی صفائی ساڑھے سات بجے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ برسوں سے مقررہ وقت ہے اب متعلقہ عملہ چھ بجے آنے سے رہا۔ خاص طور سے سردیوں میں۔ لیکن آفس میں جنرل آصف نواز کی آمد اور روانگی کے اوقات تبدیل نہ ہوئے البتہ اس کے باعث بیسیوں کو صبح خیزی کی عادت ہو گئی۔ آرمی چیف اخبارات کے سرسری مطالعہ کے بعد روزمرہ سرکاری فرائض ادا کرتے تھے۔ دن بھر بھرپور انداز میں مصروفیت ان کی عادت ثانیہ تھی۔ کچھ عرصہ بعد یونٹس کے دورے اور عسکری مشقوں کا معائنہ بھی شروع ہو گیا۔ جنرل آصف نواز کے دور میں کئی اہم واقعات پیش آئے جن میں کراچی آپریشن سرفہرست ہے۔ ایک روز ''کیفیت'' جسے مصروفیت کہنا درست نہیں ہوگا۔ اس کیفیت نے آرمی چیف کی توجہ کو بھی متاثر کیا تھا۔ یہ میاں محمد نواز شریف کا عمومی رویہ تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آرمی چیف سے جس ''قرب'' کے آرزومند ہیں وہ انہیں حاصل نہیں ہو رہا۔ تاثر یہ ہے کہ آرمی چیف صدر پاکستان غلام اسحاق خان کے زیادہ قریب ہیں۔ اس تاثر کی اطلاع جنرل آصف نواز کو بھی تھی لہٰذا انہوں نے یہ تاثر زائل کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ وزیراعظم کو اپنے ہمراہ آرمی مشقوں، عسکری تقریبات اور دیگر بریفنگز وغیرہ پر لے کر جاتے تھے۔ کئی مرتبہ بریفنگ وغیرہ میں بار بار یہ بات دہراتے تھے کہ فوج کی ملکی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں ہم اس کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے۔ اس کے باوجود نواز شریف اور ان کے چند قریبی ساتھی کسی نہ کسی حوالے سے مکمل تعاون کی ''عدم دستیابی'' کا تاثر قائم رکھنا چاہتے تھے۔ شاید انہیں ہر دس پندرہ دن کے بعد آرمی چیف سے یہ الفاظ سننا پسند تھے کہ فوج کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تاثر برقرار بھی ان کے وسیع تر سیاسی عزائم کا حصہ ہو۔ بہرحال کچھ واقعات بھی ہوئے جو منظر عام پر بھی آئے۔ چند ایک شاید زبانی گفتگو اور سرکاری فائلز ہی میں دب گئے۔

جنرل آصف نواز کا ایک اہم فیصلہ چند بااثر سیاسی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے فوجی افسروں (کیپٹن / میجر) کو سول سروس کے امتحانات میں شرکت کی اجازت دینا تھا۔ ان میں سے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شاید کچھ کا سول ملازمت میں براہ راست تقرر بھی تھا۔ جنرل آصف نواز نے واضح کیا کہ بااثر اور متمول سیاسی خاندانوں کے چشم و چراغ فوج میں رہیں گے تو اس سے جوانوں کے مورال اور استعداد کار پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ نواز شریف نے اپنے حامی قومی اسمبلی کے بعض اراکین کو یقین دلایا تھا کہ ان کے بیٹے، بھتیجے اور بھانجے وغیرہ جو فوج میں خدمات انجام دے رہے ہیں سول سروس جیسے پولیس، ڈی ایم جی، کسٹم، انکم ٹیکس وغیرہ میں ٹرانسفر کر دیئے جائیں گے لیکن جنرل آصف نواز نے دوٹوک الفاظ میں ''اعتراض'' اٹھا دیا اور یہ ''حکم عدولی'' حد درجہ منفی تاثر کے ساتھ محسوس کی گئی۔ شاید اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک روز آٹھ بجے کے قریب آئی ایس پی آر پہنچا ہی تھا کہ دو تین نائب قاصد ایک ہی بات بار بار دہرا رہے تھے کہ چیف آفس سے فون پر فون آ رہے ہیں۔ آپ کو فوراً بلایا ہے۔ میں نے ابھی تمام اخبارات نہیں دیکھے تھے پھر بھی ''دوڑے چل'' انداز میں اے ڈی سی کے پاس پہنچا تو انہوں نے سانس بحال کرنے کے لیے پانی پینے کی مہلت نہیں دی۔ آرمی چیف آفس کا دروازہ کھلا اور میں جنرل آصف نواز کے سامنے تھا۔ انہوں نے مخصوص انداز میں پوچھا: ''تم رات کہاں تھے؟''۔ میرے لیے یہ مانوس جملہ تھا۔ اس سے مراد یہ تھا کہ اخبار میں کچھ ناپسندیدہ متن خبر، اداریہ یا کالم کی صورت میں شائع ہو گیا تھا۔ اور اب اس کی جواب طلبی ہوئی ہے۔ ہر پی آر او کا رٹا رٹایا جواب ہوتا ہے: ''سر! میں رات کو پریس کلب میں یا فلاں اخبار کے دفتر میں تھا''۔ جنرل آصف نواز کے ساتھ نوکری میں رٹا رٹایا جواب نہیں چلتا تھا۔ سچ کہنے میں کافی عافیت تھی اور یہ میرا تجربہ بھی تھا۔ لہٰذا میں نے بتایا کہ! رات گھر پر ہی تھا۔ اب جنرل صاحب کی مزید آواز اونچی ہو گئی۔ ''تم گھر میں رہو اور اخباروں میں فضول باتیں شائع ہوتی رہیں''۔ (بزبان انگریزی)۔ جنرل آصف نواز سرکاری غصے کا اظہار بیک وقت انگریزی، اردو اور پنجابی زبان میں کیا کرتے تھے۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر میں دو قدم آگے بڑھا اور کنکھیوں سے میز پر رکھے اخبار کو دیکھا۔ لے آؤٹ سے ''نوائے وقت'' کا ادارتی صفحہ دکھائی دیا۔ میں نے ایک اور رسک لیا اور چیف کے سامنے رکھا ہوا اخبار اٹھا لیا۔ جنرل آصف نواز کو اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ وہ ابھی خاموش ہی تھے کہ میں نے ''تم رات کدھر تھے'' کے انداز میں دریافت کیا ''سر! یہ اخبار کس نے رکھا ہے؟'' کیا مطلب ہے تمہارا؟ انہوں نے جوابی سوال کیا۔ میں نے کہا: ''سر! مطلب یہ ہے کہ صبح آٹھ بجے چیف آف آرمی سٹاف کے سامنے نوائے وقت کا ایڈیٹوریل صفحہ کس نے رکھا ہے؟ سر! آپ آرمی چیف ہیں، ساری فوج آپ کے احکامات کی منتظر ہے، اخبارات کا مطالعہ ہمارا کام ہے۔ آپ صرف ایک انگریزی اور ایک اردو اخبار صبح دیکھا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کریں۔اس کے بعد آئی ایس پی آر کا پریس بریف۔اس کے علاوہ کچھ نہیں۔اردو اخبار کی ہیڈ لائینز اور انگریزی اخبار کا سپورٹس پیج"۔

اللہ کا شکر ہے کہ میرا "ناگہانی" عمل کارگر ثابت ہوا۔جنرل آصف نواز کہنے لگے، "ان کو سمجھا دو جو صبح صبح پیلے نیلے نشان لگا کر اخبار میز پر رکھ دیتے ہیں"۔میں سمجھ گیا۔آفس سے باہر نکل کر سیدھا بریگیڈیئر سکندر شامی کے پاس گیا جو سینئر سٹاف افسر تھے۔ان سے درخواست کی کہ آرمی چیف کو صبح صبح صرف ہیڈ لائنز اور سپورٹس پیج تک ہی رہنے دیں۔یہ اخبارات کے ادارتی صفحے پڑھنا آئی ایس پی آر کے افسروں کا کام ہے۔انہوں نے خاموشی سے میری گزارش سنی۔اور شاید سنی ان سنی کر دی۔ بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل) سکندر شامی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ چوبیں گھنٹوں میں تمیں گھنٹے کام کرتے ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ انتہائی جفاکش، محنتی، فرض شناس اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ایک مثالی افسر تھے۔جنرل آصف نواز بے پناہ خصوصیات کی وجہ سے ان پر اعتماد کرتے تھے۔ بریگیڈیئر سکندر شامی 65ء کی جنگ میں کھیم کرن کے محاذ پر شہید ہونے والے بہادر بریگیڈیئر شامی کے صاحبزادے ہیں۔1971ء کی جنگ میں ایک بہادر باپ کا یہ بہادر بیٹا شدید زخمی ہوا اور ان کا ایک پاؤں اڑ گیا۔کافی عرصہ تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہے۔اللہ کریم نے صحت یاب فرمایا اور روزمرہ ڈیوٹی انجام دینا شروع کر دی۔مصنوعی پاؤں لگایا گیا۔سخت محنت اور مثالی لگن کے ساتھ فرائض انجام دیتے تھے۔پی ایم اے میں میجر کی حیثیت سے پلاٹون کمانڈر رہے۔ترقی پا کر لیفٹیننٹ کرنل کے رینک پر پہنچے۔ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنی یونٹ کے ساتھ لانگ مارچ میں سب سے آگے چلتے ہیں۔مختصر یہ کہ اس قدر خصوصیات کے حامل افسر کو یہ کہنا کہ "مجھے میرا کام خود کرنے دیں" آسان بات نہیں تھی۔

بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل) ریاض اللہ خان کی وفات کے بعد جنرل آصف نواز نے میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ کو آئی ایس پی آر کا سربراہ مقرر کیا۔یہ کراچی کور میں بریگیڈیئر کے رینک میں کمانڈر کور انجینئرز تھے۔پاکستان آرمی کے قابل فخر کور آف انجینئرز کے مایہ ناز افسر اور انتہائی خوش اخلاق شخصیت تھے۔میں نے انہیں لیفٹیننٹ کرنل کے رینک میں شاہراہ قراقرم پر فرائض انجام دیتے دیکھا تھا۔میں چین اور پاکستان کو ملانے والی عظیم شاہراہ پر ایک دستاویزی فلم کی تکمیل کے لیے آئی ایس پی آر کی ٹیم کے ساتھ محو سفر تھا کہ لیفٹیننٹ کرنل جہانگیر نصر اللہ کی یونٹ میں کچھ دن کے لیے سرکاری پڑاؤ کیا۔وہ چند روز ہم سب کے دل میں گھر کر گئے دراصل ہم ایک اور یونٹ کے کمانڈنگ افسر کے "حسن سلوک" سے سردی میں لرزہ براندام تھے۔شدید بارش میں پہنچے تو معلوم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوا کہ ٹینٹ میں رہائش اور چائے پانی کی فراہمی کمانڈنگ افسر کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں۔ ہم آئی ایس پی آر کے کیپٹن تھے، جنرل محمد ضیاء الحق نے ویسے ہی ''صولت صاحب'' کا اعزازی رینک عطا کیا ہوا تھا۔ کپکپی کے ساتھ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوگئیں تو پتہ چلا کہ موصوف (کمانڈنگ افسر) عبادت میں مصروف ہیں۔ فی الحال کسی کو خلل کی اجازت نہیں۔ دراصل شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے دوران مشہور زمانہ کتاب ''موت کا منظر (مرنے کے بعد کیا ہوگا) عرف ''حسن پرستوں کا انجام'' متعدد افسروں اور جوانوں کے پاس موجود رہتی تھی۔ بلند و بالا پہاڑ، ایک پتلی پگڈنڈی پر خیمہ زن، نیچے رسی کی مانند بل کھاتا ہوا دریا۔ سورج ڈھلتے ہی ہر طرف سناٹا اور ہو کا عالم۔ کسی کو پہاڑ کی چوٹی پر جنات دکھائی دیتے تو کوئی دریا کنارے پریوں کے وجود کی قسمیں اٹھاتا دکھائی دیتا تھا۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے بعد متعدد بار خنجراب تک سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ جنات اور پریوں کے وجود کا احساس دراصل آکسیجن کی کمی کے باعث رونما ہوتا ہے۔ عبادت گزار اور پرہیز گار کمانڈنگ افسر کی یونٹ کو خیرباد کہا۔ کچھ فاصلہ طے کر کے شاہراہ قراقرم پر خیمہ زن ایک اور یونٹ میں پہنچے جہاں لیفٹیننٹ کرنل جہانگیر نصراللہ پذیرائی کے لیے موجود تھے۔ کراچی میں بھی ان سے بالواسطہ رابطہ رہا۔ آئی ایس پی آر کے سربراہ مقرر ہوئے تو جنرل آصف نواز نے مجھے انتباہ کیا: ''یہ میری سلیکشن ہے۔ تم آئی ایس پی آر والے اپنے آدمی کے سوا کسی کو ''تسلیم'' نہیں کرتے۔ جہانگیر نصراللہ کو کامیاب کرانا تمہاری ذمہ داری ہے''۔ انہیں ڈی جی آئی ایس پی آر تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ کراچی آپریشن کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ انہیں سندھ میں دفاعی اور غیر دفاعی مقاصد کے لیے تعمیر کی گئی سڑکیں، خفیہ راستے، دشمن کے لیے مستقل اور عارضی رکاوٹیں سمیت مزید آپریشنل اقدامات کی تفصیلات کا علم تھا لیکن سندھ کے میڈیا کا آپریشن میں کردار کا تعین ایک دشوار چیلنج تھا۔ بنیادی شرط میڈیا مالکان اور صحافیوں کے نظریات اور خیالات سے آگاہی تھی۔ بہرحال میجر (بعد میں لیفٹیننٹ کرنل) عبدالخالق چشتی پی آر او کراچی کور کو یہ اہم فرض سونپا گیا۔

جب آپریشن لانچ ہوگیا تو مجھے بھی کراچی کور سے منسلک کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جی ایچ کیو سے سائیکلو جیکل وارفیئر ڈائریکٹوریٹ کے سربراہ بریگیڈیئر آصف ہارون بھی کراچی تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ ان کے سٹاف افسر لیفٹیننٹ کرنل ارشد علوی بھی تھے جو ایم اے صحافت پنجاب یونیورسٹی میں میرے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ کراچی آپریشن ایک طویل داستان ہے جس کا ذکر گاہے بہ گاہے ہوتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے سول انتظامیہ نے جب آرمی کی مدد طلب کی تو مکمل چھان بین کے بعد منصوبہ بندی کی گئی۔ بھارت کی کراچی کو نشانہ بنانے کی کوشش کے بارے میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تمام معلومات موجود تھیں۔ مشرقی پاکستان میں شورش کے انداز پر وسیع پیانے کی گڑبڑ کا پروگرام تھا۔ الطاف حسین کی جماعت سے منسلک بعض افراد نے رضا کارانہ طور سے معلومات فراہم کیں۔ ایم کیو ایم کی بھاری اکثریت کا ان افراد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بہر حال ایم کیو ایم وقت گزرنے کے ساتھ لسانی بنیاد پر شہری سندھ کی مضبوط، توانا اور نا قابل چیلنج سیاسی حقیقت کا روپ دھار چکی تھی۔ ہر ملٹری آپریشن کی مخصوص جہتیں ہوتی ہیں۔ خاص طور پر شہری علاقوں میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔ آپریشن لانچ ہو گیا تو سب سے پہلے وزیر اعظم میاں نواز شریف کے دو قریبی ساتھیوں چودھری نثار علی خان اور غلام حیدر وائیں نے اعتراضات اٹھانے شروع کر دیئے۔ یہ صورتحال فوج اور بالخصوص آرمی چیف کے لیے خاصی ناخوشگوار تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ آپریشن کے حوالے سے ہر قدم جمہوری حکومت کی مکمل آشیر باد ہی سے اٹھایا جا رہا تھا۔ صدر اور وزیر اعظم نے ہر بریفنگ میں شرکت کی تھی۔ اخبارات میں ایم کیو ایم کے حامی موجود تھے۔ انہوں نے چودھری نثار علی خان اور غلام حیدر وائیں کے بیانات کو خوب اچھالا اور حاشیہ آرائی کی۔ دونوں بیانات میں آرمی کی آپریشن میں شرکت کے حوالے سے آئین کی شق 147 اور 245 میں درج تفصیلات کی تکمیل کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ آپریشن بھی چلتا رہا اور بیانات در بیانات کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔

بیس جولائی 1992ء کو جنرل ہیڈ کوارٹرز میں ایک اہم کانفرنس ہوئی جس میں صدر غلام اسحاق خان، وزیر اعظم نواز شریف، وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین، وزیر اعلیٰ سندھ مظفر حسین شاہ، چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی جنرل شمیم عالم خان، چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز، چیف آف نیول سٹاف ایڈمرل سعید محمد خان، چیف آف ایئر سٹاف ایئر چیف مارشل فاروق فیروز خان، کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل محمد نصیر اختر اور دیگر متعلقہ سینئر سول اور آرمڈ فورسز افسروں نے شرکت کی۔ اس میٹنگ میں آپریشن کے بارے میں کھل کر گفتگو ہوئی۔ جنرل آصف نواز نے واضح طور پر کہا کہ فوج کا کوئی سیاسی کردار نہیں، ہم جمہوری حکومت کے مکمل تابع ہیں۔ تین گھنٹے طویل میٹنگ کے بعد پریس ریلیز تیار کیا گیا جس میں سب نے اپنا حصہ ڈالا۔ آرمی چیف بار بار کہتے تھے کہ ہمیں سیاست سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہمیں ان کاموں میں مت الجھاؤ۔ خود حل کرواپنے مسائل۔ غیر رسمی بات ہو رہی تھی۔ پریس ریلیز تیار ہو گیا۔ آرمی چیف نے منظوری دے دی تو کہنے لگے کہ وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین سے منظوری ضروری ہے۔ میں پریس ریلیز لے کر چودھری صاحب کے ہاں پہنچا تو انہوں نے کہا کہ کرنل صاحب آپ پڑھ کر سنا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دیجیے۔ان کے سٹاف افسر ساجد چٹھہ بھی موجود تھے۔ساعت کے بعد کہنے لگے کہ ''میرا خیال ہے کہ وزیراعظم صاحب کو بھی دکھا دیتے ہیں''۔یوں چودھری صاحب کے ہمراہ وزیراعظم صاحب کی منظوری کے لیے روانہ ہوئے۔معلوم ہوا کہ میاں نواز شریف کسی تقریب میں ہیں۔ بہر حال چودھری صاحب نے پریس ریلیز ان کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) عبدالقیوم کو دیا جنہوں نے سٹیج پر فائل وزیراعظم کو دکھائی۔انہوں نے سرسری نگاہ ڈالی اور ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ حتمی منظوری کے لیے صدر صاحب سے رابطہ کریں۔ادھر میڈیا سے ٹیلی فون کالز کا تانتا بندھا ہوا تھا۔آئی ایس پی آر آفس سے کرنل (بعد میں بریگیڈیئر) ایس ایم اے اقبال پوچھ رہے تھے کہ آپ کہاں ہیں؟ جلدی واپس آیئے۔منظوری کیوں نہیں ملی؟ وغیرہ وغیرہ۔میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ ایک معمول کا پریس ریلیز آرمی چیف، وفاقی وزیر داخلہ اور وزیراعظم سے ہوتا ہوا اب صدر مملکت کی خدمت میں پیش ہونے جارہا ہے۔ملٹری سیکرٹری نے جب صدر مملکت سے منظوری کی شرط عائد کی جو دراصل وزیراعظم نواز شریف کے احکامات تھےتو وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین نے کہا کہ ''کرنل صاحب! بابے کول تسی آپے جاؤ!'' (بابے کے پاس آپ خود جائیں)۔

میں ایوان صدر پہنچا تو اے ڈی سی ٹو صدر مملکت نے بتایا کہ جناب غلام اسحاق خان عصر کی نماز ادا کر کے تشریف لائیں گے۔آپ انتظار کریں۔میں نے میڈیا، پریس گلوبل ولیج وغیرہ کی اصطلاحات سے اپنی بات کی اہمیت واضح کی لیکن موصوف ٹس سے مس نہ ہوئے کہنے لگے ''سر! آپ میری پوزیشن سمجھیں، میں فیملی ایریا میں داخل نہیں ہوسکتا''۔خیر نماز عصر ادا کر کے صدر مملکت تشریف لائے۔اے ڈی سے پریس ریلیز لے کر چلا گیا۔چائے کا ایک اور دور شروع ہوگیا۔آدھ گھنٹہ، ایک گھنٹہ مزید بیت گیا۔پتہ چلا کہ صدر مملکت ابھی تک پریس ریلیز ہی کو ''دیکھ'' رہے ہیں۔مغرب کی اذان ہوئی تو اے ڈی سی وزیٹر روم میں آئے اور ترمیم شدہ پریس ریلیز میرے حوالے کردیا۔جناب صدر نے باریک پنسل سے صفحہ دو پر متعدد جملے تبدیل کیے تھے۔ایک باریک بین ایڈیٹر کی مانند کہیں تیر کا نشان تھا اور ایک دو جگہ پر ''ڈبے'' بنے ہوئے تھے جن میں کچھ تحریر تھا۔کاغذ کا حاشیہ بھی خالی نہیں تھا۔میں نے اے ڈی سی سے کہا کہ کسی ایسے ٹائپسٹ کو بلائیں جو صدر کی تحریر پڑھ سکتا ہو۔انہوں نے فرمایا کہ سر! مغرب ہوگئی ہے اور سب لوگ چلے گئے ہیں۔ میں نے آئی ایس پی آر اطلاع دی کہ صفحہ اول پر صرف دو ترامیم ہیں، یوں لگتا ہے کہ ایک پر خط تنسیخ ہے البتہ صفحہ دو ''اٹھاون بی'' بنا ہوا ہے۔میرا خیال تھا کہ کرنل ایس ایم اے اقبال مزاح سے مستفید ہوں گے لیکن انہوں نے اپنی طبیعت کے برعکس بےنقط سنانا شروع کردیں کہ آپ مذاق پر تلے ہوئے ہیں۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بہر حال اسلام آباد سے راولپنڈی جانے والی سڑک پر ''حد رفتار'' کو توڑتا ہوا آئی ایس پی آر پہنچا تو موقع پر موجود افسروں نے صدر مملکت کی باریک کچی پنسل سے لکھی ہوئی تحریر کو ''ڈی کوڈ'' کیا۔ پی ٹی وی کے خبر نامے کا وقت قریب تھا۔ چند لائن ٹائپ ہوتے ہی فیکس مشین کے حوالے ہو جاتی تھیں۔ عجب گھمسان کا رن تھا۔ ایک سیدھا سادہ پریس ریلیز جو زیادہ سے زیادہ آئی ایس پی آر اور وزارتِ داخلہ کے پی آر او کے باہمی اشتراک سے جاری ہونا تھا۔ 1973ء کے آئین کے تناظر میں آرمی چیف اور وزیراعظم سے ہوتا ہوا صدر مملکت تک پہنچا جنہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور تجربہ بروئے کار لاتے ہوئے اسے نشر و اشاعت کے قابل بنایا۔ قصہ مختصر کراچی آپریشن بھی مذکورہ پریس ریلیز کی مانند ہی رواں دواں رہا۔ فوجی دستے کراچی کور کی نگرانی میں اپنی آئینی ذمہ داریاں مکمل کر رہے تھے۔ متعدد افسر اور جوان شورش پسندوں کا نشانہ بنے۔ مجھے آج بھی دو آرمی کیپٹن کی نعشیں یاد ہیں جنہیں بھارت کے تربیت یافتہ دہشت گردوں نے اغواء کر کے ٹارچر کیا اور پھر انہیں شہید کر دیا۔ آئی ایس پی آر نے بھرپور انداز میں بحالی امن کے لیے فوج کی شب و روز خدمات کو اجاگر کیا۔ یہ ایک بہت مشکل فریضہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اندرون ملک سلامتی کے آپریشن کے دوران بعض بے گناہ معصوم افراد بھی نادانستہ طور پر زد میں آتے ہیں۔ ان کی دلجوئی اور دیکھ بھال کے لیے خصوصی ہدایات تھیں۔ ایم کیو ایم بھی انتشار کا شکار ہوگئی۔ آفاق احمد نے ایم کیو ایم حقیقی کی داغ بیل ڈالی۔ پارٹی چیئرمین عظیم احمد طارق پراسرار انداز میں قتل کر دیئے گئے۔ روشنیوں کا شہر خوف، دہشت اور بے یقینی کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ آرمی آپریشن کے ساتھ سیاسی عمل بھی ضروری تھا لیکن اس حوالے سے میاں نواز شریف کی حکومت گومگو کا شکار تھی۔ محض چند ارب کے ترقیاتی منصوبوں کے اعلانات کافی نہیں تھے۔ کراچی والے اپنا کراچی واپس مانگ رہے تھے۔ سب کو اس مطالبے سے اتفاق تھا لیکن حصول کے لیے ''سیاسی عزم'' کا فقدان تھا۔ پیپلز پارٹی کا اصل حوالے سے ظاہر اور باطن ایک نہیں تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اندرون سندھ کا ووٹ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ان کے ساتھ ہے۔ سیاستدانوں کی باہمی ریشہ دوانی اور سطحی سوچ کے باعث آپریشن کے حوالے سے فوج دباؤ کا شکار رہی۔ جنرل آصف نواز کی تشویش میں بھی اضافہ ہو رہا تھا جس کا اظہار انہوں نے متعدد میٹنگز میں کیا۔ صدر مملکت، وزیراعظم اور آرمی چیف کے متعدد مشترکہ اجلاس ہوئے۔ اس کے باوجود فضا سیاسی لحاظ سے گرد آلود رہی۔

کراچی کی مخصوص جغرافیائی اور معاشی اہمیت کے باعث بھارت کی مداخلت کے ثبوت بھی موجود تھے، یہ صورتحال سیکورٹی ایجنسیز کے لئے ہمیشہ چیلنج رہی ہے۔ خاص طور سے جب دشمن کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ایجنٹ ریاست کے ستونوں میں سرگرم دکھائی دیں تو معاملات کو سنبھالنا آسان نہیں ہوتا۔ بھارت نے سندھ کو ہمیشہ ٹارگٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔1965ء اور 71ء کی جنگوں میں بھرپور حملے کیے گئے جنھیں پاک افواج نے کامیابی سے پسپا کیا۔ پاک بحریہ کا انتہائی اہم بیس ہونے کی وجہ سے بھارت کراچی کو امن دشمن کارروائیوں کے لیے ''مناسب'' سمجھتا ہے۔ بدقسمتی سے کراچی سیاسی، معاشی اور سماجی لحاظ سے بھی تقسیم در تقسیم کا شکار رہا ہے۔فرقہ واریت ایک اور عفریت ہے جس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔معاشی لحاظ سے طاقتور اقلیتی برادری جن میں پارسی اور ہندو سرفہرست ہیں دنگا فساد اور بے یقینی کی فضا سے بہت جلد پریشان ہو جاتے ہیں۔اس لیے ان میں ترک وطن کرنے والے زیادہ تعداد میں ہیں۔کراچی آپریشن کے دوران مہاجر کارڈ کی دعوے دار صرف الطاف حسین کی ایم کیو ایم ہی نہیں تھی بلکہ آفاق احمد، ڈاکٹر سلیم حیدر اور دیگر جماعتوں میں شامل اردو بولنے والے سیاسی رہنما بھی اپنا حصہ ڈالتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ آپریشن کے دوران متعدد ایسے افراد بھی گرفتار ہوئے جو بھارت سے تخریبی کارروائیوں کی تربیت حاصل کر کے آئے تھے۔ایم کیو ایم الطاف حسین کا دفتر نائن زیرو سیاست کم اور امن دشمن کارروائیوں کے لئے زیادہ استعمال ہوتا رہا۔اس کے باوجود کور ہیڈ کوارٹرز میں یہ رائے موجود تھی کہ ایم کیو ایم کی سیاسی بنیاد کو ختم کرنا دشوار ہے،مناسب ہوگا کہ اسے صحیح راستے پر گامزن کیا جائے تا کہ ماضی کی طرح مہاجر برادری پاکستان کی ترقی اور فلاح میں اہم کردار ادا کر سکے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے پاس فوج کو تھپکی دینے کے سوا کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔اندرون سندھ سے تعلق رکھنے والے سیاسی رہنما ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔اوّل یہ کہ فوج کراچی میں اردو بولنے والی مہاجر کمیونٹی کی نظر میں متنازع بن جائے اور دوم ایم کیو ایم کو سیاسی لحاظ سے زندہ درگور کر دیا جائے۔ جماعت اسلامی ایم کیو ایم سے سیاسی زک اٹھانے کے باعث گوشہ تنہائی میں تھی۔محض اکا دکا بیانات سے سیاست چل رہی تھی۔زمینی حقائق کے مطابق کراچی میں برسوں سے مقیم پختون، پنجابی اور دیگر برادریاں ایم کیو ایم کی لسانی سیاست سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے آپریشن کی حمایت کر رہی تھیں۔

اس پس منظر کے ساتھ آپریشن نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔معاشی، تعلیمی اور سماجی گہما گہمی واپس آ گئی اور لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔فوج کی تجویز پر سول آرمڈ فورسز کی تشکیل کا فیصلہ ہوا اور ''مہران فورس'' کے نام سے نیم فوجی دستے تیار کئے گئے جو سندھ پولیس کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار تھے۔مہران فورس کی بعد میں پاکستان رینجرز سندھ کے نام سے تشکیل نو کی گئی۔ یہ فورس آج بھی سندھ صوبے میں امن و امان کی بحالی کے لیے امداد میں مصروف ہے۔ بدقسمتی سے سندھ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پولیس افرادی قوت اور مناسب ساز وسامان کے باوجود اپنی بنیادی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہی ہے۔ خاص طور سے بڑے شہروں میں رونما ہونے والے جرائم پر کنٹرول کرنا دشوار تھا۔ اس تساہل کے متعدد اسباب تھے۔ خاص طور سے افرادی قوت کی غیر منصفانہ بھرتی اور سیاسی مداخلت اہم ترین نکات تھے۔ جن کا ہر اہم میٹنگ میں ذکر ہوتا تھا لیکن میٹنگ میں شامل اکثر سیاسی رہنما زیر لب مسکرا کر موضوع بدل دیتے تھے۔ عسکری قیادت ایک حد تک اصرار کر سکتی تھی، ملیر چھاؤنی میں ایلیٹ فورس کے قیام کے لیے سنٹر بنایا گیا۔ اتفاق سے میرے ایک کورس میٹ میجر احتشام کی خدمات حاصل کی گئیں جو پاکستان آرمی کے سپیشل سروسز گروپ (ایس ایس جی) کے مایہ ناز کمانڈو افسر تھے۔ انہیں سندھ پولیس کے چنیدہ اسسٹنٹ سب انسپکٹرز کو خصوصی ٹریننگ دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ میجر احتشام سے کراچی میں ملاقات ہوئی تو موصوف پولیس کی وردی میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ میں نے رائے دی کہ پولیس کے ساتھ مختصر وقت گزارنا ورنہ آپ کسی کے نہیں رہو گے۔ پولیس قبول نہیں کرے گی کہ ایک فوجی افسر ہم پر ''مسلط'' ہو گیا ہے اور جب واپس فوج میں جاؤ گے تو وہاں ''دل'' نہیں لگے گا۔ پولیس سروس میں بسر کیے شب و روز یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرو گے۔ میجر احتشام نے حسب معمول ایک زوردار قہقہہ لگایا اور میری بات سنی ان سنی کر دی۔ چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ ایک روز ٹیلی فون پر میجر احتشام پریشانی کے عالم میں کہہ رہے تھے: ''یار صولت رضا! ملیر سے پولیس والے جلوس کی صورت میں کراچی سی پی او آفس کی طرف آ رہے ہیں۔ انہیں سخت ٹریننگ پر اعتراض ہے، کہتے ہیں ہم سے فوجی تربیت نہیں ہوتی ہے''۔ میجر احتشام مسلسل بات کر رہے تھے۔ اب زوردار قہقہہ بلند کرنے کی باری میری تھی۔ میں نے کہا کہ ''برادر عزیز میں نے پہلے دن ہی گزارش کی تھی کہ سندھ پولیس کے موجودہ اے ایس آئی ایک مخصوص خاندانی پس منظر اور سیاسی تال میل کے باعث بھرتی ہوئے ہیں۔ انہیں آپ نماز فجر کے بعد دو میل بھگاتے ہیں، پریڈ کراتے ہیں اور پھر کلاسز کا اہتمام ہوتا ہے۔ یہ بے چارے اگر اتنے ہی تندرست و توانا تھے تو فوج میں بھرتی ہو جاتے''۔

میجر احتشام کا اصرار تھا کہ اخبار میں نہیں آنا چاہیے۔ بہر حال اگلے دن اچھا بھلا شائع ہو گیا اور ایک نئی بحث چھڑ گئی کہ آیا موجودہ افرادی قوت میں سے انتخاب کیا جائے یا ایلیٹ فورس کے لیے خصوصی بھرتی ہونی چاہیے۔ سندھ پولیس کے اعلیٰ افسران بھی ''تربیت'' کا معیار ایک حد تک ہی رکھنے کے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کچے کے علاقے میں برسوں سے مقیم ڈاکو ہوں یا کراچی کے مختلف اضلاع میں سرگرم جرائم پیشہ ''معززین'' ان سب سے نبرد آزما ہونے کے لیے روایتی طریقہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کار موجود ہے۔ میجر احتشام کی نافذ کردہ عسکری تربیت سے سندھ پولیس کا مورال انتہائی متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔ احتجاج کرنے والے پولیس اہلکار ''شدت تربیت'' سے نڈھال تھے۔ بہر حال نامساعد حالات کے باوجود میجر احتشام نے پیشہ وارانہ لحاظ سے بہترین تربیت دی۔ پاسنگ آؤٹ کے موقع پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں شہباز شریف بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ انہوں نے سندھ پولیس کے چاق و چوبند دستے دیکھے تو ٹریننگ انچارج سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے میجر احتشام کو پنجاب پولیس میں ایلیٹ فورس قائم کرنے اور تربیت دینے کی دعوت دی۔ نسبت روڈ لاہور سے آبائی تعلق رکھنے والے میجر احتشام کو اور کیا چاہیے تھا۔ انہوں نے سندھ حکومت سے اجازت طلب کی جو بادل نخواستہ عطا کر دی گئی۔ میں ابھی کراچی آئی ایس پی آر میں ہی تھا۔ لاہور روانگی سے پہلے ملاقات ہوئی تو میں نے دوستانہ انداز میں مشورہ دیا کہ پنجاب پولیس سے بچ سکتے ہو تو بچ جاؤ۔ سندھ کی ''سائیں پولیس'' کے ساتھ ''تعلقات عامہ'' استوار ہو گئی تھی۔ پنجاب پولیس سے انگریز بھی پناہ مانگتا تھا۔ وردی میں ''سائیں'' نے صرف جلوس نکالنے پر اکتفا کیا ہے پنجاب پولیس والے سبق سکھانے پر یقین رکھتے ہیں۔ میجر احتشام کے ساتھ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایلیٹ فورس پنجاب کو تربیت دینا شروع کر دی۔ پولیس سروس کے چند افسر بھی ہمراہ تھے۔ یہ ایس ایس جی کا کمانڈو دن رات فیلڈ میں زیر تربیت اہلکاروں کے ساتھ مصروف عمل تھا۔ دفتری معاملات اور مالی امور کی دیکھ بھال غیر روایتی تھی لہذا کچھ عرصے بعد تربیت پس منظر میں چلی گئی اور انکوائریاں شروع ہو گئیں۔

یہ طویل کہانی ہے۔ میجر احتشام کی رودادِ جوانمردی کو سمیٹتے ہوئے یہ کہنا ہی کافی ہوگا کہ ایس ایس جی افسر جو نیک نیتی کے ساتھ پولیس کو اعلیٰ تربیت پیشہ وارانہ تربیت سے سرفراز کرنا چاہتا تھا پولیس نظام کے ہاتھوں جکڑا گیا۔ اس دوران جنرل پرویز مشرف برسر اقتدار آ گئے۔ احتشام ایس ایس جی کے زمانے میں ان کا عزیز ترین جونیئر افسر تھا۔ لہذا وہ ساری فائلز بغل میں دابے راولپنڈی آ گیا۔ جنرل مشرف سے ملاقات کے بعد مجھے ملا تو کہنے لگا کہ آرمی چیف نے رات کے کھانے پر بلایا ہے اور ایس ایس جی کے زمانے کی یادیں تازہ کی ہیں۔ شہیدوں کے کارنامے دہرائے، جب میں نے اپنی کہانی بیان کی تو جنرل مشرف نے کہا کہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم پولیس میں جاؤ۔ اگر گئے تھے تو پھر پولیس والے بن جاتے، اب قانونی لڑائی وکیل کے ذریعے لڑنا ہوگی۔ یوں جنرل مشرف نے براہ راست مداخلت سے معذرت کر لی۔ کچھ عرصہ بعد احتشام تعزیرات پاکستان کی زد میں آ گیا، مدت تک قید و بند کی صعوبت برداشت کی۔ سیاستدان ہوتا تو یہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بات کریڈٹ میں جاتی، ادھر صورتحال یکسر مختلف تھی۔ اس پر جو گزری وہ ہمارے سرکاری، سماجی اور سیاسی کلچر کو بے نقاب کرتی ہے۔

خیر میں نے بات جنرل آصف نواز کے زمانے میں جاری کراچی آپریشن سے شروع کی تھی۔ اس آپریشن کے حوالے سے لاتعداد ذیلی واقعات بھی ہیں۔ کچھ امانت کے طور پر دفن رہیں گے البتہ ایسے حالات جن کا مستقبل میں بھی سامنا ہوسکتا ہے انہیں بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کراچی آپریشن میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز 8 جنوری 1993ء کو حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ انہوں نے 16 اگست 1991ء کو پاکستان آرمی کی کمان سنبھالی تھی۔ وہ بظاہر ہشاش بشاش تھے اور معمول کے مطابق اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ کور کمانڈر کراچی تعینات ہو گئے تو میں آئی ایس پی آر کراچی آفس میں تھا۔ یوں ان سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات کا موقع میسر آتا تھا۔ وہ ایک سچے کھرے اور پیشہ وارانہ معاملات کو ہر قیمت پر ترجیح دینے والے ایک باوقار افسر تھے۔ سپورٹس اور ذاتی فزیکل فٹنس پر خاص توجہ دیتے۔ آرمی چیف کی حیثیت سے بھی جاگنگ اور واک وغیرہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انتقال سے چند روز قبل ایک ''ٹی بریک'' کے دوران ''اِن ڈور'' جاگنگ مشین کی تعریف کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موسم خراب ہونے کی صورت میں بھی رننگ جاری رکھی جا سکتی ہے۔ اس موقع پر کسی افسر نے کہا کہ جاگنگ مشین کو زیادہ استعمال کرنے کے نقصانات بھی ہیں۔ شنید ہے کہ جنرل آصف نواز کو یہ مشین کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی متعدد افواہیں گردش میں تھیں۔ کراچی آپریشن کے حوالے سے بھی خفیہ رپورٹس مل رہی تھیں کہ امن دشمن بھارت کی اعانت سے آرمی کی سینئر قیادت کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ کچھ دور کی کوڑی لائے کہ ناراض سیاست کار کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ واقعہ کچھ یوں ہوا کہ چھٹی کے دن جنرل آصف نواز حسب معمولی آرمی ہاؤس کے کشادہ لان میں جاگنگ اور واک کر رہے تھے کہ اچانک دل میں درد اٹھا اور زمین پر ہی لیٹ گئے۔ کسی کی نظر پڑی تو یہ سمجھا کہ آرام یا ایکسرسائز کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد بیگم آصف نواز نے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ لان میں نیم بے ہوش پڑے ہیں۔ فوری طور پر سٹاف کار میں ہی آرمڈ فورسز انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی پہنچایا گیا۔ ایمبولینس گھر پر موجود نہیں تھی۔ ڈیوٹی ڈاکٹرز نے ابتدائی طبی امداد دی۔ سینئر ڈاکٹر بھی پہنچ گئے۔ تمام تر طبی کوششوں کے باوجود جنرل آصف نواز جانبر نہ ہو سکے۔ اگلے روز انہیں آبائی گاؤں چکری راجگان کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ کور کمانڈر لاہور لیفٹیننٹ جنرل اشرف چودھری سب سے سینئر لیفٹیننٹ جنرل تھے لہذا انہوں نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کمان سنبھال لی۔ چند روز بعد صدر غلام اسحاق نے کور کمانڈر کوئٹہ لیفٹیننٹ عبدالوحید کاکڑ کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کردیا۔

نئے آرمی چیف کے ساتھ بھی میری پریس رابطہ افسر کی حیثیت سے ڈیوٹی جاری تھی کہ ایک روز عجیب واقعہ ہوگیا اور مجھے دوبارہ اسی انداز میں کراچی جانا پڑا جیسا کہ لاہور سے بریگیڈیئر صدیق سالک شہید نے مجھے لاہور سے کراچی روانہ کیا تھا۔ چھٹی کا دن تھا اور ابھی تمام اخبارات میز پر ہی موجود تھے کہ ملازم نے اطلاع دی کہ باہر ایک صاحب کار میں موجود ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ صولت صاحب کو فوراً بھیجو۔ میں پریشان ہوگیا۔ ملازم سے حلیہ، گاڑی کا رنگ وغیرہ پوچھتے ہوئے گیٹ سے تانک جھانک کی تو ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ اپنی ذاتی کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے دکھائی دیتے۔ میں معمول کی شلوار قمیض اور سلیپر پہنے ہوئے تھا۔ جونہی گیٹ کھولا انہوں نے گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ تیزی سے گاڑی ریورس کی اور باہر مین روڈ پر آ گئے۔ بات سلام دعا سے شروع ہوئی تھی۔ میں بھی پریشان تھا، انہوں نے نصرت فتح علی خان کی آواز میں قوالی ''علی مولا۔ علی مولا'' اونچی آواز میں آن کردی۔ یہ صورتحال مزید پریشان کن تھی۔ میں نے بھی اونچی آواز میں پوچھا سر! خیریت تو ہے، آپ ٹھیک ہیں؟ انہوں نے سٹیئرنگ مضبوطی سے تھامے ہوئے بولنا شروع کردیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے 102 درجے کا بخار ہے اور آرمی چیف نے مجھے آدھا گھنٹہ کھڑا کیے رکھا ہے۔ بے نقط سنائی ہیں۔ ایسے الفاظ میں نے پوری سروس میں نہیں سنے۔ کاش! میں تمہارے آئی ایس پی آر میں نہ آیا ہوتا۔ کراچی میں گڑبڑ ہوگئی ہے۔

کراچی میں آئی ایس پی آر کے لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی نے کسی کارچور کی پریس کانفرنس کروادی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں صدر غلام اسحاق خان کے داماد عرفان اللہ مروت کا آدمی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ آج اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ صدر مملکت نے آرمی چیف سے پوچھا کہ ''تمہارا آئی ایس پی آر مجھے ''ڈاؤن'' کرنے پر لگا ہوا ہے، آخر کیوں؟'' آرمی چیف عبدالوحید کاکڑ نے مجھے صبح صبح بلالیا۔ اب ہم دونوں دفتر جارہے ہیں۔ تم نے فوراً کراچی جانا ہے اور چشتی سے چارج لینا ہے۔ چیف بہت ناراض ہیں۔ انہوں نے مجھے واضح احکامات دیے ہیں۔ میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ خود گاڑی چلاتے ہوئے دفتر داخل ہوئے تو چھٹی کے روز موجود دو تین افراد پر مشتمل عملہ پریشان ہوگیا۔ جنرل صاحب واقعی پریشان تھے۔ ساری سروس کور آف انجینئرز سے منسلک رہے۔ اب میڈیا سرکس کا سامنا تھا۔ بہرحال میس سے کافی منگوائی۔ میں نے بھی ساری خبر اونچی آواز میں پڑھی کیونکہ جنرل صاحب کے لیے اس وقت مطالعہ ممکن نہیں تھا۔ کراچی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی سے بات کی تو وہ حسب معمول مطمئن اور اپنے کارنامے پر شاداں تھے۔ جب میں نے انہیں صورتحال سے آگاہ کیا تو پریشان ہو گئے۔ ان کا اصرار تھا کہ مبینہ کار چور کی پریس کانفرنس متعلقہ حکام کی اجازت سے کی گئی ہے اور یہ سارا معاملہ کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل نصیر اختر کے بھی علم میں ہے۔ بہت بڑا کار چور ہے۔ یہ سرکاری گاڑیاں بھی چوری کرتا ہے اور صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) بھجواتا ہے۔ چند اردو اخبارات نے خبر سپر لیڈ کے طور پر نمایاں کی تھی۔ اب معاملہ چشتی صاحب کی گردن ماپنے کا تھا۔ میرا اصرار تھا کہ اگر ہمارے کولیگ کو اس بنیاد پر ''فارغ'' کیا گیا تو آئی ایس پی آر کی تاریخ میں ذکر ہوگا کہ ادارے کا سربراہ اپنے ایک بہترین اور باصلاحیت افسر کا پیشہ وارانہ انداز میں دفاع نہیں کر سکتا۔ میں نے تجویز دی کہ فی الحال سب کو غصہ ہے۔ شام تک کوئی اور خبر اس خبر پر بازی لے جائے گی۔ آپ آرمی چیف کے احکامات کے مطابق لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی صاحب کو کراچی آفس سے تبدیل کر کے راولپنڈی یا ملتان تعینات کر دیں۔ اس دوران میجر جنرل جہانگیر نصراللہ بھی مزید ٹیلی فون کالز کی ''زد'' میں تھے۔ بہر حال مجھے ایک بار پھر کراچی کا ''سامنا'' تھا۔ اُدھر ہمارے دوست چشتی صاحب کی کیفیت بھی ڈی جی آئی ایس پی آر سے کم نہیں تھی۔ وہ اپنے کارنامے پر متعدد اخبارات سے ادارتی نوٹ اور کالم وغیرہ شائع کروانے کی درخواست کر چکے تھے۔ رہی سہی کسر پی ٹی وی کے خبرنامے پوری کر رہے تھے۔ البتہ کار چور کے مبینہ بااثر افراد سے رابطے کا ذکر نہیں تھا۔ رات گئے کراچی پہنچا تو آفس میں خاصی چہل پہل تھی۔ آفس ٹیبل کی ایش ٹرے چشتی صاحب کے پھونکے ہوئے سگریٹوں سے بھری ہوئی تھی۔

لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی سراپا صحافی تھے۔ انہیں اردو انگلش زبان میں خبر سازی پر خاصا عبور تھا۔ آئی ایس پی آر میں شمولیت سے پہلے متعدد اردو اور انگریزی اخبارات سے منسلک رہے۔ موصوف بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کی دریافت تھے۔ چشتی صاحب نے چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ کے پی آر او کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی تھیں۔ ان کی تیار کردہ خبر راولپنڈی/اسلام آباد کے صحافتی معیار پر پورا اترتی تھی لہذا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ پاکستان ٹائمز، مسلم، جنگ، نوائے وقت، سمیت دیگر اخبارات میں ان کے عزیز و اقارب، دوست احباب اور شاگردان عزیز کثیر تعداد میں تھے لہذا ایک ٹیلی فون ہی کافی تھا اور آئی ایس پی آر کی خبر کو صفحہ اول پر چار چاند لگ جایا کرتے تھے۔ خاص طور پر جنرل مرزا اسلم بیگ کے قومی اور عالمی امور پر فصیح و بلیغ ارشادات عالیہ زبردست کوریج حاصل کرتے تھے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

خیالات آرمی چیف کے ہوتے تھے لیکن اخباری زبان میں منتقل کرنا چشتی صاحب کا ہی کارنامہ ہوتا تھا۔ جنرل اسلم بیگ بھی آئی ایس پی آر کے کسی اور افسر سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ جنرل مرزا اسلم بیگ سے پہلے وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل کے ایم عارف بھی معمول کی عسکری تقریبات میں طویل گفتگو فرماتے تھے۔ ان کی تقاریر کو اخبارات میں شائع کرانا بھی کسی چیلنج سے کم نہیں ہوتا تھا۔ نیوز روم میں موجود ہمارے دوست جلی کٹی سناتے تھے۔ خیر! جنرل آصف نواز نے کمان سنبھالتے ہی ابلاغ عامہ کے سارے معاملات آئی ایس پی آر کی صوابدید پر چھوڑ دیئے۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی اپنی خبر یا تصویر کی مناسب یا غیر مناسب کوریج کے حوالے سے کبھی ڈانٹ ڈپٹ کی ہو۔ البتہ ہم حفظ ماتقدم کے طور پر مناسب کوریج کے انتظامات کرتے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی کراچی سے تبدیل کر کے ملتان تعینات کر دیئے گئے تاہم انہیں جلد ہی راولپنڈی بلا لیا گیا۔ اس وقت آرمی چیف عبدالوحید کاکڑ کے پریس رابطہ افسر کی حیثیت سے میجر شاہد کرمانی فرائض انجام دے رہے تھے۔ میجر شاہد کوئٹہ میں آئی ایس پی آر آفس کے انچارج تھے۔ مجھے امید تھی کہ کراچی میں میری تعیناتی عارضی ہوگی لیکن کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل نصیر اختر نے اصرار کر کے باقاعدہ پوسٹنگ کے احکامات جاری کروا دیئے۔ کچھ عرصہ بعد لیفٹیننٹ جنرل نصیر اختر کو جی ایچ کیو میں تعینات کر دیا گیا اور کراچی کور کی کمان لیفٹیننٹ جنرل لہراسپ خان کے سپرد کر دی گئی۔ ان کی شہرت ایک سخت گیر منتظم اور پیشہ وارانہ امور پر کامل توجہ مرکوز رکھنے والے فرض شناس افسر کی تھی۔

انہوں نے تمام غیر ضروری پروٹوکول اور اسراف وغیرہ سے فوری گریز کے احکامات صادر کیے۔ سب سے اہم فیصلہ آرمی چیف جنرل عبدالوحید کاکڑ کی اجازت سے کراچی شہر سے فوج کی اندرونی سلامتی کی ڈیوٹی سے فراغت تھی۔ یہ فیصلہ دوررس نتائج کا حامل تھا۔ جس کی ہر سطح پر تعریف کی گئی۔ متعدد فارمیشنز کراچی کے گنجان آباد علاقوں میں امن وامان کی بحالی کی ڈیوٹی انجام دے رہی تھیں۔ لیفٹیننٹ جنرل لہراسپ خان نے تمام یونٹس کو کراچی سے نکالا اور ایک آپریشنل نوعیت کی مشق کے لیے سندھ کے صحرا میں لے گئے۔ عسکری مشقیں جاری تھیں البتہ آئی ایس پی آر کا عملہ کراچی ہی میں تھا۔ ایک روز آئی ایس پی آر آفس کو بھی تمام مال واسباب کے ساتھ صحرا میں رپورٹ کرنے کے احکامات مل گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کور کمانڈر کے حکم پر جاری عسکری مشق میں شرکت ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ جنرل اسلم بیگ کے زمانے میں ضرب مومن مشق کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ مشق کے اختتام پر کراچی واپس آئے۔ آرمی یونٹس ملیر چھاؤنی میں مقیم ہوگئیں اور میرے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سمیت آئی ایس پی آر کے دیگر اہلکاروں کے چہرے دھوپ اور ریت میں بسر کئے گئے ایام کے باعث سندھی رنگت میں رنگے گئے۔ ادھر آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ کار چور کی پبلسٹی کے واقعہ کے بعد بددِل سے ہو گئے تھے۔ شاید انہوں نے آرمی چیف سے درخواست کی ہوگی۔ ایک روز معلوم ہوا کہ میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ کور آف انجینئرز میں واپس چلے گئے ہیں اور ان کی جگہ کور آف سگنلز بریگیڈیئر خالد بشیر کو میجر جنرل کے رینک پر ترقی دے کر ڈی جی آئی ایس پی آر مقرر کر دیا گیا۔ بریگیڈیئر صدیق سالک کی شہادت کے بعد ہم عادی ہو گئے تھے کہ دو تین برس کے بعد ایک نئے ''ٹو سٹار'' کو آئی ایس پی آر سے روشناس کرانا ہے تا کہ وہ اس ادارہ کی سربراہی کا فرض ادا کر سکیں۔ میجر جنرل خالد بشیر شائستہ طبیعت کے حامل پیشہ وارانہ سوچ رکھنے والے ایک سینئر افسر تھے۔ ان کی قیادت میں مجھے ''عوامی جمہوریہ چین'' کی پیپلز لبریشن آرمی کے ''شعبہ تعلقات عامہ'' کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ یہ ایک معلوماتی دورہ تھا تاہم چین سے انتہائی قریبی تعلقات کے باعث معلوماتی کے ساتھ خیر سگالی پہلو زیادہ نمایاں ہو گیا۔ تین رکنی وفد میں میجر (بعد میں بریگیڈیئر ریٹائرڈ) شاہد کرمانی بھی تھے جو آئی ایس پی آر لاہور میں تعینات تھے۔ یوں میجر جنرل خالد بشیر کے ساتھ کراچی اور لاہور میں تعینات آئی ایس پی آر افسر تھے۔ ہمیں مختلف اداروں سے روشناس کرایا گیا۔ ظاہر ہے کہ عوامی جمہوریہ چین میں مختلف نوعیت کا سیاسی نظام رائج ہے۔ اور اس کے تابع صحافت بھی فروغ پذیر ہے۔ چینی افواج کے لیے ابلاغ کا موثر ترین نظام ہے۔ ان کے ہاں عوام سے زیادہ افواج میں خدمات انجام دینے والے افسروں اور دیگر باوردی اہلکاروں کی ابلاغی کیفیت پر توجہ مرکوز ہے۔

ہم عظیم دیوار چین پر ''چہل قدمی'' کر رہے تھے کہ کسی نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ پی ایل اے (پیپلز لبریشن آرمی) کے شعبہ تعلقات عامہ کے سربراہ ٹو سٹار جنرل تھے۔ مجھے کہنے لگے کہ یاد رکھو کامیابی کے لیے افواج سے منسلک تمام افراد میں یکسوئی ضروری ہے۔ میرے اپنے فوجیوں کے لیے ''آرمی ڈیلی'' تیار کرتا ہوں جو وہ کمیونسٹ پارٹی کے اخبار ''پیپلز ڈیلی'' سے پہلے پڑھ لیتے ہیں۔ یوں میری ڈیوٹی مکمل ہو گئی۔ دشمن سب سے پہلے من گھڑت خبر وغیرہ کے ذریعے فوج میں بددلی پھیلاتا ہے۔ اس پر نظر رکھنی چاہیے۔ میں دیوار چین پر کھڑا چینی جنرل کی گفتگو توجہ سے سن رہا تھا جو اپنے تئیں دشمن کے بیانیے کے آگے روزانہ ایک نئی دیوار تعمیر کرنے کا عزم رکھے ہوئے تھے۔ ہم واپس آ گئے۔ خفیہ رپورٹس ارسال کی گئیں اور ہم نے ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل خالد بشیر کو بھی ''عسکری میڈیا'' کے قیام کی کوششوں پر راضی کر لیا تھا۔ بریفنگز کا دور چلا، تخمینے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لگائے گئے کہ کم از کم ایک روز نامہ اخبار افواج کے لیے تیار کیا جائے۔ خاص طور پر اگلے مورچوں پر خدمات انجام دینے والے صورتحال سے بھرپور آگاہی حاصل کر سکیں۔ بہر حال یہ منصوبہ ابتدائی گرم جوشی کے بعد طویل سرد مہری کا شکار ہو گیا۔

جنرل عبدالوحید کاکڑ کی مدت کمانڈ مکمل ہونے کے بعد لیفٹیننٹ جنرل جہانگیر کرامت کو ترقی دے کر جنرل کے رینک میں چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا گیا۔ ان کا تعلق آرمرڈ کور سے تھا۔ آئی ایس پی آر کے ڈی جی میجر جنرل خالد بشیر کے بعد میجر جنرل سلیم اللہ خان تعینات کیے گئے۔ ان کا تعلق انفینٹری رجمنٹ سے تھا۔ میجر جنرل سلیم اللہ نے مختلف شہروں کے صحافیوں سے قریبی تعلقات استوار کر لیے۔ آئی ایس پی آر سے قبل میجر جنرل سلیم اللہ ایک حساس ادارے کے ساتھ منسلک رہے تھے۔ یوں انہیں سرکردہ صحافتی شخصیات کے پس منظر سے بخوبی آگاہی تھی۔ کبھی کبھار ہم "مستقل" آئی ایس پی آر والے بھی ڈی جی سے گفتگو کے دوران اکثر زیر ہو جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے دور میں پاک افواج کے ترجمان ہفت روزہ ہلال (آج کل ماہنامہ ہلال) کو روز نامہ میں تبدیل کرنے کے لیے کافی ہوم ورک کیا۔ میں نے اس ضمن میں مکمل بریفنگ دی۔ لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی کو مدیر بنانے پر اتفاق تھا لیکن آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت نے آخری مرحلے پر تجویز پر عمل درآمد موخر کر دیا۔ میں ابھی کراچی آفس ہی میں تعینات تھا۔ معمول کے فرائض جاری تھے۔ ایک روز میجر جنرل سلیم اللہ نے فون پر دریافت کیا کہ پاک افواج کا ایک دستہ یوگوسلاویہ میں امن دستے کے طور پر یو این ڈیوٹی انجام دینے جا رہا ہے کیا تم دلچسپی رکھتے ہو؟ میں نے فون ہی پر رضامندی کا اظہار کر دیا، یوں چند ہفتے بعد لاہور سے پاک افواج کے ایک دستے کے ساتھ کروشیا کے صدر مقام زغرب روانہ ہو گیا۔ اس دستے میں انفینٹری (11 بلوچ رجمنٹ) آمرڈ کور کا سکارڈن، آرٹلری کی بیٹری کے علاوہ انجینئرز، سگنلز اور میڈیکل کور کی نمائندگی بھی تھی۔ ہم اپریل 1996ء سے اگست 1997ء تک کروشیا اور سربیا کے مابین متنازع علاقے برانیہ میں امن وامان کی ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔ پاک فوج کے دستے کی قیادت بلوچ رجمنٹ کے کرنل (بعد میں بریگیڈیئر ریٹائرڈ) کر رہے تھے۔ ہم سے قبل بلجیم کی فوج کا دستہ اس علاقے میں تعینات تھا۔

مشرقی یورپ کا یہ خطہ بدستور جنگ کی لپیٹ میں تھا۔ ایک بہت بڑی مملکت یوگوسلاویہ کو منصوبہ بندی کے تحت چھ ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پاک افواج کا دستہ جس علاقے میں پہنچا وہاں سربیا کے حامیوں کی اکثریت تھی۔ یہ وفاق کے حامی تھے اور یوگوسلاویہ کے ٹوٹنے پر سخت دل گرفتہ تھے۔ اس علاقے کے باشندے "آرتھوڈوکس کرسچن" مذہب کے ماننے والے تھے۔ پاکستان کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

فوجی ان کے نزدیک ''ناپسندیدہ'' تھے۔ بہرحال انتہائی نامساعد حالات میں پیشہ وارانہ فرائض کی ادائیگی کا آغاز ہوا۔ ایک شب افسر ہائشی بلڈنگ میں عشائیہ کے لیے جمع ہو رہے تھے کہ باہر سے پتھر برسنا شروع ہوگئے۔ خیر یہ سلسلہ جلد ہی رک گیا اور ہماری جانب سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اگلے روز کمانڈر نے میڈیکل ٹیم کو ہدایت کی کہ وہ ہاتھوں میں ادویات اور ڈاکٹر سٹیتھوسکوپ نمایاں کیئے ''سوشل پیٹرولنگ'' شروع کریں۔ اقوام متحدہ کی جانب سے مہیا کیے گئے ترجمان ہمراہ تھے۔ آئی ایس پی آر کی ٹیم بھی ساتھ تھی۔ مقامی ناراض شہریوں کے لیے یہ ایک منفرد نظارہ تھا۔ کچھ نے نعرے بلند کیے تاہم اس بہانے قصبہ کے گلی کوچوں میں ہماری رسائی ممکن ہوگئی۔ آہستہ آہستہ مریض پاک آرمی کے میڈیکل سنٹر آنا شروع ہوگئے۔ زیادہ تر بوڑھے مرد، خواتین اور بچے تھے۔ نوجوان جنگی سرگرمیوں میں مصروف تھے یا مخالفین کے ہاتھوں مارے جانے کے خوف سے ''گمشدہ'' ہوگئے تھے۔ میں نے مقامی صحافیوں سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی تو سخت مزاحمت کا سامنا ہوا۔ پاکستان کے بارے میں ان کے خیالات میں منفی عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ یہ صحافی زیادہ تر ''سربیئن'' تھے، روس نواز تھے یا سمجھ لیجیے کہ مارشل ٹیٹو کے فلسفے کے حامی اور بلغراد حکومت کے تابع سمجھے جاتے تھے۔ اب یہ علاقہ متنازع تھا اور یہ فیصلہ ہونا تھا کہ اسے کیتھولک اکثریت کے ملک کروشیا میں شامل کیا جائے یا سربیا میں رہنے دیا جائے۔ دراصل مارشل ٹیٹو کے انتقال کے بعد یوگوسلاویہ میں مذہبی، علاقائی اور نسلی تضادات نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔

میڈیا نے بھی اس سلسلے میں منفی کردار ادا کیا اور ہر علاقے میں موجود لاتعداد ٹی وی، ایف ایم ریڈیو اور اخبارات نے تضادات کو مزید ہوا دی۔ مغربی دنیا پہلے ہی تاک میں تھی، انہیں یورپ میں طاقتور ترین سوشلسٹ ملک کو جمہوریت کے نام پر تہہ و بالا کرنے کا بہترین موقع میسر آگیا۔ سیاسی دھڑے بندیوں میں تشدد کا عنصر نمایاں ہوا تو مسلح جتھے وجود میں آگئے۔ کیتھولک کروئٹ کی زیادہ تر جرمن میں مقیم کروئٹ باشندے مدد کرتے رہے۔ آرتھوڈکس کرسچن وفاق کی پناہ میں تھے اور ان کا موقف یہ تھا کہ دیگر علاقوں میں شورش پسند باغی ہیں اور ان کے خلاف فوجی کارروائی ہونی چاہیے۔ بوسنیا کی مسلم آبادی کا علیحدہ تشخص ہے۔ انہوں نے پہلے سرب اور کروئٹ دونوں کی جانب سے روا رکھے گئے مظالم کا سامنا کیا۔ کچھ عرصے بعد مسلمانوں نے اپنی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ ہم سے پہلے بھی پاک افواج کے متعدد دستے اقوام متحدہ کے پرچم تلے شورش زدہ علاقوں میں قابل تعریف خدمات انجام دے چکے تھے۔ ہمارا دستہ بوسنیا کے صدر مقام سرائیوو سے تقریباً تین سو کلومیٹر فاصلے پر مورچہ زن تھا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یوگوسلاویہ میں قیام کے دوران تین مرتبہ سرائیوو جانے کا موقع ملا۔ایک مرتبہ ذاتی حیثیت میں اور دوبار دورہ سرکاری نوعیت کا تھا۔ ہماری وردی پر اقوام متحدہ کے نشان کے ساتھ پاکستان کا پرچم بھی آویزاں تھا۔ بوسنیا کے حدود شروع ہوتے ہی مرد و زن اور بچے جونہی پاکستان کا پرچم دیکھتے تو اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کرتے۔ہم چند افسر ایک کرافٹ کے ذریعے دریا عبور کر رہے تھے کہ اچانک دریا کی لہروں سے اللہ اکبر اور پاکستان پاکستان جیوے پاکستان کی آوازیں سنائی دیں۔غور سے دیکھا تو چند بچے اور جوان نعرے بلند کرتے دکھائی دیئے۔دریا میں ڈبکی لگا رہے تھے۔کنارے پر اترے تو کچھ عمر رسیدہ افراد بیٹھے تھے۔ہم جونہی قریب ہوئے تو انہوں نے ہمارے ہاتھ چومنا شروع کر دیئے۔پاکستان آرمی، پاکستان آرمی پکارتے ہوئے وکٹری کا نشان بلند کرتے۔ یہ سب کچھ ہم سے پہلے خدمات انجام دینے والے پاک فوج کے امن دستے کی بدولت تھا جنہوں نے بے لوث انداز میں ملی جذبے کو سر بلند رکھتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیئے اور پورے علاقے کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ہمیں بتایا گیا کہ پاک فوج کے افسر اور جوان ماہ رمضان میں باقاعدگی سے روزے رکھ رہے تھے تو اقوام متحدہ کی جانب سے ملنے والا راشن اور دیگر اشیائے خورونوش کافی مقدار میں بچ جایا کرتا تھا۔ بعد ازاں راشن پیکٹ جنگ سے متاثرہ خاندانوں میں تقسیم کرتے تھے۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ پاک فوج کی بدولت بوسنیا کے مسلمانوں کو امید اور کامیابی کی ایک نوید ملی۔ایک مرتبہ بوسنیا کے ''مسٹر جناح'' جناب عزت بیگووچ سے ملاقات بھی ہوئی۔انہوں نے پاکستان کی امداد اور پاک فوج کی خدمات کا اعتراف انتہائی جذباتی انداز میں کیا۔

سرائیوو شہر عظیم تاریخی ورثے کا حامل ہے۔رہن سہن اور ظاہری شناخت کے لحاظ سے یورپ کا شہر ہی دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے رگ و پے میں مسلم قومیت اور ترک ثقافت رواں دواں ہے۔سٹی سنٹر میں کھڑے تھے کہ مغرب کی اذان سنائی دی۔قریب ہی جامع مسجد کی جانب مرد عورتیں ایک ساتھ رواں دواں تھے۔ یہ منظر ہمارے لیے غیر مانوس تھا۔اکثر جوان خواتین مغربی لباس زیب تن کئے ہوئے تھیں۔ان کی منزل بھی جامع مسجد تھی۔ہم مسجد پہنچے تو دیکھا کہ خواتین کے لئے علیحدہ انتظامات ہیں جہاں وہ گاؤن اوڑھ کر نماز کے لیے تیار ہو جاتی ہیں اور ان کی صف مردانہ صف کے پیچھے تھی۔امام صاحب نے نماز مغرب کے بعد دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے اور رقت آمیز انداز میں دعائیہ کلمات پڑھنے لگے۔شاید ان کی نظر میں ہم بھی تھے۔ یو این آرمی کی وردی اور اس پر پاکستان کا پرچم سجائے ہم بھی سربسجود تھے۔انہوں نے دعا میں خاص طور سے پاکستان کی سلامتی اور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کشمیر کی آزادی کا بھی ذکر کیا۔ یوں جب تک بوسنیا کی حدود میں رہے بازار، کیفے، مساجد، دفاتر اور پارکس وغیرہ میں جہاں کہیں عوام ہمیں دیکھتے تو ''پاکستان۔ پاکستان'' کی صدائیں بلند کرتے تھے۔

ہم جس علاقے میں مورچہ زن تھے وہ سربیا سے جڑا ہوا تھا اور کروشیا سے بھی جغرافیائی رابطہ تھا۔ مارشل ٹیٹو کے دورِ حکومت میں بین المذہبی شادیاں عام تھیں، مسیحیوں کے فرقے ہوں یا مسلمان آپس میں شادی کی سرکاری طور پر حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ہمارے علاقے میں کئی ایسے خاندان تھے جنہیں لڑائی کے باعث منتشر ہونا پڑا۔ یعنی شوہر سرب بیوی بچوں کو چھوڑ کر کروشیاء کی ''مذہبی'' فوج میں شامل ہوگیا۔ حالات معمول پر آئے تو پاک فوج کے زیرِ انتظام علاقے میں منتشر خاندانوں کی ری یونین کے لیے ہفتہ وار انتظامات کیے گئے۔ ماں بیٹی، شوہر بیوی اور معمر افراد کی باہمی ملاقات کے مناظر انتہائی رقت آمیز تھے۔ بظاہر جب ملک ٹوٹتا ہے تو عام شہریوں کو بے شمار سماجی، معاشی اور خاندانی مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر سرب اور کروئٹ صحافی بھی آپس میں ملاقات کے لیے درخواست دیا کرتے تھے۔ میں نے اس صورتحال سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور دونوں جانب کے صحافیوں سے میل جول بڑھانے کے ساتھ اخبارات اور ایف ایم ریڈیوز کے ذریعے پاکستان کے بارے میں عمومی معلومات کی خوب تشہیر کی۔ ایک مرتبہ سرب ٹی وی کے ذریعے یوم پاکستان کے بارے میں فلم ٹیلی کاسٹ کرادی۔ اس میں کشمیر کا بھی ذکر تھا۔ سربیا میں موجود بھارتی سفارت کاروں نے اظہار برہمی کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے مقامی دفتر کو احتجاج نوٹ کرایا تاہم سرب ٹی وی کا نگران اس بات سے انکاری ہوگیا کہ یہ فلم ہمیں پاک فوج کے پریس رابطہ افسر نے مہیا کی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ سرب فوج، میڈیا اور سیاسی رہنماؤں کا کرب سقوط مشرقی پاکستان کے سانحہ سے ملتا جلتا ہے۔

لہذا میں نے اسی بنیاد پر ان سے راہ ورسم بڑھائی۔ آغاز میں اکثر نالاں تھے تاہم جب ''وفاق'' کی عظمت اور سربلندی کے لیے جاری جنگ میں یکساں کردار نمایاں کیا تو دوستی کی راہ ہموار ہوگئی۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر سے زیادہ بے تکلفی ہوگئی۔ موصوف سرب تھے اور وفاق کے حامی تھے۔ متحدہ یوگوسلاویہ کے لیے زورِ قلم صرف کر رہے تھے۔ امریکہ نے اقوام متحدہ کے ذریعے یورپ کے مضبوط ترین سوشلسٹ ممالک کو پارہ پارہ کردیا تھا۔ سانحہ مشرقی پاکستان کا ذکر آیا تو بھارت کی زبان بولنے لگے۔ میں نے بتایا کہ اسلام آباد بھی بلغراد کی مانند وفاق کی علامت ہے۔ بھارت نے لسانی اور جغرافیائی پہلوؤں کو بھرپور انداز میں استعمال کرتے ہوئے پہلے شورش کو ہوا دی اور اس کے بعد اپنی افواج کے ذریعے عسکری برتری حاصل کرلی۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہماری افواج وفاق کی علامت تھیں جیسے بلغراد یوگوسلاویہ کے وفاق کو بچانے کے لیے عسکری حکمت عملی پر کاربند تھا لیکن بین الاقوامی سازش کے تحت اسے شکست دی گئی۔ یہ بیانیہ ان کے ذہن میں پیوست ہو گیا۔ اب اسلام آباد اور بلغراد ان کی نظر میں ''جڑواں بھائی'' تھے۔ چلتے چلتے میں نے ازراہ تفنن باور کروایا کہ متحدہ یوگوسلاویہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے والے پہلے دو تین ملکوں میں شامل تھا۔ یہ دسمبر 1971ء کا ذکر ہے اور آج (1996ء) میں پچیس برس بعد پاکستان کی فوج یوگوسلاویہ کے حصے بخرے کرنے میں مصروف ہے۔ ان کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ کہنے لگے کہ مارشل ٹیٹو واقعی بھارت کے بہت قریب بلکہ تابع تھا۔ سرب صحافی کافی حد تک ہمارے ''ہمنوا'' ہو گئے تھے۔ البتہ انہیں ایک شکایت رہی۔ دراصل پاک فوج کے زیر انتظام علاقے ''برانیہ'' کی سرخ شراب ذائقے اور دوررس اثرات کے باعث بے حد مقبول تھی۔ یہ مشروب ہی ''کشیدگی'' کا سبب تھا۔ کچھ عرصے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ پاک فوج کے پی آر او کی رسائی صرف دودھ پتی تک محدود ہے۔ سرخ شراب کے تحفے کی توقع وقت کا ضیاع ہو گا۔ علاقے میں حد نظر تک انگور کے باغات تھے۔ دودھ اور شہد کی ''سوشلسٹ'' انداز میں فارمنگ تھی۔ جنگ سے پہلے لوگ ہشاش بشاش اور معاشی لحاظ سے مطمئن تھے کہ اچانک بلغراد اور زغرب سے اٹھنے والے سیاسی طوفان نے جس کی بنیاد مذہبی عصبیت تھی سب کچھ تہہ بالا کر دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گلی محلے اور شہر میدان جنگ میں تبدیل ہو گئے۔ پادری مسلح جتھے ترتیب دینے لگے۔ کروشیاء میں مسلم املاک کو بہت نقصان پہنچا۔ مرد شہید کئے گئے، عورتیں بڑی تعداد میں اغواء کر لی گئیں۔ بچے لاپتہ ہو گئے۔ سابق یوگوسلاویہ میں باہمی لڑائی جھگڑے اور جنگ و جدل کے دوران انسانیت سوز مظالم کا بازار گرم رہا۔ اس بارے میں بہت کچھ شائع ہو چکا ہے۔ ہمارے زیر انتظام علاقے کے قریب ہی کروشیاء کا ایک خوبصورت قصبہ ''اوسیک'' تھا جہاں ہم کبھی کبھار جمعہ کی نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ اکثر اپنے ہیڈ کوارٹرز ہی میں افسر اور جوان پنجگانہ نماز ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دو تین افسروں کے ہمراہ ''اوسیک'' گئے جہاں ایک مسلمان نے اپنے گھر کے ایک کمرہ میں نماز کا انتظام کیا ہوا تھا۔ مارشل ٹیٹو کی حکومت قائم ہونے سے پہلے ''اوسیک'' میں دس سے زائد مساجد تھیں۔ ترکی کمزور ہوا۔ فوج بکھر گئی تو مسلمانوں پر بھی عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ سویت یونین کی مانند یوگوسلاویہ میں بھی فوٹو سیشن کے لئے چند مساجد برقرار رکھی گئی تھیں۔

کروشیاء کے علاقے میں مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ تبدیلی مذہب کا رجحان بھی چل نکلا، اکثر لامذہب ہو گئے۔ خیر! نماز جمعہ کے بعد امام صاحب نے اقامت گاہ ہی میں کافی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پر مدعو کیا اور مسجد کے بارے میں گفتگو شروع کی۔ ان کا خیال تھا کہ مالی امداد کے بغیر مسجد کی بحالی ممکن نہیں۔ مالک مکان کی بیٹی جو انگلش سمجھتی تھی ترجمانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ اس نے امام صاحب کی بات کا ترجمہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ آپ مسجد کی انتظامیہ کو چندہ نہ دیں۔ ہم مسلمان نوجوانوں کے لیے ویک اینڈ کلب نہیں ہے جس کی وجہ سے بہت پریشانی ہو رہی ہے۔ امام صاحب نے مسکراتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن ''اوسیک'' کی مسلمان طالبہ نے معذرت کر کے بات جاری رکھی۔ اس نے کہا کہ دو ہفتے قبل میرے باپ نے اپنی بہن کا رشتہ ایک غیر مسلم نوجوان سے کر دیا ہے۔ کیونکہ مسلمان لڑکے لاپتہ ہیں۔ کچھ بوسنیا چلے گئے، چند ایک کروشیاء میں ہیں لیکن اپنی شناخت ظاہر نہیں کرتے۔ اگر ہمارا ایک ویک اینڈ کلب قائم نہ ہوا تو میرے والد مجھے بھی کسی غیر مسلم نوجوان کے حوالے کر دیں گے۔ میں ہر ''ویک اینڈ'' گھر پر ہی گزار رہی ہوں۔ دوسری طرف میری کیتھولک دوست اپنے کلب میں جاتی ہیں۔ ان کی شادیاں ہو رہی ہیں۔ بچی نے توقف کیا تو امام صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اب طالبہ نے اپنی زبان میں امام صاحب کو خلاصہ بیان کیا۔ جس پر ان کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے تاہم سر کے اشارے سے تسلیم کا اظہار کرتے رہے۔ قصہ مختصر! میرے ساتھ گئے افسر گومگو کی کیفیت میں تھے۔ مسجد کے لیے پیسے لائے تھے۔ اب مسلم نوجوانوں کے لیے ''ویک اینڈ کلب'' کا مطالبہ سامنے تھا۔

میں نے دریافت کیا کہ یہ جگہ کہاں قائم ہو سکتی ہے؟ تو طالبہ نے کہا کہ جس مکان میں آپ نے نماز پڑھی ہے۔ اس مکان کی بیس منٹ موجود ہے جہاں لکڑی کا فرش ہے جو ڈانس کے لیے بہت موزوں ہوگا۔ بارش کی وجہ سے مٹی جم گئی ہے۔ اگر یہ مٹی ہٹادی جائے اور میوزک سسٹم لگ جائے تو مسلم نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ویک اینڈ کلب بن سکتا ہے۔ یوں ہم آپس میں ملیں گے اور شادی بھی کر سکتے ہیں۔ نوجوان طالبہ نے گلوگیر آواز میں بات ختم کر دی۔ ہم پاکستانی سکتے کے عالم میں تھے۔ ہنس مکھ میجر خٹک نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے اردو میں کہا کہ سر! آپ رینک میں سینئر ضرور ہیں لیکن یہ معاملہ عسکری نوعیت کا نہیں ہے، اس کے باوجود فیصلہ آپ نے ہی کرنا ہے کیونکہ آپ سید ہیں۔ قیامت کے دن آپ ہی جوابدہ ہوں گے۔ میجر خٹک کی بات ختم ہوتے ہی میں نے مالک مکان سے درخواست کی کہ ہمیں مکان کی بیس منٹ دکھائے تا کہ فیصلہ کر سکیں۔ یہ مسجد کے لیے مختص کمرے کے نیچے ہی خاصی بڑی جگہ تھی جسے صفائی کے بعد مزید بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ بہرحال پہلے ویک اینڈ کلب کی تشکیل کے لیے مناسب رقم مہیا کر دی گئی تا کہ مسلم نوجوانوں کے ''عائلی'' بحران پر قابو پایا جا سکے۔ دو ہفتے بعد ہم دوبارہ ''اوسیک'' گئے تو شہر کی واحد مسجد جو ایک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کمرہ پر مشتمل تھی کے نیچے ویک اینڈ کلب قائم ہو چکا تھا جہاں ہفتہ اور اتوار کو شہر کے مسلمان لڑکے اور لڑکیاں جمع ہو کر ڈانس وغیرہ کرتے تھے۔ یوں ان کے مابین میل جول بڑھنے لگا۔ کئی دہائیوں سے یوگوسلاویہ کی سماجی روایات میں شادی سے پہلے فرینڈ شپ کا عمل ضروری تھا۔ یہ تمام فرقوں میں رائج تھا۔ مسلمان ابتداء میں ہچکچاتے رہے تاہم خلافت عثمانیہ کے خاتمے اور مسلم سماج کے زوال کے بعد وہ بھی علاقائی رسومات اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

پاک فوج کے یو این مشن دستے کا ہیڈ کوارٹر ''داردا'' قصبے کے قریب واقع تھا۔ اس کے ساتھ ہی فٹ بال گراؤنڈ تھی جسے چاروں جانب سے باڑ لگا کر محفوظ بنایا گیا تھا۔ جنگ کے دوران بھی یہ جگہ سپورٹس تقریبات کے لیے استعمال ہوتی رہی۔ ہمارے دستے کو پہنچے ابھی چند روز ہی گزرے ہوں گے کہ قصبے کے میئر نے کمانڈر بریگیڈیئر طارق رسول سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میئر سرب قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ہمراہ وفد بھی تھا۔ ملاقات کے دوران انہوں نے درخواست کی کہ پاکستان آرمی کے افسران اور جوان فٹ بال گراؤنڈ میں صرف سپورٹس شو پہن کر داخل ہوں کیونکہ بڑے بوٹوں سے گھاس کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ گراؤنڈ ہمارے بچوں اور نوجوانوں کے لیے مخصوص ہے۔ غیر متعلقہ شہری داخل نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہی میچ دیکھتے ہیں۔ ہم نے قیام کے دوران دیکھا کہ عمر کے لحاظ سے تین مختلف ٹیمیں تھیں جو مختلف اوقات میں باقاعدگی سے پریکٹس کرتی تھیں۔ سب سے پہلے چھوٹے بچے آتے تھے۔ جنہیں چکس کہا جاتا تھا۔ یہ کھیلتے کم اور شور زیادہ کرتے تھے۔ ایک مستعد کوچ مسلسل ان کی نگرانی پر مامور تھا۔ ان کے بعد لڑکے لڑکیاں گراؤنڈ میں فٹ بال کے پیچھے بھاگتے دکھائی دیتے۔ سب سے آخر میں باقاعدہ ٹیم کے کھلاڑی گراؤنڈ میں پیشہ وارانہ کھلاڑی کی مانند پریکٹس کرتے نظر آتے تھے۔ ہفتے، پندرہ روز میں باقاعدہ میچ بھی ہوتا تھا۔ فٹ بال کے متعدد کوچ بھی گراؤنڈ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تھے۔ جنگ نے ان کی مصروفیات ختم کر دی تھیں۔ انہیں ملازمت کی ضرورت تھی۔ پاکستان اطلاع بھجوائی گئی کہ سستے داموں فٹ بال کے بہترین کوچ دستیاب ہیں۔ کافی انتظار کے بعد جواب آیا کہ ''تمہیں جس کام کے لیے بھیجا گیا ہے اس پر توجہ دو۔ فٹ بال کے فروغ کے لیے فٹ بال فیڈریشن پاکستان موجود ہے''۔ بہرحال ہم نے علاقے میں پاکستان ساختہ فٹ بال تقسیم کیے۔ یہ سرب کھلاڑیوں کے لیے ایک بہترین تحفہ تھا۔ یوں ''تعلقات عامہ'' مزید خوشگوار ہو گئے۔

سابق یوگوسلاویہ میں گزرے شب و روز میری زندگی کا ایک منفرد تجربہ تھا۔ سب سے اہم پہلو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پاک فوج کی بے مثال پیشہ وارانہ صلاحیت، اہلیت اور فرض سے لگاؤ کا بین الاقوامی سطح پر اعتراف تھا۔ یو این مشن کے سربراہ امریکی تھے جبکہ تیس سے زائد ممالک پر مشتمل یو این آرمی کی قیادت بیلجیم فوج کے میجر جنرل شکوپس کر رہے تھے۔ یہ دونوں اعلیٰ شخصیات ہمیشہ پاک فوج کی خدمات کا برملا اعتراف کرتے اور دیگر ممالک کی افواج کے سامنے بھی پاک فوج کے دستے کو "مثالی" قرار دیتے تھے۔ واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جنہیں ایک نشست میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ آج کل "جزوی" فرصت کے ایام میں سابق یوگوسلاویہ کے عروج وزوال اور پاک افواج کے ساتھ بسر کئے گئے شب وروز پر مبنی یادداشتیں مرتب کر رہا ہوں۔ یہاں قیام کے دوران سرکاری تعطیلات کی بدولت مشرقی یورپ کے دیگر ممالک کے علاوہ جرمنی، بیلجیم، ہالینڈ اور برطانیہ کی سیر کے مواقع بھی میسر آئے۔ سابق یوگوسلاویہ سے واپسی کے لیے ہمیں کروشیاء کے صدر مقام زغرب سے روانہ ہونا تھا۔ یہ شہر ایک زمانے میں یوگوسلاویہ کا حصہ تھا۔ یہ بات مشاہدے میں آئی کہ طاقت ور ممالک ہمیشہ اپنے مخالف ملکوں میں نسلی قومیت، مقامی اشتراکیت، مغربی جمہوریت، فقہی مملوکیت اور عسکری آمریت کے بل بوتے پر عوام کو بیوقوف بناتے ہیں۔ سب سے پہلے سیاسی قیادت میں باہمی سر پھٹول کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد فوج کو کمزور کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابلاغ کے ذرائع بھی سیاسی قیادت بشمول حکمرانوں کے آلہ کار بن کر بیرونی بیانیہ کو مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اس صورتحال میں بڑے سے بڑا ملک بھی لڑکھڑا جاتا ہے۔

سابق یوگوسلاویہ امن مشن کے ساتھ خدمات انجام دینے کے بعد واپس آئی ایس پی آر ڈائریکٹوریٹ راولپنڈی میں تعیناتی کر دی گئی۔ جنرل جہانگیر کرامت کے بعد جنرل پرویز مشرف چیف آف آرمی سٹاف مقرر کر دیئے گئے تھے۔ لائن آف کنٹرول، ورکنگ باؤنڈری اور سیاچن کے علاقے میں کشیدہ صورتحال پر خاص نظر رہتی تھی۔ جی ایچ کیو میں بریفنگ وغیرہ کا زور تھا۔ ایک دو مرتبہ وزیر اعظم میاں نواز شریف بھی تشریف لائے۔ بعد ازاں کارگل کا محاذ کھل گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ابھی ابتدائی اطلاعات آ رہی تھیں۔ آئی ایس پی آر کے سربراہ بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل ریٹائرڈ) راشد قریشی نے مجھے حکم دیا کہ فوری طور پر آئی ایس پی آر کی ٹیم ایک افسر کی نگرانی میں سکردو بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز میں رپورٹ کرے۔ ٹیم تیار ہوگئی۔ اب سینئر صحافیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ اگلے مورچوں کا دورہ تھا۔ ان میں بی بی سی، وائس آف امریکہ، وائس آف جرمنی وغیرہ کے نمائندے بھی تھے۔ ہم ہیلی کاپٹر کے ذریعے سکردو پہنچے۔ اندھیرا پھیلتے ہی دریا کے ساتھ ساتھ ہمارا قافلہ آگے روانہ ہوگیا۔ آرمی جیپوں میں سینئر صحافی سوار تھے۔ سب سے آگے میری جیپ تھی۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شنید تھی کہ یہ راستہ بھارتی توپوں کی زد میں ہے لہٰذا لائٹس آن کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جیپ کے آگے ایک جوان سفید قمیض پہنے تیز قدموں کے ساتھ چل رہا تھا تا کہ جیپ ڈرائیور کا اندازہ درست رہے۔ سفر کئی گھنٹوں پر محیط تھا۔ دو تین مرتبہ چند منٹ کے لیے رکے تا کہ قافلے کی ترتیب بگڑنے نہ پائے۔ نصف شب سے کچھ زیادہ وقت ہو گیا تھا کہ ایک پہاڑی کے دامن میں پڑاؤ کیا۔ گرم چائے کا دور چلا۔ مقامی کمانڈر نے عسکری صورتحال پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے نقشے پر موجود نشانات کی مدد سے وضاحت کے ساتھ سوالات کے جواب بھی دیئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ صبح تفصیلی بریفنگ ہو گی۔ اس دوران بھارتی فوج کی آرٹلری گولہ باری کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ قریب ہی پاک فوج کی توپیں نصب تھیں۔ انہوں نے بھی جوابی کارروائی شروع کر دی۔ اب محفوظ پناہ گاہ پہاڑ کے قرب و جوار میں موجود بڑے بڑے پتھر ہی تھے۔ دن نکلا تو جنگی طیاروں کی گھن گرج سنائی دینے لگی۔ سر اٹھاتے تھے تو بلند و بالا پہاڑوں کا وسیع سلسلہ تھا۔ صورتحال واضح نہیں تھی۔ ادھر صحافیوں کے تذبذب کا سامنا بھی آسان نہیں تھا۔ میرے اصرار پر بریفنگ کا وقت پہلے کر دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ دو بھارتی لڑاکا طیارے گرا دیئے گئے ہیں۔ ایک پائلٹ مارا گیا جبکہ دوسرا گرفتار کیا گیا اور باقی باتیں جہازوں کے بچے کھچے کباڑ پر ہوں گی۔ کچھ دیر بعد ہم موقع پر موجود تھے۔ بھارتی لڑاکا طیارے کی دُم تمام نشانات کے ساتھ جارحیت کے ثبوت کے طور پر نمایاں تھی۔ اور بھی پرزے بکھرے ہوئے تھے۔ بھارتی سکواڈرن لیڈر ہلاک تھا جبکہ فلائٹ لیفٹیننٹ نے جہاز ہٹ ہوتے ہی پیراشوٹ سے کودنے میں عافیت سمجھی اور اسے برسر پیکار مجاہدین نے گرفتار کر کے پاک فوج کے حوالے کر دیا تھا۔ گرائے گئے بھارتی لڑاکا طیارے کی دم کے ساتھ صحافیوں نے جی بھر کر فوٹوگرافی کی۔ ٹی وی کے لیے مووویز بھی بنائی گئیں۔ یوں یہ سب کچھ چند لمحوں کے بعد دنیا بھر میں نشر ہو گیا۔

اب جنگ کارگل ایک عالمی خبر بن گئی اور دنیا بھر کا میڈیا اس جانب متوجہ ہو گیا۔ کشمیر ایک بار پھر خبروں میں تھا اور تجزیہ نگار جاری جنگ کا تعلق بھی 1947ء کے تقسیم ہند فارمولے سے جوڑ رہے تھے۔ ہم نے ایک رات مزید اگلے مورچوں پر پاک فوج کی مہمان نوازی کا لطف اٹھایا۔ جنگ کارگل کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ چند ایک عسکری فیصلے ہیں اور کچھ سیاسی عوامل کی ترجیحات و توضیحات وغیرہ۔ جنگ کسی طور اپنے اختتام کو پہنچی تو تجزیے شروع ہو گئے۔ وزیر اعظم نواز شریف سے منسوب یہ بیانیہ عام کیا جانے لگا کہ معرکہ کارگل ان کی اجازت کے بغیر شروع کیا گیا تھا۔ اب دونوں جانب سے دلائل اور واقعات کے انبار لگنا شروع ہو گئے۔ یہ ''راج نیتی'' کے حوالے سے ایک تشویش ناک بات ہے۔ اول تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وزیر اعظم کی مرضی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے بغیر اس قسم کی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی تھی۔ اس زمانے کی ہائی کمان میں یہ تاثر عام تھا کہ نواز شریف عسکری معاملات اور خاص طور سے بھارت سے نبرد آزمائی کی تاریخ سے مکمل آشنائی کا تاثر نہیں دیتے تھے۔ انہیں سطحی اور سرسری گفتگو زیادہ مرغوب ہے۔ جنرل پرویز مشرف کے علاوہ بھی متعدد سینئر افسر اس حقیقت کی گواہی دے رہے تھے کہ وزیرِاعظم کو متعدد بار ''حساس'' امور سے آگاہ کیا گیا۔ ماضی میں بھی ہم نے اہم واقعات کی بنیاد پر باہمی آویزش کو ''پوائنٹ آف نو ریٹرن'' تک پہنچتے دیکھا۔ جنگ 71ء اور سقوطِ مشرقی پاکستان کا تجربہ کرتے ہوئے سارا ملبہ فوج پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اس المیے کے سیاسی کردار پھولوں کے ہار ڈال کر عوام کے نعروں کا جواب دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن ''بنگلہ بندھو'' بن گئے اور ذوالفقار علی بھٹو نے ''قائدِ عوام'' اور ''فخرِ ایشیاء'' کے القاب اپنا لیے۔ جواب دہی کے لیے فوج کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ ایک عام فہم شخص بھی سمجھتا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو نے ''ادھر ہم، اُدھر تم'' کے سیاسی بیانیہ کو فروغ دیا اور اپنے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کر لیئے اور ڈٹ کر حکومت کرتے رہے۔

کارگل کے واقعہ نے بھی تشویشناک رخ اختیار کر لیا اور وزیرِاعظم نے آرمی چیف کو ہٹانے کے لیے جو طریقہ اپنایا وہ ہر لحاظ سے ملکی سلامتی اور پاک افواج ایسے ادارے کے عزت و وقار کے منافی تھا۔ میاں نواز شریف نے یہ حقیقت فراموش کر دی کہ وہ چند برس پہلے جنرل جہانگیر کرامت کو بھی مدت ملازمت مکمل ہونے سے قبل محض روایتی گفتگو کرنے کی ''پاداش'' میں رخصت کر چکے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف بھی چوکس تھے۔ انہیں سری لنکا کے سرکاری دورے پر روانہ ہونا تھا۔ اس سے قبل وزیرِاعظم نے انہیں چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے عہدہ کی اضافی ذمہ داریاں سونپ دی تھیں۔ جنرل پرویز مشرف کو فارغ کر کے اگر اپنی مرضی کا ایک اور آرمی چیف تعینات کرنا مقصود تھا تو اس کا ایک ''شریفانہ'' طریقہ بھی موجود تھا۔ میاں نواز شریف نے آرمی چیف کو سری لنکا سے واپسی پر ''دورانِ سفر'' برطرف کرنے کا فیصلہ کیا اور بچگانہ انداز میں احکامات صادر کر دیئے۔ نیا آرمی چیف لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین کو تعینات کیا گیا۔ جنرل ضیاء الدین آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل تھے اور ان کا تعلق کور آف انجینئرز سے تھا۔ ان کا شمار اعلیٰ پیشہ وارانہ صلاحیت کے حامل افسروں میں ہوتا تھا۔ موصوف سابق آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ کے پرنسپل سٹاف افسر بھی رہ چکے تھے۔ کمانڈ، سٹاف اور اہم انسٹرکشنل خدمات بھی انجام دیں۔ ہر لحاظ سے اس عہدے کے لیے موزوں تھے۔ تاہم انہیں غیر تقریبی انداز میں جنرل کے رینک آویزاں کرنے سے پہلے ضرور غور کرنا چاہیے تھا کہ اس عمل سے وطنِ عزیز بالخصوص آرمی کے افسروں اور جوانوں پر کیا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔چند گھنٹوں میں فوج پر ''محو پرواز'' آرمی چیف ہی کی گرفت بدستور قائم تھی۔دوسری جانب وزیراعظم ہاؤس میں براجمان ایک اور ''آرمی چیف'' اپنی تعیناتی کو تسلیم کروانے کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

میں اپنے گھر پہنچا ہی تھا کہ آئی ایس پی آر سے میجر (بعد میں بریگیڈیئر ریٹائرڈ) عتیق الرحمٰن کی کال آئی جس میں انہوں نے نئے آرمی چیف جنرل ضیاء الدین کی تعیناتی کے بارے میں پی ٹی وی پر ٹیلی کاسٹ ہونے والی خبر کے بارے میں بتایا۔میں نے بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل) راشد قریشی کو اطلاع دی۔وہ حیران ہو گئے اور مجھے فوراً آفس پہنچنے کے لیے کہا۔ہم دفتر پہنچے تو جی ایچ کیو سے بھی کالز آ رہی تھیں۔میجر جنرل راشد قریشی مجھے اپنے آفس میں بٹھا کر خود چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل (بعد میں جنرل ریٹائرڈ) محمد عزیز خان کے پاس چلے گئے۔چند منٹ ہی گزرے تھے کہ وزیراعظم ہاؤس سے اے ڈی سی نے بتایا کہ نئے آرمی چیف جنرل ضیاء الدین جی ایچ کیو آ رہے ہیں۔آئی ایس پی آر کو ریچ دے۔میں نے او کے کر کے فون بند کر دیا۔اب ہمارے دوست لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے میرے پاس آئے اور فرمانے لگے کہ سر! بات ہو گئی ہے جنرل ضیاء الدین کے ساتھ پی آر او کی ڈیوٹی میں کروں گا۔وہ مجھے خوب جانتے ہیں۔میں نے کہا تو پھر آپ آرمرڈ کور میس میں چلے جائیں ٹیم کے ساتھ، کیونکہ جنرل صاحب آ رہے ہیں۔

اسی دوران ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل راشد قریشی نے مجھے ''ہائی کمان'' کے فیصلے سے آگاہ کیا اور ضروری ابلاغی ہدایات دیں۔ہائی کمان کے مطابق جنرل پرویز مشرف ہی آرمی چیف ہیں اور ان کا ہر قیمت پر دفاع کیا جائے گا۔بدقسمتی سے نواز شریف، جنرل پرویز مشرف اور جنرل ضیاء الدین نے وطن عزیز کو شدید ترین بحران سے دوچار کر دیا تھا۔اب سوچتا ہوں تو پہلے سے زیادہ پریشان ہو جاتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ فوج کی مختلف فارمیشنز متضاد احکامات کی پیروی کرتے ہوئے آپس میں الجھ جاتیں تو کیا خوفناک صورتحال پیش آتی۔

جنرل ضیاء الدین وزیراعظم ہاؤس سے سینئر افسروں کی تعیناتی کے احکامات جاری کر رہے تھے۔ان میں سے ایک تھری سٹار جنرل نے مجھے بعد میں بتایا کہ وہ خود حیران تھے کہ آرمی چیف بیرون ملک دورے پر ہیں، یہ نواز شریف اور جنرل ضیاء الدین کو کیا ہو گیا ہے؟ سیاستدان تو خیر سیاستدان ہوتا ہے کم از کم جنرل ضیاء الدین کو تو باوقار فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔انہیں ڈی جی آئی ایس آئی کی حیثیت سے نواز شریف کی فوج کے افسروں اور جوانوں میں مقبولیت کی سطح کا بخوبی علم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوگا۔ جنرل پرویز مشرف ہمیشہ اعلیٰ سپاہیانہ اقدار کے حامل رہے ہیں۔ ان کی شہرت ایک باوقار پیشہ وارانہ صلاحیت کے حامل افسر کی تھی۔ انہیں اگر شک بھی ہوگیا تھا کہ وزیراعظم انہیں آرمی چیف کے طور پر ''برداشت'' نہیں کر رہے ہیں تو ایک اچھے سپاہی کی مانند دستبردار ہو جاتے۔ بہر حال بڑے لوگ ہی بڑے فیصلے کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک انگریمنٹ کے لیے اللہ کو حاضر ناظر جان کر جھوٹے حلف نامے داخل کیے جاتے ہیں۔ میاں نواز شریف کے بارے میں کچھ کہنا بے کار ہوگا۔ موصوف کی نظر میں جنرل محمد ضیاء الحق کے بعد کوئی آرمی چیف ٹھہرا ہی نہیں۔ اقتدار میں ہو یا حزب اختلاف میں۔ ہر مرتبہ بقول شخصے دھواں چھوڑتے ہوئے بم کولات مارتے ہیں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس حرکت کی ملک کتنی بھاری قیمت ادا کرتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ 12 اکتوبر 1999ء کو کسی ''نیک روح'' چاہیے تھا کہ نواز شریف، پرویز مشرف اور ضیاء الدین کو اڈیالہ جیل کے ایک کمرے میں ون ڈش، ون واش اور ون لوٹا کی سہولت دے کر ایک ساتھ بند کر دیتے تو کم از کم ربع صدی تک وطن عزیز میں سکون ہی سکون رہتا۔ برسبیل تذکرہ یہی فارمولہ 16 دسمبر 1971ء کو بھی آزمانا چاہیے تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن 162 نشستوں کے ساتھ پہلے مغربی پاکستان کی ایک جیل میں تھے۔ ان کے ساتھ زیڈ اے بھٹو 81 نشستیں لے کر شریک ہو جاتے۔ اور اب رہ گئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل آغا محمد یحییٰ خان۔ انہیں بھی شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو کے ساتھ ایک ہی کمرے میں نظر بند کرنا چاہیے تھا۔ اس زمانے کی کمان جنرل گل حسن کی قیادت میں بھٹو صاحب پر فریفتہ تھی۔ حالانکہ سب جانتے تھے کہ مشرقی پاکستان کی ابتری میں بھٹو اہم ترین کردار رہے کیونکہ مجیب الرحمٰن تمام تر فسادی سوچ اور بے رحمانہ قتل و غارت کروانے کے باوجود سیاسی لحاظ سے لاجواب بیانیہ کا مالک تھا۔ یہ بیانیہ متحدہ پاکستان قومی اسمبلی میں 160 سے زائد نشستیں تھیں اور صدر پاکستان نے اسے وزیراعظم بھی نامزد کر دیا تھا۔

خیر! بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آج جب مڑ کر دیکھتا ہوں تو سیاست کے میدان اور حکمرانی کے ایوانوں میں پورے قد کے رہنما بہت کم اور ''بونے'' زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان حالات کے باوجود مملکت خداداد پر اللہ کریم کا رحم، کرم اور فضل ہے۔ جنرل پرویز مشرف کے برسر اقتدار آتے ہی آئی ایس پی آر کے شب و روز بھی مصروف ہو گئے۔ ہمیں جنرل محمد ضیاء الحق کے دورِ حکومت کا تجربہ تھا لیکن اس مرتبہ مصروفیات کا مرکز پہلے سے مختلف تھا۔ جنرل مشرف اکثر میٹنگز میں بھرپور تیاری کے ساتھ خود شریک ہوتے تھے۔ موصوف ذاتی طور پر ایک روشن خیال، دوراندیش اور معاملہ فہم شخصیت کے حامل تھے۔ جنرل پرویز مشرف بھی جنرل ضیاء الحق کی مانند ''دہلوی'' تھے۔ دہلی میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پیدا ہوئے تھے، ان کے والدین قیام پاکستان کے بعد کراچی تشریف لائے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کراچی ہی میں حاصل کی۔ جنرل ضیاء الحق کے والد دہلی میں سرکاری ملازم تھے لہٰذا انہوں نے زیادہ تر تعلیم دہلی ہی میں حاصل کی۔ خاص طور سے سینٹ جوزف کالج کے اساتذہ کرام کو اکثر یاد کرتے تھے۔ مارشل لاء حکمران کے حوالے سے دیکھا جائے تو ازراہ تفنن بتایا دو عسکری حکمران فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور جنرل آغا محمد یحییٰ خان بھی ''دہلوی'' تھے۔ ایوب خان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہے اور جنرل یحییٰ خان انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون (بھارت) سے فارغ التحصیل تھے۔

بہر حال آمدم برسر مطلب۔ جنرل پرویز مشرف کے حکم پر مانیٹرنگ سیل قائم کیا گیا جس کا مرکز ہمارا دفتر ہی تھا۔ دیگر دفاتر میں بھی عوامی شکایات موصول ہوتی تھیں جنہیں چھانٹی کے بعد متعلقہ دفاتر میں ارسال کر دیا جاتا تھا۔ آئی ایس پی آر میں مانیٹرنگ سیل کی ہفتہ وار بریفنگ میں اکثر میجر جنرل شاہد عزیز بھی تشریف لاتے تھے۔ اس وقت ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز کی ذمہ داری بھی ادا کر رہے تھے۔ موصوف کی گفتگو میں اکھڑ پن نمایاں تھا۔ میں نے میجر جنرل راشد قریشی سے درخواست کی کہ ایسے شخص کو میڈیا کے سامنے پیش نہ کیا جائے جو الجھاؤ کو سلجھاؤ پر ترجیح دیتا ہو۔ معلوم ہوا کہ موصوف کسی حوالے سے جنرل مشرف کے رشتہ دار بھی ہیں۔ یہ سن کر ہم نے اپنی سابقہ رائے پر نظرِ ثانی کا ارادہ کر لیا۔ میجر جنرل شاہد عزیز بعد میں چیف آف جنرل سٹاف اور لاہور کے کور کمانڈر بھی رہے۔ فوج سے ریٹائر ہوئے تو نیب کے چیئرمین بھی تعینات کیے گئے۔ جنرل پرویز مشرف کے آخری ادوار میں ہتھے سے اکھڑ گئے اور ''حق گوئی و بے باکی'' پر اتر آئے۔ جنرل مشرف کے اقتدار سے علیحدہ ہونے کے بعد مزید راز ہائے درون خانہ بے نقاب کرنے لگے تو مجھے اندازہ ہوا کہ میری اولین رائے درست تھی۔ آئی ایس پی آر کے سربراہ میجر جنرل راشد قریشی جنرل مشرف کے پریس سیکرٹری کے فرائض بھی ادا کر رہے تھے۔ لیفٹیننٹ حسن عماد مہدی پی آر او تھے، وہ اسلام آباد کے آفس میں ہی فرائض ادا کرتے تھے۔ البتہ میجر جنرل راشد قریشی دونوں دفاتر کی نگرانی کر رہے تھے۔ میں لیفٹیننٹ کرنل سے ترقی حاصل کر کے کرنل کے رینک پر تعینات ہوا تو دوبارہ کراچی کا غلغلہ مچ گیا۔ جنرل مشرف نے ایم کیو ایم کو بغلی تنظیم کے طور پر دوبارہ استوار کرنے کی سعی کی۔ ان کے سرکردہ بھگوڑے جب کراچی واپس آئے تو انہوں نے سابقہ آپریشنز میں شریک پولیس افسروں اہلکاروں اور مقامی ''سہولت کاروں'' سے دل کھول کر بدلے لیے۔ یہ انتہائی افسوسناک صورتحال تھی۔ الطاف حسین کی مخالف متعدد شخصیات لاہور راولپنڈی آ گئیں۔ اس طرح عام شہریوں میں بھی عدم تحفظ کا احساس بڑھنے لگا۔ تشدد اور یکطرفہ کارروائیوں کی رپورٹس کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

باوجود جنرل مشرف کے ہمراہیوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔انہیں کراچی کو ’’پرامن شہر‘‘ بنانے کے لیے ایم کیوایم (الطاف گروپ) پر ہی بھروسہ کرنا تھا۔

جولائی 2001ء میں مجھے بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔آغاز میں امید کم تھی کیونکہ اعلیٰ ترین سطح پر یہ طے ہوگیا تھا کہ آئی ایس پی آر کے ’’بنیادی‘‘ افسروں کو لیفٹیننٹ کرنل یا کرنل تک ترقی دی جائے کیونکہ یہ پرفارمنس کے لحاظ سے افسر کم اور صحافی زیادہ ہوتے ہیں۔آئی ایس پی آر کی کارکردگی کو موثر بنانے کے لیے لازم ہے کہ ایسے افسروں کو سینئر رینک میں تعینات کیا جائے جنہوں نے ابتدائی ملازمت آئی ایس پی آر میں نہیں کی، یوں وہ فوج کے رجحانات کی بہتر عکاسی کر سکتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ کریم کی خاص مہربانی تھی کہ والدین کی دعائیں، اساتذہ کرام کے احسانات، اہل خانہ کی نیک خواہشات، دوست احباب کی حوصلہ افزائی اور سب سے بڑھ کر میرے تمام سینئرز کی شفقت تھی کہ انہوں نے فرائض کی انجام دہی میں میرے تساہل اور خامیوں کو نظرانداز کیا اور تمام جونیئرز جو مجھے کامیاب کرنے کے لیے دیانتداری سے فرائض ادا کرتے رہے۔

اہم بات یہ ہے کہ جس روز میجر جنرل راشد قریشی اور میرے کولیگ کرنل منصور رشید نے بریگیڈیئر کے رینک کندھے پر لگائے اگلے روز راولپنڈی اسلام آباد شدید طوفان بادوباراں کی لپیٹ میں تھا۔شدید بارش سے نالہ لئی میں طغیانی آ گئی، مجھے چکلالہ سکیم تھری میں عسکری فائیو کے ایک گھر میں رہنا تھا۔یہ گھر بھی سیلاب کی زد میں آ گیا۔گراؤنڈ منزل میں پانی بھر گیا۔میری اہلیہ اور والد گرامی گھر میں تھے۔پوری کالونی میں آرمی کے ریٹائرڈ اور حاضر سروس افسر قیام پذیر تھے۔میں نے دفتر سے گھر تک پہنچنے کی پوری کوشش کی لیکن سیلابی پانی کے سامنے ایک نہ چلی۔ریسکیو ٹیموں اور کچھ اپنی مدد آپ کے تحت کالونی کے مکینوں کو بمشکل باہر نکالا گیا۔ہم کرنل منصور رشید کے گھر آرڈی ننس روڈ شفٹ ہوگئے۔پانی اترنے کے بعد گھر گئے تو صرف بالائی منزل کا سامان محفوظ تھا۔باقی سب نالہ لئی کی نذر ہو چکا تھا۔

دفتر اور گھر میں مبارک سلامت کا سلسلہ جاری تھا۔اکثر ناگہانی سیلاب کے باعث بے پناہ نقصان سے بھی آگاہ تھا۔لہٰذا اکثر یہ جملہ دہراتے ہوئے ملاقات کرتے تھے کہ: ’’بہت بہت مبارک ہو۔بہت افسوس ہوا‘‘۔اور میں بہت بہت شکریہ کہہ کر خاموش ہو جاتا تھا۔

ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کی حیثیت سے معمول کے مطابق فرائض تھے۔میں اس دفتر میں لیفٹیننٹ کی حیثیت سے 1973ء میں آیا تھا۔تب سربراہ بریگیڈیئر رینک کے افسر تھے۔اٹھائیس برس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا۔چند ماہ بعد نائن الیون کا ’’معرکہ‘‘ شروع ہو گیا۔لندن میں ایک ہفتے کے دورانیہ کے کورس کے لیے نامزد ہو گیا۔’’گورنمنٹ سپوکس پرسن‘‘ حکومتی ترجمان کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اہلیت بڑھانا مقصود تھی۔ وفاقی محکمہ اطلاعات کی جانب سے جناب اشفاق گوندل تھے۔ ہم دونوں ایک ہفتہ برطانوی وزارت دفاع کے مہمان رہے۔ اس دوران ہمیں 10 ڈاؤننگ سٹریٹ بھی لے جایا گیا جہاں وزیراعظم برطانیہ (ٹونی بلیئر) کے ڈائریکٹر کمیونی کیشن نے اپنے سیٹ اپ سے آگاہ کیا۔ ہم دونوں کے علاوہ دس اور ممالک کے سول اور عسکری ابلاغی محکموں کے سرکاری افسر بھی کورس میں شریک تھے۔

31 جولائی 2003ء کو بخوشی ریٹائرمنٹ آرڈر وصول کیے۔ دراصل ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل راشد قریشی کو اچانک تبدیل کر دیا گیا۔ ان کی بریگیڈیئر شوکت سلطان کو میجر جنرل کے رینک پر ترقی دے کر ڈی جی آئی ایس پی آر تعینات کر دیا گیا۔ نئے ڈی جی میرے کورس میٹ ہیں۔ ہم نے ایک ساتھ پی ایم اے کاکول میں ٹریننگ حاصل کی۔ عسکری روایات کے مطابق کورس میٹ یا جونیئر کی کمان میں فرائض منصبی ادا کرنے کی مخصوص خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں۔ میری نظر خامیوں پر زیادہ تھی کیونکہ آئی ایس پی آر میں منفرد طریقہ کار سے خدمات انجام دی جاتی ہیں۔ یوں میں نے میجر جنرل شوکت سلطان کو سلیوٹ کیا اور اجازت طلب کی۔ انہوں نے متعدد بار نظر ثانی کے لیے کہا تاہم میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ یوں 19 اگست 1972ء کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں پاس آؤٹ ہونے کے بعد 31 جولائی 2003ء کو آئی ایس پی آر سے بطور بریگیڈیئر ریٹائر ہو گیا۔ یوں میری زندگی کی کہانی کا ایک اہم ترین باب اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

ریٹائرمنٹ میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا کہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد کے ریکٹر بریگیڈیئر عزیز احمد خان نے اپنے دفتر طلب کیا اور یونیورسٹی میں ماس کمیونی کیشن ڈیپارٹمنٹ قائم کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ بریگیڈیئر عزیز احمد خان پی ایم اے کاکول میں میرے انسٹرکٹر بھی رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد متعدد اہم اداروں کی جانب سے ملازمت کی پیشکش ہوئی تھی۔ میری عمر 51 برس تھی، یوں مزید نو برس سرکاری ملازمت بھی ہو سکتی تھی۔ تاہم میرے والد گرامی نے یونیورسٹی کی ڈیوٹی کو ترجیح دینے کی ہدایت کی۔ 31 جولائی 2003ء کو فوج سے ریٹائر ہوا اور پانچ اگست 2003ء کو یونیورسٹی میں بانی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھا۔ 1970ء کا پنجاب یونیورسٹی کا شعبہ صحافت کا دور واپس آ گیا لیکن اب فرائض کی ترتیب بدل چکی تھی۔ طالب علم کے بجائے فیکلٹی کا ''طالب علم'' رکن بن گیا۔ یونیورسٹی کی ملازمت 2011ء تک جاری رہی کہ اچانک ایک روز ایک نجی ٹی وی چینل (سچ نیوز چینل) کے سربراہ کی کال آئی۔ انتہائی شائستہ لہجے میں اپنائیت سے گفتگو فرما رہے تھے۔ کہنے لگے کہ ہمیں پہلے بتایا گیا تھا کہ آپ کا انتقال ہو گیا ہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اب ایک برس بعد پتہ چلا کہ آپ زندہ ہیں۔ دراصل وہ مجھے بریگیڈیئر صولت عباس سمجھتے رہے جو میرے سینئر تھے اور فریضہ حج ادا کرتے ہوئے انتقال کر گئے تھے۔ بہر حال ٹیلی فون کے بعد آمنا سامنا ہوا اور میں یونیورسٹی کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر نجی ٹی وی میں چیف آپریٹنگ افسر کی خدمات انجام دینے لگا۔ تقریباً ایک برس ہونے کو آیا کہ میں نے اب تمام تر توجہ ''ریٹائرڈ'' لائف کو محفوظ رکھنے پر مرکوز کی ہوئی ہے۔ یونیورسٹی اور ٹی وی میں لاتعداد واقعات اور مشاہدات پیش آئے جنہیں کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ میں آخر میں سینئر صحافی جناب مجیب الرحمٰن شامی، سینئر ایڈیٹر قومی ڈائجسٹ جناب خالد ہمایوں اور نوجوان صحافی عبدالستار اعوان کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ ان حضرات کی بے حد محبت کے طفیل مجھے زندگی کے ان اہم شب و روز کو محفوظ کرنے کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین۔ (قومی ڈائجسٹ۔ جنوری 2021ء)

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

معروف بزنس مین، صنعتکار

محمد وحید چودھری

کے تجربات ومشاہدات

محمد وحید چودھری نے اندرون لاہور کے ایک خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی۔ زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ سے متاثر ہوئے اور طلبہ سیاست میں بھرپور حصہ لیا۔ **ہیلے** کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے کاروبار سے وابستہ ہو گئے۔ چودھری صاحب بھرپور محنت اور ایمانداری پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ ''اللہ کریم جس کے مقدر میں کامیابی ڈال دیتے ہیں پھر اسی کے ذہن میں محنت، مشقت اور ایمانداری کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے نہیں دینا وہ محنت سے بھی گھبراتا ہے۔ جس شخص کے اندر اللہ تعالیٰ یہ دو خوبیاں اکٹھی کر دیتے ہیں وہ زندگی کی دوڑ میں کبھی پیچھے نہیں رہ سکتا۔'' چنانچہ چودھری صاحب نے بھی کامیابی کے یہ دو انتہائی اہم ''گُر'' اپنائے، دن رات بھرپور محنت کی اور آج کا ان شمار ایک بڑی کاروباری شخصیات میں ہوتا ہے۔ ''ہنزہ گروپ آف کمپنیز'' ان کی سرپرستی میں دن رات ترقی کی جانب گامزن ہے۔ محمد وحید چودھری بھرپور زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کے پاس کاروباری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مختلف اہم شخصیات کے حوالے سے بھی یادوں باتوں کا ایک خزانہ ہے۔ حال ہی میں ہم نے چودھری صاحب کے ساتھ چند اہم نشستیں رکھیں اور ان کے مشاہدات و تجربات قلمبند کیے۔ سوالات اس انداز سے ترتیب دیئے گئے کہ ایک دلچسپ کہانی وجود میں آ گئی ہے۔ اُمید ہے قارئین کو یہ کاوش پسند آئے گی۔ لیجئے چودھری صاحب کی کہانی انہی کی زبانی ملاحظہ فرمایئے۔

O......❄......O

سب سے پہلے تو میں ''قومی ڈائجسٹ'' کے چیف ایڈیٹر جناب مجیب الرحمٰن شامی، ایڈیٹر قومی ڈائجسٹ پروفیسر خالد ہمایوں اور آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ لوگوں کے توسط سے مجھے اپنا نقطہ نظر اور اپنی زندگی کی چند یادیں، باتیں، ملاقاتیں اور تجربات و مشاہدات محفوظ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

میں 18 مئی 1953ء میں پیدا ہوا۔ ہم اندرون شہر سریاں والا بازار رنگ محل لاہور کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

رہنے والے ہیں۔ ہمارا تعلق واہلہ جٹ خاندان سے ہے۔ ہم دادا، پردادا اور والد صاحب کے زمانے سے ہی سریاں والا بازار کے رہائشی ہیں۔ یہ علاقہ محلّہ غازی علم دین شہید بھی کہلاتا ہے۔ غازی صاحب اور ہمارے بزرگ ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ ہماری فیملی کاروباری ہے اور ہم نے کبھی بھی ملازمت وغیرہ اختیار نہیں کی۔ ہم اپنے ہی کاروبار سے وابستہ ہیں۔ ہم تین بھائی ہیں۔ سب سے بڑے بھائی چودھری محمد ادریس، ان کے بعد میں ہوں اور مجھ سے چھوٹے بھائی چودھری محمد سعید ہیں۔ ہمارے متعلق برادری اور محلے میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے والدگرامی چوہدری سراج الدین ٹھیکے پر آئل مل چلاتے تھے۔ انہوں نے 1953ء سے اپنی یہ انڈسٹری چلانا شروع کی اور 1967ء میں یہ مل چلانا چھوڑ دی۔ والدگرامی 1969ء میں برین ہیمرج کی وجہ سے اچانک انتقال کر گئے۔ میں نے **ہیلے** کالج سے بی کام کیا۔ جب 16 برس کا تھا تو کالج میں آتے ہی اسلامی جمعیت طلبہ میں آ گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے اسلامی سوشلزم، نیشنلائزیشن وغیرہ جیسے کاموں سے مجھے شروع سے ہی اختلاف تھا۔ اسی دور میں اسلامی جمعیت طلبہ کے اعلیٰ عہدیداروں سے میرا تعارف ہوا۔ یہ لوگ پھر بعد میں بڑے سیاسی لیڈر بنے۔ جب میں ایم اے او کالج میں زیر تعلیم تھا تو میں نے حفیظ خان کی قیادت **ہیلے** کالج کی طرف سے جلوس جاتے دیکھا تو میں بھی اس میں شامل ہو گیا۔ ہیلے کالج میں اس دور میں جاوید ہاشمی صاحب نے سٹوڈنٹ یونین کا الیکشن لڑا۔ میں اس وقت **ہیلے** کالج میں جمعیت کا بڑا ایکٹو لیڈر تھا۔ یہیں سے میرے اور جاوید ہاشمی کے تعلقات بنے۔ اس سے اگلے برس کے الیکشن میں فرید پراچہ نے الیکشن لڑا۔ میں نے بطور ایگزیکٹو ممبر یونین کا الیکشن لڑا۔ فرید پراچہ اس الیکشن میں صدر بنے اور الخدمت فاؤنڈیشن کے سربراہ عبدالشکور صاحب جنرل سیکرٹری بن گئے۔ اس کے بعد پھر لیاقت بلوچ، احسان اللہ وقاص آ گئے تو ان کے ساتھ تعلق بن گیا۔

میں نے 1977ء میں قومی اتحاد کی اینٹی بھٹو تحریک میں لاٹھیاں بھی کھائی۔ اس وقت ہم نوجوان تھے اور پھرتیلے تھے، ہم گرفتاری سے تو بچ گئے لیکن جلوسوں میں لاٹھیاں کھاتے رہے۔ ہم نے شادباغ میں مصطفیٰ کھر کا جلسہ بھی دیکھا، وہ اس وقت بھٹو کے مخالف تھے۔ اس باغ کے چاروں طرف سے گھر تھے، پولیس نے ہر طرف سے لاٹھی چارج کیا۔ اس وقت ہم اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ رہ کر جلسوں، جلوسوں کی مکمل ٹریننگ حاصل کر چکے ہیں۔ جب یہاں پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا تو میں نے پولیس کے بیچ میں سے ہی گھس کر بچ نکلنے کی کوشش کی اور کامیاب ہو گیا۔ ایک گلی میں ایک گھر کے سامنے خاتون کھڑی تھی میں نے اس سے درخواست کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تو اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا اور میں گھر میں چھپ گیا۔اس موقع پر چند لوگ مارے بھی گئے تھے۔سٹوڈنٹ لائف میں ہم شرارتیں بھی کرتے تھے لیکن میری شرارتیں ہلکی پھلکی ہوتیں اور ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ہمارے ایک دوست کے والد ہوم سیکرٹری پنجاب تھے۔ وہ دوست اس وقت فیٹ گاڑی پر آتے، اس گاڑی کو ''صابن دانی'' کہا جاتا تھا۔یہ ایک چھوٹی سی گاڑی ہوتی تھی اور اس کے کوئی خاص لاک وغیرہ بھی نہیں تھے۔ہم چند کلاس فیلوز اس دوست کی گاڑی کو ہیلے کالج کے اندر ہی چھپا دیتے اور جب تک وہ ہمیں جوس نہیں پلاتا تھا ہم اسے گاڑی واپس نہیں کرتے تھے۔ہم نے پہلے تو پانچ چھے مرتبہ ہیلے کالج کے اندر ہی گاڑی کو چھپایا۔اس کے بعد جب کالج میں گاڑی چھپانے کی جگہ نہیں رہی تو پھر ہم نے اس گاڑی کو لے جا کر چوبری چوک میں جہاں پی آئی اے جہاز کا ماڈل رکھا ہوا ہے وہاں چھپا دیا۔اس دوست کے والد مسافر بسیں بھی قسطوں پر فروخت کرتے تھے۔ایک مرتبہ کسی نے اپنی بس کی قسطیں ادا نہیں کیں تو ان کے والد نے اس بندے سے وہ بس واپس لے لی اور پھر اسی بس پر ہمارا یہ کلاس فیلو **ہیلے** کالج آیا۔ہم آٹھ دس دوست اس بس پر بیٹھے اور اولڈ کیمپس سے نیو کیمپس تک سواریاں اٹھا کر بس چلانے لگے۔ پھر ہم نے ان پیسوں سے لکشمی چوک جا کر کڑاہی گوشت کھایا اور خوب انجوائے کیا۔

کچھ شرارتیں ایسی بھی کیں جواب سوچتے ہیں کہ ہمیں نہیں کرنی چاہیے تھیں لیکن اگر دوبارہ موقع ملا تو اس سے بھی زیادہ شرارتیں کروں گا۔میرے نزدیک سٹوڈنٹس یونین اور طلبہ سیاست ضرور ہونی چاہیے کیونکہ سٹوڈنٹس پالیٹکس سے ہی لیڈر پیدا ہوتے ہیں۔ جتنے بھی لیڈر آپ کو نظر آتے ہیں یہ طلبہ سیاست کے ذریعے ہی آئے اور جو لوگ طلبہ سیاست کے ذریعے آگے نہیں آئے ان کے اندر کوئی قائدانہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔ لیڈر تو گراس روٹ لیول سے آتے ہیں۔شیخ رشید، پرویز رشید، ریاض فتیانہ، جاوید ہاشمی، بلال محبوب، لیاقت بلوچ، احسان اللہ وقاص، احسن رشید، فرید پراچہ اور دیگر ایسے بہت سے نام ہیں جو طلبہ سیاست کے ذریعے ہی آگے آئے۔ایسے بہت سے لیڈر کراچی، کوئٹہ، پشاور اور ملتان میں بھی ہیں۔ میں زمانہ طالب علمی میں جب 18 برس کا تھا مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے بہت متاثر ہوا۔ہم اس وقت ان کی عصر کی مجلس میں حاضر ہوتے اور بس انہیں دیکھتے رہتے۔ میری مولانا سے ون ٹو ون کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ہم جب بھی مجلس میں گئے چالیس پچاس لوگ بیٹھے ہوتے تھے اور ہم بھی جا کر مجلس میں شریک ہو جاتے۔ وہ ہمیں بہت پیار سے وعظ و نصیحت کرتے اور سمجھاتے۔اس کے بعد میں یونیورسٹی سے فارغ ہو کر کراچی اور پھر لندن چلا گیا۔ پھر انہی دنوں مولانا مودودیؒ صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرے بڑے بھائی نے ابھی فرسٹ ایئر میں داخلہ ہی لیا تھا کہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے خلاف تحریک شروع ہوگئی جس کے سبب تعلیمی ادارے بند تھے۔ میں نے ابھی میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ مارچ میں امتحان ہونا تھے جو اس ایجی ٹیشن کی وجہ سے مئی میں چلے گئے۔ مجھ سے چھوٹا بھائی نویں جماعت کا طالب علم تھا۔

ابھی میں بمشکل 16 سال کا تھا کہ والد صاحب کی وفات کے بعد زندگی کچھ مشکل ہوگئی لیکن وہ ہمارے لیے اتنا کچھ کر گئے تھے کہ ہمیں کسی مالی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ خواجہ عبدالحکیم صاحب ایک بڑی کاروباری شخصیت تھے اور والد صاحب کے دوست تھے یہ ہمارے سرپرست بن گئے۔ یہ بڑے بھائی کو اکبری منڈی لے گئے اور وہاں ہمارے والد کے قریبی دوست باؤ امان اللہ تھے، ان کی شاگردی میں بھائی کو بٹھا دیا۔ یہاں سے بھائی نے مارچ 1969ء سے کام شروع کیا۔ جب میں **ہیلے** کالج سے بی کام کر کے فارغ ہوا تو مجھے خواجہ عبدالحکیم صاحب نے کہا کہ آپ کراچی جانے کی تیاری کرو۔ خواجہ عارف صاحب (شان گھی والے) مجھ سے دو سال سینئر تھے۔ خواجہ عبدالحکیم صاحب نے مجھے ان کی سرپرستی میں کراچی بھیج دیا اور وہاں جا کر ہم دونوں نے کمیشن پر کاسٹک سوڈا وغیرہ کا کام شروع کر دیا۔ خواجہ عارف کو تو خواجہ عبدالحکیم صاحب نے ایک ماہ کے بعد واپس اپنے پاس لاہور بلا لیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے طور پر کمیشن کا کام کیا لیکن مجھے بطور کمیشن ایجنٹ یہ کام بالکل بھی پسند نہ آیا۔ چنانچہ میں نے صرف ایک ماہ یہ کام کیا اور لاہور واپس آ گیا۔ مجھ پر گھر سے کافی پریشر ڈالا گیا، میری والدہ محترمہ، تایا جان اور بھائیوں نے بہت اصرار کیا کہ آپ واپس نہ آؤ اور کام جاری رکھو۔ خیر، میں لاہور واپس آ گیا اور اگلے دن اکبری منڈی میں خواجہ عبدالحکیم کے پاس پہنچا تو مجھے کہنے لگے کہ یار تم کیوں واپس آئے ہو؟ میں نے کہا کہ میں کمیشن ایجنٹ کے طور پر کام نہیں کر سکتا، لوگوں کا رویہ مناسب نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں نے تو دونوں طرف سے کمیشن لینی ہے اور اگر کوئی پارٹی بروقت پیسے ادا نہیں کرتی تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟۔ خواجہ صاحب کہنے لگے کہ اگر کراچی میں آپ کو اپنا کاروبار کرنا پڑے تو پھر آپ چلے جاؤ گے؟ میں نے کہا کہ میں کمیشن پر تو ہرگز نہیں جاؤں گا لیکن اپنے کاروبار کے لیے چلا جاؤں گا۔ چنانچہ میں ایک ہفتہ بعد واپس کراچی پہنچ گیا۔ پھر میں نے یہاں ساڑھے تین سال کام کیا، جب ہماری کسی وجہ سے خواجہ عبدالحکیم صاحب کے ساتھ کاروباری شراکت ختم ہوگئی تو میں لاہور واپس آ گیا۔ لاہور میں کاروبار میرے بڑے بھائی چودھری ادریس کے حوالے تھا اور کراچی میں مَیں بزنس دیکھتا۔ لاہور واپس آ کر میں اپنے بھائی کے ساتھ کام میں شریک ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد میں مَیں انگلینڈ چلا گیا اور وہاں ڈیڑھ سال

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

رہا۔ میں نے کوشش کی کہ انگلینڈ میں اپنا کاروبار شروع کرسکوں لیکن وہاں میں سیٹل نہ ہوسکا اور پاکستان واپس آگیا۔ دراصل انگلینڈ جاکر مجھے علم ہوا کہ اپنا چھوٹا سا کاروبار شروع کرنے کے لیے بھی مجھے بہت زیادہ جدوجہد کرنا پڑے گی جبکہ پاکستان میں تو الحمداللہ ہمارا کاروبار چل رہا تھا۔ جتنی کوشش میں انگلینڈ میں کروں گا اتنی ہی اگر پاکستان میں اپنے چلتے کاروبار پر توجہ دوں تو میں زیادہ ترقی کرسکوں گا۔ پھر اللہ کے فضل سے ہماری کوششیں کامیاب ہوئیں۔ اللہ نے ہم بھائیوں کے کام میں برکت ڈالی اور ہمارا کاروبار تیزی سے پھیلتا گیا۔ خواجہ عبدالحکیم صاحب کے ساتھ 1979ء میں ہماری کاروباری شراکت ختم ہوئی تھی اور پھر ہم اپنے طور پر لگے رہے اور الحمداللہ 1989ء میں ہم نے اپنی پہلی گھی انڈسٹری ''سویرا بناسپتی'' لگالی۔ اس کے بعد ہمارا ایک ہی گول تھا کہ اللہ کرے ہم شوگر مل لگانے میں کامیاب ہوجائیں۔ پھر اللہ کے فضل سے ہم نے لاہور ہائی کورٹ کے ذریعے 2002ء میں ایک آکشن میں شوگر مل بھی حاصل کرلی۔ ہماری محنت جاری رہی اور اللہ کی عطا ہوتی رہی۔ اس کے بعد ہم نے 2012ء میں دوسری شوگر مل بھی خرید لی۔ اس کے بعد دوستوں کے مشورے سے ہم نے ایتھنول کا کارخانہ لگالیا۔ اللہ نے کرم کیا اور ہم نے جو بھی انڈسٹری لگائی وہ کامیابی سے چلتی رہی۔ پھر عمران خان صاحب کی حکومت آئی تو صنعتکاروں کو انڈسٹریز لگانے کے اچھے مواقع ملنے لگے تو ہم نے اپنی ایک سٹیل مل سمیت دو انڈسٹریز مزید لگالیں۔ اس وقت ہماری کل سات انڈسٹریز کام کررہی ہیں۔ ہمارے یہ صنعتیں پنجاب میں ہیں۔ ہماری گھی ملز موڑ ایمن آباد گوجرانوالہ۔ تین انڈسٹریز فیصل آباد میں چک جھمرہ کے پاس ہیں۔ دوسری شوگر مل اور سٹیل ملز اٹھارہ ہزاری ضلع جھنگ میں ہیں۔ ایک پلانٹ بھلوال میں بھی ہے۔ ہمارے صنعتوں میں پانچ ہزار سے زائد افراد کام کررہے ہیں۔ ہنزہ گروپ آف کمپنیز کا مشن اور مقصد یہ ہے کہ صارفین ہی ہماری اولین توجہ کے مستحق ہیں۔ ہمیں پختہ یقین ہے کہ ہماری اصل کامیابی قابل قدر صارفین کے اطمینان پر منحصر ہے۔ ہم مسلسل تکنیکی اور انتظامی جدت کے ذریعے بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ملکی ترقی کا راز انڈسٹریز کی ترقی میں ہے اور انڈسٹری کو چلانے کے لیے دو چیزیں انتہائی بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ انرجی اور بینک انٹرسٹ ریٹ۔ پاکستان میں انرجی بھی تمام ممالک سے مہنگی ترین ہے اور انٹرسٹ ریٹ بھی سب سے زیادہ ہے۔

کچھ ممالک میں چینی صرف چقندر سے بنائی جاتی ہے لیکن پاکستان میں صرف خیبر پختونخواہ میں دو شوگر ملیں ایسی ہیں جو چقندر سے چینی بناتی ہیں باقی سب ملوں میں گنے سے چینی بنتی ہے کیونکہ ہمارے ہاں چقندر کی فصل عام نہیں ہے۔ چقندر کی چینی کی مٹھاس گنے کی مٹھاس سے ذرا کم ہوتی ہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جہاں تک میری کامیابی کا تعلق ہے تو میرا یہ شروع دن سے اعتقاد ہے کہ کامیابی کا راز محنت میں ہے۔ یہاں میں آپ کو بتادوں کہ اللہ کریم جس کے مقدر میں کامیابی ڈال دیتے ہیں پھر اسی کے ذہن میں محنت اور مشقت کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے نہیں دینا وہ محنت سے بھی گھبراتا ہے۔ جس بندے میں اللہ تعالیٰ دو چیزیں ایمانداری اور محنت اکٹھی کر دیتے ہیں وہ بندہ کبھی پیچھے نہیں رہ سکتا۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں ایسا بندہ نہیں دیکھا جو ایمانداری اور محنت سے کام لے اور ناکام ہو گیا ہو۔ ہم نے اپنی کاروباری زندگی میں جو بھی ترقی کی ہے ہم نے کبھی قول اور فعل میں تضاد کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مارکیٹ میں الحمدللہ ہماری ایک اچھی ساکھ ہے۔ ہم نے کسی کے ساتھ ڈیل کر کے پھر اسے رول بیک نہیں کیا۔ اشیاء کی قیمتوں میں جتنا بھی فرق آجائے ہم اپنی ڈیل پر قائم رہتے ہیں۔ ہماری اسی ریپوٹیشن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہاں تک پہنچایا۔ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ ڈیل کے بعد جب قیمتوں میں فرق آتا ہے تو وہ اپنی ڈیل بھی کینسل کر دیتے ہیں۔ ہم ایک مرتبہ کسی کے ساتھ کوئی بات طے کر لیں تو پھر پیچھے نہیں ہٹتے۔

اصل میں مَیں زمانہ طالب علمی سے ہی اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہو گیا تھا اور وہ جو ہماری ایک دینی تربیت دی تھی اس نے آگے چل کر عملی زندگی میں ہماری بہت زیادہ رہنمائی کی۔ ہم نے جو بات سیکھی تھی کہ حق کی خاطر لڑنا ہے اور کوئی غلط کام نہیں کرنا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مجھے عمل کی توفیق بھی عطا فرمائی۔ کاروبار میں اصل چیز تو اعتماد اور اچھی ساکھ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا دیکھیں کہ جب 80ء کی دہائی میں لاہور میں ایک کنال کا پلاٹ لاکھ روپے یا شاید اس سے بھی کم کا ہوتا تھا اس وقت بھی لوگوں نے ہمیں ایک اور دو دو کروڑ روپے کا ادھار دیا، وجہ یہی تھی کہ مارکیٹ میں ہماری اچھا اعتماد قائم تھا۔ ہم بھائیوں کی پالیسی یہی تھی کہ تھوڑا نفع کما لو لیکن مارکیٹ میں اپنی ساکھ خراب نہ کرو اس چیز کا ہمیں بہت فائدہ ہوا۔ ہم کراچی سے دو تین دن کے ادھار پر مال خریدتے تھے۔ جب مال لوڈ ہو جاتا تھا تو ہم پے منٹ کرتے تھے۔ اس وقت بینکوں کی ٹی ٹی نہیں ملتی تھی اور پے منٹ پھنس جاتی تھی جس سے لوگ ناراض ہو جاتے۔ ہم ان سے کہتے تھے کہ آپ مال لوڈ کر کے ہمیں ٹی ٹی نمبر سینڈ کر دیں تا کہ ہم آپ کو پے منٹ کر دیں۔

(ٹی ٹی کا مطلب ہے ٹیلی گرافک ٹرانسفر یعنی لاہور بنک سے کراچی بنک رقم کی ادائیگی۔ یہ پرانے دور کی بات ہے۔ ہم پنجاب کے خریداروں کو مال بیچتے تھے اور فروخت کنندہ کو کہتے تھے کہ ایک دو دن بعد آپ کو رقم مل جائے گی، تب ٹیلی گرافک سروس اتنی بہتر نہیں تھی اس لئے رقم ملنے میں تاخیر ہو جاتی جس سے فروخت کنندہ ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ تب ہم نے یہ پالیسی بنائی کہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آپ مال لوڈ کروا دیں ہم آپ کو اگلے دن پنجاب سے ٹی ٹی نمبر لگوا دیں گے۔ مال لوڈ ہونے کے بعد ہم اگلے دن ٹی ٹی لگوا کر اُن کو ٹی ٹی کا نمبر دے دیتے۔ اب اگر ٹی ٹی ملنے میں تاخیر بھی ہو جاتی تو ہم بری الزمہ ہوتے۔ اس طرح ہمارا کاروبار بڑھتا گیا)۔

کراچی میں ایک جاوید صاحب تھے انہوں نے ہمیں کہا کہ آپ ہم سے مال خریدیں۔ میں نے کہا کہ ہم تو ادھار مال لیتے ہیں۔ ان کا تکیہ کلام تھا ''چن جی''۔ کہنے لگے چن جی ہم نے تو کسی کو آج تک گناہ بھی ادھار نہیں دیا آپ مال مانگتے ہیں۔ ہم نے کہا پھر ہم آپ کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ آخر انہوں نے بھی ہمارے ساتھ کام شروع کر دیا۔ یہ مثال دینے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کا اتنا فضل ہے کہ ہمیں کسی بھی موڑ پر کبھی دقت نہیں ہوئی اور مارکیٹ میں ہماری ایک ''گڈوِل'' بن گئی۔ جب میں ہیلے کالج میں کامرس کا طالب علم تھا تو وہاں میں سوچتا تھا کہ یہ ''گڈوِل'' کیا چیز ہوتی ہے۔ آخر پریکٹیکل لائف میں مجھے علم ہوا کہ ''گڈوِل'' کسے کہتے ہیں۔ اب میرا اتنا تجربہ ہو گیا ہے کہ آپ مجھے ابھی بھی دو تین موبائل فون دے دیں تو میں لاکھوں روپے ماہانہ کما سکتا ہوں۔ یہ بس اللہ کی عطا ہے۔ کاروبار میں جو چیز سب سے اہم ہے وہ یہی ہے کہ آپ کو ''گڈوِل'' کیسی بنانی ہے۔ یہ سادہ بات بہت کم لوگوں کو سمجھ میں آتی ہے کیونکہ آج کل ہر بندہ شارٹ کٹ کے چکر میں ہے کہ جلد از جلد پیسہ کس طرح آئے گا بھلے اس میں بے ایمانی اور فراڈ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہی چیز ہے جس نے من حیث القوم ہمیں تنزل تک پہنچایا ہے۔

جہاں تک مختلف سیاسی، فوجی ادوار اور انڈسٹری کی تعمیر و ترقی کا سوال ہے تو میں نے اپنی زندگی میں جو کچھ دیکھا ہے وہی بیان کر سکتا ہوں۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کا دور ہم نے تھوڑا بہت دیکھا ہے اور کتابوں میں پڑھا ہے۔ ایوب خان کے دور میں ہم دسویں جماعت تک پہنچ گئے تھے اور کچھ شعور آ گیا تھا۔ ابھی تک تو ہمیں یہی سمجھ آیا ہے کہ وہ دور بہت اچھا تھا، انڈسٹری لگ رہی تھی۔ ایوب خان نے اپنے دور میں انڈسٹریز پر بہت توجہ دی۔ ان کے دور میں بس ایک خامی یہ تھی کہ پرمٹ سسٹم تھا اور وہ اس کے تحت اپنے لوگوں اور عزیز و اقارب کو نوازتے رہے۔ دراصل یہ جو اقربا پروری ہے یہ بیماری پاکستان بنتے ہی ہمارے اندر سرایت کر گئی تھی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ایوب خان کا دور اچھا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ ہم صنعتی ترقی کے حوالے سے اس وقت مریخ کی طرف جا رہے تھے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ انگریزوں نے 1964ء میں ہی سوچ لیا تھا کہ پاکستان کو اس حوالے سے آگے بالکل نہیں جانے دینا اور اس کا راستہ روکنا ہے۔ انہوں نے پاکستان کی تعمیر روکنے کے لیے 1965ء میں پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ کروائی اور پھر اسلامی سوشلزم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے نام پر ذوالفقار علی بھٹو جیسے شخص کو پیدا کیا گیا۔ بھٹو نے انڈسٹری کو نیشنلائیز کر کے اس کو بالکل زیر و کر دیا اور تباہ کر دیا۔ یہ سب مغرب کی سازش تھی کہ پاکستان کو آگے نہیں جانے دینا۔ آپ اندازہ کریں کہ بھٹو دور سے پہلے ساؤتھ ایشیاء میں سب سے بڑی شپنگ کمپنی پاکستان کی تھی۔ حبیب بنک نے 62ء میں کراچی میں 25 منزلہ بلڈنگ کھڑی کر دی۔ اس دور میں ساؤتھ ایشیاء کی یہ سب سے بڑی عمارت تھی۔ ہماری ساری انڈسٹریز کامیابی کی طرف گامزن تھیں۔ اس دور میں تو ہمارے پاس لیبر کی بھی کمی پڑ گئی تھی اور ایوب خان نے پاسپورٹ بنوانے پر پابندی لگا دی تھی کہ پاکستانی لیبر باہر نہ جائے کیونکہ یہ ہماری اپنی ضرورت ہے۔ 1962ء میں پہلی مرتبہ جرمنی نے ہم سے آفیشلی طور پر لیبر کی ڈیمانڈ کی تھی۔ پاکستان نے کہا کہ یہ ہماری اپنی ضرورت ہے۔ اس کے بعد جرمنی نے ترکی سے یہی ڈیمانڈ کی تو ترکی نے اسے لیبر فراہم کر دی۔ اس وقت انڈسٹری اور لیبر کی یہ صورتحال تھی۔ اس کے بعد تو بھٹو صاحب نے آتے ہی صنعتوں کو اپنے ہدف پر رکھ لیا۔ میں کوئی پیدائشی صنعت کار نہیں ہوں۔ میں تو 1967ء سے بھٹو کا مخالف ہوں جب میری کوئی انڈسٹری نہیں تھی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ میں صنعت کار ہوں اور اس لیے بھٹو کی مخالفت کرتا ہوں۔ میں جب 14 برس کا تھا اس وقت بھی بھٹو کا اس لیے مخالف تھا کہ انہوں نے صنعتوں کا بیڑہ غرق کر کے دراصل ملکی معیشت کا راستہ روکا ہے۔ جتنے بھی ممالک نے ترقی کی ہے سب انڈسٹری کی وجہ سے ہی آگے بڑھے ہیں۔ ہمارے ہاں تو صنعت کار کو گالی دی جاتی ہے۔

1962ء میں چین کے وائس پرائم منسٹر چون این لائی پاکستان کے دورہ پر آئے تو انہوں نے بٹالہ انجینئرنگ کمپنی (BECO) کا دورہ کیا اور اس موقع پر انہوں نے اپنے ہاتھ سے بک پر لکھا کہ میں کمپنی کے مالک سی ایم لطیف سے کہوں گا کہ بیکو کمپنی چین کے لوگوں کو بھی فنی تربیت فراہم کرے۔ آپ حساب لگائیں کہ ہم اس وقت چین سے بھی آگے تھے۔ یہاں آپ کو ایک اور بات بتا دوں کہ جب چون این لائی BECO کے دورے پر آئے اس وقت یہ کمپنی 50 فیصد بھی نہیں بنی تھی اور اس کا کام جاری تھا۔ اس وقت یہ بادامی باغ لاہور میں واقع تھی۔ یہ بعد میں کوٹ لکھپت لاہور میں شفٹ ہوئی۔ بھٹو نے بٹالہ انجینئرنگ کمپنی (BECO) کو نیشنلائیز کیا اور اس کا نام پاکستان انجینئرنگ کمپنی (PECO) رکھ دیا۔ اس کے بعد جو تباہی ہوئی وہ پوری قوم کے سامنے ہے۔ میں تو بھٹو کو اس فعل پر کبھی بھی معاف نہیں کر سکتا۔ ان کے اس انتہائی غلط فیصلے کا خمیازہ آج تک پوری قوم بھگت رہی ہے۔ اس کے بعد آج تک یہ شعبہ نہیں سنبھل سکا۔ اس کے بعد 80ء کی دہائی میں یہ سوچا گیا تھا کہ پاکستان میں انویسٹمنٹ لائی جائے۔ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے کہا کہ ہم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ملک میں انویسٹمنٹ لے کر آئیں گے لیکن اس کے ساتھ ہی امریکی ایمبیسڈر نے پریس میں یہ کہہ دیا کہ یہاں پر انویسٹمنٹ کیسے آئے گی؟ یہاں تو آپ کی بیوروکریسی انویسٹرز سے پیسے مانگتی ہے۔اس طرح ہم نے کرپشن کی وجہ سے یہاں پر انویسٹمنٹ نہیں آنے دی۔اس وقت ملکی حالات بہتر تھے۔لیبر سستی تھی،اس کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا اور اہم بات یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو کو ذوالفقار علی بھٹو کے غلط فیصلے کا ادراک بھی تھا،اس لیے انہوں نے کوشش کی کہ انڈسٹری کو تحفظ فراہم کیا جائے اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا کیا جائے۔بے نظیر بھٹو زیڈ اے بھٹو کا لگایا گیا یہ داغ دھونا چاہتی تھیں لیکن ہم نے پیسے مانگ کر انویسٹرز کو خود ہی یہاں سے بھگا دیا۔اب دیکھیں کہ چین کی جو ترقی ہے وہ بھی 90ء کی دہائی میں شروع ہوئی۔اس نے 70ء کی دہائی میں امپروو کرنا شروع کیا اور پھر 90ء کی دہائی میں انہیں ثمرات ملنا شروع ہو گئے۔اسی طرح انڈیا میں بھی 90ء کی دہائی میں ترقی کا سفر شروع ہوا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم نے رشوت مانگ مانگ کر انویسٹرز کو یہاں سے بھگا دیا تو پھر انہوں نے چین اور بھارت کا رخ کیا اور وہاں جا کر انویسٹمنٹ کی اور انڈسٹری لگائی۔ہم لوگ چین کی مثالیں تو دیتے ہیں لیکن وہاں جا کر تو دیکھیں کہ وہاں اصل ترقی کی وجہ ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں البتہ یہ ہوا کہ ان کمپنیوں کو دیکھ کر چین کے لوگ خود آگے بڑھے،انہوں نے ہمت کی اور''ٹیک اوور'' کرتے ہوئے معاشی ترقی کی باگ ڈور سنبھال لی۔چین نے ملٹی نیشنل کمپنیوں کو کاپی کیا اور سے بہت کچھ سیکھا اور پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔

پاکستان کی حالت دیکھیں کہ ایک مرتبہ فائزر کمپنی کے لوگ ملک کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے ملے اور انڈسٹری لگانے کے لیے بات چیت کی۔اس کے بعد فائزر کمپنی کے پاکستان میں موجود نمائندے کو بلایا گیا اور اسے کہا گیا کہ آپ یہاں انویسٹمنٹ کریں لیکن ہمیں یہ بتائیں کہ اس میں ہمارا حصہ کتنا ہوگا۔جب اس کمپنی سے براہ راست رشوت طلب کی گئی تو یہ کمپنی یہاں سے انڈیا چلی گئی اور اس نے وہاں جا کر کام شروع کر دیا۔2017ء میں اس کمپنی نے سات بلین ڈالرز کی ایکسپورٹ کی تھی ۔آج میرے خیال سے یہ کمپنی 25 یا 30 بلین تک پہنچ چکی ہوگی۔جو ہماری ایکسپورٹ بڑھنی تھی وہ انڈیا کے حصے میں آئی اور اسے فائدہ ہوا۔اسی طرح ہم نے 1982ء میں سوزوکی کار کی فیکٹری لگائی۔جب کنٹریکٹ سائن ہوتا ہے تو یہ پانچ سال کے لیے ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں یہ انڈسٹری 100 فیصد یہاں پر لگائی جائے گی اور سارا کام یہاں پر ہوگا۔آج اس انڈسٹری کو لگے 42 سال ہو گئے ہیں اور ابھی تک وہ 70 فیصد تک ہی پہنچ سکی ہے۔ہنڈا اور کورولا 1987ء اور 88ء میں لگی تھیں اور ابھی تک وہ 30 فیصد سے آگے نہیں بڑھیں جبکہ کنٹریکٹ تھا کہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پانچ سال کے اندر یہ 100 فیصد یہاں پر تیار ہوں گی۔ہم لوگ انڈیا کی مثالیں تو دیتے ہیں لیکن اس طرح کام نہیں کر سکتے۔یہی سوزوکی کار جب انڈیا میں آئی تو اس نے دو تین سال کے اندر ہی 100 فیصد پروڈکشن دینا شروع کر دی۔جو کام انڈیا نے تین سال میں کر دیا ہم سے 42 سال میں نہیں ہو سکا۔

ہمارے ملک کے معاشی طور پر پیچھے رہنے کی وجہ یہی ہے کہ ہم محنتی نہیں اور اپنے ملک کے ساتھ مخلص نہیں ۔ یہی سوزوکی کمپنی پاکستان میں جو گاڑی تیار کر رہی ہے۔اگر وہ یہاں پر ایک 30 ہزار ڈالر کی فروخت کر رہی ہے تو یہی گاڑی انڈیا میں 15 ہزار ڈالر کی فروخت کر رہی ہے۔ایک ہی کمپنی ہے لیکن قیمتوں کا اتنا زیادہ فرق ہے،اس کے علاوہ جو پروڈکشن انڈیا میں ہو رہی ہے اس کا معیار پاکستانی گاڑیوں سے بہت بہتر ہے۔ان کی ہنڈا کورولا ہماری ہنڈا کورولا سے بہت زیادہ بہتر ہے اور سستی بھی۔قیمتوں میں پچاس فیصد کا فرق ہے۔دراصل اس ملک میں کوئی بھی کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔کوئی کسی سے پوچھنے والا نہیں ہے، یہاں تو جنگل کا قانون نافذ ہے۔انڈیا ہنڈا کرولا سے جو کاریں ایک بلین ڈالرز میں خرید لیتا ہے ہم وہی کاریں دو بلین میں خریدتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ ابھی تک ہم یہاں پر گاڑیوں کی 100 فیصد تیاری میں ناکام ہیں جبکہ انڈیا میں گاڑیاں سو فیصد تیار ہو رہی ہیں۔پرزہ جات بن رہے ہیں۔انڈیا آٹوموبائل انڈسٹری میں بہت آگے جا رہا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اسی طریقہ سے ''بائی ڈیزائن'' بیوروکریسی اور سیاستدان ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔کرپشن میں صرف بیوروکریسی ہی ملوث نہیں ہے بلکہ اس میں سیاستدان بھی پوری طرح شریک ہیں۔ایک اعلیٰ عہدیدار ہی تو تھا جس نے فائزر کمپنی سے پیسے مانگے تھے۔میں نام نہیں لینا چاہتا میں ایسے وزیروں کو جانتا ہوں جنہوں نے مختلف کمپنیوں سے پیسے مانگے۔جب آپ انویسٹرز کو اس طرح خوف زدہ کریں گے،وہ یہاں نہیں آئے گا اور ہائی ٹیک انڈسٹری نہیں لگے گی تو ملک کیسے ترقی کرے گا؟۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ کے طارق حسن صاحب ہیں وہ 2004ء میں پاکستان میں کمپیوٹر کا پلانٹ لگانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ان کی ایک اعلیٰ حکومتی رکن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ میں یہاں پر تین سو ملین ڈالرز کی انویسٹمنٹ کرنا چاہتا ہوں۔اس پر وزیر صاحب نے کہا کہ اس میں پانچ فیصد ہمارا کمیشن بھی ہوگا۔طارق حسن واپس چلے گئے۔انہوں نے کہا کہ میں تو اپنے ملک کی خدمت کرنے کے لیے آیا تھا لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔آپ دیکھیں کہ ابھی تک ہم کمپیوٹر امپورٹ کرتے ہیں،اگر یہاں پلانٹ لگ جاتا تو ہم ایکسپورٹ کر رہے ہوتے اور امپورٹ بند ہو چکی ہوتی۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

افسوس کی بات ہے کہ جمہوری حکومت ہو یا فوجی اس طرف کوئی بھی نہیں سوچتا کہ صنعتی ترقی کے بغیر ملک آگے نہیں جا سکتا۔ فوجی حکومتیں آتی رہیں اور ایک ڈر خوف قائم کر کے کچھ کرنے کی کوششیں کرتی رہی ہیں لیکن اب تو ان کا ڈر بھی ختم ہو چکا ہے۔ آپ پاکستان کے کسی بھی ادارے میں جا کر اپنا جائز کام کروا کر دکھا دیں۔ رشوت کے بغیر یہاں کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ آج تک کرپشن میں کتنے لوگوں کو سزائیں ہوئی ہیں؟۔ ملک کی بہتری کے لیے دو تین چیزیں بہت ضروری ہیں ایک تو اہل اور ایماندار لوگوں کو سیٹوں پر بٹھایا جائے دوسرا کرپشن پر کسی کو بھی ہرگز معافی نہیں ملنی چاہیے۔ یہ نہیں ہے کہ کرپٹ اہلکار کی چند ماہ کی تنخواہ ضبط کر لی یا اس کی ترقی روک دی گئی یا پھر اسے کسی دوسری جگہ پر ٹرانسفر کر دیا جائے، یہ کرپشن کا حل نہیں ہے۔ جب تک ہم کرپشن کو جڑ سے نہیں اکھاڑیں گے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

روس میں ایک بڑا بیوروکریٹ تھا جیسے ہمارے ہاں کوئی 21ویں یا22ویں گریڈ کے افسر ہوتے ہیں۔ وہ ریٹائر ہو کر امریکہ چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے سیاسی پناہ لے لی۔ دو تین سال کے بعد ایک صحافی جس کا تعلق سی این این یا فنانشل ٹائمز کے ساتھ تھا اس کے پاس انٹرویو کے لیے پہنچا۔ صحافی نے کہا کہ میں ان دو تین سالوں میں آپ کو واچ کر رہا ہوں، میں نے آپ کو بہت سٹڈی کیا ہے کہ جب آپ روس میں تھے تو آپ مجھے کسی بڑے عہدے پر نظر نہیں آئے کہ آپ نے امریکہ کی کوئی اتنی بڑی ہیلپ کی ہو کہ اس نے آپ کو پولیٹیکل Asylum بھی دے دیا، گھر بھی دیا اور پیسے بھی دے دیئے۔ آخر آپ نے روس میں رہ کر امریکہ کے لیے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں جس پوسٹ پر کام کرتا تھا میری ذمہ داری تھی کہ میں مختلف افسروں کے تبادلے اور تعیناتیاں وغیرہ کرتا۔ امریکہ نے میری یہ ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی کہ اہم پوسٹوں پر آپ نے نااہل اور نکمے لوگوں کو بٹھانا ہے اور باصلاحیت لوگوں کو کھڈے لائن لگانا ہے یعنی انہیں غیر اہم سیٹوں پر تعینات کرنا ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ پاکستان میں بھی اس وقت یہی کچھ ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ کی جو پالیسی جو روس کے لیے تھی وہی پاکستان کے لیے ہے کہ یہاں حکمران بھی نااہل لوگوں کو بنایا جاتا ہے اور بیوروکریسی میں بھی بڑی پوسٹوں پر نکمے لوگوں کو تعینات کیا جاتا ہے۔

آپ اندازہ کریں کہ کوریا اور ملائیشیا وغیرہ مختلف منصوبوں کا خاکہ ہم سے لے کر گئے۔ اس وقت آپ دیکھیں کہ یہ کہاں سے کہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان مسلسل تنزلی کی جانب گامزن ہے اور ابھی تک ہم بھٹو کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ بھٹو جس کے دور میں پاکستان کی تعمیر، ترقی اور خوشحالی کا راستہ روکنے کے لیے سازشوں کا آغاز ہوا۔ یہ کام بھی بھٹو کے دور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے شروع ہوا کہ انڈسٹریز اور انڈسٹریلسٹ کو گالیاں دینا ایک فیشن بنا۔ کبھی ہمیں شوگر مافیا، آئل مافیا، سیمنٹ مافیا، میڈیسن مافیا اور پتہ نہیں کن کن منفی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ ٹی وی چینلز پر بیٹھے ہوئے ''سوکالڈ دانش ور'' صنعتوں کے خلاف مسلسل غلط بیان بازی اور تبصرے کرتے رہتے ہیں حالانکہ انہیں اس فیلڈ کا کچھ بھی علم نہیں۔ اگر یہ لوگ حقیقت میں دانش ور اور تعلیم یافتہ ہوتے تو کبھی انڈسٹری کے خلاف منفی پروپیگنڈہ نہ کرتے۔ ان لوگوں کو اکنامکس کی قطعی کوئی سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ یہ ایم اے جرنلزم یا پولیٹیکل سائنس پڑھ کر آتے ہیں اور اکنامکس پر بات کرتے ہیں۔ انہیں زیرو فیصد بھی نہیں پتہ کہ اکنامکس کیا چیز ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ لوگ عدلیہ، فوج اور اداروں کو بھی اپنے پریشر میں لے آتے ہیں اور اس بیانیہ کو مضبوط کیا جاتا ہے کہ صنعت کار چور ہیں، حالانکہ یہ سراسر ظلم ہے۔ صنعت کار چور نہیں ہے بھائی! یہ تو ملکی ترقی کا پہیہ رواں دواں رکھنے کے لیے دن رات محنت اور مشقت کرتا ہے اور اپنا سرمایہ خرچ کرتا ہے۔ ہمارے بھی بے شمار مسائل ہیں لیکن ٹی وی چینلوں پر ہمارے مسائل اور انڈسٹریز کو درپیش مشکلات کو ڈسکس نہیں کیا جاتا بلکہ ہمارے مسائل بڑھانے کے لیے تبصرے تجزیے کیے جاتے ہیں۔

اگر انڈسٹری کے مختلف ادوار کو دیکھا جائے تو ذوالفقار علی بھٹو کے بعد صنعت کے لیے اچھا دور جنرل ضیاء الحق کا تھا۔ جنرل ضیاء نے نئی صنعتوں کے قیام کے لیے اقدامات کیے۔ ان کی نیت ٹھیک تھی لیکن اس وقت ابھی صنعتوں کی نئی نئی نیشنلائزیشن ہوئی تھی تو اس وجہ سے بزنس مین اور انویسٹر ڈرا ہوا تھا۔ دوسری طرف جب جنرل ضیاء الحق نے انڈسٹری کے لیے قرضے دینا شروع کیے تو ایسے لوگوں نے قرضے لینے شروع کر دیئے جن کا انڈسٹری کے ساتھ دور سے بھی واسطہ نہ تھا۔ میں نام تو کسی کا نہیں لوں گا لیکن بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے انڈسٹری کے لیے قرضے لیے۔ ایک صاحب ایسے بھی تھے جن کا کڑاہی گوشت کا ہوٹل تھا انہوں نے سپننگ ملز لگانے کا کہہ کر قرض لے لیا۔ اسی طرح کوئی جج کا بھائی تھا اور کوئی سیاستدان تھا، کوئی بڑے افسر کا بھائی تھا اور کوئی کسی جنرل کا بھائی یا بیٹا، ان سب نے قرضے لیے، حالانکہ ان لوگوں کا کاروبار یا انڈسٹری کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ قرضے کی صورت ایسی تھی کہ مثال کے طور پر گورنمنٹ سے 100 روپے وصول کیے تو انڈسٹری 70 روپے کی لگائی اور تیس روپے گھر لے گئے۔ جنرل ضیاء الحق کے ان قرضوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ستر یا 80 فیصد انڈسٹریز بینک کرپٹ ہو گئیں کیونکہ نہ تو لوگوں کو انڈسٹری کا تجربہ تھا اور نہ ہی اسے چلانے کی ان کی نیت تھی۔ جن لوگوں نے کبھی ایک لاکھ روپے کا کاروبار نہیں کیا تھا انہوں نے کروڑوں روپے قرض لیا۔ جنرل ضیاء الحق کی اچھی نیت کو لوگوں نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

غلط استعمال کیا۔ ایسے لوگوں نے قرض حاصل کر کے اپنی جیبیں بھر لیں جو انڈسٹریلسٹ نہیں تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنرل ضیاء نے تعمیری جذبے کے تحت یہ کام کیا تھا لیکن قرضوں کے حوالے سے تو ساری چھان بین بیوروکریسی نے کرنی تھی اور بینکوں نے معاملات دیکھنے تھے، یہیں سے خرابی پیدا ہوئی اور غلط لوگ قرض لے گئے۔ جنرل ضیاء الحق کے بعد بھی بہت سی حکومتیں آئیں لیکن میں نے بزنس کے حوالے سے جو فرینڈلی حکومتیں دیکھی ہیں ان میں پیپلز پارٹی کی حکومت بھی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیپلز پارٹی کو نیشلائزیشن کا ایسا دھچکا لگا ہوا تھا کہ وہ یہ داغ دھونا چاہتی تھی؛ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ بے نظیر بھٹو نے بہتر اقدامات کیے تھے۔ یا یہ کہہ لیں کہ پیپلز پارٹی نے بزنس مینوں کا ووٹ اور سپورٹ حاصل کرنے کے لیے سازگار مواقع پیدا کرنا شروع کیے۔

دراصل ہمارے ملک میں سیاسی مخالفت کو ہی پروان چڑھایا جاتا ہے اور اصل مسائل کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ اب یہی دیکھیں کہ جب پیپلز پارٹی کی حکومت تھی تو آئی جے آئی نے سیلز ٹیکس نہیں لگنے دیا لیکن جب آئی جے آئی خود اقتدار میں آئی تو اس نے سیلز ٹیکس بھی نافذ کر دیا۔ پاکستان میں انڈسٹری پر جتنے بھی ٹیکس لگے ہیں وہ آئی جے آئی یا مسلم لیگ ن کی حکومت میں لگے ہیں، پیپلز پارٹی کی حکومت نے بزنس پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا۔ یہاں پر میں سمجھتا ہوں کہ سیاسی جماعتوں کی آپس کی کھینچا تانی اور اقتدار کی رسہ کشی نے ملک کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ یہ المیہ ہے کہ ہر دور میں کوئی بھی اپوزیشن حزب اقتدار کو کسی اقدام پر روکتی ہے تو دوسری جانب جب وہ خود حکومت میں آتی ہے تو وہی کام کر دیتی ہے۔ اس کا بھیانک نتیجہ یہ نکلا کہ اپوزیشن جماعتوں نے حکومتوں کو اچھے کام بھی نہیں کرنے دیے جس سے ملکی ترقی کا پہیہ رک گیا۔

جب نواز شریف کا دور آیا تو اس نے کاروباری طبقے کو سہولتیں بھی دیں لیکن اس نے تنگ بھی زیادہ کیا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ کاروباری طبقے کو سب سے زیادہ سہولتیں زیڈ اے بھٹو کا دور نکال کر پیپلز پارٹی کی حکومتوں نے دیں اور پھر جنرل مشرف نے بھی اچھے اقدامات کیے۔ جنرل پرویز مشرف نے آسان قرضے فراہم کر کے انڈسٹری لگوائی اور پھر عمران خان کی حکومت نے بھی انڈسٹری پر اچھی توجہ دی اور خاطر خواہ اقدامات کیے۔ نئی صنعتوں کا قیام عمل میں آیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ پاکستان میں جو کاروباری اور معاشی ماحول بن چکا ہے یہاں باہر سے کوئی انویسٹر نہیں آئے گا اور یہاں کا مقامی انویسٹر بھی آہستہ آہستہ اپنا سرمایہ نکال کر باہر منتقل کر رہا ہے۔ ہم نے 1988ء میں بے نظیر کے دور میں پہلی گھی انڈسٹری لگائی۔ 2002ء میں ہم نے شوگر مل خریدی تو یہ جنرل پرویز مشرف کا دور تھا۔ جب 2013ء میں ہم نے دوسری شوگر مل خریدی تو اس وقت پنجاب میں نواز

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لیگ اور وفاق میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ اسی طرح مزید انڈسٹریز ہم نے نواز شریف کے دور میں 2016ء اور عمران خان کے دور میں 2019ء میں لگائیں۔ ہم نے جب حال میں دو نئی انڈسٹریز لگائیں تو دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ مزید انویسٹمنٹ نہ کریں۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری غلطی تھی۔ اب ہم یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن نکل نہیں سکتے کیونکہ ہم بہت پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر میرے بس کی بات ہو تو میں یہ ساری انڈسٹری بند کر دوں اور باہر کسی ملک میں شفٹ ہو جاؤں۔ ہمارے صنعتوں کے ساتھ پانچ ہزار سے زائد افراد کام کرتے ہیں اور اتنا بڑا اسیٹ اپ ہے کہ اسے وائنڈ اپ نہیں کر سکتے۔ شاید میں احساس کمتری میں چلا گیا ہوں یا پھر ڈپریشن میں ہوں کہ میرا تو اب نقطہ نظر یہی ہے کہ یہاں صنعتوں کے حوالے سے حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔ مجھے تو اس حوالے سے بہتری کی ایک فیصد امید بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جب تک حکمران طبقے اور بیوروکریسی کی سوچ نہیں بدلتی حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔ جب تک انڈسٹریلسٹ کو تحفظ نہیں دیا جاتا صنعت کا پہیہ نہیں چل سکتا۔ یہاں تو جو بھی صنعت کار نئی انڈسٹری لگانے لگتا ہے یا پھر کچھ ترقی کرنے لگتا ہے تو اس کا راستہ روکا جاتا ہے اور اسے مافیا کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ٹیکسز بڑھا دیے جاتے ہیں، جو لوگ ٹیکس نیٹ سے باہر ہوتے ہیں ان کی موجیں لگی ہوتی ہیں جبکہ صنعت کار مارا جاتا ہے۔

اب یہی دیکھیں کہ ہمیں شوگر مافیا کہہ کر اتنی بڑی سیاسی بات بنا دی گئی ہے کہ ہمیں اس سے چھٹکارا نہیں مل رہا۔ ہم بچپن میں ابتدائی کتابوں میں پڑھتے تھے کہ پاکستان میں چار بڑی فصلیں ہیں۔ گنا، گندم، کپاس اور چاول۔ چاول کو بھی انہوں نے مکمل چھوٹ دے دی ہے۔ جتنا اور جس ریٹ پر بھی فروخت ہو کسی کو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ کپاس کو بھی اوپن کر دیا گیا ہے کہ امپورٹ کرو یا ایکسپورٹ کرو، جو مرضی کرو۔ اب دو چیزیں تھیں گنا اور گندم۔ یہ پہلا سال ہے کہ پنجاب حکومت نے سپورٹ پرائس پر گندم نہیں خریدی۔ لیکن جہاں تک گنے کی بات ہے تو ملیں گنا خرید کر چینی بناتی تھیں اور ملوں کے لیے یہ قانون تھا کہ پندرہ دن کے اندر پے منٹ کرنی ہے۔ سو فیصد چینی گورنمنٹ خریدتی تھی۔ گورنمنٹ ہمیں سات دن کے اندر پے منٹ کرتی تھی اور اگلے ہفتے ہم آگے پے منٹ کر دیتے تھے۔ اب گورنمنٹ نے گزشتہ 35 سال سے چینی خریدنی بند کر دی ہے۔ دنیا میں مجھے کہیں بھی دکھا دیں کہ میں گنا ضرور خریدوں اور پندرہ دن کے اندر پے منٹ کر دوں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ صنعت کار کی مرضی ہے کہ وہ ایک دن میں پے منٹ کرے یا اس سے زیادہ دن میں، یا پھر کسان کو ایڈوانس دے۔ جو بھی کاشتکار کے ساتھ طے ہو جائے کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ پوری دنیا میں بزنس ایسے ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی کاروبار کے حوالے سے اتنی سختی نہیں ہے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جتنی شوگر انڈسٹری پر ہے۔ آپ اس بات کے پابند ہیں کہ آپ نے آخری سٹک تک گنا کریش کرنا ہے۔ اگر کھیت میں کوئی گنا باقی رہ گیا اور مل بند ہو جائے تو میرے خلاف ایف آئی آر کٹے گی اور میں جیل میں جاوں گا۔ اگر میں پندرہ دن کے اندر پے منٹ نہیں کروں گا تو جیل میں چلا جاؤں گا۔ ہم پر اتنی سختی کیوں ہے، کیا ہم پیسے چھاپ رہے ہیں کہ اس طرح سے پے منٹ کرتے جائیں۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ اور جب چینی فالتو بن جاتی ہے تو پھر ہماری گورنمنٹ ہمیں ایکسپورٹ نہیں کرنی دیتی اور وہ گوداموں میں پڑی رہتی ہے۔ اگر ہم ایکسپورٹ کریں گے تو پھر ہی ہمارے پاس پیسے آئیں گے اور ہم آگے لوگوں کو پے منٹ کریں گے۔ اگر چینی اسی طرح گوداموں میں پڑی رہے گی تو انڈر ریٹ فروخت ہو گی جس سے انڈسٹری کو نقصان ہوتا ہے۔ گزشتہ 22 سال میں 22 شوگر ملیں فروخت ہو چکی ہیں۔ اس وقت شوگر انڈسٹری تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے لیکن ہم ٹی وی دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ شوگر ملوں والے اربوں اور کھربوں روپے کما گئے ہیں۔ اس حوالے سے بہت زیادہ جھوٹ بولا جا رہا ہے اور میڈیا کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس وقت بھی پانچ ملیں برائے فروخت ہیں جبکہ کئی سالوں سے دو شوگر ملیں بند پڑی ہیں۔ اگر اس کام میں اتنا زیادہ پرافٹ ہے اور ہم اربوں کھربوں کما رہے ہیں تو پھر لوگوں نے اپنی ملیں کیوں بند کر رکھی ہیں اور کیوں اپنی انڈسٹری فروخت کر رہے ہیں؟۔

کہا جاتا ہے کہ چینی غائب ہو جاتی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے، چینی کہیں غائب نہیں ہوتی۔ اب ہم جنوری کے مہینے سے کہہ رہے ہیں کہ ہمیں چینی ایکسپورٹ کرنے دیں کیونکہ اس وقت گوداموں میں 15 لاکھ ٹن سے زائد چینی پڑی ہے اور اس بات کو حکومت بھی تسلیم کرتی ہے۔ پھر بھی ایکسپورٹ نہیں کرنے دیتی۔ ابھی 15 جون کو حکومت نے منظوری دے ہے کہ ڈیڑھ لاکھ ٹن چینی ایکسپورٹ کرنے دی جائے گی۔ اگر چینی کے ایکسپورٹ کرنے پر اتنی سختی ہو گی تو ہم آگے کسانوں کو پے منٹ نہیں کر سکیں گے اور پھر کسان دلبرداشتہ ہو کر اگلے سیزن میں گنا کاشت نہیں کرے گا۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے پاس چینی گوداموں میں پڑی ہوتی ہے اور ہم حکومت سے ایکسپورٹ کی اجازت مانگتے رہتے ہیں اور ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں سبسڈی بھی نہیں چاہیے لیکن پھر بھی کئی کئی ماہ تک ہمیں اجازت نہیں دی جاتی۔ آخر کار حکومت کو سبسڈی بھی دینا پڑتی ہے اور میں یہاں ایک وضاحت کر دوں کہ جب حکومت کی طرف سے سبسڈی دی جاتی ہے تو میڈیا پر شور مچایا جاتا ہے کہ شوگر مافیا کو سبسڈی دی جا رہی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سبسڈی ہمیں نہیں ملتی وہ کاشتکاروں کو دی جاتی ہے۔ جب دو دو سال تک ہمیں چینی ایکسپورٹ کرنے کی اجازت نہیں دی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جاتی تو اس وجہ سے کاشتکار بھی گنا کم کاشت کرتے ہیں۔ پھر میڈیا پر خبریں آنے لگتی ہیں کہ ملوں نے ادائیگی نہیں کی تو اس وجہ سے گنا کم کاشت ہوا ہے۔ بھائی سیدھی سی بات ہے اگر چینی فروخت نہیں ہوگی تو ہم ادائیگی کس طرح سے کریں گے۔ کیا پاکستان سے چاول ایکسپورٹ نہیں ہوتا۔ اگر چاول ایکسپورٹ ہوتا ہے اور یہاں اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے تو پھر آپ چاول کی ایکسپورٹ بھی بند کردیں تاکہ غریبوں کو چاول سستے داموں میسر آئے۔ پھل، سبزیاں اور دیگر چیزیں بھی تو ایکسپورٹ ہوتی ہیں پھر ان کی ایکسپورٹ بھی بند کردیں۔ بیف اور مٹن گوشت کتنا مہنگا ہوگیا ہے، ان کی بھی ایکسپورٹ بند کردیں تاکہ یہاں پر گوشت سستا ہوجائے تاکہ غریب لوگ گوشت کھا سکیں جو کہ سالہا سال تک گوشت نہیں کھا سکتے۔ یہ ساری پابندیاں صرف شوگر ملز مالکان کے لیے ہی کیوں ہیں؟۔ چینی تو جتنی بھی مہنگی ہوجائے ہر بندہ چمچ دو چمچ پھر بھی افورڈ کرسکتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل چکن آٹھ سو روپے فی کلو تک پہنچ گیا تھا ہم نے اس کی افغانستان ایکسپورٹ یا سمگلنگ بند کردی تو پھر یہ چار سو روپے پر آگیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ چینی کے نام پر یہاں پر سیاست کی جاتی ہے اور اپنا ووٹ بنک بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ اصل جو عوامی مسائل ہیں ان پر فوکس نہیں کیا جاتا۔ ہم ملائیشیا سے پام آئل وغیرہ امپورٹ کرتے ہیں۔ جس وقت کورونا وائرس آیا تھا تو دیگر ممالک کی طرح ملائیشیا کو بھی معاشی تنگی کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے پھر بھی اپنی ایکسپورٹ بند نہیں کی۔ یہ اکنامکس اور انڈسٹریز اس طرح ہی چلتی ہیں۔ ایکسپورٹ کو معیشت میں اہم اہمیت حاصل ہے اگر اسے بند کردیا جائے تو معاشی حالات خراب ہوجاتے ہیں۔

یہاں میں آپ کو ایک اور بات بتاؤں کہ شوگر انڈسٹری تو ایک ایسی چیز ہے جس سے آگے مزید 20 صنعتیں چلتی ہیں۔ گنا شوگر مل میں جاتا ہے اور گنے کی Baggase یعنی اس کی پھوگ سے کاغذ اور گتا بنتا ہے۔ انرجی پاور پلانٹ چلتے ہیں۔ اس سے ایتھنول انڈسٹری چلتی ہے۔ پلائی ووڈ اور چپ بورڈ وغیرہ بنتا ہے۔ ڈسپوزل برتن اسی سے بنتے ہیں۔ جو بھی لوگ حکومت میں آتے ہیں انہیں سمجھ بوجھ ہی نہیں ہوتی کہ شوگر انڈسٹری کا راستہ روکنے سے کتنا نقصان ہوگا اور کتنی صنعتیں بند ہوجائیں گی۔ اس وقت چینی ہمارے باقاعدہ طور پر ایکسپورٹ آئٹم بن چکی ہے لیکن ہم اس کا راستہ روک رہے ہیں۔ مجھے بتائیں کہ پاکستان میں کون سی چیز مہنگی نہیں ہوئی۔ ہر دو تین سال کے بعد حکومتی رکاوٹوں کی وجہ گنے کی کاشت کم ہوتی ہے اور پھر شوگر ملوں کو مافیا کہا جانے لگتا ہے۔ حکومتوں اور بیوروکریسی میں بیٹھے لوگ بالکل نااہل ہیں۔ ان کو اکنامکس کی بالکل بھی سمجھ نہیں ہے۔ اس وقت جو شوگر ملیں بند پڑی ہیں ان کے مالکان کو تو نقصان ہے ہی۔ اس سے ملک اور قوم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کو بھی نقصان ہو رہا ہے۔ جہاں جہاں شوگر ملیں لگی ہوئی ہیں آپ اس علاقے میں جا کر دیکھیں وہاں تعمیر وترقی کی صورتحال کیا ہے۔ وہاں کے مکینوں اور زمینداروں کا طرزِ زندگی کیسا بن گیا ہے جبکہ ملیں لگنے سے پہلے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم نے جہاں شوگر مل لگائی تھی وہاں اس دور میں کوئی موٹر سائیکل اور سڑک نظر نہیں آتی تھی۔ اب آپ وہاں جا کر دیکھیں کہ ساٹھ ساٹھ اور 80,80 فٹ کی سڑکیں بن چکی ہیں۔ ون وے روڈز بن چکے ہیں۔ اب وہاں موٹر سائیکل اور گاڑیاں عام نظر آتی ہے۔ اسی طرح وہاں دیگر سہولتیں بھی پہنچی ہیں، وہاں ترقی اور خوشحالی آئی ہے۔ یہ ایک ایسی انڈسٹری ہے جس سے عام آدمی کو براہ راست فائدہ پہنچتا ہے۔ اس وقت ملک بھر میں 90 کے قریب شوگر ملیں ہیں لیکن ان میں 82 ملیں چل رہی ہیں۔ آپ سٹاک ایکسچینج سے پتہ کریں کہ سیمنٹ انڈسٹری، آٹو موبائل سیکٹر، میڈیسن کی صنعت نے کتنا پیسہ کمایا ہے لیکن حکومت صرف شوگر ملوں کا گلہ گھونٹ رہی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کچھ سیاستدانوں کی بھی شوگر ملیں ہیں اس لیے بھی یہ شعبہ سیاست کی نذر ہو گیا ہے کہ مخالف جب بھی اقتدار میں آتے ہیں وہ اپنے مخالفین کا راستہ روکنے کے لیے ان کی شوگر ملوں کو ہدف پر رکھ لیتے ہیں تاکہ انہیں مالی طور پر کمزور کر دیا جائے۔

میں یہاں نام لینا نہیں چاہتا لیکن ایک میٹنگ میں ایک صوبائی وزیر نے کہا تھا کہ فلاں سیاستدان کی تو شوگر مل ہے اگر وہ کامیاب ہو گیا تو پھر میرا کیا بنے گا۔ یہ بات اس وزیر نے ایک میٹنگ میں کہی تھی۔ جب ہماری سوچ کا لیول یہ ہوگا تو پھر ملک کیسے ترقی کرے گا۔ اس ملک کو چلانے کے لیے جب تک اکانومسٹ آگے نہیں آئیں گے یہ ملک ترقی نہیں کرے گا۔ ٹیکسٹائل انڈسٹری ہو یا شوگر، کسی شعبہ کی صورتحال تسلی بخش نہیں۔ اسی وجہ سے یہاں سے لوگ اپنی انڈسٹری اکھاڑ کر بنگلہ دیش، افریقہ اور دیگر ممالک میں لے جا رہے ہیں۔ انڈسٹری کو بہت زیادہ مشکلات درپیش ہیں۔ یہاں بجلی اتنی زیادہ مہنگی ہوگئی ہے اور انٹرسٹ ریٹ اتنا زیادہ بڑھا دیا گیا کہ انڈسٹری کو چلنے نہیں دیا جا رہا۔ جب ہم انڈسٹری کے ساتھ یہ سلوک کریں گے تو پھر ہم اپنے ہمسایہ ممالک بھارت اور چین وغیرہ سے اپنا موازنہ کس طرح کریں گے؟ وہاں تو ہر صورت میں انڈسٹری کو سہولت مہیا کی جاتی ہے۔ اگر ہم نے انڈسٹری چلانی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی مصنوعات کو انٹرنیشنل مارکیٹ میں لے جانا ہے لیکن ہم نے یہاں ایسی پالیسیاں بنائی ہیں کہ بجلی کا ریٹ ڈالروں میں طے کر رہے ہیں اور ایکسپورٹ پر پابندی ہے۔ سولر انرجی یا ہائیڈل انرجی پیدا کرنے کے لیے لوگ پرمٹ لے کر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن ان کے لیے مشکلات اتنی کھڑی کر دی ہیں کہ وہ کام نہیں کر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سکتے۔ پھر پرمٹ بھی ایسے لوگوں کو دیے گئے جن کا اس شعبے سے تعلق نہیں تھا۔ ایک فلم ایکٹر کو بھی انرجی کا پرمٹ دیا گیا تھا۔ یہاں یہی مسئلہ ہے کہ بس جس کی سفارش ہوتی ہے اسے پرمٹ جاری کر دیا جاتا ہے۔ اس کے تجربے یا فیلڈ کے متعلق ہرگز نہیں پوچھا جاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ باقاعدہ منصوبے کے تحت ہمارے ملک کو انڈسٹری سے آوٹ کیا جارہا ہے۔ میں اپنی مثال دوں کہ گنا ہمارے پاس ہے اور ہم چینی لگاتار ایکسپورٹ کر کے ہاف بلین کے قریب ایتھنول کی ایکسپورٹ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم چینی کو ڈیڑھ بلین تک لے جاسکتے ہیں۔ جب حکومت گنے کی قیمت بڑھادیتی ہے تو کیا اس سے چینی مہنگی نہیں ہوگی؟۔ یہ تو سادہ سی بات ہے کہ اگر گنا مہنگا ہوگا تو چینی بھی مہنگی ہوگی۔ حکومتیں اپنا ووٹ بینک بڑھانے کے لیے اور کسانوں کی ہمدردی کے لیے گنا مہنگا کرتی ہیں لیکن دوسری طرف صنعت کار کو کہا جاتا ہے کہ وہ چینی سستی کر دے۔ یہ کہاں کا اصول ہے۔ پھر بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ ہم نے چینی پرائس کو کنٹرول کر رکھا ہے۔

میری تقریباً پاکستان کے ہر بڑے سیاسی لیڈر اور وزیراعظم سے ملاقات ہوئی ہے۔ عمران خان جب وزیراعظم تھے ان سے کافی ملاقاتیں ہوئیں۔ عمران کو میں نے بہت ذہین پایا۔ ان میں قوت فیصلہ ہے، وہ کسی بھی معاملے کو بہت جلد سمجھ جاتے ہیں۔ میں نے عمران خان جیسا ذہین سیاستدان نہیں دیکھا لیکن اب جس طرح کے ہمارے ملکی حالات بن چکے ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے خیال سے صرف انسان کی صلاحیت اور قابلیت کچھ بھی نہیں کرسکتی جب تک کہ حالات سازگار نہ ہوں۔ عمران خان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ انہیں کام نہیں کرنے دیا گیا۔ حالانکہ وہ بہت زیادہ ذہین بھی ہیں اور ملک کے ساتھ مخلص بھی۔ یہاں مسئلہ یہی ہے کہ ایماندار بندے کو کچھ نہیں کرنے دیا جاتا۔ جتنا اس کا اختیار تھا اس نے حالات بہتر بنانے کی کوشش کی لیکن معاشرے اور سسٹم میں گند اتنا ہے کہ وہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ ایک تو ان کے پاس ماہر اور اچھی ٹیم کی بھی کمی تھی۔ جس وقت عمران خان وزیراعظم تھے تو لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے وائس چیئرمین ایس ایم عمران تھے۔ میں آپ کو اپنا تجربہ بتا رہا ہوں کہ ان کے دور میں مَیں نے ایل ڈی اے سے دو تین کام کروائے اور آپ یقین مانیے کہ میرے وہ کام بغیر رشوت کے اور چند دنوں میں ہوئے۔ میرا نقشہ اور ٹرانسفر لیٹر بن کر گھر آ گیا۔ اور اب صورتحال یہ ہے کہ ایل ڈی اے پھر وہیں پر آ گیا ہے اور اب وہاں بھاری رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم نے انڈسٹریز سے متعلق چند سرکاری ادارے دیکھے جن کے ساتھ ہمارا واسطہ پڑتا ہے، وہاں بھی کافی بہتری آئی تھی۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ عمران خان کے دور میں رشوت بہت بڑھ گئی تھی لیکن میں آپ کو اپنا تجربہ بتا رہا ہوں کہ جن محکموں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے میرا اپنا واسطہ پڑا وہاں تو بہت تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ ایکسائز ڈیپارٹمنٹ میں کافی بہتری آئی تھی۔ میری عمران خان سے کافی ملاقاتیں ہوئیں۔ جب وہ پرائم منسٹر تھے تو میں ان سے ملا اور ٹیکس چوری روکنے کے لیے میں نے ان کو پروپوزل دی تھی کہ کس طرح سیلز ٹیکس کی چوری روکی جاسکتی ہے، انہوں نے پھر اس پر فوری اقدامات کیے اور 80 فیصد سیلز ٹیکس کی چوری رُک گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد اب پھر وہی صورتحال ہے۔ جب اچھے حکمران آتے ہیں تو فرق ضرور پڑتا ہے اور بہتری آتی ہے لیکن بات پھر وہی آتی ہے کہ انہیں تسلی سے کام نہیں کرنے دیا جاتا۔ نگران حکومتوں کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ حکومتیں بنانے والی قوتیں ہمیشہ حکومتوں میں اپنے افراد شامل کروا دیتے ہیں، یعنی بار بار وہی چہرے آتے جس سے ملکی مسائل جوں کے توں موجود ہیں۔ حالانکہ نئے چہروں کو موقع ملنا چاہیے۔

جہاں تک نواز شریف کی بات ہے جب وہ وزیراعظم تھے میں ان سے دو تین مرتبہ ملا۔ میری ایک ملاقات تو ان سے ون ٹو ون ہوئی جو کم از کم ڈیڑھ گھنٹے پر محیط تھی۔ میں نے ان کو بھی ذہین پایا ہے۔ فیصلے اچھے کر لیتے ہیں۔ بزنس اور معاشی معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن ایک خامی یہ ہے کہ وہ وقت کم دیتے ہیں۔ جب بھی ہماری بزنس کمیونٹی ان سے ملی وہ فوری فیصلے کرتے اور عمل درآمد کرواتے، یہ ان میں خوبی ہے۔ میں ان کو ذہین آدمی تصور کرتا ہوں۔ باقی جہاں تک سیاسی باتیں اور معاملات ہیں تو چونکہ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں اس لیے میں اس پر اپنی کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ میں تو صرف اپنے شعبے اور معیشت کے متعلق بہتر بتا سکتا ہوں۔

میری زیادہ گپ شپ والی ملاقاتیں عمران خان، نواز شریف، شہباز شریف، گورنر پنجاب بلیغ الرحمٰن، گورنر پنجاب چودھری غلام سرور سے ہوئی ہیں۔ جب جنرل پرویز مشرف اقتدار میں تھے تو اس وقت میں ان سے ایک فنکشن میں ملا تھا لیکن اسے ملاقات کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ اسی طرح یوسف رضا گیلانی سے ملاقاتیں ہوئیں۔ چودھری پرویز الٰہی کے ساتھ کافی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی سب سے اچھی بات مجھے یہ لگی کہ بطور وزیراعلیٰ جب کوئی ان کے پاس کوئی مسئلہ لے کر آتا تھا تو وہ فوری طور پر اسے حل کرتے۔ جب وہ کسی سیکرٹری یا کسی اور بڑے افسر کو فون کرتے تو اسے حکم نہیں دیتے تھے بلکہ بہت اچھے انداز اور لہجے میں کہتے کہ یار ذرا اس معاملے کو دیکھ لیں۔ سافٹ اور ریکوایسٹ کرنے کے طریقے سے وہ کام کرتے تھے، یہ ان کا بڑا پن تھا۔ وہ لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ سابق گورنر پنجاب بلیغ الرحمٰن بھی اچھے اور کام کرنے والے آدمی تھے۔ سابق گورنر پنجاب چودھری سرور کے ساتھ اچھا تعلق رہا۔ میری ان سے بھی بہت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ملاقاتیں ہوئیں۔لیکن ان کی ایک عجیب بات یہ تھی کہ جب ہم ان کے پاس اپنے مسائل لے کر جاتے تو وہ پہلا مسئلہ سننے کے بعد پانچ مسائل خود بیان کر دیتے تو تب ہمارے ایسوی ایشن کے لوگ کہتے کہ آپ گورنر ہیں آپ مسائل سے بھی بخوبی آگاہ ہیں تو پھر انہیں حل کیوں نہیں کرتے؟ جو بھی حکومت آتی ہے بزنس کمیونٹی ہر حکومت سے ملتی ہے اور اپنی ڈیمانڈز پیش کرتی ہے۔ پھر اگلے بندے کی سوچ پر منحصر ہے کہ اس کے صنعت کے حوالے سے منفی خیالات ہیں یا مثبت۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں ترقی ہوئی، انڈسٹری لگی۔

جیسا کہ میں نے عرض کر چکا ہوں کہ میں زمانہ طالب علمی سے اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ وابستہ رہا اور اس طرح پھر جماعت اسلامی کی آنے والی قیادتوں کے ساتھ بھی تعلق بن گیا۔ میری قاضی حسین احمد، منور حسین اور سراج الحق سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ جب سراج الحق امیر جماعت اسلامی تھے تو اس وقت انہوں نے کچھ مشاورت کے لیے ہم چند دوستوں کو بلایا تھا۔ مجھے جماعت اسلامی میں ایک اچھی خوبی یہ نظر آئی ہے کہ کسی بھی سیاسی جماعت کا ایک لیڈر اچانک کسی دوسری جماعت یا حکومت میں شامل ہوسکتا ہے اور وہاں جا کر وہ ایک لیڈر، وزیر مشیر لگ جاتا ہے لیکن کوئی بھی سیاستدان اچانک اس طرح سے جماعت اسلامی میں شامل نہیں ہوسکتا کیونکہ جماعت کا ایک اپنا طریقہ کار ہے اور لوگ بنیادی رکنیت حاصل کر کے اور طویل مرحلہ کے بعد اوپر تک آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سیاسی میدان میں جماعت اسلامی اس لیے پیچھے رہ گئی ہے کہ عام آدمی کے لیے اس کے دروازے بند ہیں کیونکہ وہ یوں کسی کو بھی رکن نہیں بناتی۔ جماعت اسلامی کے پیچھے رہ جانے کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک مذہبی جماعت ہے اور ہمارے سسٹم میں ایک مذہبی جماعت کبھی بھی آگے نہیں جاسکتی۔ مجھے تو کسی بھی مذہبی جماعت کا پاکستان میں کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ جماعت اسلامی کی فلاحی خدمات تو بہت زیادہ ہیں اور اسے پوری دنیا میں سراہا جارہا ہے۔ جماعت اسلامی الخدمت فاؤنڈیشن کے پلیٹ فارم پر بہت بہترین انداز میں خدمتِ خلق کر رہی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر جماعت اسلامی سیاست چھوڑ کر اپنی تمام تر توجہ اسی جانب فلاحی کاموں کی جانب رکھے تو اس کا بہت فائدہ ہوگا۔ میں یہاں یہ بات کہوں گا کہ جماعت اسلامی نے سیاست چھوڑنے کا اعلان تو نہیں کیا لیکن دیکھا جائے تو وہ تقریباً سیاست چھوڑ چکی ہے۔ اب سیاست میں اس کا کچھ حصہ باقی نہیں رہا۔ اس وقت پورے پاکستان سے جماعت کے دو چار ایم پی اے ہوں گے جبکہ ایم این اے تو ایک بھی موجود نہیں۔

امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد صاحب نے پہلے پہل تو مجھے بہت متاثر کیا لیکن جب

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

انہوں نے اسلامک فرنٹ بنایا تو میں ان کے اس اقدام کے مخالف تھا کہ آپ اس طرح سولوفلائٹ نہیں کر سکتے۔ ہمارا نقطہ نظر تھا کہ ابھی تک جماعت کا اتنا حجم نہیں ہے کہ وہ تنہا اڑان بھر سکے، اس کے لیے ابھی بہت ورکنگ کی ضرورت ہے۔ اسلامک فرنٹ کے اغراض ومقاصد یہ تھے کہ ہم اپنی حکومت بنائیں گے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی دانشمندانہ فیصلہ نہ تھا۔ پہلے جماعت اسلامی آئی جے آئی کے ساتھ الحاق کر کے الیکشن لڑا اور پھر کہا کہ ہم اپوزیشن میں بیٹھیں گے۔ ہمارا نقطہ نظر یہ تھا کہ آپ حکومت میں بیٹھیں، وزارتیں لیں اور عوام کو کچھ ڈیلیور کر کے دکھائیں۔ واضح رہے کہ 1993 میں جماعت اسلامی نے پاکستان اسلامک فرنٹ کے بینر تلے انتخابات میں حصہ لیا تھا اور کچھ قومی اور صوبائی نشستیں جیتی تھیں۔ 1993ء کے انتخابات سے قبل جماعت اسلامی نے اپنے امیر قاضی حسین احمد کی رہنمائی میں اسلامک فرنٹ تشکیل دیا اور اہم عوامی مسائل ومطالبات کو اسلامک فرنٹ کے منشور کا حصہ بنا کر انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ قاضی حسین احمد کی قیادت میں پر جوش الیکشن مہم چلائی گئی۔ قاضی صاحب بڑے زور وشور سے میاں نواز شریف اور پیپلز پارٹی کے خلاف گرجتے برستے رہے اس زمانے میں یہ جملہ ''ظالمو! قاضی آ رہا ہے'' بڑا مشہور ہوا۔ پھر 2002ء کے الیکشن میں ایسے حالات بنے کہ خیبر پختونخواہ اور بلوچستان میں مذہبی جماعتوں کے اتحاد متحدہ مجلس عمل کی حکومتیں بن گئیں، اس اتحاد میں جماعت اسلامی اہم اتحادی جماعت تھی۔ اس اتحاد نے قومی اسمبلی کی 45 نشستیں جیتی تھیں۔ اس کے بعد 2008ء میں جماعت اسلامی نے الیکشن کا مکمل بائیکاٹ کر کے گویا جماعت اسلامی کو دفن کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قاضی حسین احمد صاحب 2008ء کے الیکشن میں بائیکاٹ کر کے باقاعدہ جماعت کو دفن کر گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کو دفن کر دیا جائے تو پھر وہ کبھی واپس نہیں آتا۔ یہی صورتحال جماعت اسلامی کی ہے۔ باقی اللہ کرے کہ کوئی موقع بن جائے اور جماعت آگے جائے لیکن میرے نزدیک ایسے کوئی چانسز نہیں ہیں۔

جماعت اسلامی کے امیر سید منور حسن کے ساتھ میرا اچھا تعلق تھا۔ وہ کریکٹر کی بلندی پر تھے۔ انتہائی شریف اور نیک انسان تھے۔ لیکن پھر بات وہی ہے کہ قاضی حسین احمد کے 2008ء کے فیصلے کے بعد جماعت اسلامی کا جتنا مرضی قابل امیر لے آئیں وہ اسے سیاست میں واپس نہیں لا سکتا۔ قاضی حسین احمد سے یہ بائیکاٹ کروایا گیا تھا۔ انہیں کہا گیا تھا کہ آپ الیکشن میں حصہ نہ لیں کیونکہ اسمبلی چند ماہ کے اندر ٹوٹ جائے گی۔ میرا یہ بھی نقطہ نظر ہے کہ فوج نے جماعت اسلامی کو ''بائی ڈیزائن'' ختم کروایا۔ میں یہاں کسی کا نام نہیں لوں گا۔ 2004ء میں میری ایک طاقت ور عہدیدار سے ملاقات ہوئی، انہوں نے مجھے واضح کہا کہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ جماعت اسلامی کو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سیاست سے آؤٹ کرنا ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ دیگر مذہبی جماعتوں کا سیاسی کردار بھی محدود کرنا ہوگا۔اب دیکھیں کہ واقعی ایسا ہوا، جماعت اسلامی سیاست سے آؤٹ ہوگئی اور جے یو آئی کا کردار بھی محدود ہو چکا ہے۔ یہ طے شدہ منصوبہ تھا۔

میڈیا اور صحافیوں کے متعلق میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ میں نے 2008 سے ٹی وی پروگرام دیکھنا چھوڑ دیے ہیں۔ میں ٹی وی پر صرف سپورٹس چینل دیکھتا رہتا ہوں۔ نہ مجھے ڈراموں، فلموں سے دلچسپی ہے اور نہ ہی سیاسی تبصروں تجزیوں سے ۔میں شوگر ملز ایسوسی ایشن کی جانب سے کم از کم 300 سے زائد مرتبہ ٹی وی چینل کے پروگراموں میں شریک ہو چکا ہوں۔تجزیہ کار حبیب اکرم مجھے زیادہ پسند ہے۔ بزنس کے حوالے سے اس کے پروگرام اور تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔

ٹی وی چینلز پر اکثر کہا جاتا تھا کہ شوگر ملوں والے گنا کم تولتے ہیں۔گاڑیوں کی لائنیں لگوا دیتے ہیں۔کاشتکاروں کو تنگ کرتے ہیں۔ایسی باتوں کے خلاف میں نے شدید احتجاج کیا جو موثر ثابت ہوا۔ میں نے کہا کہ کون کم تول سکتا ہے؟۔کسی کا دماغ خراب ہے۔کہا جاتا تھا کہ یہ گاڑیوں کی لائنیں لگوا دیتے ہیں۔ میں نے پھر ایسے تجزیہ نگاروں سے کہا کہ آپ ہی بتا دیں کہ اس کا حل کیا ہے؟ میرے پاس تو حل نہیں ہے۔آپ قذافی سٹیڈیم کرکٹ دیکھنے جاتے ہیں تو وہاں کتنی زیادہ تعداد میں لائنیں لگی ہوتی ہیں۔آپ نے جان بچانی ہے، مریض سیریس ہے لیکن ڈاکٹر دو دو ماہ تک ٹائم نہیں دیتے۔اگر میری مل آٹھ ہزار ٹن گنا کاشت کرتی ہے۔باہر اگر کاشتکار 30 ٹن گنا لے کر آ کر لائنوں میں لگ گئے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ شوگر ملز اسی لیے کاشتکاروں کو پرمٹ جاری کرتی تھیں تا کہ لائنز نہ لگیں۔پھر یہاں لوگوں کو علم ہی نہیں ہے کہ گنا جتنی زیادہ دیر باہر گاڑیوں میں کھڑا رہے گا اس کا سب سے زیادہ نقصان مل مالک کو ہوگا۔ گنے کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح ہمارے جسم میں آٹھ بوتل خون ہے۔اس میں ریڈ اور وائٹ سیل ہیں۔اگر ریڈ اور وائٹ سیل کم ہو جائیں تو انسان بیمار ہو جاتا ہے، کمزور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ آٹھ بوتل خون تو جسم میں موجود ہے۔اسی طرح اگر گنا باہر کھڑا رہے تو اس میں جوس کی مقدار تو وہی رہے گی لیکن اس کی مٹھاس میں کمی آتی جائے گی۔آپ کوئی بھی سبزی لے لیں اگر اسے رکھ دیں تو کتنی دیر تک فریش رہ سکتی ہے؟۔زیادہ سے زیادہ دو چار دن، اس کے بعد تو وہ خراب ہو جائے گی۔کسانوں کو اس لیے پرمٹ جاری کیا جاتا تھا تا کہ آپ جب بھی گنا لے کر آئیں تو آپ باہر کھڑے نہ رہیں اور وہ جلد پراسیس ہو جائے۔لیکن ہمارے ہاں پرابلم یہ ہے کہ ٹی وی پر بیٹھے لوگوں کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ایک مرتبہ ایک ٹی وی پروگرام میں مَیں بھی مدعو تھا اور اس میں ابراہیم مغل بھی تھے۔ یہ صاحب روزانہ تین چار چار چینلز پر آتے تھے۔ پھر میں نے اس کی تمام چینلز پر پابندی لگوادی۔ یہ شخص بالکل فضول باتیں کرتا تھا جن کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں ہوتا تھا۔ بزنس سے متعلق ہر بات اور ہر فصل کے متعلق وہ جھوٹ بولتا۔ میں نے اس کو خوب ایکسپوز کیا۔ یہ ایک پروگرام میں کہنے لگا کہ شوگر مل مالکان گنے کی گاڑیوں کی لائنیں کیوں لگواتے ہیں؟۔ میں نے کہا مغل صاحب! ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ یہ لائنیں کس طرح ختم ہوں گی۔ آپ ہمیں اس کا حل بتادیں، میں آپ کو 10 لاکھ روپے انعام دوں گا۔ یہ 2006ء کی بات ہے۔ اس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا اور لاجواب ہوگیا۔ اگر کسی زمیندار کے پاس پرمٹ نہیں ہوتا اور وہ اپنی مرضی سے گنا لے کر آ کر لائنوں میں لگ جائے تو ہمارے پاس اس کا کیا حل ہے؟۔ خیر یہ پرانی بات ہے۔ اب تازہ صورتحال یہ ہے کہ لائنوں والا مسئلہ ختم ہوگیا ہے۔ کیونکہ اب شوگر ملیں بہت بڑی ہوگئی ہیں اور لائنوں کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ اب یہاں صورتحال یہ پیش آئی ہے کہ جب شوگر ملز مالکان نے اپنی ملوں کو توسیع دی تو یہاں پھر اینکر اور تجزیہ نگار آ گئے اور کہنے لگے کہ انہوں نے اپنی ملیں بڑی کر لی ہیں اور اس طرح پھر منفی تبصرے شروع ہوگئے۔ ملیں بڑی کرنے کا مقصد یہی تھا کہ جو ملز اس وقت چھ ہزار ٹن گنا کریش کر رہی تھی وہ 10 ہزار ٹن پر چلی گئی۔ آٹھ ہزار والی بارہ ہزار ٹن اور بارہ ہزار والی 16 ہزار ٹن پر چلی گئی۔ جس سے کافی حد تک مسئلہ پر قابو پالیا گیا۔ میں نے ابھی تک ٹی وی پر صرف حبیب اکرم کو بہترین اکانومسٹ اور تجزیہ نگار پایا ہے۔ انہوں نے شوگر ملز پر اچھے پروگرامز کیے۔ پھر اس پر بھی یہ الزام لگنے لگے کہ یہ شوگر ملز مالکان سے ''لفافہ'' لیتا ہے۔ اس کے بعد یہ بے چارہ بھی بالکل خاموش ہوگیا۔ اسی طرح مجیب الرحمٰن شامی صاحب میرے دوست ہیں۔ ان کے ساتھ اجمل جامی آتے ہیں۔ یہ لوگ اچھا تجزیہ پیش کرتے ہیں اور کبھی منفی اور پروپیگنڈہ پر مبنی باتیں نہیں کرتے۔ منصفانہ تجزیہ کرتے ہیں۔ میرے قریب صرف یہی تین صحافی ہیں۔ یہ لوگ حالات اور مسائل کو سمجھ چکے ہیں لیکن جو ضدی اینکر بات سمجھنا ہی نہیں چاہتا تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟۔

میں یہاں دو تین صحافیوں کے نام نہیں لوں گا وہ میرے پاس آتے ہیں اور بات سمجھ جاتے ہیں کہ شوگر ملز مالکان کا موقف درست ہے لیکن پھر واپس جا کر ٹی وی پر الٹے سیدھے تبصرے شروع کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ سوئے ہوئے شخص کو تو جگایا جا سکتا ہے لیکن جاگتے ہوئے شخص کو نہیں جگایا جا سکتا۔ ایک صحافی نے بہت شور مچایا کہ ہم نے بغیر اجازت کے ملیں بڑی کر لی ہیں جس سے ٹیکس چوری ہوا ہے۔ ہم نے کہا کہ ایسی بات نہیں ہے اور سب کچھ واضح ہے۔ پنجاب حکومت کو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ساری صورتحال کا علم ہے۔ٹیکس چوری والی بات بالکل غلط ہے۔ایف بی آر، ایکسائز، کین کمشنر و دیگر متعلقہ اداروں کو ساری صورتحال کا علم ہے۔اس لیے ٹیکس چوری کی بات ہرگز قرین انصاف نہیں ۔سب کچھ اداروں سے منظور شدہ ہے اور کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں۔اس انٹرویو کے توسط سے میں میڈیا سے یہی گزارش کروں گا کہ اگر ملک کو ترقی دینی ہے اور معاشی حالات بہتر بنانے ہیں تو انڈسٹریز کے حق میں بولیں۔ پچاس پچاس محکمے اس وقت انڈسٹری کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں یہ ختم ہونے چاہئیں۔صنعتیں اس طرح نہیں چل سکتیں۔ایکسائز کا انسپکٹر آکر ہمیں بلیک میل کرتا ہے۔ ایک انسپکٹر نے آکر ہماری انڈسٹری کا گیٹ بند کروادیا کہ آپ نے میری اجازت کے بغیر درخت کیوں کاٹا ہے۔سیکرٹری ایکسائز میرے جاننے والے تھے۔میں ان سے ملا اور انہیں صورتحال بتائی۔انہوں نے پھر سخت ایکشن لیا۔ایکسائز انسپکٹر نے صرف ایک لائن پڑھی ہوئی تھی کہ انڈسٹری کو ہر معاملہ ایکسائز انسپکٹر کے علم میں لانا چاہیے۔لیکن اسے یہ نہیں پتہ تھا کہ اس کا کام صرف یہ ہے کہ پروڈکشن اور ڈیلیوری کتنی ہے۔میں کمرے بناؤں یا درخت لگاؤں اس میں ایکسائز انسپکٹر کا کیا کام ہے؟۔

معاشی اور کاروباری ترقی اور ملکی بہتری کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے تمام ممالک اور بالخصوص ہمسایہ ملکوں کے ساتھ اچھے تعلقات ہونی چاہئیں۔کچھ کاروباری حلقے بھارت کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی مخالفت کرتے ہیں ان کی اپنی وجوہات ہوں گی۔ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بھارت میں بجلی سستی ہے اور جب وہاں سے پاکستان میں مصنوعات آئیں گی تو ان کی قیمت کم ہوگی جس سے یہاں کی پراڈکٹ متاثر ہوں گی۔لیکن ایسے مسائل پر ریگولر ڈیوٹی وغیرہ کے ذریعے قابو پایا جاسکتا ہے۔ بھارت کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے حوالے سے نواز شریف کا موقف ہو یا کسی دوسرے کا اس کی تائید کرنی چاہیے لیکن اب تو بھارت میں جو نریندر مودی تیسری مرتبہ اقتدار میں آیا ہے وہ بھی انتہاپسند ہے۔اس کی ساری سیاست بھی اینٹی پاکستان ہے۔اگر ہم چاہیں بھی تو انڈیا میں مودی جیسے لوگ اچھے تعلقات کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے رہیں گے۔اس کا ووٹ بینک بھی اینٹی مسلم اور اینٹی پاکستان ہی ہے۔البتہ اس بار جو الیکشن ہوا ہے اس کا بیانیہ تقریباً ناکام ہوا ہے اور اسے ووٹ کم کاسٹ ہوا ہے۔

❖ ♌ ❖ ♌ ❖

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دانش ور، کالم نگار

حافظ شفیق الرحمٰن

کی ہنگامہ خیز زندگی کی کہانی

حافظ شفیق الرحمٰن گزشتہ 45 برس سے اردو صحافت کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ انہوں نے علم وادب سے مرصع فی البدیہہ گفتگو اور منفرد طرزِ نگارش کی وجہ سے نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان ہیں۔ انہوں نے برسوں کی ریاضت کے بعد علم، ادب اور صحافت کی دنیا میں اپنی بالکل منفرد شناخت قائم کی ہے۔ وہ دُنیوی اور دینی علوم سے آراستہ ہیں، ان کے مطالعہ کا میدان وسیع ہے۔ بہت سے مشاہیر سے براہ راست یا ان کے رشحاتِ قلم کے ذریعے کسب فیض کیا۔ خطابت کے میدان میں اُس وقت قدم رکھا جب زمانہ طالب علمی میں گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے تاریخی حبیبیہ ہال میں ''اقبال اور مُلا'' کے موضوع پر لب کشا ہوئے، اس کے بعد ان کے جنوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ حافظ صاحب کی پہچان کا ایک اہم حوالہ آغا شورش کاشمیریؒ ہیں۔ دورِ حاضر میں تو گویا حافظ شفیق الرحمٰن کا نام سامنے آتے ہی شورش مرحوم کا ذکر چھڑ جاتا ہے۔ حافظ صاحب صحافت اور خطابت کے میدان میں جہاں اپنے بہت سے اساتذہ کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں وہیں آغا شورش کاشمیری اور ڈاکٹر مسکین علی حجازی کو اپنا اوّلین مرشد، محسن اور مربی خیال کرتے ہیں۔ ہماری حافظ صاحب سے پرانی یاد اللہ ہے۔ گزشتہ دنوں ہم نے ان کے ساتھ چند طویل نشستیں کر کے ان کی یادداشتیں محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ سوالات کچھ یوں ترتیب دیئے کہ حافظ صاحب کے فی البدیہہ اور مربوط جوابات سے ایک خوبصورت آپ بیتی وجود میں آ گئی ہے جس سے ''قومی ڈائجسٹ'' کے باذوق قارئین یقیناً لطف اندوز ہوں گے۔

O......❄......O

میرا ایسا ہرگز کوئی دعویٰ نہیں جو کہ عموماً شہزادوں کے ہاں کیا جاتا ہے کہ'' پدرم سلطان بود''۔ میں تو ایک عام سے گھرانے میں پیدا ہوا۔ میرے ددھیال کا تعلق ضلع مانسہرہ کی تحصیل اوگی سے تھا۔ اوگی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

وہ علاقہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پاکستان کا سوئٹزر لینڈ ہے۔ میرے والد صاحب وہیں پیدا ہوئے۔ اوگی کے مضافات میں بہت زیادہ بلند و بالا پہاڑی علاقے ہیں۔ ''کھبل'' میں میرے دادا شیر زمان (مرحوم) کی زمین تھی جہاں وہ کاشتکاری کر کے اپنی گزر بسر کرتے تھے۔ دادا جان ایک متوسط طبقے کے کاشتکار اور زمین دار تھے۔ یہ نوابی دور تھا اور دیسی ریاستیں موجود تھیں۔ اس دور میں زمین کے جملہ حقوق ملکیت بحق نواب یا بحق سردار محفوظ ہوتے تھے لیکن میرے دادا کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ ان کی زمین اپنی تھی اور کسی نواب یا سردار کی ہبہ کی ہوئی یا بخشی ہوئی جائیداد نہ تھی۔ انہوں نے اپنی محنت سے یا ان کے والد یعنی میرے پردادا نے اپنی محنت سے یہ زرعی زمین حاصل کی ہوگی۔

میرے والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ ہمارے آبائی علاقہ کا نام ''کھبل'' تھا۔ کھبل گوجری زبان میں سرسبز، شاداب، شگفتہ اور پرفضا جگہ کو کہتے ہیں۔ کھبل گاؤں میرے والد صاحب کی جنم بھومی ہے۔ میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ہماری قومی شناخت کے معاملے میں ذاتوں کا انسائیکلو پیڈیا بنانے والوں نے بڑی گڑ بڑ کر دی ہے۔ ایک طبقہ تو یہ کہتا ہے کہ ہماری گوت اور قوم چوہان ہے اور دوسرا طبقہ جو کہ ''تاریخ گوجراں'' لکھتا ہے اس کے مطابق چوہان دراصل گوجر ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو تاریخ راجپوتاں کے مصنفین ہیں ان کے ہاں چوہان دراصل راجپوت ہیں۔ بہر حال میں نجیب الطرفین چوہان ہوں۔ میری والدہ اور والد صاحب دونوں چوہان برادری سے تھے۔ بہر کیف گوجری خون ہو یا راجپوتی، ایک بات ان میں مشترک یہ ہے کہ کسی بھی غلط بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ بنیادی طور پر زمانہ قدیم ہی سے یہ جنگجو قسم کی اقوام ہیں اور ان کو کبھی تسخیر نہیں کیا گیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے سید احمد بریلوی شہید اور شاہ اسماعیل شہید اور ان کے مجاہدین کے ذکر میں میرے آبائی گاؤں ''کھبل'' کا ذکر بھی کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: ''کھبل کے ایک زمین دار نے مجاہدین کی ضیافت و نصرت کی تھی''۔ اس زمین دار سے مراد میرے پردادا جان مرحوم ہیں۔ اب جس طرح آج کل کہتے ہیں کہ یہ بنیاد پرست، انتہا پسند اور قدامت پسند ہیں۔ تو میں اس پر فخر کرتا ہوں کہ یہ بنیاد پرستی، اسلام سے انتہا درجہ محبت ہمارے خون میں شامل ہے اور میں اسی تناظر میں سب سے بڑی جہادی تنظیم اور سب سے بڑی مسلح مسلم طاقت افواج پاکستان کو سمجھتا ہوں۔ یہ میرا اپنا ایک نقطہ نظر ہے جس سے کسی کو اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔

میرے دادا کا نام شیر زمان اور والد صاحب کا نام عزیز الرحمٰن تھا جو بعد میں مولانا عزیز الرحمٰن اور ''امام صاحب'' کے نام سے معروف ہوئے۔ والد صاحب صرف دو سال کے تھے کہ ان کی والدہ انتقال کر گئیں اور میرے دادا نے دوسری شادی کر لی۔ جب میرے والد صاحب کی سوتیلی ماں آئیں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تو وہ ایک روایتی سوتیلی ماں ثابت ہوئیں۔ چونکہ زمین دار اور کاشتکار گھرانہ تھا اور سوتیلی ماں نے ایک چار سال کے بچے کے ذمے جانوروں کی دیکھ بھال اور چارہ وغیرہ لانا لگا دیا تھا۔ سوتیلی ماں میرے والد صاحب کے سر پر گھاس وغیرہ لا دیا کرتیں اور جانوروں کا گوبر بھی والد صاحب سے اٹھوایا کرتی تھیں۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر میرے والد کی شکایت میرے دادا سے کرتی تھیں اور پھر دادا مرحوم ''نظریہ ضرورت'' کے تحت میرے والد صاحب کو ڈانٹ دیا کرتے تھے۔ میرے والد صاحب دو بھائی تھے۔ میرے تایا کا نام عبدالحمید تھا۔ وہ بھی ساری عمر اوگی ضلع مانسہرہ ہی میں رہے اور وہیں پر ان کا انتقال ہوا۔ والد صاحب کی اوگی میں 82 کنال زمین تھی جس میں سے انہوں نے چار کنال جگہ مسجد اور آٹھ کنال مڈل سکول کے لیے دے دی اور چار کنال زمین اپنے ایک بھتیجے کو دے دی تھی۔ میرے والد صاحب نے انہیں کہا کہ ہم تو چونکہ لاہور ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں لہٰذا تم یہ جگہ سنبھالو اور اس کی دیکھ بھال کیا کرو۔ اس علاقے کے حوالے سے بتاتا چلوں کہ یہ ایسا پرفضا مقام ہے کہ اس کے قریب ہی چھتر پلین کے علاقے میں بھٹو صاحب نے ایک ہوائی اڈہ بنوانا شروع کیا تھا۔ اب معلوم نہیں وہ ہوائی اڈہ بن چکا ہے یا نہیں۔ یہ ہوائی اڈہ اس لیے بننا تھا کہ یہ ایک خوبصورت مقام ہے اور بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ اسے ایک سیاحتی مقام کے طور پر دنیا بھر میں متعارف کروایا جائے۔ پھر وہاں پر ڈویلپمنٹ بھی خوب ہوئی۔ اب گاؤں اوگی، پٹن اور کھبل میں ہر طرف سڑکوں کا جال بچھ چکا ہے۔

خیر ذکر ہو رہا تھا میرے والد مرحوم کا تو وہ اپنی سوتیلی ماں کے نامناسب اور ناروا رویے سے بدک کر گھر سے بھاگ گئے۔ انہوں نے اپنا پہلا پڑاؤ مانسہرہ کے قریب ایک جگہ ہے ''خاکی'' وہاں پر ڈالا۔ یہاں ایک عالم دین تھے جو بچوں کو پڑھاتے تھے۔ والد صاحب نے ان سے پڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں سے والد صاحب نے ابتدائی حروف تہجی پڑھے اور کچھ فارسی بھی پڑھی۔ پڑھتے بھی تھے اور اپنے استاد کے جانوروں کو چارہ بھی ڈالتے اور ان کی دیکھ بھال بھی کرتے۔ اس دور میں استاد کی خدمت کا تصور بھی بہت زیادہ تھا کہ جو بھی استاد کی خدمت کرے گا صرف اسی کو عروج اور ارتقا ملے گا اور جو ایسا نہیں کرے گا ذلیل و خوار ہو گا۔

والد صاحب کی تاریخ پیدائش تو مجھے یاد نہیں ہے لیکن وہ بتایا کرتے تھے کہ جب میں گھر سے خاکی گاؤں میں آیا تھا تو میری عمر پانچ سال تھی اور پانچ سال خاکی ہی میں قیام کیا۔ پھر جب میں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں گلستان سعدی اور بوستان سعدی وغیرہ پڑھ لیں تو میں پشاور میں آ گیا اور پشاور کے ایک پرائمری سکول سے پانچ جماعتیں پاس کیں۔ اب اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ والد صاحب تین چار سال کی عمر میں گھر سے نکلے تھے۔ پانچ سال انہوں نے خاکی اور پانچ سال پشاور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں گزارے تو یہ تقریباً تیرہ یا چودہ سال کی عمر بن جاتی ہے اور پھر والد مرحوم اسی عمر میں امرتسر چلے گئے۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش کیا ہوگی۔اس زمانے میں ایسا کوئی جنم پرچیوں یا فارم ب وغیرہ کا تو رواج ہی نہ تھا اور خاص طور پر کوہستانی علاقوں میں تو ایسا کوئی ادارہ نہ تھا جو بچوں کی پیدائش کا ریکارڈ مرتب کرتا۔

والد صاحب بتاتے تھے کہ امرتسر میں مولانا داؤد غزنوی کا ایک دینی ادارہ قائم تھا، میں نے وہاں داخلہ لے لیا لیکن مجھے یہ مشکل پیش آئی کہ میں خاکی گاؤں میں جن مولوی صاحب سے پڑھتا تھا وہ حنفی مسلک کے تھے اور یہ اہل حدیث اور شافعی مسلک کے۔ یہاں جب میں پہلے دن نماز کے لیے کھڑا ہوا اور ناف پر ہاتھ باندھے تو میرے دائیں بائیں کھڑے طالب علموں نے زبردستی میرے ہاتھ کھینچ کر میرے سینے پر کر دیئے اور بعد میں مجھے کہا گیا کہ اب آپ نے نماز اسی طرح پڑھنی ہے۔(خیر یہ بھی شرعی طریقہ ہے اور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا)۔ والد صاحب کو استاد بھی ڈانٹا کرتے تھے کہ نماز اس طرح پڑھنی ہے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل جب ایک چھوٹے سے بچے پر زبردستی لاگو کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ یہاں سے بھی باغی ہو گیا۔ کیونکہ میرے والد صاحب ایک کاشتکار گھرانے سے تھے اور باغیانہ خیالات کے مالک تھے۔ زمین دار کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے اور وہ کسی کی غلامی نہیں کرتا۔ چنانچہ والد صاحب نے نماز کے اس زبردستی طریقے کو بھی ''غلامی'' ہی پر محمول کیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ تو بہت ہی جابرانہ انداز سے پڑھا رہے ہیں، چنانچہ انہوں نے اس ادارے کو اپنے طور پر الوداع کہا اور امرتسر ہی میں ایک مشہور مسجد تھی جس کا نام مسجد خیر دین ہے، گو کہ اب اس مسجد میں اکا دکا نمازی ہی پائے جاتے ہیں (جب 2005ء میں مَیں امرتسر گیا تو میں نے یہ مسجد دیکھی تھی) لیکن ایک دور میں اس مسجد سے جید علماء نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اردو زبان کے سب سے بڑے اور نامور خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے بھی ابتدائی تعلیم یہیں سے حاصل کی اور اپنی خطابت کا آغاز بھی امرتسر سے شروع کیا تھا۔ جب والد صاحب اس مسجد میں آئے تو وہاں اپنے وقت کے بہت بڑے عالم دین اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ مجاز مفتی محمد حسن امرتسریؒ موجود تھے۔ مفتی صاحب نے اپنا سب سے پہلا مدرسہ اسی مسجد خیر دین ہی میں قائم کیا تھا اور قیام پاکستان کے بعد جب لاہور تشریف لائے تو یہاں انہوں نے جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد اور بعد میں جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ کی بنیاد رکھی۔ میرے والد صاحب بتاتے تھے کہ جب میں مسجد خیر دین میں زیر تعلیم تھا اور میری عمر اس وقت پندرہ سولہ سال تھی کہ مورخہ 21 اپریل 1938ء کی صبح مفتی حسن صاحبؒ نے ہمیں بلایا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اور فرمایا کہ لاہور میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا انتقال ہوگیا ہے اور آپ تمام طالب علم ان کی نماز جنازہ میں پہنچیں اور پھر ہم نے استادِ محترم کے حکم کی تعمیل میں شاعر مشرق کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔

والد صاحب مسجد خیر دین امرتسر میں 1936ء سے 1947ء تک مفتی حسن صاحبؒ کے پاس زیرِ تعلیم رہے۔ وہیں امرتسر ہی میں ایک مشہور محلّہ ہے شریف پورہ، اس میں والد صاحب نے مسجد خیر دین کے ایک استاد کے کہنے پر ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ استاد نے والد صاحب سے کہا کہ دیکھو اب یہ ضروری نہیں ہے کہ تم کسی مسجد میں امامت ہی کرواؤ۔ بہتر یہی ہے کہ شریف پورہ میں ایک دکان کھول لو اور امامت وغیرہ کا کام فی سبیل اللہ انجام دیا کرو۔ استاد کا کہنا تھا کہ ہمارا معاشرہ ایک جاگیردارانہ سوچ کا معاشرہ ہے، جہاں پر ایک مسجد کے امام کو بھی جولا ہے، ترکھان اور نائی میراثی کی طرح ایک کمی کمین تصور کیا جاتا ہے۔ مفتی صاحب کی یہ بات میرے والد کے ذہن میں بیٹھ گئی اور انہوں نے شریف پورہ کے بازار میں پرچون کی دکان کھول لی دو تین سال ہی گزرے تھے کہ تحریک پاکستان کامیاب ہوگئی اور امرتسر بھارت کا حصہ بن گیا اور امرتسر کے مسلمانوں کو ہجرت کرنا پڑی۔

امرتسر کے مسلمانوں کو کیوں ہجرت کرنا پڑی اور پھر ان پر کیا گزری، جو لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں تو انہیں خواجہ افتخار مرحوم کی کتاب ''جب امرتسر جل رہا تھا'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح سکھ، خالصہ اور نہنگ سکھ مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہے تھے اور ماؤں بہنوں، بیٹیوں کی عصمتیں پامال کی جارہی تھیں اور کیسے شیر خوار مسلمان بچوں کو کرپانوں پر اچھالا جارہا تھا۔ میرے والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ یہ خونی مناظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ان حالات میں میرے والد صاحب نے وہاں سے ہجرت کی۔ ہجرت سے صرف دو ماہ قبل یعنی 14 جون 1947ء کو میرے والد صاحب کی شادی ساہیوال سے آگے چیچہ وطنی کے قریب کے ایک گاؤں کوٹلہ جندا رام میں نامور عالم دین فاضل دارالعلوم دیوبند مولانا محمد عمرؒ کی بیٹی سے ہوئی۔ میری ماں جی کا نام حمیدۃ النساء تھا۔ مولانا محمد عمر اسیر مالٹا مولانا محمود حسنؒ اور مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگرد تھے۔ میرے نانا جان مولانا محمد عمرؒ کے جو ہم سبق تھے ان میں مولانا مفتی محمودؒ بھی شامل تھے۔ مفتی محمودؒ جب بھی ساہیوال یا چیچہ وطنی آتے تو میرے نانا جان سے ضرور ملتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بھی نانا جان سے بہت محبت کرتے اور انہیں ملنے آیا کرتے۔ میری والدہ بڑی ثقہ قسم کی نفیس اردو بولتیں۔ وہ فارسی زبان پر عبور رکھتی تھیں اور ان میں علمی و ادبی ذوق بدرجہ اتم موجود تھا۔ میرے نانا چونکہ اتر پردیش میں رہے تھے تو یوپی کی اردو زبان کا جو ''لوچ'' نفاست ونزاکت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اور لطافت ہے وہ میری والدہ کی زبان میں پوری طرح موجود تھی۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں ددھیالی طور پر ایک مجاہد اور زمیندار خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور اس پر بھی فخر ہے کہ ایک عالم دین باپ کا بیٹا اور نامور عالم دین اور فاضل دیوبند کا نواسا ہوں۔

والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ جب امرتسر سے مہاجرین کو ٹرکوں کے ذریعے لاہور کے مہاجر کیمپوں میں منتقل کیا جا رہا تھا تو خواتین اور مردوں کو الگ الگ ٹرکوں میں لاہور لایا گیا۔ یوں والد صاحب کسی اور ٹرک میں اور والدہ صاحبہ کسی دوسرے میں سوار ہوگئیں۔ لاہور میں ایک بڑا مہاجر کیمپ مولانا احمد علی لاہوریؒ کی مسجد شیرانوالہ گیٹ کے پاس لگا تھا اور دوسرا بڑا کیمپ والٹن کینٹ میں قائم کیا گیا تھا۔ والد صاحب شیرانوالہ گیٹ پہنچا دیے گئے تو وہاں پہنچ کر انہوں نے والدہ صاحبہ کو بہت تلاش کیا۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ والٹن کیمپ میں جائیں، چنانچہ والد صاحب والٹن کیمپ میں پہنچے اور میری والدہ کو تلاش کر لیا۔ والٹن کیمپ سے لوگوں کو مختلف آبادیوں میں منتقل کیا جا رہا تھا تو میرے والد صاحب کو انتظامیہ نے کہا کہ ایم اے او کالج کے قریب ساندہ روڈ پر ایک بستی راج گڑھ ہے اس کے قریب ایک ہندوؤں کا محلّہ پریم نگر ہے جہاں بہت سے ہندو گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں تو آپ وہاں چلے جائیں۔ یوں میرے والد صاحب 20 اگست 1947ء کو اس محلّہ کے ساڑھے چھ مرلے کے ایک مکان کے مکین ہوگئے جو بعد ازاں ساٹھ کی دہائی میں انہیں الاٹ ہوگیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کیا کیا جائے۔ چونکہ ہجرت کے فوری بعد درس نظامی کی تکمیل ہونے والی تھی اس لیے والد صاحب مفتی محمد حسن صاحب کو ڈھونڈ رہے تھے اور بہت پریشان بھی تھے۔

یہاں یہ بتاتا چلوں کہ راج گڑھ ساندہ روڈ کے قریب میرا آبائی محلّہ پریم نگر ہے۔ پریم نگر بہت مشہور محلّہ ہے۔ این سی اے ہاسٹل کے قریب چوک سے بائیں ہاتھ ہو کر تیسری گلی میں ہمارا گھر ہے۔ اس گلی کا نام سرن سٹریٹ ہے۔ پریم نگر کے گھروں کی خوبصورتی یہ تھی کہ اگر ایک گھر گلی نمبر تین میں ہے تو گلی نمبر دو میں بھی اس کا دروازہ کھلتا ہے۔ کشادہ گلیاں تھیں، یہ جتنے بھی محلے تھے، ہندو کمیونٹی نے بنائے تھے ان میں کرشن نگر، رام نگر، شام نگر اور سنت نگر شامل ہیں۔ میں صرف اپنے محلے کے قرب و جوار کی بات کر رہا ہوں۔ یہ محلے بڑی زبردست ٹاؤن پلاننگ سے بنائے گئے تھے۔ یعنی اگر آپ میری گلی نمبر 3 میں داخل ہوں گے تو ہر دس گھروں کے بعد ایک چوک آجائے گا۔ اس طرح یہ بڑا ہی خوبصورت محلّہ تھا۔ لیکن 20 اگست 1947ء کو میرے والد صاحب کو اس محلے میں جو کمی محسوس ہوئی وہ یہ تھی کہ ہم سب یہاں مسلمان آباد ہوگئے ہیں لیکن یہاں مسجد ہی نہیں ہے اور اذان تک نہیں ہوتی۔ لہٰذا ہماری گلی نمبر تین ہی میں ایک خالی پلاٹ پڑا ہوا تھا جو 25 مرلے کے قریب تھا تو محلے داروں نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

والد صاحب سے کہا کہ آپ اذان دے دیا کریں اور ہم اس خالی پلاٹ میں آپ کی اقتدا میں نماز ادا کرلیا کریں گے۔ یہاں مسلمان فی الحال ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے تھے کیونکہ کوئی امرتسر سے آیا تھا اور کوئی فیروز پور، جالندھر اور پٹیالہ سے۔

ہمارے پریم نگر محلے میں زیادہ تر وہ مسلمان آباد ہوئے جو مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ لوگ والد صاحب سے کہنے لگے کہ آپ بتاتے ہیں کہ آپ نے دینی تعلیم حاصل کی ہے تو آپ ہی آگے آئیں اور اذان و جماعت کا اہتمام کریں۔ میرے والد صاحب نے کہا نہیں اس وقت تک یہاں نماز با جماعت نہیں ہوگی جب تک اس پلاٹ کا پتہ نہ چل جائے کہ آیا یہ جگہ متروکہ وقف املاک بورڈ (ایویکیوای ٹرسٹ) کی ہے یا کسی اور کی۔ جب تک اس پلاٹ کے مالک سے باقاعدہ اجازت نہ لی جائے تب تک ہمیں یہاں پر نماز ادا نہیں کرنی چاہیے۔ اب اسے حسن اتفاق ہی سمجھئے کہ پوری ہندو آبادی میں یہ جو پلاٹ تھا یہ ایک مسلمان خاتون کا تھا جو مزنگ (لاہور) ہی کی رہنے والی تھیں۔ 23 اگست کو ایک وفد اس خاتون کے پاس گیا۔ (اس خاتون کا نام اب میرے ذہن میں نہیں آرہا)۔ انہیں بتایا گیا کہ ہم پریم نگر سے آئے ہیں جہاں پر ہندوؤں کے بیچ گھر اور سکھوں کا گوردوارہ تو موجود ہے لیکن مسجد موجود نہیں تو خاتون نے کہا کہ میری طرف سے تحریری اجازت ہے کہ آپ وہاں پر مسجد بنالیں۔ اس خاتون نے پلاٹ کے کاغذات میرے والد صاحب کو دے دیئے کہ آپ اس پر مسجد بنالیں۔ اب اس خالی پلاٹ پر اذان اور جماعت شروع ہوگئی۔ ایک دن والد صاحب مین سانده روڈ پر جا رہے تھے کہ ان کی ملاقات پرویز حنیف (لاہور چیمبر آف کامرس کے سابق صدر) کے والد شیخ حنیف اور ان کے دادا شیخ کوثر مرحوم سے ہوگئی۔ شیخ حنیف صاحب کو سانده روڈ پر آٹھ دس کنال جگہ الاٹ ہوئی تھی۔ یہ بڑے کاروباری لوگ تھے اور ان کا بھارت میں کارپٹ کا بڑا بزنس تھا۔ جب یہ لوگ لاہور آ گئے تو صاف ظاہر ہے کہ اس کے عوض انہیں یہاں پر کافی جگہ ملی۔ شیخ حنیف نے والد صاحب سے حالات پوچھے تو والد صاحب نے انہیں پلاٹ اور مسجد کا معاملہ بتایا اور کہا کہ یہ پلاٹ ایک خاتون نے انہیں ہبہ کر دیا ہے۔ شیخ حنیف نے پلاٹ کے کاغذات وغیرہ دیکھنے کے بعد کہا کہ اب مسجد کی تعمیر کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں اور یہ مکمل مسجد ہم بنوائیں گے۔ چنانچہ یہ مسجد انہوں نے ہی بنوائی۔ اس مسجد میں والد صاحب نے اواخر 1947ء سے 1998ء تک امامت کے فرائض انجام دیے۔ مورخہ 14 اگست 2004ء کو میو ہسپتال میں صبح 9 بجے ان کا اس وقت انتقال ہوا جب یوم آزادی کے سلسلے میں قومی ترانہ پڑھا جا رہا تھا۔

اس سارے عرصے میں کبھی اس مسجد میں چندہ نہیں ہوا، جتنے بھی اخراجات تھے وہ شیخ حنیف

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اور پھر ان کی اولاد ہی ادا کرتی تھی۔ شاید اب بھی ایسا ہی ہو بہرحال تازہ صورتحال میرے علم میں نہیں۔ والد صاحب نے مسلسل اکاون سال تک اپنی قائم کردہ مسجدِ اقبال میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دیے۔ اس سارے عرصے میں ان کا یہ معمول رہا کہ ہر سال 14 اگست کے موقع پر نماز فجر کے بعد تحریک پاکستان کے اغراض ومقاصد بیان فرماتے اور پاکستان کی تعمیر وترقی کے لیے دعا کرواتے۔ ان تقریبات میں معروف ماہر اقبالیات پروفیسر منور مرزا، سرراہے، (نوائے وقت) کے کالم نگار پروفیسر سلیم میر ودیگر حضرات بھی اپنے خیالات کا اظہار فرماتے۔

ہمارے محلے میں ایک سکول ''نیو ماڈل گرلز ہائی سکول'' تھا جس کی ہیڈ مسٹرس بڑی بی ''رابعہ صفت'' خاتون تھیں، انہیں پورا محلّہ خالہ جان کہتا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے انہوں نے ایم ایس سی کیمسٹری کیا ہوا تھا۔ وہ بتایا کرتی تھیں کہ ہم باقاعدہ برقعے میں علی گڑھ یونیورسٹی جایا کرتی تھیں۔ خالہ جان کی پوری زندگی میں کسی نے ان کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر وقت پردے میں رہا کرتیں۔ میں بچپن میں ان کے پاس پڑھتا رہا تو بس خالہ جان کا کچھ چہرہ یاد ہے۔ خالہ جان اپنے شاگردوں سے بھی جب وہ بڑے ہو جاتے تو پردہ کر لیا کرتیں۔ ایک مرتبہ خالہ جان نے شیخ حنیف صاحب سے کہا کہ مجھے مسجد میں کچھ حصہ ڈالنا ہے اور مسجد کا برآمدہ تعمیر کروانا چاہتی ہوں۔ شیخ صاحب نے کہا کہ اگر امام صاحب اجازت دے دیں تو آپ بے شک تعمیر کروا دیں۔ یوں اس مسجد کا برآمدہ خالہ جان نے تعمیر کروایا تھا۔ میرے والد صاحب کو پورا محلّہ ''امام صاحب'' کہہ کر پکارتا تھا۔ بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث غرض ہر مسلک کے لوگ میرے والد صاحب کا بہت ہی احترام کرتے اور انہیں امام صاحب کہا کرتے۔ مسجد تعمیر ہو گئی تو لوگوں نے والد صاحب سے مسجد کے نام کے بارے میں مشاورت کی تو چونکہ والد صاحب کے دل ودماغ میں پاکستانیت اور علامہ اقبالؒ سے محبت رچی بسی تھی اور وہ بتایا کرتے تھے کہ جب سے مجھے اپنے استاد مفتی محمد حسن امرتسریؒ نے حکم دیا تھا کہ لاہور جاؤ اور اقبالؒ کا جنازہ پڑھو تو اس کے بعد سے میرے دل میں علامہ اقبالؒ کی ارادت وعقیدت میں ہر گزرتے پل اضافہ ہوتا گیا۔ والد صاحب نے کہا کہ چونکہ ملت اسلامیہ کو وحدت کا پیغام دینے والی شخصیت علامہ اقبالؒ ہی تھے تو کیوں نہ مسجد کا نام ''مسجد اقبال'' رکھا جائے۔ چنانچہ مسجد کا یہی نام رکھ دیا گیا۔ والد صاحب نے اس مسجد پر کسی مخصوص مسلک کی چھاپ کبھی نہ لگنے دی، وہ ناپسند فرماتے کہ کسی مسجد کے باہر لکھا ہو کہ یہ مسجد فلاں مسلک کی ہے۔

والد صاحب مطالعہ کے بہت عادی تھے اور ان کے کمرے میں بہت سی کتابیں رکھی ہوتی تھیں۔ رات کے وقت کوئی بھی بچہ ان کے کمرے میں اس وجہ سے نہیں سو سکتا تھا کہ وہ رات کا زیادہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

حصہ عبادت یا پھر مطالعہ میں گزارتے تھے اور رات بھر لائٹ جلتی رہتی تھی لیکن مجھے چونکہ ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا تو میں انہی کے کمرے میں سوتا تھا۔ والد صاحب ایک کٹر قسم کے مذہبی لیکن نہایت کشادہ ظرف رکھنے والے انسان تھے۔ اسلام اور وطن سے بے پناہ محبت ان کے رگ و ریشے میں بسی تھی۔ میں نے اپنے شعور کے بعد چالیس سال تک ان کے پیچھے نماز ادا کی۔ وہ ہر نماز کے بعد پاکستان اور افواج پاکستان کی ترقی، استحکام اور سلامتی کے لیے دعا کروایا کرتے۔

مسجد کی تعمیر کے بعد شیخ حنیف مرحوم نے کہا کہ اس آبادی کے لوگ غریب ہیں، لٹے پٹے ہوئے آئے ہیں لہٰذا مسجد کو اپنے اخراجات کے معاملے میں خود کفیل ہونا چاہیے تو انہوں نے مسجد کے ساتھ ہی 11 دکانیں بنوا دیں جن میں سے ایک دکان میرے والد صاحب نے باقاعدہ کرایہ پر حاصل کی اور وہیں امرتسر والا پرچون کا کام شروع کیا۔ والد صاحب نے کہا تھا کہ میں مسجد میں امامت کے پیسے نہیں لیا کروں گا لیکن وہ بہرحال ایک ''ٹوکن منی'' کے طور پر کچھ پیسے لیتے تھے جیسا کہ گورنر مغربی پاکستان نواب آف کالاباغ ملک امیر محمد خان نے کہا تھا کہ میں گورنری کی تنخواہ نہیں لیتا اور صرف ایک روپیہ اس لیے لیتا ہوں تاکہ مجھے محسوس ہو کہ میں سرکار کا نوکر ہوں۔ بس والد صاحب بھی اسی نظریے کی بنیاد پر کچھ پیسے لیتے تھے لیکن ان کا مستقل ذریعہ معاش اپنی پرچون کی دکان ہی تھا۔ دکان اتنی چل نکلی تھی کہ انہوں نے ہم سب بہن بھائیوں کو اچھی تعلیم دلوائی۔ وہ اکثر ہم سے کہتے کہ یہ ایک عجیب بات ہے کہ مسجد میں آکر وہ بندہ بھی مولوی صاحب سے دینی مسائل کے معاملے میں بحث و تمحیص کرتا اور سینگ پھنساتا ہے جس نے دین کے متعلق ایک بھی کتاب نہیں پڑھی ہوتی۔ قرآن کا ایک رکوع بھی ترجمے کے ساتھ نہیں پڑھا ہوتا اور صحاح ستہ کی کتابوں میں سے کسی ایک بھی کتاب کا ایک ورق بھی نہیں پڑھا ہوتا۔ والد صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ مولوی بے چارہ اتنا بدقسمت اور کمزور ہے کہ محض محلے داروں کی چندہ نما تنخواہ پر پلنے کی وجہ سے اس قدر ممنونِ احسان ہو جاتا ہے کہ جو بندہ بھی اٹھتا ہے مسجد میں آکر مولوی صاحب سے اپنے حکم کی تعمیل کروانا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ کہا کرتے تھے کہ میں اس لیے دکان داری کرتا ہوں کہ میں ایک زمین دار باپ کا بیٹا ہوں اور مجھ سے کسی کی بات نہیں سنی جاتی۔ اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کمانے والے باپ کا بیٹا ہوں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ دینی تعلیم تو میں نے اپنی آخرت اور اپنی اصلاح کی خاطر حاصل کی تھی، روزگار کے لیے ہرگز نہیں۔ وہ اکثر اپنی سوتیلی ماں کو یاد کر کے کہا کرتے تھے کہ اللہ پاک اس کی مغفرت کرے اور اس کی قبر کو رشکِ جنت بنا دے کہ اگر وہ مجھے دھکے دے کر گھر سے نہ نکالتیں تو میں کبھی دینی تعلیم حاصل نہ کر پاتا۔ نہ مجھے دین کا شعور ملتا اور نہ میں مفتی محمد حسن امرتسریؒ جیسے اکابرین کے جوتے سیدھے کر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سکتا۔ والد صاحب کی عادت تھی کہ کوئی بھی خاص بات یا کسی واقعہ کے متعلق تاریخ کا اندراج اپنے زیر مطالعہ کسی کتاب کے بیک ٹائٹل پر کر دیتے تھے تو اس طرح ان کی ایک کتاب پر میری جو تاریخ پیدائش درج ہے اس کے مطابق میں 10 فروری 1954ء کو پریم نگر لاہور میں پیدا ہوا۔ میرے 3 بھائی حبیب الرحمٰن، عتیق الرحمٰن اور خالد عزیز اور 4 بہنیں ہیں۔

ہمارے گھر کی زبان پنجابی تھی۔ گھر میں روزنامہ نوائے وقت آتا تھا تو میری والدہ مجھے باقاعدہ کہتی تھیں کہ خبریں پڑھ کر سناؤ اور جہاں کسی تلفظ میں کوئی غلطی ہوتی تو بڑی محبت اور ملائمت کے ساتھ میری اصلاح فرماتی تھیں۔ یوں میں جلد ہی اردو میں رواں ہو گیا۔ جب میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا تو اس دور میں ایک مشکل ترین مضمون جو بچوں کے لیے سمجھا جاتا تھا وہ ''قسطنطنیہ'' تھا۔ جب بچوں کی اردو چیک کرنا ہوتی تھی تو ''قسطنطنیہ'' مضمون پڑھنے کو کہا جاتا تھا۔ میں پہلی جماعت میں تھا تو میرے محلے کے ایک صاحب نے مجھے پوچھا، اردو پڑھ لیتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ جی پڑھ لیتا ہوں تو انہوں نے فوری طور پر میرے سامنے کتاب کھول کر یہی قسطنطنیہ والی کہانی رکھ دی کہ یہ پڑھ کر سناؤ اور جب میں نے وہ بالکل درست پڑھ کر سنائی تو انہوں نے مجھے خوب داد دی۔

ناظرہ قرآن پاک، ابتدائی اردو اور کچھ فارسی مجھے والدہ صاحبہ نے گھر پر پڑھائی۔ میرے ایک ماموں تھے جن کا نام ماسٹر عبدالحکیم تھا، وہ چیچہ وطنی ہائی سکول میں سینئر ٹیچر تھے۔ ایک دن وہ ہمارے گھر تشریف لائے تو میرے والدین کو میرے متعلق کہا کہ یہ ابھی تک گھر کیوں بیٹھا ہے؟ یہ فارسی، اردو پڑھتا ہے اور طرح طرح کی بولیاں بولتا ہے تو اسے سکول کیوں نہیں بھیجتے؟ یوں اسی دن ماموں جان نے مجھے قریبی پرائمری سکول میں داخل کروا دیا۔ یہ 1960ء کی بات ہے۔ یہ سکول پانچ کمروں پر مشتمل تھا اور اس پر سرخ رنگ کیا گیا تھا کہ اس دور میں کارپوریشن یا دیگر سرکاری سکولوں پر یہی رنگ کیا جاتا تھا۔ یہ سکول مین سانده روڈ پر حق آرتھوپیڈک کے قریب واقع تھا۔ اس دور کے کیا خوبصورت استاد تھے جو بچوں کو بڑی ہی محنت سے پڑھایا کرتے۔ انکی تنخواہیں تو معمولی ہوتی تھیں لیکن ان میں پڑھانے کا ایک جذبہ ہوا کرتا تھا۔ میں تو خیر گھر سے کچھ نہ کچھ فارسی اور اردو حروف تہجی پڑھ کر گیا تھا لیکن وہ بالکل نئے بچوں پر بھی بہت زیادہ محنت کرتے تھے۔

میں کچی جماعت میں داخل ہوا تو اساتذہ نے تین ماہ تک مسلسل ہمیں صرف پہاڑے یاد کروائے۔ ہم صبح ہی صبح باآواز بلند ''اک دونی دونی۔ دو دونی چار'' شروع کر دیتے تھے۔ پہاڑے باآواز بلند اور باجماعت پڑھے جاتے تھے۔ ان تین ماہ میں ہمیں سولہ تک پہاڑے یاد کروائے گئے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جو ساری زندگی کے لیے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے۔ ہماری کچی جماعت کے ایک ٹیچر سید تھے۔ جب وہ کمرہ جماعت میں داخل ہوتے تو ساری جماعت کھڑی ہو جاتی تھی۔ سید صاحب بھی عجیب سحر طراز شخصیت کے مالک تھے۔ ہم بچے انہیں بار بار دیکھا کرتے۔ انہوں نے بالکل سفید اور اجلا لباس پہنا ہوتا تھا، ان کی مونچھیں بڑی طرح دار اور ''ٹھسے دار'' تھیں۔ رنگ گورا چٹا تھا اور وہ حقہ بہت زیادہ پیتے۔ جب وہ کلاس میں آتے تو اپنی کرسی کے دائیں ہاتھ اپنا حقہ رکھتے، اس کی نئے منہ سے لگاتے اور پھر ہمیں پہاڑے یاد کروانا شروع کر دیتے۔ وہ کرسی پر ٹانگیں لٹکا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ دونوں پاؤں کرسی پر رکھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ کش بھی لگاتے جاتے اور پہاڑے بھی یاد کرواتے جاتے۔ ہماری اردو اور پھر پہاڑوں میں جو کسر رہ گئی تھی اسے شاہ صاحب نے پورا کر دیا تھا۔ (اللہ ان کی قبر پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے۔ آمین) پھر ہم دوسری جماعت میں آئے اور ہماری جو حساب (میتھ) میں کمزوریاں تھیں وہ ہمارے استاد ماسٹر عبدالعزیز صاحب نے دور کروا دیں۔ تیسری اور چوتھی جماعت کے استاد گرامی کا نام ماسٹر شہاب الدین تھا۔ جب میں چوتھی کا امتحان دے چکا تو کسی نے میرے والد صاحب سے کہا آپ شفیق الرحمٰن کو حافظ قرآن کیوں نہیں بنا دیتے، لہٰذا 1964ء کے اواخر میں مجھے سکول سے اٹھوا کر نیلا گنبد (انارکلی کے قریب) مدرسے میں داخل کروا دیا گیا۔ (یاد رہے کہ جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن فیروز پور روڈ جو کہ مفتی محمد حسن امرتسریؒ کا قائم کردہ ادارہ ہے اس کی بنیاد یہی نیلا گنبد والا مدرسہ تھا۔ اس وقت نیلا گنبد میں گھڑیوں کی مشہور زمانہ دکان ''الانہ واچ کمپنی'' ہوتی تھی ہم اس گلی سے داخل ہو کر مدرسہ میں جایا کرتے۔ میں جن قاری صاحب کے پاس داخل کروایا گیا انہوں نے امرتسر میں میرے والد صاحب سے ناظرہ قرآن پاک پڑھا تھا۔ اب والد صاحب نے انہیں کہا کہ میں نے تمہیں پڑھایا تھا تو اب تم میرے اس بچے کو حافظ قرآن بنا دو تا کہ ہمارا حساب کتاب برابر ہو جائے۔

میں اس سے قبل ناظرہ قرآن پاک اپنے والدین سے پڑھ چکا تھا۔ میرے استاد حافظ صدیق صاحب نے مجھے اس قدر توجہ اور انہماک سے پڑھایا کہ جب 65ء میں جنگ ہوئی تو میں ستائیس پارے حفظ کر چکا تھا اور 1966ء کے اوائل میں مجھے قرآن پاک مکمل حفظ ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود میرے والد صاحب کا اصرار تھا کہ میں اپنی منزل اچھی طرح پکی کروں۔ اللہ میرے ان استاد محترم کو غریق رحمت فرمائے کہ اس شہر لاہور میں بلا مبالغہ اور بلا خوف تردید ان کے کم از کم چار پانچ ہزار شاگرد ہوں گے جنہوں نے ان سے قرآن کریم حفظ کیا۔ حافظ صدیق صاحب انتہائی سادہ اور منکسر المزاج تھے۔ جب بھی وہ کسی طالب علم میں سستی، کاہلی یا پڑھائی میں عدم دلچسپی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دیکھتے تو ان کا رویہ انتہائی سخت ہو جاتا۔ آج کل تو کہا جاتا ہے کہ ''مار نہیں، پیار'' لیکن استاد محترم کہتے تھے میرا تجربہ ہے کہ پیار سے قرآن پاک حفظ نہیں کیا جاتا اس میں ہمیں تھوڑی تھوڑی مار بھی ضرور شامل کرنا پڑتی ہے اس لیے وہ کبھی کبھار بید کا استعمال بھی فرماتے۔ مجھے یاد ہے جب میں بائیسواں پارہ حفظ کر رہا تھا تو میں اپنا سبق یاد نہ کر سکا تو انہوں نے میری کمر پر دو بید رسید کیے۔ ان کے پاس اور یجنل اور ''اصیل نسل'' کا بید ہوتا تھا جو کمر پر پڑتا تو درد کے مارے برا حال ہو جاتا۔ یہ جمعرات کا دن تھا اور اس سے اگلے دن جمعہ کی چھٹی تھی۔ جب والدہ صاحبہ مجھے نہلانے لگیں اور انہوں نے میرا کرتا اتارا، میری کمر پر نشان دیکھے تو ان کی ممتا تڑپ اٹھی اور والد صاحب سے کہنے لگیں: میں نے اب اپنا بچہ قاری صاحب کے پاس ذبح ہونے کے لیے نہیں بھیجنا۔ والدہ محترمہ میرے والد صاحب سے کہنے لگیں، دیکھیں حافظ صدیق صاحب آپ کے شاگرد ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے آپ کے بیٹے پر اس قدر ''ظلم'' ڈھایا ہے اور کچھ خیال نہیں کیا۔ والد صاحب نے جواب دیا کہ آپ پریشان نہ ہوں میں کل شفیق الرحمٰن کے ساتھ ان کے استاد کے پاس جاؤں گا اور آپ کے جذبات بھی ان تک پہنچاؤں گا۔

خیر، اگلے دن والد صاحب میرے ساتھ گئے اور انہوں نے استاد سے ایک روایتی جملہ کہا جو ماضی میں ہر باپ اپنے بچوں کے استاد سے کہتا تھا۔ یعنی جب کوئی باپ اپنے بچے کو کسی استاد کی ''تحویل'' میں دیتا اور استاد کے سامنے بچے کا زانوئے تلمذ تہ کرواتا تو اس کو ایک جملہ ضرور کہتا تھا کہ میں اپنا یہ بیٹا آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔ آپ نے اس کو قرآن پاک حفظ کروانا ہے۔ اس کا گوشت آپ کا ہے اور ہڈیاں ہماری۔ یعنی آپ جتنی بھی سزا دیں کوئی مسئلہ نہیں۔ چنانچہ جب والد صاحب میرے ساتھ گئے تو بجائے اس کے کہ والدہ کا احتجاج ان تک پہنچاتے، انہوں نے الٹا استاد صاحب سے پنجابی زبان میں کہا: ''جناں مرضی مارو بچے نوں جی۔ تسی ایسدے استاد او۔ بچے نوں مارنا تہاڈا استحقاق اے۔ شفیق الرحمٰن کی کیا مجال ہے کہ یہ سبق یاد نہ کرے۔''

جب میں مدرسے میں پڑھتا تھا تو والد صاحب میرا بہت زیادہ خیال رکھتے اور مجھ پر خوب خرچ کرتے کہ گویا میں ان کے نزدیک ''سی ایس ایس'' کر رہا تھا۔ وہ اپنے لیے اس کو ایک بہت بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ اس دور میں باپ جس بچے کو قرآن پاک حفظ کرواتا تھا اس کو گھر میں وی وی آئی پی پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ چنانچہ مجھے بھی فل پروٹوکول ملتا۔ ابھی میں نے صرف ایک پارہ ہی حفظ کیا تھا کہ مجھے گھر میں حافظ صاحب کہہ کر پکارا جانے لگا۔ یہ دراصل مجھے والد صاحب کی طرف سے ترغیب اور شوق دلانے کا ایک طریقہ تھا۔ پہلے وہ مجھے اپنی سائیکل پر مدرسے چھوڑنے جایا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کرتے، جب مجھے ایک سال مکمل ہو گیا تو مجھے ایک نئی سائیکل لے دی۔ اس دور میں سائیکلوں کی ایک مشہور ایگل کمپنی تھی جس نے بچوں کے لیے خاص طور پر ایک نئی سائیکل متعارف کروائی تھی تو والد صاحب نے مجھے وہ سائیکل لے کر دی۔ اس زمانے میں وہ سائیکل سات سو روپے کی تھی ۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ اس وقت مارکیٹ میں سائیکل کا بہترین برانڈ تھا۔ میں گھر سے مدرسے کے لیے دو ٹائم جایا کرتا: ایک صبح سویرے جاتا اور دوپہر کو لوٹتا اور دوسرے ظہر کی نماز کے بعد اور مغرب کے وقت گھر واپسی ہوتی۔

میں گھر کے قریب راج گڑھ چوک میں پہنچتا تو والد صاحب چوک میں کھڑے میرا انتظار کر رہے ہوتے۔ مجھے گھر لاتے اور راستے میں پوچھتے کیا کچھ کھانا ہے؟ اس زمانے میں ابھی تک ''کوک''، ''پیپسی'' اور دیگر کولڈ ڈرنکس کا رواج نہیں پڑا تھا اور مقامی کمپنیوں کی بنی ہوئی ''ٹھاہ ٹھاہ'' والی بوتلیں چلتی تھیں۔ والد صاحب مجھے بوتل پلاتے یا پھر مجھے دودھ والی دکان پر لے جا کر کڑاہی والا گرم گرم دودھ پلاتے اور دکان دار سے کہتے، دودھ میں اچھی خاصی ملائی ڈالنا کیونکہ میرا بچہ حفظ کر رہا ہے۔ ہم عام طور پر جس دکان سے روزانہ دودھ پیتے اس دکاندار کا نام ''باٹی'' تھا جو پورے علاقہ میں مشہور تھا۔ گھر میں میری دیسی گھی سے خاطر تواضع کی جاتی۔ اس وقت یعنی 64-1963ء میں لیور برادرز کی طرف سے ڈالڈا گھی کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ہمارے گھر میں زیادہ تر دیسی گھی ہی استعمال کیا جاتا۔ چونکہ والد صاحب خود دکان کرتے تھے تو وہ خالص دیسی گھی مزنگ کی ایک معروف دکان ''خان دی ہٹی'' سے لایا کرتے۔ ان کا دیسی گھی لاہور بھر میں مشہور تھا۔ اس پورے علاقے یعنی سانده، سنت نگر، کرشن نگر، شام نگر، پریم نگر وغیرہ میں ''خان دی ہٹی'' کی دیسی گھی کی ایجنسی ایک طرح سے میرے والد صاحب کے پاس تھی۔ والد صاحب والدہ کو کہا کرتے تھے: شفیق الرحمٰن کو سالن میں زیادہ دیسی گھی ڈال کر دیا کرو۔ اسی طرح والد صاحب میرے لیے بادام وغیرہ کا خوب اہتمام کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت لوگ اپنے بچوں کو ایم فل یا پی ایچ ڈی کروانے کے لیے اتنے پیسے خرچ نہیں کرتے تھے جتنا میرے والد محترم نے مجھے حافظ بنانے کے لیے کیے۔ دراصل یہ ان کی قرآن کریم سے بے پناہ محبت اور عقیدت کا ایک اظہار تھا۔

جب میں نے قرآن کریم حفظ کر لیا اور ایک سال مزید لگا کر منزل بھی پکی کر لی تو میں نے 1967ء میں شاہ عالمی میں واقع ایک پرائیویٹ سکول جس کا نام ''انارکلی کالج'' تھا، میں داخلہ لے لیا۔ وہاں میرے ایک ماموں حسن جاوید پڑھایا کرتے تھے جو بعد میں بحیثیت ایڈیٹوریل ایڈیٹر نوائے وقت کراچی سے ریٹائرڈ ہوئے۔ وہ سجاد میر صاحب کے ساتھ بھی کام کرتے رہے تھے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

انہوں نے کہانیاں بھی بہت لکھیں جو اپنے وقت کے ممتاز جریدے ''سب رنگ'' میں شائع ہوتی رہیں۔ انہوں نے میرے متعلق کہا، اب تو آپ کو آٹھویں جماعت میں ہونا چاہیے۔ لہٰذا انہوں نے میرا داخلہ آٹھویں میں کروا دیا اور تیاری بھی شروع کروا دی۔ سچی بات ہے کہ میں نے گلستان و بوستان تو اپنی والدہ سے پڑھ لی تھیں اور ''پند نامہ عطار'' کے چیدہ چیدہ شعر بھی مجھے ازبر تھے۔ اسی طرح شیخ سعدیؒ کے جو نثری جملے تھے وہ بھی مجھے یاد ہو گئے تھے۔ میں گھر میں جو زیادہ تر اپنی والدہ سے ایک جملہ سنتا تھا وہ تھا: ''خوئے بدرا بہانہ بسیار است''۔ اسی طرح پنجابی کے اکھان اور کہاوتیں بھی والدہ صاحبہ کو بہت یاد تھیں۔ میں نے پنجابی کہاوتیں یا تو اپنی ماں سے سیکھیں یا پھر بعد میں ریڈیو پاکستان کے معروف پنجابی پروگرام 'جمہور دی آواز' کے چوہدری نظام دین سے۔ وہ بڑے ٹھیٹھ پنجابی جملے بولتے تھے جو میرے حافظے میں نقش ہو گئے۔ میں نے حفظ کے بعد مڈل کی تیاری کرتے ہوئے پہلی بار انگریزی سیکھنا شروع کی۔ ہمیں انگریزی پڑھانے والے ایک بڑے ہی باکمال ٹیچر تھے یونس مسیح، وہ بعد میں واشنگٹن گئے اور وہاں انگریزوں کو انگریزی پڑھانے لگے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا انگریزی پر کتنا عبور ہو گا۔ نگینہ سینما لاہور کے ساتھ ایک چرچ ہے جس کے ''فادر'' ان کے قریبی عزیز تھے۔ یونس مسیح چرچ کی خانقاہ میں رہا کرتے۔ وہ بہت ہی پیار سے بچوں کو پڑھاتے اور اگر کسی بچے کو سبق نہ آتا اور سکول ٹائم ختم ہو جاتا تو وہ چرچ میں بچوں کو اپنے پاس بلا لیتے کہ یہاں بیٹھ کر سبق یاد کر لو۔ سر یونس مسیح نے ہمیں پہلے ہی دن یہ سمجھایا تھا کہ اگر آپ نے انگریزی سیکھنی ہے تو پہلے اپنی بنیادیں مضبوط کرو۔ اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ کو سمال لیٹر اور کیپٹل لیٹرز کے استعمال کا پتا ہو۔ جتنے بھی ہیلپنگ وربز تھے، از، آر، ایم، واز، وَر، ہیو، ہیز، ہیڈ، ، ووڈ، شوڈ، کڈ، ، مئے، مائٹ، مسٹ 'ڈو، ڈڈ، ڈز۔ وغیرہ اور ایکٹو وائس، پیسو وائس، ڈائریکٹ، ان ڈائریکٹ' غرض یہ سب کچھ انہوں نے ہمیں چند دنوں ہی میں یاد کروا دیے تھے۔

یونس مسیح صاحب نے گریمر کے بنیادی قواعد ہمیں ڈیڑھ سال میں مکمل طور پر سکھا دیے۔ پھر انہوں نے ہمیں جملوں کی ماڈل کنسٹرکشن بھی بتائی تھی۔ انہوں نے یہ بتایا کہ 'کین' کہاں استعمال ہوتا ہے اور 'مے' کہاں استعمال ہوتا ہے۔ انہوں نے ہماری بنیادیں اس قدر مضبوط کی تھیں کہ مجھے انگریزی پر جو عبور ہے، یہ انہی استادِ محترم کا کمال ہے۔ اسی طرح انہوں نے جملوں کی ٹرانسلیشن کا طریقہ بھی بتا دیا تھا۔ خیر، میں نے آٹھویں کا امتحان دیا اور سب سے زیادہ نمبر میرے انگریزی میں آئے۔ پھر 1969ء میں میٹرک کرنے کے لیے گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی گارڈن (لاہور) میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

داخل کروادیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں ابھی تک بچوں کو ''ٹینس'' ہی سکھائے اور پڑھائے جا رہے تھے۔ استاد استاد ہوتا ہے وہ بھلے کرسچن ہو، ہندو ہو یا مسلمان، مجھے اس بحث میں نہیں پڑنا۔ کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا کہ ''جو مجھے ایک حرف بھی سکھا دے وہ میرا آقا ہے اور میں اس کا غلام ہوں وہ چاہے تو مجھے آزاد کر دے اور چاہے تو مجھے فروخت کر دے''۔ اب اس طرح بچپن ہی سے ہمارے ذہن میں استاد کا مقام اور مرتبہ بیٹھا ہوا ہے اور میں آج بھی اپنے استاد محترم سر یونس مسیح کو بہت یاد کرتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے بتایا گورنمنٹ ہائی سکول چو برجی گارڈن میں ابھی ٹینس ہی سکھائے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے اساتذہ سے کہا کہ یہ جو آپ پڑھا رہے ہیں یہ تو ہم آٹھویں جماعت میں پڑھ چکے ہیں۔ اس پر اساتذہ نے کہا کہ ہم آپ کا امتحان لیتے ہیں۔ اساتذہ مجھ سے مشکل جملہ بھی پوچھتے تو میں فوراً جواب دے دیتا۔ میں نے ان اساتذہ سے کہا کہ ٹینسز میں گفتگو کے 12 بنیادی طریقے بتائے جاتے ہیں لیکن جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو اس میں ہم صرف 12 طریقوں اور قرینوں سے گفتگو نہیں کرتے بلکہ گفتگو کے سینکڑوں ''شیڈز'' ہوتے ہیں۔ اب میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں سینکڑوں شیڈز میں گفتگو کر سکتا ہوں البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں بیسیوں شیڈز میں گفتگو کر سکتا ہوں۔ بہرحال میری انگلش پر اس درجہ کمانڈ سے اساتذہ بہت متاثر ہوئے۔

میں نے مارچ 1971ء میں میٹرک کا امتحان 619 نمبر لے کر گورنمنٹ ہائی سکول چو برجی گارڈن سے پاس کیا۔ یہاں میں یہ بھی بتا تا چلوں کہ جب میں میٹرک کر رہا تھا تو میری والدہ کا کہنا تھا کہ میں پڑھتا تو ہوں نہیں اور یونیورسٹی گراؤنڈ میں جا کر درختوں سے شہتوت توڑ کر کھاتا رہتا ہوں اور گھر آ کر کہتا ہوں کہ میں وہاں گراؤنڈ میں مطالعہ کر کے آیا ہوں لیکن جب 619 نمبر آئے تو وہ بھی حیران رہ گئیں۔ میرے آرٹس کے مضامین تھے، سب سے پسندیدہ انگلش اور اردو تھے۔ میرا ذہن شروع ہی سے حسابی کتابی نہیں تھا اس لیے میتھ میرے لیے سب سے بور مضمون رہا۔ میں جس سبجیکٹ سے بہت ڈرتا تھا، بدکتا تھا اور لرزاں و ترساں رہتا تھا وہ یہی ''میتھ'' تھا۔ مجھے زمانہ طالب علمی میں صرف دو بید رسید ہوئے جو میرے استاد محترم حافظ محمد صدیق صاحب نے رسید کیے تھے اور ایک چھڑی مجھے قاری یعقوب صاحب نے رسید کی تھی جو میرے میتھ کے ٹیچر تھے۔ یعقوب صاحب کلین شیو تھے لیکن وہ قاری کہلاتے تھے، ان کی آواز بہت اچھی تھی۔ اس کے علاوہ اپنی پوری تعلیمی زندگی میں مَیں نے کبھی کسی استاد سے مار نہیں کھائی۔ میرا یہ خیال ہے کہ یہ صرف قرآن پاک ہی کا اعجاز تھا کہ قرآن پاک حفظ کر لینے کے بعد میرا حافظہ اس قدر تیز ہوا کہ میں جو بھی لفظ ایک بار

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پڑھ لیتا وہ حفظ ہو جاتا۔

سکول میں جو ہفتہ وار بزم ادب ہوتی تھی اس میں گفتگو کرنے کے لئے ہر ہفتے مجھے کوئی نہ کوئی موضوع دیا جاتا، میں اس زمانے میں بھی تشبیہات اور استعارات کا بہت استعمال کرتا تھا۔ اردو پڑھنے اور گفتگو کرنے میں مجھے والدین کی گفتگو اوران کی لائبریری سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ میرے والدین کے ذوق علم کا اندازہ لگایئے کہ ان دونوں ہستیوں کی گھر میں الگ الگ لائبریری تھی۔ والد صاحب مجھے کہتے کہ دیکھو یہ ابوالکلام آزاد کی سب سے آسان کتاب ہے ''غبار خاطر'' اس کو ذرا پڑھ کر سناؤ۔ میں ''غبار خاطر'' پڑھ کر انہیں سناتا اور پھر والد صاحب وہ کتاب لے کر خود پڑھتے تھے اور بتاتے تھے کہ فلاں لفظ کا صحیح تلفظ یہ ہے۔ مولانا آزاد کے تذکرے سے یاد آ گیا کہ انہوں نے غبار خاطر میں اردو زبان کو اس قدر شگفتگی کے ساتھ مفرس اور معرب کیا ہے کہ یہ ان کی ایک مجتہدانہ کاوش بن گئی ہے۔ مجھے گھر کے ماحول میں جن ادیبوں کو سب سے پہلے پڑھنے کا موقع ملا ان میں شیخ فریدالدین عطارؒ، شیخ سعدیؒ اور مولانا رومؒ کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ میں نے اردو پڑھنے کا آغاز ہی مولانا آزاد سے کیا۔ گھر میں نوائے وقت آتا تھا اور اس وقت جن کالم نگاروں کو میں نے مستقل پڑھا ان میں ''میم شین'' اور وقار انبالوی نمایاں تھے۔ اسی زمانے میں عطاء الحق قاسمی نے کالم نگاری کا آغاز کیا۔ چونکہ ان کے کالموں میں اکثر ہدف تنقید ذوالفقار علی بھٹو ہوتے تھے تو ہم اس لیے بھی ان کا کالم شوق سے پڑھتے تھے کہ ہم پہلے ہی دن سے اینٹی بھٹو بھی تھے اور اینٹی پی پی بھی۔

والد صاحب گھر میں بیٹھ کر بآواز بلند مولانا رومیؒ کی مثنوی پڑھا کرتے اوران کے اشعار ہمارے کانوں میں ہر وقت پڑتے رہتے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک طالب علم کتاب دیکھ کر اتنا نہیں سیکھ سکتا جتنا وہ ایک کامل اور مشفق استاد کی زبان سے سیکھتا ہے۔ انسان اپنی آنکھوں سے زیادہ اپنے کانوں سے پیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وحی کا نزول ہوتا۔ تو فرشتہ پیغمبر کے کانوں میں آ کر آواز ڈالتا تھا جس کا القا دل میں ہوتا تھا۔ جب آپ پوری توجہ اور انہماک سے کوئی بات سنتے ہیں تو وہ حافظے سے کبھی محو نہیں ہو سکتی۔ بچپن، لڑکپن اور کہولت تک میں والد صاحب کو دیکھتا رہا کہ وہ رات کے دو بجے بھی مطالعہ میں مستغرق ہوتے۔ میں والد صاحب کے کمرے میں سوتا تھا۔ ان کے کمرے میں صرف دو چارپائیاں ہی لگی ہوتی تھیں ایک میری اور دوسری والد صاحب کی۔ باقی بچے ان کے کمرے میں اس لیے نہیں سوتے تھے کہ اباجی کے کمرے کی لائٹ ساری رات جلتی رہتی اور انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ کبھی میں دیکھتا کہ والد صاحب تفسیر ابن کثیر پڑھ رہے ہیں اور کبھی تفسیر مظہری، تفسیر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جلالین، تفسیر بیضاوی، الاتقان فی علوم القرآن پڑھ رہے ہیں۔ان مشکل کتابوں کے نام بچپن ہی سے میری لوحِ ذہن پر نقش ہو گئے تھے۔ جبکہ میں ان کا متن بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔تفسیر حقانی اردو میں ہے اور اس تفسیر جیسی ڈکشن اردو کی بڑی بڑی ادبی کتابوں میں بھی نہیں۔آپ اس تفسیر کو محض ''مولویانہ طرزِ تحریر'' قرار دے کر مسترد نہیں کر سکتے۔یہ تفسیر پورا ادبیانہ آہنگ لیے ہوئے ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں جو ادبیانہ آہنگ کی حامل تفاسیر ہیں ان میں ایک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن، دوسری پیر کرم شاہ الازہریؒ کی ضیاءالقرآن اور تیسری تفسیر حقانی ہے۔میرے خیال سے ان تینوں تفاسیر میں تفسیر حقانی کو پہلا نمبر دینا چاہیے۔

میرے متعلق لوگوں کا کہنا ہے کہ مَیں شستہ، شگفتہ اور نستعلیق اردو لکھتا اور بولتا ہوں۔ یہ میرا اپنا دعویٰ ہرگز نہیں ہے۔بعض طنزیہ طور پر کہتے ہیں کہ حافظ شفیق الرحمٰن کی تحریر پڑھتے ہوئے ہمیں بعض اوقات ڈکشنری سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی تحسین کا پہلو شامل ہے۔بعض لوگ یہ بھی کہہ کر طنز کرتے ہیں کہ حافظ صاحب متروک اردو لکھتے اور بولتے ہیں اور کچھ کا کہنا ہے کہ میں متروک اردو کو زندہ کر رہا ہوں۔اب یہ اللہ بہتر جانتا ہے، جتنے منہ اتنی باتیں۔

بہرحال میں اپنی تعلیم کا ذکر کر رہا تھا کہ 1971ء میں مَیں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور چلا گیا۔یہاں دلچسپی کی بات یہ بھی بتاتا چلوں کہ جماعت اسلامی کے سینئر راہنما انور گوندل صاحب جو زمانہ طالب علمی میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم رہے تھے۔ان سے والد صاحب نے میرے داخلے کے متعلق مشورہ لیا تو انہوں نے اس خیال سے مجھے اسلامیہ کالج میں داخل کروا دیا کہ ان دنوں اس ادارے میں جمعیت کی پوزیشن خاصی کمزور تھی اور وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ شاید یہ لڑکا اس ادارے میں جمعیت کا ''سرگرم'' کارکن ثابت ہوگا۔لہٰذا گوندل صاحب نے ''نظریہ ضرورت'' کے تحت مجھے اس کالج میں داخل کروا دیا کہ یہ لڑکا بڑے کام کا ہے۔میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ آرٹس کا جو میرٹ تھا وہ 617 تھا جبکہ میرے 619 نمبر تھے۔یہ مجھے تین چار سال بعد پتا چلا کہ میرے ساتھ کیا ''ہاتھ'' کیا گیا اور مجھے کیوں وہاں داخل نہیں کروایا گیا۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں جو دوست مجھے سب سے پہلے ملے وہ حسین ثاقب تھے، وہ کالج کی بزمِ ادب کے صدر تھے۔وہ مشہور رسالے ''حکایت'' کے ایڈیٹر اور ممتاز ادیب عنایت اللہ مرحوم کے داماد ہیں۔اس بزمِ ادب کے نگران اور تربیت کار پروفیسر حمید کوثر صاحب تھے۔انہیں شاعرِ نظریۂ پاکستان، حفیظِ ثانی اور فردوسیِ پاکستان کہا جاتا ہے۔میں نے ایک دن کالج کے حبیبیہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہال کے نوٹس بورڈ پر ایک اعلان پڑھا کہ بزم ادب کے زیر اہتمام ایک تحریری مقابلہ ہو رہا ہے اور جو طالب علم اس میں ٹاپ کرے گا اس کو بزم ادب کا جنرل سیکرٹری بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنا مضمون لکھا اور جمع کروا دیا۔ مضمون کا عنوان تھا: ''زندگی زندہ دلی کا نام ہے''۔ بزم ادب کے ایڈیٹوریل بورڈ نے میرا مضمون پاس کیا اور مجھے بزم کا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ جب میں نے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے اجلاس کنڈکٹ کرنا شروع کیے تو مجھ پر ایک نئی حقیقت منکشف ہوئی کہ میں تو گفتگو اور تقریر بھی کر سکتا ہوں۔ حسین ثاقب صاحب نے مجھے خوب راہنمائی فراہم کی۔ وہ کہا کرتے تھے، آپ فی البدیہہ اتنی پیاری بات کہہ دیتے ہو کہ کوئی ادیب ایسا جملہ سوچ سوچ کر بھی ادا نہیں کر سکتا۔ یہ آپ کے لیے خصوصی عطیہ خداوندی ہے اس لیے آپ محنت کریں اور اس اہلیت کو مزید نکھاریں۔

ویسے تو گھر سے سکول و کالج تک اور پھر خطابت اور صحافت کے میدان تک میرے اساتذہ کرام کی فہرست طویل ہے جن سے میں نے کسب فیض کیا۔ تاہم زمانہ طالب علمی میں میری ان صلاحیتوں کو جن دو عظیم شخصیات نے مہمیز دی اور میری آتش شوق کو بڑھانے میں نہایت کلیدی کردار ادا کیا وہ یہی پروفیسر حمید کوثر اور حسین ثاقب تھے۔

میرے دیگر اساتذہ میں واصف علی واصفؒ، ڈاکٹر مسکین علی حجازی اور آغا شورش کاشمیری سرفہرست ہیں۔ پروفیسر حمید کوثر صاحب کو پاکستان کے قومی ترانہ کے خالق اور فردوسی اسلام حفیظ جالندھری رحمہ اللہ علیہ نے اپنا متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنایا۔ حفیظ جالندھری کی صرف بیٹیاں ہی تھیں۔ حمید کوثر کے بیٹے مجید غنی آج بھی میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ یہ کالج میں مجھ سے جونیئر تھے۔ بہر حال بزم ادب کے زیر اہتمام کالج کے جو بھی پروگرام ہوتے حمید کوثر صاحب بڑے بڑے شعرا اور ادیبوں کو بلاتے۔ ہم نے بزم ادب کے ان پروگراموں میں جن بڑے لوگوں کو بلایا اور ان سے ان کی شاعری سنی، ان کی تقریریں سنیں اور ان کا فکر و فن ہمارے سامنے آیا ان میں ابو الاثر حفیظ جالندھری، احسان دانش، عبدالعزیز خالد (کمشنر انکم ٹیکس)، قتیل شفائی، پروفیسر مرزا منور، پروفیسر خالد بزمی اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ اسی طرح اس دور میں جو نئے نئے شعرا سامنے آ رہے تھے اور بعد میں بہت مشہور ہوئے ان کو بھی ہم اپنے ہاں بلاتے۔ ان میں امجد اسلام امجد تھے، یونس احقر جو کہ پنجابی کے ایک بڑے شاعر تھے ان کو بھی بلایا، ایم اے او کالج کے ایک پروفیسر تھے عارف عبدالمتین جو کہ اردو ادب میں تنقید کا ایک بہت بڑا نام ہے، یہ بھی بزم ادب میں آتے۔ گویا فرسٹ ایئر ہی میں میرا رابطہ حسین ثاقب صاحب اور پروفیسر حمید کوثر جیسی عظیم شخصیات کے توسط

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے جید قسم کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے ہو گیا تھا۔

یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ حضرت واصف علی واصفؒ میرے باقاعدہ استاد تھے۔ واصف صاحب نے نابھہ روڈ لاہور میں ''لاہور انگلش کالج'' کے نام سے ایک ٹیوشن سنٹر قائم کر رکھا تھا جس میں وہ خود طالب علموں کو پڑھایا کرتے۔ میں بھی ان کے پاس 1976ء میں انگریزی پڑھنے کے لیے گیا۔ واصف صاحب کلاس میں آتے تو کہتے کہ آج میں نے آپ کو فلاں انگریزی شاعر کی فلاں نظم پڑھانا ہے اور پھر وہ کتاب دیکھے بغیر معروف انگریزی شعرا ورڈز ورتھ، کیٹس، بائرن، شیلے وغیرہ کے اشعار سنایا کرتے۔ اس دور میں بی اے کے نصاب میں A book of verses underneath the bough تھی۔

واصف علی واصف 1980ء تک نابھہ روڈ پر رہے، تب تک میں باقاعدہ ان کی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ انہوں نے حلقہ تصنیف ادب کے نام سے ایک ادبی تنظیم بھی قائم کی تھی۔ اس تنظیم کے اجلاس الشجر بلڈنگ نیلا گنبد میں منعقد ہوتے اور میں باقاعدہ وہاں جایا کرتا۔ اس میں امجد اسلام امجد، ازہر درانی، اسلم کمال، تبسم رضوانی، ثمر اکبر آبادی، حفیظ تائب و دیگر بہت سے حضرات آیا کرتے۔ ازہر درانی ممتاز صحافی مولانا مرتضی احمد خان میکش کے پوتے تھے۔ ''شریک جرم نہ ہوتے تو مخبری کرتے''۔ یہ معروف شعر ازہر درانی ہی کا ہے۔ جنابِ واصف علی واصفؒ کی کلاس میں میرا رول نمبر 9 تھا اور وہ ہر طالب علم کو نام لے کر نہیں اس کے رول نمبر سے پکارتے۔ مثلاً مجھے کہتے تھے کہ ''مسٹر نائن'' ادھر آؤ۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ بھائی تمہارے نام کے ساتھ حافظ لکھا ہے کیا تم واقعی حافظ ہو یا ویسے ہی شوقیہ طور پر لکھا ہوا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ الحمدللہ حافظ قرآن ہوں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اچھا تو پھر مجھے سورہ مزمل سناؤ۔ ابھی میں نے کچھ ہی آیات تلاوت کی تھیں کہ فرمانے لگے ٹھیک ہے، تم واقعی حافظ ہو۔

اسکے بعد انہوں نے اپنے میز کی دراز میں ہاتھ ڈالا اور میری ٹیوشن فیس جو ان دنوں تین سو روپے ماہانہ تھی مجھے واپس کر دی اور فرمانے لگے کہ میں حافظ قرآن سے فیس نہیں لیا کرتا۔

میں حلقہ اربابِ غالبؔ کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ یہ حلقہ معروف دانش ور سراج منیر نے قائم کیا تھا۔ یہ وہی سراج منیر صاحب ہیں جو نواز شریف کے پہلے دورِ حکومت میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے سربراہ تھے۔ اس حلقے میں اس وقت کے معروف ادیب اور شاعر شریک ہوتے تھے۔

جب میں 1971ء میں کالج پہنچا تو ان دنوں پورے پاکستان کے طول و عرض میں پنجاب یونیورسٹی کے صدر مخدوم جاوید ہاشمی ''بنگلہ دیش نامنظور تحریک'' چلا رہے تھے۔ ہم جاوید ہاشمی کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پرستار تھے اور جہاں بھی جلوس نکلتا ہم وہاں پہنچ جاتے۔ ابھی تک میں باقاعدہ اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل نہیں ہوا تھا لیکن جاوید ہاشمی کی شعلہ بیانی، ان کی جرات، بہادری اور ان کا حکومتوں کو کو للکارنا، پچھاڑنا اور انتظامیہ کو لتاڑنا' یہ وہ چیزیں تھیں جو میرے ذہن میں جاوید ہاشمی کو ایک رول ماڈل کے طور پر ابھار رہی تھیں۔ چونکہ نویں اور دسویں جماعت کے دوران میں نے نسیم حجازی کے ناول بھی پڑھے تھے تو نسیم حجازی کے ایک ناول میں جو معظم علی ایک کردار ہے یا جو اندلس کا ایک ہیرو بدر بن مغیرہ ہے، میں جاوید ہاشمی کو انہی کرداروں کے روپ میں ایک زندہ کردار تصور کرتا تھا۔ اسی دور میں میرے جاوید ہاشمی کے ساتھ ذاتی تعلقات بنے جو محض ہیلو ہائے تک نہیں بلکہ بہت قریبی تعلقات تھے۔ جاوید ہاشمی پیر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، بعد میں وہ سجادہ نشین بھی بنے۔ جاوید ہاشمی میں زمانہ طالب علمی میں روایتی پیروں والی بات تھی یا نہیں تھی لیکن ایک بات ان میں ضرور تھی کہ وہ جلدی دوست بنا لینے کا ہنر جانتے تھے۔

کالج کی تمام ادبی سرگرمیاں کالج کے تاریخی حبیبیہ ہال میں ہوا کرتی تھیں اور میں ان میں خوب حصہ لیتا۔ پروفیسر حمید کوثر نے مجھے کہا کہ آپ کالج کی طرف سے مختلف مباحثوں میں شریک ہوا کریں گے۔ میں بتاتا چلوں کہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کا حبیبیہ ہال ایک تاریخی ہال ہے۔ یہ ہال افغانستان کے بادشاہ امیر حبیب اللہ خان کے نام سے منسوب ہے۔ یہ وہ ہال ہے جس میں سرسید احمد خان نے خطاب کیا، اس میں مولانا الطاف حسین حالی نے اپنا کلام سنایا، اسی ہال میں مولانا ابوالکلام آزاد نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں شرکت کی تھی۔ جب میں حبیبیہ ہال کے ڈائس پر کھڑے ہو کر تقریر کرتا تو میرے ذہن میں یہ سارا تاریخی پس منظر ابھر آتا اور میں خود پر فخر محسوس کرتا۔ میں تقریر کرنے سے پہلے سوچتا کہ یہ عام سٹیج نہیں ہے لہٰذا مجھے یہاں پر ثقہ قسم کی بات کرنی ہے، کیونکہ یہاں بڑے بڑے علماء، صلحا، ادبا، فصحا، شعرا اور خطبا اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں اور مجھے ان اکابرین و مشاہیر کے وقار و افتخار اور نام و مقام کا پاس رکھنا ہے۔ لہٰذا اس ہال کے ڈائس پر کھڑے ہونے کے ذوق و شوق میں مجھے کتب بینی کے موروثی میلان اور فطری رجحان کو مزید اجالنا پڑا۔ اس میں میری راہنمائی پروفیسر حمید کوثر، پروفیسر سردار جمیل اور پروفیسر بشیر چٹھہ صاحبان نے کی۔ چٹھہ صاحب بڑے ہی باکمال انسان تھے۔ وہ اردو کے سینئر پروفیسر اور زبردست ادیب تھے لیکن اگر کوئی طالب علم کوئی اچھا جملہ بول دیتا تو وہ اس انداز میں اسے داد دیتے جیسے کسی مشاعرے میں کوئی عام سخن شناس و سخن فہم سامع کسی بڑے شاعر کو داد دیتا ہے۔ یہ انکی خرد نوازی تھی، کیونکہ کسی شاگرد کی اہلیت کو نگینے کی طرح تراش دینا ہی کسی استاد کا کمال ہوتا ہے اور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یہ کمال ہمارے ان اساتذہ میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کوئلے کی کان سے ہیرا تلاش کر لیتے تھے۔ یہ لوگ ہیرا نہ صرف تلاشتے بلکہ پھر اسے تراشتے بھی تھے۔

پھر میں نے اساتذہ کے حکم کے مطابق مختلف مباحثوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ انہی دنوں ایسا ہوا کہ میرے والد صاحب کو دکان میں بہت زیادہ خسارہ ہونے لگا اور ہمارے مالی حالات کمزور ہونے لگے۔ میں نے کالج کی طرف سے پہلی مرتبہ علی پور میں ایک ڈیبیٹ میں حصہ لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی انٹر کالجیٹ ڈیبیٹ میں حصہ لے رہا تھا، میں ابھی اس میدان میں ''نووارد'' یعنی تازہ واردِ بساطِ خطابت' تھا۔ میں نے اس پروگرام میں تقریر کی اور اس کا رزلٹ جب آیا تو الحمد للہ اس اہم اور پہلی تقریب میں میری دوسری پوزیشن جبکہ پہلی پوزیشن جناب افتخار فیروز کی تھی۔ میری پانچ منٹ کی تقریر تھی جس میں بیسیوں مقررین تھے۔ اس ڈیبیٹ میں پنجاب یونیورسٹی کے مقررین بھی تھے، افتخار فیروز صاحب وہاں موجود تھے۔ اکرم شیخ (سابق اٹارنی جنرل آف پاکستان) اس وقت پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں زیر تعلیم تھے انہوں نے بھی تقریر کی۔ گوجرانوالہ کے ایک ممتاز طالب علم راہنما تھے سلمان کھوکھر انہوں نے بھی تقریر کی۔ یہ آج کل پاکستان کے نامور ایڈووکیٹ ہیں۔ فیصل آباد سے ایک ڈیبیٹر تھے عاشق حسین کنگ یہ پنجابی کا ایک لاثانی ڈیبیٹر تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ان کی طرح کسی کو بھی پنجابی بولتے نہیں دیکھا۔ ہاں شاید سلمان کھوکھر ان کے ہم پلہ تھے۔ یہ اپنے وقت کے بڑے بڑے طالب علم ڈیبیٹر تھے جن میں ایک میں بالکل نیا تھا۔ اس کے بعد میں نے مستقل طور پر ڈیبیٹس میں حصہ لینا شروع کیا۔ ان دنوں کالج فیس صرف چھ روپے تھی اور مجھے کالج کی طرف سے ڈیبیٹ میں جانے کے سو روپے کے قریب مل جاتے تھے۔ اس طرح میں مہینے بھر میں کوئی دس پندرہ تقریری مقابلوں میں حصہ لیتا اور مجھے کسی نہ کسی پوزیشن میں انعامات ملتے رہتے۔ میں تمام مقابلوں میں فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ رہا۔ سچ پوچھیں تو مجھے اس وقت پوزیشنوں سے کوئی سروکار نہ تھا کیونکہ ایک تو میں خود فن تقریر میں ملکہ حاصل کرنا چاہتا تھا اور دوسرا اس ذریعے سے میری کچھ نہ کچھ آمدنی بھی شروع ہوگئی تھی اور میں والد صاحب کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ میں اس دور میں ہر ماہ تین چار سو روپے اپنے گھر والوں کو دینے لگا تھا۔

1973ء میں جب میں نے انٹر کا امتحان دیا تو چونکہ میں ڈیبیٹس کے چکر میں زیادہ پڑ گیا اور پڑھائی پر زیادہ توجہ نہ دے سکا، یوں میری نصابی سرگرمیوں کی لو مدھم پڑ گئی اور غیر نصابی سرگرمیوں کا الاؤ بہت زیادہ بھڑک اٹھا جس کی وجہ سے اس امتحان میں میری سیکنڈ ڈویژن آئی۔ کالج میں میرے مضامین اکنامکس، جیوگرافی، سائیکالوجی، اردو اور انگلش تھے۔ جب میں تھرڈ ایئر میں تھا تو میری

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تقریروں کی خوب شہرت ہوگئی۔ انہی دنوں کالج میں یومِ اقبال منایا گیا اور اس تقریب کی صدارت اس زمانے کے وزیر اطلاعات ونشریات اور حج واوقاف مولانا کوثر نیازی مرحوم نے کی۔ کوثر نیازی اپنے وقت کے بہت بڑے خطیب، شاعر اور صحافی تھے۔ ان کی صحافت اور سیاست سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی خطابت اور شاعری کے بارے میں اگر کوئی شک کرتا ہے تو میں یہ کہوں گا کہ:

''ہر چہ شک آرد کافر گردد''۔

مجھے اس موقع پر جو موضوع دیا گیا اس کا عنوان تھا: ''اقبال اور مُلا''۔ ہمارے وائس پرنسپل عبدالحیی نائیک صاحب جو کہ اندرون موچی دروازہ میں پیپلز پارٹی یونٹ کے سرپرست بھی تھے، نے مجھے کہا کہ دیکھو پیپلز پارٹی کی حکومت ہے اس لیے آپ ذرا مولانا کوثر نیازی صاحب، بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی کی تعریف کر دیجیے گا۔ آپ کا موضوع بھی ایسا ہے کہ آپ بھٹو مخالف مولویوں کو آسانی سے رگڑا دے سکتے ہیں۔ میں یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا چنانچہ میں نے کہا، جیسے آپ حکم دیں گے ویسی ہی تقریر ہوگی۔ مجھے انتظامیہ کی طرف سے ایک فہرست دی گئی جس میں مولانا مودودیؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مفتی محمودؒ، مولانا عبدالحق حقانی، پروفیسر عبدالغفور اور دیگر علماء جو بھٹو مخالف کیمپ میں تھے ان کے نام تھے کہ آپ نے ان مولویوں کو آڑے ہاتھوں لینا ہے تاکہ مولانا کوثر نیازی خوش ہو جائیں۔ میں نے تقریر شروع کی اور ابتدائیہ میں اقبال کے حوالے سے دو چار جملے کہے۔ مولانا کوثر نیازی اس وقت سٹیج پر موجود تھے اور کسی کے ساتھ محوِ گفتگو تھے، کیونکہ میرے جیسے طالب علم کی بات کون سنتا تھا۔ پھر مولانا تو خود بہت بڑے خطیب اور سیاستدان تھے۔ لیکن جب میں نے ابتدائی جملے کہے تو میں نے دیکھا کہ مولانا کوثر نیازی نے اپنے منہ پر انگلی رکھ کر قریب بیٹھے صاحب کو خاموش ہونے کا کہا اور میری طرف اشارہ کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ خاموش رہیں اور اس طالب علم کو سنیں۔ میں نے اپنی گفتگو میں کہا کہ آؤ! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اقبال نے جس ملاّ کو ہدف تنقید بنایا ہے وہ کون ہے؟ ''دین ملاّ فی سبیل اللہ فساد'' یہ ایک مصرع ہے۔ جس کو لے کر دین بے زار لوگ علماء کی عظیم خدمات کو رگید رہے ہیں۔ حالانکہ اقبال بذات خود جس شخص کو اپنا مرشد اور مربی کہتا ہے اس کے نام کا پہلا حصہ ہی مولانا بلکہ ملاّ ہے۔ یعنی مولائے روم۔ لفظ ''ملاّ'' کو یہاں گالی سمجھا جا رہا ہے حالانکہ فارسی اور عربی لٹریچر میں علم و فضل کی معراج پر پہنچنے والے شخص کو ملا کہا جاتا ہے۔ مثلاً ملا علی قاری اور مولانا روم وغیرہ۔ اس طرح کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں کہ جن لوگوں کے نام کے ساتھ ملاّ لکھا جاتا ہے وہ اپنے وقت کے بہت بڑے علماء و مشاہیر تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال نے جن لوگوں کو عالم ہوتے ہوئے ان کے شخصی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تضادات اور سیرت کے دوہرے پن کی بنیاد پر ان کو ہدف تنقید بنایا وہ ان علماء کو بنایا جو ''دربار اکبری'' میں جا کر جی حضوری کرتے اور ملا فیضی، ملا ابوالفضل اور ملا مبارک بن جاتے تھے۔ اقبال نے اس ملاّ کی مذمت کی تھی جو تخت پر بیٹھے براجمان ''ان پڑھ اعظم'' کو ''اکبر اعظم'' کا خطاب دیتے اور ان کی اندھی تعریف و ستائش کرتے اور اپنے دور کے اکبر کے ''نورتنوں'' میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو آج بھی ایسے ملا لوگ موجود ہیں جو اقتدار کی دہلیز پر سجدہ ریز رہتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم علمائے حق ہیں اور جو بھی وقت کے حاکم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اس کو ''ملاّ'' کہہ کر اس کی تحقیر و تضحیک کرتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال نے اعلائے کلمۃ الحق بلند کرنے والے علماء کو ''ملاّ'' کہہ کر ہرگز تحقیر نہیں کی۔ لہٰذا ناقدین حضرات اپنی اصلاح فرمالیں۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اقبال نے ملا ان کو کہا ہے جن کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ اقبال کا ملا وہ ہے جو ہمیں فائیو سٹار ہوٹلوں کے ہال میں تقریر کرتے ہوئے یہ تو بتاتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے ہاں فقر و فاقہ رہتا تھا اور وہ فقر کو اپنی معراج سمجھتے تھے اور خود وہ جس ہال میں تقریر کر رہا ہوتا ہے وہاں ٹیبل پر درجنوں اقسام کے کھانے رکھے ہوتے ہیں۔ یہ وہ ملاّ ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ پیوند لگا لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے اور وہ خود امپورٹڈ جوتے اور کپڑے پہنتا ہے اور اطلس و حریر اور ریشم و پرنیاں کی قباؤں میں ملبوس ہوتا ہے۔ دراصل اسی تضاد کی وجہ سے لوگ علماء سے دور ہوئے ہیں۔

اب اسے محض اتفاق ہی کہیے کہ مولانا کوثر نیازی صاحب نے کچھ دن قبل ہی پرل کانٹینٹل ہوٹل میں منعقدہ ایک سیرت کانفرنس میں خطاب کیا تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ طالب علم براہ راست مجھ سے ہی مخاطب ہے۔ بہرحال میری تقریر کی عوامی اور طالب علموں کی سطح تک بہت پذیرائی ہوئی اور خوب تالیاں بجائی گئیں۔ میری تقریر 7 منٹ کے بجائے سترہ منٹ ہوئی۔ اس تقریب میں خطاب کے لیے جن لوگوں کو دعوت دی گئی تھی ان میں ماہر اقبالیات پروفیسر مرزا منور، اس وقت کے بہت بڑے شیعہ عالم خطیب آل محمد سید اظہر حسن زیدی، مسلم مسجد لوہاری کے بانی اور نامور خطیب مولانا محمد بخش مسلم بی اے اور خطیبِ شاہی مسجد مولانا عبدالقادر آزاد بھی موجود تھے۔ میری تقریر کے بعد مولانا کوثر نیازی نے کہا کہ بس اب میں خود تقریر کروں گا اور باقی تمام تقریریں منسوخ ہیں۔ انہوں نے آتے ہی اپنے مخصوص انداز میں پہلا جملہ یہ کہا کہ ادھر آ! میرے نادان دوست! میں تجھے بتاتا ہوں کہ اقبال کا ''ملاّ'' کون ہے۔ اقبال کا ملا وہ ہے جس نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ اقبال کا ملا وہ ہے جس نے قائداعظم کو کافر اعظم کہا۔ اقبال کا ملا وہ ہے جو آج

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

قائداعظم کے بعد سب سے بڑے لیڈر بھٹو کی بھی مخالفت کر رہا ہے...... میری اس تقریر کی دھوم آغا شورش کاشمیری مرحوم تک حمید اصغر نجید اور خواجہ افتخار موحوم نے پہنچائی۔ اور اس زمانے کے معروف کالم نگار جناب رفیق ڈوگر نے اپنے کالم 'دید وشنید' میں بھی اس کا تذکرہ کیا۔

تقریب ختم ہوئی اور میں برف خانہ چوک میں پہنچا (برف خانہ چوک کی بھی اپنی ایک ہسٹری ہے۔ اسے برف خانہ چوک اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہاں میاں نواز شریف کے والد گرامی میاں محمد شریف مرحوم نے اپنا ایک برف خانہ قائم کیا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام برف خانہ چوک پڑ گیا) وہاں پیپلز پارٹی کی ایک ذیلی تنظیم ''پیپلز گارڈ'' (جو غنڈہ گردی اور فسطائیت کے لیے بنائی گئی تھی) کے غنڈے میرے انتظار میں تھے۔ غنڈوں کا کام تھا کہ جو بھی ان کے قائدین کی توہین کرے اسے نقد و نقد ہی سبق سکھا دیتے تھے۔ اس وقت پیپلز گارڈ کے چیئرمین طارق وحید بٹ تھے۔ یہ وہی طارق وحید بٹ ہیں جنہوں نے بعد میں اپنی سیاسی یادداشتیں ''میری آواز'' کے عنوان سے بھی لکھیں۔ بہر حال پیپلز گارڈ کے پانچ سات افراد نے مجھے گھیر لیا۔ ان میں طارق وحید بٹ اور ذوالفقار زلفی تھے جو بعد ازاں دیال سنگھ کالج میں پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بھی بنے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے آپ کے قائدین کو گالیاں ہرگز نہیں دیں اور نہ ان کی کردار کشی کی ہے۔ اسی اثنا میں ایک بندے نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور ایک زناٹے دار تھپڑ میرے دائیں کان پر رسید کیا۔ کئی دن تک میرا کان سائیں سائیں کرتا رہا۔ یوں مجھے اس تقریر کے فوری بعد ہی اس کی سزا مل گئی۔

ہفت روز ''چٹان'' کے ایڈیٹر آغا شورش کاشمیری اور ہفت روزہ ''شہاب'' کے ایڈیٹر مولانا کوثر نیازی کے مابین 1970ء کے انتخابات سے پہلے ایک بہت بڑی قلمی جنگ ہوئی تھی۔ اسے مکمل طور پر صحافتی میدان کی ایک قسم کی ''پانی پت کے چوتھی جنگ'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دوران ایسا ہوا کہ ایک روز ٹولنٹن مارکیٹ میں کوثر نیازی اور بطل حریت آغا شورش کاشمیری کا آمنا سامنا ہو گیا۔ آغا صاحب آؤ دیکھا نہ تاؤ مولانا پر یوں جھپٹ پڑے جیسے شکرا تلور پر حملہ آور ہوتا ہے۔ دونوں غصے میں بے قابو تھے۔ دونوں نے دیکھتی آنکھوں ایک دوسرے پر دکانوں پر موجود ڈبے اور بوتلیں اٹھا اٹھا کر چاند ماری شروع کر دی۔ انہی دنوں مولانا کوثر نیازی نے اپنے اخبار ''شہاب'' میں آغا شورش کاشمیری کی کردار کشی کا ایک طولانی سلسلہ شروع کیا ہوا تھا جس کے جواب میں آغا صاحب ''چٹان'' میں جوابِ آں غزل ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے'' کے مصداق لکھا کرتے۔ بعد میں اہم علمی شخصیات نے ان حضرات کی صلح کروائی۔

انٹرمیڈیٹ کے بعد میں نے اسلامیہ کالج میں گریجوایشن میں داخلہ لے لیا۔ اب یوں ہوا کہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مولانا کوثر نیازی صاحب نے مجھے جس قدر اچھال دیا تھا اس وجہ سے میں اسلامی جمعیت طلبہ والوں کی نظروں میں آ گیا وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔ ان حالات میں مجھے بھی ضرورت پڑ گئی کہ میں اپنے تحفظ کے لیے کسی تنظیم کا سہارا لے لوں۔ اس وقت کالج میں تین بڑی سیاسی جماعتوں کے سٹوڈنٹس ونگ موجود تھے۔ ایک پیپلز پارٹی کا پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن، دوسرا کمیونسٹوں کا جونیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے کام کر رہا تھا۔ کمیونسٹ نظریات کے یہ لوگ بھٹو کے ساتھ بھی شامل نہیں ہوئے تھے اور ان کے مخالف تھے۔ البتہ ان کے کچھ لوگ بھٹو کے ساتھ مل گئے جن میں پرویز رشید (سابق وفاقی وزیر اطلاعات) وغیرہ شامل ہیں۔ پرویز رشید این ایس ایف کے بانیوں میں سے تھے اور تیسرا دھڑا اسلامی جمعیت طلبہ کا تھا۔ مجھے جمعیت والوں نے کہا کہ 1969ء کے بعد اس کالج سے جمعیت کامیاب نہیں ہوئی۔ تمام سیٹیں یا تو پی ایس ایف جیت جاتی ہے یا پھر این ایس ایف۔ اب ہم ایک مضبوط پینل سامنے لا رہے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ نائب صدر کے امیدوار آپ ہوں۔ یوں میں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ ان انتخابات میں حصہ لیا اور ایک ایک کلاس میں جا کر تقریریں کیں۔ یہاں پھر میری خداداد خطابتی صلاحیت کام آئی، تقریروں نے اپنا رنگ دکھایا اور مخالفین کی بھرپور مہم کے باوجود میں الیکشن میں کامیاب ہو گیا۔ اب میرے پاس کالج کا ایک پورٹ فولیو تھا، میں لاہور سٹوڈنٹس کونسل کا بھی ممبر تھا۔ یہ کونسل لاہور کی تمام منتخب طلبہ جماعتوں کا ایک اتحاد تھا۔ میں نے تھرڈ ایئر میں آ کر مباحثوں میں اسی طرح حصہ لینا جاری رکھا۔

1970ء کے بعد چونکہ ہمارا گھرانہ معاشی بدحالی کا شکار ہو گیا تھا اس لیے گرمیوں کی چھٹیوں میں مَیں نے اپنی گلی میں موجود چوہدری قطب دین کی بیکری میں سیلز مینی کا کام شروع کیا۔ وہ پورے لاہور میں بند، پیسٹریاں، کیک اور بسکٹ کی سپلائی دیتے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس کام کروں تو وہ کہنے لگے کہ آپ کے پاس سائیکل ہے تو آ جاؤ اور کام کرو۔ انہوں نے میری سائیکل کے پیچھے لوہے کا صندوق رکھ دیا جس میں تمام بیکری کی اشیاء تھیں، یوں میں نے پورے دو مہینے کرشن نگر، راج گڑھ، سمن آباد، شادمان کے علاقوں میں سپلائی دی۔ اس دور میں بھی میں ماہانہ چھ سات سو روپے کما تا تھا۔ اس زمانے میں گریڈ 17 کے افسر کی تنخواہ بھی 600 یا 700 ہی ہوتی تھی۔ اس طرح میں نے گھر کے معاشی بحران پر قابو پانے میں کردار ادا کیا۔

یہاں یاد آ گیا کہ اس سے بھی پہلے جب میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ تھا تو میں نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

والد صاحب کے حکم پر نہانے والے فوم کی سپلائی کا کام کیا تھا۔ یہ نہانے والے فوم ہماری گلی میں ایک صاحب رہتے تھے وہ بناتے تھے۔ میں نے سمن آباد، شاہ عالمی، گلبرگ مین مارکیٹ میں چار پانچ ماہ تک سپلائی کا کام کیا۔ اس طرح 1974ء میں مَیں نے مباحثوں سے ملنے والے پیسوں اور سیلز مینی کے ذریعے ملنے والے پیسوں سے گھر والوں کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ مجھے دیگر نوکریوں سے سیلز مینی زیادہ مناسب لگی کیونکہ یہ ایک تو آزاد کام تھا کہ آپ جب چاہیں سپلائی دے دیں اور جب چاہیں چھٹی کر لیں، اس میں کوئی خاص پابندی والی بات نہیں تھی پھر اس کا معاوضہ بھی اچھا ملتا تھا لیکن بعد میں مَیں اس گھومنے پھرنے والے کام سے بھی اکتا گیا اور دل چاہتا تھا کہ کہیں بیٹھ کر کام کروں۔

جن دنوں میں اسلامیہ کالج میں سٹوڈنٹس یونین کا نائب صدر تھا، میں نے راج گڑھ کے جماعت اسلامی کے ایک صاحب سے بات کی کہ مجھے کوئی کام چاہیے کیونکہ اب سیلز مینی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ میں عصر کی نماز اکثر ریواز گارڈن میں بیت المکرّم مسجد میں پڑھا کرتا تھا۔ پریم نگر اور ریواز گارڈن میں تھوڑا ہی فاصلہ تھا، ان صاحب سے میری ملاقات اسی مسجد میں ہوئی تھی اور معلوم ہوا کہ وہ بھی جماعت اسلامی کے ہم نوا ہیں۔ ان صاحب کی شیشے کے برتن بنانے والی فیکٹری تھی، انہوں نے مجھے کام پر رکھ لیا۔ یہ فیکٹری چوہنگ میں تھی اور بھٹو صاحب کے اس دور میں یہ بات اچھی تھی کہ طالب علموں کی بس کی ٹکٹ دس پیسے فکس ہوگئی تھی۔ یوں چوہنگ فیکٹری میں آنے جانے کے میرے بیس پیسے لگتے تھے۔ میں روزانہ ماں سے پانچ روپے لے کر جاتا، دوپہر کا کھانا بھی کھاتا اور پھر بھی تین روپے بچا لیتا تھا۔ میں بے فکر تھا کہ میں سیلز مینی میں ماہانہ پانچ چھ سو روپے کما لیتا تھا تو اس فیکٹری میں تو مجھے زیادہ پیسے مل جائیں گے کیونکہ یہ زیادہ مشقت طلب کام تھا۔ جون کی شدید گرمی میں جب سورج کی کرنیں آگ برساتی ہیں اس میں میرا کام یہ ہوتا تھا کہ فاؤنڈری میں جہاں پر شیشہ پگھلتا اور اس کے فلاسک یوں نکلتے تھے جس طرح تندور سے روٹیاں نکالتے ہیں۔ میں اس آگ کے سامنے کھڑے ہو کر گنتی کرتا تھا کہ کتنے فلاسک گر گئے اور کتنے جگ بن گئے اور کتنے گلاس۔ لیکن ہوا یہ کہ جب میں نے ایک ماہ کے بعد تنخواہ طلب کی تو انہوں نے مجھے اکاؤنٹنٹ کے پاس بھیج دیا اور اکاؤنٹنٹ نے ایک رجسٹر میرے آگے کر دیا کہ یہاں دستخط کر دیں۔ میں نے کہا کہ پہلے بتائیں کہ میری تنخواہ کتنی ہے تو اس نے کہا کہ ڈیڑھ سو روپے۔ میں نے کہا کہ ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ تو میرے یہاں آنے جانے میں خرچ ہو گئے ہیں اور اس قدر محنت کا صرف اتنا معاوضہ دے رہے ہیں۔ یوں اسی دن میں نے یہ کام چھوڑ دیا۔

1975ء میں دوبارہ طلبہ یونین کے الیکشن ہوئے اور میں یہ الیکشن ہار گیا کیونکہ انہی دنوں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرے والد صاحب کا علی ہسپتال میں آنکھ کے موتیے کا آپریشن ہوا۔ یاد رہے کہ یہ آپریشن آج کل کی طرح آسان نہ تھا بلکہ اس دور میں موتیے کا آپریشن ایک بہت بڑا آپریشن تھا، کئی دنوں تک مریض ہسپتال میں رہتا اور پھر ایک عرصہ تک اس کی آنکھوں پر سبز پٹی بندھی رہتی۔ لہذا میں الیکشن مہم نہ چلا سکا اور الیکشن ہار گیا۔ 1976ء میں اے جی پی ٹی این ٹی میں سینئر اور اور جونیئر آڈیٹر کی نوکریوں کے متعلق خبر شائع ہوئی۔ میں چونکہ گریجوایشن کا طالب علم تھا لہٰذا میں نے اپلائی کر دیا۔ میرا ٹمیسٹ اور انٹرویو کامیاب ہوا اور مجھے نوکری مل گئی اور نومبر 1976ء میں بطور سینئر آڈیٹر بھرتی ہو گیا۔ اب یہ جتنے بھی اکاؤنٹس کے محکمے ہوتے ہیں وہ اے جی پنجاب ہو یا اے جی پی ٹی اینڈ ٹی ہو وہاں ساری فائلیں جب ''باس ٹو باس'' یا ''ٹیبل ٹو ٹیبل'' آگے بڑھتی ہیں تو ان کے نیچے چاندی کے پہیے لگانے پڑتے ہیں، ظاہر ہے کہ وہ پہیے آڈیٹر اپنے پاس سے تو نہیں لگا سکتا لہٰذا جو سائل ہوتا ہے اس سے خوب رشوت لی جاتی ہے۔ میرے سپرنٹنڈنٹ رفیق اختر صاحب تھے میں نے ان سے کہا کہ میں تو یہ کام نہیں کر سکتا تو اس پر انہوں نے کہا کہ بھائی آپ پھر فائلوں کو ہاتھ نہ لگایا کریں کیونکہ اس طرح آپ ہمارا بھی حق ماریں گے۔ یوں میں دفتر وقت پر آ جاتا تھا اور آٹھ گھنٹے بیٹھ کر چھٹی کر جاتا اور فائلوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ چند ماہ بعد ہی میں نے یہ پکی سرکاری نوکری بھی چھوڑ دی۔

دسمبر 1976ء میں جاوید ہاشمی نے اسلامی جمعیت طلبہ کو خیر باد کہا تو جماعت اسلامی والوں کا خیال تھا کہ اب وہ جماعت میں باقاعدہ شامل ہو جائیں گے لیکن انہوں نے ایئر مارشل اصغر خان مرحوم کی تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کر لی۔ اسی دور میں راولپنڈی سے شیخ رشید نے بھی تحریک استقلال جوائن کی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کا ایک اور قد آور نام تھا حفیظ خان، یہ بھی جمعیت کو چھوڑ کر تحریک استقلال میں آ گئے۔ حفیظ خان انگریزی کے اتنے بڑے ڈیبیٹر تھے کہ میں نے ان کے متعلق ثقہ راویوں سے سنا ہے کہ جب وہ پنجاب یونیورسٹی میں سٹوڈنٹس یونین کے صدر تھے تو وزیر اعظم بھٹو نے انہیں پیغام بھیجا کہ میں نے آپ کی انگریزی خطابت کی بڑی شہرت سنی ہے اور میں آپ کی تقریر سننے یونیورسٹی آنا چاہتا ہوں تو حفیظ خان نے انکار کر دیا تھا۔ خیر یہ بات تو ایک طرف رہنے دیں میرا بتانے کا مقصد یہ ہے کہ حفیظ خان انگریزی زبان کا بہت بڑا مقرر تھا۔ اس زمانے میں تعلیمی اداروں میں صرف دو ہی بڑے ڈیبیٹرز کا نام گونجتا تھا، ایک افتخار فیروز اور دوسرے حفیظ خان۔ جاوید ہاشمی ایک شعلہ بیان اور جذباتی مقرر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ وہ جس مجمع میں بھی کھڑے ہو جاتے اس میں جان ڈال دیتے۔ ان کی آتش بیانی ضرب المثل بن چکی تھی۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جب دسمبر 1976ء آیا تو جاوید ہاشمی جو کہ زمانہ طالب علمی ہی سے میرے لیے ایک رول ماڈل طالب علم لیڈر تھے۔ ان کی پریس کانفرنس میں نے اخبار میں پڑھی کہ وہ اسلامی جمعیت طلبہ چھوڑ کر ایئر مارشل اصغر کی تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کر چکے ہیں۔ انہی دنوں یعنی دسمبر 76ء ہی میں ذوالفقار علی بھٹو نے عام انتخابات کا اعلان کر دیا کہ یہ انتخابات مارچ 1977ء کے اوائل میں ہوں گے۔ پھر بھٹو مخالف 9 سیاسی جماعتوں کا قومی اتحاد بن گیا۔ جس میں لیفٹ رائٹ کی تمام سیاسی جماعتیں شامل تھیں۔ مسلم لیگ آفس ڈیوس روڈ لاہور جو کہ صاحبزادی محمودہ بیگم کی ملکیت تھا، وہاں پر قومی اتحاد کا بڑا اہم اجلاس ہوا اور نو جماعتوں نے شرکت کی اور ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر یہ اعلان کیا کہ ہم بھٹو کو برطرف کرنے کے بعد بھی متحد رہیں گے۔

77ء کے الیکشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جاوید ہاشمی نے مجھے بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ہاشمی صاحب لاہور سے صوبائی نشست پر الیکشن لڑ رہے تھے اور ان کا انتخابی دفتر رانا چیمبر پرانی انارکلی میں واقع تھا۔ یہ عمارت معروف سیاسی شخصیت رانا نذر الرحمٰن کی تھی۔ یہاں پر میں باقاعدہ آتا۔ مجیب الرحمٰن شامی کے رسالے ''اسلامی جمہوریہ'' کا دفتر بھی اسی عمارت میں دوسرے فلور پر ہوا کرتا تھا۔

73ء سے 76ء تک میرا زمانہ طالب علمی تھا میں جناب مجیب الرحمان شامی کا ہفتہ وار رسالہ اور آغا شورش مرحوم کا ''چٹان'' باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ ان دنوں چونکہ شامی صاحب اپنے اداریوں اور دوسری تحریروں میں بھٹو حکومت کے خلاف کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے تو اس کے رسالے کے بار بار ڈیکلیریشن ضبط ہوتے رہے۔ ان کے نام تھا: اذان حق، لیل و نہار، اداکار، الحدید، اسلامی جمہوریہ، زندگی رفاقت اور طاہر۔ اب شامی صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ کبھی ان کا پرچہ تعطل کا شکار نہ ہوا، ان کا ایک ڈیکلریشن منسوخ ہوتا تو دوسرا آ جاتا۔ یہ اس ققنس کی طرح تھے جو اپنی ہی راکھ میں جل کر دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ شامی صاحب کے پرچوں کی بندشیں اور پیہم منسوخیاں اور ہر منسوخی کے بعد ان کا دوبارہ ایک نئے انداز اور نئے آہنگ سے جوش و جذبے کے ساتھ کسی اور ڈیکلریشن کو لے کر ایک نئے جریدے کا آغاز کر دینا، یہ ان کی میں سمجھتا ہوں کہ ایک خداداد صلاحیت تھی کہ ان کا جو بھی نیا جریدہ آتا وہ لوگوں کے لیے ہرگز نیا نہیں ہوتا تھا۔

دراصل لوگ ان دنوں پڑھنا چاہتے تھے مجیب الرحمٰن شامی کو، بھلے پرچے کا نام ''اداکار'' ہو یا ''رفاقت'' ''اسلامی جمہوریہ'' یا ''طاہر'' اور ''اذان حق''۔ کوئی بھی پرچہ ہوتا لوگ اس کا باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے۔ جو لوگ حریت فکر سے پیار کرتے تھے اور آزادی اظہار کے ایک پرچم بردار کے طور پر مجیب الرحمٰن شامی کو دیکھتے تھے وہ پرچے کی خریداری ضرور کرتے تھے۔ میرے تصور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں جب یہ سب کچھ آتا ہے تو میں تاریخ کی انگلیاں پکڑ کر ماضی کے میدانوں میں چلا جاتا ہوں اور سچ پوچھیے تو مجھے مولانا ظفرعلی خان اور مجیب الرحمٰن شامی ایک ہی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کے 'زمیندار' اخبار کے ڈیکلریشن منسوخ ہوتے رہے اور وہ بار بار جراتِ اظہار کرنے کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ اپنی آزادی و بے باکی سے تمام تر پابندیوں اور جکڑ بندیوں کے باوجود کبھی دست بردار نہیں ہوئے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ اگر برطانوی ملوکیت کے محافظ ان کی آواز کو دبانا چاہیں یا ان کے ڈیکلریشن منسوخ کردیں تو وہ دم سادھ کر بیٹھ جائیں اور لب بستہ ہوجائیں۔ ظفرعلی خان کا ایک ڈیکلریشن منسوخ ہوتا اور انہیں جرمانہ کیا جاتا تو لاہور کے شہری خود چندہ جمع کر کے یہ جرمانہ ادا کردیتے۔ یہ جرمانہ ہزاروں روپے میں ہوتا تھا۔ اگر صبح کو ڈیکلریشن منسوخ ہوتا تو شام تک لوگ جرمانہ ادا کردیتے اور یوں اگلے روز مولانا کا اخبار پھر سے منصۂ شہود پر آجاتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پنجاب میں اردو صحافت میں جو کردار مولانا ظفرعلی خان نے ادا کیا اس کی نقابت، اس کی پیروی اور تتبع اگر کسی نے پامردی اور جگرداری سے 1970ء سے 1977ء تک بدستور کیا تو وہ جناب مجیب الرحمٰن شامی ہی تھے۔ اسی تناظر میں بعض احباب انہیں ظفرعلی ثانی بھی کہتے ہیں۔

اب ظفرعلی خان کا مقام اور قد کاٹھ کیا تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب انہوں نے 'زمیندار' نکالا اور تحریک خلافت کے دنوں میں جب وہ استنبول سے بمبئی پہنچے اور پھر لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو مولانا الطاف حسین حالی نے انہیں اپنی ایک نظم سنانے کے لیے پانی پت آنے کی دعوت دی اور بعد میں جب مولانا ظفرعلی خان پروگرام کے مطابق دہلی سے براستہ بٹھنڈہ لاہور پہنچ گئے تو مولانا حالی نے یہ نظم انہیں لاہور بھیجی جو زمیندار میں اور پھر بعد میں مولانا ظفرعلی خان کے مجموعہ کلام 'بہارستان' میں شائع ہوئی۔ اس نظم کے چند اشعار میں یہاں پیش کیے دیتا ہوں:

اے مالکِ دفترِ زمیندار...... اے نازشِ قوم و فخرِ اقراں
اے روحِ رواں جمعِ احباب...... اے چشم و چراغِ بزمِ اخواں
اے دیں کے امتحاں میں جانباز...... اے نصرتِ حق میں تیغِ عریاں
اے صدق وصفا کی زندہ تصویر...... اے شیر دل اے ظفرعلی خاں
ڈالا یہ تیری پکار نے غل...... جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں
جو دل غمِ قوم سے تھے بے حس...... چلنے لگیں ان دلوں پہ چھریاں
پنجاب کو تجھ پہ ہوا اگر فخر...... ہے اس کو یہ فخر نازشایاں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

زندہ ہے وہ ملک اور ملت...... ہوں زندہ دل جس میں ایسے انساں

مولانا ظفر علی خان اگر ''زمیندار'' ضبط ہوتا تو ''ستارہ صبح'' نکال لیتے تھے، اس طرح سے انگریز حکومت کے خلاف ان کا یہ صحافتی اور قلمی جہاد بدستور جاری رہا۔ ایک دور ایسا بھی آیا جب انہیں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر مائیکل اوڈوائر کے دور میں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ ظفر علی خان ایک حاضر طبع اور موزوں طبع شاعر تھے، ان کا عالم یہ تھا کہ ''مردم دیدہ'' کتاب میں چراغ حسن حسرت نے لکھا ہے کہ ادھر حقے کی ''نے'' ان کے منہ میں آتی اور اِدھر ان کے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت ان کے انگوٹھے کا طواف کرتی، وہ حقے کا ایک کش لیتے، دھواں فضا میں پھیلتا اور کھٹ سے ایک شعر نمودار ہو جاتا۔ اب جب وہ کرم آباد میں نظر بند ہوئے تو انہوں نے وہاں ایک نظم کہی:

کرم آباد کو سر مائیکل نے بنایا ہے میری علمی حوالات

اگر اس وقت میں آزاد ہوتا تو دکھا سکتا نہ شاید یہ کمالات

نہ ہوتی ترجمے کی مجھ کو فرصت، کتابوں میں نہ کٹتے میرے دن رات

نہ ہوتا نعت ہی کا سر میں سودا، دل سے ہی نہ نکل سکتی مناجات

پرو سکتا نہ موتی روز ایسے، چمک سے ہیں جن کے شمس و قمر مات

گنوا تا شاید اپنے وقت کو، دلاتی شرم مجھ کو میری اوقات

اسی طرح کرم آباد ہی سے ''ستارۂ صبح'' اخبار نکلتا رہا اور پھر لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یوں مولانا نے پہلی جنگ عظیم سے قبل ہی جو شہرت کی بلند ترین چوٹی تھی اس کو سر کر لیا، یہ ایک بہت بڑا کام تھا کہ ان کا سر کبھی خم نہ ہوا اور نہ ان کا قلم جھکا۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ بھٹو صاحب کے دور میں بھی مجیب الرحمٰن شامی نے اپنا سر خم نہیں کیا اور ان کی جبین نیاز کبھی بھٹو صاحب کی سول آمریت کے سامنے خم ہوئی اور نہ انہوں نے گردن نیاز کو جھکایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شجاعت، جرات، بہادری، تہور، شیر دلی، عالی حوصلگی، عالی ظرفی، مردانگی، استقامت، استقلال، بسالت، اولوالعزمی، کہسار مزاجی اور انتہائی شہامت کا ایک شاندار، آن دار اور جاندار مظاہرہ تھا جو مجیب الرحمٰن شامی نے اُس ''عصرِ جبر'' میں کیا۔

رانا چیمبرز میں زمانہ طالب علمی میں اور عہد شباب میں ہماری آمد و رفت ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہی۔ میں جب بھی وہاں جاتا تو مجیب الرحمٰن شامی صاحب کو بھی ملتا۔ میں نے وقت کے بڑے بڑے صحافیوں، ادیبوں اور نامور شاعروں کو یہاں دیکھا۔ ان میں ایک بڑا نام جنابِ ضیاء الاسلام انصاری تھا جنہیں میں نے یہاں دیکھا۔ انصاری صاحب اس زمانے میں روزنامہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مشرق کے ایڈیٹر تھے۔اسی طرح بہت ہی معروف اور ممتاز صحافی جناب رفیق ڈوگر سے میری وہیں ملاقات ہوئی۔حبیب جالب بھی آیا کرتے تھے۔بھٹو صاحب کے خلاف قومی اتحاد کی تحریک میں خورشید محمود قصوری ایئر مارشل اصغر خان، جاوید ہاشمی و دیگر حضرات وہاں آیا کرتے تھے۔سیدھی بات ہے کہ میں تو صرف جنابِ شامی کو ان کے جرات مندانہ اداریوں کی وجہ سے سلام کرنے جایا کرتا اور اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں انہیں گل ہائے تحسین پیش کرتا۔

خیر بات ہو رہی تھی جاوید ہاشمی کی،تو وہ لاہور سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑ رہے تھے۔وہ راج گڑھ میں میرے گھر تشریف لائے اور انہوں نے مجھے خود کہا کہ میری الیکشن کمپین کو آپ ہی نے سنبھالنا ہے اور آپ ہی اس کے انچارج ہوں گے۔لہذا رانا چیمبر میں دو دکانوں کو انتخابی آفس بنا دیا گیا جہاں سے ہم نے الیکشن مہم کا آغاز کیا۔جوان خون تھا اور ہمارے جذبے جوان تھے تو ہم نے اس الیکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب 1977ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات ہو گئے تو قومی اتحاد نے انہیں دھاندلی زدہ قرار دے کر ان کے خلاف ایک تحریک کا اعلان کر دیا اور پوری طرح منظم انداز میں میڈیا (جو کہ ان دنوں صرف چند اخبارات پر ہی مشتمل تھا) کے ذریعے رائے عامہ ہموار کی۔مسلم لیگ ہاؤس ڈیوس روڈ میں قومی اتحاد کا ایک اہم اجلاس ہوا جس میں نو اتحادی جماعتوں نے شرکت کی اور تمام لیڈروں نے اس پر اتفاق کیا اور ہاتھوں میں قرآن اٹھا کر یہ اعلان کیا کہ ہم اپنے مقاصد کے حصول اور بھٹو کی سول آمریت کے خاتمے کے لیے ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ان قائدین میں جمعیت علمائے پاکستان کے مولانا شاہ احمد نورانی، جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد، پیر پگاڑا، خان عبدالولی خان، مفتی محمود، ایئر مارشل اصغر خان، پی ڈی پی کے نوابزادہ نصر اللہ خان اور تحریک خاکسار کے امیر حبیب اللہ سعدی وغیرہ شامل تھے۔قومی اتحاد نے اعلامیہ جاری کیا کہ وہ ہر نشست پر کامیابی کے جھنڈے گاڑھ چکا تھا لیکن منظم دھاندلی کر کے اس کو اپوزیشن میں رکھا گیا۔بھٹو کے خلاف قومی اتحاد کی اس تحریک نے خوب زور پکڑا اور ہم نے بھی اس میں خوب حصہ لیا۔

اس سلسلے میں لاہور میں 14 مارچ کو ایک بڑا جلوس ایئر مارشل اصغر خان کی قیادت میں نکلنا تھا۔مجھے یاد پڑتا ہے کہ 13 مارچ کی شام مجھے جاوید ہاشمی نے بتایا کہ کل ایک جلوس نکلنا ہے اور ہم نے اس سلسلے میں ایک اہم مشاورتی اجلاس میاں محمود علی قصوری ایڈووکیٹ کی کوٹھی جو کہ فین روڈ پر واقع تھی، میں طلب کیا ہے۔میں بھی جاوید ہاشمی کے ساتھ اس کوٹھی پر پہنچا۔ یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میاں محمود علی قصوری اپنے وقت کے ایک بلند قامت اور مایہ ناز قانون دان تھے۔ قصوری صاحب کی کوٹھی پر یہ میٹنگ 13 مارچ کو مغرب کے وقت شروع ہوئی اور دس بجے تک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جاری رہی۔اس میٹنگ میں جولیڈر شریک ہوئے صاف ظاہر ہے کہ اس میں تحریک استقلال کے لوگ زیادہ تھے۔ایئر مارشل اصغرخان، میاں محمود علی قصوری، خورشید محمود قصوری، جاوید ہاشمی وغیرہ شامل تھے۔اجلاس کے بعد طے پایا کہ اب ہم نے گلبرگ مین بلیوارڈ میں واقع ''می کا نگ'' نامی ہوٹل میں کھانا کھانے جانا ہے۔ہم ہوٹل میں پہنچے، یہاں مجیب الرحمٰن شامی بھی آ گئے۔ان کے اخبار میں کام کرنے والے ایک بہت ہی قدر آور صحافی جنابِ ممتاز اقبال ملک صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔(ممتاز اقبال ملک بعد میں افواج پاکستان کے شعبہ تعلقات عامہ آئی ایس پی آر کے ماہانہ جریدے 'ہلال' کے ایڈیٹر بھی رہے)۔ملک صاحب مجیب الرحمٰن شامی کے قلمی رفیق کار تھے اوران کے جرائد ورسائل میں طویل عرصہ تک ان کے ساتھ رہے۔

جب ہم می کا نگ ہوٹل سے کھانا کھا کر لابی سے باہر نکلے تو ہم نے دیکھا کہ پولیس نے ہوٹل کو چاروں سے طرف گھیر رکھا ہے۔یہ ایک منظم پولیس محاصرہ تھا۔اس محاصرہ کی قیادت ایک بڑے معروف پولیس افسر ایس ایس پی اصغرخان نوانی المعروف ہلاکو خان تھے جو بعد میں ڈی آئی جی کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ہلاکو خان کی بڑی شہرت تھی اور وہ پولیس مقابلہ فیم افسر تھے۔

اصغرخان آگے بڑھے اورانہوں نے ایئر مارشل اصغرخان کی کلائی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا: ''یو آر انڈر اریسٹ''۔ایئر مارشل نے وہاں ایک بڑی زبردست بات کی اور کہا ''اصغرخان! تم میرے ہم نام ہو لیکن ایک بات یادرکھو کہ میں بہ خوبی جانتا ہوں کہ وردی کے تقاضے کیا ہوتے ہیں اور اخلاقیات کے کیا، یہ بات میں تم سے ہزار درجہ بہتر جانتا ہوں۔میں پاکستان ایئر فورس کا پہلا سربراہ رہا ہوں۔تم بھلے کسی کے حکم سے بھی گرفتار کرنے آئے ہو لیکن تمہیں میرے ساتھ اس انداز میں گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔تم میرے ساتھ ایسا رویہ اختیار کر رہے ہو جیسے تم کسی اخلاقی مجرم کو پکڑ رہے ہو، تمہیں ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔مَیں تمہاری اس روش کو سخت ناپسند کرتا ہوں، اس لیے فوری طور پر پیچھے ہٹ جاؤ۔'' اصغرخان نوانی چار قدم پیچھے ہٹے اور کہا کہ ہم تو آپ کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے تو ایئر مارشل اصغرخان نے جواب دیا کہ جب تک آپ مجھے گرفتاری کے عدالتی آرڈر نہیں دکھاتے میں بھٹو صاحب کی زبانی کلامی یا ٹیلی فونک آرڈر پر گرفتاری نہیں دوں گا۔سیاستدانوں کو گرفتار کرنے کا بھی ایک طریقہ کار، ایک ضابطہ اور قاعدہ ہوتا ہے۔آپ اس ضابطے کو پامال کرتے ہوئے مجھے پکڑنا چاہیں گے تو میں یہ گرفتاری نہیں دوں گا''۔اب صاف ظاہر ہے کہ جب بیسیوں پولیس والوں نے گھیرا ڈال رکھا ہو اور پولیس کو وزیراعظم کی بھی پشت پناہی اور آشیرباد حاصل ہو تو پانچ سات لوگ پولیس بہادر کی مزاحمت کس طرح کر سکتے ہیں۔میں یہاں بتاتا چلوں کہ بھٹو صاحب کی یہ شدید

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

خواہش تھی کہ کسی طرح ایئر مارشل اصغر خان پر ہاتھ ڈالا جائے۔ان دنوں بھٹو صاحب کا ایک ڈائیلاگ ’’فکس اپ‘‘ مشہور ہوا تھا۔وہ اپنے ہر مخالف کو کہتے تھے کہ میں اسے ’’فکس اپ‘‘ کروادوں گا۔

جب گفتگو آگے بڑھی تو جاوید ہاشمی نے بھی اصغر خان المعروف ہلاکو خان کو کہا کہ ’تم ناشائستہ حرکت کرر ہے ہو اور پیچھے ہٹ جاؤ‘ تو ہلاکو خان نے کہا کہ زیادہ باتیں مت کرو اور گرفتاری دو تو اس پر جاوید ہاشمی جلال میں آ گئے۔ میں اس وقت ان کے بالکل پیچھے کھڑا تھا۔ پیر سائیں کی ایک یہ خاص پہچان تھی کہ بھٹو دور میں انتظامیہ کو دیکھتے ہی ان کا پارہ خطرے کی ریڈ لائن کو چھونے لگتا اور وہ ناقابل تسخیر ’’جلال‘‘ میں آ جاتے۔ بھلے سامنے پولیس افسر ہوتا، کمشنر ہوتا یا مجسٹریٹ، جاوید ہاشمی کسی کی پروا نہیں کرتے تھے اور اپنا نعرہ رُست خیز بلند کر دیتے۔ یہاں بھی جب انہوں نے اپنا نعرہ رستخیز بلند کیا ۔ جہاں دو اڑھائی سو کے قریب پولیس اہلکار موجود ہوں تو چھ یا سات سیاسی ورکرز کیا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اصغر خان نوانی المعروف ہلاکو خان نے فوراً حکم دیا کہ ان سب کو اٹھا کر پولیس کے ٹرک میں پھینک دو۔لہٰذا ہم سب کو گرفتار کر کے ایک پرانے سے پولیس ٹرک میں ٹھونس دیا گیا۔ٹرک میں مَیں تھا اور میرے ساتھ جناب جاوید ہاشمی ،ایئر مارشل اصغر خان، ممتاز اقبال ملک، خورشید محمود قصوری ،اسحاق ظفر ایڈووکیٹ اور مجیب الرحمٰن شامی تھے۔

رات گیارہ بجے کا وقت ہوگا جب ہم گرفتار کیے گئے ۔آج تو بہترین سڑکیں بن گئی ہیں جبکہ اس وقت می کا نگ ہوٹل گلبرگ سے چوہنگ پولیس سنٹر تک زیادہ سے زیادہ سفر ایک گھنٹے کا ہوگا لیکن ہمیں وہاں پہنچنے میں تقریباً تین گھنٹے لگے۔ ہمیں لاہور کی مختلف سڑکوں پر گھمایا جاتا رہا۔شاید پولیس والے اس انتظار میں تھے کہ کوئی نیا آرڈر آئے اور ہم ان کو ادھر ہی کہیں ڈراپ کر دیں لیکن ایسا کوئی حکم نامہ نہ آیا اور آخر کار پولیس ہمیں تھانہ چوہنگ لے آئی۔ وہاں اس وقت جو ایس ایچ او تھے ان کا نام امان اللہ خان تھا۔ یہ بعد میں نواز شریف کے دور میں ایس پی لاہور پر موٹ ہوئے۔ جب ہم تھانہ چوہنگ میں پہنچے تو وہاں اس وقت امان اللہ خان ایس ایچ او موجود نہ تھے اور عملے نے ہمیں ریسیو کر کے حوالات میں بند کرنا چاہا تو اسی وقت امان اللہ خان آ گئے، ہمیں دیکھا اور پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہیں جب معلوم ہوا کہ ایئر مارشل اصغر خان، جاوید ہاشمی اور ان کے دیگر ساتھی آئے ہیں اور یہ لوگ اس وقت بھٹو مخالف تحریک چلا رہے ہیں تو اس نے ہمیں حوالات میں بند نہ کیا۔

کچھ ہی دیر بعد حکام بالا کے حکم پر ایئر مارشل اصغر خان، مجیب الرحمٰن شامی، ممتاز اقبال ملک، خورشید محمود قصوری و دیگر کو تھانہ مناواں میں منتقل کر دیا گیا۔ میں اور جاوید ہاشمی ادھر ہی رہ گئے۔ یہاں میں یہ بھی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ میں اس وقت کوئی اتنا قابل ذکر شخص نہ تھا، بس بڑے لوگوں کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ساتھ اجلاس میں شریک ہونے کی وجہ سے گرفتار کرلیا گیا تھا۔ میری اور جاوید ہاشمی کی تھانہ چوہنگ کے ایس ایچ او امان اللہ خان نے اس قدر تواضع کی کہ میں اسے بیان نہیں کرسکتا۔ مختصراً یہ کہ انہوں نے اپنے گھر سے چارپائیاں منگوائیں، نئے بستر منگوائے، یہ مارچ کا مہینہ تھا اور رات کو بسا اوقات موسم خنک ہوجاتا تھا اور کسی بھی وقت یہ امکان باقی رہتا تھا کہ شاید رات مزید خنک ہوجائے تو حفظ ماتقدم کے طور پر ہماری چارپائیوں کی پائنتی کی طرف کھیس بھی رکھ دیئے گئے۔ یہ کھیس والی بات بظاہر تو معمولی ہے لیکن پنجاب پولیس کی جو روایت ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ ایک بہت بڑی خدمت تھی اور خاص طور پر ایک حوالاتی کو ایسا پروٹوکول ہرگز نہیں دیا جاتا۔ ہم سوگئے اور جب اٹھے تو نماز فجر کے بعد امان اللہ خان نے ہم سے ناشتے کا پوچھا کہ آپ کیا پسند کریں گے؟ امان اللہ خان جس قدر اچھا اور معیاری ناشتہ ہمیں فراہم کرسکتے تھے انہوں نے کیا۔ ایک دن پورا ہم ان کی تحویل میں رہے لیکن انہوں نے ایک لحہ بھی ہمیں حوالات نہیں دکھائی۔

ہم ان کی مہمان نوازی پر بہت زیادہ حیران تھے کیونکہ ان کا رویہ اور برتاؤ ہرگز پنجاب پولیس جیسا نہ تھا۔ خیر ہمارا یہ تجسس زیادہ دیر نہ رہا اور ہمیں معلوم ہوا کہ جو بھی بھٹو مخالف سیاسی قیدی امان اللہ خان کی تحویل میں دیا جاتا ہے وہ اس کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ بعد میں امان اللہ خان نے ہمیں خود بتایا کہ وہ آخر بھٹو صاحب کا اس حد تک مخالف کیوں ہے اور اینٹی بھٹوز کی خدمت کیوں کرتا ہے؟ امان اللہ خان نے بتایا کہ اس مخالفت کا پس منظر یہ ہے کہ 1971ء کے الیکشن میں بھٹو صاحب جیت گئے تو میں اس وقت لاہور کے کینٹ ایریا میں تعینات تھا، اس علاقہ میں ایک ڈاکو تھا جو علاقہ بھر میں وارداتیں کرتا تھا اور خوف ودہشت کی علامت بن چکا تھا۔ اس کا طریقہ واردات یہ تھا کہ وہ نیم برہنہ حالت میں وارداتیں کرتا، اپنے پورے جسم پر کڑوا تیل لگا لیتا تھا اور اس قدر چکناہٹ میں رچ بس جاتا تھا کہ اسے جو بھی پکڑنے کی کوشش کرتا وہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر نکل جاتا۔ اس کی رنگت بالکل سیاہ تھی، وہ اس قدر کالا بھجنگ تھا کہ اسے ''کالا ڈاکو'' کے نام سے ہی پکارا جاتا تھا۔ کینٹ اور دیگر مضافاتی علاقوں کی آبادیاں اس ڈاکو سے بہت تنگ تھیں کیونکہ وہ آتشیں اسلحہ سے لیس ہوکر وارداتیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے اس کی واردات کی اطلاع ملی تو میں موقع واردات پر جا پہنچا اور اس نے ہم پر فائرنگ شروع کردی اور جب ہم نے ردعمل کے طور پر اس پر فائر کیا تو وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ جب اس کی ہلاکت کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو اس سے اگلے روز ہی ذوالفقار علی بھٹو اس کے گھر پر تعزیت کے لیے پہنچ گئے اور جب انہیں میرے متعلق بتایا گیا تو انہوں نے میری فوری گرفتاری کا حکم دے دیا۔ یوں میں نے اس کیس کا سامنا کیا اور جیل

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کاٹی۔ بجائے اس کے کہ بھٹو صاحب قانون کا نفاذ کرنے والے افسر کا ساتھ دیتے انہوں نے ایک سکہ بند جرائم پیشہ شخص کا ساتھ دے کر مجھے گرفتار کروادیا۔ بس اب اس کے بعد سے میں بھٹو صاحب کا شدید مخالف ہوں۔ سیدھی بات ہے کہ بھٹو کے خلاف جو اس وقت قومی اتحاد کام کر رہا ہے اس میں شامل تمام کارکنوں کو مَیں مجاہد تصور کرتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ظلم کے خلاف اور اصل جمہوریت کی بحالی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی میں اس انداز سے مدد کرتا ہوں کہ جو بھی میرے پاس بھٹو مخالف لوگ گرفتار کر کے لائے جاتے ہیں میں ان کو تعظیم و تکریم دیتا ہوں اور ان کو اعزاز و اکرام کے ساتھ رکھتا ہوں، جیسا کہ میں نے آپ کے ساتھ کیا۔ پھر یوں ہوا کہ اس سے اگلے دن یعنی 16 مارچ 1977ء کو امان اللہ خان نے ہم سے معذرت کرتے ہوئے کہا مجھے تازہ حکم ملا ہے کہ آپ کو تھانہ چوہنگ سے کہیں اور منتقل کر دوں۔ جاوید ہاشمی نے ان سے ''نئی منزل'' کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میری طرف سے معذرت سمجھیں کیونکہ مجھے منع کر دیا گیا ہے اور میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ بہرحال اب میری مہمان داری ختم ہے اور میں بہت مجبور ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔ لہٰذا اب آپ گاڑی میں تشریف لے جائیں اور میں آپ کو وہاں چھوڑ آتا ہوں جس جگہ کی نشاندہی حکام بالا نے کی ہے۔

اس کے بعد میری اور جاوید ہاشمی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور کوئی چالیس منٹ تک گاڑی چلتی رہی اور جب ہمیں گاڑی سے اتار کر آنکھیں کھول دی گئیں تو میں چونکہ پیدائشی اندرون لاہور کا رہنے والا ہوں تو مجھے یہ جاننے میں بالکل دشواری نہ لگی کہ ہم شاہی قلعہ میں آ گئے ہیں۔ سچ پوچھیے تو میں اس موقع پر نہ تو جھوٹ بول کر کسی ٹارزن کا کردار ادا کرنا چاہوں گا اور نہ ہی رستم، سہراب، اسفندیار یا افراسیاب بننا چاہوں گا۔ حقیقت یہی ہے کہ میں پر ہیبت شاہی قلعہ دیکھ کر کانپ گیا تھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ اس وقت میری عمر یہی 21 یا 22 سال ہو گی تو صاف بات یہی ہے کہ میں بہت ڈر گیا تھا اور اس ڈر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں کچھ ہی دن قبل آغا شورش کاشمیری کی کتاب ''پس دیوار زنداں'' پڑھ رہا تھا اور اس میں مَیں وہ حصہ پڑھ چکا تھا اور وہ اقتباسات ازبر کر چکا تھا جن میں شاہی قلعہ میں قیدیوں پر روا رکھے جانے والی صعوبتوں اور اذیتوں کا ذکر تھا۔

سیدھی بات ہے یہ دیکھ کر میں تو گھبرا گیا لیکن اس وقت مجھے جاوید ہاشمی نے بہت حوصلہ دیا۔ جاوید ہاشمی کو میں نے ہر دور اور ہر حالت میں بڑا ثابت قدم دیکھا ہے۔ جاوید ہاشمی نے میرا مورال بلند کرنے کے لیے کہا ''یار سنو، یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے کبھی آپ نے بغیر ٹکٹ کے شاہی قلعہ کی سیر کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہے؟''...... میں نے جواب دیا'' بالکل بھی نہیں''۔ انہوں نے کہا کہ'' دیکھو بھئی جب بھی بیرون ملک سے کوئی بڑی اہم شخصیت آتی ہے تو صرف وہ بغیر ٹکٹ کے شاہی قلعہ کی سیر کرتی ہے اور یا پھر ہم جیسے سیاسی لوگ جو شہری آزادیوں کی جنگیں لڑتے ہیں بغیر ٹکٹ یہاں آسکتے ہیں، اب ہم بغیر ٹکٹ کے شاہی قلعہ دیکھنے جارہے ہیں اور تم پریشان ہورہے ہو''۔ اس پر میرا حوصلہ بہت بلند ہوا اور میں ہنس پڑا۔ جاوید ہاشمی نے مزید کہا'' حافظ صاحب گھبرانا بالکل بھی نہیں، ہمیں یہ وقت نہایت صبر اور استقامت سے گزارنا ہے''۔

ہم 16 مارچ 1977ء سے لے کر 22 مارچ کی درمیانی شب تک شاہی قلعہ میں محبوس رہے۔ ہم ایک بالکل چھوٹے اور تاریک تہ خانے میں قید تھے، اب اس کمرے کا سائز میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ 8x6 کا تھا یا 8x4 کا تھا۔ بار بار پولیس اہلکار آتے اور سلاخوں پر لاٹھیاں برساتے تاکہ ہم سو نہ سکیں اور ہم واقعی سو نہیں سکتے تھے۔ یہ سیلن زدہ کوٹھڑی تھی اور اس میں تعفن بہت زیادہ تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا، سورج کے طلوع اور غروب ہونے کا امتیاز یہاں پر ختم تھا۔ مجھے بالکل اچھی طرح یاد ہے کہ یہ 22 اور 23 مارچ 77ء کی درمیانی شب تھی جب ہمیں ایک اہلکار نے باہر نکالا۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید یہ ہمیں مزید ٹارچر کرنے کے لیے کہیں لے جارہے ہیں کیونکہ اس سے قبل بھی وہ ہمیں الگ الگ باہر لے آئے تھے اور پھر مجھے ایک الگ بڑے سے کمرے میں لے گئے جس میں ہر طرف'' آلاتِ تعذیب'' یعنی تشدد کرنے کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ اہلکاروں نے مجھے بتایا کہ یہ وہ کمرہ ہے جہاں ہم نے حنیف رامے کو بھٹو صاحب کے حکم پر گرفتار کرکے رکھا تھا اور پھر ہم نے ان کے لباس کی تقدیس کو بھی بالکل پامال کردیا تھا۔ یہ سن کر میں کانپ کر رہ گیا کہ کیا اس حد تک شرمناک تشدد بھی کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح پیپلز پارٹی ہی کے ایک بڑے سیاستدان ہوا کرتے تھے جن کا مکمل نام حافظے سے اتر رہا ہے انہیں خاکوانی صاحب کہا جاتا تھا۔ اہلکاروں نے مجھے بتایا کہ اسی کمرے میں خاکوانی پر بھی بے انتہا تشدد کیا گیا تھا۔ نہایت افسوس کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ پولیس والے اس'' تشدد'' کو کسی اور اندازِ تشدد سے وابستہ کرکے بتارہے تھے جبکہ میں یہاں ملفوف پیرائے میں بات کررہا ہوں۔ پولیس والے تو کچھ اور ہی کہہ رہے تھے جسے من وعن بیان کرنے کا مجھے ہرگز حوصلہ نہیں۔ بھٹو صاحب کے دور میں جب جماعت اسلامی کے مرکزی راہنما میاں طفیل محمد صاحب کو گرفتار کرکے شاہی قلعہ لایا گیا تھا تو ان پر بھی اسی طرح غضب ناک اور بلکہ شرمناک انداز سے تشدد کیا گیا تھا۔ اتنے بڑے عالم دین، جید، پارسا، صالح اور متقی راہنما کے ساتھ میرے خیال سے اس قدر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شرمناک سلوک کی مثال نہیں ملتی۔

بہرحال اہلکار مجھے یہ کمرہ دکھا رہے تھے تو ماضی کا ایک کرب ناک سانحہ بھی میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس کمرے میں دیوار کے اندر ایک لوہے کا بہت بڑا میخ نما کیل بڑی مضبوطی سے پیوست کیا گیا تھا۔ اس کیل کے نیچے ایک چوکی یا سیڑھی نما چیز رکھی تھی، مجھے اہلکاروں نے جب اس پیڑھی پر کھڑا کیا تو میری گردن اس نوکیلے لوہے کے سریے کے بالکل سامنے آ گئی تو انہوں نے مجھے اس موقع پر ایک بڑی ہی کرب ناک داستان سناتے ہوئے کہا کہ جنرل ایوب خان کے دور میں ممتاز ترقی پسند طالب علم راہنما حسن ناصر کو جب یہاں کھڑا کر کے پیچھے سے پوری قوت سے دھکا دیا گیا تھا تو یہ لوہے کی سلاخ ان کی گردن کے آر پار ہو گئی تھی اور وہ کچھ ہی دنوں بعد انتقال کر گئے تھے۔ اب جب مجھے اور جاوید ہاشمی کو ایک بار پھر رات کے وقت باہر نکالا گیا تو یہ ساری کیسٹ میرے دل و دماغ میں ریوائنڈ ہو گئی کہ شاید یہ ہم پر بھی کچھ ایسا ہی تشدد کرنے لگے ہیں۔ لیکن اب وہ ہمیں باہر نکال کر سیدھا ایس پی فورٹ کے پاس لے گئے جنہیں درانی صاحب کہا جاتا تھا، ان کا پورا نام تو میرے حافظے سے محو ہو گیا ہے البتہ اتنا یاد ہے کہ وہ بہاولپور کے رہنے والے تھے۔ جب ہمیں درانی صاحب کے کمرے میں لایا گیا تو ہم نے دیکھا کہ ان کے پاس اپنے وقت کے بہت بڑے وکیل ایم انور بار ایٹ لاء موجود تھے۔ انور صاحب ہائی کورٹ سے ہماری دستیابی کا حکم نامہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم جو ایک ہفتہ سے شاہی قلعہ میں قید تھے تو ہمیں رہائی دلوانے کے لیے انور صاحب نے لاہور ہائی کورٹ سے رجوع کر رکھا تھا اور اب پولیس ہمیں شاہی قلعہ سے لنڈا بازار کی نکڑ پر واقع لاہور کے تاریخی تھانہ کوتوالی میں لے آئی۔

چند گھنٹے ہم نے یہاں گزارے۔ اس دوران ایم انور بار ایٹ لاء ہمارے ساتھ رہے اور ہمیں حوالات میں بند نہیں کیا گیا۔ کچھ دیر بعد راشد بٹ نامی ایک سب انسپکٹر ہمیں لے کر ضلع کچہری آ گیا، یہ 23 مارچ 1977ء اور اتوار کا دن تھا۔ جب ہم عدالت پہنچے تو اتوار کو صرف ایک ہی سٹی مجسٹریٹ عدالت لگاتا تھا۔ پولیس والوں نے ہمیں جیپ میں ہی بٹھائے رکھا۔ صرف سب انسپکٹر اندر گیا اور کچھ ہی دیر بعد واپس آ کر یہ مژدہ سنایا کہ مجسٹریٹ نے آپ کو جوڈیشل ریمانڈ پر کیمپ جیل میں بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ جاوید ہاشمی نے اس موقع پر خوب احتجاج کیا کہ جب ہمیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا تو اس نے کیسے یہ حکم نامہ جاری کر دیا ہے۔ یہ تو بالکل خلاف قانون ہے۔ بہرحال جاوید ہاشمی نے وہاں پر کافی ''ہلہ گلہ'' کیا اور یہ شور سن کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تو پولیس کے لیے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ جاوید ہاشمی کو ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں اور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی صورت پولیس کی گاڑی سے باہر آ جائیں اور سید حاسٹی مجسٹریٹ کے سامنے جا کر اس سے پوچھیں کہ کیا یہ قانون آپ کے گھر کی لونڈی ہے کہ جس طرح چاہے استعمال کرو۔ خیر ایسے موقع پر پولیس حراست میں موجود آدمی کی کون سنتا ہے اور پھر ریاستی اداروں کے آگے کس کی چلتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مزید پولیس اہلکار بھی آ گئے۔ انہوں نے راستہ بنایا لوگوں کو پیچھے ہٹایا اور ہم سید ھا کیمپ جیل لاہور پہنچا دیئے گئے۔ کیمپ جیل میں ہم مزید چالیس دن رہے اور 20 اپریل 1977ء کو ہماری رہائی عمل میں آئی۔ ہم پر مختلف الزامات کے تحت مقدمات بنائے گئے تھے جو کہ عموماً سیاسی لوگوں پر بنائے جاتے ہیں یعنی 16 ایم پی او، تخریب کاری اور پتا نہیں کون کون سی دفعات لگائی گئی تھیں۔ پھر ہماری درخواست لاہور ہائی کورٹ میں لگی اور ہمیں چالیس دن بعد رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے اگلے دن یعنی 21 اپریل 1977ء کو قومی اتحاد نے ملک گیر پہیہ جام ہڑتال کا اعلان کر رکھا تھا۔ اس موقع پر لاہور شہر کے گلی کوچوں اور سڑکوں پر ایک ہی گونج دار صدا سنائی دیتی تھی کہ: ''کل کیا ہوگا۔ پہیہ جام''۔ یہ بڑی دہشت ناک اور ہیبت ناک صدا تھی۔ اس ہڑتال میں بھر پور انداز میں عوامی طاقت کا مظاہرہ کیا گیا تھا اور یہ ہڑتال بڑی کامیاب رہی۔

یہاں میں بتاتا چلوں کہ 1977ء کی قومی اتحاد تحریک میں میری گرفتاری پہلی مرتبہ نہیں تھی بلکہ میں اس سے قبل بھی تحریک تحفظ ختم نبوت کے دوران 1974ء میں گرفتار ہوا تھا اور کم و بیش اتنے ہی دن کوٹ لکھپت جیل میں رہا تھا۔ تحریک ختم نبوت میں جیل کے جو میرے ساتھی تھے ان میں لیاقت بلوچ، ڈاکٹر منصور الحمید، فرید پراچہ، نعیم سرویا، اکمل جاوید اور اسلامی جمعیت طلبہ لاہور کے لوگ شامل تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے سیل میں جو دوسرے ساتھی میرے ساتھ قید تھے ان میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے اس وقت کے ناظم اعلیٰ اور نہایت مقبول شخصیت ظفر جمال بلوچ تھے۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ ہم ایک ہی کمرے میں آ گئے تھے۔ اسی طرح جمعیت کے نعیم سرویا ہمارے ساتھ تھے۔ تحریک ختم نبوت میں حصہ لینے کی پاداش میں ہم نے ایک ماہ کے Detention آرڈرز کے تحت جیل کاٹی تھی۔

یہاں ہمارے ساتھ والی بیرک میں وہ فوجی قید تھے جن پر الزام تھا کہ انہوں نے 1972ء یا شاید 1973ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی میلے میں شرکت کے موقع پر انہیں قتل کر کے فوجی بغاوت کا پروگرام بنایا تھا۔ جن لوگوں کے نام مجھے اب تک یاد ہیں ان میں ایک کیپٹن سرور تھے اور دوسرے میجر ایاز علی سپرا تھے۔ کیپٹن سرور لیفٹیننٹ جنرل کے ایم اظہر کے صاحبزادے تھے اور میجر ایاز علی سپرا آئی جی پولیس بلوچستان نیاز علی سپرا کے کوئی قریبی عزیز تھے یا پھر شاید ان کے بھائی تھے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

۔اس سارے مبینہ حملے کا ماسٹر مائنڈ ایئر مارشل اصغر خان کے ایک قریبی عزیز کو قرار دیا جاتا تھا۔

اب ان فوجی قیدیوں اور ہمارے مابین ''برسبیل تفنن'' ایک اچھی خاصی ''چونچ بازی'' ہوا کرتی تھی۔فرید پراچہ ان کو کہا کرتے تھے:''بڑے آئے تھے قائد عوام،فخر ایشیا،وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان کو راستے سے ہٹا کر فوجی انقلاب برپا کرنے اور اب پڑے ہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے''۔فرید پراچہ کے اس ''مصرع طرح'' پر کیپٹن سرور یہ گرہ لگاتا کہ ''بڑے آئے تھے اسلامی انقلاب برپا کرنے اور اب بے چارے جیل کی اونچی دیواروں کے پیچھے تنگ کوٹھڑیوں میں محبوس ہیں''۔جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں اور ظفر جمال بلوچ جیل میں روم میٹ تھے۔خیر روم میٹ کی اصطلاح تو عام طور پر ہاسٹل کے لیے استعمال ہوتی ہے اسے ''جیل برڈ'' کہہ لیں تو بہتر ہے۔یعنی میں اور ظفر جمال بلوچ ''ہم قفس'' تھے۔میں نے اپنی پوری زندگی میں ظفر جمال بلوچ جیسا صالح، دینی مزاج رکھنے والا اور دینی اقدار وروایات اور شعائر میں گُندھا ہوا شخص نہیں دیکھا۔

تحریک ختم نبوت کا مقصد یہ تھا کہ عوام کو ختم نبوت کے مفہوم اور قادیانیت کی ریشہ دوانیوں کے متعلق آگاہ کیا جائے۔جن مقررین کو لاہور میں اس ڈیوٹی پر مامور کیا گیا تھا ان میں حافظ سلمان بٹ،لیاقت بلوچ،ظفر جمال بلوچ اور دیگر حضرات شامل تھے۔ان مقررین کی فہرست میں مَیں اس لیے بھی شامل تھا کہ میں ان دنوں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کی طلبہ یونین کا منتخب نائب صدر تھا۔لہٰذا جہاں بھی جلسہ ہوتا مجھے اطلاع دے دی جاتی اور میں وہاں پہنچ جاتا اور اس وقت قادیانیت کے متعلق میرا جو بھی حاصل مطالعہ تھا وہ سارا سامعین کے سامنے پیش کرتا۔اس زمانے میں مَیں نے آغا شورش کاشمیری کا تازہ تازہ کتابچہ پڑھا تھا جس کا نام تھا'' عجمی اسرائیل''۔اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ قادیانی اسلام اور پاکستان کے خلاف سازشوں میں کس طرح سے مصروف عمل ہیں اور سر ظفر اللہ خان جو پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ تھا اس کا کس قدر منفی کردار تھا۔جب قائداعظم محمد علی جناح کی نماز جنازہ کے موقع پر ظفر اللہ خان غیر مسلم ممالک کے چند سفیروں کے ساتھ باہر بیٹھا گپ شپ لگا رہا تھا تو کسی نے اس سے کہا کہ'' آپ قائداعظم کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے کیوں نہیں جا رہے؟''......تو اس نے قہقہہ لگا کر یہ جواب دیا کہ ''یا تو آپ اس تابوت میں پڑے شخص کو کافر سمجھ لیں یا پھر مجھے کافر سمجھ لیں''۔گویا میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں ظفر اللہ خان بطور وزیر خارجہ وہ پہلا قادیانی تھا جس نے تسلیم کیا تھا کہ قادیانی غیر مسلم ہیں۔

اب 1974ء میں قومی اسمبلی میں جو قراردادیں پیش کی جا رہی تھیں اور جو کارروائی ہو رہی تھی اس میں یہی مطالبہ سرفہرست تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔اس موقع پر مرزا غلام احمد

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

قادیانی کے متعلق تمام ریفرنسز قومی اسمبلی میں مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی اور یحییٰ بختیار نے پیش کیے۔ یحییٰ بختیار اٹارنی جنرل آف پاکستان تھے۔ انہوں نے جس انداز سے قادیانیوں اور لاہوری قادیانیوں پر جرح کی اور ان کو ناکوں چنے چبوائے، تاریخ کبھی ان کا کردار نظر انداز نہیں کر سکتی۔ قادیانی ان کے سوالوں کا جواب دینے سے قاصر رہے اور یہ بہت بڑا کریڈٹ ہے جو جناب یحییٰ بختیار کو جاتا ہے۔ اس میں باقی علماء بھی تھے، ان کا کردار بھی تاریخ کا ناقابل فراموش باب ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پوری قومی اسمبلی ایک پیج پر تھی۔ پی پی پی، مسلم لیگ، اے این پی، جے یو آئی، جے یو پی، غرض یہ تمام لوگ ایک ہی صف میں تھے اور یوں ایک متفقہ قرارداد کے ذریعے سے مورخہ 7 ستمبر 1974ء کو قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ جب قادیانی غیر مسلم قرار پا گئے تو اس دن پورے ملک میں جشن کا سماں تھا اور پھر ہم لوگوں کی تو خوشی دیدنی تھی کہ جنہوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ تحریک ختم نبوت میں میری گرفتاری مئی 1974ء میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب تحریک ختم نبوت پورے عروج پر تھی اور شہر شہر اور گاؤں گاؤں ایک لہر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس دوران نامور خطباء اور مقررین کو سننے کا نہ صرف موقع ملا بلکہ میں نے ان مشاہیر کی موجودگی میں تقریریں بھی کیں۔ ان میں مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا مسلم بخش بی اے، مولانا عبدالقادر روپڑی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا منظور چنیوٹی، مولانا گلزار احمد مظاہری، مولانا محمد اجمل خان، مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا مفتی محمود، مولانا تاج محمود، مولانا شاہ احمد نورانی، علامہ محمود رضوی، خطیب آل محمد سید اظہر حسن زیدی، سید مظفر علی شمسی سمیت دیگر بہت سے اور ہر مسلک و مشرب کے بلند پایہ خطیبوں کو سنا اور ان کے سامنے تقریریں بھی کیں۔ یہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے وقت کے ان مشاہیر کی ''خردنوازی'' ہی تھی کہ ان میں سے جو بھی تقریر کرنے کے لیے مائیک پر آتا تو میں چونکہ ایک طالب علم ہونے کے ناتے ان سے پہلے تقریر کر چکا ہوتا تو میرے بعد آنے والے مقررین میری تقریر کی تحسین کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے والدین اور میرے عظیم اساتذہ کی جوتیاں سیدھے کرنے کا صدقہ اور ثمرہ تھا۔

تحریک ختم نبوت میں میَں دو بار گرفتار ہوا۔ شاید انتظامیہ سمجھتی تھی کہ یہ بچے ہیں، طالب علم ہیں اور انہیں گرفتار کریں گے تو شاید یہ سدھر جائیں لیکن ہمارے دل و دماغ میں جو ختم نبوت کے تحفظ کا ایک لاوا ابل رہا تھا وہ تب کہیں جا کر کچھ ٹھنڈا ہوا جب 7 ستمبر 74ء کو قادیانیوں کو آئینی طور پر کافر اقلیت قرار دے دیا گیا۔ تحریک ختم نبوت کے دوران میری پہلی گرفتاری میرے گھر سے عمل میں لائی گئی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو سامنے پولیس کھڑی تھی اور گلی میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرے والد صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ کر گھر کی طرف آ رہے تھے۔ اس موقع پر محلے والوں نے پولیس سے کہا کہ بھئی یہ تو شریف لوگ ہیں آپ انہیں کیوں پکڑتے ہیں تو پولیس والوں نے جواب دیا کہ اوپر سے ڈپٹی کمشنر نے ڈیٹنشن آرڈر جاری کیے ہیں اور ہم مجبور ہیں۔ لہٰذا مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے چند گھنٹے میں نے مزنگ تھانے ہی میں گزارے۔ میں سخت ہراساں تھا کہ پتہ نہیں میرے گھر والوں کو معلوم ہے کہ نہیں کہ مجھے کون سے تھانے میں رکھا گیا ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد اسلامی جمعیت طلبہ کے لوگ تھانے آنا شروع ہو گئے جو اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی لاتے تھے۔ یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے کل چار مرتبہ جیل کاٹی۔ یعنی قومی اتحاد کی تحریک میں، تحریک ختم نبوت کے دوران دو مرتبہ اور چوتھی مرتبہ 1993ء میں نواز شریف کی تحریک نجات کے دوران۔ اس دوران میرا تجربہ یہ رہا ہے کہ جمعیت کافی نظم وضبط کا مظاہرہ کرتی تھی۔ جونہی ان کا کوئی بندہ گرفتار ہوتا تو وہ فوری طور پر اپنے ذرائع سے پتہ کرواتے اور پھر متعلقہ تھانے میں وکیل اور کھانا وغیرہ لے کر فوری طور پر پہنچ جاتے۔ اس دور میں اپنے اسیروں کا جو خیال اس طلبہ تنظیم نے رکھا اس کی مثال اس وقت کی دیگر جماعتوں میں تلاش کرنا مشکل ہے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔ تحریک ختم نبوت میں جب دوسری مرتبہ جیل کاٹی تو اس موقع پر بھی میرے ساتھ جاوید ہاشمی اور احسان اللہ وقاص تھے۔ جیل میں سیدھی بات یہی ہے کہ جاوید ہاشمی کی وجہ سے بھی بہت زیادہ لوگ ہم سے ملاقات کے لیے جیل آتے تھے۔

جیل میں لاہور کا ایک مشہور بدمعاش ''شاہیا'' بھی قید تھا۔ حویلی بارود خانہ اور سٹی سینما کے علاقوں میں شاہیا بدمعاش کی اپنی ایک سلطنت اور ریاست تھی۔ وہ لاہور کا ایک بڑا نام تھا اور اس کا بڑا دبدبہ تھا۔ میں نے جیل کی ڈیوڑھی میں دیکھا کہ شاہیا بدمعاش نیچے چوکڑی مار کر بیٹھا ہوا ہے اور ایک بہت بوڑھی خاتون کہ جس کے چہرے پر جھریاں برگد کی چھال کی طرح لٹکی ہوئی ہیں وہ اس کی پنڈلیاں دبا رہا تھا اور اس کے پاؤں چوم رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ میری ماں ہے۔ اب اس زمانے کی قدریں، روایات اور والدین کا احترام دیکھیں کہ معاشرہ جن کو ان پڑھ، جاہل، غنڈہ اور بدمعاش کہتا ہے وہ بھی والدین کے معاملے میں اس قدر حساس تھے اور والدین کا احترام کرتے تھے۔ اسی جیل میں ہماری ملاقات وسن پورہ شالی لاہور کے ایک بہت بڑے بدمعاش۔ معذرت، اب میں لفظ بدمعاش استعمال نہیں کروں گا کیونکہ اب ایسے لوگوں کو ''پہلوان'' کہا جاتا ہے۔ علاقہ وسن پورہ اور شمالی لاہور کا ایک بہت بڑا پہلوان تھا ''باہلا بیتاں والا'' اس سے بھی ہماری جیل میں ملاقات ہوئی۔ اب اس نے داڑھی رکھ لی تھی اور پکا نمازی تھا، ہر وقت یادِ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جیل کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہاں آ کر انسان کو اللہ یاد آ جاتا ہے۔

جب دِیارِ نج بتوں نے تو خدا یاد آیا

اسی جیل کے اندر ایک اور بہت بڑے پہلوان حافظ صمد کو بھی ہم نے دیکھا۔ اب ان ''پہلوانوں'' کی بات چل نکلی ہے تو عرض کرتا چلوں کہ اس زمانے میں لاہور میں بستہ الف کے چار معروف بدمعاش یا پہلوان تھے۔ حافظ صمد، اچھا شوکر والا، جگا گجر اور سلیم نمبردار۔ حافظ صمد بہت اچھے انسان تھے، یہ بھی ہمیں جیل میں ملے۔ جب بھی ہم سے ملتے بڑی خوبصورت گفتگو کرتے۔ یہ بڑے ہی نفیس اور نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔ حافظ صمد ہمیں کہتے تھے کہ یار آپ لوگ ختم نبوت کے تحفظ کی خاطر جیل میں آئے ہیں۔ آپ عاشقانِ رسولؐ ہیں اور میں اس لیے بڑی عقیدت کے ساتھ آپ کو ملنے آتا ہوں۔ اسی طرح قلعہ گجر سنگھ اور ریلوے سٹیشن کے علاقوں میں بھی بستہ الف کا ایک پہلوان رہتا تھا جس کا نام تھا اچھا شوکر والا۔ اچھا شوکر والا نے بہت ہی شہرت پائی۔ یہ لاہور کا ایک نہایت معروف اور دہشت ناک نام تھا۔ میرے استادِ محترم آغا شورش کاشمیری نے اپنی کتاب ''موت سے واپسی'' میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اسلامیہ پارک سے لے کر مزنگ، مہاجر آباد، سوڈیوال اور دیگر آس پاس کے علاقوں میں جس پہلوان کا سکہ چلتا تھا اس کا نام سلیم نمبردار تھا۔ ان پہلوانوں کا ذکر ریاض بٹالوی نے ان دنوں اپنے ایک فیچر میں بھی کیا تھا۔

اسی طرح لاہور میں بستہ ب کے جو بدمعاش تھے ان میں ایک بھولا چکی والا تھا۔ یہ گوالمنڈی کا رہنے والا تھا اور لاہور کے ایک لارڈ میئر خواجہ ریاض محمود کا خسر تھا۔ بستہ ب کے دوسرے بدمعاش کا نام تھا ملاں مظفر۔ یہ بازارِ حسن اور اس کے گردونواح کے علاقہ کا پہلوان تھا۔ اگر ہم ٹکسالی کی طرف سے آئیں تو ہیرا منڈی کے آغاز ہی میں ایک مسجد ہے جو چھوٹی شاہی مسجد کہلاتی ہے۔ یہ بہت قدیم مسجد ہے۔ اس مسجد کے جو خطیب (ان کا نام ذہن سے اتر گیا ہے) تھے ملا مظفر ان کے بیٹے تھے جو بعد میں غلط راستوں پر پڑ گئے تھے۔ امین پارک میں میرے گھر کے قریب کریم پارک میں ان کی رہائش تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان پہلوانوں کی پرورش کون کرتا تھا؟ ان کی ساخت اور پرداخت کون کرتا تھا؟ انہیں معاشرے کے لئے دہشت اور وحشت کی علامت اور استعارہ کون بناتا تھا؟ اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو ہمارے سیاسی عناصر ''پہلوان'' بنایا کرتے ہیں یا پھر پولیس بنایا کرتی ہے۔ پولیس کی سرپرستی کے بغیر کوئی بھی بندہ بدمعاش اور پہلوان نہیں بن سکتا۔ میں یہاں پر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یہ پیغام بھی دینا چاہوں گا کہ وہ نوجوان کہ جنہیں یہ پہلوان بہت متاثر کرتے ہیں، اور غنڈہ گردی کے ذریعے نام بنانے والے لوگوں کو وہ ''ہیرو'' کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھیں کہ ان کی زندگی انتہائی مختصر ہوتی ہے اور ان کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ فارسی زبان میں ایک ترکیب استعمال ہوتی ہے ''شعلۂ مستعجل''۔ یہ جرائم پیشہ لوگ شعلۂ مستعجل ہی ہوتے ہیں۔ یہ پھلجھڑی کی طرح چند لمحوں کی بہار دکھاتے اور پھر اس کے بعد راکھ ہو جاتے ہیں...... اسی طرح میرے ایک شاگرد اور دوست تھے جو بعد میں کونسلر بھی بنے۔ انہوں نے بدمعاشی چھوڑنا بھی چاہی تو نہ چھوڑ سکے اور اس وقت کی برسر اقتدار پارٹی مسلم لیگ نواز نے ان کو دوبارہ جرائم پر مجبور کرنا چاہا۔ اس نوجوان کا نام تھا طاہر پرنس۔ اس کی ہیبت سے سمادھی گنگا رام، بلال گنج، امین پارک اور چودھری پارک کے علاقوں میں جو اصل ''پہلوان'' تھے وہ خائف ہو گئے تھے۔ ان سارے علاقوں میں مجاوروں کی پہلوانی کا سکہ چلتا تھا اور ان کے اس نظام کو جس نوجوان نے تلپٹ کیا اس کا نام تھا طاہر پرنس۔ اس کا اصل نام طاہر نفیس اخگر تھا جو بعد میں طاہر پرنس کے نام سے معروف ہوا۔ طاہر نفیس اخگر راوین تھا اس نے میٹرک میں بہت اچھے نمبر لیے تھے اور گورنمنٹ کالج میں اس نے اپنی ایک تنظیم ''راوین فرنٹ'' کے نام سے بھی قائم کی تھی۔ اس تنظیم نے اسلامی جمعیت طلبہ جیسی تنظیم کو بھی شکست دی تھی۔

طاہر پرنس اپنے علاقے سے کونسلر بھی منتخب ہوا۔ اس نوجوان نے بعد میں اعلان کیا کہ میں غنڈہ گردی چھوڑنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں اس نے وائے ایم سی اے کے تہہ خانے میں ایک ریستوران ''Meals'' ہوا کرتا تھا، میں باقاعدہ ایک پریس کانفرنس کی جس میں مَیں بھی شامل تھا اور میرے ساتھ لاہور پریس کلب کے اس وقت کے صدر ہما علی و دیگر بھی موجود تھے۔ یہاں اس نے غنڈہ گردی چھوڑنے اور ایک نئی تنظیم قائم کرنے کا اعلان کیا۔ یہ 1988ء کے اوائل کی بات ہے۔ اس نے اس پریس کانفرنس میں ''جیو اور جینے دو'' کا نعرہ لگایا۔ یہ سلوگن اسی کی ایجاد ہے۔ طاہر پرنس بلال گنج کے علاقوں کا منتخب بلدیاتی نمائندہ بھی تھا۔ اس نے اس پریس کانفرنس میں بندوق پھینک کر قلم تھامنے کا اعلان کیا تھا لیکن جو اس کے سیاسی حریف تھے انہوں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کر دیا اور آخر کار وہ ملک چھوڑ کر برطانیہ چلا گیا۔

طاہر نفیس پہلی بار گرفتار ہوا تو اس پر پولیس نے تشدد کیا۔ اب اس کے پاس صرف دو ہی راستے تھے کہ یا تو وہ دوبارہ بندوق اٹھالے یا پھر وہ ''شاخِ زیتون'' تھام لے۔ لیکن پولیس اور معاشرے کی جو پولیٹیکل رولنگ ایلیٹ ہے اس کے مقابلے میں اس کو یہ سسٹم اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ بندوق پھینک کر ''شاخِ زیتون'' تھام لے۔ لہٰذا ان حالات میں اس نے ہمیشہ کے لیے یہ ملک چھوڑ دیا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اسی فہرست میں ایک نام باؤ وارث کا ہے۔ یہ لاہور میں جنرل ایوب خان اور مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم کے دوران بطور ''پہلوان'' بہت مشہور ہوا۔ میں جب ان سے ملا تو وہ اس وقت پولیٹیکل فگر بن چکے تھے۔ یہ 1985ء کی بات ہے۔ اس وقت انہوں نے کرشن نگر میں اپنی مارکیٹ بنالی تھی۔ اسی طرح میں نے سلیم نمبردار کو دیکھا کہ اس نے بھی منفی سرگرمیاں چھوڑ دیں اور پھر راج گڑھ میں ''نمبرداروں کی مسجد'' کے نام سے ایک مسجد بھی تعمیر کی تھی۔ سلیم نمبردار اکثر اوقات مسجد کے باہر کرسی پر بیٹھا ہوتا اور جونہی نماز کا وقت ہوتا، مسجد کے اندر چلا جاتا۔ لاہور کا ایک بہت بڑا کردار ''ٹیپوٹرکاں والا'' تھا۔ یہاں پر اب دو اور کردار یاد آ گئے ہیں جو منشیات فروشی کے حوالے سے معروف تھے۔ یہ دو بھائی تھے: ایک کا نام تھا ''فیجا'' اس کا اصل نام حفیظ تھا اور اس کے دوسرے بھائی کا نام ''نجا'' تھا۔ یہ دونوں بھائی لاہور کے ''ڈرگ لارڈز'' تھے۔ رانا چیمبرز جوان دنوں جاوید ہاشمی کی سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ تھا، اس کے ایک کمرے میں دو موٹے موٹے آدمی ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو میں دسمبر 1976ء سے الیکشن تک مسلسل دیکھتا رہا۔ مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں ہاں اتنا میں ضرور سمجھتا تھا کہ یہ ضرور کوئی ''صحت مند'' سے بندے ہیں جو ملتان سے آئے ہیں۔ ایک دن مجھے کہا گیا کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ جائیں اور شاہ عالمی چوک میں جا کر ''بلے'' نامی شخص سے ملیں۔ خیر میں ''نجے'' کے ساتھ وہاں پہنچا اور وہاں سے ہم الیکشن کمپین کے لیے ایک اچھا خاصا ''زرِاعانت'' لے کر آئے۔

1978ء سے 1980ء تک جو لوگ اس میدان میں مشہور ہوئے ان میں پرانی انارکلی میں ایک کردار تھا ''کالے خان''۔ یہ معروف فلم ایکٹر یوسف خان کے بھتیجے تھے۔ کالے خان کے بڑے بھائی کا نام لالہ فرید تھا اور ان کے والد صاحب لاہور ہائی کورٹ کے سینئر وکیل تھے۔ اس کے بعد جو نام چلا وہ انہی دو بھائیوں ''فیجے'' اور ''نجے'' کا چلا جن کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ ''کالے خان'' کے بعد جو نام معروف ہوئے، ان میں ''کالو شاہ پوریہ'' کا نام تھا۔ یہ تمام لوگ بالآخر برے انجام سے دوچار ہوئے۔ لاہور کی بدمعاشی میں ایک بڑا نام ''رئیس ٹینکی'' بھی گزرا ہے۔ منا قصائی، اشرف ٹیڈی، رئیس کالیا وغیرہ بھی اسی قبیل کے لوگ تھے۔ اب چونکہ میں بلدیات کی سیاست کر رہا تھا تو ان غنڈوں کے خلاف میں عوامی طاقت کے ساتھ اور اللہ پاک نے جو مجھے لکھنے اور بولنے کی صلاحیت دی تھی اس کے ساتھ میں نے ان کے خلاف جنگ کرنا تھی۔ میں نے ہمیشہ سچی بات کہنے اور کسی کو للکارنے سے کبھی تامل نہیں کیا۔

میں اپنے بلدیاتی حلقے سے دو مرتبہ 1987ء اور 1991ء میں کونسلر منتخب ہوا اور ایک مرتبہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن میں ڈپٹی ایوان قائد بنایا گیا تو اس دور میں مَیں نے اپنے حلقے میں ان پہلوانوں، بدمعاشوں اور ڈرگ مافیاز کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ بالخصوص منشیات فروشوں کے خلاف میں ہمہ وقت میدان عمل میں رہا اور اپنے علاقے سے اس لعنت کو ختم کرنے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کردار ادا کیا۔ اسی موقع پر مجھے ظفر علی روڈ پر واقع امریکی قونصلیٹ میں قونصل جنرل نے باقاعدہ بلایا اور منشیات فروشوں کے خلاف میری کوشش کو سراہتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اس مافیا کی بیخ کنی کیسے کی تو میں نے جواب دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ''زور خطابت'' اور عوامی طاقت کے ساتھ ایسا کیا جس میں مجھے کامیابی ملی۔ جب میں چوتھی بار 1993ء میں گرفتار ہوا، اس وقت میرے ساتھ یہ منسوب کر دیا گیا تھا کہ میرا تعلق مسلم لیگ نو از سے ہے۔ 1993ء میں جب منظور احمد وٹو صاحب وزیر اعلیٰ پنجاب تھے اور نواز شریف نے حکومت کے خلاف ''تحریک نجات'' کا اعلان کرتے ہوئے مورخہ 19 اکتوبر کو ایک جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا تو اس موقع پر منظور احمد وٹو اپنے بیٹے معظم وٹو کی شادی سے جونہی فارغ ہوئے تو انہوں نے پہلا ''نادر شاہی'' فرمان یہ جاری کیا کہ لاہور شہر چونکہ نواز شریف کا سیاسی گڑھ ہے اور یہاں سے تحریک نجات کامیاب ہو سکتی ہے تو لاہور شہر کے لوگوں کو سڑکوں پر لانے میں جو لوگ رول پلے کر سکتے ہیں، ان کو گرفتار کر لیا جائے۔ لہٰذا اس ضمن میں ایک ''موہوم'' سے خدشے کے پیش نظر جبکہ میرا نواز شریف کے ساتھ کوئی تعلق ہرگز نہ تھا اور کبھی نہیں رہا تھا اور میں نے دونوں بلدیاتی الیکشن بھی ان کے خلاف لڑے تھے اور صوبائی الیکشن میں میاں نواز شریف کے خلاف عبید اللہ شیخ کو کھڑا کر کے اس کی بھرپور سپورٹ کی تھی۔ (یہ عبید اللہ شیخ وہی ہیں جنہوں نے 1983ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں طلبہ یونین کا الیکشن لڑا تھا اور صدر منتخب ہوئے تھے)۔

بہر حال نواز شریف کی تحریک نجات میں مجھے بھی بلا جواز گرفتار کر لیا گیا اور اس تحریک کا اولین اسیر بھی میں ہی تھا۔ پولیس جب مجھے تھانے لے گئی تو ایس ایچ او نے کہا: حافظ صاحب آپ کا تو نواز شریف کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ حکومتی حکم نامہ یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے تمام سیاسی مخالفین کو گرفتار کر لیا جائے تو اس خدشے کے پیش نظر آپ کو گرفتار کیا گیا ہے۔ آپ اگر ہمیں لکھ کر دے دیں کہ آپ مسلم لیگ کے نہیں ہیں تو ہم آپ کو چھوڑ دیں گے۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ جناب یہ تھانہ اور جیل میرے لیے ہرگز نئے نہیں ہیں۔ آپ لوگوں نے باقاعدہ سیڑھی لگا کر اور میرے گھر کی چار دیواری کا تقدس پامال کر کے مجھے گرفتار کیا ہے، یہ بات تو آپ کو مجھ سے وہاں پوچھنا چاہیے تھی، اگر آپ وہاں مجھے یہی بات کہتے تو شاید میں آپ کی یہ بات تسلیم کرتا یا نہ کرتا لیکن

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یہ بات مجھے معقول ضرور لگتی۔ جب آپ نے وقتی طور پر مجھے زبردستی مسلم لیگ نواز کے ساتھ ''نتھی'' کر ہی دیا ہے اور جبکہ میں مسلم لیگ نواز کا مخالف ہوں اور اس کے ساتھ اینٹی بھٹو بھی ہوں لیکن اب میں ان حالات میں اینٹی پی پی بھی ہوں اور اینٹی پی پی بھی ہوں۔ اب میں مسلم لیگ کا ساتھ دوں گا اور کوئی معافی نامہ، معذرت نامہ یا تلافی نامہ ہرگز نہ لکھوں گا۔ کیونکہ میرے استاد محترم آغا شورش کاشمیری نے کہا تھا کہ: ''معذرت شیوہ مردانِ اولوالعزمی نہیں ہے''۔ میری گرفتاری پر مسلم لیگ ہاؤس ڈیوس روڈ پر منعقدہ ایک اجلاس میں میاں محمد نواز شریف نے کہا کہ: ''میں بلدیہ عظمٰی لاہور کے ڈپٹی قائد ایوان حافظ شفیق الرحمٰن کی گرفتاری کے موقع پر چادر اور چار دیواری کے تقدس کی پامالی کی مذمت کرتا ہوں''۔ میں اس موقع پر پندرہ دن کیمپ جیل میں رہا۔ استاد محترم آغا شورش کاشمیری کے ذکر سے یاد آیا کہ ان سے میری پہلی ملاقات بطور سامع پنجاب یونیورسٹی ہال میں ہوئی تھی۔ ہمارے گھرانے میں ان کا اکثر ذکر رہتا تھا کیونکہ ہمارے گھر ان کا جریدہ ''چٹان'' مستقل آیا کرتا۔ والد صاحب ختم نبوت کے حوالے سے آغا صاحب کے غیر متزلزل موقف کی وجہ سے ان سے عقیدت رکھتے تھے اور دوسری بات یہ ہے کہ آغا صاحب کا جو علمائے کرام کے ساتھ تعلق تھا اس کی وجہ سے بھی والد صاحب ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

یہ 21 اپریل 1970ء کی بات ہے کہ یونیورسٹی ہال میں ''مرکزیہ مجلس اقبال'' کا جلسہ تھا اور چھٹی والے دن والدہ مجھے گوشت لانے کے لیے بھیجتی تھیں۔ اس وقت بکرے کا معیاری گوشت انارکلی میں پرانی ٹولنٹن مارکیٹ سے ملتا تھا۔ میں راج گڑھ اپنے آبائی علاقہ سے ٹولنٹن مارکیٹ پہنچا اور جب وہاں سے گوشت لے کر باہر نکلا تو اولڈ کیمپس کے باہر ایک ہجوم دیکھا۔ جیسا کہ بچوں میں ایک تجسس ہوتا ہے اور میں بھی اسی تجسس کے سبب ہجوم کی طرف چل پڑا۔ میرے پاس سائیکل تھی اس زمانے میں شاپر نہیں ہوتے تھے اور تھیلا ہوتا تھا۔ میں نے تھیلا ہاتھ میں پکڑا اور لوگوں سے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے تو لوگوں نے مرکزیہ مجلس اقبال کے جلسے کے متعلق بتایا۔ اسی اثنا میں میرے کانوں میں ایک آواز آئی:

''دوستو! یہ مرکزیہ مجلس اقبال کا اجتماع ہے۔ یہاں آپ نے انتہائی مودب انداز میں بیٹھنا ہے۔ اس مودب انداز اور منظم انداز میں بیٹھنا ہے کہ ہر کہ و مہ جو آپ کو دیکھے تو وہ آپ کو جیتے جاگتے انسانوں کا ایک ہجوم یا مجمع نہ سمجھے بلکہ اسے یوں محسوس ہو کہ جیسے کسی کہنہ مشق شاعر نے چھوٹی بحر کی مرصع غزل میں قافیوں کے ساتھ ردیفوں کی لڑیاں پرودی ہوں''۔

یہ الفاظ اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن حافظہ اچھا تھا کہ جو بات بھی سنتا تھا وہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرے ذہن میں نقش کا ابھر ہو جاتی تھی۔ اس سے مجھے تجسس پیدا ہوا۔ میں تو چونکہ اپنے والد کے ساتھ مختلف خطباء کو سنا کرتا تھا اور میں نے ان کے ساتھ مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا غلام غوث ہزاروی، علامہ خالد محمود، علامہ عنایت اللہ گجراتی، مولانا ضیاء القاسمی، مولانا محمد عمر پالن پوری، سید ابو معاویہ بخاری، صاحبزادہ فیض الحسن آلومہار شریف، مولانا محمد عمر اچھروی، (بریلوی سکول آف تھاٹ کے ایک بڑے مناظر)، علامہ رشید ترابی اور نصیر الاجتہادی کو سنا جو کہ بہت بڑے شیعہ ذاکر تھے۔

بہر حال اب میں نے شورش صاحب کے یہ الفاظ سنے تو میں نے سوچا کہ ایسے الفاظ تو میں نے کسی کے ہاں نہیں سنے اور اس طرح کی بات تو کسی نے نہیں کی۔ چٹان پڑھ پڑھ کر میرا ادبی ذہن تو بن گیا تھا اور اب ان کے الفاظ اور بیان کی بنت اور تقریر کا ایک بہاؤ اور ان کا اسلوب اور قرینہ تھا جو میرے ذہن کے اندر خوبصورت احساس پیدا کر رہا تھا اور ایک شوق پیدا کر رہا تھا کہ خطابت ایک باقاعدہ فن ہے۔ تقریر محض الفاظ کی بارش کر دینے کا نام نہیں ہوتا۔ اس میں آپ کو اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ اور اپنے لہجے کے زیر و بم سے ایک ایسا تاثر پیدا کرنا ہوتا ہے کہ سامعین کے دل میں آپ کی بات یوں اتر جائے جیسے صبح کے وقت ''شاخِ گل'' میں ''شبنم کا رس' ڈھل جاتا ہے۔

اس جلسہ کی صدارت جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید مودودیؒ کر رہے تھے۔ میں نے پہلی بار اسی پروگرام میں ان کی زیارت کی۔ مرکزیہ مجلس اقبال کے سٹیج سیکرٹری بھی آغا صاحب خود ہی ہوتے تھے۔ جب آغا صاحب نے مولانا مودودی کو تقریر کے لیے دعوت دی، تو کہا: ''سامعین اب آپ کے سامنے عالم اسلام کے ایک جید سکالر اور بین الاقوامی سطح پر مسلمہ علوم شرقی و غربی کے ماہر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اظہار خیال کریں گے۔ فکر اقبال کے حوالے سے ذکر اقبال ان کی زبان بلاغت سے سنیے گا اور میں یہ چاہوں گا کہ آپ ان کی گفتگو اس طرح خاموشی سے سنیں کہ جیسے رات کا سناٹا چمکتے ہوئے ستاروں کی کتھا سنا کرتا ہے''۔

آغا صاحب کا یہ جملہ بھی میرے ذہن میں نقش ہو گیا۔ یوں میں نے پہلی مرتبہ دونوں بڑی شخصیات کو ایک ہی موقع پر دیکھا اور ان کو سنا۔ میرا خاندانی پس منظر دیوبند مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا جو مولانا مودودی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ بہر حال اب میں نے وہاں آغا صاحب کی زبان سے ان کی اس حد تک تعریف سنی تو میرے ذہن میں از خود ان کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔ یاد پڑتا ہے کہ 1972ء میں جب میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں مختلف انٹر کالج ڈیبیٹس اور انٹر یونیورسٹیز ڈیبیٹس میں حصہ لیتا تھا اور انعامات کا کوئی ایک درجہ ایسا نہیں تھا جو میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

نے حاصل نہ کیا ہو۔ میں نے گولڈ میڈل بھی حاصل کیے۔ میں نے ٹرافیز لیں اور شیلڈز بھی حاصل کیں۔ میں نے سلور میڈل بھی حاصل کیے، میں نے حوصلہ افزائی کا بھی انعام حاصل کیا۔ میں نے یونیورسٹی سطح کیا نے ہوئے مقررین کے ہجوم میں اپنی ڈبیٹس کا آغاز کیا تھا۔ میرے ذہن میں رول ماڈل اور جو آئیڈیل تھا وہ آغا صاحب ہی کا اسلوب تھا۔ ان کی خطابت تھی۔ 70ء کے جب الیکشن ہوئے تو ان دنوں کوئی ایسا موقع میں نے نہیں جانے دیا کہ جب آغا صاحب کی کہیں تقریر ہو اور میں انہیں سننے کے لیے نہ پہنچا۔ مجھے اگر پتہ چلتا کہ سلطان پورہ یعنی شمالی لاہور میں جلسہ ہو رہا ہے تو میں وہاں پہنچ جاتا تھا۔ یہ میرا آغا صاحب سے ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا اور مجھے جنون کی حد تک ان سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ جب پتہ چلتا کہ جلو یا باٹا پور کے علاقے میں کہیں جلسہ ہے تو میں وہاں سائیکل پر پہنچ جاتا۔ کوئی ایسا مقام نہ تھا جہاں آغا صاحب کی تقریر ہوئی ہو اور میں وہاں نہ پہنچا ہوں اور میں نے اپنے دامن سماعت میں ان کی خطابت کے جو موتی ہیں ان کو نہ سمیٹا ہو۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ 1973ء میں مشرق اخبار کے ایڈیٹر ضیاء الاسلام انصاری تھے۔ اس کے بانی عنایت اللہ تھے۔ (یہ عنایت اللہ حکایت والے نہیں تھے)۔ عنایت اللہ ''کوہستان'' اخبار سے آئے تھے۔ اس دور میں کاتب اخبارات کے دفاتر میں نیچے چٹائیوں پر بیٹھا کرتے تھے اور پہلی مرتبہ عنایت اللہ مرحوم نے جدت یہ پیدا کی کہ ان کو کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر مشرق اخبار جس انداز سے انہوں نے نکالا اور اس کے رنگین ایڈیشن شائع کیے اس کی آج تک کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس زمانے میں گرافکس اور کتابت کے وہ آلات اور وہ سہولتیں موجود نہ تھیں جو آج کل میسر ہیں، تب بھی انہوں نے اس دور میں بہت جدت پیدا کر دی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک وژنری انسان تھے۔

مشرق اخبار میں کاتبوں کی ایک تنظیم تھی جس کے صدر ملک نور ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ یار آپ آئیں اور ہمارے عنایت اللہ صاحب کی برسی کے موقع پر ہونے والے ''تعزیتی ریفرنس'' میں اظہار خیال کریں۔ یہ پروگرام جناح ہال میں ہوا جس کو ٹاؤن ہال بھی کہا جاتا ہے۔ عنایت اللہ صاحب کے بارے میں معلومات مجھے ملک نور اللہ صاحب نے فراہم کیں اور میں نے ان کو اپنے انداز میں خطابتی اور تقریری اسلوب میں ڈھال کر تقریر کر دی۔ اس جلسہ میں جن مقررین نے تقریریں کی ان میں آغا شورش کاشمیری، سیاستدان نبیل گبول کے والد سردار عبدالستار گبول اور دیگر بڑے حضرات شامل تھے۔ اس جلسہ کی صدارت ممتاز بیوروکریٹ اور شہاب نامہ کے خالق قدرت اللہ شہاب کر رہے تھے۔ میں نے جب تقریر کی تو اس وقت تک آغا صاحب نہیں پہنچے تھے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں نے عنایت اللہ مرحوم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بڑے صحافیوں حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش کا ذکر کیا وہاں میں نے آغا صاحب کا بھی ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ یہ لوگ تو ماضی مرحوم کی نذر ہو گئے ہیں اور اب ہم اس خوش قسمت دور میں زندہ ہیں جہاں اس وقت قبیلہ صحافت کی سرداری آغا شورش کاشمیری کے پاس ہے۔ یوں میرے دل میں ان کی جتنی ارادت اور عقیدت تھی اور جتنے بہترین الفاظ میں اس عقیدت کو بیان کر سکتا تھا وہ بیان کر دی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آغا صاحب کب آئے اور آ کر سٹیج پر بیٹھ گئے۔ جب میں تقریر کر کے ہٹا تو سٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ اب آغا صاحب تقریر کریں گے۔ آغا صاحب سٹیج پر آئے، یہ میری ان سے پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔ ان کی عادت تھی کہ جب وہ تقریر کے لیے مائیک پر آتے تو ان سے پہلے جتنے بھی مقرر تقریر کر چکے ہوتے، وہ ایک ایک کا نام لیتے اور ہر ایک کے بارے میں ایک آدھ تحسینی جملہ ضرور کہتے۔ انہوں نے میرے بارے میں کہا کہ اسلامیہ کالج کے جس نوجوان نے تقریر کی ہے میں اس کے بارے میں کسی قسم کا کوئی تحسینی جملہ نہیں کہتا اس لیے کہ اس نے اپنی تقریر میں مجھے بے تحاشا خراج تحسین پیش کیا ہے اور میں بھی اس کی تعریف کروں گا تو یہ عمل رشوت کے زمرے میں آ جائے گا۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ جب یہ تقریب ختم ہو جائے تو وہ مجھے ضرور مل کر جائے۔

چنانچہ جب تقریب ختم ہوئی اور میں ان سے ملا تو انہوں نے کہا کہ بچے بات یہ ہے کہ میں فن خطابت پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں، میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ کتاب کوئی پڑھے نہ پڑھے تم ضرور پڑھنا۔ کیونکہ میں تمہارے اندر بہت سی اہلیتیں اور صلاحیتیں دیکھ رہا ہوں اور خطابتی حوالے سے کمزوریاں بھی دیکھ رہا ہوں۔ جب تم وہ کتاب پڑھو گے تو ایک اچھے خطیب کی صورت میں سامنے آؤ گے۔ اور ایک بات یاد رکھنا کہ صحافی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک خاص شعبہ کا مطالعہ کرے، ڈاکٹر کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو اپنی پروفیشنل ایجوکیشن تک محدود رکھے۔ شعراء کے لیے ضروری ہے کہ وہ متقدمین اور متاخرین شعراء اور متوسطین کا کلام پڑھیں لیکن ایک خطیب پر لازم ہے کہ وہ ادب بھی پڑھے، ناول بھی پڑھے، افسانہ بھی پڑھے، کہانی بھی پڑھے، اداریہ بھی پڑھے، مطائبات بھی پڑھے، انشائیہ بھی پڑھے، فکاہیہ بھی پڑھے، پابند نظم، آزاد نظم، نظم معریٰ، نثری نظم، غزل، رباعی، ہزل، قصیدہ، مثنوی، مخمس بھی پڑھے اور مسدس بھی۔ غرض ایک خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر موضوع پر کتب کا مطالعہ کرے اور جو بھی کتاب اسے میسر ہو اسے پڑھ ڈالے۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات کا احوال ہے۔ اس کے بعد بھی خواجہ افتخار صاحب جو کہ ''امرتسر جل

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

رہا ہے'' کے مصنف تھے ان کی وساطت سے میں ایک بار آغا شورش صاحب سے ملا تو خواجہ صاحب نے اس موقع پر آغا صاحب کو میری اس تقریر کے متعلق بھی بتایا جو میں نے مولانا کوثر نیازی کی موجودگی میں بھٹو صاحب کے خلاف کی تھی۔ دیکھیں اصل بات یہ نہیں کہ آپ کی کسی بڑی علمی اور ویژنری شخصیت سے کتنی طویل رفاقت رہی اور اس کی کتنی صحبتیں اختیار کیں۔اصل بات یہ ہے کہ آپ نے کسی بڑی شخصیت کی تعلیمات کو کس قدر اپنایا اور اس کے تبحر علمی سے کتنا فائدہ اٹھایا۔اصل چیز کسی رائٹر یا ادیب وخطیب کے وہ رشحات فکر ہوتے ہیں جو کتابی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ میں نے آغا صاحب کی کوئی ایسی شاعری یا نثری کتاب نہیں ہوگی جسے بار بار نہ پڑھ لیا ہو۔ 1949ء سے 1955ء تک تو میں نے ان کے تمام چٹان والے اداریے پڑھ لیے تھے۔اس کے بعد 1970 سے لے کر اکتوبر 1975ء یعنی ان کی وفات تک جتنے بھی چٹان کے اداریے تھے، فکاہیہ کالم تھے، جتنی ان کی دوسری تحریریں، شذرات چھپے وہ سارے کے سارے میں نے پڑھے اور صرف پڑھے ہی نہیں بلکہ انہیں اپنے اندر سمویا اور اپنے اندر جذب کیا اور بہت کچھ سیکھا۔ یوں میری آغا صاحب کی زندگی میں تو ان کے ساتھ چند ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں لیکن ان کے وصال کے بعد ان سے ہر شب جو ملاقاتیں ہوتی ہیں ان کا کوئی شمار نہیں۔آج بھی میرا یہی معمول ہے کہ میں ان کی روزانہ کوئی نہ کوئی تحریر پڑھتا ہوں۔

جب 1975ء میں آغا صاحب کی وفات ہوئی تو میں ان کے جنازے میں شریک تھا۔ یہ لاہور کا بہت بڑا جنازہ تھا۔ میں نے بہت سے جنازوں میں شرکت کی۔ مجھے شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ کی نماز جنازہ بھی یاد ہے جو یونیورسٹی گراؤنڈ میں پڑھائی گئی۔ یونیورسٹی گراؤنڈ جین مندر سے شروع ہوتی ہے اور چوبرجی تک جاتی ہے۔ یہ ساری گراؤنڈ اس کی سامنے والی سڑکیں، ملتان روڈ والی سڑک، لیک روڈ' غرض ہر طرف خلقت ہی خلقت تھی۔مولانا کے جنازے کی چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس لگائے گئے تھے۔لوگ ان کو چھو کر گزر جاتے۔ یہ لاہور کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا اور مجھے والد صاحب نے بغلوں سے اٹھا کر اوپر کیا کہ دیکھو کتنے لوگ ہیں۔تو وہ منظر مجھے آج بھی یاد ہے۔دوسرا جنازہ جو میں سمجھتا ہوں کہ بہت بڑا تھا وہ آغا صاحب کا تھا۔ یہ بھی یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہوا۔ بڑے بڑے سیاستدان، صحافی، مشاہیر اور عام لوگوں نے اس میں شرکت کی۔تیسرا بڑا جنازہ جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھا وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تھا۔اسی طرح چوتھا بڑا جنازہ جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ خواجہ سعد رفیق کے والد گرامی خواجہ رفیق شہید کا تھا۔ ہمارے بزرگ بتایا کرتے ہیں کہ لاہور کی تاریخ کا ایک بہت بڑا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جنازہ 1929ء میں غازی علم دین شہیدؒ کا تھا۔

جب میں طلبہ یونین کا نائب صدر تھا اور اسلامی جمعیت طلبہ کے دفتر واقع۔ پانچ اے ذیلدار پارک، اچھرہ جانا ہوتا تو اس دفتر کے بالمقابل مولانا مودودیؒ کی رہائش تھی جس کے صحن میں نمازِ عصر کے بعد مولانا کی روزانہ کی مجلس ہوتی تھی، اس میں مَیں شریک ہو جاتا۔ سیدھی سی بات ہے کہ میری تو کبھی جرات بھی نہیں ہوئی کہ میں مولانا جیسے عظیم انسان سے مخاطب ہو سکوں۔ میں تو بس ان کی زیارت کرتا رہتا اور خاموش رہتا۔ ان سے میں نے کبھی کوئی سوال جواب یا استفسار نہیں کیا۔ ہم سے سینئر لوگ وہاں پر موجود ہوتے تھے جو بات چیت کرتے تھے۔ ہم تو بس مولانا کی باتیں نہایت ادب اور احترام کے ساتھ سنتے رہتے۔ مولانا انتہائی سادہ، وضع دار تھے اور دکن کی تہذیب کا شائستہ ترین شاہکار تھے۔ ان کی بہت سی کتابیں پڑھیں، چونکہ میں نے ابوالکلام آزاد سے شروعات کی تھیں اور جب میں نے مولانا مودودی کو پڑھا تو پھر مجھے سلیس اردو پڑھنے کا خوب موقع ملا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب تفہیم القرآن کا انگریزی ترجمہ الطاف گوہر نے کیا تو لاہور ہی میں ایک ہوٹل میں تقریب ہوئی تو اس موقع پراے کے بروہی نے ایک بات کہی تھی کہ قرآن ''عربی مبین'' میں نازل ہوا تھا اور سید مودودی نے اس کی تشریح تفہیم القرآن کے روپ میں ''اردوئے مبین'' میں کردی۔ میرے محلے راج گڑھ کے قریب کا محلّہ اسلام پورہ تھا۔ اس کا اصل نام کرشن نگر ہے۔ ناصر کاظمی یہیں کے رہنے والے تھے لیکن جس دور کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت وہ حیات نہیں تھے۔ اس دور میں کرشن نگر میں جو ایک ادبی آستانہ تھا اور جہاں سے فکر و نظر کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں وہ پروفیسر مرزا منور کا تھا۔ میں نے وہاں حاضری دینا شروع کی۔

پروفیسر مرزا منور جامع العلوم شخصیت تھے۔ عربی شاعری پر عبور تھا۔ وہ ہم جیسے عام طالب علموں کو بھی سمجھانے کے لیے عربی اشعار پڑھتے اور پھر ہم سے سنتے بھی۔ وہ ان اشعار کی تشریح کرتے اور پھر کہتے کہ اسے لکھ لو اور یاد کر لو۔ ہم ان کے حکم کی تعمیل کرتے اور جب بھی ان کے ہاں جانا ہوتا ایک ڈائری اپنے ساتھ لے لیتے۔ یہ کسی انسان کی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ بچپن ہی میں اسے ایسے لوگ مل جائیں یا ایسے لوگوں کو اپنے گرد و پیش، آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے دیکھ لے۔ جس محلے میں میں رہتا تھا اس میں مولانا چراغ حسن حسرت کے بیٹے ظہیر جاوید رہتے تھے۔ ان سے ہمارے گھریلو تعلقات تھے۔ وہ میرے والد صاحب کے شاگرد تھے۔ مولانا کی بیگم بھی میرے والد کی شاگردہ تھیں۔ ہم ان کو دادی اماں کہتے تھے اور ظہیر جاوید کو ہم بھائی جان کہا کرتے۔ یہ غالباً 1969ء کی بات ہے اور یہ اس زمانے میں ''امروز'' اخبار میں ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا امروز کی وجہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے لاہور سے شائع ہونے والے تمام اخبارات کی فائل ان کے ہاں آیا کرتی۔ وہ دفتر چلے جاتے تھے اور فائل میرے والد صاحب کو مطالعہ کے لیے دے جاتے۔ یوں مجھے اپنے گھر پر ہی لاہور سے شائع ہونے والا ہر اخبار اور ہر جریدہ میسر آتا اور میں خوب مطالعہ کرتا۔

راج گڑھ ہی میں ایک صاحب ''شرقی بن شائق'' رہتے تھے، وہ پیپلز پارٹی کے بڑے مداح تھے۔ مرتضیٰ بھٹو نے جب طیارہ ہائی جیک کیا اور اس کے بعد پیپلز پارٹی کے جن لوگوں کی رہائی کا مطالبہ ہوا تھا ان میں شرقی بن شائق کے بھائی بھی شامل تھے۔ انہیں سب لوگ ''ماسٹر غن غناں'' کہا کرتے کیونکہ وہ ناک میں بولتے تھے۔ یہ بڑا ادیبانہ ذوق رکھتے تھے۔ محلے میں میرے صحافتی شوق کو مہمیز دینے والوں میں جناب زبیر احسان قریشی میرے دوست بھی تھے اور استاد بھی۔ ان کے بیٹے سلمان قریشی لاہور پریس کلب کے عہدیدار بھی رہے۔ میرے گھر سے پانچ منٹ کے فاصلے پر مولانا کوثر نیازی کا نوتعمیر شدہ گھر تھا۔ مولانا کو ہم شیروانی، پاجامہ اور قراقلی ٹوپی پہنے راج گڑھ روڈ پر آتے جاتے دیکھا کرتے۔ ہم راج گڑھ سے یونیورسٹی گراؤنڈ پڑھنے جاتے تو بیچ میں ریواز گارڈن آتا تو کبھی راستے میں ہمیں پروفیسر برہان احمد فاروقی ترکی ٹوپی پہنے، علی گڑھ کٹ پاجامہ پہنے نظر آتے یا کبھی وہ پنجاب پبلک لائبریری یا اورنٹیئل کالج کی طرف جاتے دکھائی دیتے۔ یہیں پر ہم نے سید اسلام شاہ کو دیکھا جو ریڈیو پاکستان کے پروگرام منیجر تھے۔ بعد میں کسی بڑے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ یہ موسیقی پر خوب مہارت تامہ رکھتے تھے اور میرے ساتھ ان کا تعلق اس لیے بن گیا کہ وہ بھی میرے والد کے شاگرد تھے۔ سید اسلام شاہ راج گڑھ چونگی کی نکڑ پر رہتے تھے۔ ان کا کوٹھی نما بڑا اچھا گھر تھا۔ وہ انبالہ سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کے گھر کے باہر پتھر کا ایک بینچ رکھا ہوتا تھا اس پر مولانا کوثر نیازی ٹیک لگا کر بیٹھے ہوتے۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی جان مجھے یہ بتائیں کہ یہ مولانا کوثر نیازی آپ کے پاس کیوں آتے ہیں، وہ تو جماعت اسلامی کے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ریڈیو پاکستان کا پروگرام لینے کے لیے آتے ہیں اور میں چونکہ پروگرام منیجر ہوں تو یہ میرے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں تاکہ ان کو ایک پروگرام مل جائے، جس کا معاوضہ چالیس روپے ہوتا ہے۔ میں 70ء تک ان کو باقاعدہ حاضری بھرتے دیکھتا رہا۔

راج گڑھ اور آس پاس کا یہ سارا علاقہ بڑا مردم خیز خطہ تھا۔ ساندہ روڈ پر ایک کوٹھی نما گھر میں جب منو بھائی تازہ تازہ منتقل ہوئے تو ہم ان کو اکثر اس علاقے میں دیکھا کرتے۔ اسی طرح ریواز گارڈن کے عوامی فلیٹس میں مَیں نے استاد طالب جالندھری جیسے بڑے آدمی کو دیکھا۔ اسی علاقے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں ہماری ملاقات ڈاکٹر تبسم رضوانی سے ہوئی اور ان کی ادبی محفلوں میں مَیں نے زیبا ناروی کو دیکھا، یہیں پر ہماری ملاقاتیں بیدار سرمدی سے ہوئیں جو نوائے وقت میں رہے۔ یہ بڑے رائٹر اور ادیب ہیں۔ یہاں استاد بِچل آگروی سے جو استاد ثمر اکبرآبادی کہلاتے تھے سے بھی ملاقاتیں رہیں۔اسی علاقے میں پیام شاہجہان پوری سے ملا، حکیم ولی الرحمٰن ناصر سے ملا۔ ''اسلامی جمہوریہ'' کا جو ڈیکلریشن تھا وہ منصور طیب کے نام پر تھا، یہ بھی ریواز گارڈن میں رہتے تھے۔حمید جہلمی بھی اسی علاقے میں رہتے تھے۔ یہ اکبر علی بھٹی کے دور میں روزنامہ پاکستان کے گروپ ایڈیٹر رہے۔ ممتاز ادیب حمید اختر بھی اسی علاقہ میں کرائے کے ایک مکان میں رہتے تھے ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔

اسی طرح ایک بہت بڑا نام ہے سید عبدالصبور طارق، یہ بھی ہمارے محلے میں رہتے تھے۔ میں جب میٹرک میں تھا تو انہوں نے ایک بزم ادب بنا رکھی تھی وہ اس کے صدر تھے۔ وہ ملٹری اکاؤنٹس سے ڈائریکٹر ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ان کی بہت بڑی لائبریری تھی۔ان کے چھوٹے سے گھر میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں رکھی ہوتیں۔ ان کو پورے محلے کے بچے ماموں جی کہا کرتے۔ 1985ء سے 1988ء تک نیشنل بک فاؤنڈیشن کی جتنی بھی کتابوں پر اول انعام دیا گیا وہ سید عبدالصبور طارق ہی کی کتابوں کو ملا۔ تاریخ پر انہیں بڑا عبور تھا۔ بہت اچھے مترجم تھے، لین پول اور دوسرے لوگوں کے انہوں نے ترجمے کیے تھے۔ میں ان کی محفلوں میں بیٹھا کرتا۔ جب میں میٹرک میں تھا تو سید عبدالصبور طارق صاحب کے اس حلقہ احباب ادب میں کئی بڑے ادیبوں کو ملنے کا موقع ملا۔ پروفیسر مرزا منور، ڈاکٹر خواجہ زکریا اور استاد احسان دانش آیا کرتے۔ نوائے وقت کے کالم سرراہے کے لکھاری پروفیسر سلیم میر ہمارے گھر کی عقبی گلی میں رہتے تھے ان کو بھی میں آتے جاتے دیکھا کرتا اور لوگوں سے سنا کرتا کہ یہ بہت بڑے صحافی اور رائٹر ہیں۔ یوں بچپن ہی میں میرا ایک خاص ادبی اور صحافتی ذوق بن گیا تھا۔

احسان دانش کے متعلق مجھے یاد ہے کہ انتہائی سادہ اور درویش طبع انسان تھے۔ میں ان کے پاس بہت سی کتابیں دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ جب میں حفظ کر رہا تھا اور نیلا گنبد مدرسے میں جایا کرتا تو راستے میں بائبل سوسائٹی کے قریب فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کے سٹال لگے ہوتے تھے۔ میں اکثر دیکھتا کہ استاد دانش کھدر کا سوٹ، پاجامہ اور صدری نما واسکٹ پہنے اکڑوں بیٹھ کر کتابوں کی ورق گردانی کر رہے ہوتے تھے۔ یہیں میں نے پروفیسر برہان احمد فاروقی صاحب کو بھی دیکھا۔ 71ء میں جب میں پنجاب پبلک لائبریری جانا شروع ہوا تو وہاں بھی اکثر استاد احسان دانش کو دیکھا کرتا۔ میں نے 1978ء میں ''اسلامی جمہوریہ'' جریدے کے لیے استاد احسان دانش کا انٹرو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یو بھی کیا تھا جس میں انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ جب 1947ء میں قیام پاکستان عمل میں آ گیا تو سیکریٹریٹ کا بیش قیمت مواد ایسا تھا جسے انگریز اور ہندوؤں نے جاتے جاتے خفیہ طریقے سے نذر آتش کر دیا تھا۔ اس کے باوجود سیکرٹریٹ کی کچھ خفیہ فائلیں بچ گئی تھیں جو اب صرف میرے پاس ہیں جن میں لکھا ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریز پنجاب پر قابض ہوا تو پنجاب کے کن کن جاگیرداروں کو صلے میں کیا کیا دیا گیا۔ ایک تو ''چیفس آف پنجاب'' یا روسائے پنجاب'' و دیگر کتابوں میں بھی ان خاندانوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن احسان دانش کہتے تھے کہ میرے پاس تو اصل ماخذ ہیں اور ان فائلوں میں سب کچھ تفصیل کے ساتھ موجود ہے کہ کس کو کیا دیا گیا۔ دوستوں اور شخصیات کا تذکرہ چل نکلا ہے تو یاد آیا کہ جب میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ طلبہ یونین کا نائب صدر تھا تو اس وقت یونین کے صدر عباد علی شاہ تھے۔ عباد علی شاہ صاحب بیوروکریٹ کی حیثیت سے پٹرولیم کے ڈیپارٹمنٹ میں ایک بڑے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ہماری یونین کے جوائنٹ سیکرٹری عبدالجبار بٹ صاحب تھے جو آج کل جبار پیپر مل کے مالک ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں ان لوگوں کے ساتھ بہت اچھا اور بڑا بھرپور وقت گزرا۔ آغا شورش کاشمیری کی وفات کے بعد ان کے بچوں سے میل ملاقات رہی۔ چونکہ ہمارے گھر میں ہر ہفتے ''چٹان'' اخبار باقاعدہ آتا تھا تو ایک دن اخبار میں اشتہار نظر سے گزرا کہ آغا شورش کاشمیری کی یاد میں ''چٹان'' کا ایک خاص نمبر شائع کیا جا رہا ہے اور جو حضرات ان پر مضامین لکھنا چاہیں وہ فلاں تاریخ تک ہمیں بھیج دیں۔

میں نے سوچا کہ میں آغا صاحب پر کیسے مضمون لکھوں کیونکہ میں تو طالب ہوں اور کوئی اتنا بڑا عالم فاضل یا ناقد نہیں کہ ان کی قد آور شخصیت اور ان کے فن کا محاکمہ کر سکوں۔ ہاں ایک شعبہ ہے کہ جس سے میں منسلک ہوں اور تحریک ختم نبوت میں جس فن میں کچھ نکھار آ گیا تھا تو وہ تھا خطابت۔ یوں میں نے آغا صاحب پر ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا: ''آغا شورش کاشمیری: اخطب الخطباء''۔ عربی گرامر کی رو سے خطیب کی جو ''سپرلیٹیو ڈگری'' ہے وہ ''اخطب'' ہے۔ اسی طرح شاعر ایک عام شاعر کو کہا جاتا ہے اور ''اشعر'' سب سے بڑے شاعر کو۔ بہر حال میں نے اس مضمون میں اپنے علم اور اپنی حیثیت کے مطابق آغا صاحب کو جو بھی خراج تحسین پیش کر سکتا تھا کیا۔ میں یہ مضمون بھیج کر اسے بھول گیا کہ میں کس باغ کی مولی ہوں کیونکہ اس خاص نمبر میں تو بڑے بڑے لکھاریوں کے مضامین شامل ہوں گے۔

اس کے بعد ایک دن پرچہ آیا تو اس میں یہ اعلان تھا کہ اگلا پرچہ ''آغا شورش کاشمیری نمبر'' ہو گا۔ خیر میں اگلے ہفتے صبح ہی پرانی انارکلی میں کراچی سویٹ کے سامنے ایک بڑے اخبار کے سٹال پر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پہنچا اور چٹان حاصل کر کے اس کی فہرست دیکھنے لگا۔ کیونکہ یہ ایک فطری سی بات ہے جو ہر لکھنے والے میں موجود ہوتی ہے کہ جب وہ کسی پرچے کو مضمون بھیجتا ہے اور اس کے بعد وہ پرچہ اس کے سامنے آتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس میں اپنا نام تلاش کرتا ہے۔ میں نے جب اپنا نام تلاش کرنا چاہا اور مولانا سید مودودیؒ، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر سید عبداللہ، نعیم صدیقی، سید اسعد گیلانی، میرزا ادیب وغیرہ کے نام دیکھے تو ایک بار پھر سوچا کہ میرا مضمون ان بڑے لوگوں کی فہرست میں کہاں سے آ گیا۔ پھر میں نے اگلے صفحات پر ''انڈیکس'' دیکھا تو اس میں آغا صاحب کی یاد میں لکھے جانے والے مضامین کو الگ الگ ابواب میں تقسیم کیا گیا تھا۔ مثلاً ''آغا شورش کاشمیری۔ بحیثیت شاعر''۔ ''آغا شورش کاشمیری بحیثیت مدیر''۔ ''آغا شورش کاشمیری۔ بحیثیت سیاستدان''۔ اسی طرح جب میری نظر ''آغا شورش کاشمیری۔ بحیثیت خطیب'' کے عنوان پر پڑی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں سب سے پہلے میرا مضمون تھا۔

اس باب میں اپنے دور کے دو نامور خطیبوں مولانا کوثر نیازی اور علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کے مضامین بھی شامل تھے جو میرے مضمون کے بعد تھے۔ میں یہ نہ سمجھ سکا کہ مضامین کی یہ ترتیب کس حساب سے ہے، کیونکہ میں تو اس وقت کسی قطار شمار میں نہ تھا تو میرا مضمون پہلے کیوں لگا دیا گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مشاعروں اور جلسوں کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے چھوٹے شعرا اور مقررین کو دعوت دی جاتی ہے اور اس کے بعد سینئر حضرات کو دعوت دی جاتی ہے۔ تو یوں اس ترتیب کو بھی میں نے اسی پر محمول کیا کہ مجھے جونیئر سمجھ کر میرا مضمون پہلے لگا یا گیا اور میرے بعد مشاہیر کے مضامین لگائے گئے۔ یوں 1975ء میں ہفت روزہ ''چٹان'' میں یہ میرا پہلا مضمون تھا۔ اس حوالے سے یہ بڑی ہی خوش نصیبی تھی کہ میرا مضمون پاکستان اور بھارت کے ایک تاریخ ساز جریدے میں شائع ہوا جو کہ اس دور میں اپنی ایک ''پولیٹیکل اور لٹریری ورتھ'' رکھتا تھا۔ پھر اسی دور میں میرا باقاعدہ صحافتی سفر شروع ہو گیا۔ یوں آج (2019ء) جبکہ 44 برس بیت رہے ہیں میں اس نجدِ صحافت میں آبلہ پائی کر رہا ہوں۔

یہاں بتاتا چلوں کہ یہ میرا پہلا مضمون نہیں تھا۔ اس سے قبل جب میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا تو مولانا محمد عمر اچھرویؒ کا انتقال ہوا۔ اب میں نے ایسے گھرانے میں پرورش پائی تھی جو دیوبند فکر سے متعلق تھا لیکن میرے والد انتہائی وسیع المشرب انسان تھے۔ وہ مجھے تمام علماء اور خطباء کی مجالس میں لے جاتے تھے اور وہ ہر مسلک کے علماء و مشاہیر کے ساتھ ذاتی تعلقات بھی رکھتے۔ وہ کہتے کہ یہ فروعی اختلافات ہیں آپ اس میں نہ پڑنا۔ میں نے مولانا محمد عمر اچھرویؒ کی یاد

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں اپنا پہلا مضمون روزنامہ مشرق کے لیے لکھا۔ میرا مضمون مشرق کے ادارتی صفحہ پر موجود تھا۔ میں نے اخبار کو اپنی تصویر اس لیے نہیں بھیجی تھی کہیں بچہ سمجھ کر میرا مضمون ردنہ کر دیا جائے۔ اس مضمون کے ساتھ جو مضمون تھا وہ ممتاز ادیب انتظار حسین کا مستقل کالم ''لاہور نامہ'' تھا۔ یعنی اتنی چھوٹی سی عمر میں میری تحریر انتظار صاحب کے شانہ بشانہ شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں مَیں نے ایک مضمون مولانا ظفر علی خان کی یاد میں اس دور کے معروف اخبار ''کوہستان'' کو بھیجا اور وہ بھی چھپا۔ یہ آغا صاحب والا میرا تیسرا مضمون تھا۔

آغا صاحب کے چار بیٹے ہیں: آغا مسعود شورش، آغا محمود شورش، آغا مشہود شورش اور آغا مبشر شورش۔ ان سب کے ساتھ میرے بہت اچھے تعلقات رہے۔ آغا مسعود ان دنوں اپنی یادداشتیں مرتب کر رہے ہیں جب کہ آغا مشہود شورش اپنے عظیم والد کے ادبی شہ پاروں کی تسوید و تالیف کے عظیم کام کی تکمیل میں مگن ہیں۔ آغا محمود درویش ہو چکے ہیں، انہیں دو جوان بیٹوں کی موت کے روگ نے گوشہ نشین بنا دیا ہے۔ آغا مبشر کینیڈا میں مقیم ہیں اور وہیں اپنا کاروبار کر رہے ہیں۔ 1978ء کی بات ہے کہ چٹان بلڈنگ کے نیچے والے فلور پر ایک محفل لگا کرتی تھی، میر محفل آغا محمود شورش ہوا کرتے تھے۔ مَیں، فاروق لغاری کا بیٹا جمال لغاری، خواجہ سعد رفیق اور سلمان رفیق و دیگر احباب بھی اس محفل کے باقاعدہ شرکاء تھے۔ خواجہ سعد رفیق آغا صاحب کے خانوادے کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں۔ جریدہ چٹان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ خواجہ رفیق شہید کی جائے شہادت پر جو پہلی تصویر لی گئی تھی وہ چٹان کے منیجر اور فوٹو گرافر صلاح الدین نے لی تھی۔ یہ صلاح الدین صاحب بھی عجب شخصیت کے مالک تھے، ایک ''ورسٹائل'' انسان تھے۔ ان کا اصل نام محمد حسین تھا اور یہ صلاح الدین کے نام سے معروف ہوئے۔

آغا مسعود ایک دن مجھے کہنے لگے کہ آپ اوپر دفتر میں آ کر بیٹھا کریں اور نیچے والی منزل پر نہ بیٹھا کریں، دفتر آ کر کام کیا کریں۔ خیر میں نے آغا مسعود کے کہنے پر ''چٹان'' میں باقاعدہ آنا جانا شروع کر دیا۔ آغا مسعود اب چٹان کے چیف ایڈیٹر تھے۔ مجھے انہوں نے کہا کہ اس طرف جا کر بیٹھ جاؤ جہاں پر ایڈیٹوریل کے لوگ بیٹھتے تھے۔ میں دن کے ایک بجے کے قریب دفتر پہنچ جاتا۔ ڈاکٹر مسکین حجازی صاحب جو اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے سربراہ تھے۔ آغا صاحب کی وفات کے بعد انہوں نے چٹان کی ادارت سنبھال لی تھی۔ حجازی صاحب باری علیگ (مصنف: ''کمپنی کی حکومت'') کے داماد تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بہت ہی درویش منش آدمی تھے، سیکڑوں صحافیوں کے استاد تھے۔ حجازی صاحب نے مجھے کہا، دیکھو تم اداریہ لکھا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کروگے اور مجھ سے راہنمائی لے لیا کرو کیونکہ میری یونیورسٹی کی بھی بہت ذمہ داری ہے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ یہ میرا گھر کا ٹیلی فون نمبر ہے (اس دور میں موبائل فون تو آیا ہی نہیں تھا)۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ اس وقت مجھے فون کر لیا کرو اور میں آپ کو تازہ موضوع بتا دیا کروں گا اور اشارات دے دیا کروں گا جن کی بنیاد پر آپ نے اپنا اداریہ لکھنا ہے۔ اس سے قبل انہوں نے کچھ دن مجھے ایڈیٹوریل نوٹس اپنے پاس بٹھا کر لکھوائے تھے۔ یوں انہوں نے میری تربیت کی۔ میں برجستہ نوٹس ان کو لکھ کر دیتا تو وہ بہت حوصلہ افزائی کرتے۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ لکھ سکتے ہو، بس مجھ سے مشورہ کر لیا کرو۔ یہ دراصل ان کا بڑا پن تھا اور مجھے سکھانے کا ایک طریقہ تھا۔ یہاں میری ملاقات استاد تجمل حسین دل سے بھی ہوئی، میں نے ان ایسا بسیار نویس کسی کو بھی نہ پایا۔ جو بندھ گیا، سوموتی کے مصداق وہ اپنے مسودے کی شاذ ہی قطع و برید کرتے۔

مسکین حجازی صاحب اپنی ذات میں دانش ور تو بہت بڑے تھے ہی، وہ دانش گر بھی تھے۔ وہ آغا شورش کے شاگرد تھے اور انہوں نے حق شاگردی بھی خوب ادا کیا۔ وہ جس بھی شہر سے لاہور پہلی بار پڑھنے کے لیے آئے تھے تو انہیں آغا صاحب نے اپنی چٹان بلڈنگ میں جو کہ ایک بہت بڑی عمارت تھی میں ایک کمرہ دے دیا تھا کہ یہاں بغیر کرائے کے رہ لیا کرو۔ حجازی صاحب نے اس بات کو ہمیشہ یاد رکھا اور جب 24 اکتوبر 1975ء کو آغا صاحب کا انتقال ہو گیا تو اس دن سے لے کر مئی 1978ء تک مسلسل روزانہ حجازی صاحب چٹان دفتر آتے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ میرا مرشد خانہ ہے، یہاں حاضری دینا لازم ہے۔ وہ اس ساری ذمہ داری کا ایک دھیلا بھی نہیں لیتے تھے۔ استاد کا جو مقام اور مرتبہ تھا وہ مجھے حجازی صاحب سے جاننے کا موقع ملا۔ حجازی صاحب کہا کرتے تھے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اگر استاد زندہ ہے تو آپ اس کی قدم بوسی اور جبین بوسی بھی کریں لیکن جونہی اس کا انتقال ہو جائے تو اس کی اولاد یا اس کے قائم کردہ ادارے سے قطع تعلق کر لیں۔ میں نے ڈاکٹر حجازی صاحب کی سرپرستی میں چٹان میں بہت کام کیا۔ اس دوران تقریباً حجازی صاحب نے صحافت کے ہر شعبے میں کام کرنے کے مواقع فراہم کیے، مجھے جذبہ اور مہمیز دی۔

ایک مرتبہ انہوں نے مجھے عاصمہ جہانگیر اور حنا جیلانی کے والد ملک غلام جیلانی کے انٹرویو کے لیے بھی بھیجا۔ (بعض حلقوں کے نزدیک ملک صاحب کا ایک عمومی تعارف یہ بھی تھا کہ:

("He was the first CIA Horse in Pakistan"

خیر میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ ملک غلام جیلانی جنرل ایوب خان، نواب آف کالا باغ اور بھٹو صاحب کے خلاف ہمیشہ میدان میں رہے۔ میں نے حجازی صاحب سے کہا ملک غلام جیلانی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اتنے بڑے آدمی ہیں میں ان کا انٹرویو کیسے کرسکتا ہوں۔انہوں نے کہا آپ جائیں تو سہی، آج آپ پہل کریں۔ یہ میں نے زندگی میں پہلا انٹرویو کیا جو ''چٹان'' میں چھپا۔حجازی صاحب نے ایک سوال نامہ مرتب کردیا تھا، کیونکہ میں ''تازہ واردِ بساطِ صحافت'' تھا لہٰذا میرے لیے سوال نامہ استاد ہی مرتب کرسکتا تھا۔میں تو ملک صاحب کا کوئی پس منظر،تہہ منظر اور ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔میرے ساتھ ''چٹان'' کے فوٹو گرافر صلاح الدین تھے۔میں راج گڑھ سے سائیکل پر گلبرگ میں واقع جیلانی صاحب کے گھر پہنچا تو ان کا ملازم مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔جیلانی صاحب اپنے بستر پر نیم دراز تھے،وہ مجھے پرتپاک انداز میں ملے اور پھر مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے کیا آپ میرا انٹرویو کروگے؟اوئے توں تے ہلے منڈا اکھنڈا ایں'' (تم تو ابھی لڑکے ہو)۔ یہ چٹان والوں نے کیا مذاق بنا رکھا ہے، آغا شورش کا اتنا مقبول پرچہ ہے اور ایک بچے کو میرے پاس بھیج دیا ہے۔پھر وہ کہنے لگے: اچھا آپ انٹرویو شروع کریں مجھے پتہ چل جائے گا کہ میں نے انٹرویو دینا ہے یا نہیں دینا۔پھر انہوں نے ایک اور شرط رکھی اور کہا کہ میں نے اردو کا بائیکاٹ کررکھا ہے اس لیے میں آپ سے یا تو انگریزی میں بات کروں گا یا پھر پنجابی میں، ہاں آپ اسے اردو میں ٹرانسلیٹ کر کے چھاپ دیجیے گا۔(اب یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے اردو زبان کا بائیکاٹ کیوں کر رکھا تھا) پھر انہوں نے پنجابی میں انٹرویو دیا۔جیلانی صاحب کے اس انٹرویو کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ جب میں برطانیہ گیا تو میں نے وہاں پر سانحہ مشرقی پاکستان پر حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ مکمل پڑھی۔جب انہوں نے یہ بات کی تو میرے ہاتھ میں تو ایک بہت بڑی سٹوری آگئی۔کیونکہ اس وقت حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ سربمہر تھی اور اسے پبلک نہیں کیا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ یہ آپ نے کیسے پڑھ لی؟اب میں سوال نامہ سے ''ڈی ٹریک'' ہوگیا اور ذہن میں خود بہ خود سوالات اٹھتے گئے۔میں نے کہا آپ مجھے یہ بتائیں کہ یہ تو حکومت کی تحویل میں تھی، آپ نے اس تک رسائی کیسے حاصل کی؟انہوں نے جواب دیا کہ 52 پونٹ سٹریٹ لندن میں میرا فلیٹ تھا اور میرے فلیٹ کے ساتھ جو میرا ہمسایہ تھا وہ ایک انگریز رائٹر اور جرنلسٹ تھا۔(اس انگریز رائٹر کا نام اب میرے ذہن سے محو ہوگیا ہے۔چٹان کی فائلوں میں اس کا نام موجود ہے)۔اس انگریز صحافی کو بھٹو صاحب نے اپنی سوانح عمری لکھنے کے لیے بلوایا تھا۔ جب وہ بھٹو صاحب کے پاس آیا تو اس نے کہا کہ آپ کی سوانح اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک اس میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں آپ کے کردار کے حوالے سے بات نہ کی جائے۔پھر بھٹو صاحب نے اپنی بائیوگرافی کی تکمیل کے شوق میں اس صحافی کو کسی نہ کسی طرح اس رپورٹ تک رسائی دلوائی اور فوٹو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کاپیاں فراہم کر دی گئیں۔ ملک غلام جیلانی کا کہنا تھا کہ لندن میں ہم ہر شام دونوں اکٹھے تاش کھیلتے تھے اور گپ شپ لگاتے اور اسی دوران اس صحافی نے بتایا کہ میرے پاس تو حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی کاپیاں ہیں تو میں نے اس سے کہا کہ ایک طائرانہ سی نگاہ مجھے بھی اس پر ڈالنے دو۔ چنانچہ میں نے وہ فائل لے لی اور پھر میں نے اس کی فوٹو کاپیاں کروالیں۔ اب وہ رپورٹ میرے پاس ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان توڑنے کے جرم میں بھٹو بھی برابر کا شریک ہے۔

جب میرا یہ پہلا انٹرویو ''چٹان'' میں شائع ہوا تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ یہ جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا اور اس وقت چٹان ہر جمعہ کو شائع ہوتا تھا۔ جس دن یہ پرچہ آیا تو اس سے اگلے روز روزنامہ جنگ نے ''چٹان'' اور ''حافظ شفیق الرحمٰن'' کا حوالہ دیتے ہوئے لیڈ سٹوری شائع کی کہ: ''بھٹو نے اپنے اختیارات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ اپنے سوانح نگار کو فراہم کر دی تھی''۔ یوں میرا یہ انٹرویو اچھا خاصا مقبول ہوا۔ اس کے بعد بھی میں نے مختلف لوگوں کے انٹرویوز کیے جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس زمانے میں ایک بہت بڑی اور متنازع شخصیت رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ تھے۔ وہ باکمال خطیب تھے۔ باجوہ صاحب جمعیت علمائے پاکستان کے مرکزی سیکرٹری جنرل تھے اور بھٹو کے خلاف بننے والے قومی اتحاد کے بھی مرکزی سیکرٹری جنرل تھے۔ ان کا بھی میں نے انٹرویو کرتے ہوئے ان سے سوال کیا تھا کہ آپ کو قومی اتحاد سے نکال دیا گیا اور آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ جس وقت تحریک عروج پر تھی تو آپ نے بھٹو صاحب سے ملاقات کر لی۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ سیاستدان تو صرف دھاندلی کا شور مچا رہے ہیں میں نے اس تحریک کو عوامی تحریک بنانے کے لیے ایک مشن اور نصب العین بنایا تھا۔ میرے سیاسی مقاصد ہرگز نہیں تھے۔ میری اولین کوشش یہی تھی کہ ہم ایک عوامی مطالبہ سامنے لائیں کہ: ''پاکستان کو ایسا بنایا جائے جو کہ اس کے قیام کے مقاصد میں شامل تھا۔ وہ یہ کہ اس ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ کیا جائے''۔ قومی اتحاد کی تحریک کے دوران جس شخص نے اسلامی نظام کے نفاذ کا نعرہ لگایا تھا وہ یہی باجوہ صاحب تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں یہی مطالبہ لے کر بھٹو کے پاس گیا تھا۔ بھٹو نے میری 95 فیصد باتیں تسلیم کر لی تھیں اور میں نے واپس آ کر ابھی قومی اتحاد کو بتانا تھا کہ جماعت اسلامی اور نوابزادہ نصر اللہ خان نے ایک دم میرے خلاف محاذ کھڑا کر دیا۔

باجوہ صاحب کا کہنا تھا کہ دراصل یہ لوگ میرے سیاسی قد کاٹھ سے خائف تھے اور حسد کا بھی شکار تھے کیونکہ 1977ء کی سیاست میں اچانک میرا قد کاٹھ بہت بلند ہو گیا تھا۔ بس میری اسی عوامی مقبولیت کے تحت ان حضرات نے مجھے فارغ کر دیا لیکن میں خوش ہوں کہ یہ میرے ہی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مطالبات کی شقیں تھیں جن کے تحت بھٹو نے جمعہ کی چھٹی منظور کی، اسلامی نظام کا وعدہ کیا اور شراب پر پابندی لگا دی۔ یہ میرا چٹان میں دوسرا انٹرویو تھا اس کے بعد تو میں نے بہت زیادہ لوگوں کے انٹرویوز کیے، فیچر اور کالم لکھے اور فکاہیہ کالمز بھی لکھے۔ میں نے جب پہلا فکاہیہ کالم لکھا اور ''چٹان'' میں ہمارے ساتھ کام کرنے والے نہایت سینئر اور میرے استاد تجمل حسین دل کو دکھایا تو انہوں نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ استاد تجمل فلم انڈسٹری میں بھی کام کرتے تھے اور مسکین حجازی صاحب کے بعد ان کے قائم مقام ہوا کرتے تھے۔ میرے یہ دونوں اساتذہ تھے، جن سے میں نے صحافت کی نزاکتیں اور لطافتیں سیکھیں۔ ان کا ہینڈ رائٹنگ بہت زبردست تھا، کمال کے خوش نویس تھے۔ جی چاہتا تھا کہ بندہ ان کی تحریر، ان کے قلم اور ان کے ہاتھوں کو چوم لے۔ جملے کی بُنت میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ وہ بے ساختہ لکھتے، چاروں طرف پریس کی مشینوں اور لوگوں کا شور ہوتا اور استاد تجمل صاحب لکھتے چلے جاتے۔ وہ حاضر طبع شاعر بھی تھے۔ پی ٹی وی پر جتنے بھی موسیقی کے پروگرام ہوتے تھے ان کے سکرپٹ رائٹر استاد تجمل حسین دل ہی ہوتے تھے، وہ چوہان روڈ پر رہتے تھے اور بڑے درویش منش آدمی تھے۔

1978ء میں جب ''اسلامی جمہوریہ'' رسالے کا ڈیکلریشن واپس منصور طیب کے پاس آ گیا تو انہوں نے میری ڈیوٹی لگائی کہ میں استاد احسان دانش کا انٹرویو کروں' چنانچہ میں نے انٹرویو کیا جو رسالے میں شائع ہوا۔ میں نے چٹان میں معروف ادیب پروفیسر مرزا منور کا انٹرویو بھی کیا۔ مرزا منور کا تفصیلی ذکر گزشتہ سطور میں گزر چکا ہے۔ میں نے اس دور میں جن اہم شخصیات کے انٹرویوز کیے ان میں ملک غلام جیلانی، رفیق باجوہ، مفتی محمود، ایئر مارشل اصغر خان، بیگم نصرت بھٹو، جسٹس بی زیڈ کیکاؤس، پیر کرم شاہ الازہری، اس دور کے امام کعبہ عبداللہ ابن السبّیل، جماعت اسلامی ہندوستان امیر، پروفیسر غفور اور دیگر قائدین اور سیاسی کارکنوں کے انٹرویوز شامل ہیں۔ چٹان میں مَیں نے باقاعدہ کام تو 1975ء سے 1978ء تک کیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ چٹان سے میرا تعلق زمانہ طالب علمی سے لے کر 94ء تک کسی نہ کسی سطح پر ضرور رہا۔ 1981ء میں مَیں نے اپنے گھر میں ''حافظ شفیق اکیڈمی'' بھی بنائی جو 1993ء تک مسلسل چلتی رہی۔ اس عرصے میں سٹوڈنٹس کی جو اوریج تعداد تھی وہ ڈیڑھ سو کے قریب رہی۔ لڑکوں نے مجھ سے انٹر اور بی اے تک کے مضامین پڑھے۔

میں نے 1987ء میں نواز شریف کے حلقے سے ان کے خلاف آزاد امیدوار کی حیثیت سے پہلا بلدیاتی الیکشن بھی لڑا۔ مجھے اس موقع پر شہباز شریف نے ملک ہوٹل ریواز گارڈن میں بلایا۔ میاں صاحب نے مجھے کہا کہ آپ اپنے مدمقابل شاہد مقبول ایڈووکیٹ کے حق میں دستبردار

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہو جائیں کیونکہ یہ وکیل صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں۔(یہ وہی شاہد مقبول ہیں جو بعد میں لاہور بار کونسل کے صدر بھی رہے۔ یہ بڑے سلجھے ہوئے اور اچھے انسان ہیں) میں نے کہا میں اپنے پڑھے لکھے ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں ایک طالب علم ہوں۔ میرا ابھی تعلق تعلیم کے شعبے سے ہے اور میں بھی بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ میں نے کہا میں آپ سے مسلم لیگ کا ٹکٹ تو نہیں مانگنے آیا آپ نے خود مجھے بلایا ہے۔ میاں صاحب نے کہا کہ دیکھیں آپ غریب آدمی ہیں اور بچوں کو پڑھائیں۔ میں نے کہا کہ جی میں یہ الیکشن اسی روایت کو توڑنے کے لیے لڑ رہا ہوں کہ آپ جیسے لوگوں نے معاشرے میں اس بات کو لوگوں کے ذہن میں بٹھا دیا ہے کہ الیکشن میں کبھی کوئی عام اور متوسط آدمی حصہ نہیں لے سکتا۔ پھر میں نے یہ الیکشن لڑا اور جیتا۔ مجھے 1869 ووٹ پڑے اور میرے مدمقابل مسلم لیگ کے امیدوار شیخ شاہد مقبول صاحب کو صرف 61 ووٹ کم پڑے۔ یوں میں ان سے 61 ووٹوں سے جیتا، یہ ایک کانٹے دار مقابلہ تھا۔ میں نے یہ چار سالہ بلدیاتی دور مکمل کیا اور پھر 1991ء میں مَیں نے دوبارہ الیکشن لڑا تو مسلم لیگ نے مجھے ٹکٹ دینا چاہا لیکن میں نے کہا کہ اگر میں آپ کے ٹکٹ پر لڑتا ہوں تو اس سے میرے ووٹ کم ہو جائیں گے۔ میں نے یہ الیکشن بھی جیتا۔ اس کے بعد لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن کے الیکشن میں مَیں نے لاہور کے لارڈ میئر کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کو ووٹ نہیں دیا کیونکہ میں اینٹی پی پی تھا اور میں نے میاں محمد مجید (ریگل سینما کے مالک) جو مسلم لیگ کے لارڈ میئر کے امیدوار تھے، ان کو ووٹ دیا۔ لارڈ میئر کے الیکشن کے بعد لیڈر آف دی ہاؤس اور ڈپٹی لیڈر آف دی ہاؤس کی تعیناتی ہوتی ہے۔

ایک رات میں سو رہا تھا کہ ڈپٹی میئر کے نامزد امیدوار اصغر بٹ نے مجھے فون پر مبارک دیتے ہوئے کہا کہ میاں شہباز شریف نے آج میٹنگ بلائی تھی اور اس میں آپ کو ڈپٹی لیڈر آف دی ہاؤس میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور نامزد کر دیا گیا ہے۔ یوں میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے ڈپٹی قائد ایوان بلدیہ عظمیٰ لاہور رہا ہوں۔ اس سیٹ اپ میں ایک لارڈ میئر ہوتا ہے اور آٹھ ڈپٹی میئرز ہوتے ہیں اور ایک قائد ایوان ہوتا اور ایک ہی ڈپٹی قائد ایوان ہوتا ہے۔ مارچ 1993ء میں جب غلام اسحاق خان اور نواز شریف کی آپس میں چپقلش ہوئی اور نواز شریف نے کہا کہ میں غلام اسحاق خان سے ڈکٹیشن نہیں لوں گا تو ردعمل میں اسحاق خان نے ان کی حکومت تحلیل کر دی۔ ان حالات میں بلدیاتی اداروں کی زندگی کشمکش کا شکار ہو گئی کہ ان کا کیا بنے گا تو انہی دنوں معین قریشی صاحب ''امپورٹڈ'' وزیر اعظم کی حیثیت سے آ گئے۔ ان سے پہلے قومی اسمبلی کو غلام اسحاق

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

خان ذبح کر گئے تھے اور اب معین قریشی نے آتے ہی منتخب بلدیاتی ادارے تحلیل کر دیے اور وہ جو شاعر نے کہا تھا کہ

سانس دیکھی جو تنِ بسمل میں آتے جاتے
ایک اور چرکا دیا صیاد نے جاتے جاتے

لہٰذا قریشی صاحب نے بساط ہی لپیٹ دی۔ ان حالات میں مَیں سیاست سے بیزار ہو کر کنارہ کش ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ بعد دوبارہ چٹان جوائن کر لیا اور کل وقتی صحافی کے طور پر کام کرنے لگا۔ 1996ء میں خواجہ سعد رفیق میرے پاس آئے (یہ میرے شاگردوں میں سے ہیں۔ اب وہ اس بات کو تسلیم کریں یا نہ کریں) کہنے لگے کہ اگر آپ نے باقاعدہ صحافت کرنی ہے تو میں آپ کو ضیا شاہد سے ملوا دیتا ہوں۔ میں ضیا شاہد سے ملا اور میں نے مستقل کالم لکھنے شروع کیے اور طویل عرصہ تک روز نامہ خبریں کے صفحہ دو پر میرا کالم شائع ہوتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی اکیڈمی بھی شروع کر دی۔ مئی 1997ء میں میری ملاقات طاہر عالم خان سے ہوئی۔ یہ کالج کے زمانے سے میرے دوست تھے اور آئی جی اسلام آباد ریٹائرڈ ہوئے۔ اس زمانے میں یہ غالب مارکیٹ لاہور کے ڈی ایس پی تھے۔ انہوں نے کہا کہ ایک نیا اخبار روز نامہ ''دن'' آ چکا ہے میں آپ کو اس کے مالک محمود صادق سے ملواتا ہوں۔ اگلے ہی روز میں محمود صادق سے ملا اور انہوں نے فوری طور پر مجھے ایڈیٹوریل میں رکھ لیا اور یہاں میں نے مئی 1997ء سے 30 جون 2011ء تک مستقل کام کیا۔ روز نامہ دن کا دور ایک سنہری دور تھا۔ یہ اخبار اپنے وقت کا ایک موقر ترین جریدہ تھا۔ یہاں بہت سے اچھے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ ایک زمانے میں چونکہ روز نامہ پاکستان بھی محمود صادق صاحب نے لے لیا تھا تو میں نے قدرت اللہ چودھری صاحب اور مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے ساتھ بھی کام کیا۔

روز نامہ دن کے پہلے ایڈیٹر طاہر مجید کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ ایثار رانا ایڈیٹر بن کر آئے تو ان کے ساتھ کام کیا۔ ایثار رانا ایک مختلف قسم کے ایڈیٹر تھے۔ یہ اپنے ہر سینئر اور جونیئر کے پاس جاتے اور نہایت اخلاق سے پیش آتے۔ ایثار رانا آفس میں آ کر اپنے بوٹ اتار دیتے اور چپل پہن لیتے اور بعض اوقات ننگے پاؤں ہی ہر ایک کے پاس چل کر جاتے اور پرسش احوال کرتے۔ میں نے ایڈیٹرز میں ان جیسا ملنسار اور خوش اخلاق ایڈیٹر کوئی اور نہیں دیکھا۔ میرے فکری اور نظری طور پر ان سے اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن ان کا جو حسنِ اخلاق ہے اور ان کا جو خوشگوار کردار ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے بھائی کہہ کر مخاطب کیا۔ ''دن'' اخبار ہی میں ممتاز

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ترقی پسند ادیب حمید اختر بھی کالم لکھا کرتے تھے۔حمید اختر نے جو کالم لکھے ''بک ہوم'' نے مختلف عنوانات سے ان کے مجموعے شائع کیے۔انہی میں ایک مجموعہ'' آشنائیاں کیا کیا'' کے نام سے بھی چھپا۔حمید اختر نے ساری زندگی ''امروز'' اخبار میں اداریے لکھے تھے۔ جب انہوں نے ہمارے پاس روزنامہ ''دن'' میں کالم لکھنا شروع کیے اور انہیں خوب پذیرائی ملی اور لیٹرز اور ای میلز آنا شروع ہوئیں تو وہ کہنے لگے کہ بھائی ہم تو محض اداریے لکھ لکھ کر ساری زندگی ایک ''گناہ بے لذت'' کرتے رہے۔اصل مزہ تو کالم لکھنے میں ہے۔

روزنامہ دن کے پہلے ایڈیٹوریل انچارج استادِ محترم توصیف احمد خان مرحوم تھے۔وہ ایک علمی اور ادبی خانوادے کے چشم وچراغ تھے۔''مشرق'' اخبار سے انہوں نے کام کا آغاز کیا تھا۔ایک لاابالی سی ان کی طبیعت تھی۔وہ کسی بھی متکبر اور رعونت کے پیکر شخص کو ہرگز پسند نہ کرتے اور اسے جوتے کی نوک پر رکھتے۔وہ اپنی جس بات کو حق سمجھتے تھے وہ چیف ایڈیٹر کے سامنے بھی کہنے سے جھجک محسوس نہ کرتے اور بلاکم وکاست کہہ دیا کرتے۔وہ اردو ناول نگار خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے بھائی تھے۔اور خالد احمد جو کہ ایک بہت بڑے نغز گو شاعر تھے ان کے بڑے بھائی تھے۔توصیف احمد خان لکھنوی تھے لیکن ان کے لہجے میں لکھنویوں کے برعکس ایک اکھڑپن تھا۔کیونکہ لکھنویوں کی زبان میں تو لکھنوی معشوق کی کمر کا ''لوچ'' ہوتا ہے لیکن ان کی زبان ''سیف'' تھی۔اسی طرح ممتاز صحافی اطہر ندیم صاحب بھی ہمارے کولیگ تھے۔یہ شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور اداریہ نگار بھی تھے۔ بڑے معتدل مزاج انسان تھے۔ترقی پسند اور سوشلسٹ خیالات کے حامل تھے لیکن دین سے برگشتہ نہیں تھے۔ایک مرتبہ مجھے بلا کر کہنے لگے کہ یار آج ایک نعت ہوئی وہ آپ کو سناتا ہوں۔وہ نعت سنانے لگے اور ان کی آنکھیں نم ہوتی گئیں۔ اسی طرح روزنامہ دن کے ایڈمنسٹریٹر ملک لیاقت تھے۔ملازمین کو جوڑ کر رکھتے ان کے مسائل میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ملازمین کی ذاتی گرہ سے بھی ہیلپ کر دیتے تھے۔ یہ بڑے زبردست انسان تھے۔سرکولیشن کے شعبے میں ایک جامی صاحب تھے۔یہ پریس اور سرکولیشن کے بھی انچارج تھے۔ان کا بھی کارکنوں کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔میں نے دن اخبار میں مئی 1998ء سے 30 جون 2011ء تک کام کیا اور 2004ء کے بعد سے تو میں مستقل اداراتی نوٹ لکھتا رہا۔کیونکہ توصیف احمد خان صاحب کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو گئے۔اطہر ندیم صاحب بھی دل کے مریض بن گئے اور یہ ذمہ داریاں کلی طور پر مجھے دے دی گئیں۔اس سارے عرصے میں دن اخبار کے مالک اور چیف ایڈیٹر محمود صادق نے کبھی کسی کالم یا کسی اداریہ پر مداخلت نہیں کی۔وہ میرے متعلق کہا کرتے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تھے کہ جس بندے کے کالم لکھنے پر اور دیگر کالم شائع کرنے پر آج تک مجھے کوئی ایک بھی لیگل نوٹس نہیں آیا اور کسی بھی ادارے کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ملی ایسے معقول بندے کے کام میں مَیں کیسے مداخلت کر سکتا ہوں۔ ویسے ان کی فطرت ہی یہی تھی کہ وہ صرف میرے ہی نہیں کسی بھی اخباری کارکن کے کام میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔

اظہار رائے کی جتنی آزادی میں نے ان کے ادارے میں دیکھی مجھے کہیں اور نہیں ملی۔ بعد میں محمود صادق صاحب نے دن ٹی وی چینل شروع کیا تو اس میں میرا مستقل پروگرام 'گلوبل ٹاک'' کے نام سے شروع کروایا یہ انٹرنیشنل افیئرز پر ہوتا تھا۔ میں نے ایک اور پروگرام ''ٹو دی پوائنٹ'' کے نام سے بھی کیا۔ ریحان اظہر اور ذوالفقار راحت کے ساتھ بھی پروگرام کیے۔ یکم اکتوبر 2011ء کو میں نے روزنامہ ''نئی بات'' جوائن کر لیا۔ میرا انٹرویو نئی بات کے مالک اور چیف ایڈیٹر چوہدری عبدالرحمٰن نے خود لیا۔ یہ سپیریئر گروپ آف کالجز کے مالک ہیں۔ انہوں نے بھی ہمیشہ شفقت فرمائی اور بہت خلوص سے پیش آتے۔ نئی بات اخبار میں بطور گروپ ایڈیٹر میرا سابقہ سینئر صحافی جناب عطاء الرحمٰن کے ساتھ پڑا۔ وہ بھی عالم فاضل انسان ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے کے ہر بڑے انسان سے فیض پایا۔ عطاء الرحمٰن صاحب اچھرہ میں رہتے تھے اور میں اچھرہ کو لاہور کا یونان کہتا ہوں۔ اسی اچھرہ میں جہاں عطاء الرحمٰن صاحب کی رہائش تھی وہاں ایک طرف مولانا مودودیؒ موجود تھے یہ ان سے بھی اخذ فیض کرتے اور ان کے گھر کے دوسری طرف علامہ عنایت اللہ خان المشرقی موجود تھے ان سے بھی اکتساب علم کر رہے تھے۔ عطاء الرحمٰن صاحب نوجوانی ہی میں مولانا سید مودودیؒ کے بہت ہی قریب ہو گئے تھے۔ سید مودودیؒ سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ اگر کسی نوجوان کے ساتھ مولانا مودودیؒ کی قدرے بے تکلفی تھی تو وہ یہی عطاء الرحمٰن تھے۔ اسی طرح یہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے معتمد ترین ساتھیوں اور شاگردوں میں سے تھے۔ سیاسی حوالے سے عطاء الرحمٰن صاحب ''وفاداری بشرط استواری اصل ایمان'' کے نقطہ نظر پر عمل پیرا رہتے ہیں اور اس سے وہ بال برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ یہ بھی بہر حال ان کا استقلال اور استقامت ہے۔ میرے ان سے سیاسی حوالے سے بہت اختلاف رہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ایک پڑھے لکھے اور مہذب انسان ہیں۔ ان سے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا۔ ان سے کسی بھی موضوع پر بات کی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ معلومات کا ایک چشمہ ابل رہا ہے۔ روزنامہ نئی بات ہی میں ہمارے ایک اور ساتھی زاہد رفیق تھے۔ یہ اچھے انسان ہیں اور ان کا شمار سینئر صحافیوں میں ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ بھی بہت اچھا وقت گزرا۔ میں نے روزنامہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نئی بات میں 2019ء کے اوائل تک کام کیا۔

میری شادی 23 نومبر 1989ء کو ہوئی۔ اہلیہ کا نام شکیلہ شفیق ہے جو لاہور کے یوسف زئی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرے دو بیٹے اسامہ شفیق، شامل شفیق اور ایک بیٹی ربیعہ شفیق ہے۔ بڑے بیٹے محمد اسامہ شفیق نے قائداعظم یونیورسٹی سے ڈیفنس اینڈ سٹریٹجک سٹڈیز میں ایم ایس سی کیا ہے۔ بیٹی ربیعہ شفیق ہے جس نے فائن آرٹس میں بی ایس سی آنرز کیا اور تیسرے نمبر پر بیٹا شامل شفیق ہے جو اس وقت میٹرک کر رہا ہے۔ اس بیٹے کا نام میں نے زارِ روس دور کے چیچنیا کے عظیم فریڈم فائٹر امام شامل کے نام پر رکھا ہے۔ میں اپنی زندگی کی مکمل آپ بیتی قلمبند کروں تو یقیناً ایک ضخیم کتاب وجود میں آ سکتی ہے۔ میں صحافی عبدالستار اعوان کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ اس نوجوان نے بڑی لگن اور محبت کے ساتھ میری یہ یادداشتیں اور میری زندگی کے اہم شب و روز محفوظ کر دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین (قومی ڈائجسٹ۔ ستمبر 2019ء)

O......❄......O

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مذہبی سکالر، مصنف

محمد متین خالد

کی رُودادِ حیات

جناب محمد متین خالد تحریک تحفظ ختم نبوت کے ایک صاحب قلم راہنما ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس تحریک کی نذر کر دیا ہے۔ ان کی تحریر اور مکالمے سے تحریک کو نئے ولولے ملے ہیں۔ ان کے تجربات و مشاہدات ہمارے تہذیبی زندگی کے بہت سے گوشوں کو پہلی دفعہ بے نقاب کرتے ہیں۔ قومی ڈائجسٹ کو یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے کہ پہلی بار ان کی زندگی کی کہانی اور یادیں باتیں محفوظ کی جا رہی ہیں۔

O......❁......O

میرے والد صاحب کا نام غلام محمد تھا اور وہ اپنے والد یعنی میرے دادا جان کے ہمراہ 1947ء میں بھارت کے ضلع ہوشیار پور سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچے تھے۔ میرا تعلق گوجر قوم سے ہے۔ میرے والد صاحب جب ہمیں ہجرت کی خونچکاں داستان سناتے تو ہم بچے کانپ کانپ جاتے تھے۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ یہ وطن ہم نے فی الواقع خون کے دریا عبور کر کے حاصل کیا ہے۔ ہجرت کے وقت ہمیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ ہم اپنی عورتوں کی حفاظت کیسے کریں۔ ہم لوگ ذکر اذکار کرتے ہوئے ہوشیار پور سے نکل آئے اور خوف کی فضا میں یہاں پہنچے اور جب پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے تو ہمارا خوف ختم ہوا۔ پاکستان پہنچ کر والد صاحب منڈی بہاؤالدین کے ایک گاؤں چک نمبر 2 شمالی میں آباد ہوئے۔ میرے ننھیال کا تعلق پپلاں ضلع میانوالی سے ہے۔ وہاں میرے والد صاحب کی شادی تقسیم ہند کے کچھ ہی عرصہ بعد ہوئی۔ والد صاحب فوج میں ملازمت کرتے تھے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ پپلاں میں پٹھان برادری کے ساتھ ہمارے ماموں کا کوئی جھگڑا ہوا تو میرے بڑے ماموں سے ایک شخص قتل ہو گیا۔ میری نانی جان بہت جہاندیدہ خاتون تھیں، کہنے لگیں، بیٹا بات یہ ہے کہ لوگ بھلے آپ کو ڈرپوک کہیں یا کچھ اور، بہتری اسی میں ہے کہ ہم مستقل طور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پر یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں کیونکہ اگر ہم یہیں رہتے ہیں تو ہماری دشمنی مزید بڑھتی جائے گی جس سے بہت نقصان ہوگا۔ میری نانی اماں کی ہدایت کے مطابق ہمارے ماموں نے تمام زمین اونے پونے داموں بیچ ڈالی، قصاص ادا کیا اور چک نمبر 72 ایم ایل۔ اڈہ شوکت والا (بھکر) کے قریب آباد ہوگئے۔ میری والدہ صاحبہ شادی کے بعد والد صاحب کے پاس منڈی بہاؤ الدین آ گئیں اور پھر 1962ء میں میرے والدین منڈی بہاؤ الدین سے مستقل طور پر ہجرت کر کے ننکانہ صاحب آ کر آباد ہوئے۔ میری جائے پیدائش تحصیل پپلاں ضلع میانوالی ہے اور میں پانچ اکتوبر 1960ء کو پیدا ہوا۔

میری نانی اماں ان پڑھ خاتون تھیں لیکن وہ روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتیں۔ قرآن مجید کی جلد کے اندرونی حصہ پر اللہ تعالیٰ کے 99 نام اور جلد کے دوسری طرف حضور نبی کریم ﷺ کے اسمائے گرامی لکھے ہوتے تھے تو میری نانی اماں ان دونوں حصوں کی بھی تلاوت فرمایا کرتیں۔ میرا نام جو 'محمد متین خالد' رکھا گیا تو یہ انہوں نے ہی رکھا۔ نانی اماں کہا کرتی تھیں کہ میں نے یہ نام 'متین' اس لیے رکھا ہے کہ یہ اللہ رب العزت کا بھی (صفاتی) نام ہے اور نبی کریم ﷺ کا بھی۔ ہم پانچ بھائی ہیں اور ہماری کوئی بہن نہیں۔ بڑے بھائی کا نام محمد امین جاوید ہے جو ننکانہ صاحب میں ہوتے ہیں اور بلدیہ سے ریٹائر ہوئے۔ ان سے چھوٹے محمد شاہین پرواز ننکانہ صاحب سے گریڈ اٹھارہ میں بطور سینئر ٹیچر ملازمت سے سبکدوش ہوئے، وہ آج کل لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔ تیسرے نمبر پر میں ہوں اور چوتھے نمبر پر تنویر شہزاد ہیں جو سینئر صحافی ہیں اور ایک مدت سے جرمنی کے ''ڈوئچے ویلے'' ریڈیو سے وابستہ ہیں۔ وہ کسی زمانے میں مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے ''زندگی'' میگزین میں بھی کام کرتے رہے۔ ان کا شامی صاحب اور دیگر اہم شخصیات کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔ ہمارے سب سے چھوٹے بھائی قدیر شہزاد ہیں جو مستقل طور پر مانچسٹر برطانیہ میں آباد ہیں۔

میں نے 1976ء میں گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1978ء میں گورنمنٹ گرو نانک ڈگری کالج سے انٹرمیڈیٹ اور 1980ء میں اسی کالج سے بی اے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لا کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں ہمارے استاد سردار اقبال موکل صاحب تھے، جو ایک عظیم انسان تھے۔ یہاں ''لا'' (Law) کے دو امتحان ہوتے تھے: ''ایف ای ایل'' (فرسٹ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ایگزامینیشن آف لا) اور دوسرا ''ایل ایل بی''۔ میں نے پہلا سال مکمل کر کے ''ایف ای ایل'' کیا لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر میں ایل ایل بی نہ کر سکا۔ 1982ء میں، مَیں نے سٹیٹ بینک آف پاکستان میں ملازمت کے لیے اپلائی کر دیا اور میرا تقرر راولپنڈی سٹیٹ بینک میں ہو گیا جہاں میں ایک سال رہا اور اس کے بعد میرا لاہور تبادلہ ہو گیا، پھر پوری سروس یہیں پر پوری کی۔ 2015ء میں ریٹائر ہوا۔ دوران سروس ہی پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کر لیا۔

1971ء میں جب میں ننکانہ صاحب میں پرائمری سکول میں پڑھتا تھا اس وقت سکولوں میں سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ہم گھر سے ٹاٹ اور بوریاں لے کر جاتے اور درختوں تلے بیٹھ کر پڑھتے لیکن اس دور کے اساتذہ کرام بہت زیادہ محنتی تھے۔ وہ لوگ واقعی اپنے پیشے کے ساتھ مخلص تھے۔ ہمارے ریاضی کے استاد رحیم بخش صاحب تھے، وہ ہمیں بلند آواز کے ساتھ پڑھایا کرتے۔ استاد سخی محمد صاحب، یامین صاحب، ماسٹر محمد رمضان صاحب یہ سب بہت محنتی تھے۔ انہوں نے بڑے اچھے طریقے سے پڑھایا اور بہت اچھی تربیت کی۔ ان اساتذہ نے تعلیم کے بنیادی تصورات بہت پختہ کر دیے اور پھر ہم اسی بنیاد پر آگے بڑھے۔ اس وقت انگلش چھٹی کلاس سے شروع ہوتی تھی اور اس وقت اسے ایک بورنگ سبجیکٹ کے طور پر لیا جاتا تھا لیکن ان اساتذہ نے اس مضمون میں اس قدر دلچسپی پیدا کی کہ ہمیں شوق پیدا ہوا کہ زیادہ سے زیادہ انگلش سیکھیں۔ اس دور میں اساتذہ بدنی سزا بھی دیتے تھے۔ ہم استاد کو گلی میں دیکھتے تو احتراماً راستہ بدل لیتے تھے، استاد کی عزت کا تصور بہت زیادہ تھا۔ استاد مارتے ضرور تھے لیکن ہونہار طالب علموں کے ساتھ بہت زیادہ شفقت بھی فرماتے۔ میں شروع ہی سے شرارتی تھا لیکن پڑھائی کے معاملے میں کبھی غفلت نہ کی۔ پہلی جماعت سے لے کر آخر تک اللہ کے فضل سے کبھی فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ پوزیشنیں لیتا رہا۔ میرے لیے سب سے خشک مضمون سائنس تھا اور سب سے زیادہ دلچسپ ریاضی اور انگلش تھے۔ میرے ریاضی میں بہت اچھے نمبر آتے رہے۔ اس کے علاوہ آگے جا کر میری زیادہ دلچسپی اسلامیات کے ساتھ ہو گئی۔

جب میرے والد صاحب فوج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر گھر آ گئے تو انہوں نے تحصیل ننکانہ میں ایک معمولی سی نوکری شروع کی۔ ''بڑا گھر'' کے قریب حنیف رامے صاحب کی زمین کے ساتھ ہی ہماری زمین تھی جس سے ہمیں گندم، چاول، گڑ، دالیں وغیرہ میسر آتی رہتی تھیں۔ والد صاحب نے ایک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بھینس رکھی ہوئی تھی اور یوں خالص دودھ ہمیں گھر کا نصیب ہوتا تھا۔ یہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ والدین نے ہمیں کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ کھانے پینے میں والد صاحب نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اصل بنیاد تو یہی ہوتی ہے کہ کھانے پینے کا نظام بہتر ہو تو اگلی زندگی بھی صحت مند گزرتی ہے۔ بجلی کے بل بہت کم آتے تھے، دیگر اخراجات بھی اس وقت بہت تھوڑے ہوتے تھے۔ گھر میں بہت زیادہ خوشحالی تو نہیں تھی لیکن بہرحال غربت بھی نہ تھی۔

اب میں حالات کا موازنہ اس پرانے دور سے کرتا ہوں تو مجھے ایک چیز میں واضح فرق نظر آتا ہے کہ اس دور میں ''شکر'' کا رویہ بہت تھا اور جو بھی کھانے پینے کو مل جاتا لوگ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کرتے۔ آج تو ہزاروں نعمتیں ہمارے پاس موجود ہیں لیکن ہر وقت شکوہ ہی زبان پر رہتا ہے کہ ہائے فلاں چیز کی کمی اور فلاں چیز کی کمی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم صرف عیدین کے موقع پر ہی نئے جوتے اور نئے کپڑے لیتے تھے۔ عید سے پندرہ بیس دن قبل جب ہمارے والد صاحب نئے جوتے اور نئے کپڑے لاتے تو ہم ہر روز اپنی چیزیں نکال نکال کر دیکھا کرتے اور خوش ہوتے رہتے۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں اور ہم اپنی لائف بڑی انجوائے کیا کرتے۔ ہم ملیشیا کے کپڑے پہن کر سکول جاتے کیونکہ یہی سکول کی وردی تھی۔ ہمارے والد صاحب ہم پانچوں بھائیوں کے ساتھ بے حد محبت فرماتے لیکن پڑھائی کے معاملے میں بہت ہی سخت مزاج تھے۔ اگر کسی استاد نے انہیں سرِ راہ بتا دیا کہ آپ کے بیٹے کا ٹیسٹ تھا اور اس کے نمبر اچھے نہیں آئے تو اس پر والد صاحب ہمیں بہت مارتے۔ پڑھائی کے بارے میں گھر میں ایک مارشل لا والی صورتحال ہوتی۔ پھر بعد میں والد صاحب ہمیں پاس بلاتے، پیار کرتے اور کوئی چیز لا کر دیتے اور ہمیں نصیحت کرتے کہ بیٹا میں جو آپ کی پڑھائی کے معاملے میں بہت زیادہ سختی کرتا ہوں تو اس میں صرف اور صرف تمہارا اپنا بھلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ والدین کی اس تربیت کی وجہ سے الحمدللہ ہم پانچوں بھائیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور آج اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب خود بالکل ان پڑھ تھے لیکن انہیں بے حد شوق تھا کہ میری اولاد اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور اس معاملے میں وہ بہت ہی سنجیدہ رہتے اور پڑھائی کے معاملے میں ہم پانچوں بھائیوں کے ساتھ ہرگز کوئی رعایت روا نہ رکھتے۔ والد صاحب ہمیں کہتے کہ سبق بلند آواز سے پڑھو، اتنا کہ تمہاری آواز اذان کی طرح اونچی ہونی چاہیے۔ اس کا ہمیں بہت ہی فائدہ ہوا۔ والد

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

صاحب بہت مہمان نواز بھی تھے۔ ہم دیکھا کرتے کہ ہر وقت ان کے پاس دوستوں کا آنا جانا لگا رہتا اور چائے پانی کا دور چلتا رہتا۔ جب میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ہمارے والدین بڑے پکے نمازی تھے اور ہر وقت یادِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ والد صاحب چائے کے بے حد شوقین تھے۔ وہ صبح نماز سے پہلے ہی کپ چائے کا ضرور پیتے۔ ہمارے گھر میں دو اخبار روزانہ آتے تھے: روزنامہ مشرق اور روزنامہ کوہستان۔ بعد میں ''امروز'' بھی آنا شروع ہو گیا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں یہی اخبارات دیکھے اور مجھے جو لکھنے پڑھنے کا ذوق ہے یہ مجھے وہیں سے پیدا ہوا۔ ان اخبارات میں بچوں کا ہفتہ وار صفحہ بھی آتا تھا۔ جو چیز مجھے ابھی تک یاد ہے وہ یہ کہ بچوں کے اس صفحہ پر دو ایک جیسی تصویریں ہوتی تھیں اور نیچے لکھا ہوتا تھا کہ ان تصویروں میں دس مقامات پر فرق تلاش کریں۔ ہم بچے سب سے پہلے یہی کام کرتے تھے کہ پنسل لے کر وہ فرق تلاش کیا کرتے۔ اسی طرح ایک سلسلہ ''راستہ تلاش کیجئے'' کا بھی ہوتا۔ پہیلیاں ہوتی تھیں، مختلف کہانیاں اور لطیفے بھی ہوتے۔ ہم ان تمام سلسلوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ میں روزنامہ مشرق کو کوئی نہ کوئی لطیفہ بھیجتا تھا یا پنسل سے کوئی تصویر یا خاکہ بنا کر بھیجتا تو میری کوئی چیز شائع ہو جاتی تو میں پورے گھر میں خوشی سے اچھلتا پھرتا۔ ظاہر ہے یہ تصویریں اور خاکے بس ایسے ہی ہوتے تھے جس طرح کوئی بچہ الٹی سیدھی لکیریں کھینچ دیتا ہے۔ آج کل تو پھر بھی سکولوں میں یہ سب کچھ بچوں کو سکھایا جاتا ہے لیکن ہمارے دور میں تو ٹاٹ کے سکول ہوا کرتے تھے اور عام پڑھائی لکھائی کے سوا کوئی دوسری دلچسپی کی چیزیں بچوں کو نہیں سکھائی جاتی تھیں۔ دوسری طرف والد صاحب ہمیں روزانہ یہ حکم دیا کرتے تھے کہ یہ پورا اخبار ادارتی صفحے سمیت مجھے باآواز بلند پڑھ کر سناؤ۔ وہ ہم سے ایک ایک خبر اور کالم سنتے۔ والد صاحب ریڈیو بھی بہت سنتے اور خبروں کے علاوہ زیادہ تر ریڈیو پاکستان پر نظام دین کا پنجابی زبان میں پروگرام سنتے تھے۔ مجھے ابھی تک وہ منظر یاد ہے کہ جب نظام دین کا پنجابی پروگرام شروع ہوتا تھا تو پورے گھر میں مکمل خاموشی ہوتی تھی کیونکہ والد صاحب کا حکم تھا کہ اب پروگرام شروع ہونے لگا ہے اور کوئی شور شرابا نہ کرے۔ یوں پورے گھر میں صرف نظام دین ہی کی آواز سنائی دیتی۔ یہاں میں بتاتا چلوں کہ گزشتہ دنوں معروف شاعر امجد اسلام امجد کو کسی نے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ جب امجد اسلام امجد کا ''وارث'' ڈرامہ چلتا تو سڑکیں ویران ہو جاتی تھیں تو اس نے لکھا کہ اسی جملے کو یوں کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ وارث ڈرامہ چلتا تھا تو گھر آباد ہو جاتے تھے۔ بالکل یہی پوزیشن

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہمارے گھر کی ہوتی تھی کہ جب بھی ریڈیو پر تلقین شاہ اور نظام دین کی آواز گونجتی تو سب لوگ گھر میں موجود ہوتے تھے۔

پھر وہ وقت بھی مجھے یاد ہے کہ جب نظام دین صاحب ننکانہ آئے تو میں ان سے ملنے کے لیے پہنچا اور ان سے مل کر بے حد خوش ہوا۔ اسی طرح جب ہم 1978ء میں سکول میں پڑھتے تھے اور مری میں ہمارے سکول کا ٹرپ گیا تو میں بھی اس میں شامل تھا۔ واپسی پر ہم جس ٹرین میں سفر کر رہے تھے کسی نے بتایا کہ اسی بوگی میں نظام دین صاحب بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ہم ان کے پاس پہنچ گئے۔ شروع شروع میں تو انہوں نے ہمیں بچے سمجھ کر کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن بعد میں جب ہم نے انہیں ایک لطیفہ سنایا تو وہ ہنس پڑے اور اس کے ساتھ ہی وہ ہمارے ساتھ گھل مل گئے۔ انہوں نے ہم بچوں سے بڑی محبت فرمائی اور ہمارے ساتھ خوب مذاق بھی کیا۔ ٹرین کا پورا ڈبہ ان کی باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

میری والدہ صاحبہ بہت ہی نیک سیرت خاتون تھیں۔ جب میں ساتویں کلاس میں تھا تو والد صاحب ہیپاٹائٹس کے باعث سروسز ہسپتال لاہور میں وفات پا گئے۔ یوں بہت زیادہ امکان تھا کہ ہم بگڑ جاتے، ہمارے شہر میں سینما گھر بھی تھا اور آوارہ گردی کے دوسرے مواقع بھی موجود تھے۔ لیکن والدہ صاحبہ کا ہم پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ہم پانچ بھائیوں کو انتہائی مشکل وقت میں سنبھالا اور سنبھالا بھی ایسا کہ سختی اور ڈانٹ ڈپٹ کے بغیر ہماری تربیت کی۔ والد صاحب چونکہ پڑھائی کے معاملے میں بہت زیادہ سختی فرماتے اور ہمارے باہر گھومنے پھرنے پر بھی پوری نظر رکھتے تھے اور مغرب کے بعد تو ہمارا باہر نکلنا بالکل ممنوع قرار پایا تھا۔ والد صاحب بسا اوقات ہماری پٹائی بھی کر دیا کرتے تھے تو ان کی وفات کے بعد ہمیں یوں لگا جیسے ایک دم ہماری زنجیریں ٹوٹ گئیں اور ہم بالکل آزاد ہو گئے۔ ان حالات میں بہت زیادہ خدشہ اس بات کا تھا کہ ہم بگڑ نہ جائیں کیونکہ والدہ کے علاوہ تو اس وقت ہمارا کوئی اور سرپرست نہ تھا جو ہم پر پوری نظر رکھتا، چنانچہ پوری ذمہ داری والدہ پر آ پڑی تھی۔ ایک بیوہ جو پانچ بچوں کی ماں ہو، اس کے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ تھا۔ جس طرح ایک مرغی خطرے کو دیکھ کر اپنے چوزوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے بس والدہ صاحب نے ہماری اسی طرح سے حفاظت فرمائی اور ہمیں زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رکھا۔ ہاں البتہ ہماری تربیت کے حوالے سے دوسری جس خاتون کا بڑا کردار تھا، وہ ہماری ایک بڑی پھوپھو تھیں۔ میں نے شاید مردوں میں بھی اتنا حوصلہ نہیں دیکھا جتنی باحوصلہ وہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

خاتون تھیں۔ انہوں نے بھی ہمیں والد صاحب کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ وہ ہمارے کھانے پینے کا بہت زیادہ خیال کرتیں۔ پھوپھو کی زرعی زمین تھی اور انہوں نے ہر لحاظ سے ہمیں سپورٹ فراہم کی۔ والدہ صاحبہ کی ہم پر سب سے بڑی شفقت یہی رہی کہ پڑھائی کے معاملے میں ہمیں بالکل والد صاحب والی روٹین پر رکھا اور ہمیں اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اب ہم پانچوں بھائی اپنی اپنی فیلڈ میں ماشاءاللہ فٹ ہیں۔ میں اپنی والدہ کو جو سب سے بڑا خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ انہوں نے شروع دن سے ہمیں کہا کہ بیٹا مجھے بس آپ کی کسی بھی قسم کی اخلاقی لحاظ سے کوئی شکایت نہیں آنی چاہیے۔ ہمارے شہر میں لڑکیوں کو چھیڑنا اور اس حوالے سے لڑائی جھگڑے معمول کی بات تھی۔ ہماری کزن لڑکیاں ہمارے گھر کھیلنے آتیں لیکن کبھی ہمارے تصور میں بھی کبھی کوئی غلط بات نہ آئی۔ یہ صرف اور صرف ہماری والدہ صاحبہ کی تربیت تھی جس کا اثر آج تک موجود ہے۔

آئندہ زندگی میں جب مجھے اللہ تعالیٰ نے تحریک تحفظ ختم نبوت میں حصہ لینے کی توفیق عطا فرمائی تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب میری محترمہ والدہ کی دعاؤں ہی کا نتیجہ تھا۔ وہ حیات ہی تھیں جب میں ختم نبوت کے کام سے منسلک ہوا اور گھر کے ڈرائنگ روم ہی میں اپنا دفتر قائم کر لیا۔ اس سلسلے میں گھر میں روزانہ بیس افراد بھی آتے تو والدہ صاحبہ نے مہمان نوازی کے حوالے سے کبھی اُف تک نہ کی اور ان کے لیے چائے کھانے کا انتظام بخوشی کیا کرتی تھیں۔ وہ اپنے لیے اس کام کو ایک سعادت سمجھتی تھیں۔

والدہ صاحبہ بڑی رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں، بڑا سوشل مزاج رکھتی تھیں۔ جب پتا چلتا کہ محلے میں کوئی خاتون بیمار ہے تو وہ نہ صرف خبر گیری کرتیں بلکہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کی مدد بھی کر دیا کرتیں۔ اسی طرح اگر کوئی خاتون گھر میں آجاتی اور والدہ سے اپنی ضرورت بیان کرتی تو ان کی پوری خواہش ہوتی کہ وہ اس کی ضرورت پوری کر دیں۔ اکثر والدہ صاحبہ ہماری ضرورت کا دودھ، لسی یا گھی بھی کسی ضرورت مند کو دے دیا کرتی تھیں اور ہمیں کہا کرتی تھیں کہ پریشان نہیں ہونا ''اللہ کے نام پر دیا ہوا کبھی ضائع نہیں جاتا۔'' میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ آپ کسی کو کھانا کھلاتے ہیں تو اللہ آپ کے رزق میں بہت زیادہ اضافہ کرتا ہے۔ میرا آج بھی یہ معمول ہے کہ پانچ وقت کی نماز کے بعد ایک دعا ضرور مانگتا ہوں کہ یا اللہ ایمان کی سلامتی دینا، صحت و تندرستی دینا، رزق حلال وافر مقدار میں عطا کرنا اور مہمانوں کی خدمت کی توفیق دینا اور آنے والی مشکلات سے محفوظ فرمانا۔ یقین مانیے کہ اللہ تعالیٰ نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

زندگی کے ہر موڑ پر ہماری مدد فرمائی۔ ہم سب بھائیوں کا اب بھی یہ مزاج ہے کہ اگر کسی کو تکلیف میں دیکھیں تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کی ضرورت پوری کر دیں۔ جب تک میری والدہ محترمہ حیات تھیں تو مجھے جرأت نہیں تھی کہ میں ننکانہ صاحب چھوڑوں۔ وہ 1993ء میں وفات پا گئیں تو میں نے پھر مستقل طور پر لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ میں نے اپنے تمام بھائیوں سے اجازت لی اور پھر کچھ اپنے محکمہ سے قرض لے کر اور کچھ اپنی بھی سیونگ تھی تو یوں میں نے والٹن کے علاقہ میں اپنا مکان بنا لیا۔

1982ء میں جب میں راولپنڈی سٹیٹ بینک میں تھا تو اس وقت یہ قانون تھا کہ پورے ملک میں کوئی بھی آدمی جو پاکستان سے باہر جاتا اس کو اپنے متعلقہ سٹیٹ بینک ضرور آنا پڑتا۔ سٹیٹ بینک میں ایک لسٹ 'ای سی ایل' ہوتی تھی جس میں لکھا ہوتا تھا کہ کیا اس آدمی پر بیرون ملک سفر پر پابندی تو نہیں ہے۔ وہ لسٹ چیک کرنے کے بعد سٹیٹ بینک اس آدمی کو کلیئرنس سرٹیفکیٹ جاری کرتا۔ میں ایک دن اپنے سیکشن میں بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سائلین کی قطار لگی ہوئی تھی، مجھے ایک آفس فیلو نے کہا کہ وہ جو سامنے نوجوان کھڑا ہے، کیا آپ اس کو جانتے ہیں؟ اس نوجوان نے سادہ سے کپڑے اور پرانا جوتا پہن رکھا تھا۔ لمبا قد اور بہت ہی سادہ سٹائل تھا۔ میں نے کہا میں تو نہیں جانتا کیونکہ میں تو ابھی راولپنڈی میں نیا نیا آیا ہوں۔ ان صاحب نے کہا کہ یہ شیخ رشید ہے جو سٹوڈنٹ لیڈر رہ چکا ہے اور اب اس کا شمار مشہور لیڈروں میں ہوتا ہے۔ میں نے شیخ رشید صاحب کو پہلی مرتبہ اس حالت میں دیکھا۔ اب تو وہ شہرت کی بلندی پر پہنچ گئے ہیں۔

سٹیٹ بینک سروس کے دوران میں اپنا کام بڑی دلچسپی سے کیا کرتا تھا۔ ویسے تو سٹیٹ بینک کی نوکری بڑی بور ہے لیکن اگر آپ کو کام آتا ہو اور آپ محنت کر کے کھانے پر یقین رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کے باس کا آپ کے ساتھ رویہ بھی اچھا ہو تو پھر کام میں مزا آتا ہے اور بوریت نہیں ہوتی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے اپنی پوری سروس بڑی دل جمعی کے ساتھ کی اور مجھے جو بھی افسران بالا ملے وہ میرے ساتھ بے حد محبت کرنے والے تھے۔ کیونکہ اگر افسر اچھا ہو تو نوکری اچھی رہتی ہے وگرنہ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی اپنی گھریلو زندگی ڈسٹرب ہوتی ہے اور وہ اپنے ماتحت کو بھی خوش نہیں دیکھ سکتے اور اسے تنگ کرتے ہیں۔ سٹیٹ بینک کی پوری سروس میں دو شخصیات نے مجھے بہت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

زیادہ محبت دی: ایک چوہدری محمد جاوید صاحب تھے اور دوسرے جاوید اقبال صاحب (چیف منیجر) تھے۔

جب میں نے ریٹائرمنٹ کی درخواست دی تو انہی دنوں پاکستان میں مذہبی کارکنوں کی خوب پکڑ دھکڑ جاری تھی۔ جاوید بٹ صاحب کہنے لگے کہ اگر آپ کو قادیانی لابی اور ختم نبوت کے کام کی وجہ سے کوئی پریشانی ہے اور آپ اس وجہ سے نوکری قبل از وقت چھوڑنا چاہ رہے ہیں تو آپ نہ چھوڑیں، میں ہر لحاظ سے آپ کے ساتھ کھڑا ہوں۔ آپ کو نوکری کا کسی قسم کا نقصان نہیں ہوگا، اگر آپ اپنی خوشی سے جانا چاہ رہے ہیں تو میں آپ کو نہیں روکتا۔ یہ میرے لیے بہت بڑی بات تھی کہ میرا افسر سربراہ مجھے اتنی محبت دے رہا تھا۔ جب میں ریٹائرمنٹ کے بعد عمرہ پر گیا تو میں نے جاوید اقبال بٹ صاحب کو ہر وقت اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔

سٹیٹ بینک میں مختلف نوعیت کے کام ہوتے ہیں، آسان بھی اور مشکل بھی۔ میری ڈیوٹی جعلی نوٹوں کے متعلق ''کلیم سیکشن'' میں تھی۔ ہم ایک ایک نوٹ کی اپنے رجسٹر میں انٹری کرتے اور پھر ایک ایک نوٹ پر مہر لگاتے اور اس کے بعد جب تک اس کیس کا فیصلہ نہیں ہو جاتا تھا ہم اس کرنسی کو محفوظ رکھتے تھے۔ یہ کام بڑی ذمہ داری والا تھا۔ اگر کوئی شخص مارکیٹ میں جعلی نوٹ استعمال کرتا ہوا پکڑ لیا جائے تو پولیس ایف آئی آر درج کرنے کے بعد ہمارے پاس آتی ہے۔ پولیس ہم سے سرٹیفکیٹ طلب کرتی ہے کہ آپ بتائیں کہ یہ نوٹ جعلی ہے یا اصلی؟ اگر ہم سرٹیفکیٹ دیتے ہیں کہ یہ نوٹ اصلی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ایف آئی آر وہیں پر ختم ہو جاتی اور اگر ہم اس کے جعلی ہونے کی تصدیق کر دیں تو پھر کیس بھی اسی بنیاد پر آگے چلتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں ایک بڑا المیہ یہ ہے جس کا مجھے خود تلخ تجربہ ہوا کہ جب پولیس والے میرے پاس بڑے بڑے بنڈلوں میں لاکھوں روپے کی جعلی کرنسی لے کر آتے تو میں ان سے ایک سوال ضرور کرتا تھا کہ ملزم کہاں ہے؟ تو مجھے بڑی حیرانی ہوتی جب وہ یہ جواب دیتے کہ ملزم کی تو ضمانت ہو چکی ہے۔ 95 فی صد کے قریب ایسے واقعات تھے جن میں مجھے پولیس کے تفتیشی افسر کی طرف سے ایک ہی جواب ملتا کہ جی ملزم کی تو ضمانت ہو گئی ہے۔ میں انہیں کہتا کہ بھائی ابھی تو ہم (یعنی سٹیٹ بینک) نے اس کرنسی کے متعلق سرٹیفکیٹ بھی جاری نہیں کیا کہ یہ جعلی ہے یا اصلی ہے تو اس سے پہلے ہی اس ملزم کی ضمانت کیسے ہو گئی جبکہ ابھی ایف آئی آر کو درج ہوئے صرف دو چار دن ہی گزرے ہیں۔ میں ایسے واقعات کے متعلق سوچتا تھا کہ ہمارا عدالتی نظام کیسا ہے کہ اس قدر عجلت میں قومی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مفادات کے ساتھ کھیلنے والے ملزموں کو ضمانت پر رہا کر دیتا ہے، کم از کم عدالتوں کو سٹیٹ بینک کے سرٹیفکیٹ کا تو انتظار کرنا چاہیے۔ میں سوچتا تھا کہ پوری دنیا میں یہ قانون رائج ہے کہ جو بھی آدمی جعلی کرنسی تیار کرتا ہے وہ ملک اور قوم کا غدار کہلاتا ہے اور اس کی کوئی ضمانت نہیں، بلکہ بعض ممالک میں تو اس جرم کی سزا موت ہے۔ امریکہ، انگلینڈ، جاپان، سعودی عرب جیسے ملکوں میں جعلی کرنسی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اسے عبرت کا نشان بنا دیا جاتا ہے۔

ایک دن ایک پولیس افسر نے مجھے ایک بڑی عجیب بات کہی کہ یہ جو جعلی کرنسی بناتے ہیں ان کے پیچھے بہت بڑا مافیا ہوتا ہے اور ان کی پشت پر کوئی نہ کوئی بڑ تگڑا سیاست دان ہوتا ہے۔ اس لیے یہ لوگ بڑے طاقت ور ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ سٹیٹ بینک نے پاکستانی کرنسی میں جتنے بھی خفیہ سیکیورٹی فیچر ڈر کھے ہوئے ہیں، مافیا کمال ہوشیاری سے جعلی کرنسی میں یہ فیچر ڈ ڈال دیتا ہے۔ ایسے جعلی نوٹ اے ٹی ایم کی مشینوں سے بھی نکل آتے ہیں اور عام بینکوں میں بھی گردش کرتے رہتے ہیں اور انہیں پکڑنا مشکل ہوتا ہے۔ جعلی کرنسی تیار کرنے والے مافیا نے جعلی نوٹوں کی کچھ اس طرح سے کیٹگریز بنا رکھی ہیں کہ اوّل درجے کے جعلی نوٹ کا حساب یہ ہوتا ہے کہ ایک ہزار روپے کا جعلی نوٹ سات یا آٹھ سو روپے تک فروخت ہوتا ہے۔ اس کے نچلے درجے کا ہزار روپے کا جعلی نوٹ چھ سو روپے میں ملتا ہے اور جو بہت ہی ہلکا جعلی نوٹ ہے وہ تین سو روپے میں ملتا ہے۔

ایک مرتبہ قصور کی پولیس میرے پاس بہت زیادہ تعداد میں دس روپے کے جعلی نوٹ لے کر آئی۔ تفتیشی افسر مجھے بتانے لگا کہ للیانی، مصطفیٰ آباد اور اس کے مضافات میں لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ وہ جب شادیوں کا سامان خریدنے جاتے ہیں اور دولہے کے لیے نوٹوں والا ہار بھی لیتے ہیں تو اس ''ہار'' میں پانچ سو روپے کا ایک نوٹ اصلی لگا دیا جاتا ہے اور باقی پانچ سو روپے کے نوٹ جعلی لگا دیئے جاتے ہیں۔ دکاندار کہتا ہے کہ دیکھیں کہ اس ہار میں ایک ہزار روپے لگے ہوئے ہیں اور اس میں ہماری محنت بھی شامل ہے تو یہ آپ کو 13 سو روپے میں ملے گا۔ اس طرح یہ دکاندار عام شہریوں کو لوٹتے رہے۔ میں نے اپنی پوری سروس کے دوران میں کوئی ایک بھی ایسا کیس نہیں دیکھا جس میں جعلی کرنسی کے ملزموں کو عبرت کا نشان بنایا گیا ہو۔ میں نے ان ملک دشمن عناصر کو ہمیشہ عدالتوں سے رہا ہوتے دیکھا ہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جعلی کرنسی کے کیسوں کے سلسلہ میں مجھے پولیس سے اکثر واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ایک دن میں نے ایک تھانیدار سے کہا: میں نے سنا ہے کہ آپ تھانوں میں چوری، ڈکیتی اور دیگر جرائم میں ملوث لوگوں پر انسانیت سوز تشدد کرتے ہیں تو اس میں کیا حقیقت ہے؟ آج کل تو میڈیا اور سوشل میڈیا کا دور ہے اور ہر شخص پولیس تشدد سے بخوبی آگاہ ہے لیکن اس وقت پولیس تشدد کے متعلق صرف اخبارات ہی میں خبریں پڑھنے کو ملا کرتی تھیں اس لیے مجھے تجسس تھا کہ واقعی تشدد ہوتا ہے یا خبریں غلط ہوتی ہیں تو میں نے اس پولیس افسر سے کہا کہ کیا میں یہ تشدد خود دیکھ سکتا ہوں کہ آپ کس طرح لوگوں کو مارتے ہیں؟ میں اس کا جواب سن کر حیران رہ گیا کہ اس نے مجھے دعوت دیتے ہوئے کہا کہ جی کل فلاں وقت پر آپ میرے تھانے میں تشریف لائیں ہم نے ایک ملزم کی پٹائی کرنی ہے۔آپ خود دیکھ لیں گے کہ ہم ان کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔لیکن میں تشدد کا منظر دیکھنے کے لیے نہ جا سکا کیونکہ میں اس کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔جب میں سٹیٹ بینک راولپنڈی میں تھا تو اس وقت ہمارا دفتر جی ایچ کیو کے عقب میں واقع تھا۔اس دور میں فوجی علاقوں میں عام لوگ آتے جاتے رہتے تھے اور زیادہ سیکیورٹی مسائل نہیں تھے۔ ایک دن میں دوپہر کا کھانا کھا کر چائے پینے کے لیے باہر نکلا اور کینٹین پر جانے کے لیے سڑک پار کرنے لگا تو میں نے دیکھا کہ جگہ جگہ فوجی حضرات کھڑے ہیں جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی وی آئی پی شخصیت آرہی ہے۔جب فوجی قافلہ گزرنے لگا تو سب سے آگے تین چار پروٹوکول گاڑیاں گزر گئیں اور اس کے بعد ایک گاڑی گزری تو اس کا شیشہ نیچے ہوا اور وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگی تو میں پیچھے ہونے لگا۔اس کے بعد گاڑی رک گئی اور شیشہ کھلا تو جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے مجھے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا، اس کے بعد وہ چلے گئے۔میں اس پر بہت ہی حیران ہوا۔یہ میری زندگی کا ایک حسین لمحہ تھا۔میں ایک عام شہری تھا اور میری تو کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔میں بھٹو صاحب کے بعد تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں جنرل ضیاء الحق سے بھی بہت محبت کرتا ہوں کیونکہ ان کے دورِ اقتدار میں (1984ء میں) قادیانیوں کے خلاف تاریخ ساز ''امتناع قادیانیت آرڈی نینس'' پاس ہوا۔

اس طرح کا ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے کہ ایک مرتبہ میں منصورہ مسجد میں نماز پڑھ کر باہر آیا اور مولانا عبدالمالک صاحب کے ساتھ باہر کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ اسی دوران مسجد سے قاضی حسین احمد صاحب نکلے اور سیدھا ہمارے پاس آئے۔مجھ سے بغل گیر ہوئے اور حال احوال پوچھ کر چلے گئے۔وہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس انداز سے ملے جیسے وہ صرف مجھ ہی سے ملنے آئے ہوں جبکہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مولانا عبدالمالک صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ مولانا عبدالمالک نے کہا کہ قاضی صاحب صرف آپ ہی سے ملنے آئے تھے۔ یہ دراصل بڑے لوگوں کی نشانیاں ہوتی ہیں کہ ان میں غرور اور تکبر نہیں ہوتا اور عاجزی وانکساران کا سرمایہ ہوتا ہے۔

جس وقت جنرل حمید گل صاحب آئی ایس آئی میں تھے تو ایک صاحب سے میں نے ان کا فون نمبر لے کر بات کی اور کہا کہ فتنہ قادیانیت کے خلاف میری کتاب ''ثبوت حاضر ہے'' پر آپ نے دیباچہ لکھنا ہے تو وہ کہنے لگے کہ جی میں ضرور لکھوں گا، چنانچہ انہوں نے بہت جاندار دیباچہ لکھا۔ یہ میرا ان سے پہلا رابطہ تھا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ شاہدرہ سے آگے ایک محلے میں ختم نبوت کانفرنس تھی تو میں نے احباب کے اصرار پر جنرل حمید گل صاحب کو دعوت دے دی لیکن بعد میں احساس ہوا کہ مجھے ان کو تکلیف نہیں دینی چاہیے تھی کیونکہ وہ بہت پسماندہ محلّہ تھا۔ سڑکیں اور گلیاں ٹوٹی پھوٹی تھیں اور جلسے کا کوئی خاص انتظام بھی نہ تھا۔ رات کا اندھیرا تھا اور گلیوں میں لائٹوں کا بھی بندوبست نہ تھا لیکن جنرل صاحب بالکل وقت پر پہنچے اور جو بھی روکھا سوکھا کھانا تھا کھایا، تقریر کی اور چلے گئے۔ انہوں نے اس پر ذرا بھی خفگی کا اظہار نہ کیا کہ یہ آپ نے مجھے کہاں پر بلالیا ہے۔ میں نے ان سے معذرت چاہی تو کہنے لگے کوئی بات نہیں میں تو تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ بس یہی چیزیں ہوتی ہیں جو کسی انسان کی اصل شخصیت کو آشکار کرتی ہیں اور لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت بیٹھ جاتی ہے۔ مولانا شاہ احمد نورانیؒ اور مولانا عبدالستار خان نیازیؒ صاحب کے ساتھ بھی میرا بہت تعلق رہا۔ یہ حضرات مجھ سے خصوصی محبت فرماتے۔ مولانا نیازی جب کرشن نگر (لاہور) میں رہائش پذیر تھے تو ہم اکثر ان کے پاس چلے جاتے اور گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ معروف ادیب طالب ہاشمی کے ساتھ میری بہت زیادہ نیاز مندی رہی۔ ہاشمی صاحب نے کمال کی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ بڑے زبردست انسان تھے۔ صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ پر انہوں نے بہت کام کیا۔ چلتا پھرتا ایک انسائیکلو پیڈیا تھے۔ بڑے سادہ مزاج انسان تھے۔ معروف دانشور ڈاکٹر محمود احمد غازی کے ساتھ بہت ہی قریبی تعلق رہا، ان کے میں نے بہت سے خطبات بھی سنے۔ مجھے غازی صاحب نے ایک زبردست آئیڈیا دیا تھا کہ آپ سابق قادیانیوں سے مل کر ان کے انٹرویوز اور حالات قلم بند کریں، چنانچہ میں نے یہ کام کیا اور یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ محمود احمد غازی صاحب

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نے انہی دنوں مجھے معروف صحافی زیڈ اے سلہری مرحوم کے پاس بھی بھیجا۔ سلہری صاحب کہنے لگے کہ میں تو اپنی یہ مکمل داستان اپنی یادداشتوں میں لکھ چکا ہوں۔ اسی مہم کے سلسلے میں مَیں شفیق مرزا صاحب (سابق قادیانی) سے بھی ملا۔ میری اس کتاب کا نام ''قادیانیت سے اسلام تک'' ہے اور اس میں 37 سابق قادیانیوں کے حالات ہیں۔

مولانا عبدالمالک اور ڈاکٹر طاہر القادری کے ساتھ تو اب بھی بہت اچھا تعلق ہے۔ معروف صوفی بزرگ خواجہ خان محمد رحمۃ اللہ سے میری بہت ہی عقیدت رہی۔ وہ مجھ پر بہت ہی شفقت فرماتے۔ حضرت جی بہت ہی کم بولتے تھے۔ جب بھی مرکز سراجیہ لاہور تشریف لاتے تو میں ضرور حاضر ہوتا۔ ایک بزرگ عالم دین مولانا سیّد خلیل احمد قادریؒ بھی تھے۔ یہ بھی بڑے مجاہد انسان تھے۔ میں جب ان سے ملا تو بہت زیادہ ضعیف ہو چکے تھے۔ 1953ء کی تحریک ختم نبوت میں انہیں پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ ہم نے تحریک ختم نبوت میں جیلیں کاٹنے والے اکابر کے اعزاز میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا تو قادری صاحب کو بھی بلایا۔ اس موقع پر انہوں نے 1953ء میں جو جیل کاٹی تھی اس کے کچھ ایمان افروز واقعات سنائے تھے۔ فرمانے لگے کہ مجھے دو دن تک بھوکا رکھا گیا اور شدید اذیت دی گئی۔ ایک رات میں بھوک سے نڈھال ہو کر بیٹھ گیا اور شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھا کہ اسی دوران مجھے ایک آواز آئی۔ میں نے دیکھا تو ایک نورانی صورت والے بزرگ میری بیرک میں موجود ہیں۔ وہ مجھے پیار سے سینے سے لگاتے ہیں اور پھر مجھے دو تھیلے دیتے ہیں کہ یہ رکھ لو۔ اس کے ساتھ ہی وہ بزرگ چلے جاتے ہیں۔ جب میں نے تھیلے کھولے تو ان میں تازہ فروٹ اور دیگر میوہ جات موجود تھے۔ میں نے ایسا فروٹ زندگی بھر کبھی نہیں کھایا۔ ختم نبوت کے محاذ پر کام کرنے والے ایک اور صاحب کا بھی بہت اہم کردار ہے اور وہ ہیں سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ، جسٹس ریٹائرڈ میاں محبوب احمد (وہ آج کل نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے چیئرمین ہیں)۔ حفیظ تائبؔ، مجید نظامی، نعیم صدیقی، امین گیلانی، معروف قلم کار وقار انبالوی، صاحبزادہ خورشید گیلانی اور میاں عبدالرشید (نور بصیرت / نوائے وقت) کے ساتھ میری بہت اچھی دوستی رہی۔ ایک صاحب حافظ نذر محمد تھے جنہوں نے ردعیسائیت پر بہت کام کیا۔ یہ گڑھی شاہو میں رہتے تھے۔ ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ بڑے نفیس اور نیک انسان تھے۔

جنگ ستمبر کے ہیرو ایئر کموڈور ایم ایم عالم کے ساتھ میری ایک یادگار ملاقات فیصل آباد میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوئی تھی۔ مولانا تاج محمودؒ کے بیٹے صاحبزادہ طارق محمود بہت ہی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی دو کتابیں ''خطبات'' اور ''قادیانیت کا سیاسی تجزیہ'' بڑی یادگار شئے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کے والد مولانا تاج محمودؒ کی برسی کے موقع پر میں فیصل آباد گیا تو ایم ایم عالم سے وہیں ملاقات ہوئی، بڑے فقیر مزاج اور نیک انسان تھے۔ انہوں نے سوویت یونین کے خلاف جنگ میں بھی بھرپور حصہ لیا تھا۔ ان پر یادِ الٰہی کا بہت ہی زیادہ غلبہ طاری رہتا۔ جب قرآن پڑھتے تو بچوں کی طرح رونا شروع کر دیتے، جہادی آیات کی تلاوت بڑے جذبے سے کیا کرتے۔ انہوں نے مجھے 1965ء کی سٹوری سناتے ہوئے کہا کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق تھی کہ میں نے ایک نشانے سے پانچ انڈین فائٹر طیارے مار گرائے۔ اس میں میرا اپنا کوئی کمال نہیں۔ وہ پھر جس کسمپرسی میں فوت ہوئے وہ بھی اپنی جگہ ایک تلخ حقیقت ہے۔

دوستوں کا ذکر کرنے لگا ہوں تو شفیق مرزا یاد آ گئے۔ یہ سینئر صحافی اور معروف شخصیت تھے۔ وہ قادیانیت سے تائب ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک کتاب ''شہر سدوم'' بھی لکھی۔ یہ قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ شفیق مرزا روزنامہ جنگ کے اداریہ نگار تھے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو میں سب سے زیادہ حفیظ تائبؔ مرحوم سے متاثر ہوں۔ مجھے شاعری وہی پسند ہے جو نعت رسول اللہ ﷺ پر مبنی ہو۔ ''ہم کو درکار ہے روشنی یا نبیؐ''۔ ان کے یہ نعتیہ اشعار اکثر پڑھتا رہتا ہوں۔ یہ دراصل ایک نوحہ ہے۔ حفیظ تائب نے جس طرح نبی رحمتؐ کی بارگاہ میں امت مسلمہ کا نوحہ پیش کیا ہے وہ انسان کو تڑپا دیتا ہے۔ اعظم چشتی مرحوم بھی میرے پسندیدہ شاعر اور نعت خوان تھے۔ ان کے ساتھ بھی میرا تعلق خوب رہا۔ اگر دوسری شاعری کی بات کی جائے تو مجھے شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ بہت پسند ہیں۔ ان کی ''بال جبریل'' اور ''ارمغان حجاز'' کے مطالعہ سے قاری میں ایک انقلابی روح بیدار ہوتی ہے۔ اقبالؒ کا یہ شعر جو بانگِ درا میں ہے، یہ مجھے بہت تڑپاتا ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

مزاحیہ شاعری کی بات کی جائے تو مجھے خالد مسعود اور انور مسعود کی شاعری پسند ہے۔ 1975ء میں مَیں نے اپنی محلے کی مسجد میں ایک تقریری مقابلہ کروایا جس کا عنوان تھا ''سیرت النبیؐ''۔ اس میں جہاں ہم نے لوگوں کو گفٹ دیے وہاں جو میں اپنے لیے ایک کتاب خرید کر لایا تھا اس کا نام تھا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

’’سیرت رسول عربیﷺ‘‘۔ یہ پروفیسر نور بخش توکلی صاحب کی تصنیف ہے۔ نصابی کتابوں کے علاوہ یہ میری زندگی کی پہلی کتاب تھی جس نے مجھے بہت زیادہ انسپائر کیا۔ ہمارے ننکانہ صاحب کے بلدیہ کے دفتر میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی (اب تو بدقسمتی سے لائبریریوں کا کلچر دم توڑ رہا ہے)۔ اس دور میں تحصیل کی سطح پر کارپوریشن یا جو بلدیہ کا دفتر ہوتا تھا اس میں ایک لائبریری ضرور ہوا کرتی تھی۔ اس لائبریری میں اخبار بھی آتے تھے۔ میں اس لائبریری میں باقاعدہ جاتا اور وہاں پر ہر موضوع سے متعلق دیکھتا رہتا، اسی طرح میں نے جو سب سے پہلا ناول پڑھا وہ نسیم حجازی کا ’’آخری چٹان‘‘ تھا، یہ کمال کا ناول ہے۔

بلدیہ کی اس لائبریری نے میرے شوقِ مطالعہ کو بہت زیادہ مہمیز دی۔ میں نے میٹرک، ایف اے کے دور میں بہت سے ناول پڑھ ڈالے جن میں ایک عنایت اللہ مرحوم کا ناول ’’داستان ایمان فروشوں کی‘‘ بھی شامل ہے۔ پھر یوں ہوا کہ میرا دل ناولوں سے جلد ہی اچاٹ ہوگیا کیونکہ میں سوچتا تھا کہ بھاری بھرکم ناول پڑھنے کے بعد بھی مستند معلومات کے حوالے سے انسان کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور بہت کم ایسے ناول ہوتے ہیں جن میں معلومات بھی قاری کو ملتی ہوں۔ مثلاً عنایت اللہ نے اپنے طویل ناول ’’داستان ایمان فروشوں کی‘‘ میں بہت زیادہ مصالحہ ڈال دیا۔ انہوں نے اس دور میں یہ مصالحہ ڈالا جب ہمارے لیے یہ چیزیں بڑی ہی حیران کن تھیں کیونکہ وہ پرانا دور تھا اور اس قسم کا لٹریچر بچوں پر بہت برا اثر ڈالتا تھا۔ اس ناول میں انہوں نے سیکس کو بہت زیادہ بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے میں نسیم حجازی کے ناولوں کو بہت زیادہ ترجیح دیتا تھا کیونکہ وہ بہت ہی صاف ستھرا لکھتے تھے اور کوئی ایک جملہ بھی ایسا نہیں ہوتا تھا جو بچوں کے ذہن پر منفی اثر ڈالتا ہو۔

میں نے نسیم حجازی کے قیصر و کسریٰ، خاک اور خون، شاہین اور تلوار ٹوٹ گئی ناول پڑھے لیکن ’’آخری چٹان‘‘ نے مجھے بہت متاثر کیا۔ بہرحال میں جلد ہی اس نتیجے پر پہنچا کہ ناول پڑھنا سراسر وقت کا ضیاع ہے۔ اسی طرح افسانوں کی بھی یہی صورتحال ہے کہ میں نے کچھ ہی افسانے پڑھنے کے بعد اس ’’صنف ادب‘‘ کو بھی خیر باد کہہ دیا کیونکہ میں تو صرف اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کرنے کی خاطر کتابیں پڑھنا چاہتا تھا، یوں جلد ہی میں نے دوسری کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا کیونکہ لکھنے اور کہیں ڈسکس کرنے کے لیے آپ کے پاس بہت زیادہ معلومات کا ذخیرہ ہونا چاہیے جبکہ ناول اور افسانے تو یہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کمی نہیں پوری کر سکتے۔ پھر میں نے بڑی مدت کے بعد عمیرہ احمد کا ناول ''پیر کامل'' پڑھا جو مجھے بہت پسند آیا۔اس ناول میں ایک قادیانی کی سٹوری ہے جو مصنفہ نے بڑی خوبصورتی سے بیان کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نوجوانوں کو یہ پڑھنا چاہیے۔ میرے مطالعہ کے شوق کو مزید مہمیز دینے میں حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحبؒ کے مضامین کا بھی بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ انہی دنوں مجھے ماموں جان کی وساطت سے پیر صاحب کی تصنیف، ''سنت خیر الانام'' میسر آئی۔ یہ 'فتنہ انکارِ سنت کے موضوع پر بڑی شاہکار کتاب ہے۔ پہلے پہل تو میں کتابیں لائبریری سے لاتا تھا، اس کے بعد میں نے کتابیں خریدنا شروع کر دیں۔ اسی دور میں میرے بڑے ماموں خالد نسیم چشتی جو حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری رحمہ اللہ (بھیرہ شریف) سے بیعت تھے اور انہوں نے ہمیں بھی ان کے دست حق پرست پر بیعت کروایا۔ حضرت پیر صاحبؒ کے ساتھ پھر بہت ہی زیادہ قلبی و روحانی تعلق قائم ہوا اور وہ مجھ سے خصوصی شفقت کے ساتھ پیش آتے۔

میں ابھی میٹرک ہی میں پڑھتا تھا کہ میرے ماموں جان کے پاس حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب کے رسالہ ماہنامہ 'ضیائے حرم' کی ایجنسی تھی۔ اس رسالے میں پیر صاحب کا مستقل اداریہ 'سر دلبراں' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا جو میں مستقل پڑھتا۔ آج بھی اگر آپ 'ضیائے حرم' کے پرانے شمارے دیکھیں تو آپ حیران ہو جائیں گے کہ پیر صاحب کا قلم کس قدر متاثر کن تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں لکھنے کا کیا کمال ملکہ عطا فرمایا تھا۔ اتنی خوبصورت علمی و ادبی تحریر کہ جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس میں آغا شورش کاشمیری اور ابوالکلام آزاد کے طرزِ تحریر کی جھلک نظر آتی تھی۔ پیر صاحب کا مضمون 'سر دلبراں' پڑھتے ہوئے قاری کو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی خطابت کے زمزمے بہتے محسوس ہوتے ہیں۔ پیر صاحبؒ کا یہ اداریہ بہت مقبول تھا، اس میں وہ مختلف سیاسی و مذہبی حالات کی پیش گوئی کرتے اور حالات کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ تجزیہ کرتے تھے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ پیر صاحب اپنے اداریوں میں حالات کے متعلق جو بھی پیش گوئی فرماتے تھے وہ تقریباً پوری ہوتی تھی۔ انہوں نے 1974ء کی تحریک ختم نبوت میں جو تاریخ ساز اداریے لکھے وہ بڑے کمال کی چیز ہیں۔ اسی طرح اگر آپ پیر صاحب کی تفسیر قرآن 'ضیاء القرآن' دیکھیں تو قاری ان کے قلم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جب میں تقریروں کی طرف آیا اور پیر صاحب کے مضامین سے خط کشیدہ جملے استعمال کرتا تو بہت لطف آتا۔ یہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تفسیر ایک ادبی شہ پارہ ہے۔

یہاں ایک اور دلچسپ بات بتا تا چلوں کہ دو سال قبل (2017ء میں) میری ایک کتاب شوگر کے موضوع پر شائع ہوئی۔ چونکہ میں خود شوگر کا مریض ہوں تو میں نے ضروری سمجھا کہ اس موضوع پر مستند تحریریں اکٹھی کر کے شائع کی جائیں۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے آج سے کوئی 35 سال پہلے 'ضیائے حرم' کے ایک مضمون میں چینی کے بارے میں ایک مضمون ''میٹھا زہر'' پڑھا تھا۔ میرے اندر خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس مضمون کو اس کتاب میں شامل کروں چنانچہ میں پنجاب پبلک لائبریری گیا اور وہاں سے 'ضیائے حرم' کی پرانی فائلیں نکلوائیں، وہ مضمون تلاش کر کے اپنی کتاب میں شامل کیا۔ (میری معلومات کے مطابق یہ پہلا ایسا مضمون تھا جس میں لکھا گیا تھا کہ چینی ایک میٹھا زہر ہے اور اس سے بچنا چاہیے)۔ اس مضمون میں لکھا تھا کہ 100 من چینی کا رنگ سفید کرنے کے لیے ایک من یوریا کھاد استعمال کی جاتی ہے۔ کیونکہ چینی گنے (شوگر کین) سے بنتی ہے اور اس کا اپنا رنگ تو سفید نہیں ہوتا تو اسے یوریا کھاد کے ذریعے سفید کیا جاتا ہے۔ اب اس میٹھے زہر کے متعلق آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کس قدر خطرناک ہے!

آپ اچھا تبھی لکھ سکتے ہیں جب آپ کے پاس مستند مطالعہ ہو اور آپ کے پاس وافر معلومات ہوں۔ یہ چیز شروع ہی سے میرے ذہن میں بیٹھ گئی تھی اور اسی لیے میں ناولوں اور افسانوں سے بدک گیا تھا۔ میں سکول کے تقریری اور مضمون نویسی کے مقابلوں میں خوب حصہ لیتا تھا۔ بعد میں جب میں کالج اور یونیورسٹی میں پہنچا تو یہ شوق مزید بڑھ گیا۔ مجھے جب بھی ان مقابلوں میں کتابیں تحفے اور انعام کے طور پر ملتیں تو میں بہت زیادہ خوش ہوتا۔ میرا یہ کتابیں جمع کرنے اور انہیں پڑھنے کا شوق اس قدر بڑھا کہ اب میرے پاس کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔

میرے کتابیں جمع کرنے کے شوق کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہمارے ہاں شادی کے موقع پر لوگ دولہا اور دلہن کو سلامی دیتے ہیں اور ایک لفافے میں کچھ رقم بند کر کے انہیں پیش کرتے ہیں لیکن 1989ء میں میری شادی ہوئی تو مجھے سلامیوں میں نقد رقم بہت کم ملی اور زیادہ کتابیں ہی ملیں کیونکہ دوستوں کو معلوم تھا کہ اسے کتابوں کا بے حد شوق ہے۔ میرے جو رشتہ دار تھے انہوں نے تو مجھے پیسوں کی صورت میں سلامی دی لیکن میرے جو ختم نبوت کے حوالے سے یا دیگر لٹریری ذوق کے احباب تھے ان کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

طرف سے مجھے زیادہ تر کتابیں ہی ملیں۔نعیم صدیقی صاحب کی سیرت کی کتاب محسنِ انسانیتؐ، ضیاء القرآن، معارف القرآن کے مکمل سیٹ سلامی کے طور پر ملے جو ابھی تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ یہاں ایک اور دلچسپ بات یاد آ گئی کہ سہاگ رات کو سارے گفٹ میرے کمرے میں پہنچا دیے گئے تو میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ میں ذرا اپنے گفٹ چیک کرلوں، جب میں نے اپنے تحفے جو خوبصورت پیکٹوں میں بند تھے کھولنا شروع کیے تو ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نکلنے لگیں۔ میری اہلیہ پوچھنے لگیں کہ یہ کیا ہے؟ میں نے انہیں مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ یہ آپ کی ''سوکنیں'' ہیں۔ان کو بھی مجھے بہت وقت دینا ہے۔

یہاں ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میری ایک کتاب کا عنوان ہے غدار پاکستان۔ یہ 1998ء میں چھپی اور بہت مقبول ہوئی۔ میں اس کتاب کا دیباچہ لکھوانے کے لیے معروف کالم نگار عبد القادر حسن کے پاس گیا، یہ اس وقت گلبرگ میں رہتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ انہوں نے پہلے پہل تو مجھے کوئی اہمیت نہ دی اور دیباچہ لکھنے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ مجھے ان کی باڈی لینگوئج سے معلوم ہوا کہ وہ تھوڑا سا ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ میں نے ان کا موڈ آف دیکھا تو انہیں کہا کہ میری ایک بات سن لیں اس کے بعد فیصلہ کیجیے گا کہ میں آپ کے پاس کیوں آیا تو انہوں نے کہا بتاؤ کیا بات ہے۔ میں نے کہا کہ کیا سہاگ رات کو انسان کو کوئی ہوش ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ اس وقت تو واقعی کوئی ہوش ہی نہیں ہوتا اور اسے یہی فکر ہوتی ہے کہ میں بس اپنی شریک حیات کے ساتھ نئی زندگی کے سفر کے متعلق بہت سی باتیں کروں۔ میں نے انہیں کہا کہ جب مجھے شادی کے تحفوں میں بہت سی کتابیں ملیں تو ان میں ایک آپ کی کتاب ''غیر سیاسی باتیں'' بھی تھی جو آپ کے کالموں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب مجھے سینئر صحافی صابر شاکر جو آج کل اے آر وائی نیوز چینل میں ہوتے ہیں انہوں نے گفٹ کی تھی۔ میں نے ساری کتابیں کھول کھول کر رکھ دیں لیکن آپ کی واحد کتاب تھی جو میں نے اپنے ہاتھ میں لی اور اس کے دو مکمل صفحے پڑھ ڈالے۔ اس پر عبد القادر حسن مجھے کہنے لگے کہ آپ مجھے ''مکھن'' نہ لگائیں اور اتنی لمبی لمبی نہ چھوڑیں۔ میں ویسے ہی آپ کی کتاب کا دیباچہ لکھ دیتا ہوں۔

میں نے کہا آپ لکھیں یا نہ لکھیں لیکن میری بات سن لیں کہ میں آپ کو کس قدر شوق سے پڑھتا ہوں۔اس پر انہوں نے ایک سوال داغ دیا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ آپ نے اس دن کیا پڑھا تھا؟ میں نے کہا آپ نے ملکہ ترنم نور جہاں کا انٹرویو کیا تھا اور آپ نے اسی کے متعلق کالم لکھا تھا۔آپ نے اس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کالم میں لکھا تھا کہ میڈم آپ یہ بتائیں کہ آپ نے آج تک کتنے گانے گائے؟ تو میڈم نے آپ کو کیا جواب دیا وہ آپ کے اپنے کالم اور کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ میڈم نے کہا کہ قادر بھائی!'' گانوں اور گناہوں کا کوئی حساب نہیں''۔ میرا یہ جواب سنا تھا کہ عبدالقادر حسن اپنی نشست سے اچھل پڑے اور اس قدر زیادہ خوش ہوئے کہ انہوں نے اسی وقت اپنی بیگم رفعت صاحبہ کو بلایا اور کہا کہ ادھر آؤ اور دیکھو کہ ہمارے چاہنے والے کس طرح کے ہیں۔ یہ دیکھوان صاحب نے سہاگ رات کو میری کتاب پڑھی اور مجھے اقتباس بھی سنا ڈالا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے بڑی پر تکلف چائے پلائی اور پھر انہوں نے میری کتاب پر بہت خوبصورت دیباچہ بھی لکھا۔ اس کے بعد سے پھر عبدالقادر حسن صاحب سے بہت زیادہ تعلق قائم ہو گیا۔

ہمارے ایک عزیز حکیم نور محمد چوہان تھے جو داتا دربارؒ کے قریب پیر مکی کے قریب رہتے تھے۔ وہ ایک مزاحیہ رسالہ ''قہقہہ'' نکالتے تھے۔ میں اس میں بھی اپنی ہلکی پھلکی تحریریں بھیجا کرتا۔ ایک زمانے میں مَیں نے ایک مزاحیہ تحریر ''لوٹا'' کے عنوان سے بھیجی جو شائع ہوئی اور مجھے بہت حوصلہ افزائی ملی۔ دیکھیں کہ یہ بظاہر تو آج ایک معمولی سی بات محسوس ہوتی ہے لیکن درحقیقت انسان کی بنیادوں میں یہی چیز ہوتی ہے جو اسے آگے لے کر جاتی ہے اور میں جو آج الحمدللہ ایک سو کے قریب کتابیں اور کتابچے تصنیف و تالیف کر چکا ہوں تو میری بنیادوں میں یہی چھوٹی چھوٹی تحریروں کا ذوق تھا۔ پھر جب میں سنجیدہ اور تحقیقی مضامین کی طرف آیا تو میں نے اپنے مطالعہ کو بھی بہت بڑھایا۔ جس وقت میں ایم اے اسلامیات کر رہا تھا تو میں نے ایک تحریر ''مباہلہ'' کے عنوان سے لکھی تھی۔ یہ مضمون بعد میں مَیں نے اپنی کتاب ''عیسائیت کے تعاقب میں'' میں شامل کیا۔ یہ مضمون مَیں نے بڑی تحقیق کے بعد علمی انداز میں لکھا۔ بعض دوست پوچھتے ہیں کہ میں تحفظ ختم نبوت کے محاذ پر کب آیا۔ یوں تو میں اس وقت ہی ختم نبوت کے محاذ پر سرگرم ہو گیا تھا جب 1974ء میں تحریک ختم نبوت چلی اس وقت میری عمر صرف 14 برس تھی لیکن میں نے تحریک ختم نبوت کے جلوسوں میں شرکت کی تھی۔ بس وہ دن اور آج کا دن ہے کہ میں الحمدللہ اسی مشن پر لگا ہوا ہوں اور اپنی شفاعت اسی میں سمجھتا ہوں۔ میں نے اپنے اللہ سے عہد کر رکھا ہے کہ مجھے ہر قسم کے مسلکی تعصب سے محفوظ فرمائے اور مجھ سے صرف تحفظ ختم نبوت کے لیے کام لے۔

1984ء کا واقعہ ہے کہ ایک دن میں لاہور سے ننکانہ صاحب جانے کے لیے گاڑی پر سوار

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوا تو مجھے کسی صاحب نے ایک چار صفحاتی پمفلٹ دیا جو قادیانیوں کے عقائد کے متعلق تھا۔ میں نے ابھی تک قادیانیوں کے لٹریچر کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا تھا اور مجھے بس اتنا ہی معلوم تھا کہ قادیانی ختم نبوت کے منکر ہیں اور وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی مانتے ہیں، مجھے ان کے عقائد اور عزائم کا گہرائی کے ساتھ علم نہیں تھا۔ میں نے یہ کتابچہ پڑھنا شروع کیا تو اس میں مرزا قادیانی اور ان کے پیروکاروں کی جانب سے انبیاء کرام، امہات المومنینؓ، اہل بیتؓ، صحابہؓ اور اولیاء اللہ کی صریح توہین کی گئی تھی۔ مکہ اور مدینہ اور قرآن کی بھی توہین کی گئی تھی۔ ایک جگہ پر پہنچ کر تو میں ششدر ہی رہ گیا جب میں نے خاتون جنت، سیدۃ النساء حضرت فاطمہؓ کی شان میں بہت زیادہ توہین دیکھی۔ ان کے متعلق ایسے توہین آمیز جملے تھے کہ میں رُک گیا اور حالت غیر ہوگئی اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ اس زمانے میں لاہور سے ننکانہ تک ڈھائی گھنٹے کا سفر ہوتا تھا لیکن میں اس قدر سوچوں میں گم تھا کہ مجھے کچھ پتہ نہیں چلا کہ کب ننکانہ آیا اور گاڑی رک گئی۔ اس کتابچے نے مجھ پر بہت گہرا اثر کیا تھا۔ میں رات بھر سوچتا رہا کہ ایسا کون بدبخت ہے جس کو سیدۃ النساءؓ کے ساتھ اس قدر دشمنی ہے کہ وہ اس حد تک بکواس کرتا ہے۔ یہ تو کھلم کھلا توہین ہے ایسا تو نہیں ہونا چاہیے۔ اس کتابچے میں مرزا قادیانی کی جس کتاب کا حوالہ دیا گیا اس کا نام تھا ''ایک غلطی کا ازالہ''۔

اگلی صبح فجر کی نماز کے بعد میں نے اپنی مسجد کے مولانا سے پوچھا کہ قادیانیوں کے متعلق مجھے تفصیل سے بتائیے کہ یہ کون ہوتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے ان کے متعلق کچھ علم نہیں، بس علماء سے یہی سنا ہے کہ وہ ختم نبوت کے منکر ہیں۔ پھر میں شہر میں کئی لوگوں سے ملا اور ان سے پوچھا تو انہوں نے بھی مرزا قادیانی کے متعلق اظہار لاعلمی کیا۔ میں لوگوں سے یہ بھی پوچھتا رہا کہ کیا قادیانیوں کے خلاف پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ یا دفتر کام کر رہا ہے جہاں پر جا کر مزید معلومات حاصل کی جا سکیں کیونکہ اس وقت معلومات تک رسائی بہت مشکل تھی۔ آج کل تو تقریباً ہر قسم کی اہم معلومات ہمیں انٹرنیٹ پر صرف ایک کلک سے مل جاتی ہے لیکن اس وقت ایسا نہیں تھا۔

جب میں ختم نبوت جماعت میں شامل ہوا تو ہم چونکہ کالج اور یونیورسٹی کے لوگ تھے اور کسی دینی مدرسے میں نہیں پڑھے تھے تو میں نے اس موضوع پر کتب کا مطالعہ اور نامور علمائے کرام اور علمی شخصیات سے استفادہ کرنا شروع کیا۔ میں نے قادیانیت کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے علماء کی کتابیں پڑھیں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تو بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ میں نے براہ راست بھی مشاہیر اور اکابر سے با قاعدہ سبق پڑھے۔ مولانا یوسف لدھیانوی بڑے زبردست انداز میں ہمیں پڑھاتے تھے۔ اس کے بعد میں نے اس بات کا گہرا مشاہدہ کیا کہ قادیانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے لٹریچر سے سادہ لوح مسلمانوں کا فریب میں آنا ہمارے لیے بہت زیادہ فکر کا باعث تھا۔ میں نے قادیانیوں اور پھر سادہ لوح مسلمانوں اور عام دنیادار طبقے کی نفسیات کو پرکھا اور پھر دیکھا کہ یہاں پر کس طرح کے لٹریچر کی ضرورت ہے۔ پھر ہم نے اپنی جماعت کی توجہ اس جانب مبذول کروائی کہ عام شہریوں، سکول و کالجز اور دفاتر میں کام کرنے والے لوگوں کے لیے ردِ قادیانیت پر اس طرح کا لٹریچر ہونا چاہیے کہ انہیں عقلی دلائل کے ساتھ بات سمجھائی جائے کیونکہ علمائے کرام اور دینی مدارس میں پڑھنے والے طلبہ تو قادیانی مسئلہ سمجھ چکے تھے اور جو عام طور پر علماء کی کتابیں تھیں ان سے بھی دینی مدارس یا دیگر مذہبی طبقہ ہی استفادہ کر سکتا تھا، کیونکہ ان کتابوں میں گنجلک بحثیں موجود تھیں۔ جبکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ عام مسلمانوں کو قادیانی مذہب کی ہولناکی سے آگاہ کرنے کے لیے سادہ انداز میں بات سمجھائی جائے۔ چنانچہ میں نے قادیانی مسئلہ کو عوامی انداز میں سمجھانے کے لیے تصنیف و تحقیق کا کام شروع کیا۔

اسی دور میں مَیں نے ایک کتاب ''ثبوت حاضر ہیں'' مرتب کی جو پوری دنیا میں پڑھی گئی اور اللہ کے خاص فضل و کرم سے مجھے اس سے بہت عزت ملی۔ مولانا عبدالرحیم اشعرؒ، مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور دیگر تمام بزرگ بتاتے تھے کہ جب ہم کسی قادیانی سے مناظرہ کرنے کے لئے جاتے ہیں تو ہم تین تین صندوقوں میں کتابیں لے کر جاتے ہیں، ان میں زیادہ تر کتابیں قادیانیوں کی ہوتی ہیں۔ ہم ایک کتاب تلاش کر کے صفحہ دکھاتے ہیں اور پھر دوسری کتاب سے کوئی حوالہ تلاش کرتے ہیں تو اس سے ہمیں بڑی دقت ہوتی ہے۔ یہ کتابیں ایسی تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی گم ہو جائے تو وہ دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے کیونکہ قادیانیوں کی جو بہت متنازع کتابیں ہیں انہیں تلاش کرنا بھی بہت مشکل ہے۔

ان حالات میں میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا کہ قادیانی جماعت کے بانی آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک سو کے قریب کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے بیٹوں کی بھی بہت سی کتابیں ہیں۔ کیوں نہ ہر کتاب سے دو دو یا پانچ پانچ صفحات جو بہت زیادہ متنازع ہیں ان کو سکین کروا کر ایک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

الگ کتاب میں سمو دیا جائے، یوں ہم اپنا موقف بہت آسان انداز سے مسلمان بھائیوں تک پہنچا سکتے ہیں اور عام قادیانیوں کو بھی دعوت فکر دے سکتے ہیں۔ میں نے ان متنازع صفحات کی کمپوزنگ کروائی۔ اس کے بعد نیچے حوالہ جات دیے اور اگلے صفحہ پر اس کتاب کے اصل صفحے کا عکس دے دیا۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کو یا کسی بھی صاحبِ علم کو قادیانیوں سے مباحثہ کرتے وقت سینکڑوں کتابیں اٹھانے کی ضرورت نہ رہی اور وہ صرف کتاب ''ثبوت حاضر ہیں'' کو پیش نظر رکھ کر قادیانیوں سے بات کر سکتے تھے۔ یہ کتاب دنیا بھر میں بے حد مقبول ہوئی۔ ''ثبوت حاضر ہیں'' چار جلدوں پر مشتمل ہے: پہلی جلد 1072، دوسری 912، تیسری 1056 اور چوتھی 1250 صفحات پر مشتمل ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک قادیانی سے کہتے ہیں کہ مرزا قادیانی نے سیدہ کائنات حضرت فاطمہؓ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ قادیانی کہتا ہے کہ یہ تو ہماری کتاب میں نہیں ہے تو اس قادیانی کو ''ثبوت حاضر ہیں'' کتاب سے مرزا قادیانی کی متنازع عبارت کا اصل عکس دکھایا جا سکتا ہے۔ میں نے اس کتاب کے شروع میں ایک کھلا چیلنج لکھا ہے کہ میں نے جو عکس دیے ہیں اگر یہ جعلی ہوں اور ان میں کسی قسم کا ردوبدل کیا گیا ہو، یا میں نے کسی میں کوئی ترمیم یا اضافہ کیا ہو۔ قادیانی مجھے جو بھی سزا دینا چاہیں، وہ سفید کاغذ پر لکھ دیں مجھے منظور ہے۔ اگر یہ عکس بالکل ٹھیک ہیں اور واقعی یہ ٹھیک ہیں تو پھر آپ سے میری گزارش ہے کہ اسلام کی آغوش میں آ جائیں اور مرزائیت کو چھوڑ دیں۔ آج میں ان یادداشتوں کو بیان کر رہا ہوں تو ایک بار پھر ''قومی ڈائجسٹ'' کی وساطت سے اسی چیلنج کو دہراتا ہوں۔

اسی طرح میرا ایک اور چیلنج ہے جو پندرہ برس قبل میں نے اپنی ایک ویڈیو کے ذریعے انٹرنیٹ پر دیا تھا۔ یہ ویڈیو آج بھی انٹرنیٹ، سوشل میڈیا پر موجود ہے لیکن مجھے اس چیلنج کے جواب میں قادیانی ای میلز کرتے ہیں، میسج کرتے ہیں جن میں مجھے صرف اور صرف گالیاں دیتے ہیں اور مباحثے کی طرف نہیں آتے۔ میں کہتا ہوں کہ گالی تو وہی دیتا ہے جس کے پاس دلیل نہیں ہوتی۔ قادیانی آج تک مجھے اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکے۔ چیلنج یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی 100 کے قریب کتب ہیں۔ اس کی 83 مکمل کتابیں جو 23 جلدوں میں ''روحانی خزائن'' کے عنوان سے اکٹھی کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ 10 کتابیں ''ملفوظات'' کے نام سے ہیں۔ تین کتابیں ''مجموعہ اشتہارات''، تین کتابیں ''مکتوبات'' ہیں اس کے علاوہ ایک کتاب ''تذکرہ'' ہے۔ یہ تذکرہ وہ کتاب ہے جو درحقیقت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

قادیانیوں کا اپنا قرآن ہے۔ میرا چیلنج یہ ہے کہ کسی بھی قادیانی نے مرزا قادیانی کی تمام کتابیں نہیں پڑھیں۔ اگر وہ خود اس کی کتب بغور پڑھ لیں اور اللہ تعالیٰ سے ہدایت کے طلب گار ہوں تو وہ کتابیں پڑھتے ہی قادیانیت سے تائب ہو جائیں گے۔

ایک مرتبہ ایک قادیانی مجھ سے بات کرنے آیا اور کہنے لگا کہ ہم کافر کس طرح ہیں؟ میں اس سے کہتا ہوں کہ مرزا نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ ہماری کتاب میں تو ایسا نہیں ہے۔ میں نے اس مربی سے پوچھا کہ آپ نے مرزا کی کتنی کتابیں پڑھی ہیں تو اس کا جواب تھا کہ صرف چار پڑھی ہیں تو میں نے کہا کہ باقی 96 کتابیں کس نے پڑھنی ہیں۔ مجھے آج تک ایسا قادیانی نہیں ملا جس نے اپنے مرزا کی تمام کتابیں پڑھ رکھی ہوں۔ دراصل مطالعہ کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ یہ مشکل کام اس لیے کہ چونکہ مرزا کی کتابوں کے ہر ہر صفحے پر کسی نہ کسی مقدس شخصیت کی توہین موجود ہے اس توہین کو پڑھنا بھی بہت مشکل کام ہے اور ہمارے ذوق کے بالکل برعکس ہے لیکن قادیانیوں کو تو یہ کتابیں پڑھنی چاہئیں اور انہیں اپنے لٹریچر کا تو علم ہونا چاہیے۔

میرے گزشتہ 35 سال کے عرصہ میں قادیانی مربیوں اور نوجوانوں کے ساتھ بہت سے مباحثے اور مناظرے ہوئے جن میں اللہ کی خصوصی توفیق اور فضل سے بہت سے قادیانی مسلمان بھی ہوئے۔ ایک مناظرے کے دوران مجھے قادیانی کہنے لگا کہ ''ہم قرآن مجید کے علاوہ کسی بھی موضوع پر بات نہیں کریں گے''۔ یہ دراصل ان کا ایک نفسیاتی حربہ ہے جس سے عام مسلمان تو گھبرا کر پھنس جاتا ہے۔ قادیانی جب بھی مناظرہ اور بحث کرتے ہیں تو وہ یہ بات ضرور کرتے ہیں۔

لیکن جب مجھے قادیانی نے یہی بات کہی تو میں نے جواب دیا کہ مجھے آپ کی بات منظور ہے لیکن یہ وضاحت کیجیے کہ ''کون سا قرآن؟ آپ کا یا ہمارا؟'' میرا جواب سن کر قادیانی مربی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کہنے لگا میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ میں نے کہا کہ دیکھو! ایک قرآن آپ کا ہے اور دوسرا ہمارا ہے۔ اب مجھے بتایئے کہ کس سے باہر نہیں نکلنا۔ قادیانی مربی کہنے لگا کہ نہیں قرآن تو ہمارا اور آپ کا ایک ہی ہے۔ میں نے کہا کہ مرزا قادیانی اور اس کی جماعت کا عقیدہ ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے اٹھا لیا تھا اور اس کے بعد قرآن مرزا غلام احمد قادیانی پر دوبارہ نازل ہوا۔ (نعوذ باللہ)۔ اب یہ قرآن ''تذکرہ'' کے عنوان سے موجود ہے۔ قادیانی میری بات

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کا انکار کر رہا تھا کہ میں نے اسی دوران ''تذکرہ'' کھولا اور ایک صفحہ اس کے سامنے کر دیا اور کہا کہ یہ لو اور مرزا کی عبارت پڑھو: ''انا انزلہ قریباً من القادیان'' (اے مرزا قادیانی ہم نے قرآن کو قادیان کے قریب نازل کیا)۔

اب مجھے آپ بتاؤ کہ آپ کا اور ہمارا قرآن مختلف ہے یا نہیں ہے؟ تو پھر بحث کون سے قرآن سے کرنی ہے؟ آپ کس طرح کہتے ہو کہ ایک ہی قرآن ہے؟ کیونکہ ایسی باتیں ہمارے قرآن میں تو نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں تو ''انا انزلناہ فی لیلۃ القدر'' ہے۔ میں نے ''تذکرہ'' کا ایک اور صفحہ نکالا اور اسے بتایا کہ آپ کا پیشوا مرزا قادیانی کہتا ہے کہ تین شہروں کا نام قرآن مجید میں بڑی عزت کے ساتھ لیا گیا ہے۔ مکہ، مدینہ اور قادیان۔ میں نے جواب دیا کہ ہمارا جو قرآن کریم ہے جو خاتم النبیین حضرت محمد عربی ﷺ پر نازل ہوا اس میں تو الحمد سے لے کر والناس تک' کہیں بھی 'قادیان' کا لفظ نہیں ہے۔ اگر آپ کسی لفظ کی 'تاویل' بھی کرنا چاہیں تو بھی 'قادیان' لفظ آپ کو نہیں ملے گا۔ یہاں میں اپنے قارئین کو مختصر طور پر بتاتا چلوں کہ قرآن کے مختلف نام ہیں اور اس کا ایک نام ''تذکرہ'' بھی ہے۔ قادیانیوں نے جو اپنے مرزا قادیانی کے اوپر نام نہاد وحی نازل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس میں انہوں نے ہمارے قرآن پاک ہی سے کوئی 80 فیصد کے قریب آیات لے لی ہیں۔ مثلاً نبی کریم ﷺ پر ایک وحی اتری ہے "وما ارسلنک الا رحمتہ للعلمین". اب قادیانی اس سے مراد (نعوذ باللہ) مرزا قادیانی کو لیتے ہیں۔ اب مجھے بتائیے کہ اگر کسی مسلمان کا گہرا مطالعہ نہیں ہوگا تو وہ قادیانیوں کو لاجواب کیسے کر پائے گا؟ اسی طرح ''انا اعطینک الکوثر'' ہے۔ یٰسین، والضحیٰ، وما اعطلم الرسولُ۔ یاایہاالذین آمنو لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی۔ یہ ساری آیات انہوں نے مرزا قادیانی کے ساتھ منسوب کر رکھی ہیں۔ یوں میں نے یہ مناظرہ شروع ہونے سے پہلے جیت لیا اور قادیانی بھاگ گئے۔

ایک المیہ یہ ہے کہ جب قادیانی کسی بحث میں یہ کہتے ہیں کہ بات صرف قرآن سے ہوگی تو دوسری طرف ہوتا یہ ہے کہ ہم لوگوں کا سطحی مطالعہ ہوتا ہے۔ ہم قرآن کریم کو پوری طرح سے نہایت گہرائی کے ساتھ تفسیر کے ساتھ نہیں پڑھتے اور اس کے ساتھ ہم قادیانیوں کے مکمل لٹریچر کو بھی نہیں پڑھتے۔ اس لیے علمائے کرام کہتے ہیں کہ ہر شخص کو قادیانیوں کے ساتھ بحث اور مناظرہ نہیں کرنا چاہیے اور صرف وہی شخص بات کرے جس کا ہر لحاظ سے مطالعہ وسیع ہو اور اس کی اپنی اور قادیانیوں کی پوری

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کتابوں پر نظر ہو۔ کیونکہ اگر آپ کے پاس معلومات کی کمی ہوگی اور قادیانیوں اور اپنی کتب کا گہرا مطالعہ نہیں ہوگا تو آپ قادیانیوں کے چکمہ میں آ سکتے ہیں۔ اس کی علماء ایک مثال یوں بھی دیتے ہیں کہ اگر سانپ پکڑنا ہو تو وہ صرف سپیرے کا ہی کام ہے اور یہ ایک باقاعدہ فن ہے ہر بندہ سانپ نہیں پکڑ سکتا۔ قادیانیوں کے ساتھ مناظرہ کرنے کے لیے بھی ایک فن درکار ہے۔

الحمدللہ میں نے یہ فن اپنے علمائے کرام اور مشاہیر سے سیکھا اور اللہ کے فضل سے میری 35 سالہ تحریکی زندگی میں جب بھی قادیانیوں کے ساتھ بحث ہوئی تو مجھے اللہ نے ہمیشہ سرخرو فرمایا۔ وہ فن یہ ہے کہ ردِ مرزائیت پر آپ کے پاس دلائل اور گہرا مطالعہ ہونا چاہیے۔ میرا قادیانیوں کے ساتھ سب سے پہلا مناظرہ کھرڑیانوالہ ضلع فیصل آباد کے ایک گاؤں رُڑکا میں ہوا تھا۔ یقین مانیں کہ وہ قادیانی مربی میرے سوالوں کے جواب نہ دے سکا۔ میں نے اسے اس کی اپنی کتابوں کے جال میں پھنسایا اور وہ چند سوالوں کے بعد ہی گھبرا اٹھا۔ ہاں ایک بات میں یہاں پر بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ الحمدللہ میں اس مباحثہ میں تو کامیاب رہا لیکن جب میں نے قادیانیوں کی کتابوں کے حوالے پیش کیے تو مربی کہنے لگا کیا آپ نے خود ہماری کتابیں پڑھی ہیں تو میں نے جواب دیا کہ میں نے براہِ راست مرزا کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ تو اس پر مجھے تھوڑی سی شرمندگی ہوئی تھی، حالانکہ جس کتاب کا حوالہ میں نے دیا تھا وہ بالکل درست تھا لیکن چونکہ میں نے خود براہِ راست قادیانی کتب کا مطالعہ نہیں کیا تھا تو مجھے شرمندہ ہونا پڑا۔ اس کے بعد میں نے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا کہ میں تمام قادیانی کتابوں اور ان کے اصل ماخذ کا نہایت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کروں گا اور جب بھی قادیانیوں سے بات چیت ہوگی میں براہِ راست ان کی کتابوں کا حوالہ دوں گا، چنانچہ میں نے اپنے مطالعہ کا دائرہ بے حد وسیع کر دیا اور آج تو حالت یہ ہے کہ تمام قادیانی کتابوں اور رسائل کو نہایت عمیق نظر سے پڑھ چکا ہوں۔

پورے لاہور میں جتنے بھی اولڈ بک سیلرز ہیں، میں ان سے رابطے میں رہتا ہوں، وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ آج بھی جب ان کے پاس کوئی قادیانیوں کی پرانی کتاب آتی ہے تو وہ میرے لیے رکھ لیتے ہیں۔ اصل میں قادیانیت انگریزوں کا خودکاشتہ پودا ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز جہاد فی سبیل اللہ سے بہت خائف تھا تو اس نے مسلمانوں کے دلوں میں جہاد کے خلاف نفرت ڈالنے کے لیے اس فتنے کو کھڑا کیا تھا۔ اس کا تسلسل آج تک چلا آ رہا ہے اور موجودہ امریکی صدر ٹرمپ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تک سبھی اس فتنے کی سرپرستی کرتے آئے ہیں۔ کیونکہ عالم کفر بالخصوص یہودیوں اور عیسائیوں کو خوب معلوم ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ اسلامی تعلیمات کا ایک اہم ترین ستون ہے اگر یہ ستون کمزور کر دیا جائے تو کافی حد تک مسلمانوں پر غلبہ پایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ جہاد کا نام لیتے ہیں تو لوگ آپ کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

1857ء کے بعد انگریز بہت پریشان تھا کہ جہاد سے ہماری جان کیسے چھوٹ سکتی ہے۔ انہوں نے بڑی کوششیں کیں۔ کبھی سوچا کہ قرآن پاک کے تمام نسخہ جات سمندر برد کر دیئے جائیں، جان گلیڈسٹون کے زمانے میں پارلیمنٹ میں اس پر بحث ہوئی تو وہاں پر ایک بوڑھے پارلیمنٹرین نے کہا کہ دیکھیں آپ پوری دنیا سے قرآن پاک اکھٹے کر کے سمندر برد تو کر دیں لیکن قرآن مجید تو پھر بھی ختم نہیں ہوگا، کیونکہ دنیا بھر میں کروڑوں مسلمان حفاظ کرام کے دلوں میں قرآن پورے کا پورا موجود ہے۔ (مثال کے طور پر دیکھیں کہ روس کی ریاستوں میں تو پرنٹ قرآن مجید پر طویل عرصہ تک پابندی رہی لیکن وہاں پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت حفاظ کرام کے ذریعے سے کی۔ پاکستان سے جو بھی لوگ ماسکو اور دیگر روسی شہروں میں جاتے تھے تو وہ بتاتے تھے کہ وہاں پر حفاظ کرام کی کوئی کمی نہیں۔

اس کے بعد انگریزوں کو بخاری اور مسلم کی ایک حدیث ملی۔ وہ طویل حدیث میں یہاں پر مختصر طور پر بیان کرتا ہوں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قربِ قیامت حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ نے انہیں عزت دی اور انہیں آسمان پر اٹھا لیا۔ تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق حضور نبی کریم ﷺ نے نشانیاں بیان فرمائیں اور روٹ بھی بیان فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کب تشریف لائیں گے اور کس راستے سے آئیں گے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ دمشق کی جامع مسجد میں آئیں گے اور صبح کا وقت ہوگا۔ جب عیسیٰؑ تشریف لائیں گے تو دجال کو قتل کریں گے اور پوری دنیا مسلمان ہو جائے گی۔ جب پوری دنیا مسلمان ہوگی تو پھر جہاد کس کے خلاف کیا جائے گا کیونکہ جہاد تو کفار کے خلاف ہوتا ہے۔ تو فرمایا کہ اس وقت جہاد ختم ہو جائے گا۔ پھر فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کی شادی ہوگی اور بچے پیدا ہوں گے۔ پھر حضرت عیسیٰؑ وفات پا جائیں گے اور گنبد خضریٰ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ دفن ہوں گے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ اب

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بھی حضرت عیسیٰؑ کی جگہ خالی ہے۔

چنانچہ انگریزوں کے تھنک ٹینک نے پروگرام بنایا کہ حضرت عیسیٰؑ کے آنے سے جہاد ختم ہو گا تو کیوں نہ ہم ایک ایسا بندہ تیار کریں جو یہ کہے کہ میں حضرت عیسیٰؑ ہوں (نعوذ باللہ) اور میرے آنے سے جہاد ختم ہو چکا ہے۔ اب انگریز نے برصغیر میں موجود اپنے ڈپٹی کمشنروں کی ڈیوٹیاں لگائیں کہ وہ اس کام کے لیے کوئی بندہ تلاش کریں۔ مرزا غلام احمد قادیانی ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی کچہری میں منشی/اہلمد کی نوکری کرتا تھا اور اسے عربی و فارسی سے تھوڑی بہت شدھ بدھ تھی۔ لہٰذا انگریزوں نے اس کا انٹرویو کیا اور اسے منتخب کر لیا گیا۔ لیکن یہاں پر لوگوں نے اس سے سوال کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے تو فرمایا تھا کہ جس نے آنا ہے وہ عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ مرزا غلام احمد قادیانی سے پوچھا گیا کہ آپ کا نام تو مرزا غلام احمد ہے اور جنہوں نے آنا ہے ان کا نام عیسیٰ ہوگا۔ عیسیٰؑ کی والدہ کا نام حضرت مریمؑ ہے جبکہ آپ کی والدہ کا نام چراغ بی بی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ تو بغیر والد کے اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے جبکہ آپ کے والد کا نام غلام مرتضیٰ ہے تو آپ میں تو یہ نشانیاں موجود نہیں ہیں چنانچہ آپ وہ نہیں ہو سکتے۔ اس پر مرزا قادیانی اپنی گمراہی پر ڈٹ گیا اور کہا کہ میں اب آ گیا ہوں، عیسیٰ وفات پا چکے اور اب میرے آنے سے جہاد کا حکم ختم ہو گیا ہے۔ جب انگریز نے اپنا مقصد پورا ہوتا دیکھا تو مرزا قادیانی اور اس کی جماعت کو پروموٹ کرنا شروع کر دیا اور کفار کی یہ سرپرستی آج بھی جاری ہے۔

جب مسلمانوں کی طرف سے مرزا سے پوچھا گیا کہ آپ کس طرح عیسیٰؑ ہیں تو مرزا نے اپنی کتاب ''کشتی نوح'' میں جو انتہائی مضحکہ خیز اور انتہائی Stupid جواب دیا وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے خود (نعوذ باللہ) مجھ سے ''انٹرکورس'' کیا جس سے میں حاملہ ہوا اور دس مہینے کے بعد اور مجھ سے میں پیدا ہو گیا۔ جب ہم قادیانیوں سے یہ بات کرتے ہیں تو وہ اس بات کا انکار کرتے ہیں حالانکہ یہ بات ''کشتی نوح'' نامی کتاب میں موجود ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ میں نے یہ حوالہ دے کر اور ثابت کر کے کئی قادیانیوں کو اللہ کے فضل و کرم سے مسلمان کیا ہے۔ میں اب تک 100 سے زائد قادیانیوں سے مناظرے کر چکا ہوں۔ میرے پاس زیادہ تر Love میرج کے کیس آئے۔ ایک مرتبہ ڈیفنس لاہور کا ایک نوجوان میرے پاس آیا جو ایک لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی بھی رضامند تھی۔ ان کی آپس میں محبت تھی لیکن وہ لڑکی قادیانی تھی اور لڑکے کا کہنا تھا کہ تم پہلے مسلمان ہو جاؤ پھر شادی کریں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گے۔اس پرلڑکی نے کہا آپ مجھے قائل کرلوتو میں قادیانیت سے تائب ہو جاؤں گی۔ یہ کیس میرے پاس آیا۔ جب میں اس لڑکی کے گھر پہنچا تو لڑکی اورلڑکے والوں کی پوری فیملی موجود تھی۔ وہاں پر میں نے نقلی اور عقلی دلائل اس انداز سے پیش کیے کہ اللہ نے اپنے پیارے نبی اکرم ﷺ کی ختم نبوت ﷺ کے صدقے مجھے کامیابی دی۔

لڑکی مجھے کہنے لگی کہ انکل! ہمارا اور آپ کا بس اتنا اختلاف ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ حضرت مہدی نے آنا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ وہ مرزا کی صورت میں آ گئے ہیں۔ میں نے کہا فرض کریں کہ میں آپ کو کہتا ہوں کہ جو حضرت مہدی آنے ہیں وہ میں ہوں۔ آپ مجھے کیوں نہیں مانیں گی؟ آپ مجھے کن دلائل کی بنیاد پر مہدی نہیں مانیں گی اور مجھے رد کریں گی؟ وہ لڑکی خاموش ہوگئی۔ کہنے لگی آپ کس طرح مہدی ہو سکتے ہیں؟ میں نے کہا کہ آپ لمز یونیورسٹی کی پڑھی ہوئی ہیں کسی دیہات کی ان پڑھ لڑکی تو ہو نہیں۔ مجھے آپ دلائل دیں کہ آپ مجھے کس طرح سے مسترد کرسکتی ہیں۔ آپ نے جو مرزا کو مہدی تسلیم کیا ہے اور مجھے نہیں کر رہیں تو یہ کس بنیاد پر ہے؟ وہ لڑکی مجھے ایک ہی بات کہتی تھی کہ آپ کس طرح مہدی ہیں؟ میں جواب میں یہی کہتا تھا کہ جس طرح مرزا قادیانی ہے۔ جب میں نے اس کو بحث میں اچھا خاصا الجھایا تو وہ کہنے لگی انکل سوری۔ آپ مجھے اس گنجلک بحث سے نکالیں۔ میں نے کہا کہ بیٹا! دیکھو اگر امام مہدی کا دعویٰ اتنا سستا ہوتا تو ہر شہر اور ہر محلے میں ہی مہدی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ میرے ماں باپ قربان ہوں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر کہ آپؐ نے اس بابت نشانیاں بیان فرمائی ہیں جو کہ تقریباً سو سے زائد ہیں جو امام مہدی کے متعلق ہیں۔ میں نے کہا میں صرف آپ کو تین چار انتہائی بنیادی نشانیاں بتاتا ہوں۔ یہ وہ نشانیاں ہیں جو مجھ میں بھی نہیں ہیں اور مرزا قادیانی میں بھی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر اصل مہدی جو آئیں گے ان کا نام محمد ہوگا۔ مرزا کا نام ہے مرزا غلام احمد میرا نام ہے محمد متین خالد۔ ان کے والد صاحب کا نام ہوگا عبداللہ۔ میرے والد کا نام غلام محمد اور مرزا کے والد کا نام ہے غلام مرتضیٰ۔ تیسری یہ نشانی ہے کہ امام مہدی کی والدہ کا نام آمنہ ہوگا۔ میری والدہ کا نام کریم فاطمہ اور مرزا کی والدہ کا نام چراغ بی بی ہے۔

بہرحال ایک طویل بحث ہوئی اور اللہ کے لاکھ لاکھ فضل وکرم سے اسی مجلس میں وہ لڑکی میرے موقف پر قائل ہوگئی اور اس نے قادیانیت سے پکی توبہ کرلی۔ اسی طرح ایک اور جگہ بھی اسی نوعیت کا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مباحثہ ہوا۔ یہاں بھی لڑکی قادیانی تھی، اس نے اور اس کے گھر والوں نے بھی یہی کہا کہ صرف قرآن مجید سے بات کریں گے۔ تو میں نے اس کا وہی جواب دیا جس کا تفصیلی احوال گزشتہ سطور میں گزر چکا ہے۔ لڑکی سے میں نے بھی پوچھا کہ آپ مرزا قادیانی کو کیا سمجھتی ہیں تو وہ کہنے لگی کہ ہم اسے مہدی سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ دونوں قرآن، ہمارا اور آپ کا خودساختہ قرآن بھی موجود ہے۔ مجھے اس سے حوالہ دکھادیں تو بچی کہنے لگی کہ نہیں یہ حدیث میں ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ آپ نے تو کہا تھا کہ بات صرف قرآن سے ہوگی۔ اب آپ بیچ میں حدیث لے آئی ہیں۔ یوں بہر حال وہ لڑکی ہر بات پر لاجواب ہوئی۔ اصل میں وہ لڑکی ضدی نہیں تھی، وہ واقعی حق کی متلاشی تھی تو اللہ نے اسے ہدایت بھی دی۔ وہ لڑکی میرے موقف پر قائل ہوگئی اور اس نے قادیانیت سے پکی توبہ کر لی۔ اس طرح کے اور بھی واقعات ہیں۔

میری مناظروں میں کوشش ہوتی ہے کہ میں مباحثے کے دوران ''ایگریسو'' نہ ہوں اور انتہائی ٹھنڈے دل سے فریق مخالف کو قائل کرنے کی کوشش کروں۔ میرا یہ گہرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ 95 فیصد قادیانیوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں؟ جب ہم ان کے ساتھ مناظرہ کرتے ہیں اور اپنا موقف پیش کرتے ہیں تو ان کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ میرے زیادہ مناظرے لاہور میں ہوئے ہیں اور کچھ دوسرے شہروں میں بھی ہوئے۔ بعض اوقات میں سکیورٹی کی وجہ سے بھی دوسرے شہروں میں نہیں جاتا اور یہی حکم میرے بزرگوں کا بھی تھا۔ یہاں میں اپنے قارئین کو ایک اور دلچسپ بات بتاؤں کہ گزشتہ 13 صدیوں میں جتنے بھی مجددین آئے ہیں، ان پر ہمارا اور قادیانیوں کا اتفاق ہے۔ ہمارے اور قادیانیوں کے مابین دو انتہائی بنیادی اختلافات ہیں: نمبر: (1) قادیانی کہتے ہیں کہ نبوت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا اور جاری ہے۔ نمبر: (2) حضرت عیسیٰؑ کو زندہ آسمان پر نہیں اٹھایا گیا وہ وفات پا چکے ہیں۔

اب ہم قادیانیوں سے ایک بڑا آسان سا سوال کرتے ہیں جو کہ میں کئی مقامات پر ان سے مباحثوں میں کر چکا ہوں کہ دیکھیں گزشتہ 13 صدیوں کے مجددین پر ہمارا اور آپ کا کوئی اختلاف نہیں تو کیوں نہ ہم یہ دونوں سوالات ان مجددین کے پاس لے جاتے ہیں۔ اب یہاں آ کر قادیانی لاجواب ہوجاتے ہیں اور راہِ فرار اختیار کر جاتے ہیں کیونکہ اگر وہ فی الواقع حق کے متلاشی ہوتے اور 13 صدیوں کے مجددین کا موقف تسلیم کر لیں تو انہیں بات نہایت آسانی سے سمجھ آ سکتی ہے۔

ایک مرتبہ میں نے قادیانی نوجوان سے کہا کہ اذ قال اللہ یا عیسیٰ انی متوفیک ...... کا ترجمہ یہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہے کہ مرزا قادیانی پاگل ہے تو قادیانی کہنے لگا کہ جی یہ تو غلط ترجمہ ہے آپ نے یہ کہاں سے لے لیا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ جس طرح آپ نے یہ ترجمہ لیا ہے کہ حضرت عیسیٰ وفات پا گئے ہیں تو میں نے بھی یہ ترجمہ وہیں سے لیا ہے۔ اس پر وہ لاجواب ہو گیا اور اس سے بات نہ ہو سکی۔ یعنی آپ قادیانیوں کو نقلی سے زیادہ عقلی دلائل دیں گے تو وہ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ دیکھو اب آپ کا اور میرا اس آیت کے ترجمہ پر اختلاف ہو گیا نا؟ تو اب فیصلہ کس نے کرنا ہے؟ جناب! یہ فیصلہ گزشتہ 13 صدیوں کے مجددین نے کرنا ہے۔ اب ہم جب ان مجددین کے پاس جاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ قادیانیوں کا بھی ترجمہ غلط ہے اور متین خالد کا بھی ترجمہ غلط ہے۔ اصل ترجمہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ آسمانوں پر زندہ ہیں اور قربِ قیامت دوبارہ تشریف لائیں گے۔ جس وقت حضور نبی کریم ﷺ کے خاکے (نعوذ باللہ) شائع کیے گئے تو مجھے ردِعیسائیت کا بھی شوق پیدا ہوا۔ میں نے سوچا کہ اگر متعصب عیسائی حضور نبی کریم ﷺ کی کردار کشی کرتے ہیں تو مجھے بھی حق حاصل ہے کہ میں ان کے بڑے بڑے پادریوں کا اصل چہرہ دنیا کو دکھاؤں اور ان پادریوں کا چرچ میں جو غلیظ کردار ہے، اس سے پردہ اٹھاؤں۔ چنانچہ میں نے اس عنوان سے بہت مطالعہ کیا اور دو کتابیں ''عیسائیت کے تعاقب میں'' اور ''پادریوں کے کرتوت'' مرتب کیں۔ آج بھی جب مجیب الرحمٰن شامی صاحب سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ اس کتاب کو یاد کرتے ہیں۔ پادریوں کے کرتوت بڑی زبردست کتاب ہے۔

''پادریوں کے کرتوت'' میں میں نے جتنا بھی تحقیقی مواد لیا وہ عالمی جرائد سے لیا ہے۔ مَیں بی بی سی، سی این این، نیویارک ٹائمز، واشنگٹن ٹائم، ڈیلی مرر، نیوز ویک جیسے مستند عالمی جرائد سے باہر نہیں نکلا۔ میں نے نیوز ویک میں ایک سٹوری پڑھی کہ کیلی فورنیا کے ایک چرچ میں ایک پادری نے تین سال کے لڑکے کے ساتھ بدفعلی کی ہے۔ جب میں نے سٹوری پڑھی تو سمجھا کہ نیوز ویک نے بچے کی عمر 13 سال لکھنے کے بجائے غلطی سے 3 سال لکھ دی ہے تو میں نے نیوز ویک کے ایڈیٹر کو ای میل کی اور لکھا کہ کہیں یہ کمپوزنگ کی غلطی تو نہیں' کیونکہ تین سال تو بہت ہی کم عمر ہے۔ اس پر ایڈیٹر کا جواب آیا کہ نہیں یہ واقعی تین سال عمر ہے۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں میں نے اس کتاب میں کس قدر تحقیق سے کام لیا ہے۔ یہ کتاب 2005ء میں شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ اس پر جے سالک اور لاہور کے دیگر پادریوں نے جنرل پرویز مشرف (جو اس وقت چیف آف آرمی سٹاف اور صدرِ پاکستان تھے)

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے ملاقات کی اور میری یہ کتاب ان کو دکھائی کہ اس سے ہماری دل آزاری ہوئی ہے، لہٰذا اس پر پابندی لگائی جائے۔ اس ملاقات کے فوری بعد میرے خلاف لاہور کے تھانہ سول لائنز میں مقدمہ قائم کر لیا گیا۔ اس پرچے میں مجھ پر دہشت گردی کی دفعات لگائی گئیں اور اس کے ساتھ میری اس کتاب پر پابندی لگا دی گئی۔

اللہ کا کرم یہ ہوا کہ میں ضمانت کے چکر میں تھا کہ قبل از گرفتاری ضمانت کروالوں تو مجھے اس وقت کے ایڈیشنل آئی جی پنجاب کا فون آیا۔ (میں ان کا نام نہیں بتانا چاہتا)۔ وہ کہنے لگے کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کے خلاف دہشت گردی کا پرچہ درج ہوا ہے۔ آپ فوری طور پر میرے دفتر آ کر مجھ سے ملیں۔ یہ مجھے اللہ کی طرف سے ایک غیبی نصرت تھی ورنہ میری تو کوئی سفارش نہیں تھی۔ میں اپنے پبلشر کے ساتھ ان کے آفس گیا تو انہوں نے میری بہت زیادہ عزت افزائی کی اور کہنے لگے کہ آپ نے گھبرانا نہیں ہے۔ آپ ختم نبوت کے محاذ پر بہت زیادہ کام کر رہے ہیں اور اگر میں آپ کی مدد کر دوں تو یہ میرے لیے ایک سعادت ہوگی۔ پھر انہوں نے متعلقہ اے ایس آئی جس کے پاس میری تفتیش تھی کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ متین خالد نے بہت اچھا کام کیا، بالکل غلط پرچہ درج ہوا تو اس پرچے کو خارج کر دیں۔ چنانچہ اسی دن پرچہ خارج ہو گیا۔ یہاں پر ایک لطیفہ بھی سن لیں کہ وہ اے ایس آئی مجھے کہنے لگا کہ جی آپ نے اتنی بڑی سفارش کروائی ہے تو یہ پرچہ آپ کا ختم کر دیتا ہوں۔ آپ بس ایسا کریں کہ مجھے کچھ نہ کچھ "خرچہ" دے دیں۔ یوں میں نے اسے کچھ چائے پانی پیش کر دیا۔ مجھ پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے اور بہت سے پرچے بھی درج ہوئے لیکن اللہ نے اپنے نبی کریم ﷺ کی ختم نبوت کے صدقے مجھے ہمیشہ محفوظ رکھا۔ 26 اپریل 1984ء کو جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں قادیانیوں کے خلاف آرڈیننس نافذ ہوا جس کے تحت قادیانیوں کو واضح الفاظ میں کہا گیا کہ وہ آئین پاکستان کے تحت شعائر اسلامی استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ اپنے مذہب کو اسلام نہیں کہہ سکتے اور اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ جب قادیانی کلمہ لکھتے یا پڑھتے ہیں تو اس میں وہ محمد ﷺ کی جگہ مرزا قادیانی مراد لیتے ہیں۔ مرزا قادیانی کی بیوی کو ام المومنین کہتے ہیں اور اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہتے ہیں۔

اس وقت قادیانی جماعت کا چوتھا سربراہ مرزا طاہر احمد تھا۔ یہ بھٹو صاحب کے دور میں بہت ایکٹو تھا اور 29 مئی 1974ء کو اسلامی جمعیت طلبہ ملتان کے جن طلبہ کو قادیانیوں نے مارا پیٹا تھا۔ اس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گروہ کو مرزا طاہر خود لیڈ کر رہا تھا۔ان حالات میں مرزا طاہر نے یہ مہم چلائی کہ چونکہ ہمیں حکومت کی طرف سے شعائرِ اسلامی کے استعمال پر روکا جا رہا ہے تو اس نے قادیانیوں سے کہا کہ وہ اپنے گھروں، دکانوں پر بورڈ لگائیں اور اپنے سینوں پر بیج لگائیں جن پر واضح طور پر کلمہ طیبہ لکھا ہو۔اسے ''کلمہ طیبہ مہم'' کہا گیا۔ننکانہ صاحب میں قادیانیوں نے اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ہم نے یہ کیا کہ قانون اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے اور قادیانیوں کو زبردستی روکنے کے بجائے علمائے کرام، وکلاء حضرات، ٹریڈ یونینز، تاجر برادری اور طلبہ برادری و دیگر طبقات سے مشاورت کی۔ہم نے کارنر میٹنگز کیں، جلسے کیے۔ایک عوامی فضا بنائی اور عام لوگوں کو بتایا کہ اس وقت ننکانہ صاحب میں جو قادیانیوں نے اپنے گھروں کے باہر کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے یہ تو پاکستانی قانون کی خلاف ورزی ہے۔لہٰذا ہم قانون کے ذریعے انہیں اس بات سے باز رکھیں کہ وہ شعائرِ اسلامی استعمال نہ کریں۔اس کے بعد ہم نے انتظامیہ سے کہا کہ قادیانیوں نے جو کلمہ طیبہ لکھا ہے یہ غیر قانونی ہے۔اس وقت وزیرِ اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف کی حکومت میں ارشد خان لودھی صوبائی وزیر تھے۔ان کے ایک بھائی محمد اکرم لودھی ڈی ایس پی ننکانہ تھے۔یہ بڑے باکمال انسان تھے۔اس وقت ننکانہ ابھی ضلع نہیں بنا تھا اور یہ تحصیل تھی۔لودھی صاحب نے ہماری بات بڑی توجہ کے ساتھ سنی اور انہوں نے پھر قادیانیوں کے گھروں کے باہر لکھا گیا کلمہ طیبہ ہٹایا۔

ننکانہ کے قادیانیوں کو بخوبی علم تھا کہ اس ساری مہم کے پیچھے متین خالد ہے۔اس وقت قادیانیوں کو ننکانہ میں جو شخص لیڈ کر رہا تھا اس کا نام طاہر خان تھا۔یہ شہر کا ایک بدمعاش ٹائپ آدمی تھا۔اس کی والدہ اور والد قادیانی مبلغ تھے۔یہ اس وقت کلاشنکوف سے مسلح ہو کر میرے گھر آیا اور غصے سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا اور گالیاں دیں اور خوب للکارے مارے کہ متین خالد کو باہر نکالو آج میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔اس نے ہوائی فائرنگ کی تو ایک خوف کی فضا پیدا ہوگئی۔میرے گھر والوں نے گھر کا دروازہ بند کر دیا۔یہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا اور میں مسجد میں اعتکاف بیٹھا ہوا تھا۔مجھے وہاں اطلاع ملی کہ طاہر خان آپ کے گھر کے باہر شور کر رہا ہے۔میں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ میرے لیے اعتکاف مکمل کرنا بہت مشکل ہے اور میں ابھی باہر نکل کر اس سے دو دو ہاتھ کر کے آتا ہوں۔ظاہر ہے کہ اس وقت میرا خون بھی جوان تھا اور میں تحفظ ختم نبوت کے جذبے سے بھی سرشار تھا۔مجھے مسجد کی انتظامیہ اور اور تمام دوستوں نے بڑی مشکل سے روکا اور کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہم سب آپ کے ساتھ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہیں اور آپ اپنا اعتکاف ختم نہ کریں۔ ہم نے اس کے خلاف تھانے میں ایف آئی آر درج کروا دی ہے۔ خیر میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس واقعہ کے کچھ ہی روز بعد طاہر خان اور اس کے قادیانی والدین پاکستان چھوڑ گئے اور انگلینڈ سیٹل ہو گئے۔ اس طرح کے اور بھی واقعات ہیں۔ لاہور میں میرا بہت تعاقب ہوتا رہا ہے، قادیانی دھمکی آمیز خطوط لکھتے رہے اور فون پر بھی دھمکیاں دیتے رہے اور آج تک دیتے ہیں لیکن میں نے آج تک اپنے دوستوں اور گھر والوں کو نہیں بتایا کہ میرے ساتھ کیا حالات پیش آتے رہتے ہیں، باقی میں موت سے تو بالکل ہی نہیں ڈرتا کیونکہ موت کا ایک وقت معین ہے اور اس سے بڑھ کر بہترین موت اور کیا ہوگی جو تحفظ ختم نبوت کے راستے میں آئے۔

قادیانی یہ بات بار بار دہراتے ہیں کہ جو بھی شخص ختم نبوت کا کام کرتا ہے اس کی موت عبرت ناک ہوتی ہے کیونکہ نبوت کا سلسلہ جاری ہے (نعوذ باللہ)۔ مجھے اس بات کا تجسس ہوا کہ میں بھی تو تحقیق کروں کہ قادیانی خود کیسی موت مرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک تحقیقی کتاب ''قادیانی راسپوٹینوں کے انجام''، لکھی جس پر پابندی لگا دی گئی اور مجھ پر مقدمہ دائر کر دیا گیا۔

میں نے جتنے بھی علمائے کرام کی صحبت اختیار کی وہ تمام تحفظ ختم نبوت کا کام کرنے والے تھے اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان علماء میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو فرقہ پرور ہو اور فروعی اختلافات کی بنیاد پر مسلمانوں کو آپس میں لڑاتا ہو۔ ان علماء و مشاہیر میں حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، مولانا محمد منظور چنیوٹیؒ، مولانا تاج محمود، مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا تاج محمود کے بیٹے صاحبزادہ طارق محمود سے مسلکی اعتدال کا سبق سیکھا۔ یہ لوگ حقیقی معنوں میں اتحاد امت کا درس دیتے تھے۔ یہ عظیم لوگ تھے۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہریؒ بڑے عظیم انسان تھے۔ انہوں نے عملی طور پر اتحاد امت کے لیے شاندار کام کیا۔ ان کی اپنی تفسیر ضیاء القرآن کے دیباچے میں بھی ہے کہ امت مسلمہ فروعی اختلافات میں گھر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے جو لمحہ فکریہ ہے۔ یہی وجہ ہے ان علماء کی صحبت کا مجھ پر خاص اثر ہوا اور میں فرقہ واریت کا ہرگز قائل نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ قادیانیوں کے خلاف کام کیا اور ہر مسلک کے پلیٹ فارم پر گیا اور اب بھی جاتا ہوں۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی ہر ایک کے پروگراموں میں جاتا ہوں۔ نبی کریم ﷺ کی ختم نبوت کے تحفظ کے صدقے مجھے تمام مسالک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے لوگ اپنے سٹیج پر بلاتے ہیں۔

میری سب سے پہلی کتاب ''قادیانیت ہماری نظر میں'' 1993ء میں شائع ہوئی۔ یہ سات سو پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی منفرد بات یہ تھی کہ میں نے اس میں علماء، وکلاء، تاجر برادری، طلبہ برادری، سیاستدان، شعراء، صحافی اور دیگر تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے تاثرات درج کیے تھے کہ قادیانیت کیا ہے۔ یہ کتاب میں نے اس لیے ترتیب دی تھی کہ قادیانی یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ ہمیں تو صرف مولوی غیر مسلم کہتا ہے اور پڑھا لکھا دانش ور طبقہ ہمیں مسلمان سمجھتا ہے۔ تو میں نے اس کا جواب یوں دیا کہ ایسی بات نہیں پوری امت مسلمہ کے نزدیک آپ کافر ہیں۔ آپ کو تو سب سے پہلے علامہ اقبالؒ جیسے عظیم دانش ور نے کافر قرار دیا تھا۔ شاعرِ مشرق برصغیر کے وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے قادیانیوں کو کافر قرار دینے کا مطالبہ کیا اور قرار دیا کہ قادیانی قوم اور ملک دونوں کے غدار ہیں، پھر کہا کہ قادیانیت یہودیت کا چربہ ہے۔

جب ہم نے ختم نبوت کا کام شروع کیا تو اس وقت دین دار طبقہ تو قادیانیوں کو سمجھ چکا تھا لیکن وکلاء، ججز، صحافی، تاجر اور دیگر طبقوں کو بات سمجھانا بہت مشکل تھا کیونکہ یہ لوگ عام، سادہ اور ٹو دی پوائنٹ دلیل کو مانتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک بات ایک مولانا صاحب دیہات کے مجمع سے مخاطب ہو کر اسے سمجھا رہے ہیں تو ہم وہی بات جب کسی جج اور بیوروکریٹ کے سامنے پیش کریں گے تو وہ دیہات والا سٹائل اور علم نہیں چلے گا اور بات نقلی سے زیادہ عقلی دلیل سے چلے گی۔ اس لیے ہم نے اپنے بزرگوں اور مشاہیر سے مشاورت کر کے ان کو توجہ دلائی کہ عام لوگوں کو قادیانی مسئلہ سمجھانے کے لیے اس طرح کا لٹریچر تیار کیا جائے۔

میری زندگی میں ایک تاریخی واقعہ یہ پیش آیا کہ جب قادیانی جماعت کا چوتھا خلیفہ مرزا طاہر احمد یہاں سے بھاگ کر لندن پہنچ گیا تو وہاں اس نے سرکردہ قادیانیوں کی ایک میٹنگ رکھی۔ وہاں پہلی صف میں سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام بیٹھا تھا۔ مرزا طاہر نے اس سے کہا کہ آپ پاکستان جائیں اور جنرل ضیاء الحق سے کہیں کہ وہ 1984ء والا آرڈی نینس واپس لیں جس میں کہا گیا کہ قادیانی شعائر اسلامی استعمال نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام یہاں آیا اور اس نے جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کی۔ جنرل صاحب بڑے زیرک انسان تھے اور اس ملاقات سے قبل ہی ان کو بریف کر دیا گیا تھا کہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

عبدالسلام کیوں ملاقات کرنا چاہتا ہے۔عبدالسلام جب ملاقات کے لیے آیا اور اس نے اپنا مدعا بیان کیا تو جنرل ضیاء الحق اپنی نشست سے اٹھے اور قادیانیوں کا قرآن ''تذکرہ'' نکال کر لائے اور کہا کہ دیکھیں اس میں مرزا غلام احمد قادیانی نے لکھا ہے کہ ''انا انزلہ قریباً من القادیان''۔قرآن قادیان کے قریب نازل ہوا۔ڈاکٹر عبدالسلام جنرل ضیاء الحق سے اس طرح کی توقع نہیں رکھتا تھا۔بہر حال جنرل صاحب نے اسے صاف انکار کر کے واپس بھیج دیا۔اس کے بعد 1989ء میں مرزا طاہر نے ایک اور چال چلی اور جتنے بھی اہم لوگ قادیانیوں کے خلاف کسی بھی انداز میں کام کر رہے تھے ان کو خطوط لکھے۔اس نے چند اہم شخصیات کا انتخاب کر کے ''مباہلے'' کا ایک خط بھیجا۔

اب دیکھیں کہ مباہلے کی کچھ شرائط ہوتی ہیں جس طرح نبی کریم ﷺ نے نجران کے عیسائیوں سے مباہلہ کیا تھا اور قرآن میں اس کا ذکر ہے۔پہلی شرط یہ ہے کہ مباہلہ چیلنج کرنے والا اپنے اہل خانہ کو بھی ہمراہ لائے گا۔دوسرا فریق بھی اپنے اہل خانہ کو لائے گا۔جب آپ ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کو چیلنج دیا تو اس میں آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ، حضرات حسنین کریمینؓ کو لے کر اس مقام پر پہنچے۔ظاہر بات ہے کہ عیسائیوں نے کہاں مباہلہ کرنا تھا، وہ بھاگ گئے۔اب مرزا طاہر نے پاکستان کے علماء، مصنفین کو مباہلے کا خط لکھا تو اس کا وہ خط میرے نام بھی آیا۔میں نے ان کو جواب دیا کہ آپ تو انگلینڈ میں ہیں اور مجھے تو انگلینڈ کا ویزا نہیں ملے گا۔آپ چونکہ ایک جماعت کے سربراہ ہیں تو آپ پاکستان آ جائیں۔آپ بھی اپنے بیوی بچوں کو ہمراہ لائیں اور میں بھی اپنے اہل خانہ کو لے کر آتا ہوں اور پاکستان کے جس مقام پر آپ کہیں گے میں پہنچ جاؤں گا۔لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ کبھی نہیں آئیں گے۔اس لیے کہ آپ بالکل جھوٹے ہیں۔

مرزا طاہر کے مباہلے کے چیلنج کو پاکستان کے تمام علماء اور دانش وروں نے قبول کیا جن میں ڈاکٹر علامہ طاہر القادری بھی شامل تھے۔علامہ صاحب نے مرزا طاہر کو کہا کہ آپ مینار پاکستان آ جائیں وہاں پر مباہلہ ہوگا۔اس کے ساتھ ہی قادری صاحب نے مینار پاکستان پر ''مباہلہ کانفرنس'' کا اعلان کر دیا۔یہ کانفرنس بڑی شاندار ہوئی تھی۔اس میں تمام مسالک کے علماء اور شہریوں نے شرکت کی۔کانفرنس سے کچھ دن پہلے قادری صاحب نے اپنی مجلس شوریٰ میں کہا کہ رد قادیانیت کے موضوع کا سپیشلسٹ متین خالد ہے ان کی راہنمائی ضروری ہے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے حکم سے ان کے ایک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شاگرد الیاس اعظمی صاحب میرے پاس تشریف لائے۔میں نے ان سے کہا کہ میری تمام قادیانی کتابیں تو ننکانہ صاحب میں ہیں تو انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں وہاں سے ہم پوری لائبریری اٹھا لائیں گے۔پھر ہم ننکانہ گئے اور تمام کتابیں لے کرادارہ منہاج القرآن میں آگئے۔میں نے اپنے دفتر سے کچھ دن کی چھٹی لے لی اور ڈاکٹر صاحب مجھ سے جو بھی حوالہ جات طلب کرتے میں فوری طور پر انہیں نکال دیتا اور جہاں وہ کوئی بات سمجھنا چاہتے میں ان کی راہنمائی کر دیتا۔اس کے بعد مجھے قادری صاحب نے آفر کی کہ آپ میرے ادارے میں مستقل آجائیں اور تحفظ ناموس رسالتؐ کا مستقل شعبہ سنبھال لیں۔میں نے مسکرا کر کہا علامہ صاحب میری بہت اچھی سرکاری نوکری ہے۔آپ کے مزاج کا کچھ پتا نہیں کل کو بدل جائے تو پھر میں کہاں جاؤں گا؟ آپ تحفظ ناموس رسالتؐ کے سلسلے میں مجھے جہاں بھی طلب کریں گے میں غیر مشروط طور پر بغیر کسی معاوضہ کے حاضر ہو جایا کروں گا۔پھر یہ مباہلہ کانفرنس بڑے زبردست انداز میں ہوئی اور میری لائبریری میں تمام کتب سٹیج پر سلیقے سے رکھی گئیں اور میں سٹیج پر ڈاکٹر صاحب کے پاس بیٹھا رہا۔لیکن ظاہری بات ہے کہ مرزا طاہر نے نہ آنا تھا نہ وہ آیا۔سچ پوچھیے تو میں جب سے تحفظ ختم نبوت کے کام سے منسلک ہوا ہوں میں نے آج تک کسی کو اپنے مسلک کے متعلق نہیں بتایا۔میری ایک عادت ہے کہ مجھے جس مسلک کے لوگ بھی رد قادیانیت اور تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں اپنے پروگرام میں بلاتے ہیں تو میں انہی کے بزرگوں اور اکابر کے حالات بیان کرتا ہوں جس سے ان پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

ایک لطیفہ یہ ہوا کہ مجھے لیاقت بلوچ صاحب اور ڈاکٹر فرید احمد پراچہ صاحب نے منصورہ میں ایک پروگرام میں مدعو کیا تو میں نے اپنی تقریر میں مولانا سیّد مودودیؒ اور فرید احمد پراچہ صاحب کے والد مولانا گلزار احمد مظاہریؒ کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔(مولانا گلزار احمد مظاہریؒ ڈاکٹر ارباب عالم کے سسر ہیں۔ڈاکٹر ارباب عالم نشتر میڈیکل کالج ملتان کی سٹوڈنٹس یونین کے صدر تھے اور طلباء کی اس جماعت میں شامل تھے جس پر قادیانیوں نے تشدد کیا تھا۔جب مظاہریؒ صاحب کے پاس ارباب عالم کا رشتہ آیا تو گھر والوں نے ذرا سی مخالفت کی تو مولانا گلزار احمد مظاہریؒ نے ایک جملہ کہا کہ اگر اس نوجوان کی نوکری اور مکان نہیں ہے تو اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ مجاہد ختم نبوت ہے اور میرے لیے یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔چنانچہ انہوں نے پھر ارباب عالم کو اپنا داماد بنا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لیا)۔ جب میں تقریر ختم کر کے سٹیج سے نیچے آیا تو لوگ کہنے لگے کہ متین صاحب آپ جماعت اسلامی میں کب شامل ہوئے؟ تو میں نے مسکرا کر جواب دیا کہ یہی کوئی ایک گھنٹہ پہلے میں نے جماعت جوائن کی ہے۔اس پر سب حضرات مسکرا اٹھے۔

آپ میری بات سن کر حیران ہوں گے کہ میری ڈاڑھی پہلے بہت ہی چھوٹی تھی اور میں جس محفل میں بھی جاتا علمائے کرام کچھ اچھا نہیں سمجھتے تھے اور بعض حضرات تو با قاعدہ مجھ سے کھنچے کھنچے رہتے کہ یہ بندہ ختم نبوت کا کام کرتا ہے اور اس کی ڈاڑھی مکمل نہیں۔ اکثر علماء مجھے بھری محفل میں کہہ دیتے تھے کہ آپ کی ڈاڑھی سنت کے مطابق نہیں ہے، حالانکہ اصلاح کا یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آپ آدمی کو بڑی محبت اور چاہت کے ساتھ اپنے پاس بٹھائیں اور باتوں باتوں میں بڑے لطیف انداز میں اس کی اصلاح کریں اور بھری محفل میں ٹوکنے سے اجتناب کریں۔

مجاہد ختم نبوت، مجاہد فی سبیل اللہ اور ردِ عیسائیت پر ماہرانہ دسترس رکھنے والے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ تھے۔ان کے ایک پوتے ادارہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے سربراہ تھے۔ان کا نام غالباً مولانا ہاشم ہے۔ جب میں وہاں گیا تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اپنی کتاب ''عیسائیت کے تعاقب میں'' پیش کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے ہاتھوں سے شہد میں آبِ زم زم ڈال کر مجھے پلایا۔ پھر کہنے لگے کہ کل آپ کا کھانا میرے پاس ہے۔ اگلے دن میں پہنچا تو وہاں مولانا زکریا کاندھلویؒ کے پوتے مولانا طلحہ کاندھلوی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ لاہور سے بھی کچھ علمائے کرام وہاں موجود تھے۔ لاہور کے علماء میں سے ایک صاحب تھے جن کا میں نام نہیں لینا چاہتا۔مولانا ہاشم صاحب نے علماء سے میرا تعارف کروایا تو یہ بھری محفل میں مجھ پر کڑی تنقید کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ ان کا کام بہت اچھا ہے لیکن ان کی ڈاڑھی بہر حال سنت کے مطابق نہیں ہے اس پر مولانا ہاشم صاحب کہنے لگے کہ دیکھیں یہ جواب تو وہ خود دیں گے، لیکن بات یہ ہے کہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو نصیحت کرنی ہو تو علیحدگی میں کرنی چاہیے۔ بھری محفل میں نصیحت نہیں ہوتی بلکہ انسان کی توہین ہوتی ہے۔ پھر میں نے مولانا ہاشم صاحب سے کہا کہ میرے دل میں ایک جستجو ضرور ہے کہ میں نے ایک دن مکمل ڈاڑھی رکھ لینی ہے آپ میرے لیے دعا فرمائیے۔اس کے ساتھ ہی میں ان مولانا صاحب سے مخاطب ہوا کہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری ڈاڑھی سنت کے مطابق نہیں ہے لیکن اگر آپ اجازت دیں اور ناراض نہ ہوں تو میرا بھی ایک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اعتراض ہے کہ آپ کا جو اتنا پیٹ بڑھا ہوا ہے، یہ بھی تو سنت کے مطابق نہیں ہے۔ میں نے کہا ایسا پیٹ تو نبی کریم ﷺ اور ان کے لاکھوں صحابہ کرامؓ میں سے کسی کا بھی نہیں تھا۔ اگر آپ اس دور میں ہوتے تو کیا آپ کو نبی کریم ﷺ اپنے ساتھ جہاد و قتال پر لے کر جاتے؟ تو میرے اس جواب پر وہ مولانا بہت ہی شرمندہ ہوئے۔

ہمارے ہاں یہ جو اصلاح کا طریقہ ہے یہ بالکل غلط ہے۔ اگر ایک نوجوان پینٹ شرٹ پہن کر مسجد میں آجاتا ہے اور آپ اسے ٹوکتے ہیں تو آپ کو یہ کس نے حق دیا ہے کہ اس کے لباس پر تنقید کریں اور اسے مسجد سے دور کرنے کا سبب بن جائیں۔ ترکی سمیت بہت سے ایسے ممالک جہاں پر مساجد کے علماء اور آئمہ بھی پینٹ شرٹ پہن کر جماعت کرواتے ہیں۔ میں نے اپنے دورہ ترکی میں ایسی مساجد میں نماز ادا کی جہاں پر پچاس پچاس ہزار نمازی تھے۔ وہاں امام سمیت سبھی نے پینٹ شرٹ پہن رکھی ہوتی ہے تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ ان کی نماز نہیں ہوتی، ایسی ہرگز کوئی بات نہیں۔ دیکھیں کہ لباس اور ثقافت تو ہر خطے کی اپنی اپنی ہے، ہمیں یہ کس نے حق دیا ہے کہ ہم لباس کے متعلق فتوے لگاتے پھریں؟

میں حیران ہوتا ہوں کہ حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہریؒ، مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ اور مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ جیسے علمائے کرام کی صحبتوں میں بیٹھتا رہا لیکن انہوں نے مجھے بھری محفل میں ٹوکنا تو دور کی بات کبھی علیحدگی میں بھی ایسا نہیں کہا۔ یہ حضرات تو مجھے والہانہ انداز میں ملتے اور بہت محبت سے پیش آتے۔ انہی علماء کی صحبت کی برکت تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے پوری ڈاڑھی رکھ لی۔ اب دلچسپ بات دیکھئے کہ میں نے پوری ڈاڑھی کیسے رکھی۔ 2015ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوا تو میں نے اپنی فیملی کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کا ارادہ کیا۔ ان دنوں میں مولانا یوسف لدھیانویؒ کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا جس میں انہوں نے ڈاڑھی کے متعلق ایک جملہ لکھا جو مجھ پر بہت اثر کر گیا اور پھر میں نے ڈاڑھی رکھ لی۔ انہوں نے لکھا کہ جن حضرات کی ڈاڑھی مکمل نہیں ہے اگر وہ ناراض نہ ہوں تو میں ان سے عرض کروں کہ آپ اتنا پیسہ اور وقت لگا کر روضہ رسول ﷺ پر جاتے ہیں اور آپ ان کی بارگاہ میں سلام پیش کرتے ہیں تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سلام کا جواب نہیں دیتے اور منہ پھیر لیتے ہیں۔ بس یہ جملہ پڑھ کر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ چنانچہ میں پوری ڈاڑھی رکھ کر ہی عمرہ کی ادائیگی کے لیے گیا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

انسان کی زندگی میں نشیب وفراز آتے رہتے ہیں، 1977ء میں مَیں نے ننکانہ صاحب میں بھٹو صاحب کے خلاف چلنے والی قومی اتحاد کی تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قومی اتحاد کے لیڈروں کی تقریریں سننے کے لیے ننکانہ صاحب سے لاہور آیا کرتا۔ یہ بعد کی بات ہے کہ جب میں نے بھٹو صاحب کے قادیانیوں کے حوالے سے کردار کا مطالعہ کیا تو پھر میں نے انہیں ایک عظیم مسلمان لیڈر کے طور پر تسلیم کر لیا اور آج انہیں اچھے الفاظ میں یاد کرتا ہوں۔ قومی اتحاد کے جن لیڈروں کی تقریریں مجھے پسند تھیں ان میں رفیق باجوہ مرحوم سرفہرست ہیں۔ باجوہ صاحب کمال کے مقرر تھے۔ جب بولتے تو پورے مجمع پر ایک خاموشی چھا جاتی اور ہر طرف باجوہ صاحب ہی کی آواز گونج رہی ہوتی۔ لوگ ہمہ تن گوش ہو کر ان کی تقریر سنا کرتے۔ وہ اپنی گفتگو میں تجسس بہت پیدا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر، وہ کہتے تھے کہ ''صاحبو! جانتے ہو کہ کتا فقیر پر کیوں بھونکتا ہے؟ کتا اس لیے بھونکتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میرے مالک سے کیوں مانگتا ہے اپنے مالک سے مانگ''۔ پھر کہتے کہ صاحبو! ''غرور نہ کیا کرو۔ کسی کو چھوٹا ہرگز نہ سمجھو۔ دیکھو! پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا شخص اگر یہ سمجھتا ہے کہ زمین پر بیٹھا شخص اسے ''بونا'' نظر آتا ہے تو اسے یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ زمین والے شخص کو بھی آپ ''بونے'' نظر آ رہے ہیں''۔ باجوہ صاحب اس طرح کے فقروں سے جلسے میں ایک سماں باندھ دیتے تھے۔ پھر وہ کہتے تھے کہ ''متحد ہو جاؤ۔ چڑیاں جب اکٹھی ہو جائیں تو شیر کی کھال اتار سکتی ہیں''۔ پھر وہ پیپلز پارٹی کی طرف آتے اور اسے خوب رگڑا لگاتے۔ دوسری طرف پیپلز پارٹی کے مولانا کوثر نیازی بھی کمال کے مقرر تھے۔ ان کی خطابت کا ایک اپنا ہی رنگ تھا۔

1974ء میں قومی اسمبلی میں قادیانیوں کے امیر مرزا ناصر کے ساتھ علماء اور مشائخ کی 13 دن تک مسلسل بحث ہوتی رہی۔ جس وقت قادیانیوں کے خلاف مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی طرف سے قرارداد قومی اسمبلی میں پیش ہوئی تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس پر اسمبلی کے ارکان کی ووٹنگ کروائی جاتی جیسا کہ عام طور پر قراردادوں میں ہوتا ہے لیکن یہاں پر بھٹو صاحب نے ووٹنگ نہیں کروائی۔ بھٹو صاحب اصل میں قادیانیوں کو مکمل موقع دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنا موقف پیش کریں۔ لہٰذا انہوں نے ہدایت کی کہ قرارداد پر بجائے ووٹنگ کرانے کے براہ راست اس جماعت کے سربراہوں (قادیانی اور لاہوری گروپ) کو یہاں بلائیں اور ان کا موقف بھی سن لیں۔ یہ میں سمجھتا ہوں کہ بھٹو صاحب کی بڑی بصیرت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

اور دور اندیشی تھی کہ انہوں نے قادیانیوں کو اپنا موقف پیش کرنے کا بہترین موقع دیا تا کہ کوئی ابہام نہ رہ جائے۔ بھٹو صاحب کے اس فیصلہ پر تمام اپوزیشن جماعتیں بھی متفق ہوگئیں۔ اس وقت پاکستان کے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار تھے۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، بہت عظیم انسان تھے۔ انہوں نے جس انداز سے یہ مقدمہ لڑا ان سے یقیناً اللہ کریم ضرور خوش ہوئے ہوں گے۔ یحییٰ بختیار صاحب نے تیرہ دن تک قادیانیوں اور ان کے دوسرے دھڑے لاہوری قادیانیوں پر جرح کی۔ یہاں میں معذرت کے ساتھ یہ کہنا چاہوں گا اگر اس انتہائی نازک موقع پر یحییٰ بختیار کے علاوہ کوئی صاحب ہوتے یا کوئی عالم دین ہوتے تو شاید غصے میں آجاتے اور معاملہ مزید بگڑ جاتا لیکن بختیار صاحب نے یہ کیس بہت ہی اچھے انداز میں لڑا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ علمائے کرام یحییٰ بختیار کو مسلسل اس کیس کی تیاری کرواتے رہے لیکن بہر حال جرح کے موقع پر بختیار صاحب وہ بڑے ہی نپے تلے انداز میں اپنا موقف پیش کرتے۔ ان کا انداز نہایت دھیما اور دلائل سے مزین ہوتا۔ میری ان سے ملاقات لاہور ہائی کورٹ میں ہوئی ہے۔ یہ غالباً 1987ء کی بات ہے۔ ان سے تفصیلی بات ہوئی اور وہ بہت ہی خوش ہوئے۔ وہ ختم نبوت کے محاذ پر اپنے کام کو اپنے لیے ایک بہت بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے تو کہنے لگے کہ ایک بات یاد رکھیں کہ اگر آپ نے ردِ قادیانیت پر کام کرنا ہے اور جب بھی کسی قادیانی سے گفتگو یا مباحثہ کرنا ہے تو آپ کے پاس مرزا قادیانی کے بیٹے مرزا بشیر احمد ایم اے کی کتاب ''کلمۃ الفصل'' ضرور ہونی چاہیے، اس کے بغیر مناظرہ کبھی نہ کرنا۔ یہ خطرناک ترین کتاب ہے اور اس میں قادیانیت کے عقائد کا اصل چہرہ موجود ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ اس پر سپریم کورٹ اور قومی اسمبلی کے ارکان اور بھٹو صاحب جیسا بندہ بھی ششدر رہ گیا تھا۔ میں مختصر طور پر بتاتا چلوں کہ اس کتاب میں مرزا قادیانی کے بیٹوں نے اپنے باپ کے عقائد کی تشریح کر دی ہے۔ لکھا ہے کہ اذان، نماز، قرآن سمیت جہاں کہیں بھی لفظ ''محمد'' آئے گا اس سے مراد مرزا قادیانی ہے۔ (نعوذ باللہ)

بہر حال جس وقت قادیانی جماعت کا تیسرا خلیفہ مرزا ناصر قومی اسمبلی میں داخل ہوا تو اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تسبیح تھی۔ سر پر عمامہ تھا اور ہاتھ میں سنت کے مطابق عصا تھا۔ مکمل ڈاڑھی تھی۔ تہبند باندھا ہوا تھا۔ ٹخنوں سے اوپر شلوار تھی۔ اور یہ اسمبلی میں درود شریف پڑھتے ہوئے آیا۔ اس حالت میں انہیں دیکھ کر بھٹو صاحب چکرا کر رہ گئے کہ یہ ہم کن لوگوں کو کافر قرار

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دینے جارہے ہیں۔ انہوں نے مفتی محمودؒ سے کہا کہ کیا ہم ان لوگوں کو کافر قرار دیں گے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ یہ سراسر دھوکا ہے۔ یہاں پر مجھے ایک بات یاد آ گئی کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے فل بنچ نے اپنے ایک کیس ''ظہیرالدین بنام سرکار۔1993، صفحہ نمبر 1718'' میں لکھا ہے کہ قادیانی دھوکا باز قسم کے غیر مسلم ہیں۔ حالانکہ ہندو، سکھ وغیرہ بھی تو غیر مسلم ہیں سپریم کورٹ نے انہیں ''دھوکا باز'' نہیں کہا لیکن قادیانیوں کے متعلق واضح لکھا کہ یہ دھوکا باز ہیں۔ تو یہاں پر مفتی صاحب نے بھٹو صاحب سے کہا کہ یہ سراسر دھوکا ہے اور ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ بھٹو صاحب اگر چاہتے تو ان حالات میں استعفا دے سکتے تھے یا ملک کو خون خرابے کی طرف دھکیل سکتے تھے لیکن انہوں نے واضح سٹینڈ لیا اور قادیانیوں کے 90 سالہ سلگتے مسئلے کو حل کرتے ہوئے انہیں کافر اقلیت قرار دے دیا۔ سچ پوچھیے تو جب بھی بھٹو صاحب کا نام سامنے آتا ہے تو میری گردن انتہائی احترام کے ساتھ جھک جاتی ہے۔ میں تحریک نظامِ مصطفیٰ میں ایک بار گرفتار بھی ہوا۔ واقعہ یوں پیش آیا کہ ننکانہ صاحب میں ایک جلسے کے دوران میں تقریر کر رہا تھا تو لڑائی ہوگئی جس میں میرے خلاف بھی کیس بنا دیا گیا۔ حالانکہ میں نے صرف تقریر کی تھی اور کوئی لڑائی نہیں کی تھی۔ میں گرفتار ہوا تو یہ مارشل لا کا دور تھا۔ ضلع شیخوپورہ میں کرنل بشیر صاحب ''ڈپٹی ایڈمنسٹریٹر مارشل لا'' تھے۔ انہوں نے مجھے نو ماہ قید اور پندرہ کوڑوں کی سزا سنائی۔ یہ سب کچھ آن ریکارڈ ہے۔ اس کیس میں مجھے شیخوپورہ جیل بھیج دیا گیا۔ جب میں جیل میں داخل ہوا تو مجھے ایک وارڈن نے کہا کہ وہ جھاڑو اٹھالو اور پوری جیل کو صاف کر ڈالو۔ میں بڑا حیران ہوا کہ میں تو کسی اخلاقی جرم میں نہیں آیا تو اس قدر بڑی سزا مجھے کیوں دی جارہی ہے؟ مجھے پھر کسی نے بتایا کہ اس مصیبت سے نکلنے کا ایک ہی حل ہے کہ اگر آپ کے پاس سو روپے ہیں تو وہ اس اہلکار کو دے دو۔ جیل چالان کے وقت میرے بڑے بھائی نے کچھ رقم میری جیب میں ڈال دی تھی جو اس وقت میرے کام آئی اور میں نے سو روپے اس وارڈن کو دے دیے تو اس نے کہا کہ آپ ہر ماہ اتنی رقم مجھے دے دیا کریں تو آپ کو ہم تنگ نہیں کریں گے۔ اللہ کا کرم یہ ہوا کہ میں بیس دن کے بعد رہا ہو گیا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کو جو عادی مجرم قتل کے کیسوں میں ملوث تھے وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ یہ بڑے بڑے مافیاز کے لوگ تھے۔

میں نے جیل میں پہلے دن جو کھانا کھایا بتایا گیا کہ یہ ساگ پکا ہوا ہے لیکن وہ جانوروں کو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ڈالنے والا'' شتالہ'' تھا۔غرض میں نے صرف بیس دنوں میں بہت سے انسانیت سوز مظالم دیکھے۔ لاچار اور بے بس قیدیوں کو ذلیل وخوار ہوتے اور مافیاز کے لوگوں اور عادی مجرموں کو عیش کرتے دیکھا۔ وہاں میں نے یہ بھی دیکھا کہ قتل کے کئی قیدی رات کو خواب میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے اور بڑی خوفناک آوازیں نکالتے تو میں دوسرے دن ان سے پوچھتا کہ آپ کو ڈراؤنے خواب کیوں آتے ہیں تو وہ جواب دیتے کہ جس شخص کو ہم قتل کر کے آئے ہیں وہ خواب میں آتا ہے تو ہم ڈر جاتے ہیں۔ جیل میں ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک شخص چنے بیچ رہا تھا اور آواز لگا رہا تھا۔ میں نے ایک قیدی سے کہا کہ یار اس بندے سے چنے لے کر کھاتے ہیں تو وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ جناب وہ چنے نہیں بیچ رہا چرس فروخت کر رہا ہے اور اپنے مخصوص ''کوڈ ورڈ'' میں آواز لگا رہا ہے اور سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں۔

یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی معصوم آدمی غلطی سے جیل میں چلا جائے اور چند دن وہاں رہ کر آئے تو وہ عادی مجرم بن جاتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بچ پاتے ہیں۔ جیل میں کم عمر بچوں کے ساتھ جنسی درندگی بہت زیادہ ہے اور یہ سب کچھ جیل عملے کی ملی بھگت سے ہوتا ہے، جیل عملہ عادی مجرموں سے پیسے لے کر کوئی نوعمر قیدی ان کی بیرک میں بھیج دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی نے جہنم کا ایک نظارہ دیکھنا ہو تو وہ پاکستانی جیلوں کی حالت زار دیکھ لے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے قیدیوں پر تشدد کے ہولناک مناظر دیکھے۔ میں بیس دن جیل میں رہا اور پھر کچھ دوستوں نے جنرل سوار خان سے اپیل کی تو انہوں نے میری سزا ختم کر کے رہا کرنے کا حکم دیا۔

میری تحریکی زندگی کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ جب مذہبی جماعتوں نے شناختی کارڈ میں مذہب کے اندراج کا معاملہ اٹھایا، اس وقت چوہدری شجاعت حسین صاحب وزیر داخلہ تھے۔ پہلے تو حکومت نے ہمارا مطالبہ مان لیا لیکن بعد میں قادیانیوں اور عیسائیوں کے احتجاج کے باعث یہ فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ شناختی کارڈ والے مسئلہ پر قادیانیوں کا احتجاج تو بجا تھا کہ انہیں واضح طور پر لکھوانا پڑتا کہ ہم غیر مسلم ہیں کیونکہ اگر وہ یہ لکھواتے کہ ہم مسلمان ہیں تو پاکستان کے قانون 298-C تعزیراتِ پاکستان کے تحت ان کے خلاف پرچہ درج ہوتا۔ کیونکہ قانون میں تو واضح موجود ہے کہ وہ خود کو مسلمان نہیں لکھ سکتے۔ اب یہاں پر قادیانیوں نے دھوکے کے ساتھ پاکستان کی عیسائی کمیونٹی کو بھی ساتھ ملا لیا اور عیسائی بھی احتجاج پر اتر آئے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ پاکستان میں عیسائیوں کے لیڈر جے سالک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نے دانستہ طور پر اور اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے قادیانیوں کا ساتھ دیا تھا۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ ایک عیسائی کو شناختی کارڈ پر یہ لکھوانے میں کیا حرج ہے کہ وہ ''عیسائی'' ہے۔ یورپ میں کسی بھی عیسائی سے پوچھیں تو وہ فخر سے کہے گا کہ میں کرسچن ہوں۔ جو بھی مذہب ہے اس کے ماننے والے اس کے متعلق فخر سے بتاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندو، سکھ، یہودی، عیسائی، مسلمان سبھی اپنے اپنے مذہب کے متعلق واضح بتاتے ہیں۔ یوں شناختی کارڈ کے معاملے پر عیسائیوں کا احتجاج ہماری سمجھ سے باہر تھا۔ عیسائیوں نے پورے پاکستان میں خوب جلوس نکالے اور شناختی کارڈ والے فیصلے کو سختی سے مسترد کر دیا۔ چنانچہ اس معاملے کے متعلق میں نے جے سالک سے ملاقات کا فیصلہ کیا اور ''انجام آتھم'' نامی کتاب لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''انجام آتھم'' مرزا قادیانی کی ایک کتاب ہے۔ آتھم ایک عیسائی تھا اور اس نے مرزا قادیانی کو برا بھلا کہا اور کچھ عرصہ بعد وہ مر گیا تو مرزا نے کہا کہ یہ میری بددعا سے مرا ہے۔ آپ اس پوری کتاب کی ایک لائن بھی نہیں پڑھ سکتے کیونکہ اس میں حضرت عیسیٰ کی واضح توہین ہے۔

جے سالک اس وقت لاہور ہائی کورٹ بار آفس کے باہر بیٹھے تھے۔ ہائی کورٹ میں ایک پرانا بوہڑ کا درخت ہے جس کے نیچے ساری شخصیات بیٹھی ہوتی تھیں۔ وہیں پر صحافی وغیرہ بھی موجود ہوتے، ہائی کورٹ کا پہلا سٹاپ یہی درخت ہوتا اور وہیں پر مختصر محفل جم جاتی۔ میں جے سالک سے بھی اسی مقام پر ملا اور انہیں ''انجام آتھم'' کتاب دی اور کہا کہ آپ قادیانیوں کے ہاتھوں کھیل رہے ہیں جبکہ وہ تو آپ کو بھی اچھا نہیں سمجھتے اور حضرت عیسیٰؑ کی بھی کھلی توہین کرتے ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کے متعلق آپ کا اعتراض کسی صورت نہیں بنتا۔ مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ جے سالک کہنے لگے کہ ''مجھے بہتر معلوم ہے کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ آپ ہمیں نہ سمجھائیں''۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جے سالک صاحب مخصوص طاقتوں کے اشاروں اور اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ہی کام کرتے ہیں۔ ختم نبوت کے محاذ پر جناب مجیب الرحمٰن شامی کا بہت زیادہ فکری اور نظریاتی کام ہے۔ مجھے یاد ہے کہ قومی ڈائجسٹ نے کسی زمانے میں قادیانیت پر ایک خاص شمارہ شائع کیا تھا اور یہ پورے ملک میں ''ہاٹ کیک'' کی طرح فروخت ہوا تھا۔ شامی صاحب نے اس کی قیمت بھی معمولی رکھی تھی۔ سینئر صحافی شفیق مرزا (مرحوم) نے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ قادیانی اس خاص شمارے سے اس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

قدر خائف ہوئے کہ انہوں نے دکانوں سے یہ شمارے خرید کر بڑی تعداد میں ضائع بھی کیے تاکہ یہ مسلمانوں تک نہ پہنچ سکیں۔

میں اپنے دور کے جن کالم نگاروں سے بہت زیادہ متاثر ہوا ان میں خورشید گیلانی بھی شامل ہیں۔ انہوں نے غازی علم دین شہیدؒ پر جو ایک تحریر لکھی، اس کا جواب نہیں۔ روزنامہ جنگ میں رفیق باجوہ مرحوم (قومی اتحاد کے سربراہ) بھی کالم لکھتے، میں انہیں شوق سے پڑھتا۔ ان کا کالم بہت خوبصورت ہوتا، وہ علامہ اقبالؒ کی شاعری کو اپنی عمدہ نثر میں بیان کرتے۔ ان کے کالموں کا مجموعہ ''بولتے زخم'' بھی چھپا تھا۔ اسی طرح ضیا شاہد روزنامہ جنگ میں ''جمعہ بخیر'' کے عنوان سے لکھتے تھے۔ ان کا کالم بھی مجھے بہت پسند تھا۔ جاوید چودھری بھی اچھا لکھتے ہیں۔ حافظ شفیق الرحمٰن جب روزنامہ دن میں کالم لکھتے تھے تو انہیں مستقل پڑھتا رہا ہوں۔

روزنامہ جنگ لاہور سے 1981ء میں شروع ہوا اس سے پہلے یہ کراچی اور راولپنڈی سے چھپتا تھا۔ جنگ جب لاہور سے شروع ہوا تو اس کی ابتداء ہی میں عبدالقادر حسن نے اپنا کالم لکھنا شروع کیا، میں ان کو مستقل پڑھتا تھا۔ اسی طرح میں کوثر نیازی کا بھی مستقل قاری تھا۔ اس دور میں بہت ہی اچھا لکھنے والے تھے۔ خطباء میں رفیق احمد باجوہ، کوثر نیازی اور مولانا اجمل خان کی خطابت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ یہ اپنے دور کے بڑے خطیب تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر طاہر القادری اور ڈاکٹر اسرار احمد کی گفتگو بھی بہت دلچسپی سے سنتا تھا۔ واپڈا ہاؤس آڈیٹوریم میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے بیانات ہوتے تو میں مستقل جایا کرتا۔ یہاں اپنے متعلق یہ بھی بتاتا چلوں کہ مجھے سیر و سیاحت کا بڑا شوق ہے اور میں نے پاکستان کے تمام اہم مقامات دیکھے اور فطری مناظر سے لطف اندوز ہوا ہوں۔ میرا بچپن سے ایک خواب تھا جس کی تعبیر مجھے مارچ 2019ء میں ملی۔ وہ خواب یہ تھا کہ میں ترکی جاؤں اور خلافتِ عثمانیہ کی سرزمین دیکھوں اور اس سرزمین پر محفوظ حضور کریم ﷺ، صحابہ کرامؓ واہل بیتؓ کے جتنے بھی تاریخی نوادرات ہیں وہ دیکھوں۔ یہ ساری تاریخی چیزیں استنبول کے میوزیم ''توپ کاپی'' میں محفوظ ہیں۔ میں جب بھی کسی کتاب میں خلافتِ عثمانیہ اور ترکی کا ذکر پڑھتا تو ترکی دیکھنے کا بے حد اشتیاق پیدا ہوتا۔

میں نے استنبول جانے کا پروگرام بنایا اور وہاں کی سیر و سیاحت کے بعد واپسی پر عمرہ کا مقدس فریضہ بھی سرانجام دیا۔ میں نے استنبول میوزیم میں بہت کچھ دیکھا۔ بالخصوص حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کی تلواریں دیکھنے والی ہیں۔ یہ تلواریں بالکل منفرد ہیں۔ یعنی اس زمانے میں جو تلواریں ہوتی تھیں یہ دونوں ان سے بالکل منفرد ہیں، تلواروں کی چوڑائی تین انچ ہے لیکن حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ کی تلواروں کے پھل کی چوڑائی کم از کم چھ انچ ہے، میں بڑا حیران ہوا کہ ان دو حضرات کی تلواریں اس دور کی تلواروں سے بالکل مختلف اور دیوہیکل تھیں۔ یہ بھاری بھر کم تلواریں حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ کی بہادری اور دلیری کی واقعی گواہی دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ حضور کریم ﷺ کے موئے مبارک، برتن مبارک بھی دیکھے۔ میوزیم میں مَیں نے وہ اوریجنل خط بھی دیکھا جو حضور نبی کریم ﷺ نے مسیلمہ کذاب کو لکھا تھا۔ ہم یہاں مرزا قادیانی کو ''کذاب'' کہتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں جبکہ خود نبی اکرم ﷺ نے اپنے مکتوب میں مسیلمہ کو کذاب کہہ کر مخاطب فرمایا۔ اس میوزیم میں ایک ایک چیز دیکھنے کے لائق ہے۔ 22 سال کے مسلمان نوجوان سلطان محمد فاتح نے جس طرح کمال حکمت عملی، فہم و فراست اور فوجی تدبر کے ساتھ قسطنطنیہ (استنبول) فتح کیا، یہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور یہ ایک غیر یقینی داستان ہے۔ استنبول میں ایک ہال ہے جس کا نام ''پنوراما 1453'' ہے۔ اس میں ایک شو لگتا ہے جس میں یہ سارا منظر دکھایا جاتا ہے کہ کس طرح سلطان محمد فاتح نے رومی فوجوں کو عبرت ناک شکست دے کر استنبول فتح کیا۔ یہ بڑا زبردست شو ہوتا ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ترک حکومت نے کمال مہارت سے یہ پورا سین بالکل اسی پرانے انداز میں دکھایا ہے اور گمان گزرتا ہے کہ ہم حقیقت میں اسی جنگ کے میدان میں کھڑے ہیں۔ وہی پرانی توپیں، فوجوں کی لڑائی، چیخ پکار، تلواروں کی جھنکار اور جنگی انداز، سب کچھ اس طرح دکھایا جاتا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض ''شو'' نہیں بلکہ ہم حقیقی نظارہ دیکھ رہے ہیں۔ سارا منظر ہو بہو اسی انداز میں دکھایا جاتا ہے جس طرح ہم کتابوں میں پڑھتے رہے ہیں۔ یہ شو بہت مقبول ہے اور وہاں پوری دنیا سے سیاح آتے ہیں۔ توپ کاپی میوزیم میں سلطان محمد فاتح کی بہت ساری جنگی چیزیں بھی رکھی ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر ان مجاہدین کے جذبہ ایمانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کاش! آج کے مسلمانوں میں بھی ایسا جذبہ ایمانی بیدار ہو سکے اور ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت بحال کر سکیں۔ میں ''قومی ڈائجسٹ'' کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس کے سبب مجھے اپنی یادداشتوں کو محفوظ کرنے کا موقع میسر آیا۔ عبدالستار اعوان نے بڑی محنت کے ساتھ میری یادداشتیں ریکارڈ کیں اور پھر انہیں قرطاس پر منتقل کیا۔ ان کا بہت شکریہ۔ (قومی ڈائجسٹ۔ جنوری 2020ء)

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

متین خالد کی کتابیں اور رسائل

(1) جب حضور ﷺ آئے (2) بارگاہِ رسالت ﷺ میں (3) معارف اسم محمد ﷺ (4) مرا پیمبر ﷺ عظیم تر ہے (5) سید الشہداء حضرت حمزہؓ (6) قادیانیت ہماری نظر میں (7) ثبوت حاضر ہیں! (مختصر) (8) ثبوت حاضر ہیں! (جلد اول) (9) ثبوت حاضر ہیں! (جلد دوم) (10) ثبوت حاضر ہیں! (جلد سوم) (11) ثبوت حاضر ہیں! (جلد چہارم) (12) قادیانیت سے اسلام تک (13) فتنہ قادیانیت کے خلاف عدالتی فیصلے۔ (14) Qadyaniat, In the Eye of Law (15) علامہ اقبالؒ اور فتنہ قادیانیت (16) قادیانیت اس بازار میں (17) قادیانیت کی عریاں تصویریں (18) قادیانی راسپوٹینوں کے عبرتناک انجام (19) ربوہ و قادیان، جو ہم نے دیکھا (20) احمدی دوستو! تمہیں اسلام بلاتا ہے! (21) معلوماتِ ختم نبوت (سوالاً جواباً) (22) قادیانیت اسلام کے نام پر دھوکا (23) اسلام کا سفیر (قائد اعظمؒ) (24) رشتے محبت کے (زیر طبع) (25) قادیانیوں سے فیصلہ کن مناظرے (26) کامیاب مناظرہ (27) قادیانیت ایک دہشت گرد تنظیم (28) غدارِ پاکستان (29) وحید الدین خان، اسلام دشمن شخصیت (30) ملالہ یوسف زئی، اسلام دشمن طاقتوں کا نیا مہرہ (31) قادیانیت انگریز کا خود کاشتہ پودا (32) قادیانیوں کو لاجواب کیجیے (33) حیاتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور قادیانیت (زیر طبع) (34) تحفظ ختم نبوت، اہمیت اور فضیلت (35) شہیدانِ ناموس رسالت ﷺ (36) شہید ناموسِ رسالت ﷺ عامر عبدالرحمٰن چیمہ (37) کیا امریکہ جیت گیا؟ (38) حقوق انسانی کی آڑ میں (39) آزادئ اظہار کے نام پر (40) راجپال کے جانشین (41) ناموس رسالت ﷺ کے خلاف بینظیر فیصلہ (42) ناموس رسالت ﷺ کے خلاف امریکی سازشیں (43) ناموس رسالت ﷺ کے خلاف مغرب کی شر انگیزیاں (44) توہین رسالت کے مرتکبین کے خلاف سیشن کورٹس کے یادگار فیصلے (45) ناموسِ رسالت ﷺ، مغرب اور آزادئ اظہار (46) قانونِ تحفظ ناموس رسالت ﷺ (زیر طبع) (47) تحفظ ناموس رسالت ﷺ، اعتراضات و جوابات (زیر طبع) (48) عیسائیت کے تعاقب میں (49) پادریوں کے کرتوت (50) اُف یہ پادری (51) شوگر کو شکست دیں (52) کمپیوٹر کے مسائل اور ان کا حل (53) کمپیوٹر کی بیماریاں اور ان کا علاج (54) اسلام انٹرنیٹ پر (55) پاکستان انٹرنیٹ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پر(56)انٹرنیٹ ڈائریکٹری(57) کمپیوٹر خود سیکھیں۔(58) The Advance Science (60)Fraz Encyclopedia of FAQ (59)۔Dictionary Internet Directry پمفلٹس / رسائل: 1- عقیدۂ ختم نبوت اور فتنۂ قادیانیت 2- قادیانی عقائد 3 - غیرتِ مسلم زندہ ہے 4 - تحفظ ختم نبوت، جنت کا راستہ 5 - مرزا طاہر کا عبرتناک انجام 6- قادیانی چھلاوہ 7- قادیانیوں کی شرعی حیثیت اور ان کا مکمل بائیکاٹ 8- قادیانیوں سے متعلق عدالتی فیصلے 9- فتنۂ قادیانیت، آئین و قانون کیا کہتا ہے؟ 10- قادیانیت پر تبصرے 11- ایسے بھی ہوتے ہیں خوش نصیب! 12 - یہ ہے قادیانی اخلاق!!! 13 - احمدی دوستو! تمہیں اسلام بلاتا ہے 14- الفاظ اپنا حق مانگتے ہیں 15- اہل بیتؓ اور قادیانیت 16- معلوماتِ ختم نبوت (سوالاً جواباً) 17- مرزا قادیانی کی ایک شرمناک تحریر 18- ڈاکٹر عبدالسلام، تصویر کا دوسرا رخ 19- قادیانیت، اعلیٰ عدالتیں کیا کہتی ہیں 20- قادیانیت انگریز کا خودکاشتہ پودا 21- قادیانی فرقے 22- جب کوئی مسلمان قادیانی مذہب قبول کرتا ہے 23- حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام اور فتنۂ قادیانیت 24- مرزا قادیانی کی علمی حیثیت 25- حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ اور فتنہ قادیانیت 26- پاکستان کے خلاف قادیانی سازشیں 27- پارلیمنٹ میں قادیانی شکست 28- مرزا قادیانی کے جھوٹ 29- محمدی بیگم 30- مرزا قادیانی کی پیش گوئیاں 31- Qadyaniat, What Law & Constitution Say? 32- ماں 33- باپ 34- بیوی 35- بیٹی 36- قانون تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ 37- غازی علم الدین شہیدؒ 38- اتحاد بین المسلمین، وقت کی اہم ترین ضرورت 39- یادگار فیصلہ۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دانش ور، طالب علم رہنما

محمد زاہد بلند شہری

کی دلچسپ آپ بیتی

زاہد بلند شہری بھارتی دارالحکومت دلی سے چالیس کلومیٹر دور ''بلند شہر'' میں پیدا ہوئے ہفت روزہ چٹان، حرمت اور ترجمان اسلام جیسے معروف جرائد کے ایڈیٹر رہے۔ اوائل جوانی میں جمعیت علمائے اسلام میں شامل ہوئے اور ابھی تک جمعیت کے نظریات پر سختی سے کاربند ہیں۔ شہر لاہور کے نامور علم دوست' جناب شبیر احمد میواتی نے ہمیں توجہ دلائی کہ زاہد بلند شہری جیسے سینئر صحافی اور سیاسی کارکن کی یادداشتیں بھی قومی ڈائجسٹ کے صفحات پر محفوظ ہونی چاہئیں۔ یوں ہم نے ان کے ساتھ تفصیلی نشست کا اہتمام کیا جس کی روداد قارئین کی نذر کی جارہی ہے۔ امید ہے قارئین لطف اندوز ہوں گے۔

○......❄......○

ہمارے آباؤ اجداد کئی سو سال قبل ایران سے ہندوستان آئے۔ ہندوستان میں وہ کہاں پر آباد ہوئے، اس بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ دلی سے چالیس کلومیٹر دور بلند شہر کے ایک قصبے سکندر آباد میں ہمارا پورا خاندان آباد تھا اور ابھی تک وہیں پر آباد ہے۔ ممکن ہے ہمارے بزرگ ایران سے آکر اسی قصبے میں آباد ہوئے ہوں۔ ہمارا سلسلہ سید ہاشمی ہے۔ ہمارے خاندان کے ایک بزرگ سید لطف اللہ شاہ تھے، جو بڑے صاحب ریاضت اور اللہ والے تھے۔ شاہ صاحب کی قبر بھی بلند شہر ہی میں واقع ہے اور اب تو وہاں پر ان کا بہت بڑا مزار بن گیا ہے۔ لاہور سے جی ٹی روڈ پر دلی جائیں تو اسی روڈ پر دلی سے چالیس کلومیٹر دور بلند شہر واقع ہے۔ میں تین چار مرتبہ بھارت گیا۔ دلی، میرٹھ، علی گڑھ اور بلند شہر دیکھا اور اپنے آباؤ اجداد کی دھرتی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اصل میں ''بلند شہر'' کے ساتھ میری ایک جذباتی وابستگی بھی ہے۔ ہمارا پورا خاندان وہیں مقیم ہے اور صرف میرے والدین ہی پاکستان آئے تھے۔

میں جنوری 1954ء میں بلند شہر میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا نام محمد انور تھا۔ میری والدہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

محترمہ پاکستان سے بلند شہر گئی ہوئی تھیں اور میری پیدائش وہیں پر ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد والد صاحب 1949ء میں ہجرت کر کے لاہور آئے لیکن والدہ صاحبہ اس سے بھی دو تین سال بعد لاہور آئیں۔ ہمارے پورے خاندان میں سے صرف والد صاحب ہی ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ باقی خاندان بلند شہر ہی میں رہا اور ابھی تک وہیں پر ہے۔ میرے دادا جان اور خاندان کے دیگر افراد نے والد صاحب کے اس فیصلے کی بہت مخالفت کی تھی لیکن انہوں نے پاکستان آنے کو ترجیح دی۔ والد صاحب بہت زیادہ مذہبی سوچ رکھتے تھے ان کا خیال تھا کہ پاکستان چونکہ خالص اسلام کی خاطر حاصل کیا گیا ہے لہٰذا وہاں پر بکری اور شیر ایک گھاٹ پانی پیتے ہوں گے۔ اب یہ الگ موضوع ہے کہ والد صاحب کی طرح لاکھوں مسلمانوں کے بھی ارمان دل ہی دل میں رہ گئے اور یہ ملک خالص اسلامی فلاحی ریاست نہ بن سکا۔ والد صاحب نے لاہور آ کر کرشن نگر میں رہائش اختیار کی۔ وہ ایک نرم خو انسان تھے لیکن اسلامی معاملات میں قدرے سخت بھی تھے۔ موسم خواہ کیسا ہوتا وہ نماز کے لیے مسجد ضرور جایا کرتے۔ ایمانداری اور دیانت داری میرے والد صاحب پر ہمیشہ غالب رہی۔ اسی طرح میرے ددھیال کی طرح میرے ننھیال والے بھی مذہبی سوچ رکھتے تھے جس کا لامحالہ اثر میری والدہ اور پھر ہم پر بھی پڑا۔ والدہ محترمہ ایک نیک سیرت خاتون تھیں۔ ہم تین بھائی اور دو بہنیں تھے۔ میں نے پرائمری جماعت تک تعلیم گورنمنٹ مڈل سکول گورنر ہاؤس لاہور سے حاصل کی۔ اساتذہ اور سکول دونوں ہی اچھے تھے۔ سالانہ امتحانات کے نتیجے کے بعد گورنر مغربی پاکستان نواب آف کالاباغ ملک امیر محمد خان بچوں کو اپنے ہاتھ سے فرداً فرداً مٹھائی تقسیم کرتے تھے۔ دراز قد، اونچا شملہ، سفید شلوار قمیض اور شیروانی میں ملبوس ہو کر گولڈن بگھی میں شاہانہ انداز میں تشریف لاتے تھے۔ بچوں کے پاس چل کر جاتے اور ہر بچے کو اپنے ہاتھ سے مٹھائی دیتے۔ عام طور پر ان کے چہرے پر مسکراہٹ نام کی کوئی چیز نہ تھی لیکن مٹھائی تقسیم کرتے وقت بچوں کے سامنے ضرور مسکراتے تھے۔ گورنر ہاؤس کا یہ سکول اس دور میں لاہور کا سب سے ماڈرن اور صاف ستھرا سکول تھا۔

میں نے 1975ء میں اسلامیہ کالج سول لائنز سے ایف ایس سی کی۔ اس دور کے اساتذہ اپنا ایک قومی فرض سمجھ کر بچوں کو پڑھایا کرتے۔ جب امتحان قریب ہوتا تو اساتذہ کہا کرتے تھے کہ جو بچے ہمارے گھر آ سکتے ہیں وہ آ کر امتحان کی تیاری کیا کریں۔ وہ اس پر کسی قسم کی فیس وغیرہ بھی طلب نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد میں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے بی اے اور پھر پرائیویٹ طور پر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔ جب ہم پاکستان آئے تو ہمارے مالی حالات بہت کمزور تھے، اسی وجہ سے میں باقاعدہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ کیونکہ میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پرائیویٹ طور پر پڑھتا بھی تھا اور مختلف کام کاج کر کے والد صاحب کا ہاتھ بھی بٹاتا تھا۔ میں شروع سے آج تک ''ہینڈ ٹو ماؤتھ'' ہی رہا ہوں۔ بلند شہر میں والد صاحب کا ذریعہ معاش یہ تھا کہ وہ فرنیچر بنانے والی مختلف مشینوں کی مرمت کا کام کرتے تھے۔ لاہور میں آ کر بھی یہی کام کیا اور بہت سے اچھے اداروں سے وابستہ رہے۔

میرے والد صاحب مذہبی پس منظر رکھتے تھے۔ مذہبی رجحان کے باعث طبیعت میں حلال و حرام میں تمیز کا غلبہ بہت زیادہ تھا۔ اسی وجہ سے معاشی حوالے سے بھی کمزور رہے۔ لیکن ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہمارے والد نے ہمیں حلال کا لقمہ کھلایا اور ہماری پرورش حلال رزق سے ہوئی ہے۔ جب میں اسلامیہ کالج سول لائنز آیا تو اس وقت طلبہ سیاست پورے عروج پر تھی۔ کالج میں پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن اور اسلامی جمعیت طلبہ کا بہت زور تھا۔ میں طلبہ سیاست میں باقاعدہ دلچسپی تو نہیں لیتا تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ ان جماعتوں کے جلسوں وغیرہ میں شرکت کیا کرتا۔ میں اس وجہ سے بھی طلبہ سیاست سے دور رہا کہ کالج میں اکثر طلبہ جماعتیں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی رہتیں اور تشدد کو فروغ دیتی تھیں جبکہ لڑائی جھگڑے سے میری ہمیشہ ہی سے جان جاتی ہے۔ اصل میں طلبہ سیاست نے ملک کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ طلبہ یونین کا وجود ہونا چاہیے لیکن اس کا باقاعدہ سیاسی کردار نہیں ہونا چاہیے اور انہیں بڑی سیاسی جماعتوں کے ''ذیلی ونگز'' کے طور پر استعمال نہیں کیا جانا چاہیے، اس سے بہت خرابی پیدا ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں طلبہ سیاست کو ہمیشہ تشدد کے لیے ہی استعمال کیا گیا۔ اگر ہم نے آکسفورڈ اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی طرز کی طلبہ یونین چلانی ہیں تو پھر طلبہ یونین کو سیاست سے دور رکھنا ہوگا اور انہیں تشدد سے ہٹانا ہوگا۔ دیکھیے کہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے طلبہ صرف اور صرف طلبہ مسائل کی بات کرتے ہیں اور وہ جلاؤ گھیراؤ کی سیاست نہیں کرتے۔ وہاں طلبہ مسائل ہی کو لے کر یونین آگے بڑھتی ہے اور ملکی سیاست سے بالکل دور رہتی ہے۔

والدین قیام پاکستان کے بعد لاہور آئے اور کرشن نگر میں رہائش اختیار کی۔ کرشن نگر کسی دور میں ادیبوں اور صحافیوں کا مسکن رہا ہے۔ میرزا ادیب اسی محلے میں چوہان روڈ پر رہتے تھے، ان سے بہت ملاقاتیں رہیں۔ کچھ فاصلے پر ناصر کاظمی رہتے تھے۔ گلوکار شوکت علی خان سے آتے جاتے ملنا ہوتا تھا، یہ بھی بڑے ملنسار طبیعت کے مالک تھے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ اس دور میں مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ کتنی بڑی شخصیات ہیں۔ اسی طرح اداکارہ بشریٰ انصاری یہیں پر رہتی تھیں اور اقبال انصاری سے شادی کے بعد کراچی چلی گئیں۔ یوسف خان ایک بہت بڑا نام ہے۔ یہ پنجابی فلموں کے اداکار تھے۔ یہ بڑے خاندانی لوگ تھے، ان کے والد بیرسٹر تھے اور یہ خالص پٹھان تھے۔ ان سے ملاقاتیں رہیں۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یہ ہم سے بہت بڑے تھے تو ایک احترام کا رشتہ تھا، بس ہم احترام کے ساتھ دعا سلام کر کے آگے بڑھ جاتے۔ ان کے علاوہ ایک اہم شخصیت پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی تھی۔ وہ ہم سے دو گھر آگے رہتے۔ ان سے میرے والد گرامی کی بہت دعا سلام تھی۔ ہمارا ایک حجاب تھا اور یوں میں براہ راست ان سے کبھی مخاطب نہیں ہو سکا تھا، لیکن بہر حال ان کی شخصیت کا ایک سراپا میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ ہم علمی حوالے سے بھی ان سے بہت چھوٹے تھے اور عمر کے لحاظ سے بھی۔ بس اتنا شوق ہوتا تھا کہ ان کے پاس جائیں اور خاموشی سے بیٹھے رہیں۔ اسی طرح جمعیت علمائے پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا عبدالستار خان نیازی جب بھی لاہور آتے میرے ہمسائے میں اپنے بھانجے ڈاکٹر اقبال نیازی کے پاس ٹھہرتے۔ حق گو آدمی تھے۔ شاید اسی لیے ایک طبقہ انہیں سخت گیر سمجھتا تھا۔ ہم جب بھی ان کے پاس جاتے وہ بہت اخلاق اور شفقت سے پیش آتے۔ مولانا بہت زیادہ خوبیوں کے مالک تھے۔ میرا ان سے مسلکی وفکری اختلاف تو بہر حال تھا لیکن میں ان کی شخصی خوبیوں کا انکار نہیں کر سکتا۔ مولانا نیازی بڑے بہادر آدمی تھے اور اپنی بات پر ڈٹ جانے والے تھے۔ ختم نبوت کے مسئلے پر ان کی بہت خدمات ہیں جن کا میں بہت معترف ہوں۔ اب یہ الگ موضوع ہے کہ کسی بھی لیڈر کی ایک خانگی اور حجرے والی زندگی عوامی زندگی سے تھوڑی سی مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی لیڈر جب اپنے گھر میں ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ریلیکس محسوس کرتا ہے اور ایسی باتیں بھی کر جاتا ہے جو وہ عوام کے سامنے نہیں کر پاتا۔ لیکن میرے خیال سے یہ کوئی خرابی والی بات نہیں ہے۔ بحیثیت انسان یہ معاملات سب کے ساتھ ہیں۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم اپنے دور کی ایک قدر آور علمی شخصیت تھے۔ ان کی رہائش کرشن نگر میں تھی۔ میرے ہمسائے تھے۔ سادگی پسند تھے۔ وہ دیوانِ غالب اور کلام اقبال کے شارح کے طور پر معروف ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ تصوف پر ان کی کتاب ہے جو اس زمانے میں محکمہ اوقاف نے شائع کی تھی۔ کچھ علمی حلقوں نے اس کی مخالفت بھی کی لیکن اس کتاب کا علمی مقام اپنی جگہ پر ہے۔ مشہور انقلابی شاعر حبیب جالب بھی کرشن نگر میں رہتے تھے۔ میری ان کے ساتھ بہت ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے گھر میں بہت ہی غربت تھی۔ ایک بالکل چھوٹے سے کمرے میں ان کا پورا کنبہ رہتا تھا، انہوں نے پوری زندگی غربت سے جنگ لڑی۔ وہ کرشن نگر میں تانگے والے چوک کے قریب ایک گیراج نما کمرے میں رہتے تھے۔ ایک ہی کمرہ بیڈ روم، ڈرائنگ روم، کچن اور غسل خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ انہوں نے بہت ہی کسمپرسی میں زندگی بسر کی۔ جس وقت مفتی محمود صاحب کا انتقال ہوا تو اس وقت میں نے حبیب جالب سے ایک نظم کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

فرمائش کی۔ انہوں نے کہا کہ میں مفتی محمود جیسے شخص کے لیے ضرور لکھوں گا۔ اس وقت ان کی طبیعت بہت خراب تھی لیکن انہوں نے حسب وعدہ وہ نظم لکھی اور کمال کر دیا۔ یہ نظم ہفت روزہ ترجمان اسلام میں چھپی تھی۔ حبیب جالب غربت کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے۔ جو لوگ انہیں قریب سے نہیں جانتے تھے ان کا خیال تھا کہ شاید بڑی عالیشان زندگی گزار رہے ہوں گے لیکن مرحوم نے حق کی آواز کو اپنے معاش کا ذریعہ ہرگز نہیں بنایا تھا۔ اور نہ کبھی معاش کو حق گوئی میں رکاوٹ بننے دیا۔ فاقہ کشی کی اور عسرت کی زندگی گزاری لیکن جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے سے کبھی باز نہ رہے۔ وہ چاہتے تو اپنا قلم بیچ کر ایک اچھی زندگی گزار سکتے تھے لیکن انہوں نے ضمیر کا سودا کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔

جالب کے علاوہ بھی کرشن نگر میں بہت سی شخصیات رہتی تھیں لیکن چونکہ میں بہت چھوٹا تھا تو مجھے ان کے مقام و مرتبے کا علم بہت بعد میں ہوا۔ احسان دانش مرحوم میرے ادبی راہنما تھے۔ مرحوم سے رات سات بجے کے بعد اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ اس وقت ملاقاتی کم ہوتے تھے۔ میں نے انہیں ہمیشہ مختصر گفتگو کرتے پایا۔ اکثر نئے شعراء اصلاح کے لیے ان کے پاس آیا کرتے۔ انار کلی میں واقع ان کا گھر ایک ادبی بیٹھک کا درجہ رکھتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں واحد شاعر دیکھا جو شراب اور کباب کے بغیر شاعری کیا کرتا تھا۔ شاید اسی لیے ان کی شخصیت میں روحانیت کا پہلو بھی بڑا واضح تھا۔ ان کے پاس بیٹھ کر بہت سکون ملتا تھا۔ ان کی اپنی ابتدائی زندگی تو مفلسی ہی میں گزری لیکن اس کے باوجود بعض ضرورت مند شعراء کی اپنی بساط کے مطابق مدد بھی کر دیا کرتے تھے۔

ایک بار میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شاعر بڑی پریشانی کے عالم میں ان کے پاس پہنچے اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔ انہوں نے شاعر کا چہرہ پڑھا اور اس سے کہا کہ سامنے میرے کوٹ کی جیب میں دیکھو کیا ہے۔ ان صاحب نے کھونٹی پر لٹکے کوٹ کی اندر کی جیب ٹٹولی تو اس میں سے ایک سو روپے نکلے۔ استاد کو دکھائے تو انہوں نے کہا، یہ تم رکھ لو۔ اس شاعر کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ استاد احسان دانش کے شاگردوں میں کئی بڑے نام ہیں لیکن کسب فیض کا دعویٰ صرف محیط اسماعیل ہی کو ہے۔

میں نے 1974ء میں ماہنامہ العرب جوائن کر لیا۔ یہ تین زبانوں اردو، انگریزی اور عربی میں شائع ہوتا تھا۔ بڑے سائز کا رسالہ تھا۔ یہ میری زندگی کی پہلی جاب تھی اور میں نے بطور پروف ریڈر اسے جوائن کیا تھا۔ ایک صاحب محمد امین الرحمٰن نام کے تھے۔ وہ اپنے ذاتی شوق سے یہ اخبار نکالتے تھے۔ ان کا بیٹا اب ایک سینئر صحافی ہے جس کا نام انیس الرحمٰن ہے اور نوائے وقت میں ہوتا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہے۔ میں ایک سال تک پروف ریڈر رہا اور اس کے بعد جمیعت علمائے اسلام کے ترجمان ہفت روزہ ''ترجمان اسلام'' میں بطور مدیر معاون آ گیا۔ یہ جنوری 1976ء کی بات ہے۔ میں 1985ء تک ترجمان اسلام میں رہا اور جب 1985ء میں یہ پرچہ بند ہوا تو اس کا آخری شمارہ بھی میں نے ہی تیار کیا۔ اس کے علاوہ میں نے اپنا بھی ایک رسالہ ''تذکرہ'' نکالا جو ظاہر ہے کہ وسائل کی عدم دستیابی کے باعث زیادہ دیر نہ چل سکا۔ ترجمان اسلام میں کام کرتے ہوئے میں نے بڑے بڑے علماء اور لیڈروں کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان لوگوں کے پاس بیٹھنے اور بات کرنے کا موقع ملا۔ ان مشاہیر میں مولانا مفتی محمود، مولانا عبداللہ درخواستی، مولانا عبیداللہ انور، مولانا غلام غوث ہزاروی، خان عبدالغفار خان، مولانا محمد عبداللہ آف بھکر اور دیگر بہت اہم شخصیات شامل ہیں۔ مختلف اجلاسوں میں ان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ بعض اوقات اداریوں کی نوک پلک مولانا عبیداللہ انور خود درست کیا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھار ہی ایسا کرتے تھے۔ اکثر انہوں نے ہمیں ہی مکمل اختیار دیا ہوا تھا۔ ترجمان اسلام کی پالیسیوں میں مفتی محمود بہت دلچسپی لیتے۔ سال میں تین یا چار اجلاس ہوتے تھے جن میں صرف ترجمان اسلام ہی کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ انتظامی معاملات اور ادارتی پالیسیاں ڈسکس ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ اس دور میں ہر ہفتے سات سے آٹھ ہزار کی تعداد میں شائع ہوتا تھا اور لاہور جیسے شہر میں جہاں جمیعت علمائے اسلام کے ارکان بہت کم تعداد میں تھے لیکن پھر بھی اس شہر میں چھ سات سو کاپیاں فروخت ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں لیڈروں کو اخبارات و جرائد سے بہت دلچسپی ہوتی تھی۔ ترجمان اسلام کا دفتر رنگ محل میں نصرت بلڈنگ میں تھا، نیچے جمیعت کا دفتر تھا اور اوپر ہمارا دفتر تھا۔ دفتر میں ہر وقت ایک رونق لگی رہتی اور مختلف لوگوں کا آنا جانا رہتا۔

اس اخبار میں ہم چار آدمی مستقل کام کرتے تھے۔ چیف ایڈیٹر اکرام القادری (معروف شاعر، ادیب) تھے۔ میں معاون مدیر تھا۔ فاروق قریشی دو سال رہے اور پھر چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ ایک کلرک سلیم تھا اور ایک صاحب اکاؤنٹنٹ تھے۔ یہ سارے بہت اچھے لوگ تھے، ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ مولانا زاہد الراشدی اس دور میں جمیعت علمائے اسلام کے سیکرٹری اطلاعات تھے۔ ان کے ساتھ میرا بہت اچھا تعلق تھا اور اب بھی ہے۔ تمام تر نشر و اشاعت کی ذمہ داری انہی کی تھی، ہمارے اخبار کی ذمہ داری بھی انہی کی تھی۔ مولانا راشدی صاحب کی میگزین پر بہت زیادہ توجہ ہوتی۔ ہر ہفتے ان کا مضمون شائع ہوتا۔ وہ پالیسیوں پر پوری نظر رکھتے۔ اسی دور میں بھٹو صاحب کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی تحریک اٹھی تو اس میں بھی مولانا زاہد الراشدی سیکرٹری اطلاعات تھے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور جمعیت علمائے اسلام پاکستان کا مرکزی جریدہ تھا جو پاکستان اور اس سے باہر کی جمعیت کی بھرپور ترجمانی کرتا تھا۔ اس دور میں ہماری تنخواہ بہت ہی کم ہوا کرتی تھی۔ یہ کم تنخواہ البتہ ہمیں وقت پر ضرور مل جایا کرتی تھی۔ ہم لوگ مطمئن ہوتے تھے۔ تنخواہ ہر سال بڑھا بھی کرتی تھی اور اس کا فیصلہ جمعیت کے جنرل سیکرٹری مولانا مفتی محمود شوریٰ سے مل کر کرتے تھے۔ رنگ محل لاہور میں تین منزلہ دفتر تھا۔ یہ دفتر 1985ء تک برقرار رہا۔ ترجمان اسلام بند ہونے کا سال بھی یہی ہے۔ جماعت اسلامی اور کمیونسٹ تنظیموں کی طرح جمعیت علمائے اسلام میں باقاعدہ ادارے نہیں تھے۔ جن لوگوں کو مختلف شعبہ جات کا ذمہ دار بنایا جاتا تھا وہ عملاً کام نہیں کرتے تھے۔ کسی بھی سیاسی جماعت کے لیے اپنا نظم چلانے کے لیے شعبہ مالیات بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے لیکن جمعیت کا یہ شعبہ بہت ہی کمزور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جمعیت کا نشرواشاعت کا شعبہ دھکا سٹارٹ تھا۔ البتہ مولانا زاہدالراشدی سیکرٹری نشرواشاعت اپنی بساط کے مطابق حتی الامکان کوشش کرتے تھے کہ پریس سے باقاعدگی سے رابطہ رہے۔ لیکن مالی کمزوری کے باعث اس نظم میں جدت پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جمعیت علمائے اسلام کے مخلصین میں مولانا موصوف سرفہرست رکھے جا سکتے ہیں۔

میں ذاتی حیثیت میں کوشاں رہا کہ یہ جریدہ بند نہ ہو۔ اس سلسلے میں مولانا اجمل خان مرحوم، مولانا زاہدالراشدی، مولانا اجمل قادری اور مولانا فداءالرحمٰن درخواستی سے جریدے کو برقرار رکھنے کے لیے ملاقاتیں کرتا رہا، تجاویز بھی دیں کہ اگر ان پر عمل ہو جائے تو ہم جریدے کو آئندہ پانچ سال تک جاری رکھ سکتے ہیں لیکن میری کوششیں سودمند ثابت نہ ہو سکیں۔ حد یہ ہوگئی کہ اجمل قادری کی بے توجہی کے باعث رنگ محل کا جمعیت کا مرکزی دفتر بھی خالی کرنا پڑ گیا۔ اس کے بعد آج تک جمعیت کا ایسا عالی شان دفتر نہیں بن سکا۔

بعض دوست مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اس دور کے نامور علمائے کرام نے اپنے رسالے کی ادارت آپ جیسے ''غیر مولوی'' کو کیسے سونپ دی تھی؟۔ اصل میں یہ سوال اس زمانے میں بھی ہوتا تھا۔ بات یہ ہے کہ میں شروع ہی سے کلین شیو تھا۔ اس دور میں مجھے علماء اور دیگر مذہبی کارکن دیکھ کر بہت حیران ہوتے تھے۔ میرے بڑے بڑے بال تھے، جوانی عروج پر تھی اور میں مستقل طور پر کلین شیو کیا کرتا تھا۔ جس وقت مفتی محمود صاحب و دیگر علمائے کرام ترجمان اسلام کی میٹنگ میں ہمیں بلاتے تو بعض مولوی حضرات چہ میگوئیاں بھی کرتے تھے کہ ایک دینی جماعت میں یہ غیر مولوی کیوں ہے۔ لیکن یہ محض چہ میگوئیاں ہی ہوتیں اور براہ راست کھل کر کوئی بھی اعتراض نہیں کرتا تھا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دوسری طرف جو مفتی محمود، مولانا زاہد الراشدی اور دیگر علمائے کرام تھے وہ بڑے کھلے ذہن کے تھے۔ وہ اس معاملے میں زبردستی کرنا درست نہیں سمجھتے تھے، لہٰذا انہوں نے کبھی داڑھی رکھنے پر زور نہ دیا۔

میں نے قومی اتحاد کی تحریک دیکھی اور پھر جمعیت علمائے اسلام کو دو اور پھر مزید دھڑوں میں تقسیم ہوتے بھی دیکھا۔ جس وقت قومی اسمبلی میں مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب نے بھٹو صاحب کی حمایت کی تو اس کی وجہ سے گروپ بندی ہوگئی۔ مولانا ہزاروی گروپ الگ ہوگیا اور مولانا عبداللہ درخواستی کا گروپ الگ۔ مولانا فضل الرحمٰن، مولانا عبیداللہ انور اور مولانا درخواستی ایک پیج پر ہوگئے۔ مولانا درخواستی امیر بنا دیئے گئے اور مولانا عبیداللہ انور سیکرٹری جنرل بنے۔ اصل میں مولانا ہزاروی صاحب کا گروپ بہت مختصر لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان کے ساتھ چند لوگ ہی تھے۔ بڑا گروپ مولانا درخواستی کا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں بھٹو صاحب کا کوئی بھی ساتھ دینے کو تیار نہ تھا۔ اب مولانا ہزاروی کے متعلق لوگ مختلف باتیں بناتے ہیں کہ انہوں نے ذاتی مفاد کی خاطر بھٹو کا ساتھ دیا لیکن میرے تجربات کی حد تک وہ ساری باتیں غلط ہیں۔ کیونکہ ہزاروی صاحب بڑے مخلص آدمی تھے، لالچ سے دور تھے۔ ان کے کوئی بیٹا بھی نہیں تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ انہوں نے اپنے داماد کو نوازنے کے لیے بھٹو کی حمایت کی تھی لیکن یہ محض سطحی باتیں ہیں۔ میری مولانا ہزاروی سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی ایک بڑی علمی اور گہری شخصیت تھے۔ میں نے ان جیسا عالم دین نہیں دیکھا، وہ بالکل درویش صفت انسان تھے۔ دنیاداری نام کو نہ تھی۔ پھر جب جے یو آئی دو دھڑوں میں بٹ گئی اور اختلافات پیدا ہوگئے تو مولانا ہزاروی کبھی ترجمان اسلام کے دفتر نہیں آئے۔ جب یہ اختلاف شروع ہوا تو مولانا درخواستی اور مولانا عبیداللہ انور کی جمعیت علمائے اسلام کے لوگوں نے مولانا ہزاروی کے لوگوں سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا۔ پھر لاہور میں تو ویسے بھی ہزاروی صاحب کا کوئی بندہ نہ تھا۔ بس مولانا ہزاروی کے اپنے علاقہ بٹ گرام اور بفہ ہی میں ان کے چند ساتھی رہ گئے تھے باقی پورے ملک میں ہر طرف درخواستی گروپ ہی تھا۔

جب جمعیت علمائے اسلام دو دھڑوں میں بٹ گئی تو اس وقت مولانا فضل الرحمٰن اکوڑہ خٹک میں مولانا سمیع الحق صاحب کے مدرسہ جامعہ حقانیہ میں پڑھتے تھے اور کبھی کبھار ترجمان اسلام کے دفتر آیا کرتے۔ شروع میں ہماری ان سے مختصر ملاقاتیں ہی رہتیں۔ ہمیں علم نہ تھا کہ یہ نوجوان کل کو پوری جمعیت کی قیادت سنبھال لے گا۔ پھر جب جنرل ضیاء الحق کے دور میں مزید دو دھڑے بن گئے تو مولانا فضل الرحمٰن کی شخصیت ابھر کر سامنے آئی۔ اب ان حالات میں مولانا درخواستی اور مولانا عبیداللہ انور کا دھڑا الگ ہوگیا تھا اور مولانا فضل الرحمٰن کا دھڑا الگ بن گیا۔ دراصل مولانا فضل

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

الرحمٰن کا جو دھڑا تھا یہ فوج اور اسٹیبلشمنٹ کے سیاسی کردار کے بالکل خلاف تھا اور ضیاء الحق کے مارشل لاء پر کڑی تنقید کرتا تھا۔ مولانا درخواستی اور مولانا عبیداللہ انور کے دھڑے کے لوگ جنرل ضیاء الحق کے حوالے سے بالکل نرم گوشہ تو نہیں رکھتے تھے لیکن ان کا موقف یہ ضرور تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے جو اسلامی دفعات نافذ کی ہیں ان کی ہمیں حمایت کرنی چاہیے کیونکہ اسلامی دفعات کے نفاذ پر جنرل ضیاء الحق پر تنقید کرنے والے بہت تھے۔ خاص طور پر عورت کی گواہی اور زکوۃ کے مسئلے پر زیادہ کشمکش چل رہی تھی۔ انٹرنیشنل میڈیا جنرل ضیاء الحق کی بہت زیادہ مخالفت کر رہا تھا اور این جی اوز بہت زیادہ پیسہ خرچ کر رہی تھیں۔ اس لیے مولانا درخواستی و مولانا عبیداللہ انور کا موقف تھا کہ ان حالات میں ہمیں جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں تا کہ اسلام مخالف قوتوں کو موقع نہ مل سکے جبکہ مولانا فضل الرحمٰن کا موقف تھا کہ ضیاء الحق نے صرف نوے دن میں انتخابات کا وعدہ کیا تھا، وہ اپنا وعدہ پورا کر کے واپس چلے جائیں۔ اسلام نافذ کرنا اور احتساب کرنا ضیاء الحق کا کام نہیں ہے یہ جمہوری حکومت کا کام ہے۔ پھر جنرل ضیاء الحق کی مخالفت کی پاداش میں ایم آر ڈی کی تحریک میں مولانا فضل الرحمٰن نے جیل بھی کاٹی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایم آر ڈی کی تحریک میں عوام نے بالکل بھی حصہ نہیں لیا اور صرف سیاسی کارکنوں نے ہی حصہ لیا۔ جے یو آئی کے کارکن زیادہ حصہ لیتے رہے۔

میں ہر مسلک کی تمام مذہبی و علمی شخصیات کا احترام کرتا ہوں۔ میں ایک سال تک متواتر مولانا مودودی صاحب کی عصر کی مجلس میں شریک ہوتا رہا اور انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اب تو عصر کی ان مجالس کی روداد "5اے ذیلدار پارک" کے عنوان سے تین جلدوں کی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ مودودی صاحب کے مزاج میں تلخی بالکل نہ تھی، بڑے دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ بہت اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ ان کی مجالس میں ہم بہت سے نوجوان بیٹھا کرتے تھے۔ مولانا کی باتیں سنتے اور ان سے بہت کچھ سیکھتے۔ اس مجلس میں مولانا ہر موضوع پر گفتگو فرماتے۔ لوگ مختلف سوالات بھی کیا کرتے۔ مولانا بڑے خوبصورت، وجیہہ اور نفیس قسم کے انسان تھے۔ بڑے زندہ دل اور خوش مزاج تھے۔ ان میں بذلہ سنجی بھی کمال کی تھی۔ مخالفین کے بارے میں بھی ہمیشہ نرم گوشہ رکھتے۔ مودودی صاحب بہت اچھے انشا پرداز تھے، بہت ہی اعلیٰ پائے کی اردو لکھتے۔ میں مولانا کی نثر کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ عام گفتگو میں بہت ہی اچھے تھے لیکن سحر بیان مقرر نہ تھے۔ یہ میں ان کا کوئی منفی پہلو ہرگز نہیں بیان کر رہا، یہ بالکل بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک اچھا نثر نگار ایک اچھا خطیب بھی ہو۔ یہ تو خداداد صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ نظم، نثر اور تقریر کی جو صلاحیتیں میں نے ایک شخص میں یکساں طور پر دیکھی تھیں تو وہ آغا شورش کاشمیری تھے۔ آغا صاحب صحافی بھی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تھے، مدیر بھی، شاعر بھی، نثر نگار بھی اور خطیب بھی اور تھوڑے تھوڑے سیاستدان بھی تھے۔

مولانا مودودی صاحب ایک مُصلح کے طور پر سامنے آئے، وہ امت کی اصلاح کا مشن لے کر آئے تھے۔ جو ریفارمر قوم کی اصلاح کا علم اٹھا کر نکلتا ہے تو پھر وہ کوئی بھی اختلافی بات نہیں کرتا۔ مولانا خود بھی یہی فرماتے تھے کہ میں ایک ریفارمر ہوں اور ہم بھی انہیں ایک ریفارمر ہی سمجھتے ہیں۔ ان کا پروگرام بہت اچھا تھا لیکن ان کی کتاب خلافت وملوکیت سے تاریخِ اسلام کا ایک متنازع باب زندہ ہوگیا۔ اس کتاب سے دو متشدد طبقے وجود میں آ گئے۔ ایک متشدد طبقہ تو وہ تھا جو مودودی صاحب کے ساتھ کھڑا ہوگیا اور دوسرا طبقہ وہ تھا جو ان کی جان کا دشمن ہوگیا اور اس نے سخت مخالفت کی۔ ایک تیسرا طبقہ راہِ اعتدال پر تھا۔ اس کا موقف تھا کہ مولانا صاحب کو یہ موضوع نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔ ایک ریفارمر کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ اختلافی مسائل کو چھیڑے اور امت کو مزید انتشار کی طرف دھکیل دے۔ میرا اختلاف بھی یہی ہے کہ مولانا صاحب کو یہ موضوع ہرگز نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔ باقی ان کی شخصیت اور دینی کارناموں میں کوئی کلام نہیں۔ اللہ کریم ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائیں۔ آمین۔ جماعت اسلامی سے وابستہ نامور ادیب اور قلم کار نعیم صدیقی سے بھی میرا ملنا جلنا رہا۔ وہ ایک عظیم آدمی تھے۔ میاں طفیل صاحب بھی بہت نیک اور اچھے امیر جماعت تھے۔ ان میں بے شمار خوبیاں تھیں لیکن میرے خیال سے ان کی ضیاء الحق کی جا و بے جا حمایت موزوں نہ تھی۔ ذاتی حوالے سے وہ بہت اچھے انسان تھے، میرا کہنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ انہوں نے کسی لالچ میں ایسا کیا۔ محض اتنا کہوں گا کہ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ ان کی یہ پالیسی بالکل غلط تھی اور اس بات کو خود جماعت کے حلقے بھی تسلیم کرتے ہیں۔

جب میں ''ترجمان اسلام'' کا مدیر تھا تو میں نے 1977ء میں خان عبدالغفار خان (باچا خان) سے انٹرویو کیا۔ جنرل ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے کے کوئی ایک ہفتہ بعد میں کوئٹہ مشن روڈ پر واقع باچا خان کے دفتر گیا اور ان سے انٹرویو لیا۔ میں نے ملاقات کے لیے دروازے پر کھڑے گارڈ سے وقت مانگا تو اس نے کہا: ''اس میں وقت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ دیکھو سامنے باچا خان چارپائی پر بیٹھا ہے۔ جا کر اس سے مل لو''۔ میں اندر گیا تو بان کی سخت چارپائی پر باچا خان لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر سیدھے ہو کر اٹھ بیٹھے اور بڑے پرتپاک انداز میں ملے۔ میں نے تعارف کروایا کہ میں لاہور سے آیا ہوں اور مجھے رسالے کے لیے آپ کا انٹرویو کرنا ہے۔ میں چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ گیا تو انہوں نے مجھے سرہانے کی طرف بٹھایا اور خود پائنتی کی طرف بیٹھ گئے۔ یہ انٹرویو کوئی آدھے گھنٹے پر مشتمل تھا۔ اس زمانے میں (یعنی ضیاء الحق سے پہلے بھٹو دور میں)

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بلوچستان میں فوج کا آپریشن جاری تھااور جنرل ضیاء الحق کو اقتدار میں آئے ایک دو ہفتے ہی ہوئے تھے۔اس پر باچا خان نے بہت احتجاج کیا کہ بلوچوں اور پختونوں کا قتل کیا جار ہا ہےاور بہت ظلم ہو رہا ہے۔انہوں نے ضیاء الحق سے کہا کہ آپ نے تو کہا تھا کہ بھٹودور میں شروع کیے گئے آپریشن بند کر کے گرفتار بلوچوں اور پختونوں کو رہا کر دیا جائے گا لیکن ابھی تک ہمارے بہت سے لوگ جیلوں میں بند ہیں۔بھٹودور میں باچا خان کی نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) بلوچستان اور صوبہ سرحد (موجودہ نام خیبر پختونخواہ) میں برسراقتدار تھی۔یہ سیاسی حوالے سے انٹرویو تھا۔جس میں انہوں نے بھٹو کی بہت مخالفت کی اور انہیں جمہوریت کے روپ میں ایک بدترین آمر قرار دیا۔باچا خان فوج کے حق میں ہرگز نہیں تھے لیکن وہ کہتے تھے کہ یہ سب کچھ بھٹو کی وجہ سے ہوا ہے۔باچا خان نے کہا کہ بلوچستان میں جتنے بھی فوجی آپریشن ہوئے یہ بھٹوصاحب نے فوج سے کروائے۔فوج آپریشن نہیں کرنا چاہتی تھی۔اسی طرح انہوں نے بھٹوصاحب کی بنائی گئی ایف ایس ایف (فیڈرل سکیورٹی فورس) کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا کہ اس کے ذریعے سے بھٹو نے اپنے مخالفین پر بہت ظلم کیا۔

باچا خان کا یہ انٹرویو ترجمان اسلام میں چھپا تو اس پر بعض حلقوں کی طرف سے سخت ردِعمل آیا۔ جے یو آئی کے لوگوں کے خطوط بھی آئے جن میں احتجاج کیا گیا تھا کہ آپ نے ایک پارٹی کے ترجمان رسالے میں باچا خان کا انٹرویو کیوں شائع کیا ہے۔میں نے اس پر جے یو آئی کے سیکرٹری اطلاعات مولانا زاہدالراشدی صاحب سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔آئندہ احتیاط کیجیے گا۔

ترجمان اسلام کا آخری شمارہ 1985ء میں شائع ہوا اور پھر یہ جریدہ بند ہو گیا۔ترجمان اسلام ہی کے دنوں میں آغا شورش کاشمیری کے بیٹے آغا مسعود شورش سے میرا تعارف ہو گیا تھا۔آغا مسعود نے کہا کہ آپ میرے پاس ہفت روزہ چٹان میں بطور معاون مدیر آجائیں۔پھر میں نے دو سال تک چٹان میں کام کیا۔مجھے چٹان میں مکمل آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔اس وقت چٹان اپنے پورے عروج پر تھا،آغا شورش کاشمیری کا تو انتقال ہو چکا تھا لیکن یہ جریدہ ان کے انتقال کے بعد بھی کئی سال تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔لیکن شخصیت کا بہر حال اثر ہوتا ہےاور چٹان میں اب آغا شورش والی آب وتاب باقی نہیں رہی تھی۔کچھ یہ بھی معاملہ تھا کہ آغا صاحب کے بچوں نے بھی اخبار میں دلچسپی نہ لی۔آغا مسعود نے کچھ عرصہ اس اخبار کو زندہ رکھنے کی کوشش کی لیکن پھر یہ پرچہ بند ہو گیا۔

ہفت روزہ چٹان کے لیے میں نے بہت سی شخصیات کے انٹرویوز کیے تھے۔انہی میں سے ایک انٹرویو مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے والے لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کا تھا۔نیازی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

صاحب کا گھر فورٹریس سٹیڈیم لاہور کے سامنے ایک سوسائٹی میں تھا۔ جنرل نیازی کا انٹرویو تاریخی واقعہ تھا۔ وہ انٹرویو کے دوران خوف کی وجہ سے بار بار اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ انہوں نے مکمل خوف کی فضا میں انٹرویو دیا اور کسی خاص بات سے پردہ نہیں اٹھایا۔ وہ اس قدر ڈرے ہوئے تھے کہ انہوں نے انٹرویو میں دلچسپی ہی نہ لی۔ اصل میں وہ کسی بھی اخبار کو انٹرویو نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ مکمل خوف میں زندگی بسر کررہے تھے لیکن چونکہ ان دنوں ہفت روزہ چٹان ایک بڑا نام تھا تو اس لیے وہ انٹرویو دینے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ بڑا تہلکہ خیز انٹرویو ہوگا لیکن وہ ہتھیار ڈالنے کی اصل کہانی بتانے سے مسلسل کترا رہے تھے۔ انہوں نے نپے تلے الفاظ میں جواب دیے۔ عمومی باتیں تو بتاتے رہے لیکن کوئی خاص بات نہ کی۔ وہ فوجی قیادت سے بہت ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی ایسی بات کہہ دی تو میرے اور میرے بچوں کے لیے مسائل نہ پیدا ہوں۔ انہوں نے بس یہی کہا کہ ایسٹ پاکستان رائفلز تو مکمل طور پر بنگالیوں پر مشتمل تھی اور یہ مکتی باہنی کے ساتھ مل گئی تھی۔ اسی طرح پاک فوج میں موجود بنگالی فوجیوں کے رویے بھی تبدیل ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ بنگالی عوام بھی مکمل طور پر ہمارے خلاف ہوگئے تھے۔ یوں ہم بے دست و پا ہوکر رہ گئے۔ ہم صرف مغربی پاکستان کے فوجیوں کو ہی لڑا سکتے تھے لیکن یہ فوجی اس قابل نہیں تھے کہ ان حالات کا تن تنہا سامنا کرپاتے۔ ہتھیار ڈالنے کے حوالے سے انہوں نے اتنا کہا کہ یہ فیصلہ میرا ہرگز نہیں تھا یہ تو مرکز کا فیصلہ تھا جس پر ہم نے عمل کیا۔ ہمیں سرنڈر کرنے کے لیے اسلام آباد سے براہ راست احکامات ملے تھے۔

اب یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ اس وقت ہمارے جی ایچ کیو میں کیا ہو رہا تھا۔ جنرل یحییٰ جیسے لوگ کیا کر رہے تھے۔ یہ ہماری تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب ہے جس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنرل نیازی پر سقوط ڈھاکہ کا مقدمہ مکمل طور پر تھوپ دینا سخت ناانصافی ہے۔ ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ انہوں نے مرکز کا حکم مانا۔ اس کے علاوہ ہماری جتنی بھی لیڈرشپ تھی وہ حالات سے بے خبر تھی۔ انہوں نے بنگالی عوام کے رویوں کا تجزیہ نہیں کیا۔ اسلام آباد والوں کو معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ اب بنگالی عوام فوج اور مغربی پاکستان کی نفرت میں اس حد تک آگے جاچکے ہیں کہ جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہے۔ نفرت کا یہ بیج تو دراصل ہماری لیڈرشپ نے بویا تھا۔ اگر مشرقی پاکستان سے عوامی لیگ جیت چکی تھی تو پھر اسے اقتدار میں آنے کا حق دے دیا جاتا کیونکہ بنگالی عوام نے مجیب الرحمٰن کو ووٹ دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنرل نیازی اور مجیب الرحمٰن کو آپ لاکھ برا بھلا کہیں سب سے بڑی قصوروار اسلام آباد کی قیادت کو قرار دیں جس نے صرف نفرت پر مبنی رویوں کو پروان چڑھایا اور ملک کو دولخت کیا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان میں سو فیصد کامیابی حاصل کی تھی۔ اسے سو فیصد ہی کہیں گے کہ صرف ایک سیٹ کو چھوڑ کر اس نے تمام سیٹوں پر فتح حاصل کی تھی۔ صرف ایک سیٹ نوابزادہ نصراللہ کی پارٹی کے امیدوار نے جیتی تھی۔ پھر عوامی لیگ نے یہ نشستیں بنگال کے نام پر نہیں بلکہ پاکستان کے نام پر جیتی تھیں تو اب یہ ان کا حق بنتا تھا کہ انہیں حکومت میں شامل کیا جائے اور انہیں پورا پورا جمہوری حق دیا جائے۔ اب یہاں یہ بھی خرابی پیدا ہوگئی کہ فوج اقتدار میں سے اپنا حصہ مانگنے لگی تھی۔ یحییٰ خان کہتے تھے کہ مجھے ہی صدر بنایا جائے جس پر مجیب الرحمٰن کہتا تھا کہ آپ کو کیوں صدر بنایا جائے۔ آپ کا تو اقتدار میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ یحییٰ خان کے ساتھ بھٹو صاحب کمپرومائز کرنے کو تیار تھے لیکن شیخ مجیب بالکل تیار نہیں تھا وہ کہتا تھا کہ فوج کا اقتدار میں کیا کام ہے۔ پھر بھٹو مسلسل حیل وحجت کا مظاہرہ کرتے رہے اور وہ شیخ مجیب کے ساتھ بات چیت کے لیے نہ بیٹھے۔ بھٹو نے تو اپنے ارکان کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ جو بھی ڈھاکہ کے اجلاس میں جائے گا میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ اگر یہ اجلاس کامیاب ہو جاتا تو شاید پاکستان بچ جاتا۔ میرے خیال سے ڈھاکہ فال میں سیاسی قیادت سے زیادہ فوجی قیادت کا قصور تھا۔ اگر فوجی قیادت چاہتی تو بھٹو کو مجبور کر کے شیخ مجیب کے ساتھ بٹھا سکتی تھی۔ جہاں تک حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ کی بات ہے تو اس پر بھی عمل نہیں کیا گیا اور قصورواروں کو سزا نہیں مل سکی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حمودالرحمٰن کمیشن کی جو رپورٹ پبلک کی گئی ہے وہ اصل رپورٹ نہیں ہے۔ اصل رپورٹ کو آج تک پوشیدہ ہی رکھا گیا ہے۔

جب میں چٹان میں کام کرتا تھا تو وہاں پر بہت سی علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات کا آنا جانا لگا رہتا۔ اختر کاشمیری بھی ان دنوں چٹان میں تھے۔ باقاعدہ کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ وہ بعد میں مستقل طور پر امریکہ چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے اور لکھنا تو میرے خیال سے بالکل چھوڑ چکے ہیں۔ مجھ سے پہلے چٹان کے ایڈیٹر ڈاکٹر مسکین علی حجازی صاحب تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ اس جریدے سے وابستہ رہے۔ میں نے چٹان میں دو ادوار میں کام کیا۔ 1985ء سے 1987ء تک اور دوبارہ 1988ء کے اوائل میں آیا۔ سیالکوٹ کے آصف بھلی اس وقت ایم اے جرنلزم کر رہے تھے۔ انٹرن شپ کے سلسلے میں انہوں نے ''چٹان'' کے لیے کئی انٹرویوز کیے جو میری کافی محنت کے بعد ہی قابل اشاعت ہوتے تھے۔ آج کل وہ ایک اچھے کالم نگار کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ چٹان میں جب 1988ء میں دوبارہ آیا تو اب تنخواہوں کے معاملات درست نہ تھے۔ کیونکہ آغا شورش صاحب کے بچوں کی توجہ ہی نہیں تھی جبکہ میری گزر بسر تو اخبار نویسی ہی پر منحصر ہوتی تھی۔ اب اگر تنخواہ وقت پر نہ ملتی تو گزارا ہی مشکل ہو جاتا تھا۔ یوں میں نے پھر چٹان

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اخبار کو خدا حافظ کہہ دیا۔

انہی دنوں میری ملاقات معروف صحافی زاہد ملک (چیف ایڈیٹر ہفت روزہ حرمت) سے ہوئی تو انہوں نے مجھے اپنے پاس اسلام آباد بلا لیا اور اپنے اخبار میں ملازمت دے دی۔ زاہد ملک صاحب بڑی خوبیوں کے مالک تھے، نیک اور ملنسار شخصیت تھے۔ میں نے حرمت میں صرف آٹھ مہینے کام کیا لیکن تنخواہ کا معاملہ یہاں بھی چٹان سے مختلف نہیں تھا۔ یوں اسے بھی خدا حافظ کہنا پڑا۔

جب میں لاہور سے اسلام آباد کی صحافت میں آیا تو میں نے دیکھا کہ اس شہر اقتدار کا جرنلزم ''Paid جرنلزم'' ہے۔ وہاں کے کئی صحافی غیر ملکی سفارتخانوں کے لیے خفیہ کام کرتے تھے اور کچھ لوگ اسٹیبلشمنٹ کے لیے کام کر کے اپنی جیبیں بھرتے تھے۔ اسی طرح کچھ لوگ غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں کے بھی آلہ کار تھے۔ یہ جنرل ضیاء الحق کا دور تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ میرا گزارا تو صرف تنخواہ پر ہی ہوتا تھا اور وہ بھی بروقت نہیں ملتی تھی۔ یوں میں حرمت کو خیر باد کہہ کر، زاہد ملک صاحب سے معذرت کر کے لاہور واپس آ گیا۔ لاہور واپس آیا تو انہی دنوں ہمارے ایک دیرینہ دوست نے پندرہ روزہ ''آف دی ریکارڈ'' کا اجراء کیا اور مجھے اس کی ذمہ داری دے دی۔ اس اخبار کے مالک قاضی سہیل امین تھے جو زمانہ طالب علمی میں ایف سی کالج لاہور میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم رہے۔ یہ میرے بڑے اچھے دوست تھے۔ یہ اخبار 1988ء میں شروع ہوا اور ہم بمشکل ہی اسے دو سال تک چلا پائے اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے یہ اخبار بند ہو گیا۔ اس کے بعد بھی میں مختلف چھوٹے بڑے اخبارات میں کام کرتا رہا۔ مجھے ان تجربات سے یہ سیکھنے کو ملا کہ یہ صحافت کانٹوں کی سیج ہے۔ اور یہ کانٹے بھی تھے بے ایمانی اور بددیانتی کے۔ میری تربیت مذہبی بنیادوں پر ہوئی تھی اور ''زرد صحافت'' کا علم بلند کرنا میرے بس میں نہیں تھا اور جہاں تک صاف ستھری صحافت تھی تو اس سے تو دو وقت کی روٹی ہی پوری نہیں ہوتی تھی۔

ملک صاحب خود کتابیں نہیں لکھتے تھے۔ ان کی تمام کتابیں ''کمپائلڈ'' ہیں۔ یعنی اِدھر اُدھر سے مواد اکٹھا کر کے انہیں کتابوں کی صورت دے دی گئی ہے۔ کمپائلیشن کا یہ عمل تین چار لوگ کرتے تھے۔ ملک صاحب تو بہت مصروف انسان تھے، ان کے پاس کتابیں لکھنے کا وقت ہی کہاں تھا۔ اصل میں پاکستان میں جتنے بھی نامور لوگوں کی کتابیں چھپتی ہیں وہ اکثر اِدھر اُدھر سے مواد جمع کر کے ہی کمپائل کر دی جاتی ہیں یا پھر اچھے مصنفین کو پیسے دے کر لکھوالی جاتی ہیں۔ کمپائلیشن کا یہ عمل کئی لوگ کرتے ہیں اور ٹائٹل پر مصنف کا نام دے دیا جاتا ہے اور ''مصنف'' صرف ایک نظر اس کو دیکھ کر فائنل کر دیتا ہے۔ یہاں اکثر بڑے لوگوں کی کتابیں ایسے ہی چھپتی ہیں۔ 2013ء میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

غالباً نوائے وقت نے ایک فیچر شائع کیا تھا۔ان دنوں ڈاکٹر طاہرالقادری صاحب کا دھرنا جاری تھا اور یہ فیچر ان کی ٹیم کے ایک سابق رکن نے لکھا تھا۔انہوں نے لکھا کہ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ قادری صاحب آج کل نارویجن (ناروے کی زبان) زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کر رہے ہیں۔میری گزارش صرف اتنی ہے کہ وہ ترجمہ لکھنے سے پہلے کم ازکم نارویجن زبان سیکھ لیں''۔پھر انہوں نے پوری ہسٹری لکھی تھی کہ قادری صاحب نے مختلف کتابیں کیسے لکھیں۔پھر انہوں نے پوری ٹیم کے نام بھی لکھے جو یہ کتابیں تیار کرتی ہے۔یہ تو ہوگئی قادری صاحب کی تصانیف کی بات۔البتہ میں اس بات کا معترف ہوں کہ وہ اپنی تقریر اور گفتگو سے لوگوں کو قائل کر لیتے ہیں اور ایک اچھے مقرر ضرور ہیں۔باقی کمی کوتاہیاں کس انسان میں نہیں ہوتیں۔

میری زندگی کی اہم یادداشتوں میں سفر افغانستان محفوظ ہے۔میں افغان جہاد کے دوران بحیثیت صحافی دو مرتبہ افغانستان گیا۔اس وقت روسی افواج کا انخلاء نہیں ہوا تھا۔ہم پہلی مرتبہ خوست گئے۔حقانی گروپ کے مولانا یونس حقانی،مولانا جلال الدین حقانی کا شمار افغان مجاہدین کے بڑے گروپوں میں ہوتا تھا۔ہماری مولانا جلال الدین حقانی،انجینئر گلبدین حکمت یار اور دیگر افغان مجاہد لیڈروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔افغان مجاہدین زیادہ تر تو اکوڑہ خٹک کے مدرسہ جامعہ حقانیہ سے ہی وابستہ تھے۔باقی انجینئر گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی کو پاکستان میں جماعت اسلامی نے کیش کروا لیا تھا۔اس کے علاوہ زیادہ تر دیوبندی تنظیمیں ہی تھیں جو افغان جہاد میں حصہ لے رہی تھیں۔احمد شاہ مسعود تھے جنہیں آپ جدید زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ افغان مجاہدین کے ایک ''لبرل گروپ'' کو لیڈ کر رہے تھے۔افغانستان جاتے ہوئے میری انجینئر گلبدین حکمت یار سے پشاور میں ملاقات ہوئی اور مولانا جلال الدین حقانی سے دو مرتبہ افغانستان کے شہر خوست میں ملاقاتیں ہوئیں۔جس وقت مجاہدین نے خوست فتح کیا اور روسی افواج یہاں سے پسپا ہوگئیں تو اس وقت ہم خوست دیکھنے گئے۔ہم لاہور سے چھ لوگ خوست گئے تھے جن میں دو ڈاکٹر،دو صحافی اور دو اور ساتھی تھے۔افغان جہاد کے دنوں میں جماعت اسلامی سے ایک گروپ منحرف ہو کر الگ ہوگیا تھا۔وہ گروپ افغان جہادیوں کے لیے ایک رسالہ ''بیدار'' شائع کرتا تھا اور مجھے اس رسالے کا ایڈیٹر بنایا گیا تھا۔جماعت اسلامی کا یہ منحرف گروپ جماعت اسلامی اور انجینئر گلبدین حکمت یار کے خلاف ہوگیا تھا اور جلال الدین حقانی گروپ کو سپورٹ کرتا تھا۔یہاں میں آپ کو بتاتا چلوں کہ جب خوست فتح ہوا تو یہ جلال الدین حقانی کے مجاہدین نے روسی افواج کے خلاف کئی سال لڑنے کے بعد فتح کیا تھا۔اصل حقیقت بھی یہی تھی کہ یہ علاقہ حقانی ہی کے لوگوں نے فتح کیا تھا۔کیونکہ ایک مدت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے حقانی مجاہدین بڑی تعداد میں خوست اور گردونواح کے علاقوں میں روسی فوج کے خلاف لڑ رہے تھے اور حزب اسلامی اس علاقے میں موجود نہ تھی۔ اسی طرح احمد شاہ مسعود شمالی افغانستان میں لڑ رہا تھا۔

جب خوست فتح ہو گیا تو اس سے اگلے دن گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی کے لوگ آ گئے اور انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ خوست ہم نے فتح کیا ہے۔ اس وقت خوست میں روسی فوج کے چھوڑے گئے کچھ مورچے خالی پڑے تھے جن پر ابھی تک حقانی مجاہدین نے قبضہ نہیں کیا تھا لیکن شہر خوست پورا حقانی مجاہدین کے پاس تھا۔ یوں ان خالی مورچوں پر حکمت یار کے لوگوں نے قبضہ کر لیا اور حقانی مجاہدین پر فائرنگ شروع کر دی۔ جواب میں بھی فائرنگ کی گئی جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ حکمت یار نے جماعت اسلامی پاکستان کی لیڈرشپ کو خوست میں لے جا کر پریس کانفرنس کر ڈالی کہ یہ ہم نے فتح کیا ہے۔ یاد رہے کہ اس وقت روس پورے افغانستان سے نہیں نکلا تھا اور ابھی صرف خوست ہی فتح ہوا تھا اور یوں مجاہدین ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو کر ایک دوسرے کی گردنیں اڑانے لگ گئے تھے۔ اصل میں افغان مجاہدین کی قیادت کا ایک حصہ صرف اور صرف مالی مفادات کا ہی اسیر تھا۔ جس وقت ہم خوست پہنچے اور جلال الدین حقانی سے ملے تو میں نے ان سے اس کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "کوئی بات نہیں ہے۔ حکمت یار کے لوگ بھی ہمارے ہی مجاہدین ہیں۔ ہمارے بھائی ہیں۔ اگر وہ فتح کا سہرا اپنے سر پر سجانا چاہتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے"۔ ہم نے افغانستان کے کچھ اور علاقے بھی دیکھے۔ ہماری احمد شاہ مسعود کے ساتھ ملاقات کی بڑی خواہش تھی جو پوری نہ ہو سکی کیونکہ وہ افغانستان کے شمالی علاقہ جات میں روسی فوج کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ان کے علاقے روسی سرحدوں کے قریب تھے جہاں پر ہمارا پہنچنا ممکن نہ تھا۔ میں جلال الدین حقانی کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ وہ بڑے وجیہہ اور جسیم تھے۔ خوبصورت گفتگو کرتے تھے اور متاثر کرتے تھے۔

حرمت اور آف دی ریکارڈ اخبارات کے بعد بھی میں مختلف چھوٹے بڑے اخبارات میں کام کرتا رہا۔ مجھے ان تجربات سے یہ سیکھنے کو ملا کہ یہ صحافت کانٹوں کی سیج ہے۔ اور یہ کانٹے بھی تھے بے ایمانی اور بددیانتی کے۔ میری تربیت مذہبی بنیادوں پر ہوئی تھی اور "زرد صحافت" کا علم بلند کرنا میرے بس میں نہیں تھا اور جہاں تک صاف ستھری صحافت تھی تو اس سے تو دو وقت کی روٹی ہی پوری نہیں ہوتی تھی۔ بالآخر میں نے اخبار نویسی کو خیر باد کہہ دیا اور 1990ء میں نصابی کتابوں کی طرف آ گیا۔ کیونکہ لکھنے والا کام تو میرا پہلے بھی تھا اور میں بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھایا کرتا تھا۔ 1990ء سے اب تک اسی کام سے وابستہ ہوں اور دسویں جماعت تک کی تدریسی کتابوں پر کام کرتا ہوں۔ اب

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تک میرے بہت سے خلاصے اور دیگر کتابیں چھپ چکی ہیں۔اردو بازار کے جو پبلشر ہیں وہ مصنفین کا بہت استحصال کرتے ہیں۔خاص طور پر نصابی کتابوں کے مصنفین کا۔اس میں ہوتا یہ ہے کہ پبلشر حضرات ہم سے کتاب لکھوا لیتے ہیں اور ہمیں صرف پہلی مرتبہ کچھ رقم دے دیتے ہیں اور پھر سالہا سال تک اس کتاب کو چھاپ کر پیسے کماتے ہیں لیکن مصنف کو بس شروع میں ہی تھوڑا سا معاوضہ دے کر فارغ کر دیتے ہیں۔اصول تو یہ ہونا چاہیے کہ سلیبس کے تبدیل ہونے تک مصنفین کو بھی معاوضہ ملتا رہے لیکن ایسا نہیں ہے۔یہاں ہمیں ایک صفحے کے 100 یا 200 روپے دے دیے جاتے ہیں۔حالانکہ آتھر (مصنف) کو تو رائلٹی ملنی چاہیے جس کا پوری دنیا میں رواج ہے۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، پیراماؤنٹ پبلشرز وغیرہ چند ایک اچھے ادارے ہیں جو مصنف کو پورا وقت دیتے ہیں اور پورا پورا معاوضہ دیتے ہیں۔یہاں تو مصنف کو وقت بھی نہیں دیا جاتا۔ایک موضوع پر اگر سال میں کام ہونا ہے تو یہ اچانک کہہ دیتے ہیں کہ آپ نے اس پر ایک ماہ میں لکھنا ہے۔اب جو کتاب ایک سال میں لکھی جانی ہے اس کو مہینے میں لکھا جائے گا تو اس کا معیار کیا ہوگا جبکہ درسی کتاب کا معاملہ تو بہت ہی حساس ہوتا ہے۔پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ایک سرکاری ادارہ ہے۔اس میں مصنفین کو اچھا معاوضہ دیا جاتا ہے اور یہ ان کے مستقل ملازم ہوتے ہیں جنہیں ''ماہرین مضمون'' کہا جاتا ہے۔یہ ادارہ مصنفین کو بھرپور سہولت دیتا ہے۔اس کا ایک مکمل سیٹ اپ ہے لیکن اس کے باوجود بھی ان کی تدریسی کتابوں کا معیار وہ نہیں جو ہونا چاہیے۔

میری بڑی خواہش تھی کہ میں چند اہم شخصیات پر تحقیقی کام کروں لیکن مجھے غم روزگار ہی سے فرصت نہیں مل سکی۔جنرل حمید گل کے متعلق میری شدید خواہش رہی کہ ان پر ایک بڑا تحقیقی کام کروں کیونکہ وہ فوج کی حکمت عملی اور ملک کی خارجہ پالیسی کے متعلق بڑے باخبر تھے۔حقیقت یہ ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی صرف فوج ہی طے کرتی ہے۔میں بہت سا تحقیقی کام کرنا چاہتا تھا جس کا مجھے موقع نہیں مل سکا۔بعض لوگ جمعیت علمائے اسلام کو جمعیت علمائے ہند ہی کا تسلسل سمجھتے ہیں؟ اس پر میرا اپنا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جی ہاں یہ جمعیت علمائے ہند کا ہی تسلسل ہے۔یہ تسلسل اس طرح سے ہے کہ جب ہم لوگ بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آئے یا جو لوگ پہلے سے ہی یہاں پر موجود تھے۔یہ وہی نظریاتی لوگ تھے جو جمعیت علمائے ہند کے ساتھ منسلک تھے۔جب پاکستان بن گیا تو پھر قیادت نے فیصلہ کیا کہ اس جماعت کا نام بدل دیا جائے۔یوں میرے نزدیک یہ جمعیت علمائے ہند کا ہی تسلسل ہے۔اگر کوئی نظریاتی حوالے سے اس لمبی بحث میں جائے تو یہ پھر ایک الگ اور مستقل موضوع ہے۔بعض حلقے جمعیت علمائے اسلام کو ''ترقی پسند'' جماعتوں میں شمار کرتے ہیں اور بعض

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مصنفین نے ایسی کتابیں بھی لکھی ہیں تو اس پر میری رائے یہ ہے۔ دیکھیے کہ تمام مذہبی جماعتوں میں سے جے یو آئی ہی وہ واحد جماعت ہے جو ترقی پسند ہے۔ کیونکہ دوسری مذہبی جماعتوں میں جو دقیانوسی سوچ پائی جاتی ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ یہ مذہبی جماعتیں بہت زیادہ تنگ نظر ہیں اور یہ جدت پسندی کو قبول نہیں کرتیں جبکہ جے یو آئی میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اب جس زمانے میں تبدیلیاں واقع ہو رہی ہوں تو ان کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے، یہی جے یو آئی کی سوچ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جے یو آئی محض مذہبی پارٹی نہیں بلکہ ایک مکمل طور پر سیاسی جماعت ہے۔ میرے خیال سے جے یو آئی مذہبی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ جہاں تک مولانا فضل الرحمٰن کی وجہ سے اسے شخصی جماعت کہا جاتا ہے تو یہ تاثر بالکل غلط ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن نے اپنی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں سے خود کو منوایا ہے اور وہ صحیح معنوں میں جے یو آئی کا نظریاتی تشخص اجاگر کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ہر دور میں مولانا فضل الرحمٰن غیر جمہوری قوتوں کے خلاف میدان میں رہے ہیں۔ جے یو آئی کے کچھ حلقوں کا خیال تھا کہ بعض اوقات حالات کی وجہ سے اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ دینا چاہیے لیکن مولانا نے صاف انکار کیا اور کہا کہ جب ہم نے انگریز جیسے آمر کا ساتھ نہیں دیا تو پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ کیوں دیں۔ اسی بنیاد پر مولانا سمیع الحق صاحب اور دیگر کچھ حلقے مولانا سے نالاں رہے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مولانا فضل الرحمٰن کا موقف بالکل درست ہے اور وہ ایک خالص نظریاتی جماعت کو اسٹیبلشمنٹ کی گود میں ڈالنا گوارا نہیں کرتے۔

یہ بھی المیہ ہے کہ ہمارا اکثر مذہبی طبقہ ''ترقی پسندی'' کو منفی معنوں میں لیتا ہے۔ دیکھیے کہ جو اسلام سے بیزار لوگ ہیں ان کے ہاں تو ترقی پسندی یہ ہے کہ مذہب کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا جائے لیکن میرے نزدیک ترقی پسندی اور مذہب ساتھ ساتھ ہی ہیں۔ یہ جو ''اجتہاد'' ہے یہ دراصل ترقی پسندی ہی کا مظہر ہے۔ اسلام اور ترقی پسندی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ اجتہاد اور ترقی پسندی ہی تو ہے کہ علماء نے بتایا کہ جب موبائل فون جیب میں ہو اور اس کی گھنٹی بج جائے تو آپ اس کو بند کر سکتے ہیں، اس سے نماز نہیں ٹوٹے گی۔ اگر ہم پرانی ڈگر پر ہی چلتے رہیں تو پھر ہم ایسے مسائل کا حل کیسے نکال سکتے ہیں؟۔ جے یو آئی نے ہمیشہ اعتدال کی سیاست کی ہے اور متشددانہ مذہبی و سیاسی رویوں کو رد کیا ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کو ترقی پسند ہی ہونا چاہیے اور اسے دقیانوسی سوچ سے بالاتر ہونا چاہیے۔ مفتی محمود صاحب نے خیبر پختونخواہ کی وزارت اعلیٰ سے استعفا کیوں دیا تھا؟ اس کا پس منظر یہ ہے کہ بھٹو صاحب بلوچستان میں اپنی حکومت بنانے کے خواہشمند تھے اور ان کی وہاں پر چند ہی نشستیں تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح اپنی حکومت بنالیں لیکن انہیں کوئی حل نظر نہیں آ رہا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تھا۔اس کے لیے سب سے پہلے انہوں نے وہاں پر گورنر راج نافذ کر دیا۔گورنر راج نافذ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اسمبلی کو تھوڑی دیر کے لیے خاموش کر دیتے ہیں اور وہ کام نہیں کر سکتی۔ اس دوران بھٹو نے یہ کیا کہ جے یو آئی اور نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) اور کچھ آزاد ارکان کو توڑنا شروع کر دیا۔ پھر یہ کیا کہ چند لوگوں کو ملا کر، کسی کو خرید کر اور کسی کو ڈرا کر اپنے ساتھ ملایا اور حکومت بنالی۔ اس زمانے میں موچی گیٹ لاہور میں ایک جلسہ ہوا جس میں خان عبدالولی خان نے بھٹو صاحب کی اس گنتی کو پورا کرنے کے متعلق بڑا دلچسپ لطیفہ سنایا کہ:

''بھٹو نے اسمبلی میں اپنی اکثریت ایسے ثابت کی ہے کہ ہمارے قبائل میں ایک نوجوان کی شادی ہوئی اور تین ماہ بعد اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔اب قبیلے میں انتشار پیدا ہوا اور ایک جرگہ بٹھایا گیا۔اس نوجوان نے جرگے کو بتایا کہ آپ لوگ بوڑھے ہو گئے ہیں اور آپ کی عقل کام نہیں کرتی۔

خان عبدالولی خان کہنے لگے کہ جرگے کو جو بات اس نوجوان نے سمجھائی تھی وہی بات اب ہمیں بھٹو صاحب سمجھاتے ہیں۔اس نوجوان نے کہا کہ دیکھیے، میری شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟ جرگے نے کہا تین ماہ۔نوجوان بولا، میری بیوی کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا۔ جرگے نے جواب دیا، تین ماہ۔نوجوان نے پھر کہا کہ اب بیٹے کی پیدائش کتنے عرصے بعد ہوئی؟ جرگے نے جواب دیا کہ تین ماہ بعد۔اس پر نوجوان بولا کہ اب کل کتنے ماہ ہو گئے؟ جرگے نے جواب دیا کہ نو ماہ۔اس پر نوجوان نے کہا کہ دیکھو نو ماہ مکمل ہو گئے ہیں اور آپ خوانخواہ اس بات کو متنازعہ بنا رہے ہیں''۔عبدالولی خان کہنے لگے کہ بالکل یہی کام بھٹو نے بھی کیا ہے اور اسی نوجوان کی طرح اسمبلی میں اپنی گنتی پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔یوں بھٹو صاحب کے اس کام کے ردعمل کے طور پر احتجاج کرتے ہوئے مفتی محمود صاحب نے وزارت اعلیٰ سے استعفا دے دیا۔میرے خیال سے یہ مفتی صاحب کا ایک تاریخی فیصلہ تھا اور شاید ہی پاکستان کی تاریخ میں کسی نے جمہوری انداز میں احتجاج کرتے ہوئے اتنے بڑے منصب سے یوں استعفا دیا ہو جبکہ بھٹو سرحد میں کسی قسم کی مداخلت بھی نہیں کر رہے تھے کہ جس کی وجہ سے مفتی محمود صاحب کو مشکل پیش آ رہی ہو۔

سوال یہ ہے کہ مولانا عبیداللہ انور اور مولانا عبداللہ درخواستی بھی تو جے یو آئی کے سینئر راہنما تھے۔ پھر انہوں نے جنرل ضیاء الحق کا ساتھ کیوں دیا تھا؟۔ دیکھیے کہ ان لوگوں نے ضیاء الحق کا ساتھ بالکل بھی نہیں دیا تھا۔ان حضرات کا خیال تھا کہ ضیاء الحق نے اسلامی نظام کے نفاذ کا اعلان کیا ہے۔ختم نبوت کے حوالے سے قانون سازی کی ہے۔زکوۃ کے نفاذ کے لیے بھی کام کیا۔عورت کی گواہی کے بارے میں بھی بات ہو رہی تھی۔بینکوں کو بھی کہا گیا تھا کہ آپ سود کو ختم کر کے اپنا نظام

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اسلام کے نظام مالیات کے متعلق ڈھالنے کی کوشش کریں۔اسی طرح دفتروں میں نمازوں کا اہتمام شروع ہوگیا تھا۔ججز اور وکلاء کو بھی کہا گیا تھا کہ وہ اسلامی لباس پہنیں۔ان حالات میں مولانا عبید اللہ انور اور مولانا عبداللہ درخواستی کا موقف تھا کہ ہم جنرل ضیاء الحق کا ظاہر دیکھ رہے ہیں۔ہمیں اس کی مخالفت کرنے بجائے اس کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں۔اس سے زیادہ ان حضرات کا موقف کچھ نہیں تھا۔اب یہاں پر جمعیت علمائے اسلام پھر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔مولانا عبیداللہ انور اور مولانا عبداللہ درخواستی وغیرہ ایک طرف تھے۔صدر الشہید (بنوں سے ایم این اے)۔ قلات کے صدیق شاہ صاحب اور مولانا امیر المعروف بجلی گھر پشاور والے، یہ کچھ لوگ مولانا عبیداللہ انور و درخواستی کے ساتھ تھے۔اور جو دوسرا گروپ تھا اس کی قیادت مولانا فضل الرحمٰن کے پاس آ گئی۔یہی گروپ صحیح معنوں میں جمہوری گروپ تھا۔اور آج بھی یہی گروپ مضبوط ہے۔میں نے شیرانوالہ گیٹ مرکز میں بہت سا وقت گزارا ہے اور میری وہاں بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

اجمل قادری ایک سیاسی شخصیت تو بالکل بھی نہیں ہیں اور اپنی طبیعت کے حوالے سے روحانی شخصیت بھی نہیں ہیں۔ہاں طبیعت کے حوالے سے ان کا چھوٹا بھائی اکمل قادری ایک روحانی شخصیت ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس نے ایم بی ایس کیا اور دنیا داری کی طرف نکل گیا اور حضرت لاہوریؒ کی روحانی گدی بامر مجبوری اجمل قادری کے پاس آ گئی۔اب حضرت لاہوریؒ کے سلسلے کے متوسلین نے انہیں دل سے تو قبول نہیں کیا لیکن وہ کیا کر سکتے ہیں۔وہ بہرحال یہی سوچتے ہیں کہ جو بھی ہے آخر حضرت لاہوریؒ کی اولاد ہے اور ان کی نشانی ہے۔نسل در نسل ایک سلسلہ چل رہا ہو تو پھر اس کو چلانا چاہیے۔بہرحال یہ میں نہیں کہہ رہا، یہ طے شدہ بات ہے کہ اجمل قادری کے پاس تصوف و روحانیت کے حوالے سے کچھ بھی نہیں ہے۔ان کا طرز عمل ایک بالکل عام اور خشک آدمی جیسا ہے، وہ روحانیت والا نہیں ہے۔البتہ جب انہیں گدی مل گئی تو انہوں نے خود کو اس میں سمونے کی کوشش ضرور کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ہاں اگر روحانی سلسلہ اکمل قادری کے پاس ہوتا تو شاید بہت بہتر ہوتا۔حضرت لاہوریؒ کا جو سلسلہ پورے ملک میں ہونا چاہیے تھا وہ اب صرف شیرانوالہ گیٹ تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جے یو آئی ایک عوامی پارٹی نہیں بن سکی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جمعیت والے زیادہ تر مذہبی لوگوں اور مدارس کے لوگوں کو ہی اپنے قریب کرتے ہیں۔انہوں نے محنت ہی نہیں کی کہ جمعیت کو ایک عام سیاسی جماعت بنایا جائے۔اگر کوشش کی جاتی تو میرے خیال سے یہ ایک بڑی سیاسی جماعت بن سکتی تھی۔کیونکہ جو نظریہ اس جماعت کے پاس ہے وہ کسی کے پاس نہیں۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

البتہ مفتی محمود کے دور میں یہ ضرور ہوا تھا کہ تھوڑا سا عرصہ ایسا آیا تھا کہ یہ ایک عوامی جماعت بنتی جارہی تھی۔ جلسوں، پروگراموں میں عام آدمی شریک ہوتا تھا۔ پنجاب میں بھی عام دنیا دار لوگ جلسوں میں آتے تھے اور موقف سنتے تھے۔ اس وقت اگر محنت کی جاتی تو یہ ایک بہت بڑی سیاسی جماعت بن سکتی تھی۔

رہا یہ سوال کہ جمعیت علمائے اسلام کو بعض حلقے تحریک پاکستان اور پھر قیام پاکستان کا مخالف قرار دیتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد جمعیت کا یہ موقف بالکل ہی ختم ہو گیا ہے۔ کیونکہ قیام پاکستان کے بعد ہمارے بزرگوں نے واضح کہا تھا کہ اب یہ پاکستان تمہارا وطن ہے اس کی ترقی وخوشحالی کے لیے کام کرو۔ اور یہاں یہ بات بھی بتا تا چلوں کہ یہ وہی موقف ہے جو قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ہندوستان کی آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر اور دلی میٹروپولیٹن کے صدر کو دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر نے قائداعظمؒ سے سوال کیا تھا کہ آپ ہمیں کس کے سہارے پر چھوڑ کر جارہے ہیں۔ ہمیں تو اندازہ ہی نہ تھا کہ پاکستان بن جائے گا اور ہم اپنے ہی ملک میں غیر ملکی ہو جائیں گے۔ اس پر قائداعظمؒ نے تاریخی جواب دیتے ہوئے کہا: ''اب یہ (یعنی بھارت) آپ کا وطن ہے۔ اس کی خوشحالی اور ترقی کے لیے آپ کام کریں''۔ یہ بالکل وہی موقف ہے جو ہمارے علماء نے قیام پاکستان کے وقت پیش کیا تھا۔

پانچ جولائی 1977ء کو میں ٹھل نو ضلع جیکب آباد میں جمعیت علمائے اسلام کے ایک رکن کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ اس زمانے میں سندھ کے اکثر دیہات میں ٹیلی وژن نہیں تھے اور لوگ ریڈیو پر خبریں سنا کرتے تھے۔ میرے میزبان نے چھ بجے کی خبریں سننے کے لیے ریڈیو آن کیا تو پہلی دو خبریں قومی اتحاد اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان مذاکرات کے تعطل کی تھیں۔ پھر ایک دم خاموشی چھا گئی اور ریڈیو پاکستان پر اعلان ہوا کہ فوج نے وزیراعظم اور ان کی کابینہ کو حفاظت میں لے لیا ہے۔ یہ ضیائی مارشل لاء کی سب سے پہلی خبر تھی جو میں نے سنی۔ یہ خبر میرے لیے کوئی معمولی خبر نہ تھی۔ اس سے قبل بھٹو کے خلاف عوامی سطح پر قومی اتحاد کی تحریک باقاعدہ نو اپریل 1977ء کو پنجاب اسمبلی کے ایک اجلاس کے خلاف لاہور میں شروع ہوئی تھی جو جمہوری تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب ہے۔ اپوزیشن نئے الیکشن چاہتی تھی جبکہ بھٹو صاحب دھاندلی زدہ چند نشستوں پر دوبارہ الیکشن کروانا چاہتے تھے۔ شاید دونوں کے مابین سیاسی معاہدہ ہو جاتا اور پاکستان مارشل لاء سے بچ جاتا لیکن بھٹو کو ان کی انا اور ان کے ''جی حضور'' ساتھی اس حد تک لے آئے تھے۔، یہ ساتھی انہیں آخر دم تک روکتے رہے۔ ان دنوں یہ بات عام تھی کہ دس جولائی سے پہلے پہلے معاہدہ ہونے والا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تھا جس کی بھنک جرنیلوں کے کانوں میں پڑ گئی تھی۔ یہ جرنیل اس لوہے کو ٹھنڈا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آخر کار ان جرنیلوں نے ضرب لگا دی اور پاکستان ایک طویل عرصہ کے لیے آمرانہ تسلط کی دہکتی بھٹی میں سلگنے لگا۔

میں اتحاد تحریک کے تحت ہونے والے جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہوتا رہا۔ عوام جلوس کی نشاندہی ہونے پر کسی بھی سیاسی جماعت کی اعانت کے بغیر از خود ہی شریک ہوتے تھے۔ جماعت اسلامی واحد جماعت تھی جو باقاعدہ منصوبہ بندی سے شریک ہوتی تھی۔ کئی بار میں نے دیکھا کہ جماعت اسلامی کے کارکن عوامی جلوسوں کی از خود راہنمائی کرتے لیکن مارکٹائی اور پکڑ دھکڑ شروع ہوتی تو موقع سے غائب ہو جاتے۔ دراصل بھٹو مرحوم کو حالات کا درست اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ ایجنسیاں اور دیگر خفیہ ادارے ''سب اچھا'' کی رپورٹ پیش کرتے رہے یہاں تک کہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ گیا۔ بھٹو مرحوم دراصل شکست اسی دن ہی کھا گئے تھے جب الیکشن کا اعلان ہوتے ہی تمام سیاسی جماعتیں ایک بڑے پلیٹ فارم پر متحد ہو گئی تھیں جب کہ مرحوم کو بتایا گیا تھا کہ آپ کے مخالفین تفریق کا شکار ہیں اور کبھی متحد نہیں ہو سکتے۔ آپ بے خوف ہو کر عام انتخابات کا اعلان کر دیجیے۔ جو میں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا وہ یہ ہے کہ اس وقت عوام معاشی حوالے سے حکومت سے بہت تنگ آ چکے تھے اور قومی اتحاد کی تحریک ان عوام کے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی اور یوں حکومت خلاف تحریک شروع ہو کر مارشل لاء پر منتج ہو گئی۔ جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالا تو میں نے خود ریڈیو پر یہ اعلان سنا کہ ہم صرف 90 دن میں الیکشن کروا دیں گے لیکن دراصل یہ 90 دن 11 برسوں پر محیط تھے۔ میرے خیال سے اگر مرحوم بروقت اپنے اس ارادے پر عمل کر دیتے تو آج تاریخ انہیں بہت اچھے لفظوں میں یاد کرتی اور شاید پیپلز پارٹی بھی قصہ پارینہ بن جاتی۔ کیونکہ عوام میں بھٹو حکومت کے خلاف سخت غم و غصہ اور نفرت پائی جاتی تھی اور یہی غصہ اور نفرت ہی قومی اتحاد کی کامیابی کا سبب بنی تھی۔ بھٹو صاحب کی پھانسی سیاسی، اخلاقی اور عدالتی سطح پر ہر حوالے سے بالکل غلط تھی، کیونکہ اگر آپ کو اختلاف ہے تو سیاست دان کو اچھی سیاست کے ذریعے ہی شکست دینی چاہیے نا کہ جھوٹے الزامات اور بندوق کے زور پر اسے راستے سے ہٹا دیا جائے۔

میں قومی اتحاد کے جلسوں میں بڑے جوش و جذبے کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ بھٹو حکومت ان احتجاجی جلسوں کو پوری طاقت کے ساتھ کچلنے پر عمل پیرا تھی۔ جلسوں اور جلوسوں پر تشدد ہوتا تھا اور یوں عوامی غصے میں شدید اضافہ ہوتا تھا۔ بھٹو نے اپوزیشن کی اس تحریک کو کچلنے کے لیے فوج طلب کی اور کئی شہروں میں ''سول مارشل لاء'' نافذ کر دیا جس سے فوج کو جمہوری عمل کی بساط لپیٹنے میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بہت آسانی ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ضیائی مارشل لاء کی راہ دراصل بھٹو صاحب نے خود ہی ہموار کر دی تھی جس کا بدترین نتیجہ آج ہم سب کے سامنے ہے۔ وہ جو سیانے ایک مثال دیتے ہیں ناں کہ ''تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی'' تو میں سمجھتا ہوں کہ ضیائی مارشل لاء کی آمد کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ بھٹو صاحب بظاہر نظریاتی آدمی تھے اور احمد رضا خان، مختار رانا، مبشر حسن اور معراج محمد خان کو چھوڑ کر بھٹو صاحب کی جماعت کے دیگر ذمہ داران منتشر اذہان کے حامل تھے۔ بھٹو مرحوم کے سحر نے انہیں ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ مارشل لاء کے بعد وہ لڑی بکھر گئی اور آج تک وہ اسی طرح بکھری ہوئی ہے۔ دراصل پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوری بعد لیاقت علی خان کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا اور سیاسی بندر بانٹ کا نظام خفیہ ایجنسیوں نے ازخود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ فوج کے بڑے ذمہ داران اور بیوروکریسی شتر بے مہار بن گئے تھے۔ حکومتوں کی اکھاڑ پچھاڑ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ بالآخر سکندر مرزا نے ہاتھ دکھا دیئے، ایوب خان نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر پاکستان میں باقاعدہ مارشل لاء کا راستہ کھول دیا جو اب تک جمہوری استحکام کی آڑ میں کھلا ہوا ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لیجیے کہ عملاً مارشل لاء ہی ہے، سیاسی لوگ صرف مہرے ہیں اور چال یعنی پالیسیاں اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں میں ہیں۔ وزیر اعظم اور پارلیمنٹ کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں ہے۔

ہم اپنے زمانے میں دیکھا کرتے تھے کہ خفیہ ایجنسیاں ہر چھوٹی بڑی سیاسی جماعت میں اپنے لوگ باقاعدہ داخل کرتی ہیں یا پھر اسی جماعت کے نظریاتی لوگوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہیں اور انہیں اپنی مرضی سے استعمال کرتی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ بعض سیاسی جماعتیں تو من حیث الجماعت ہی ایجنسیوں کی ہدایات پر سیاست کرتی ہیں بلکہ ایجنسیاں حالات کے مطابق ''پریشر گروپس'' بھی پالتی ہیں اور بسا اوقات تو ایسے پریشر گروپس انہیں پلے پلائے مل جاتے ہیں۔ ایم کیو ایم، سپاہ محمد، سپاہ صحابہ، پنجابی پختون اتحاد، پیر صاحب پگاڑا کی فنکشنل لیگ وغیرہ یہ سب اسٹیبلشمنٹ کے ہی پریشر گروپ ہیں۔

خفیہ ادارے جہاں سیاسی جماعتوں میں اپنے ایجنٹ رکھتے ہیں وہاں صحافیوں میں بھی ان کے تنخواہ دار بہی خواہ موجود ہوتے ہیں۔ معروف صحافیوں میں ہر دوسرا صحافی کسی نہ کسی ایجنسی کے لیے کام ضرور کرتا ہے۔ آج کل معاملہ کچھ مختلف ہے۔ ایجنسیاں صحافیوں کو خریدنے کے ساتھ ساتھ ان پر دباؤ بھی ڈالتی ہیں اور دھمکیاں بھی دیتی ہیں، یوں بہت سے لوگ ان کے لیے بلا چون و چرا کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آج کل الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ کئی اینکرز اور صحافی اس کی زندہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مثال ہیں جو ہمیشہ اپنا ضمیر بیچ کر علی الاعلان جھوٹ بولتے ہیں اور پھیلاتے ہیں۔ یہی ایجنسیاں اپنے مخالف سیاستدانوں کو بدنام کرنے کے لیے ہانگ کانگ لیبارٹریوں کا سہارا لینے کی بجائے انہی اینکرز اور صحافیوں کے ذریعے اپنے مقاصد پورے کر لیتی ہیں۔

میں نے ایم آر ڈی Movement for the Restoration of Democracy (بحالی جمہوریت تحریک) کے جلسوں، جلوسوں میں بھی بھرپور شرکت کی۔ اس تحریک کی روح رواں پاکستان پیپلز پارٹی تھی۔ پنجاب میں اس کے کارکن نہ ہونے کے برابر تھے لیکن سندھ میں ان کی بھرپور شرکت رہی۔ پنجاب میں جے یو آئی مولانا فضل الرحمٰن کی قیادت میں اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ اس کے کارکنوں نے ماریں کھائیں، جیلیں کاٹیں اور صعوبتیں برداشت کیں۔ تحریک سندھ میں پرزور طریقے سے چل رہی تھی۔ لیکن پنجاب میں ایسی صورتحال نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھی بہت مطمئن تھے، کیونکہ کوئی بھی تحریک عوام کی آزادانہ شرکت کے بغیر کبھی کامیاب نہیں ہوتی، چنانچہ یہ تحریک تو ختم ہو گئی اور مارشل لاء کو مزید استحکام بھی مل گیا لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ایم آر ڈی کی آمریت کے خلاف جدوجہد تاریخ کے صفحات پر نیا باب ضرور نقش کرنے میں کامیاب ہوئی۔

لوگ کہتے ہیں کہ ضیاء الحق نے ایم آر ڈی کو ناکام بنا دیا تھا۔ لیکن میرے خیال سے ایم آر ڈی کی کامیابی یہ تھی کہ وہ ضیاء کی مکمل فتح اور جمہوریت کی فاش شکست کے بیچ حائل ہو گئی تھی۔ یہ تحریک راہنماؤں کی نہیں بلکہ کارکنوں کی تحریک تھی جسے انہوں نے اپنے خون سے سینچا۔ ایم آر ڈی تحریک میں جمہوریت بحالی کے لیے قربانیاں دینے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ انہی میں ایک فراز واہلہ بھی ہیں جن کا تعلق پنجاب سے تھا۔ فراز واہلہ کی جدوجہد کی کہانی بی بی سی کی طرف سے شائع بھی ہو چکی ہے۔ فراز واہلہ اپنے والد ایم ایس واہلہ ایڈووکیٹ کے ساتھ ایم آر ڈی کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ فراز واہلہ اس وقت تین چار سال کے بچے تھے۔ اب تقریباً تین دہائیوں بعد فراز واہلہ اس تحریک میں اپنے والد اور اپنی شمولیت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کے والد انہیں ایم آر ڈی کے احتجاجی مظاہروں میں لے جاتے اور ان کو پیپلز پارٹی کا پرچم پکڑا کر آگے کر دیتے تھے، حالانکہ اس وقت وہ بہت چھوٹے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جلوسوں پر لاٹھی چارج ہو جاتا یا آنسو گیس پھینک دی جاتی میں رونے لگتا اور میرے ابو مجھے بچانے کی کوشش کرتے۔ کبھی پولیس ہمیں پکڑ کر لے جاتی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے والد پنجاب میں ایم آر ڈی کے سرگرم راہنما تھے اور اکثر پولیس فراز اور ان کی والدہ کو تھانے لے جاتی تا کہ ان کے والد کو مجبوراً آ کر گرفتاری دینی پڑے۔

یاد رہے کہ ایک موقع پر فراز واہلہ کو گرفتار کر کے تھانے کے لاک اپ میں ڈال دیا گیا تھا اور شاید

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یوں وہ اس تحریک کے گرفتار ہونے والے سب سے کم عمر شخص بن گئے۔اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مارشل لاء حکام کس قدر ایم آر ڈی سے خوفزدہ تھے کہ ایک بچے کو بھی انہوں نے گرفتار کر کے بند کر دیا تھا۔ یہ تو فراز وابلہ کی صرف ایک کہانی ہے جو بی بی سی پر تفصیل سے نشر ہو چکی ہے ورنہ مارشل لاء کے خلاف جمہوریت بحالی کی جدوجہد کرنے والوں پر فوجی مظالم کی کہانی بہت طویل ہے۔

میری صحافتی اور سیاسی زندگی کے دوران یہ سوال اکثر کیا جاتا رہا ہے کہ ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ کیوں نہ ہو سکا؟ رکاوٹ کون ہے؟ علمائے کرام یا سول اور ملٹری بیوروکریسی؟ میرے خیال سے یہ سوال جتنا اہم ہے اتنا ہی پیچیدہ بھی ہے۔ بانیان پاکستان نے تحریک پاکستان شروع کرتے ہوئے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے لیے عملاً کوئی تیاری نہ کی تھی۔ 1946ء کے الیکشن ٹو ون کی بنیاد پر لڑے گئے۔ مذہبی اور معاشی طور پر پسے ہوئے مسلمانوں کو صرف اور صرف اپنے معاش کی فکر تھی۔ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں رہ کر وہ معاشی طور پر بالکل پس جائیں گے اور ہندو انہیں غلام بنا لے گا۔ چنانچہ مسلم لیگ اس الیکشن میں اکثریت سے جیتی۔ یہی بنیاد ہی ہندو مسلم علاقوں کی تقسیم کا باعث بنی۔ مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈر ذہنی طور پر پاکستان کو عملی اسلامی ریاست بنانے کے لیے کوئی تیاری نہیں کر رہے تھے۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کا نعرہ بلاشبہ زبان زد عام تھا۔لیکن اس کے لیے مسلم لیگ نے کوئی ہوم ورک نہیں کیا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے چودہ نکات کے بعد 14 اگست 1947ء تک مسلم لیگ کے پاس بہت وقت تھا جس سے اس نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔سکندر مرزا اور جنرل ایوب خان تو اس نوزائیدہ ریاست کا اسلامی تشخص ہی ختم کرنے کے درپے تھے۔ایوب خاں نے ملک کو جو آئین (1962ء) دیا اس میں پاکستان کا نام محض ''جمہوریہ پاکستان'' قرار دیا گیا تھا۔ بعد کے حالات میں اشرافیہ اور بیوروکریسی ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئے اور آج تک ہیں۔اب تو کوششیں ہو رہی ہیں کہ پاکستان کو ایک سیکولر ریاست ڈیکلیئر کر دیا جائے۔اس میں سول و ملٹری بیوروکریسی دونوں برابر شریک ہیں۔لیکن مذہبی عناصر ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ایک خیال یہ بھی ہے کہ علمائے کرام میں اتفاق نہیں ہے اس لیے پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست نہ بن سکا۔ میرے خیال سے یہ تاثر غلط ہے۔سب سے بڑی رکاوٹ تو سول اور ملٹری بیوروکریسی ہے۔اس کے بعد وہ این جی اوز ہیں جو غیر ملکی ایجنسیوں سے فنڈ وصول کر کے اسلامی نظام اور اس کی مخصوص جزئیات پر اعتراضات کر کے عام آدمی کو اسلام سے متنفر کرتی ہیں۔

جے یو آئی کے سینئر راہنما مولانا محمد عبداللہ آف بھکر بڑے زبردست آدمی تھے۔ بڑے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

صاحب فکر اور اعلیٰ ظرف کے مالک تھے۔ میں ''ترجمان اسلام'' کے دنوں میں ان کے پاس متعدد بار گیا اور قیام کیا۔ انہوں نے ہمیشہ محبت ہی فرمائی۔ وہ ہمیشہ احترام دیتے اور کلین شیو ہونے کے باوجود مجھے علماء کے ساتھ بٹھاتے اور میرا تعارف کرواتے۔ الحمدللہ جمعیت علمائے اسلام کے تمام بڑے علمائے کرام نے مجھے ہمیشہ عزت دی اور ایک دنیادار ہونے کے ناطے کبھی مجھے فراموش نہیں کیا۔ میرا ان تمام علمائے کرام سے نہ اس وقت کوئی شکوہ تھا نہ اب ہے۔ بریلوی مسلک کے مولانا عبدالستار خان نیازیؒ سے میرا زیادہ تعلق رہا۔ انہوں نے ختم نبوت کے حوالے سے تاریخ ساز کردار ادا کیا جس پر میرے دل میں ان کا بے حد احترام ہے۔ مولانا سرفراز نعیمیؒ شہید کے والد مفتی محمد حسین نعیمیؒ بڑے آدمی تھے، یہ بڑے کھلے دل کے تھے۔ ان کے پاس ہر مسلک کے لوگ جایا کرتے۔ ان کے ساتھ بھی بہت سی ملاقاتیں رہیں۔ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان سے بھی ایک آدھ ملاقات رہی۔ اہل حدیث علمائے کرام میں مولانا صلاح الدین یوسف، علیم ناصری (ایڈیٹر الاعتصام)، مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا اسحاق بھٹی وغیرہ سے بہت تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ یہ اپنے وقت کے نابغہء روزگار لوگ تھے۔ شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے علامہ عین غین کراروی سے میرا بڑا محبت کا رشتہ تھا۔ یہ ماڈل ٹاؤن میں واقع جامعہ المنتظر کے رسالہ 'المنتظر' کے ایڈیٹر بھی تھے۔ ان کا اپنا ایک مسلک اور موقف تھا۔ ظاہر ہے اپنے موقف سے تو کوئی بھی پیچھے نہیں ہٹتا لیکن وہ ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملتے ضرور تھے۔ مسلکی حوالے سے مذاق بھی بڑے کھلے دل سے برداشت کرتے۔ بڑے نستعلیق آدمی تھے اور لکھنوی انداز میں گفتگو کرتے۔ پرانے یوپی طرز کا پاجامہ اور کرتا پہنتے۔ یہ اتنے سوشل مزاج تھے کہ میرے خیال سے کسی بھی مسلک سے تعلق رکھنے والا ان سے اختلاف نہیں کرتا تھا۔ اسی طرح قومی اتحاد کی تحریک میں اہل تشیع کی طرف سے جو لیڈر شامل تھے ان کا نام مظفر علی شمسی تھا۔ یہ بھی بڑے زبردست آدمی تھے۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے۔

بس یہ تھے میری زندگی کے چند اہم واقعات جنہیں میں نے مختصر طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ادارہ قومی ڈائجسٹ، ایڈیٹر جناب خالد ہمایوں اور نوجوان صحافی عبدالستار اعوان کا بے حد شکریہ کہ ان دوستوں کی محبت کے طفیل مجھے ان یادداشتوں کو محفوظ کرنے کا موقع میسر آیا۔ (قومی ڈائجسٹ)

❖ ♌ ❖ ♌ ❖

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ڈپٹی کمشنر ریٹائرڈ

عبدالغفور چودھری

کی حیرت انگیز رُوداد

عبدالغفور چودھری نے قصور کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان ہیں۔ انہوں نے سخت محنت کر کے نمایاں مقام حاصل کیا۔ دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا کہ انہیں والد صاحب کے سیاسی حریفوں نے قتل کے ایک جھوٹے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی۔ عبدالغفور چودھری ایک ٹھٹھرتی صبح گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے اور چھپتے چھپاتے قصور پہنچے اور پھر لاہور میں اپنے ماموں زاد بھائی فرزند علی جو کہ فوج میں ملازم تھے کے پاس آ کر پناہ لی۔ فرزند علی نے انہیں فوج میں سپاہی بھرتی کروا دیا۔ جس وقت روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں عبدالغفور چودھری پاک افغان سرحد پر اپنے دو ساتھیوں سمیت سب سے بلند پہاڑی چوٹی پر قائم ''ابزرویشن پوسٹ'' پر تعینات تھے۔ چودھری صاحب نے روسی جارحیت کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ موت کو بہت نزدیک سے دیکھا جب روسی گن شپ ہیلی کاپٹر ان کی پوسٹ کے عین اوپر آ گیا اور روسی فوج کے آرٹلری دستے نے وہاں شدید گولہ باری شروع کر دی۔ چودھری صاحب نے عسکری ملازمت کے دوران بھی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا اور ''آرمڈ فورسز بورڈ فار ایجوکیشن'' میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد پاک فوج میں جونیئر کمیشنڈ آفیسر کے لئے اپلائی کیا اور سپاہی سے براہ راست نائب صوبیدار (ایجوکیشن) کے طور پر سلیکٹ ہو گئے۔ وہ اپنے پورے بیج میں سب سے کم عمر نائب صوبیدار تھے۔ اس کے بعد بی ایڈ، ایم اے اسلامیات اور ایم اے انگلش کیا۔ 1994ء میں پی سی ایس مقابلے کا امتحان دیا لیکن میرٹ اچھا نہ ہونے کے سبب انہیں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے بجائے ''اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز'' تعینات کر دیا گیا۔ 1996ء میں دوبارہ پی سی ایس کا امتحان دیا اور حکومت پنجاب نے انہیں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ فرسٹ کلاس) تعینات کر دیا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

چودھری صاحب کو ''پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن'' لاہور میں بطور جوڈیشل آفیسر اور لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن میں اہم عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پنجاب کے مختلف اضلاع اور ڈویژنز میں بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ درجہ اول)، سپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ، اسسٹنٹ کمشنر، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر، ڈائریکٹر اینٹی کرپشن، ڈپٹی سیکرٹری، ایڈیشنل کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے طور پر کام کیا اور 2019ء میں بطور ڈپٹی کمشنر سبکدوش ہوئے۔ چودھری صاحب نے افسر شاہی، سیاست اور مختلف سماجی رویوں کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا۔ میں چودھری صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ''قومی ڈائجسٹ'' کے لئے اپنی دلچسپ یادداشتیں محفوظ کرنے کے لئے بہت تعاون کیا۔ ان یادداشتوں میں کئی گوشے تو خاصے چشم کشا ہیں۔ امید ہے قارئین لطف اندوز ہوں گے۔

○......❀......○

میرا تعلق ارائیں فیملی سے ہے۔ میرے آباؤ اجداد 1947ء میں ایک گاؤں جودھ سنگھ والا، تھانہ کھیم کرن، تحصیل قصور ضلع لاہور، جو اب بھارت میں ہے سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور چاہ ہری والا، موضع کھنگرانوالہ تھانہ کھڈیاں خاص، تحصیل قصور ضلع لاہور (اب ضلع قصور) میں آکر آباد ہو گئے۔ میرے والد صاحب کا نام مہر محمد اسماعیل اور والدہ کا نام زینب بی بی تھا۔ والد صاحب کی تعلیم چار جماعت (اس وقت کی پرائمری) تھی اور والدہ صاحبہ صرف قرآن پاک پڑھی ہوئی تھیں۔ ہم نے اپنے والدین کو صوم وصلوۃ کا پابند ہی دیکھا۔ والد صاحب پیشے کے لحاظ سے کاشتکار تھے۔ بہت محنتی تھے۔ ایک بار بلدیاتی الیکشن بھی لڑا۔ والدہ صاحبہ ان پڑھ ہونے کے باوجود بڑی زیرک، سمجھدار اور دانا خاتون تھیں۔ گاؤں کی زیادہ تر خواتین ان کے پاس مشورے لینے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ وہ تہجد گذار بھی تھیں۔ ہم تمام بہن بھائی جب شام کے وقت چولھے کے ارد گرد بیٹھ کر اپنی ماں کے ہاتھ کا بنا ہو کھانا کھایا کرتے تھے تو ہماری ماں روزانہ کی بنیاد پر ہمیں کوئی نہ کوئی نصیحت کیا کرتی تھیں۔ وہ ہمیں دیانتداری، ایمانداری، عدل وانصاف، محبت، رواداری، خلوص، نیک نیتی اور محنت جیسی اعلیٰ صفات کو اپنانے کا درس دیا کرتی تھیں۔ ہم اپنی والدہ صاحبہ کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا کرتے تھے۔ خدا گواہ ہے کہ ہم نے جب بھی کوئی کام اپنی ماں کے مشورے کے بغیر یا ان کی رائے کے برعکس کیا، ہمیں نقصان ہی اٹھانا پڑا۔

میری تعلیمی اسناد کے مطابق تاریخ پیدائش 14 فروری 1959ء ہے۔ اس وقت ماسٹر صاحب بچے کا قد دیکھ کر داخلہ رجسٹر پر تاریخ پیدائش لکھا کرتے تھے۔ میں تقریباً چھ برس کا ہوا تو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مجھے گورنمنٹ پرائمری سکول کھنگرانوالہ میں جماعت اول میں داخل کروا دیا گیا۔ اس وقت نہ تو پرائیویٹ ادارے تھے اور نہ پی جی، نرسری اور پریپ کلاس کے ڈرامے ہوتے تھے۔ اول سے پانچویں جماعت تک صرف حساب اور اردو کے مضامین پڑھائے جاتے۔ کاپی عام طور پر شاید چوتھی جماعت سے استعمال میں آتی تھی۔ اس سے پہلی کلاسوں میں سلیٹ اور تختی کا استعمال ہوتا۔ سلیٹ پر سلیٹی یا چاک سے لکھا جاتا تھا اور تختی کو لکھائی کے لئے تیار کرنے کے لئے اس پر چکنی مٹی، جسے ہم گاچنی کہتے تھے کی لیپ کر کے اس کو دھوپ میں سکھایا جاتا تھا۔ بعد میں سیاہی کا استعمال کرتے ہوئے سرکنڈے کی بنی ہوئی قلم کے ساتھ اس پر لکھائی کی جاتی تھی۔ ہم تختیوں کو دھونے والا کام آدھی چھٹی کے دوران' سکول کے سامنے موجود چھپڑ پر جا کر انجام دیا کرتے۔ اسی دوران ہم گھر سے لایا ہوا لنچ بھی کھایا کرتے تھے۔ ہمارے لنچ میں نہ تو کوئی شامی کباب ہوتا تھا۔ نہ ہی ڈبل روٹی، نہ آلو کے چپس اور نہ انڈے سے بنی ہوئی مختلف ڈشیں، وہ پونے (رومال) میں باندھے گئے دیسی گھی سے بنے ہوئے پراٹھے اور گھر کے بنے ہوئے اچار پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہم نلکے کے پاس بیٹھ کر یا بعض اوقات سکول کے پاس ہی موجود مسجد میں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے اور جب پانی کی طلب ہوتی تھی تو نلکے یا ٹونٹی کو منہ لگا کر تازہ پانی پی لیا کرتے۔ آدھی چھٹی کے بعد ہم تختیاں لکھا کرتے۔ آخری پیریڈ میں ہمیں سکول کی دیواروں کے ساتھ کھڑا کر دیا جاتا تھا اور ہم میں سے ایک ایسا طالبعلم جس کو پہاڑے آتے ہوں اسے ہمارے سامنے کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ وہ اونچی آواز سے پہاڑے پڑھتا تھا اور ہم سب اس کے پیچھے پیچھے اونچی آواز سے پہاڑوں کو دہرایا کرتے تھے۔ سکول میں صرف ایک تختہ سیاہ ہوتا تھا جس پر چاک سے لکھا جاتا تھا۔ عام طور پر باری باری ایک بچے کو گیلا کپڑا دے کر تختہ سیاہ کے پاس کھڑا کر دیا جاتا تھا تا کہ ماسٹر صاحب جب اشارہ کریں تو تختہ سیاہ پر لکھی گئی تمام تحریر کو گیلے کپڑے سے مٹا دے۔

میرا اسکول چاہ ہری والا سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں بستہ اپنے کندھے پر ڈال کر اپنے گھر سے پیدل سکول جاتا۔ بستہ عام کپڑے کا بنا ہوا ہوتا جس میں اکثر سیاہی والی دوات میں سے سیاہی لیک ہو جاتی تھی۔ اس طرح بستے پر عام طور پر کالے دھبے پڑے ہوتے تھے۔ ہم بعض اوقات سیاہی کی دوات اپنی وردی کی سامنے والی جیب میں بھی ڈال لیتے تھے۔ وہ بعض اوقات لیک ہو کر ہماری قمیض کی جیب کو بھی دھبے دار کر دیتی تھی۔ اس سکول میں ماسٹر بشیر شاہ صاحب اکلوتے استاد تھے جو اکیلے ہی تمام جماعتوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ وہ قریبی گاؤں محمود پورہ کے رہنے والے تھے۔ سفید لباس پہنتے تھے۔ گورے چٹے سید تھے۔ نہایت ایماندار اور فرض شناس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

استاد تھے۔ ان کی محنت کی وجہ سے ہر سال ہمارے سکول کے کئی بچے وظیفے کے لیے امتحان دیتے تھے اور کامیاب بھی ہوتے تھے۔ ماسٹر بشیر شاہ صاحب پر لوگ بہت اعتماد کرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے جھگڑوں کے فیصلے بطور ثالث بھی کیا کرتے تھے۔ میں پانچویں جماعت کے امتحان میں جماعت میں اول آیا اور چھٹی جماعت میں داخلے کا مرحلہ آیا۔ اس اثنا میں ہم کوٹ ارائیاں والا میں نئے مکان بنا کر منتقل ہو گئے تھے۔ ہائی سکول میرے گھر سے تقریباً چھ کلومیٹر دور تھا سڑک موجود نہ تھی۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا کوئی تصور نہ تھا۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ بائیسکل بھی نہیں چلا سکتا تھا۔ میرے والدین سوچ میں پڑ گئے کہ بچہ اتنی دور روزانہ کیسے جایا کرے گا۔ ایک موقع پر یہ فیصلہ بھی ہو گیا کہ مجھے ہائی سکول میں داخلہ نہ دلوایا جائے بلکہ کھیتی باڑی پر لگا دیا جائے۔ لیکن میں نے اپنی تعلیم جاری رکھنے پر اصرار کیا اور ماں جی کو بھی اس حوالے سے ساتھ ملا لیا۔ میں نے کہا کہ میں پیدل چلا جایا کروں گا۔ بالآخر بڑوں نے فیصلہ دیا کہ مجھے ہائی سکول میں داخل کروا دیا جائے، چنانچہ مجھے میرے دو ماموں زاد بھائیوں حافظ محمد عیسیٰ اور حافظ محمد موسیٰ کے سپرد کر دیا گیا جو مجھ سے ایک کلاس سینئر تھے۔ میری ماں، باپ یا بڑے بھائیوں کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ خود مجھے ہائی سکول میں داخل کروانے جائیں۔ انہوں نے میری پڑھائی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی۔ میں عام طور پر کلاس میں پہلی یا دوسری پوزیشن لیتا تھا لیکن میرے گھر والوں نے کبھی اس پر خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انہیں صرف اس بات سے غرض ہوتی تھی کہ میں ہر سال پاس ہو کر اگلی کلاس میں چلا جاؤں۔

یہ اپریل 1970ء کی بات ہے کہ مذکورہ حافظ برادران مجھے اپنے ساتھ گورنمنٹ ہائی سکول کھڈیاں خاص، تحصیل و ضلع قصور لے گئے۔ یہ سکول اس سے پہلے ڈی سی (ڈپٹی کمشنر) ہائی سکول ہوتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان نے باقی تعلیمی اداروں اور صنعتوں کے ساتھ اس ادارے کو بھی قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس سے ہماری تعلیم میں زوال کا آغاز ہوا اور اس زوال کا مداوا ابھی تک کوئی حکومت نہیں کر سکی۔ خیر، مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملوایا گیا۔ ویسے تو اس سکول میں بغیر داخلہ ٹیسٹ لئے کسی بچے کو داخلہ نہیں ملتا تھا لیکن میں چونکہ ماسٹر بشیر احمد شاہ کا شاگرد تھا اس لئے مجھے اس سکول میں بغیر داخلہ ٹیسٹ کے داخلہ مل گیا۔ اس وقت انگریزی کی پڑھائی چھٹی جماعت سے شروع ہوتی تھی۔ یعنی ہمیں اے بی سی چھٹی جماعت میں سکھائی گئی۔ میں یہاں پر بھائی نذیر احمد ولد حاجی فضل دین، جو ہمارے پڑوسی تھے اور مجھ سے کافی سینئر تھے کا ذکر نہ کروں تو ناانصافی ہو گی۔ انہوں نے اس وقت مجھے بڑی اے بی سی سکھا دی جب میں پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ جس کا مجھے سارے تعلیمی کیریئر میں فائدہ ہوا۔ میرا داخلہ گورنمنٹ ہائی سکول

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کھڈیاں خاص میں جماعت ششم میں ہوگیا۔ داخلے کے ساتھ ہی آزمائشیں اور مشکلات شروع ہو گئیں۔ روزانہ کی بنیاد پر بارہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایسے نامساعد حالات میں میں نے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور وہ منزل پانے میں کامیاب ہوگیا جس کا خواب ماں جی نے دیکھا تھا۔ ہمارے چھٹی کلاس کے انچارج عبدالرحمٰن صاحب تھے۔ بڑے محنتی اور ماہر استاد تھے۔ چھڑی ہر وقت ان کے پاس ہوتی تھی۔ کوئی طالب علم پڑھائی میں ذرا سی کوتاہی کرتا تو اس کی خاطر مدارت چھڑی سے ہوتی۔ ایک دو دفعہ میرا بھی ان کی اس مہربان چھڑی سے پالا پڑا تو بڑی تکلیف محسوس ہوئی۔ خاص کر ٹھٹھرتی سردی کے موسم میں جب وہ ہاتھوں پر ڈنڈے مارتے تھے تو ہم ہاتھوں کو اپنی بغلوں میں داب لیتے تھے تاکہ تکلیف کی شدت کم ہو۔ لیکن اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ایک دفعہ ڈنڈا کھانے کے بعد طالب علم کی طبیعت کافی دنوں تک درست رہتی تھی۔ اگرچہ میرے گھر میں میری تعلیم پر توجہ دینے والا کوئی شخص موجود نہ تھا لیکن ہمارے اساتذہ کرام والدین کی یہ کمی بھی پوری کر دیتے تھے۔ 1971ء میں میں ساتویں جماعت میں تھا۔

خیر اسی طرح خراماں خراماں تعلیمی سفر جاری رہا ہے اور میری ترقی نویں جماعت میں ہوگئی۔ اس وقت میٹرک میں صرف دو ہی گروپ ہوتے تھے سائنس گروپ اور آرٹس گروپ۔ سائنس گروپ میں لازمی مضامین کے علاوہ طبیعات، کیمیا، ریاضی اور فزیالوجی اینڈ ہائی جین (جسے آج کل بیالوجی کہتے ہیں) کے مضامین پڑھائے جاتے۔ اس وقت تک کمپیوٹر کا مضمون متعارف نہیں ہوا تھا۔ پڑھنے والے بچے سائنس گروپ کے مضامین پڑھتے تھے اور جو بچے تعلیمی لحاظ سے قدرے کمزور ہوتے وہ آرٹس گروپ کے مضامین پڑھتے۔ اس وقت نویں جماعت کا امتحان بورڈ کا نہیں ہوتا تھا۔ نویں اور دسویں کا اکٹھا امتحان ہوتا، بچوں کو پڑھائے گئے اسباق دو سال تک یاد رکھنے پڑتے تھے۔ اس لیے ہم نے جو کچھ پینتالیس سال پہلے پڑھا اس میں سے بہت کچھ اب بھی یاد ہے۔ نویں اور دسویں جماعت میں ہمیں مومن صاحب، سر محمد صدیق انجم صاحب، سر محمد سلیم صاحب، سر ظفر اقبال صاحب وغیرہ نے پڑھایا۔ کیا استاد تھے اور کیا شاگرد! وہ صرف استاد نہیں تھے بلکہ صحیح معنوں میں روحانی ماں باپ، ہمارے رہبر و راہنما، ہمارے مصلح، ہمارے ہمدرد اور غمخوار تھے۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد میرے گھر میں پھر سے بحث چھڑی کہ اسے کالج بھیجا جائے یا نہیں۔ گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج قصور میرے گھر سے 29 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ کالج جانے کے لئے پہلے تو مجھے چھ کلومیٹر بائیسکل چلا کر کھڈیاں خاص تک جانا تھا۔ پھر وہاں سے بس میں سوار ہو کر قصور جانا تھا اور 23 کلومیٹر کا سفر بذریعہ بس طے کرنا تھا۔ میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گھر والوں کو آفر بھی دی کہ میں قصور میں کالج کے ہاسٹل میں رہ لوں گا۔ ٹیوشن پڑھا کر اپنا خرچہ خود چلا لوں گا۔ ماں جی نے بھی میرا بھرپور ساتھ دیا لیکن جب ہاسٹل میں رہنے کی بات آئی تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔ میرا خواب تھا کہ میں یا تو ڈاکٹر بنوں یا پروفیسر۔ لیکن میں تو بے بس تھا، مجبور تھا، میرے مستقبل کے فیصلے کرنے کا اختیار کسی اور کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ مجھے ہمارے گاؤں کے ایک دندان ساز جنہوں نے کھڈیاں خاص میں اپنا کلینک بنایا ہوا تھا کی شاگردی میں دے دیا جائے۔ چنانچہ مجھے ان کی شاگردی میں دے دیا گیا۔ تقریباً ایک سال گزر گیا۔ اس عرصہ میں استاد جی نے ہر ممکن کوشش کی کہ میں ڈاکٹری کے علاوہ باقی سارے کام سیکھ جاؤں۔ استاد جی ہر نسخہ مجھ سے چھپا کر لکھتے تھے۔ ان استاد جی کی شاگردی کی بھی ایک بہت طویل اور دلچسپ داستان ہے، جو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

اب ہمارے گھر کے مالی حالات میں بھی کافی بہتری آ چکی تھی اور میں باقاعدہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ گھر والوں سے بات کی تو وہ مان گئے اور میرا داخلہ گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج، قصور میں ایف ایس سی (پری میڈیکل) گروپ میں کروا دیا گیا کہ اسی دوران ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا جس نے میری زندگی کا رخ ہی موڑ دیا۔ یہ 31 مارچ 1980ء کا دن تھا۔ اس دن میرے دوست سعید احمد کا نویں کا رزلٹ آیا اور وہ پاس ہو گیا۔ گھر آ کر خوشخبری دی، سارے گھر والے خوش تھے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ یہ خوشی کتنی عارضی ہے۔ اسی روز شام کو اسے کوئی نامعلوم شخص گھر سے بلا کر لے گیا اور پھر سعید احمد کبھی واپس نہ آیا۔ اس روز میں نے اپنی سائیکل پکڑی اور سعید احمد کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ماں جی نے پریشانی کے عالم میں دروازہ کھولا۔ میں نے جھٹ سے پوچھا، خالہ جی! سعید احمد کدھر ہے؟ ماں جی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کہنے لگیں کل شام سے گھر سے گیا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ پھر ایک دن ہمیں وہ خبر سننے کو ملی جس نے میرے اعصاب شل کر دیے۔ ایک صبح میں سعید احمد کے گھر گیا تو وہاں صف ماتم بچھی تھی۔ معلوم ہوا کہ سعید احمد کو کسی نے قتل کر کے کھڈیاں خاص کے پاس سے گزرنے والی نہر میں پھینک دیا تھا۔ اس کی نعش نہر سے برآمد ہوئی ہے۔ اب ہمارے خلاف سازشوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میرے والد صاحب نے چونکہ علاقے میں الیکشن میں حصہ لے کر روایتی بڑوں کو للکارا تھا اور ہم اپنے گاؤں کی ایک ابھرتی ہوئی طاقت بنتے جا رہے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے سیاسی مخالف ماسٹر محمد عالم آج کل تھانے کے بہت چکر لگا رہے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح میرا نام سعید احمد کے قتل کے مقدمہ میں تتمہ بیان کے ذریعہ نامزد کر دیا جائے لیکن سعید احمد کے لواحقین اس پر راضی نہیں ہو رہے ہیں۔ ان کا موقف تھا کہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

عبدالغفور کے ساتھ تو ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم کیوں کسی بے گناہ کو مقدمہ میں پھنسائیں۔ ماسٹر محمد عالم جو ہمارے دور کے رشتہ دار بھی تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے گاؤں میں کوئی نیا چودھری پیدا ہو۔ گاؤں میں ہماری حویلی کے سامنے ہماری ہی زمین میں شیشم کا بہت بڑا درخت تھا۔ گاؤں میں اس وقت بجلی نہیں آئی تھی۔ گاؤں کے تقریباً تمام مرد دن کے وقت اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر، اپنی اپنی چارپائی اور اپنا اپنا سرہانہ سروں پر اٹھا کر آرام کرنے کے لئے اس درخت کے نیچے اپنی چارپائیاں بچھا لیتے تھے۔ ہمارے والد صاحب روزانہ دس بجے کے قریب اپنے لیے چند چارپائیاں وہاں لگا دیتے تھے اور ساتھ حقہ بھی تیار کر کے رکھ دیتے۔ دیہات کے لوگ آرام بھی کرتے تھے۔ کچھ لوگ حقہ پیتے تھے اور گپ شپ بھی خوب چلتی رہتی۔ ہم اس شیشم (ٹاہلی) کے درخت پر ساون کے مہینے میں پینگھ بھی ڈالا کرتے تھے اور اس کے جھولوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

اپریل 1980ء کی سولہ یا سترہ تاریخ تھی۔ مذکورہ ٹاہلی کے نیچے حسب معمول مجمع لگا ہوا تھا۔ اچانک ہماری نظر سڑک پر سے گزرتے ہوئے ایک تانگے پر پڑی جس پر پولیس ملازمین سوار تھے۔ وہ تانگہ سیدھا ماسٹر عالم کے گاؤں کوٹ ماسٹر محمد عالم کی طرف جا رہا تھا۔ اتنی دیر میں سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک پولیس اہلکار جو میرے لالہ جی (بڑے بھائی مہر محمد عالم) کا دوست تھا ٹاہلی کے نیچے پہنچا اور لالہ جی کو ایک طرف لے گیا اور ان سے کوئی بات کر کے فوراً واپس چلا گیا۔ لالہ جی بھائی نور احمد نمبردار اور مجھے ساتھ لے کر گھر کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچ کر لالہ جی نے فوری طور پر ماموں محمد حنیف کو بھی ان کے گھر سے بلا لیا۔ جب سارے بیٹھ گئے تو ہم سب لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ لالہ جی نے سکوت توڑا اور بتایا کہ ماسٹر محمد عالم نے غفور کو گرفتار کروانے کے لیے پولیس بلوالی ہے۔ تھانہ کا ایک اہلکار جو میرا قریبی دوست ہے ابھی مجھے بتا کر گیا ہے۔ ان حالات میں بڑوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے فوری طور پر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ہماری بڑی بہن نے مجھے ایک تھیلے میں کپڑوں کے دو سوٹ تھما دیے۔ مجھے حکم دیا گیا کہ میں اپنی بڑی بہن کے پاس چلا جاؤں، جن کی شادی چک نمبر 4 ویرم تھانہ چتوکی میں ہوئی تھی۔ میں بہن کے پاس پہنچا اور پھر وہاں سے لاہور کے لیے نکل کھڑا ہوا اور اپنے ماموں زاد بھائی فرزند علی کے پاس جا پہنچا۔

بھائی فرزند علی صاحب مع فیملی رہ رہے تھے اور وہ فوج میں ملازم تھے۔ اس وقت وہ ایک میڈیم رجمنٹ آرٹلری میں رجمنٹ کوارٹر ماسٹر حوالدار کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ فرزند علی مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے کے بعد میرے اس طرح اچانک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آنے کی وجہ پوچھنے لگے۔ میں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔تھوڑے سے پریشان تو ہوئےلیکن اپنے تاثرات سےانہوں نے بالکل بھی اپنی پریشانی ظاہر نہ ہونے دی۔ کہنے لگے:'' میں نے ماموں کواس سے پہلے بھی کئی پیغامات بھیجے ہیں کہ غفور کوفوج میں بھرتی کروا دیا جائے لیکن وہ نہ مانے۔جب سے تم نے میٹرک پاس کیا ہےتب سے میں کوشش کر رہا ہوں کہ ماموں (میرے والدصاحب)اور پھوپھو(میری والدہ صاحبہ) کومنالوں کہ وہ تمہیں فوج میں بھرتی کروادیں۔لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی''۔ پھر بھائی فرزندعلی نے فوج کی نوکری کے فضائل ومناقب اس انداز سے بیان کئے کہ ایسے لگ رہا تھا کہ پوری دنیا میں فوج کی نوکری سے بہتر کوئی ملازمت نہیں اور مجھے مشورہ دیا کہ اب بھی وقت ہے میری بات مان جاؤ اور فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔ کہنے لگے،'' میری یونٹ میں ہی بھرتی ہو رہی ہے۔ٹریننگ بھی لاہور میں یونٹ کے اندر ہی ہوگی۔ میں بھی یہاں موجود ہوں۔ تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہوگا۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمہارا پولیس کیس بھی ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ جب ایک بارتم فوج میں بھرتی ہو گئے تو فوج کبھی تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کرے گی۔ پھرتم نے کون ساقتل کیا ہوا ہےلیکن پریشانی تو بن گئی ہے ناں۔اس پریشانی سے بچنے کا فوری حل یہی ہے کہ تم فوج میں بھرتی ہو جاؤ''۔

میں نے کہا:''بھائی جان کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں نے ایف ایس سی (پری میڈیکل) گروپ میں داخلہ لے لیا ہے۔ میرا خواب تو ڈاکٹر بننے کا ہے۔آپ مجھے فوج میں سپاہی بھرتی ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں''۔ وہ کہنے لگے:''فوج میں پڑھنے لکھنے کے مواقع بھی ملتے ہیں۔ فوج کا اپنا ایک ایجوکیشن بورڈ ہے جسے آرمڈ فورسز بورڈ فار ایجوکیشن کہتے ہیں۔اگر تم ایف اے کر لیتے ہوتو فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ بھی بن سکتے ہو۔جس کی پرموشن جنرل تک ہو جاتی ہے''۔دوسرے تیسرے دن میں اور بھائی فرزندعلی سائیکل پر بیٹھ کران کی یونٹ کی طرف چل دیے۔مین گیٹ پر پہنچ کر میری انٹری کروائی گئی۔اس وقت میری یونٹ آرائے بازار، لاہور کے پاس تھی۔ بہت اونچی اونچی اور پرانی اور خستہ حال بیرکیں تھیں جنہیں بعد میں مسمار کر دیا گیا۔ بھائی فرزندعلی مجھے اپنے کمرے میں بٹھا کر خود پریڈ پر چلے گئے۔تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گئے اور مجھے ایک خوبصورت، دراز قد اور گورے چٹے افسر کے دفتر میں لے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شخصیت یونٹ صوبیدار میجر محمد عارف تھے۔انہیں بھائی فرزند نے بتایا کہ میں نے میٹرک سائنس کے ساتھ کیا ہے۔(یاد رہے کہ اُس وقت سائنس کے ساتھ میٹرک کرنے کی ہمت کوئی کوئی طالبعلم کرتا تھا)۔ایک باؤ جی آئے (اس وقت فوج میں کلرک کو باؤ جی کہتے تھے)انہوں نے کچھ فارم وغیرہ فل کئے اور میری

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میٹرک کی سند بھی طلب کی۔ میں نے کہا وہ تو گھر ہے۔ باؤ جی مجھے ایک صوبیدار میجر صاحب کے پاس لے گئے۔ انہیں بتایا کہ یہ جولڑ کا بھرتی ہونے کے لئے آیا ہے، اپنے آپ کو میٹرک بتاتا ہے لیکن اس کے پاس کوئی تعلیمی سند موجود نہیں۔

صوبیدار میجر مجھے ایک افسر (یونٹ کے ایڈ جوٹنٹ) کے پاس لے گئے۔ ایڈ جوٹنٹ کمانڈنگ آفیسر کا سٹاف آفیسر ہوتا ہے جو پوری یونٹ کے نظم ونسق کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ایڈ جوٹنٹ صاحب نے مجھ سے چند سوال فزکس اور کیمسٹری کے پوچھے اور ایک دو سوال جنرل نالج کے۔ خوش قسمتی سے میں نے تمام سوالوں کے جوابات درست دیے۔ پھر ایڈ جوٹنٹ صاحب کے حکم پر میرا تفصیلی میڈیکل چیک اپ کروایا گیا۔ بہر حال مجھے اور میرے ساتھ دو اور امیدواروں کو میڈیکل افسر نے طبی طور پر پاک آرمی کے لئے موزوں قرار دے دیا۔ ہمیں تین دن کی چھٹی دی گئی اور حکم دیا گیا کہ 23 اپریل 1980ء کو گھر سے اپنا سامان وغیرہ لے کر واپس یونٹ میں رپورٹ کریں۔ مجھے یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنی میٹرک کی اصل سند بھی لے کر آؤں۔ میں یہاں سے فارغ ہو کر بھائی فرزند علی کے کمرے میں گیا اور انہیں بتایا کہ میں بھرتی ہو گیا ہوں، تین دن کی چھٹی دی گئی ہے اور مورخہ 23 اپریل کو واپسی رپورٹ کا کہا گیا ہے۔ انہوں نے کہا، ”تم آج شام کو ہی نکل جاؤ، رات کے اندھیرے میں چھپ چھپا کر۔ دیکھنا! گاؤں میں کسی کو پتہ نہ چلنے پائے ورنہ کام خراب ہو سکتا ہے۔ اپنا ضروری سامان اور میٹرک کی سند لے کر کل صبح فجر کی نماز پڑھتے ہی گاؤں سے نکل آنا اور سیدھا میرے گھر پہنچ جانا“۔

میں قینچی سٹاپ لاہور سے بس پر سوار ہو کر کھڈیاں خاص (قصور) پہنچا۔ وہاں سے میرا گھر چھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت سواری کا کوئی بندوبست نہیں تھا کیونکہ مغرب کے بعد کوئی تانگہ بھی میرے گاؤں کی طرف نہیں جاتا تھا۔ میں پیدل چل نکلا۔ گھر پہنچا تو گھر کے تمام افراد سو چکے تھے۔ میرے اتنی دیر سے اور اچانک گھر پہنچنے پر سارے اہل خانہ پریشان ہو گئے۔ میں نے بتایا کہ میں چک نمبر 4 ویرم سے لاہور بھائی فرزند علی کے پاس چلا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے فوج میں بھرتی کروا دیا ہے۔ والد صاحب پوچھنے لگے کہ کیا بھرتی ہوئے ہو؟ میں نے جواب دیا، ”ٹیکنیکل اسسٹنٹ“۔ گھر والوں نے سوچا کہ یہ ٹیکنیکل اسسٹنٹ فوج کا کوئی افسر ہوتا ہو گا۔ لیکن میں نے انہیں بتایا کہ یہ عہدہ افسر نہیں بلکہ ایک سپاہی کے برابر ہوتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ سارے گھر والے مجھے اور بھائی فرزند علی کو لعن طعن کرنے لگے۔ پھر ماں جی نے بڑے پیار سے پوچھا: ”پتر! تیری تنخواہ کنی لگی اے؟“ (بیٹا! تمہاری تنخواہ کتنی ہو گی؟) جب میں نے بتایا کہ میری تنخواہ مبلغ 280 روپے ماہانہ ہو گی تو پھر سے ایک شور مچا کہ اتنی کم تنخواہ! میں نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ بھائی فرزند علی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نے کمال مہربانی کرتے ہوئے مجھے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے بھرتی کروایا ہے۔انہوں نے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اب فوج میں بھرتی ہو جانے سے تمہاری پولیس کے مقدمے سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔لالہ جی (بڑے بھائی مہر محمد عالم) غصے سے بولے،''سعید احمد کو کون سا ہم نے قتل کیا ہے۔ہم سچے ہیں۔مقدمہ تو ختم ہونا ہی ہے لیکن تمہیں جو فوج کی عمر قید ہوگئی ہے۔اب اس کا کیا بنے گا؟''

پھر میں نے پوچھا کہ اس دن میرے جانے کے بعد کیا ہوا؟ لالہ جی نے بتایا،''تمہارے گھر سے نکلنے کے دس پندرہ منٹ کے بعد گاؤں کے چوکیدار کے ساتھ دو پولیس ملازم آئے تھے۔کہہ رہے تھے کہ غفور کو بھیجو،اسے ماسٹر عالم کے ڈیرے پر لے کر جانا ہے۔ہم نے کہا کہ وہ تو گھر پر نہیں ہے تو کہنے لگے کہ آدھ گھنٹہ پہلے تو وہ ٹاہلی کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اب اچانک کہاں چلا گیا ہے؟۔اس کے کچھ دیر بعد پولیس سے بھرا ہوا تانگہ ہمارے گھر کے گیٹ پر رکا اور تھانیدار یہ پیغام دے کر چلا گیا کہ غفور کو کل تھانہ کنگن پور میں پیش کریں ورنہ ہم گھر کے سارے مرد حضرات کو اور تمہارے مال مویشی بھی اٹھا کر لے جائیں گے۔''میں نے بڑی بے قراری سے پوچھا،''پھر آپ لوگوں نے کیا کیا؟''لالہ جی کہنے لگے، میں تھانہ کھڈیاں گیا تھا۔وہاں پر میرا ایک دوست تھانیدار ہے۔اس سے بات کی تو اس نے مجھے بتایا کہ یہاں پورے تھانے کو پتہ ہے کہ عبدالغفور بے گناہ ہے۔اس کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن ماسٹر محمد عالم آپ کو پھنسانے پر تلا ہوا ہے۔وہ نہ صرف اپنے ذاتی تعلقات استعمال کر رہا ہے بلکہ اس نے ایک بھاری رقم بھی اس مقصد کے لئے ایک پولیس افسر کو دی ہوئی ہے۔اس نے مجھے کہا ہے کہ آپ بھی کچھ رقم کا بندوبست کریں۔میں آپ کی ڈیل کروا دوں گا۔ اب ہم نے اس مقصد کے لئے کچھ رقم کا بندوبست کر لیا ہے۔''

میں یہ بات سن کر بہت پریشان ہوا۔لالہ جی سے کہا:''ہم نے کون سا کوئی جرم کیا ہے کہ ہم پولیس والوں کو پیسے دیں؟ لالہ جی نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا:''غفور تمہیں نہیں پتہ کہ پاکستان میں کیا نہیں ہوتا۔ہمارے کیس ہی کو دیکھ لیں۔ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟ لیکن پولیس ہمارے سیاسی مخالف کے کہنے پر تمہیں قتل کیس میں گرفتار کرنے کے درپے ہے۔یہ ایک مصیبت ہم پر آن پڑی ہے اس سے نکلنا تو ہے۔''۔پھر میں نے گھر والوں کو بتایا کہ بھائی فرزند علی نے مجھے کہا تھا کہ کل صبح فجر کی نماز کے بعد گاؤں سے لاہور کے لئے نکل آنا۔اس لئے مجھے علی الصبح نکلنا ہے۔ماں جی میری یہ بات سن کر بہت پریشان ہوگئیں۔دوسری جانب پولیس کیس کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش آگئی تھی تو اس کا سامنا بھی تو کرنا تھا اس لئے ضبط کر گئیں۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس طرح میں اپنے والدین اور تمام بہن بھائیوں کی سسکیوں میں صبح فجر کی نماز کے بعد گھر سے لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ یوں اپنی چھٹی گزارنے کے بعد میں اگلے دن مغرب سے قبل اپنی یونٹ پہنچ گیا۔ گیٹ پر رپورٹ کی تو وہاں سے رجمنٹ پولیس کا ایک جوان مجھے ایک بیرک میں چھوڑ آیا۔ ہم کل 67 رنگروٹ تھے جس میں ایک میں میٹرک پاس تھا اور دوسرا ٹیکنیکل اسسٹنٹ محمد ارشد تھا۔ باقی سب ان پڑھ تھے۔ ہم تمام لوگوں کو ایک ہی بیرک میں ٹھونس دیا گیا۔

ہمیں خوش خبری سنائی گئی کہ مورخہ 26 اپریل 1980ء سے ہماری باقاعدہ فوجی ٹریننگ کا آغاز ہو رہا ہے۔ چونکہ ہماری ٹریننگ شدید گرمی کے موسم میں ہونا تھی اس لیے ٹریننگ کا ڈریس بنیان بغیر بازو کے، نیکر، بوٹ اور اونی جرابوں کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ خیر ایک جاں گسل اور سخت ٹریننگ کے بعد ہماری ٹریننگ مکمل ہو گئی۔ ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ مورخہ 16 اکتوبر 1980ء کو ہونا تھی۔ اس کے لئے تیاریاں زوروں پر تھیں۔ ہمیں چھ ماہ تک مسلسل دن رات رگڑا لگایا گیا اور جوں جوں پاسنگ آؤٹ پریڈ کا دن قریب آ رہا تھا اس رگڑے میں بہت زیادہ سختی آ گئی تھی۔ سارا دن ڈرل کروائی جاتی تھی اور شام تک تھکاوٹ سے ہمارا برا حال ہو جایا کرتا تھا۔ دن گن گن کر گزارے جا رہے تھے۔ سنا تھا کہ پاسنگ آؤٹ پریڈ کے بعد جب ہمیں اپنی اپنی بیٹری میں تعینات کر دیا جائے گا تو ٹریننگ والی سختیاں نہیں ہوں گی۔ ٹریننگ کے اختتام پر بیٹری میں تعیناتی کے بعد بھی میں نے انتہائی محنت اور دل لگا کر کام کیا۔ لاہور میرے گھر سے کافی نزدیک تھا۔ ہر ماہ ایک دو دن کی چھٹی لے کر گھر چلا جاتا تھا۔ ویسے بھی بھائی فرزند علی کے گھر میں خاندان کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اس لئے گھر کے حالات کی خبر ملتی رہتی تھی۔

1981ء کی بات ہے کہ ایک دن چونکا دینے والی خبر ملی کہ عن قریب میری یونٹ کوہاٹ، صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) جا رہی ہے اور یہ کہ یونٹ کی ایک بیٹری پاراچنار میں بھی ڈیپلائی ہو گی۔ پاراچنار پاک افغان بارڈر پر ایک قصبہ ہے جو افغانستان سے دس پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت روس کی فوجیں افغانستان میں داخل ہو چکی تھیں لیکن مجاہدین کی سخت ترین مزاحمتی جنگ جاری تھی۔ افغانستان کو فتح کرنے کے بعد روس کا منصوبہ پاکستان پر قبضہ کرنا تھا کیونکہ وہ گرم پانیوں تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن اللہ نے اسے توفیق نہ دی اور افغان مجاہدین کے ہاتھوں شکست کھا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ آخر کار لاہور سے کوہاٹ جانے کا شیڈول آ گیا اور ہماری یونٹ نے ماہ مئی 1981ء میں لاہور سے کوہاٹ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ جس بیٹری کا میں حصہ ہوں وہ لاہور سے سیدھی پارہ چنار اجائے گی۔ پوری یونٹ نے دو ماہ قبل ہی سامان کی پیکنگ شروع کر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دی۔ہم تمام سپاہی سارا دن یونٹ کے سامان کی پیکنگ میں مصروف رہتے۔کام کی زیادتی کی وجہ سے ہماری چھٹیاں بند کر دی گئی تھیں۔آخر کار لاہور سے روانگی کا دن آ گیا۔ہم نے اپنا سامان فوجی گاڑیوں میں لادا اور لاہور کینٹ ریلوے اسٹیشن پر لے جا کر ہماری یونٹ کے لئے مخصوص کی گئی بوگیوں میں رکھ دیا۔سٹیشن پر ہی ہماری ''فال ان'' ہوئی، گنتی کی گئی۔ہم ٹرین میں سوار ہوئے اور ٹرین چھک چھک کرتی ہوئی روانہ ہو گئی۔تین چار دن کے بعد ہم کوہاٹ پہنچ گئے۔سامان ٹرین سے اتار کر پارا چنار جانے والی ٹرین پر رکھا اور پارا چنار جا پہنچے۔ہمارا کیمپ پارہ چنار شہر سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر سیبوں کے باغ کے پاس تھا۔ہماری رہائش زیر زمین بینکرز میں تھی۔بینکرز کی چھتیں لوہے کی چادروں سے بنی ہوئی تھیں۔اور ان جستی چادروں کو سہارا دینے کی لئے ان کے نیچے لکڑی کی ''بلیاں'' کھڑی کی تھیں اور ان چادروں کو تیز ہوا کے اثر سے بچانے کے لئے ان کے اوپر بڑے بڑے پتھر رکھے گئے تھے۔

ایک دن میں مورچے میں ڈیوٹی پر تھا۔میرے چارج میں ہیوی مشین گن تھی جس کی بیلٹ ایک ہزار گولیوں کی تھی۔مورچے کے اوپر چھت نہ تھی۔اچانک بارش آ گئی۔میں نے فوری طور پر مشین گن کو کلوز کیا۔گن کو کاندھے پر رکھا اور ایمونیشن بیگ کو ایک ہاتھ میں پکڑ کر اپنے بنکر کی طرف بھاگا تا کہ مشین گن بارش کے پانی سے بھیگ نہ جائے۔جلدی سے بینکر میں داخل ہوا۔سیڑھیاں اترا، اندر اندھیرا تھا۔کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔اچانک یوں ہوا کہ میری کاندھے پر رکھی ہوئی مشین گن ٹن کی چادروں کو سہارا دینے والی ایک "بلی" سے ٹکرائی اور آناً فاناً بینکر کے ایک حصے کی چھت کی جستی چادریں نیچے گرنا شروع ہو گئیں اور ان کے اوپر رکھے پتھر بھی دھڑام دھڑام کر کے نیچے گرنا شروع ہو گئے۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس اثناء میں میں نیچے گر گیا۔میں جونہی گرا ایک جستی چادر مرے اوپر اس طرح گری کہ وہ گرتے ہی دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور میرے لیے شیلٹر بن گئی ورنہ جتنے بڑے بڑے پتھر چھت کے اوپر سے گر رہے تھے۔ایک ہی پتھر میرا کام تمام کرنے کے لئے کافی تھا لیکن اللہ تعالٰی کی ذات نے مجھے بال بال بچا لیا۔میری بیٹری کے سارے لوگ بارش کی وجہ سے اپنے اپنے بینکرز میں گھسے ہوئے تھے لیکن جستی چادروں پر پتھروں کے گرنے کی شدید آوازیں سن کر دوڑ کر اس بینکر پر پہنچے جس کے اندر میں گرا ہو تھا۔ان لوگوں نے جلدی جلدی سے اور بڑی احتیاط کے ساتھ تمام پتھر ہٹائے اور چادروں کو ایک طرف کر کے مجھے نیچے سے نکالا۔تمام لوگ مجھے صحیح سلامت دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور حیران بھی۔

افغانستان بارڈر پر پاکستان کا آخری گاؤں ''تری مینگل'' ہے۔اس گاؤں کے قریب

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پہاڑوں پر تقریباً ایک کلومیٹر چڑھائی پر ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہماری یونٹ کی آبزرویشن پوسٹ (او۔پی) تھی۔ وہاں پر ایک جے سی او (جونیئر کمیشنڈ آفیسر)، ایک ٹی اے (ٹیکنیکل اسسٹنٹ) اور ایک اوسی یو (آپریٹر کمیونیکیشن یونٹ) کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ اگست 81ء میں میری ڈیوٹی وہاں لگائی گئی، میرے ساتھ صوبیدار محمد سلیمان اور اوسی یو محمد اختر کی ڈیوٹی لگی۔ گاؤں ''تری مینگل'' تک تو ہمیں فوجی گاڑی میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے او۔پی (ابزرویشن پوسٹ) تک اپنا بستر اٹھا کر پہاڑ کی چوٹی تک پیدل چڑھنا تھا۔ خیر، ہم وہاں پہنچے، اپنے اپنے سامان کا چارج لیا اور پہلے والے لوگوں کو واپس روانہ کر دیا۔ یہ پوسٹ اس علاقہ کی بلندترین چوٹی پر تھی اور افغانستان کے علاقہ میں تھی۔

یہاں کے سٹاف کے فرائض میں شامل تھا کہ ہر گھنٹے بعد دشمن کی نقل وحرکت سے اپنی یونٹ کو بذریعہ وائرلیس معلومات فراہم کی جائیں۔ کسی بھی خطرے یا ایمرجنسی کی صورت میں یونٹ سے گولہ باری کی صورت میں کمک مانگی جائے۔

ایک دن دو بجے کے قریب ہم اپنے بنکر سے باہر بیٹھے دھوپ تاپ رہے تھے کہ افغانستان کی طرف سے ایک روسی ہیلی کاپٹر انتہائی نیچی پرواز سے ہماری پوسٹ کے اوپر آیا۔ ہمارے پاس انٹی ایئر کرافٹ مشین گن تھی۔ صوبیدار صاحب نے گنر کو اس ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل ہوئی لیکن یہ کیا؟ ہیلی کاپٹر پر ان گنت گولیاں فائر کی گئیں۔ گولیاں بالکل اس کے اوپر لگ رہی تھیں لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ وہ روسی ساختہ بلٹ پروف ہیلی کاپٹر تھا۔ ہم حیران تھے کہ ہیلی کاپٹر نے وہاں آ کر کوئی کارروائی نہ کی اور واپس چلا گیا اور ہمیں اللہ کی ذات نے محفوظ رکھا۔

ایک دن ہم اپنے بنکر کے اندر بیٹھے تھے کہ ایک بم کا دھماکہ ہوا۔ ہم دوربین لے کر اپنے بینکر سے باہر نکلے تاکہ دیکھا جا سکے کہ بم کہاں گرا ہے اور اس سے کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔ کیونکہ ہم نے اس کی رپورٹ اپنے ہیڈ کوارٹر کو دینا تھی۔ اتنی دیر میں ہمارے بینکر کے قریب ہی توپ کا ایک اور گولہ گرا۔ ہم سب فوری طور پر زمین پر لیٹ گئے۔ بعد میں صوبیدار صاحب کے حکم سے پیٹ کے بل ''کرالنگ'' کر کے اپنے بنکرز میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد توپ کا ایک اور گولہ ہمارے بنکر کے بالکل قریب آ کر گرا۔ اس سے اڑنے والی دھول ہمارے بنکر کے دروازے سے اندر آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اب ہم سارے سہمے ہوئے تھے کہ دشمن کا اگلا ٹارگٹ ہمارا بنکر ہوگا۔ گولہ ہمارے بنکر کے عین اوپر گرے گا اور ہم یقیناً شہید کے رتبے پر فائز ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے بعد دشمن کی طرف سے کوئی گولہ نہ آیا، شاید دشمن نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی گولہ باری سے ہمارا بنکر تباہ ہو چکا ہے۔ اس ابزرویشن پوسٹ میں ہم نے ایک مہینہ موت کے منہ میں گزارا اور افغان روس جنگ کو نہایت قریب

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے دیکھا۔ ہماری بیٹری نے پاراچنار میں ایک سالہ مدت پوری کی۔ اس کے بعد ہماری جگہ کسی اور بیٹری کو بھیج دیا گیا اور ہماری بیٹری کو کوہاٹ واپس بلالیا گیا۔

میں فوج میں مختلف تقریری مقابلوں میں حصہ لیتا رہا۔ اپنے سرکاری کاموں سے بڑی مشکل سے فرصت نکال کر اپنی تقریریں کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا تھا اور اس میں اپنے سینئرز سے بھرپور رہنمائی بھی لیتا رہتا۔ میں فوج میں نوکری تو کر رہا تھا لیکن مجھے اپنا مستقبل روشن نہیں لگ رہا تھا۔ ہر وقت سوچتا رہتا کہ مجھے ایسا کیا کرنا چاہئے کہ میں ترقی کرسکوں۔ وہاں رہ کر میری ترقی زیادہ سے زیادہ صوبیدار میجر تک ہوجاتی، زیادہ بھی تیر مار لیتا تو آنریری (اعزازی) کیپٹن بن پاتا۔ ایک دن میری ملاقات محمد اقبال (ٹیکنیکل اسسٹنٹ) رومیو بیٹری سے ہوئی۔ یہ بعد میں آنریری کیپٹن ریٹائر ہوئے۔ انہیں انگریزی بولنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے آتے ہی میرے ساتھ انگریزی میں گفتگو شروع کر دی۔ ایک دن کہنے لگے: ''کیا یہاں پڑے پڑے گلتے رہنے کا ارادہ ہے! ہمارے جیسے پڑھے لوگوں کا یہاں کیا مستقبل ہے''۔ عرض کرتا چلوں کہ اس وقت میٹرک پاس کر جانا ایک معنی رکھتا تھا۔ دوسرا یہ کہ فوج میں اس وقت نچلے رینکس میں میٹرک پاس لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی تھی۔ میں نے اقبال سے پوچھا، پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ تو کہنے لگا: ''سب سے پہلے تو ہمیں اپنی انگریزی بول چال بہتر کرنی چاہیے اور انگریزی گرامر وغیرہ سیکھنی چاہیے۔ دوسرا یہ کہ ہمیں پرائیویٹ ایف اے کرنا چاہیے۔ پھر آرمی میں کمیشن کے لئے اپلائی کرنا چاہیے''۔

اپریل 1983ء میں مَیں میپ ریڈنگ (فوجی نقشہ بینی) کی کلاس اٹینڈ کر رہا تھا۔ اس وقت ملک عبداللہ صاحب (نائب صوبیدار) ہماری یونٹ کے ایجوکیشن جے سی او ہوا کرتے تھے۔ انتہائی نفیس اور پڑھے لکھے انسان تھے۔ اس وقت ان کی تعلیم ایم اے اکنامکس تھی، میرے تو وہ محسن تھے۔ ایک دن وہ ہماری کلاس چیک کرنے کے لئے آئے۔ ہم سب کی کاپیاں ایک میز پر پڑی تھیں۔ انہوں نے ہماری کاپیاں چیک کرنی شروع کیں، میری کاپی کھولی تو وہ کلاس کی سب سے خوبصورت کاپی تھی۔ میری اردو اور انگریزی لکھائی بہت اچھی تھی، کاپی دیکھ کر متاثر ہوئے۔ کلاس میں ان کی آواز گونجی: ٹی اے عبدالغفور کون ہے؟ میں کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا۔ کہنے لگے: ''تمہاری تعلیم کتنی ہے؟'' میں نے انہیں بتایا کہ میں نے میٹرک سائنس کیا ہے۔ کہنے لگے، تم ایف اے کیوں نہیں کر لیتے ہو؟ میں نے گزارش کی، سر! آپ کو پتہ ہے کہ میں سپاہی ہوں۔ سپاہیوں کو کہاں پڑھنے کا وقت ملتا ہے؟۔ میری یہ بات سن کر مسکرائے اور کہنے لگے، ''اگر آپ کو پشاور میں ڈویژنل ایجوکیشن سکول میں ایف اے کرنے کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لئے بھیج دیا جائے تو چلے جاؤ گے؟ وہاں ایف اے کی ریگولر کلاس چل رہی ہے۔" میں نے عرض کی، "آپ مہربانی فرمادیں۔ میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔" انہوں نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ میں کمانڈنگ آفیسر (کرنل) سے بات کرتا ہوں۔

اگلے دن عبداللہ صاحب پھر ہماری کلاس میں آئے، مجھے بلایا اور بتانے لگے کہ ان کی کرنل محمد سلیم (کمانڈنگ آفیسر) سے بات ہوگئی ہے۔ پھر تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگے: "میں کل یہاں سے سیدھا سی او صاحب کے پاس گیا تھا اور انہیں بتایا کہ سر! ہمارا ایک ٹی اے ہے جو ایف اے کرنا چاہتا ہے۔ پشاور میں ایف اے کی کلاس چل رہی ہے۔ اگر ہم اسے وہاں بھیج دیں تو شاید اس کا مستقبل بن جائے۔ انہوں نے پوچھا کہ کون سا ٹی اے؟ تو میں نے انہیں تمہارا نام بتایا تو کہنے لگے یہ کہیں وہی لڑکا تو نہیں جس نے اپنی بریگیڈ میں زبردست تقریر کی تھی؟" بہر کیف، ان حضرات کا مجھ پر احسان تھا کہ انہوں نے اگلے ہی دن مجھے میرا مومنٹ آرڈر تھما دیا اور میں پشاور میں ڈویژنل ایجوکیشن سکول چلا گیا۔

اس وقت ڈویژنل ایجوکیشن سکول پشاور کے انچارج میجر اختر رندھاوا تھے اور صوبیدار شوکت علی (آرمی ایجوکیشن کور) سکول کے انچارج جے سی او تھے۔ میں صوبیدار شوکت صاحب سے ملا اور انہیں اپنی یونٹ کی طرف سے جاری کردہ چٹھی دی اور کہا کہ "سر! میں ایف اے کرنا چاہتا ہوں"۔ صوبیدار صاحب بہت ہی مشفق، نیک، متقی، پرہیزگار، پابندصوم وصلوۃ اور باشرع آدمی تھے، کہنے لگے: "بیٹا آپ تو بہت لیٹ آئے ہیں۔ ہم اس سکول میں ایف اے کی کلاس صرف بیس ہفتے کی چلاتے ہیں۔ آج کلاس کا نواں ہفتہ شروع ہو چکا ہے۔ ہم طلبا کو آدھے سے زیادہ سلیبس پڑھا چکے ہیں۔ اگر آپ کو ہم رکھتے ہیں تو آپ کلاس کے ساتھ نہیں چل پائیں گے اور ہمارے سکول کا رزلٹ خراب ہونے کا امکان ہوگا"۔ میں نے منت کرنے کے انداز میں کہا: "سر! میں بڑی مشکلوں سے اپنی یونٹ سے اجازت لے کر آیا ہوں۔ مجھے دوبارہ چانس ملنا ناممکن ہے۔ آپ مہربانی فرمائیں مجھے موقع دیں میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔" میری باتیں سن کر صوبیدار صاحب کے دل میں رحم آ گیا۔ پوچھنے لگے: "تمہارا میٹرک سائنس کے ساتھ ہے یا آرٹس کے ساتھ؟ اور میٹرک میں کتنے نمبر تھے؟" میں نے بتایا کہ میرا میٹرک سائنس کے ساتھ ہے اور میرے میٹرک میں 559 نمبر تھے۔ کہنے لگے اس کے لئے تو میجر صاحب سے بات کرنی پڑے گی۔ پھر کہنے لگے ہم آپ کو مشروط طور پر ایک ہفتے کے لئے کلاس میں بٹھا لیتے ہیں اگر تمہاری پرفارمنس ٹھیک ہوئی تو آپ کو کلاس جاری رکھنے کی اجازت دے دیں گے ورنہ آپ کو فارغ کر دیں گے۔ صوبیدار صاحب نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مجھے کلاس میں بھیج دیا۔

کلاس میں تیس کے قریب لڑکے تھے۔ایک لڑکا تھا جس کا نام تھا دلدار حسین۔ یہ ملٹری پولیس کا نائیک تھا۔کلاس میں اس کا طوطی بولتا تھا۔ وہ لائق بھی تھا اور اس کی انگریزی کی لکھائی بھی اچھی تھی۔ میں نے بہت سے انگریزی کے الفاظ کی بناوٹ اس سے سیکھی۔ وہ میرا دوست بن گیا۔وہ شام کو اکثر ہماری بیرک میں آجاتا اور ہم اکٹھے پڑھا کرتے۔ پورا ہفتہ میں نے خوب دل لگا کر پڑھا کیونکہ مجھے ادراک تھا کہ میرا مستقبل اس ہفتے کی محنت میں پوشیدہ ہے۔اللہ نے مجھ پر اپنا خاص کرم کیا۔اگلے ہفتے شیڈول کے مطابق ہمارا مطالعہ پاکستان کا پیپر تھا۔ پورے ہفتے میں جو پڑھایا گیا تھا اس میں سے ٹیسٹ لیا جانا تھا۔میری تیاری ٹھیک تھی۔اگلے دن جب رزلٹ سنایا گیا تو دلدار حسین فرسٹ آگیا اور میں کلاس میں سیکنڈ آیا۔صوبیدار شوکت صاحب نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔حوصلہ افزائی کی اور شاباش دی۔ یہ بھی کہا کہ تم اسی طرح محنت کرتے رہو گے تو بہت اچھا رزلٹ لے سکتے ہو۔ پڑھائی اور محنت کا سلسلہ یونہی شب و روز جاری رہا۔ میں نے ایف اے میں سیاسیات، اسلامیات اختیاری اور میپ ریڈنگ (فوجی نقشہ بینی) کے اختیاری مضامین لئے تھے۔ باقی دو اختیاری مضامین تو سکول میں پڑھائے جاتے تھے لیکن میپ ریڈنگ نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے میپ ریڈنگ میں بہت محنت کی اور صوبیدار شوکت صاحب جیسی نہایت شفیق ہستی میسر آئی جنہوں نے میری ہر قدم پر رہنمائی کی۔

ایف اے کے امتحانات سر پر آگئے، ہم نے زبردست تیاری کی اور امتحانات دے دیئے۔ اب میرا اپنی یونٹ میں واپسی کا دن آگیا۔واپسی سے ایک دن قبل میں نے عصر کی نماز اسی مسجد میں ادا کی جہاں صوبیدار شوکت علی صاحب رہائش پذیر تھے۔صوبیدار صاحب اپنی سرکاری رہائش جے سی او میس کے بجائے مسجد کے حجرے میں رہتے تھے کیونکہ وہ سرکاری ڈیوٹی کے بعد تمام وقت یادِ الٰہی میں ہی صرف کر دیتے تھے۔ بڑے اللہ والے انسان تھے۔ وہ مجھے اپنے حجرے میں لے گئے جہاں کوئی چارپائی نہ تھی۔موصوف فرشی بستر پر ہی سویا کرتے۔ کمرے میں انتہائی بوسیدہ حالت میں لیکن صاف ستھرے دو عدد گول تکیے بھی تھے۔انہوں نے مسجد کے خادم کو چائے لانے کا کہا۔ میں نے شوکت صاحب سے کہا: ''سر! کل میں واپس جا رہا ہوں۔آپ کو خصوصی طور پر ملنے آیا ہوں کہ آپ کی مہربانیوں، شفقتوں، محبتوں اور راہنمائیوں کا شکریہ ادا کر سکوں۔آپ میرے عظیم محسن ہیں''۔صوبیدار صاحب کہنے لگے، ''بیٹا! میں نے جو کچھ کیا اپنا فرض سمجھ کر کیا کیونکہ میں تنخواہ ہی اسی کام کی لیتا ہوں۔بس آپ نماز پڑھ کر میرے لیے بھی دعا کر دیا کرنا اور یاد رکھنا ماں باپ کی دعا سے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بڑھ کر کوئی دعا نہیں ہوتی۔ والدین کی موجودگی میں کسی پیر سے دعا کروانے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہی سب سے بڑے پیر ہوتے ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پیپرز بہت اچھے ہوئے ہیں کیونکہ آپ ذہین بچے ہو۔ مجھے اللہ کے گھر سے امید ہے کہ تمہاری آرمڈ فورسز بورڈ میں کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور آئے گی"۔ میں نے کہا سر! وہ کیسے؟ کہنے لگے: "بس مجھے تمہاری محنت سے بخوبی اندازہ ہو رہا ہے"۔

میں اپنی یونٹ میں واپس کوہاٹ آ گیا۔ سب سے پہلے اپنے محسن نائب صوبیدار ملک محمد عبداللہ، ایجوکیشن جے سی او سے ملا۔ انہوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ میرے پیپرز کیسے ہوئے؟ میں نے انہیں بتایا کہ سر! میرے پیپرز بہت اچھے ہوئے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر یونٹ کے کمانڈنگ افسر سے بات کر کے مجھے سرکاری ایجوکیشن گرانٹ سے بی اے کی کتب منگوا کر دیں اور ساتھ حکم دیا کہ جب بھی وقت ملے کچھ نہ کچھ پڑھ لیا کرنا۔ جنوری 1984ء میں اپنے ٹریڈ کی کلاس اٹینڈ کر رہا تھا۔ دیکھا کہ محترم عبداللہ صاحب بڑے تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہماری کلاس کی طرف آ رہے ہیں۔ انہوں نے قریب پہنچ کر مجھے بلایا، مبارکباد دی اور گلے سے لگا لیا اور کہنے لگے، "غفور تم پاس ہو گئے ہو"۔ میں نے سے پوچھا، "سر! کیا میں صرف پاس ہوا ہوں؟"۔ انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگے: "آرمڈ فورسز بورڈ فار ہائر ایجوکیشن، جی ایچ کیو، راولپنڈی کی طرف سے لئے گئے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں (جس میں پاک آرمی، پاکستان ایئر فورس اور پاکستان نیوی کے طلبا نے شرکت کی) آپ نے 753 نمبر حاصل کر کے پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ آپ نے سابقہ ریکارڈ جو 728 نمبر کا تھا توڑ دیا ہے"۔

پھر عبداللہ صاحب نے مجھے بتایا کہ میں یہ خوشخبری کرنل محمد سلیم، کمانڈنگ افیسر کو دے کر آیا ہوں۔ انہوں نے تمہیں بلایا ہے۔ میں نے فوراً اپنی ٹوپی سر پر پہنی۔ یونیفارم کو سیٹ کیا اور عبداللہ صاحب کے ساتھ سی او صاحب کے دفتر کی طرف چل پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں چل نہیں رہا بلکہ ہوا میں تیرتا ہوا جا رہا ہوں۔ میرے قدم زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ یہ میری زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ جب سی او صاحب کے دفتر پہنچے تو میرے پہنچنے سے پہلے انہوں نے تمام بیٹری کمانڈرز کو اپنے دفتر بلایا ہوا تھا۔ جب میں عبداللہ صاحب کے پیچھے پیچھے کرنل صاحب کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ اپنی سیٹ چھوڑ کر اپنے دفتری میز کی دوسری طرف آئے اور مجھے گلے سے لگایا، میرا ماتھا چوما اور مبارک باد۔ پھر تمام بیٹری کمانڈرز نے باری باری مجھے اپنے سینے سے لگا کر مبارک باد دی۔ ایک فوجی سپاہی کے لئے اس سے بڑا کیا اعزاز ہو سکتا ہے کہ جو افسر سپاہیوں سے ہاتھ تک ملانا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پسند نہ کرتے ہوں وہ اسے گلے سے لگا کر مبارک بادیں دے رہے ہوں۔ کرنل صاحب نے ساتھ ہی ایک لفافہ میری طرف بڑھایا اور کہنے لگے، ''غفور! اس لفافے میں مبلغ پانچ صد روپیہ ہے۔ یہ آپ کا انعام ہے''۔ اب کرنل صاحب نے ایک اور اعلان کیا۔ انہوں نے مجھے سپاہی سے ترقی دے کر ''اَن پیڈ لانس نائیک'' بنا دیا۔ فوجی اصطلاح میں ''اَن پیڈ'' سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص رینک تو لگائے گا لیکن اس کی تنخواہ میں اضافہ نہیں ہوگا۔ کرنل صاحب نے یہ بھی اعلان کیا کہ مجھے رینک پوری یونٹ کے سامنے لگایا جائے گا۔ جس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ اس کی پوری یونٹ کے لوگوں کے سامنے عزت بڑھے گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگوں کو اچھا کام کرنے کے لئے موٹیویشن بھی ملے گی۔

پھر میں نے فوج ہی میں بی اے کی تیاری شروع کر لی اور 1986ء میں بی اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے بطور پرائیویٹ امیدوار، فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ جس دن میرا بی اے کا رزلٹ آیا اس سے اگلے دن پاک آرمی میں ایجوکیشن جے سی او کے مقابلے کے امتحان کے لئے اپلائی کرنے کی آخری تاریخ تھی۔ میں نے اس امتحان کے لیے اپلائی کر دیا۔ مجھے ایجوکیشن جے سی او کے مقابلے کے امتحان کی کال آ گئی۔ امتحانی سنٹر راولپنڈی میں تھا وہاں میرا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ اپنے پرانے محسن کرنل راجہ محمد سلیم صاحب کے پاس گیا۔ یہ ان دنوں راولپنڈی میں ٹرانسفر ہو چکے تھے۔ انہوں نے میری رہائش اور کھانے کا بندوبست کر دیا۔ جب امتحانی سنٹر پہنچا تو یہ دیکھ کر بڑا مایوس ہوا کہ کل 36 سیٹیں تھیں جبکہ ہزاروں امیدوار تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک پرسنالٹی والے لوگ تھے، ہشاش بشاش چہرے اور فر فر انگریزی بولنے والے۔ آرمی کے علاوہ سول امیدوار بھی تھے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اس پڑھے لکھے ہجوم میں میری سلیکشن تو ناممکن ہی لگتی ہے لیکن میں نے اللہ کو یاد کر کے پیپر دے دیئے۔

اس امتحانی سنٹر میں ایک دلچسپ شخصیت تھی۔ نام تو پتہ نہیں ان کا کیا تھا لیکن انہیں صوبیدار خاندانی صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ جوں جوں رزلٹ کا وقت قریب آ رہا تھا، دل کی دھڑکن بے ترتیب اور تیز ہوتی جا رہی تھی۔ آخر مقررہ وقت پر صوبیدار خاندانی صاحب اپنی ٹیم کے ہمراہ تشریف لائے اور ہمیں فال ان ہونے کا حکم دیا گیا۔ پھر صوبیدار صاحب نے اپنے ہاتھ میں پکڑے لفافے میں سے ایک فہرست نکالی اور حکم دیا کہ وہ جس امیدوار کا نام پکاریں وہ ان کی دائیں طرف قطار بنا کر کھڑا ہوتا جائے۔ جب صوبیدار صاحب فہرست میں مذکور نام سنا چکے تو تمام امیدوار دو حصوں میں بٹ چکے تھے۔ کہنے لگے: ''آپ کے سامنے میں نے دو گروپ بنا دیے ہیں۔ ایک گروپ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تحریری امتحان میں کامیاب ہونے والوں کا ہے اور دوسرا گروپ ناکام ہونے والوں کا"۔ پھر انہوں نے پاس اور فیل ہونے والے امیدواروں کا اعلان بڑے دلچسپ انداز سے کیا۔ انہوں نے اس دوسرے گروپ کو جس میں مَیں شامل نہیں تھا۔ ہوشیار باش ہونے کا حکم دیا۔ ذرا سا توقف کیا۔ پھر حکم دیا "داہنے پھر"۔ جب وہ گروپ دائیں جانب پھر گیا تو پھر صوبیدار صاحب کی آواز گونجی "جلدی چل۔ دوڑے چل اور اگلے سال پھر آ جانا"۔ صوبیدار صاحب کا یہ حکم سننے کے بعد نہ صرف کامیاب ہونے والے بلکہ ناکام ہونے والے امیدواران بھی قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔ یوں انہوں نے فیل ہونے والے امیدواروں کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

اگلے دن میں انٹرویو کے لیے جی ایچ کیو گیا اور انٹرویو دے کر واپس کوہاٹ اپنی یونٹ میں چلا گیا۔ چند دنوں کے بعد رزلٹ آ گیا اور میری ایجوکیشن جے سی او (جونیئر کمیشنڈ آفیسر) کے طور پر سلیکشن ہو گئی۔ یہ خبر میری یونٹ میں آگ کی طرح پھیل گئی اور یونٹ کے ہر فرد نے مجھے مبارک باد دی۔ میرے لیے میری یونٹ نے بڑے کھانے کا اہتمام کیا جس میں یونٹ کے تمام افسران، جے سی او صاحبان اور جوانان شامل ہوئے اور مجھے یونٹ کی طرف سے گفٹ دے کر الوداع کیا گیا۔
مجھے ایجوکیشن جے سی او کی ابتدائی تربیت کے لئے سکول (اب کالج) آف آرمی ایجوکیشن، اپر ٹوپہ، مری ہلز میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ 03 مئی 1986ء کو ہماری ٹریننگ شروع ہوئی اور 4 ستمبر 86ء کو پاسنگ آؤٹ ہوئی۔ ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ کے وقت ہم سب کو نائب صوبیدار کے رینک کے بیجز لگائے گئے۔ میں اپنے بیج کا سب سے کم عمر نائب صوبیدار تھا۔ اس وقت آرمی میں میری سروس ساڑھے چھ سال ہو چکی تھی۔ میں نے جے سی او بننے کے بعد بھی اپنی محنت ترک نہ کی حالانکہ جے سی او بننے کے بعد جوان کا سٹیٹس تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ لنگر بھی بجائے جے سی او میس میں کھانا کھاتا ہے۔ بیرکوں کی بجائے اس کی رہائش جے سی او میس میں ہوتی ہے۔ ایک جوان کی خدمات بطور "بیٹ مین" اس کو دی جاتی تھیں۔ اس کے نام کے ساتھ صاحب کا لاحقہ لگ جاتا ہے وغیرہ۔ وغیرہ۔ لیکن میں اسے اپنی منزل نہ سمجھا کیونکہ میری منزل کچھ اور تھی۔ میں نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور پنجاب یونیورسٹی سے پہلے بی۔ ایڈ کی ڈگری اور اس کے بعد ایم اے اسلامک سٹڈیز کی ڈگری لی۔ 1989ء میں میری پوسٹنگ لاہور میں ایک سگنل کی بٹالین میں بطور ایجوکیشن جے سی او ہو گئی۔ میں کور سنٹرل سکول، لاہور میں ایف اے اور میٹرک کی کلاسز کو انگریزی پڑھاتا رہا۔ 1991ء میں میرا تبادلہ لاہور سے بہاولپور میں ایک بلوچ رجمنٹ میں بطور ایجوکیشن جے سی او ہو گیا۔ میں نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں ایم اے انگلش پارٹ ون کا داخلہ بھیج دیا۔ امتحان دیا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اور اللہ کے فضل و کرم سے تمام پرچوں میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوگیا۔ اگلے سال یعنی 1993ء میں ایم اے انگلش۔ پارٹ ٹو کا امتحان دیا اور میں نے ایم اے انگلش کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرلیا۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ میں نے کون سا معرکہ مارا ہے۔ اب تو ایم اے میں لوگ اے اور اے پلس گریڈ لے رہے ہیں۔ جس دور کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت ایم اے انگلش واحد مضمون تھا جس کی کسی سرکاری نوکری کے لیے اپلائی کرنے کے لئے تھرڈ ڈویژن بھی قابل قبول تھی۔

1993ء میں مجھ سے دو بڑی غلطیاں ہوئیں: اس سال ایک تو میں نے ایم اے انگلش پارٹ ٹو کا امتحان دیا، وہ تو پاس ہوگیا۔ ساتھ ہی بغیر مکمل تیاری کے سی ایس ایس اور پی سی ایس کے امتحانات بھی اسی سال دے دیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے فوج جیسی ٹف نوکری بھی کرنا تھی اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال بھی کرنی تھی۔ لیکن الحمدللہ جب جذبے صادق ہوں، ہمت جوان ہو اور اپنے اہداف کے حصول کے لیے اخلاص سے کام لیا جارہا ہو تو ساری مشکلیں آسان ہوجاتی ہیں۔ سی ایس ایس میں میرے نمبر 548/1100 آئے اور میرا ایگریگیٹ نہ بن سکا۔ سی ایس ایس میں میرے نمبر 550 آتے تو میں امتحان کوالیفائی کر جاتا۔ یوں میں صرف دو نمبروں سے رہ گیا۔ اتفاق دیکھئے کہ پی سی ایس کے امتحان میں مطالعہ پاکستان میں میرے 31/100 نمبر آئے۔ باقی سارے پرچے پاس تھے اور اچھے نمبروں میں پاس تھے لیکن میں فیل ہوگیا۔ کیونکہ مقابلے کے ان دونوں امتحانات میں ایک تو امیدوار کو تمام پرچوں میں انفرادی طور پر پاس ہونا ہوتا ہے دوسرا اس کے کل حاصل کردہ نمبر کل نمبروں کا کم از کم 50 فی صد ہونے چاہئیں۔ میرے اگر مطالعہ پاکستان میں 31 کی بجائے 33 نمبر آتے تو میں امتحان کوالیفائی کر جاتا۔ میں نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو بتایا ”سر! میں صرف دو نمبروں سے پی سی ایس کے امتحان میں فیل ہوگیا ہوں اور فیل بھی مطالعہ پاکستان میں ہوا“۔ انہوں نے فوری طور پر ایک چٹھی سیکرٹری پنجاب پبلک سروس کمیشن، لاہور کو لکھی جس میں استدعا کی گئی کہ یا تو میرے مطالعہ پاکستان کے پیپر کی ری چیکنگ کی جائے یا مجھے گریس مارکس (صرف دو نمبر) دے کر پاس کردیا جائے۔ چند دنوں بعد اس چٹھی کا جواب آگیا جس میں تحریر تھا کہ پی پی ایس سی کے رولز کے مطابق نہ تو پیپرز کی ری چیکنگ کی جاسکتی ہے اور نہ ہی گریس مارکس دیے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا ہم معذرت خواہ ہیں۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور پی سی ایس-1994 کے مقابلے کے امتحان میں پھر بیٹھ گیا۔ اور خدائے بزرگ و برتر کی مہربانی سے اس امتحان میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوا اور کرنل محمد اقبال، آئی سپیشلسٹ، جنہوں نے مجھے فوج

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں کمیشن کے لئے طبی طور پر ان فٹ قرار دیا تھا کی بات سچ ثابت ہوئی جو انہوں نے کہا تھا، "تمہارے جیسے بندوں کی فوج میں ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ کہیں سول سروس میں قسمت آزمائی کرو۔" لیکن یہ سفر بہت لمبا تھا۔ یہ دن دیکھنے کے لئے مجھے پندرہ سال کے طویل عرصے تک انتظار کرنا پڑا۔

اس امتحان میں میرا میرٹ بہت اچھا نہ تھا اس لئے میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نہ بن سکا بلکہ میری تعیناتی میرٹ کے مطابق بطور اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز ہوئی۔ اس وقت میری تعیناتی بہاولپور میں ایک پنجاب رجمنٹ میں بطور ایجوکیشن جے سی او تھی۔ یونٹ میں جب پتہ چلا تو ایک جشن کا سماں تھا۔ مجھے یونٹ نے اپنی شاندار روایات کے مطابق بڑے شایان شان طریقے سے الوداع کیا۔ میں اپنے سنٹر کالج آف آرمی ایجوکیشن، اپر ٹوپہ مری ہلز گیا۔ اپنی سلیکشن کے ضروری کاغذات متعلقہ افسران کو دیئے اور یوں مجھے 25 جولائی 1995ء کو پاک فوج سے "رہا" کر دیا گیا۔ اس وقت فوج میں میری سروس پندرہ سال، تین ماہ اور پانچ دن تھی۔ یعنی پندرہ سال سے زیادہ۔ تو میں پاک آرمی سے پنشن کا حقدار ٹھہرا۔ یہی میرے اللہ کی مصلحت تھی جو مجھے ایک سال پہلے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیونکہ ایک سال پہلے اگر میں آرمی کو خیر باد کہتا تھا تو مجھے آرمی سروس کی پنشن نہیں ملنا تھی۔

میں نے 1994ء میں پی سی ایس مقابلے کا امتحان پاس کیا تو میرا میرٹ تھوڑا نیچے تھا اس لیے پنجاب پبلک سروس کمیشن نے مجھے اسسٹنٹ رجسٹرار (کوآپریٹو سوسائٹیز) تعینات کرنے کی سفارش کی اور حکومت پنجاب نے میری تعیناتی کر دی اور مجھے ایک خالی سیٹ پر اسسٹنٹ رجسٹرار (کوآپریٹو سوسائٹیز) تحصیل پاکپتن تعینات کر دیا۔ ساتھ ہی مجھے اور میرے ساتھ نئے تعینات ہونے والے افسران کو محکمانہ ٹریننگ کے لیے کوآپریٹو ٹریننگ کالج فیصل آباد بھیج دیا۔ ہم ٹریننگ تو فیصل آباد میں کر رہے تھے لیکن ہمیں تنخواہیں اپنی تعیناتی والی جگہ سے ملنا تھیں۔ کسی سرکاری ملازم کے تقرر کے بعد اسے اپنی پہلی تنخواہ جاری کروانے کے لیے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفس والے تنخواہ کے بلوں پر کیسے کیسے اعتراضات لگاتے ہیں، نو آموز ملازمین کو کتنے چکر لگواتے ہیں، ان کو کتنا ذلیل و خوار کرتے ہیں، ان اعتراضات کے پیچھے کیا محرکات ہوتے ہیں اور یہی بظاہر نہ حل ہونے والے اعتراضات ان کی مٹھی گرم کرنے کے بعد کتنی سرعت سے ختم ہوتے ہیں، یہ تو صرف وہی شخص جانتا ہے جو اس اذیت سے گزرا ہو۔ ہمارے ارباب بست و کشاد بھی اس سے بخوبی واقف ہیں لیکن اس کا مداوا کرنے کے لیے صرف زبانی جمع تفریق کی جاتی رہی ہے، عملی طور پر کبھی کچھ نہیں۔ اگرچہ باقی تمام محکمہ جات کے حالات بھی اس سے کچھ مختلف نہیں لیکن

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفس والوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ میں اپنی تنخواہ جاری کروانے کے لیے کالج سے چھٹی لے کر پاکپتن گیا۔ ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفس پاک پتن والوں نے مجھے دو دن تک اتنا تنگ اور خراب کیا کہ الامان والحفیظ۔ میں سول سروس میں نو وارد تھا، اس لیے بہت پریشان ہوا۔ اعتراضات پر اعتراضات۔ فلاں دستاویز لاؤ، فلاں لاؤ۔ وہ لے کر گیا تو کسی دیگر دستاویز کی ڈیمانڈ کر دی جاتی۔ چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ پریشانی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا، میں وہاں نزدیکی گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ دو دن پریشانی کے عالم میں گزار کر شام کو تھک ہار کر واپس چلا گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد خالق کائنات سے دعا کی: ''اے مالک کائنات! آپ نے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا اور ہر مشکل وقت میں میری مشکل کشائی فرمائی ہے، کیوں کہ آپ کے علاوہ کوئی مشکل کشا اور حاجت روا نہیں۔ آپ مسبب الاسباب ہو، اس مشکل وقت اور پریشانی میں بھی میری مدد فرما''۔ میں نے یہ دعا مانگی اور سو گیا۔

آپ یقین کریں کہ میرے دل سے خلوص نیت سے نکلی ہوئی میری دعا کو اللہ تعالیٰ کی ذات با برکات نے قبولیت بخشی۔ اگلے دن میں پریشانی کے عالم میں اکاؤنٹس آفس پہنچا۔ وہ میری چھٹی کا آخری دن تھا۔ اللہ کی طرف سے ایک معجزہ رونما ہوا۔ مجھے پریشان دیکھ کر اس دفتر کا ایک اہلکار خود بخود اللہ کے حکم سے میرے پاس آ گیا۔ وہ گزشتہ دو دنوں سے مجھے خوار ہوتا دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے میرا مسئلہ پوچھا۔ میں نے تفصیل بتائی تو کہنے لگا: ''بھائی! جب تک آپ پاکستانی طریقہ اختیار نہیں کریں گے، اعتراضات لگتے رہیں گے''۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔ میں نے اس سے کہا، ''بھائی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' اس نے طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا، بھائی قائداعظم کا فون کرواؤ۔ آپ کا کام فوراً ہو جائے گا''۔ میں نے استفسار کیا: ''کیا مطلب ہے، قائداعظم تو کب کے دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں۔ میں ان سے فون کیسے کرواؤں؟ ایسا کرنے کے لئے تو مجھے بھی ان کے پاس جانا پڑے گا لیکن فی الحال میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں۔ میں نے تو ابھی افسری دیکھی بھی نہیں''۔ وہ مسکرایا اور بولا، ''بھائی اللہ آپ کو سلامت رکھے، میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا''۔ پھر کہنے لگا، ''بھائی میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس دفتر کے ملازمین کی خدمت کئے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں؟ میں نے کہا، ''میرے پاس کوئی زیادہ پیسے تو نہیں۔ بس میرے اپنے خرچے کے لیے کافی ہوں گے''۔ اس کو اصل بات سمجھ آ گئی کہ پارٹی پیسے والی نہیں ہے۔ فوراً اللہ کی مہربانی سے وہ تو بڑا ہمدرد اور نیک دل انسان بن گیا۔ اس نے مجھے ایک دفتر میں بٹھا دیا اور مجھے انتظار کرنے کا کہہ کر کہیں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور کہا، ''اب آپ کا کام ہو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جائے گا۔ میں نے اس دفتر کے سب سے بڑے افسر سے بات کی ہے۔ان کو سب کچھ بتادیا ہے کہ دفتری اہلکاران دو دن سے کس طرح آپ کو پریشان کررہے ہیں؟'' وہ مجھے ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس افسر پاک پتن کے دفتر لے گیا۔ افسر موصوف بہت ملنسار، نیک دل اور فرض شناس انسان نظر آئے۔ مجھے بیٹھنے کا کہااور میرا مسئلہ پوچھا۔ میں نے اپنی فائل ان کے سامنے رکھ دی، انہوں نے فائل ملاحظہ کی۔ دفتر کی گھنٹی بجائی۔ اردلی آیا تو انہوں نے کسی دفتری اہلکار کو بلا کر لانے کا کہا، متعلقہ اہلکار آیا تو وہی اہلکار تھا جو دو دن سے مجھے ذلیل کررہا تھا۔

مجھے وہاں بیٹھا دیکھ کراس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔اس نے میری طرف التجا بھری نظروں سے دیکھا۔اتنی دیر میں ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس افسراس پر برسے اور انتہائی ناراضی سے کہا'' آپ لوگوں کو کیوں اتنا ذلیل کرتے ہو جب کہ فائل بھی مکمل ہوتی ہے، آپ کو خدا کا خوف کیوں نہیں آتا؟'' اور پھراس کو بڑی سختی سے حکم دیا:'' جاؤ اور فوری طور پر اس شریف آدمی کی پے سلپ بنا کر لاؤ''۔ وہ،''تعمیل حکم ہوتی ہے سر!'' کا کہہ کر چلا گیا اور تقریباً دس منٹ بعد واپس آیا۔اس کے ہاتھ میں ایک رجسٹر تھا۔ مجھے اس رجسٹر میں دستخط کرنے کا کہا۔ اس نے جہاں پر انگلی رکھی میں نے وہاں دستخط کر دیئے تو اس نے بڑے مہذب اور مؤدب طریقہ سے ایک کاغذ کا ٹکڑا مجھے تھما دیا جسے ''پے سلپ'' کہتے ہیں۔ میں نے اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا۔ پھر افسر موصوف کا بھی شکریہ ادا کر کے دفتر سے باہر نکلا اور اس دفتری اہلکار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:''اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے''۔

میں اکاؤنٹس آفس سے نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ انسان کیوں گمراہی کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے، کیوں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے؟ اپنے اللہ کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتا جب کہ اللہ رب العالمین نے قرآن کریم فرقان حمید میں فرما دیا ہے،''میں انسان کی شہ رگ سے بھی قریب ہوں'' اور ساتھ یہ بھی فرما دیا،''جب کوئی انسان مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی آواز سنتا ہوں اور اسے جواب بھی دیتا ہوں'' تو پھر ہمیں اللہ کی باتوں پر یقین کیوں نہیں آتا؟ اس لیے کہ ہمارے عقائد بہت کمزور ہیں۔ہم محض اس لیے مسلمان ہیں کہ ہم مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو گئے، والدین نے ہمارا نام مسلمانوں والا رکھ دیا اور بس۔اگر میرے جیسے گنہگار انسان کی دعا اللہ کے ہاں شرف قبولیت پا سکتی ہے تو باقی مسلمانوں کی کیوں نہیں؟ دراصل ہم نے مانگنے کے لیے اللہ کے علاوہ بھی کچھ اور در بھی بنا لئے ہیں اور ہماری دعائیں شائد یقین کامل اور خلوص نیت سے بھی خالی ہوتی ہیں۔ میں اسی دن واپس فیصل آباد چلا گیا اور اپنی ٹریننگ جائن کر لی۔تقریباً دو ماہ گزرے ہوں گے کہ مجھے سول سیکریٹریٹ لاہور سے خاکی لفافہ موصول ہوا۔لفافہ کھولا تو اسے پڑھ کر میری حیرت کی انتہا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نہ رہی کہ حکومت پنجاب نے مجھے بے سہارا سمجھ کر میرے گھر سے بہت ہی دور بطور مینیجر/ کوآپریٹو ایکسٹینشن آفیسر، پاک جرمن انسٹیٹیوٹ فار کوآپریٹو ایگری کلچر۔ چک نمبر 5 فیض، ضلع ملتان تعینات کر دیا تھا۔ کیونکہ میرے پاس اچھی اور گھر کے نزدیک پوسٹنگ کے لیے کوئی سیاسی یا بیورو کریٹک سفارش نہ تھی اور محکمہ کا کوئی بھی افسر مذکورہ ادارے میں کام کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میرے باقی تمام ساتھی افسران کو پہلے ہی ان کی خواہش کے مطابق پوسٹنگ دے دی گئی تھی جن میں سے میرے بہت سارے ساتھی افسران اس وقت سے لے کر آج تک لاہور میں اپنی مرضی کی پوسٹنگ پر کام کر رہے ہیں۔

اس وقت میری ٹریننگ کے ابھی چار ماہ باقی تھے۔ پاکپتن میں جس ذہنی اذیت سے میں دو چار ہوا تھا مجھے اس کا صدمہ ابھی تک نہ بھولا تھا۔ اب مجھے پھر سے پاکپتن جانا تھا اور چارج چھوڑنا تھا۔ اپنا آخری تنخواہ کا سرٹیفکیٹ لینا تھا اور پھر ملتان میں پہلے والا پراسیس نئے سرے سے ہونا تھا۔ لیکن محکمہ کے ارباب اختیار کو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ سروس میں ایک نو وارد افسر کے لیے اس کو تبدیل کرنے سے کتنے مسائل پیدا ہوں گے اور کس اذیت میں مبتلا ہوگا۔ انہوں نے تو سفارشی لوگوں کو ان کی من پسند پوسٹنگ دینا ہی اپنی زندگی کا نصب العین سمجھ رکھا تھا۔ حالانکہ صاحبان اختیار کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ افسران کی پوسٹنگ ٹرانسفر کے حوالے سے کوئی قابل عمل پالیسی بنائیں اور اس پر عمل درآمد کو یقینی بنائیں۔ بہر حال میں نے ہمیشہ کی طرح پوسٹنگ/ ٹرانسفر کے معاملات اللہ وحدہ لا شریک کے سپرد کر کے اپنی نئی تعیناتی کی جگہ پر جائن کر کے کام کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ واحد ذات ہے جو اپنے بندوں کے لیے بہترین فیصلے کرنے والی ہے۔

ٹریننگ ختم ہونے کے بعد میں چک نمبر 5۔ فیض، ملتان پہنچا اور چارج رپورٹ بھری۔ پراجیکٹ ڈائریکٹر صاحب کے دفتر گیا، وہ دفتر میں موجود نہ تھے۔ پتہ چلا کہ موصوف ہفتہ میں ایک یا دو دن کے لیے دفتر تشریف لاتے ہیں۔ میں انسٹیٹیوٹ کے ریسٹ ہاؤس میں شفٹ ہو گیا۔ دو دن بعد پراجیکٹ ڈائریکٹر صاحب تشریف لائے اور میری طلبی ہوئی۔ کافی لمبے انٹرویو کے بعد میری جائننگ ہوئی۔ انہوں نے کہا، ''اگرچہ آپ ناتجربہ کار افسر ہیں، لیکن یہاں آپ کے علاوہ کوئی اور انتظامی افسر نہیں ہے اس لیے ادارہ آپ نے ہی چلانا ہے۔ میں بیمار آدمی ہوں۔ ملتان سے آنا ہوتا ہے، کبھی کبھی میں بھی دفتر آ جایا کروں گا۔ ضروری ڈاک میرے گھر ملتان میں بھجوا دیا کرنا۔ دیکھنا! دھیان سے کام کرنا۔ کوئی شکایت نہ آئے''۔ میں نے کہا، ''سر! آپ فکر نہ کریں۔ میں ان شاءاللہ آپ کی توقعات سے بڑھ کر کام کروں گا'' میں ناتجربہ کار تھا۔ نیا نیا افسر بنا تھا، کوئی گائیڈ کرنے والا بھی نہ تھا، پراجیکٹ ڈائریکٹر صاحب بھی تقریباً غیر حاضر افسر تھے لیکن سہولیات سے بھی زیادہ فوائد

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

حاصل کر رہے تھے۔ میں نے حوصلہ نہ ہارا اور اللہ کا نام لے کر ایک ''قریب المرگ'' ادارے میں کام شروع کر دیا اور اس ادارے کو از سرِ نو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اللہ کی مہربانی سے اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ میں نے ادارے کے تمام ہڈحرام، کام چور اور بغیر کام کئے تنخواہ وصول کرنے والے ملازمین کی حاضری کو یقینی بنا کر ان کو کام پر لگا دیا۔ کیونکہ ان میں سے اکثر ملازمین صرف اپنی تنخواہ کی وصولی کے لیے مہینہ میں ایک دن ادارے میں رونق افروز ہو کر انسٹیٹیوٹ کی رونق دوبالا کرتے تھے۔ اس وقت جن لوگوں نے میرے ساتھ کام کیا وہ اس حقیقت کے عینی شاہد ہیں۔

وہاں مجھے صرف چند ایک ایسے افسر ملے جو ذہین، محنتی اور ایمانداری سے کام کرنے والے تھے، ان میں سے ایک زبیر وحید صاحب بھی تھے جو اس وقت وہاں پر زراعت افسر تھے۔ وہ اب ایک پی ایم ایس (پی ایس ایس) آفیسر (ایڈیشنل سیکرٹری) ہیں۔ ہم دونوں نے مل کر پی سی ایس امتحان کی تیاری کی، امتحان دیا اور مالک کائنات کی مہربانی سے کامیابی حاصل کی۔ میری تعیناتی بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ درجہ اول) اور ان کی تعیناتی پنجاب سول سیکرٹریٹ میں بطور سیکشن افسر ہوئی۔ افسر موصوف میرے کہنے، ترغیب دینے اور حوصلہ افزائی کرنے پر ہی مذکورہ امتحان دینے کے لئے تیار ہوئے اور کامیاب ہوئے۔ اب ان کا ایک بیٹا جس کا نام بلال زبیر ہے، بھی ایک پی ایم ایس افسر ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ 1994ء کے پی سی ایس مقابلے کے امتحان میں میرٹ کم ہونے کی وجہ سے میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ درجہ اول) نہ بن سکا بلکہ میری تعیناتی بطور اسسٹنٹ رجسٹرار (کوآپریٹو سوسائٹیز) ہوئی۔ محکمہ کوآپریٹوز (امداد باہمی) پنجاب جائن کیا اور ٹریننگ کے لیے فیصل آباد چلا گیا اور ٹریننگ ختم ہونے پر میں نے اپنی جائے تعیناتی پر کارسرکار سر انجام دینے شروع کر دیئے۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور پھر سے مقابلہ کا امتحان دینے کا فیصلہ کیا اور دوبارہ سے تیاری شروع کر دی۔ پی سی ایس 1995ء کا مقابلے کا امتحان بوجہ ٹریننگ نہ دے سکا اور پی سی ایس (ایگزیکٹو) 1996ء کا امتحان دوبارہ کے لیے تیاری شروع کر دی۔ 1996ء ہی میں مجھے ''جوڈیشل افسر پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن'' تعینات کر دیا گیا۔ اسی دوران 1996ء کے پی سی ایس امتحانات کی تیاری بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ میرے پاس اپنا تبادلہ کروانے کے لئے کوئی سیاسی یا بیوروکریٹک سفارش نہیں تھی لیکن جب اللہ تعالے نے کسی انسان سے کوئی کام لینا ہوتا ہے تو وہ اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں ایک دن اپنے دفتر میں کارسرکار میں مصروف تھا کہ محترم اسد شاہ کھگہ، جو اس وقت انسٹیٹیوٹ کے پراجیکٹ ڈائریکٹر تھے، کا اردلی میرے پاس آیا اور بتایا کہ مجھے پراجیکٹ ڈائریکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔ میں ان کے دفتر گیا تو انہوں نے میرے بیٹھتے ہی فوراً سوال کیا۔ ''آپ کا سفارشی کون ہے؟'' میں نے کہا، ''سر، اللہ کے علاوہ میرا تو کوئی سفارشی نہیں''۔ ان کو میری بات پر یقین نہ آیا۔ دوبارہ پوچھا، ''آپ سفارشی کا نام کیوں چھپا رہے ہیں؟'' میں نے کہا، ''سر اگر میری کوئی سفارش ہوتی تو میں آپ کو ضرور بتاتا''۔ پھر میں نے پوچھا، ''سر آخر ہوا کیا ہے جو آپ بار بار مجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں؟'' میں اندر ہی اندر سے ڈر بھی رہا تھا اور پریشان بھی تھا کہ کوئی ''کٹا'' ہی نہ کھل جائے کیونکہ مذکورہ افسر بہت سخت مزاج واقع ہوئے تھے اور شنید یہ تھی کہ وہ اکثر سرکاری ملازمین کو بلا کر بہت زیادہ بے عزت کیا کرتے تھے۔ ہفتہ میں ایک آدھ دن دفتر تشریف لاتے تھے لیکن وہ دن سرکاری ملازمین کے لیے بہت بھاری ہوتا تھا ماسوائے ادارے کے اکاؤنٹنٹ کے۔ وہ ملازمین کو بے عزت کرنے کا پورے ہفتے کا کوٹہ ایک ہی دن میں پورا کر جاتے تھے لیکن میرے ساتھ ان کا رویہ قدرے بہتر تھا۔ پوچھنے لگے، ''آپ نے یہاں سے اپنا تبادلہ کیوں کروایا ہے؟ یہاں آپ کو کوئی مسئلہ تھا تو آپ مجھے بتاتے۔ آپ نے آتے ہی ادارے میں ایک جان سی ڈال دی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ یہاں سے جائیں۔ لیکن......''۔ میں نے کہا سر، ''لیکن کیا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی''۔ اس پر فرمانے لگے: ''جناب رجسٹرار کوآپریٹوز پنجاب کا فون آیا ہے۔ انہوں نے آپ کا تبادلہ ''پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن'' لاہور میں بطور جوڈیشل آفیسر کر دیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کل صبح لاہور جا کر جناب رجسٹرار صاحب کو ملیں اور اپنی نئی ڈیوٹی جائن کریں''۔ انہوں نے مجھے مزید کہا: ''آپ ابھی چارج چھوڑیں اور کل صبح لاہور جا کر رجسٹرار صاحب کے دفتر رپورٹ کریں''۔

ایک وضاحت کرتا چلوں کہ ان دنوں یہ سیٹ محکمہ کے تمام افسران کی من پسند تھی، محکمہ کا تقریباً ہر افسر یہی چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طریقہ سے اس کو یہ سیٹ مل جائے۔ کیونکہ اس وقت پورے صوبہ پنجاب میں صرف ایک ہی جوڈیشل افسر برائے پنجاب لیکوڈیشن بورڈ تعینات ہوتا تھا جس کے پاس لامحدود اختیارات ہوتے تھے۔ ان اختیارات کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جوڈیشل افسر کے فیصلے کے خلاف اپیل کی سماعت کا اختیار صرف اور صرف کوآپریٹو جج، لاہور ہائیکورٹ کو تھا۔

جب میں نے پراجیکٹ ڈائریکٹر صاحب سے آرڈرز کی کاپی مانگی تو کہنے لگے، ''آرڈرز تو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ابھی تک نہیں پہنچے لیکن آپ چارج رپورٹ پر آرڈر نمبر کی جگہ خالی چھوڑ دیں۔ چارج رپورٹ پر دستخط کریں، ہم آرڈرز کا نمبر بعد میں لکھ لیں گے۔ آپ فوری طور پر لاہور کے لیے نکل جائیں اور دیکھنا سستی نہ کرنا۔ کل علی الصبح رجسٹرار صاحب کو جا کر رپورٹ کرنا، میری نوکری کا معاملہ ہے"۔ میں نے کہا سر، "آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی"۔ میں اسی دن بجکم پراجیکٹ ڈائریکٹر، وہاں سے لاہور روانہ ہو گیا۔ رجسٹرار کوآپریٹوز پنجاب کا دفتر ان دنوں بینک سکوائرز د نیلا گنبد لاہور میں تھا۔ اگلے دن میں ٹھیک آٹھ بجے وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت جناب نجیب اللہ ملک جو کہ ایک ڈی ایم جی (اب پی اے ایس) افسر تھے بطور رجسٹرار کوآپریٹوز پنجاب کام کر رہے تھے اور جناب محمد الیاس مفتی ان کے دفتر میں بطور اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمن) اپنے فرائض منصبی سرانجام دے رہے تھے۔ محترم مفتی محمد الیاس صاحب بڑے وضعدار، تحمل مزاج، نیک دل، ایماندار اور اپنے کام کے ماہر افسر تھے۔ میں جا کر انہیں ملا اور اپنے تبادلہ کا بتایا۔ انہوں نے مجھے بتایا، "آپ کی نئی پوسٹنگ میرے کہنے پر ہی ہوئی ہے"۔ میں نے ان سے کہا، "سر! آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"۔

کہنے لگے: "میری آپ سے صرف دو ملاقاتیں ہوئی ہیں: ایک جب میں اپنی تعیناتی کے وقت آپ کے پاس جائننگ دینے آیا تھا۔ دوسرا جب میں آپ سے اپنی جائننگ رپورٹ کی کاپی لینے آیا تھا"۔ فرمانے لگے، "میرے بھائی ہم ہیڈ آفس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہماری نظر ہر افسر پر ہوتی ہے۔ ہمیں پتہ ہوتا ہے کون سا افسر فیلڈ میں کیا کر رہا ہے؟" میں نے کہا: "سر! میں تو چند ماہ پہلے ہی اپنی ابتدائی ٹریننگ سے فارغ ہوا ہوں۔ ابھی تو اس محکمہ میں، میں نے کام کی ابتدا ہی کی ہے۔ مجھے محکمانہ کام کا کوئی تجربہ بھی نہیں۔ میں اتنی بڑی سیٹ پر کام کیسے کروں گا؟ میری نوکری کی تو ابھی شروعات ہیں"۔ مفتی صاحب کہنے لگے، "مجھے قوی امید ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے اس سیٹ پر کامیابی سے کام کریں گے"۔ میں نے ان سے پوچھا، "سر! میری یہاں پوسٹنگ اتنی اچانک کیسے ہوئی؟" تو کہنے لگے: "یہاں پر ہم نے ایک افسر کو کسی سیاستدان کی سفارش پر لگایا ہوا تھا، وہ کافی دیر سے یہاں کام کر رہے تھے۔ ان کی کافی شکایات آتی رہتی تھیں، لیکن ان کی سفارش اتنی تگڑی تھی کہ ہم بے بس تھے۔ کل اچانک جناب سیکرٹری کوآپریٹوز کا فون آیا۔ انہوں نے رجسٹرار صاحب کو حکم دیا کہ افسر موصوف سے آج ہی جوڈیشل افسر کا چارج چھڑوایا جائے اور اس کی جگہ پر کوئی کام کرنے والا ایماندار افسر فوری تعینات کیا جائے"۔ مزید کہا کہ، "فوری طور پر کسی کام کرنے والے دیانتدار افسر کا نام بتاؤ تا کہ جناب سیکرٹری صاحب کے حکم کی تعمیل ہو سکے تو میں نے فوری طور پر آپ کا نام لے دیا۔ رجسٹرار صاحب نے پوچھا کہ اس افسر کی سروس کتنی ہے؟ تو میں نے بتایا کہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

تقریباً نو دس ماہ۔ کہنے لگے کہ کیا وہ اتنی بڑی اور اہم سیٹ پر کام کر لے گا؟ میں نے انہیں یقین دلایا کہ سر! مجھے قوی یقین ہے کہ یہ افسر بڑے ہی احسن طریقہ سے اور دیانتداری سے اپنے فرائض منصبی ادا کرے گا اور ہمیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ تو رجسٹرار صاحب نے تبادلہ وتعیناتی کے آرڈرز جاری کرنے کا حکم صادر فرمادیا''۔

مجھے محترم الیاس مفتی صاحب ساتھ لے کر جناب رجسٹرار کوآپریٹوز پنجاب کے پاس لے گئے اور میرا تعارف کروایا۔ جناب رجسٹرار نے میرا مختصر انٹرویو لیا اور فرمانے لگے: ''اس سیٹ پر پہلے کام کرنے والے افسر کی مختلف شعبوں سے شکایات موصول ہو رہی تھیں اس لیے ان کو تبدیل کر دیا گیا۔ اگرچہ آپ کی سروس اور تجربہ نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن الیاس مفتی صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی ہے اور ساتھ یہ یقین دہانی بھی کروائی ہے کہ آپ اس دفتر وعدالت کو صحیح طرح سے چلالیں گے تو ہم نے آپ کو یہاں تعینات کر دیا ہے۔ اس لیے آپ کو ہماری توقعات پر پورا اترنا ہو گا تاکہ ہم سیکرٹری کوآپریٹوز کے سامنے سرخرو ہو سکیں''۔ میں نے کہا: ''سر! بلاشبہ یہ میری سروس کا آغاز ہے۔ مجھے تجربہ بھی کوئی نہیں ہے لیکن سر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے دن رات ایک کر کے کام سیکھوں گا اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ اور انشاءاللہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا اور آپ کے اعتماد پر پورا اتروں گا''۔ یہ سن کر رجسٹرار نے اپنی نیک خواہشات کے اظہار کے ساتھ بطور جوڈیشل افسر ڈی پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن کام کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے اسی دن لیکوڈیشن بورڈ میں جائن کیا اور اپنے سٹاف کی میٹنگ کال کی۔

ان سے سابقہ افسر کے تبادلے کی وجہ پوچھی۔ تو جو کچھ انہوں نے بتایا وہ ایک مقدس امانت ہے اس کی تفصیل یہاں نہیں بتائی جا سکتی۔ میں نے عدالت میں زیر التوا مقدمات کی تفصیل پوچھی۔ یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ عدالت میں زیر التوا مقدمات کی تعداد ہزاروں میں تھی اور پچھلے تین سالوں میں نمٹائے گئے مقدمات صرف چند سو ہی تھے۔ میں نے عملے سے پوچھا کہ افسر موصوف کتنا وقت عدالت کو دیتے تھے۔ پتہ چلا کہ موصوف کا عدالت میں آنے اور جانے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ ان کی دیگر مصروفیات بھی کافی تھیں۔ عدالت کو بہت کم وقت دیتے، عدالت کی کوئی کازلسٹ نہیں بنتی تھی۔ جو لوگ عدالت میں حاضر ہو جاتے ان کی فائلوں پر احکامات لکھ دیے جاتے۔ باقی فائلیں سرد خانے کی نذر ہو جاتیں۔ صرف مخصوص فائلوں ہی پر عدالتی کارروائی ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ عدالت میں نہ تو مقدمات کا رجسٹر مکمل تھا اور نہ سٹور میں پڑی ہوئی فائلوں کو مقدمات

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نمبر لگے ہوئے تھے۔

قارئین کو بتاتا چلوں خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی سروس کے دوران جس دفتر میں بھی جا کر چارج سنبھالا ماسوائے چند مستثنیات کے، دفاتر کی حالت کم وبیش وہی تھی جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ کیونکہ ہمارے پیارے ملک میں شاید لوگ سرکاری ملازمت حاصل ہی اس لیے کرتے ہیں کہ کام نہ کرنا پڑے۔ تن آسانی، ہڈحرامی، سستی، کاہلی، بددیانتی، بے ایمانی اور صرف اس فائل کو ہاتھ لگانا جس سے ذاتی مفاد وابستہ ہو، ہمارے ملازمین کا وطیرہ بن چکا ہے۔ یہاں فائلوں کو سالہا سال تک نہ نمٹانے والے افسران ایمانداری اور دیانتداری کا لبادہ پہن کر اس کا ڈھنڈورہ بھی پیٹتے ہیں اور سائلین کو برسہا برس ذلیل وخوار بھی کرتے ہیں اور ایسے افسران اس بات پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ پیسے نہیں لیتے اور ایماندار ہیں۔ ایسے نام نہاد ایماندار نہ تو سرکار کا کوئی کام کرتے اور نہ ہی عوام الناس کو کوئی ریلیف فراہم کرتے ہیں اور سرکاری سہولیات پوری کی پوری بلکہ اس سے بھی زیادہ حاصل کرتے ہیں۔ خصوصی طور پر سرکار کی طرف سے دیئے گئے بجٹ پر ان کی خاص نظر ہوتی ہے۔ عام طور پر ایسے لوگ سرکاری وسائل کے استعمال میں انتہا درجے کے بددیانت ہوتے ہیں۔ ایسی نام نہاد ایمانداری اور دیانتداری کا کیا فائدہ کہ لوگوں کو اپنے جائز اور قانونی کاموں کے لئے سالہا سال تک دفاتر/ عدالتوں کے چکر لگانے پڑیں۔ کسی کا جائز کام بھی نہ ہو سکے اور سائلین حق پر ہونے کے باوجود ذہنی اذیت اور کوفت میں مبتلا ہوں اور دفاتر/ عدالتوں میں دھکے کھاتے کھاتے اپنے ارمانوں، خواہشوں اور حسرتوں سمیت اس دارفانی ہی سے کوچ کر جائیں۔ پھر ان کی آنیوالی نسلیں بھی اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لیئے از سر نو عدالتوں/ دفاتر کا طواف شروع کر دیں۔ میں نے اپنے سٹاف سے کہا کہ بھائی جس نے کام کرنا ہے وہ یہاں رہے، جس نے کام نہیں کرنا وہ اپنا تبادلہ یہاں سے کروا لے۔ میرے ہوتے ہوئے دفتر آنے کا ٹائم ہوگا جانے کا کوئی ٹائم نہیں ہوگا۔ اب یہاں صرف اور صرف کام کرنا ہوگا۔ اگر کوئی یہاں کام نہیں کر سکتا اور اپنا تبادلہ بھی نہیں کروا سکتا وہ مجھے بتا دے، میں اس معاملہ میں اس کی مدد کر دوں گا۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا، ”سر! ہم آپ کے زیر سایہ ہی کام کریں گے۔ آپ جتنا کام کہیں گے، ہم کریں گے“۔ ماتحتوں کے اس طرح کے جذبات جان کر مجھے خوشگوار حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔

میں نے انہیں کہا کہ کل صبح ٹھیک آٹھ بجے آپ سب لوگ دفتر میں موجود ہوں۔ اگلے دن تمام ملازمین بروقت دفتر پہنچ گئے اور میں بھی وقت مقررہ پر دفتر پہنچ گیا۔ تمام ملازمین کو حکم دیا کہ سب سے پہلے عدالت میں موجود تمام فائلوں کو دو دن کے اندر اندر رجسٹر میں درج کریں اور ان کو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نمبر الاٹ کریں۔ ریڈر سے کہا کہ مجھے متعلقہ قوانین کی ایک کاپی اور چند ایسی فائلیں لاکر دے جن پر فیصلے ہو چکے تھے، اس نے حکم کی تعمیل کی۔ یقین جانئے میں نے دو دنوں کے اندر اندر تمام متعلقہ قوانین اور سابقہ فیصلہ جات پڑھ لیئے۔ تیسرے ہی دن ایک سو کے قریب مسئول علیہان کو نوٹس برائے سماعت جاری کر دیئے۔

یہاں پر قارئین کے علم میں اضافے کے لیے بتاتا چلوں کہ ''پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن'' کیا ہے؟۔ اس کی تشکیل کے کیا اغراض و مقاصد تھے؟ اس کے اختیارات اور فرائض کیا ہیں؟ یہ ایک بہت ہی المناک داستان ہے۔ یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ ہماری حکومتیں صرف وہ کام کرتی ہیں جن کی وجہ سے ان کا ووٹ بینک بڑھے یا انہیں مالی فوائد حاصل ہوں۔ آج تک کسی بھی حکومت نے عوامی اور قومی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی پالیسی نہیں بنائی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اقوام عالم میں صرف ان اقوام نے سرعت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کیں جنہوں نے پالیسی سازی کے وقت اجتماعی عوامی مفاد کو مدنظر رکھا اور اجتماعیت کو انفرادیت پر ترجیح دی۔ لیکن ہمارے ملک میں اس کے معرض وجود میں آنے سے لے کر آج تک تقریباً جتنی بھی پالیسیاں بنائی گئیں ان کے درپردہ قومی کی بجائے گروہی یا ذاتی مفاد کارفرما تھا۔ یہاں جتنے بھی مالی سکینڈل آئے ان کا ''گھرا'' حکومت کی طرف ہی جاتا ہے۔ بالآخر نقصان عوام ہی کا ہوتا ہے۔ باقی سکینڈلز اپنی جگہ لیکن ایک مالی اسکینڈل 1970ء کی دہائی میں آیا جس میں ملک عظیم میں سینکڑوں کی تعداد میں مالیاتی ادارے کھلے جنہوں نے غیر قانونی طور پر بینکنگ کا کام شروع کیا۔ لوگوں سے سرمایہ کاری کے نام پر اور بھاری منافع اور سود دینے کا وعدہ کر کے ان کا مال لوٹا گیا۔ حکومت نے ان اداروں سے لوٹا ہوا مال عوام کو واپس دلانے کا وعدہ کیا لیکن عوام کو ذلت کے سوا کچھ نہ ملا۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ حکومت ایسے اداروں کو غیر قانونی کام کرنے کا موقع ہی کیوں دیتی ہے؟ جب ایسے ادارے عوام کو لوٹ رہے ہوتے ہیں اس وقت حکومتیں اپنی آنکھیں کیوں موند لیتی ہیں؟ اس کا جواب ہے۔ نااہلی، بدنیتی، بددیانتی اور ذاتی مفادات۔

اسی طرح کا ایک ہوش ربا سکینڈل 80ء کی دہائی میں ''کوآپریٹو اسکینڈل'' کے نام سے سامنے آیا۔ حکومت کے من پسند لوگوں نے کل 102 کوآپریٹو فنانس کارپوریشنز لمیٹڈ ''محکمہ کوآپریٹوز پنجاب'' سے رجسٹر کروائیں اور کوآپریٹوز (محکمہ امداد باہمی) کی روح کے خلاف غیر قانونی طور پر بینکنگ کا کام شروع کر دیا اور 5 نومبر 1991ء تک حکومت پنجاب اور محکمہ کوآپریٹوز کی ملی بھگت سے سادہ لوح عوام سے ''شیئرز'' کے نام پر اور بھاری سود/منافع کا لالچ دے کر رقم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لوٹتی رہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اپنے من پسند افراد اور سیاستدانوں کو نا قابل واپسی قرضے بھی دیے جاتے رہے۔پھر جب ان اداروں نے ان طاقتور سیاستدانوں کو مزید قرض دینے سے انکار کیا تو حکومتی ایوانوں میں بیٹھے عوامی نمائندگان کی رگ حمیت وانصاف پھڑکی اور یہ ادارے راتوں رات غیر قانونی قرار دے کر بند کر دیئے گئے۔ایک رپورٹ کے مطابق اُس وقت کے وزیراعظم اور وزیر داخلہ پاکستان سمیت بہت سی دیگر اہم شخصیات بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے والوں میں شامل تھیں۔علاوہ ازیں ایک سوسائٹی کے مالک نے ایک بہت بڑے سیاسی گھرانے کے خلاف عام انتخابات میں الیکشن لڑنے کی جسارت بھی کر ڈالی جس کی پاداش میں اس کو اتنا ذلیل وخوار کیا گیا کہ بالآخر اسے موت کی وادی کی طرف دھکیل دیا گیا۔اس کے علاوہ اس کے نا قابل معافی جرم (کسی بڑے سیاسی خاندان کے خلاف الیکشن لڑنا) کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی سزا بھگتنا پڑی۔باقی تمام اداروں کے ساتھ ساتھ بہت سارے ایسے ادارے بھی بند کر دیئے گئے جو مالی طور پر انتہائی مستحکم تھے۔اس مالیاتی سکینڈل میں ایک رپورٹ کے مطابق کل 70 لاکھ خاندان اپنی جمع پونجی سے محروم ہوئے اور لوگوں کے تقریباً سترہ ارب روپے ڈوب گئے۔چالیس سال گزرنے کے بعد بھی آج تک لوگ اپنے کلیمز حاصل کرنے کے لیئے دھکے کھا رہے ہیں اور''پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن''ابھی تک قائم ودائم ہے۔

ان اداروں کو ایک نوٹیفیکیشن کے تحت مورخہ 6 نومبر 1991ء کو بند کیا گیا اور مورخہ 27 فروری، 1993ء کو حکومت نے کمال مہربانی فرماتے ہوئے''دی پنجاب ناپسندیدہ کوآپریٹو سوسائٹیز (تنسیخی) ایکٹ، 1993''جاری کر دیا۔اس ایکٹ کی رو سے ایک ادارہ''دی پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن''تشکیل دیا گیا جس کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ منسوخ کیئے گئے تمام اداروں کی ذمہ داریوں اور اثاثہ جات کا تعین کردے اور متاثرین کو ان کی جمع شدہ رقوم واپس کرے۔اس بورڈ میں جوڈیشل افسر کی اسامیاں منظور کی گئیں اور ان افسران کو بورڈ نے یہ اختیارات تفویض کیئے کہ ایک تو وہ ان بند کی گئی سوسائٹیز کے اثاثہ جات اور ذمہ داریوں کا تعین کریں، ان کے ڈائریکٹرز کے خلاف بھی علیحدہ علیحدہ ذمہ داریوں کا تعین کیا جائے۔علاوہ ازیں ان اداروں سے قرض لینے والوں کو طلب کر کے مقدمات کی سماعت کی جائے اور فریقین کی سماعت کر کے مقروضان کے ذمہ واجب الادا قرضوں کا تعین کریں اور ان کے خلاف ڈگریاں بھی جاری کریں۔

''دی پنجاب کوآپریٹو بورڈ برائے لیکوڈیشن''میں بطور جوڈیشل افسر تعیناتی کے دوران بہت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے ایسے واقعات پیش آئے جس میں لوگوں نے مجھے دعائیں دی ہوں گی لیکن دو ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے دعاؤں کی قبولیت پر میرا یقین جو پہلے ہی بہت مضبوط تھا وہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ میں ایک دن عدالت میں بیٹھا مقدمات کی سماعت کر رہا تھا۔ وہ دن ایسے مقدمات کے لیے مخصوص تھا جو ناپسندیدہ قرار دی گئی سوسائٹیز کے مالکان/ ڈائریکٹران کے اثاثہ جات اور ذمہ داریوں کے تعین کے لئے لیکوڈیشن بورڈ نے میری عدالت میں دائر کر رکھے تھے۔ عدالت میں آواز دلائی گئی۔ لیکوڈیشن بورڈ کا نمائندہ پہلے سے عدالت میں موجود تھا۔ صرف ایک ملزم/مسئول علیہ حاضر ہوا۔ بھاری بھرکم جسم کا پچاس پچپن کے پیٹے کا تقریباً چھ فٹ قد کا شخص عدالت میں پیش ہوا۔ میں نے نام پوچھا۔ اس نے نام بتایا اور ساتھ ہی کہنے لگا، ''سر مجھے آپ کے قیمتی وقت سے صرف دو منٹ کا وقت چاہیے۔ مجھے آپ کو حقائق بتانے ہیں''۔ میں نے کہا، ''بھائی مجھے یہاں ریاست نے بٹھایا ہی اس لیے ہے کہ میں آپ لوگوں کی باتیں سنوں۔ تمام فریقین کو سن کر کوئی فیصلہ کروں۔ آپ بات کریں''۔ اس نے اپنی درد بھری کہانی ان الفاظ میں سنائی۔

کہنے لگا: ''سر! میں ضلع جہلم کا رہنے والا ہوں۔ سابقہ فوجی ہوں۔ میں نائیک کے رینک سے پاک فوج سے ریٹائر ہوا ہوں۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ایک فوجی اپنی جوانی ہی میں ریٹائر ہو جاتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اسے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے کوئی روزگار تلاش کرنا ہوتا ہے۔ میں بھی نئے روزگار کی تلاش میں تھا تو میری کوآپریٹو سوسائٹی کے برانچ منیجر سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے کہا کہ آپ سوسائٹی کے برانچ کے اکاؤنٹ میں کچھ رقم ڈیپازٹ کروائیں اور اپنے عزیز رشتہ داروں کے اکاؤنٹس برانچ میں کھلوائیں آپ کو ہم یہاں پر سیکورٹی انچارج کی نوکری دے دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی جمع پونجی برانچ میں جمع کروا دی اور اپنے کچھ رشتہ داروں کو بھی ترغیب دی کہ وہ بھی اپنے پیسے اس برانچ میں جمع کروا دیں تا کہ مجھے نوکری مل سکے۔ مجھے نوکری مل گئی۔ میں نے تقریباً چھ ماہ وہاں نوکری کی۔ صرف چار ماہ کی تنخواہ ملی۔ آخری دو ماہ کی نہ ملی اور ادارے راتوں رات بند کر دیئے گئے۔ میری جمع پونجی بھی گئی ور میرے رشتہ داروں کی بھی۔ اوپر سے میرے ساتھ یہ ظلم کیا گیا کہ میں گزشتہ ڈیڑھ سال سے اس عدالت میں پیشیاں بھگت رہا ہوں۔ مجھے یہاں آ کر یہ پتہ چلا ہے کہ میرا نام سوسائٹی کے ڈائریکٹران کی فہرست میں شامل ہے''۔ یہ کہتے کہتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

میں نے اسے تسلی دی کہ وہ اپنی بات مکمل کرے۔ اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔ وہ ذرا سنبھلا اور بولا: ''سر! آپ مقدمہ کی مثل ملاحظہ فرما کر دیکھیں کہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے اس مقدمہ میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرے علاوہ کوئی اور شخص/ ڈائریکٹر حاضر عدالت نہیں ہو رہا ہے۔ میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ مجھے سکیورٹی انچارج کی نوکری دی گئی تھی۔ مجھے تنخواہ بھی اسی عہدے کی ملتی رہی۔ ریکارڈ آپ کے سامنے ہے۔ جو اصل مالکان ہیں وہ ایک دن بھی آپ کی عدالت میں پیش نہیں ہوئے۔ ان کو ذرہ برابر پروانہیں۔ میں لاہور آنے کے لیے کرایہ بھی کسی سے مانگ کر آتا ہوں۔ میرے حال پر رحم فرمائیں۔ اگر میرے بطور ڈائریکٹر کسی بھی دستاویز پر کوئی ایک بھی دستخط ریکارڈ میں موجود ہوں تو آپ سوسائٹی کی ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال دیں میں قبول کرلوں گا۔ آپ سے پہلے والے افسر صاحب سے میں نے بہت دفعہ بات کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کبھی میری بات نہیں سنی۔ ہر دفعہ میری حاضری لگا کر اگلی تاریخ پیشی دے دی جاتی۔ میں بہت مجبور ہوں۔ آپ میری مدد فرمائیں۔ میرا اللہ کے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے۔ مجھے صرف اور صرف انصاف چاہیے۔ میں بے گناہ ہوں اور غریب بھی۔ جو گناہ گار ہیں اور امیر ہیں وہ تو گزشتہ ڈیڑھ سال سے عدالت کے بلانے کے باوجود بھی پیش نہیں ہو رہے"۔

وہ خاموش ہو گیا تو میں نے لیکوڈیشن بورڈ کے نمائندہ سے پوچھا، "آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟ آپ کا ریکارڈ کیا کہتا ہے؟"۔ اس نے اپنی فائل کھولی اور مجھے ڈائریکٹران کی فہرست دکھائی جس میں مذکورہ مسئول علیہ کا نام موجود تھا"۔ میں نے کہا، "آپ مجھے سوسائٹی کی کسی ایسی میٹنگ کی روداد (منٹس آف میٹنگ) دکھائیں جس میں یہ شخص بحیثیت ڈائریکٹر شامل ہوا ہو اور اس نے دستخط بھی کیے ہوں"۔ نمائندہ بورڈ نے کہا کہ اسے کچھ وقت دیا جائے تا کہ وہ ریکارڈ ڈھونڈ کر عدالت میں پیش کر سکے۔ مسئول علیہ کا بیان لکھ لیا گیا اور حسب استدعا نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ کیس کی سماعت آئندہ تاریخ پیشی تک ملتوی کر دی گئی۔ اور نمائندہ بورڈ کو سختی سی ہدایت کی گئی کہ وہ آئندہ تاریخ پیشی پر مکمل تیاری کے ساتھ آئے اور متعلقہ مکمل ریکارڈ بھی عدالت میں پیش کرے۔

اگلی تاریخ پیشی پر آواز دلائی گئی۔ مسئول علیہ حاضر عدالت ہوا۔ نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ نے حاضر عدالت ہو کر مزید وقت مانگا کہ ریکارڈ نہیں مل رہا، مصروفیت بھی بہت زیادہ ہے۔ میں نے اسے کہا، "مقدمہ گذشتہ ڈیڑھ سال سے چل رہا ہے۔ آپ ڈیڑھ سال میں ریکارڈ نہیں ڈھونڈ سکے۔ اگر آپ کے پاس ریکارڈ نہیں تھا تو آپ نے یہ مقدمہ عدالت میں کیوں دائر کیا؟ آپ کو آخری موقع دیا جاتا ہے کہ اگر آپ کے پاس اپنے دعوی کو ثابت کرنے کے لیئے کوئی ثبوت ہیں تو پیش کیے جائیں ورنہ عدالت انصاف کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دے گی"۔ لہٰذا حسب استدعا نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ کو ایک اور التوا دے دیا گیا۔ میں نے اپنے ریڈر کو حکم دیا کہ اگلی تاریخ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پیشی سے ایک دن قبل زیر بحث عدالتی فائل میری گاڑی میں رکھوادے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے رات کو پوری فائل کا تسلی سے معائنہ اور ملاحظہ کیا۔ یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مسؤل علیہ کو اگر سوسائٹی کا ڈائریکٹر مان لیا جائے تو اس کی ذاتی ذمہ داری کروڑوں روپے بنتی تھی۔ مزید یہ کہ فائل میں اس کی تعیناتی کے جو احکامات لف تھے وہ سکیورٹی گارڈ کے تھے۔ اس کا نام ابتدائی طور پر ڈائریکٹران کی فہرست میں کہیں بھی موجود نہیں تھا، لیکن سوسائٹی بند ہونے سے دو ماہ قبل اس کا نام ڈائریکٹران کی فہرست میں شامل کر دیا گیا تھا، مزید برآں عدالتی فائل میں کسی بھی جگہ پر مجھے بحیثیت ڈائریکٹر اس کے دستخط نظر نہ آئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سوسائٹی نے آخری مہینے میں ڈائریکٹران کی فہرست میں ردو بدل کیوں کیا؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کوآپریٹو سوسائٹی ایکٹ اور رولز کے مطابق محکمہ کوآپریٹوز نے تمام سوسائٹیز کی وقفوں وقفوں سے تمام رجسٹرڈ سوسائٹیز کے ریکارڈ کی انسپکشن کرنا ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ ان کا آڈٹ بھی۔ لیکن محکمہ کی غفلت، لاپروائی، سستی، بددیانتی اور بدنیتی کی وجہ سے تقریباً تمام سوسائٹیز کی نہ تو قانون کے مطابق انسپکشن کی گئی اور نہ ہی آڈٹ۔ اس کے در پردہ دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں: ایک تو یہ کہ محکمہ کے لوگوں کی مٹھی گرم ہوتی رہی ہو اور دوسرا یہ کہ ان سوسائٹیز کے مالکان اتنے بااثر اور طاقتور لوگ ہوں کہ محکمہ نہ تو ان کی انسپکشن کر سکتا تھا نہ ہی آڈٹ۔ لیکن محکمہ قانونی طور پر پابند تھا کہ باقاعدگی سے ان سوسائٹیز کا آڈٹ اور انسپکشن کرتا، ایسا نہ کر کے محکمہ کے ملازمین نے بددیانتی اور مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہ ادارے بند ہوئے تو ان اداروں نے اپنے کرتا دھرتا لوگوں کو مالیاتی ذمہ داری سے بچانے کے لیے ان بااثر لوگوں کے نام نکال کر ان لوگوں کے نام بھی ڈائریکٹران کی فہرست میں ڈال دیئے جن کا سوسائٹیز کے معاملات سے دور دور کا واسطہ نہ تھا۔ اور وہ صرف اور صرف ان اداروں کے ملازمین تھے۔ ایسا ہی معاملہ مذکورہ بالا مسؤل علیہ کے ساتھ ہوا۔

خیر مقررہ تاریخ پیشی پر اور مقررہ وقت پر عدالتی کام شروع ہوا۔ آوازیں دلائی جا رہی تھیں۔ جب مذکورہ بالا مقدمہ کے لیے آواز دلائی گئی تو الزام علیہ/ مسؤل علیہ عدالت میں حاضر ہوا۔ لیکوڈیشن بورڈ کا نمائندہ بھی حاضر عدالت ہوا، میں نے اسے پوچھا: ”آپ اس کیس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ کیا آپ کو کوئی ایسا ریکارڈ ملا جس کی بنا پر آپ نے عدالت میں موجود مسؤل علیہ کو ڈائریکٹر ظاہر کیا اور اس کے خلاف ذمہ داری کے تعین کے لیے آپ نے عدالت ہذا میں مقدمہ دائر کیا؟“۔

کہنے لگا: ”سر! لوگ اتنے ایماندار کہاں رہ گئے ہیں کہ عدالت میں آ کر سچ بولیں۔ آپ کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سامنے جو بھی ڈائریکٹر پیش ہوگا وہی اپنے آپ کو بے گناہ کہے گا۔ اگر ہم سب لوگوں کو بے گناہ سمجھ کر چھوڑتے گئے تو جن لوگوں کی ساری زندگی کی جمع پونجی ان لوگوں نے ہڑپ کی ہے ان کو ہم ادائیگی کہاں سے کریں گے؟۔ سر! اگرچہ عدالت میں موجود مسؤل علیہ کی ڈائریکٹران کی کسی بھی میٹنگ میں حاضری ہمارے ریکارڈ کے مطابق موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس کے دستخطوں سے سوسائٹی کے کوئی اخراجات ہوئے ہیں اور نہ اس نے سوائے تنخواہ کے کوئی اور مالی مفاد سوسائٹی سے حاصل کیا ہے۔ لیکن بمطابق قانون، یہ چونکہ ہمارے ریکارڈ کے مطابق سوسائٹی کا ڈائریکٹر تھا، اس لیے اس کے خلاف ذمہ داری کا تعین کیا جائے تاکہ ہم متاثرین کو رقم واپس دے سکیں۔ سر! ہم سب لوگ لیکوڈیشن بورڈ کے ملازم ہیں، ہم تنخواہ اور دیگر مراعات بورڈ سے ہی تو لے رہے ہیں۔ اگر آپ لیکوڈیشن بورڈ کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں تو بورڈ انتظامیہ سخت ناراض ہوگی''۔ میں نے بڑی حیرت سے اس سے پوچھا، ''آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا اللہ کی ذات بابرکات نے مجھے اس لئے عدالت میں بٹھایا ہے کہ لیکوڈیشن بورڈ جس کے خلاف بھی کیس فائل کردے میں اس کو بغیر ریکارڈ دیکھے گنہگار قرار دے دوں؟؟ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دوں، آپ کی طرح ظلم کروں، زیادتی کروں، بے گناہ لوگوں کو ذلیل و خوار کروں اور انہیں عدالت کے چکر لگواؤں؟ کیا میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں؟ ہاں! میں اس ہستی کے سامنے جواب دہ ہوں جس کے سامنے تمام ہستیاں ہیچ ہیں۔ میں کسی کے ساتھ ناانصافی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ خواہ مجھے اس کے لیے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے، اگر آپ کے پاس اپنے دعوی کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت ہیں تو پیش کرو، میں آپ کو مزید وقت نہیں دے سکتا نہ ہی مسئول علیہ کو مزید ذلیل کرسکتا ہوں۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ بہت عرصہ ہوتا ہے۔ اس کی ڈیڑھ سالہ اذیت کا حساب کون دے گا؟''۔ کہنے لگا، ''سر! میرے ریکارڈ میں ملزم کے خلاف اور کوئی ثبوت نہیں ہیں، آپ میرٹ پر کیس کا فیصلہ سنا دیں''۔ میں نے فریقین کو آدھ گھنٹے کے بعد دوبارہ آنے کا کہا اور عدالت برخاست کردی۔

آدھے گھنٹہ کے بعد میں دوبارہ عدالت میں بیٹھ گیا۔ اس دوران میں نے فائل پر مختصر فیصلہ لکھ لیا تھا۔ آواز دلانے پر فریقین فیصلہ سننے کے لیے حاضر ہوگئے۔ میں نے فیصلہ پڑھ کر سنایا اور مسئول علیہ کو اس مقدمہ میں تمام تر ذمہ داری سے بالکل بری کردیا۔ مسئول علیہ کو شاید اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ پوچھنے لگا، ''سر! کیا آپ نے مجھے اس مقدمہ سے بری کردیا ہے؟'' میں نے کہا، ''ہاں! آپ کو اس مقدمہ سے بری کیا جاتا ہے''۔ میرے یہ الفاظ سنتے ہی وہ چھ فٹ کا صحت مند اور لمبا تڑنگا انسان زاروقطار رونا شروع ہوگیا۔ عدالت کا ماحول افسردگی میں ڈوب گیا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

عدالت میں موجود دوسرے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور اسکو یقین دلانے لگے کہ اس کو سزا نہیں ہوئی بلکہ بری کر دیا گیا ہے۔ لیکن وہ زارو قطار روئے جا رہا تھا۔ آخر اس کی ہچکی بندھ گئی۔ میں یہ سارا واقعہ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ عدالت میں موجود لوگوں سے میں نے کہا کہ آپ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ میں نے اسے بیٹھنے کا کہا لیکن وہ بیٹھنے کو تیار نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نارمل ہوا تو میں نے اس سے پوچھا، ''آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ کو تو مقدمہ سے بری کر دیا گیا ہے، آپ کو خوش ہونا چاہیے تھا، لیکن آپ نے رونا شروع کر دیا۔ اور ہم سب لوگوں کو پریشان کر دیا۔ اس رونے کی وجہ کیا ہے؟''۔ کہنے لگا، ''سر! میں رویا اس لئے تھا کہ مجھ پر ایک وقت ایسا بھی آ گیا تھا کہ میں نے اپنے اللہ سے بھی گلے شکوے کرنے شروع کر دیے تھے کہ اے اللہ آپ کو تو پتہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں پھر بھی میری اتنی لمبی آزمائش کیوں؟ میں نے اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر گناہ کیا۔ میں رو رو کر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگ رہا تھا۔ دوسرا یہ کہ، سر! مجھے اب بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا کہ میرے جیسا شخص جس کے پاس نہ تو کوئی سفارش ہو اور نہ ہی کسی کی خدمت کرنے کے لیے دولت، اس کو کروڑوں روپے کی ذمہ داری سے کیسے بری کیا جا سکتا ہے، سر! آج کے دور میں انصاف کہاں ملتا ہے۔ جو کچھ ہوا وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شاید یہاں بھیجا ہی میرے ساتھ انصاف کرنے کے لئے ہے''۔

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ پھر دوبارہ بولا اور کہنے لگا: ''سر! میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، میں صرف آپ کو دعا ہی دے سکتا ہوں''۔ پھر اس نے وہاں پر کھڑے اپنے ہاتھ اٹھائے اور ان الفاظ میں دعا کی، ''اے اللہ اس سر جی کو زیادہ عرصہ تک اس عدالت میں رکھنا تا کہ میرے جیسے اور بھی لاوارث لوگوں کو انصاف مل سکے''۔ پھر بولا، ''اے اللہ اس سر جی کو اس سے بھی بڑا افسر بنا تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو انصاف دے سکیں''۔ عدالت میں موجود سب لوگوں نے اس کی دعا پر آمین کہا اور وہ سلام کر کے عدالت سے چلا گیا۔ وہ دن میری زندگی کا یادگار دن تھا۔ اس رات میں جتنی سکون کی نیند سویا شاید پوری زندگی ایسی نیند نہ سویا ہوں۔ کیوں کہ میں نے ایک بے سہارا اور بے گناہ شخص کو اللہ کی مہربانی سے فوری انصاف فراہم کیا۔ حالانکہ اس طرح کے فیصلے کرنے سے لیکوڈیشن بورڈ کے اعلیٰ افسران میرے ساتھ ناراض بھی ہو سکتے تھے۔ اور مجھے آزمائش میں بھی مبتلا کر سکتے تھے، لیکن فیصلہ چونکہ میرٹ اور نیک نیتی پر مبنی تھا اس لئے لیکوڈیشن بورڈ کے اعلیٰ افسران نے نہ تو مجھ سے کوئی پوچھ گچھ کی اور نہ میرے فیصلے کے خلاف لاہور ہائیکورٹ میں کوئی اپیل دائر کی۔ اسی طرح ایک دوسرا واقعہ بھی پیش آیا۔ مجھے لیکوڈیشن بورڈ میں کام شروع

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کیے تقریباً دو ماہ ہی گزرے ہوں گے۔ میں حسب معمول عدالت میں بیٹھ کر مقدمات کی سماعت کر رہا تھا کہ آواز دلانے پر ایک ستر پچھتر سالہ شخص پیش ہوا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ اس نے استدعا کی کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اجازت دی تو کہنے لگا: ''سر! میرا نام (میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ میں نے اپنے سابقہ ریڈر یاسین ملک کو بھی ان کا نام پوچھنے کے لیے فون کیا لیکن وہ بھی ان کا نام بھول چکا ہے)۔ میرے ساتھ سید محمد فاروق ہے، یہ میرا بیٹا ہے۔ میں سید ہوں، آل رسولؐ ہوں، میرے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں ہے، آپ جب سے اس سیٹ پر آئے ہیں تب سے ایک حوصلہ سا ہوا ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ کوئی ایسا افسر بھی آیا جو ہر شخص کی بات تو غور سے سنتا ہے''۔ میں نے انہیں ٹوکا اور کہا'' شاہ صاحب آپ اپنی بات کریں کیوں کہ باقی بہت سارے لوگ عدالت کے باہر موجود ہیں، جن کو ابھی کال کرنا باقی ہے''۔ تو اس نے اپنی درد بھری کہانی یوں بیان کی: ''سر! میں حبیب بینک لمیٹڈ میں برانچ منیجر تھا۔ اپنی سروس مکمل کرنے کے بعد ریٹائر ہوا۔ اب میری عمر بہتر برس ہے۔ دل کا مریض ہوں۔ میرے گھٹنے بھی جواب دے گئے ہیں، اس لیے میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے بیٹے کو سہارا دینے کے لیے ساتھ رکھتا ہوں۔ گزشتہ دو سال سے آپ کی عدالت کی سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر تھک گیا ہوں۔ (میری عدالت دوسری منزل پر تھی) اب مجھ میں سکت نہیں رہی کہ میں سیڑھیاں چڑھ سکوں، میری ہمت جواب دے چکی ہے۔ گزشتہ دو سالوں میں جو میرے خلاف مقدمہ بنایا گیا ہے اس پر کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ کیس طلبی میں چل رہا ہے۔ میرے علاوہ کوئی بھی ملزم پیش نہیں ہو رہا۔ ایک دفعہ سوسائٹی کا مالک حاضر ہوا تھا اس کے بعد وہ مجھے کبھی عدالت میں نظر نہیں آیا۔ آپ عدالتی مثل ملاحظہ فرما کر دیکھ سکتے ہیں۔ میں یہاں آتا ہوں، حاضری لگتی ہے اور آئندہ تاریخ پیشی دے دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ آج تک میرا بیان بھی قلمبند نہیں کیا گیا اور نہ مجھ سے کبھی پوچھا گیا ہے کہ تمہارا مقدمہ میں کیا کردار ہے۔ میں نے یہاں سے تبدیل ہو کر جانے والے افسر صاحب بہادر کو کئی دفعہ اپنی بات سنانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے مجھے کبھی وقت نہ دیا''۔

میں نے شاہ جی سے کہا کہ آپ انتظار کریں، آپ کا بیان آج ہی قلمبند کیا جائیگا۔ روزمرہ کے دوسرے عدالتی امور نمٹا کر جب شہادتیں لکھنے کا مرحلہ آیا تو نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ کو طلب کر کے شہادتیں قلمبند کرنا شروع کر دی گئیں۔ شاہ صاحب کی شہادت بھی قلمبند کی گئی۔ انہوں نے اپنا جو بیان قلمبند کروایا اس کا خلاصہ یہ ہے: ''میں حلفاً بیان کرتا ہوں کہ میں حبیب بینک لمیٹڈ کا ریٹائرڈ مینیجر ہوں۔ میں نے اس ادارے/سوسائٹی میں ریٹائرمنٹ کے بعد بحیثیت برانچ مینیجر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نوکری جائن کی اور ادارے کی شرائط کے مطابق اپنی پوری جمع پونجی بطور ایڈوانس ڈیپازٹ برانچ میں جمع کروادی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنا ٹارگٹ پورا کرنے کے لیے اپنے تمام رشتہ داروں، دوستوں اور دیگر جاننے والوں کی رقوم بھی برانچ میں جمع کروائیں۔ بعد میں تمام جمع شدہ رقم ہیڈ آفس ٹرانسفر کردی گئی۔ میں نے تقریباً چھ ماہ بطور برانچ منیجر کام کیا اور پانچ ماہ کی تنخواہیں وصول کیں۔ پھر حکومت کے حکم سے یہ تمام ادرے بند ہو گئے۔ میری اپنی جمع پونجی اور میرے رشتہ داروں، عزیزوں، دوستوں اور جاننے والوں کی تمام جمع شدہ رقم ڈوب گئی۔ سوسائٹی مالکان روپوش ہو گئے، ہمارا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ جن لوگوں نے برانچ میں رقوم میرے حوالے سے جمع کروائی تھیں ان کے تقاضے شدت اختیار کرتے گئے۔ لیکن میرے پاس تو اب ان کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ جب لوگوں کے تقاضوں سے تنگ آ گیا تو میرا جو سمن آباد لاہور میں دس مرلہ کا آبائی مکان تھا اس کو بیچ کر ان لوگوں کو ادائیگی کر دی۔ اب میں ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہتا ہوں۔ مکان بیچنے کے باوجود لوگوں کو مکمل ادائیگیاں نہیں کر سکا ہوں۔ لوگ اب بھی مجھے بہت پریشان کرتے ہیں لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا جس کو بیچ کر لوگوں کی بقیہ رقم ادا کر سکوں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے وہ زیر تعلیم تھا۔ اس کی تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اب وہ لاہور ہائیکورٹ کے سامنے شاہ بابا بریانی کے نام سے بریانی بیچتا ہے اور ہماری گزر اوقات ہوتی ہے۔ ساری زندگی عزت سے گزاری، اب بڑھاپے میں لوگوں کی باتیں سننا پڑیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ادارے ختم ہونے کے بعد سوسائٹی مالکان نے سابقہ تاریخوں میں کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے لیئے میرا نام ڈائریکٹران کی فہرست میں ڈال دیا۔ اب میرے خلاف لیکوڈیشن بورڈ نے بطور ڈائریکٹر ذمہ داری کا تعین کرنے کے لئے دعوی دائر کیا ہوا ہے۔

خدا گواہ ہے کہ میں کبھی اس ادارے کا ڈائریکٹر نہیں رہا، نہ ہی عدالت ہذا کی طلبی سے قبل یہ بات میرے علم میں تھی۔ جب میں سمن ملنے پر آپ کی عدالت میں آیا تو مجھے پتہ چلا کہ مجھے سوسائٹی والوں نے جعلسازی سے ڈائریکٹر بنا دیا ہوا تھا۔ میں نے کبھی بطور ڈائریکٹر کوئی میٹنگ اٹینڈ کی اور نہ ہی بطور ڈائریکٹر کبھی دستخط کیے۔ اور نہ اس حوالے سے کوئی مالی مفاد سوسائٹی سے حاصل کیا۔ میں ایک لٹا پٹا اور حالات کا مارا ہوا شخص ہوں۔ اس کیس میں بے گناہ ہوں۔ میرے حال پر رحم کھاتے ہوئے مجھے بری کیا جائے''۔ نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ کی موجودگی ہی میں بیان لیا گیا تھا۔ بیان ختم ہونے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ اس کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ بھی اس حوالے سے اپنا مدعا بیان کرے۔ اور اگر مسؤل علیہ سے کوئی سوال کرنا چاہتا ہے تو کر لے۔ اس نے کہا کہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اسے تیاری کا وقت دیا جائے، وہ آئندہ تاریخ پیشی پر مکمل ریکارڈ پیش کر دے گا اور اپنا بیان بھی قلمبند کروا دے گا۔ چنانچہ حسب استدعا نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ مقدمہ کی کارروائی آئندہ تاریخ پیشی تک ملتوی کر دی گئی۔ میں آئندہ تاریخ پیشی سے پہلے ہی مثل مقدمہ اپنے گھر لے گیا۔ رات کو تسلی سے اسے ملاحظہ کیا۔ مثل کا ایک ایک ورق چھان مارا۔ ڈائریکٹران کی میٹنگز کی تمام رودادیں (منٹس آف میٹنگز) دیکھ لیے لیکن مجھے اس مثل میں کہیں بھی شاہ صاحب کے بطور ڈائریکٹر دستخط نظر نہ آئے۔ صرف ایک فہرست ڈائریکٹران صفحہ مثل پر موجود تھی جس میں شاہ صاحب کا نام درج تھا اور اس فہرست پر بھی کسی مجاز شخص کے دستخط نہ تھے۔

مقررہ تاریخ پیشی پر آواز دلائی گئی۔ فریقین مقدمہ حاضر ہوئے۔ مثل کے درمیانی احکامات کی شیٹ کو ملاحظہ کیا گیا۔ مثل میں موجود فہرست کو بھی ملاحظہ کیا گیا جس کے مطابق سوسائٹی کے شاید پندرہ کے لگ بھگ ڈائریکٹر تھے۔ ان میں سے سوائے شاہ صاحب کے گزشتہ دو سال سے کوئی بھی ڈائریکٹر حاضر نہیں ہو رہا تھا۔ سوسائٹی کا ایک اور ڈائریکٹر صرف ایک دفعہ پیش عدالت ہوا اس کے بعد پھر کبھی نہیں لوٹا۔ کیوں کہ وہ شاید سوسائٹی کا مالک تھا۔ امیر آدمی ہوگا۔ اس کا اثر و رسوخ بھی کافی ہوگا۔ اس کے تعلقات بھی بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ بڑی بڑی سفارشیں، افسروں اور سیاستدانوں کی، بھی اس کے پیچھے ہوں گی۔ اور اس کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ کس افسر/جج کی کتنی قیمت ہے؟ اس کو بھلا کیا ضرورت تھی کہ چھوٹی چھوٹی عدالتوں میں پیش ہوتا پھرے؟ یہ چھوٹی چھوٹی عدالتیں اس کے معیار پر کہاں پوری اترتی تھیں؟ یہ چھوٹی عدالتیں تو غریب، بے بس، مظلوموں اور بے سہارا لوگوں کو بلا کر کھڑا کرنے کے لیے، انتظار کروانے کے لیے، تاریخ پر تاریخ دینے کے لیے اور پھر ان کو پکڑ کر جیل بھیجنے کے لیے ہی تو ہوتی ہیں۔ ان کی کیا مجال کہ کسی طاقتور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکیں۔

خیر اگلی پیشی پر نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ نے متعلقہ ریکارڈ پیش کیا۔ ملاحظہ کیا گیا۔ لیکن شاہ صاحب کے بطور ڈائریکٹر کہیں بھی دستخط موجود نہ پائے گئے۔ میں نے نمائندہ لیکوڈیشن بورڈ سے پوچھا، ''آپ کے پاس اس ملزم/مسؤل علیہ کے خلاف اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے اس کے علاوہ کیا ثبوت ہیں؟'' کہنے لگا: ''سر! میرے پاس مسؤل علیہ کے خلاف جو ثبوت تھے پیش عدالت کر دئے ہیں، ان کے علاوہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہیں''۔ میں نے استفسار کیا، ''کیا ڈائریکٹران کی بنائی گئی ایک سادہ فہرست کی بنیاد پر حاضر آمدہ مسؤل علیہ کو ڈائریکٹر سمجھ کر اس کے خلاف ذمہ داری کا تعین کیا جا سکتا ہے؟''۔ تو وہ خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا، بعد میں کہنے لگا،

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

''سر! آپ میرٹ پر فیصلہ کر دیں۔ اگر لیکوڈیشن بورڈ کو آپ کا فیصلہ سے اختلاف ہوا تو ہم آپ کے فیصلے کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل دائر کر دیں گے''۔

اس پر میں نے صفحہ مثل پر اپنے ہاتھ سے مختصر فیصلہ لکھا اور مسؤل علیہ (شاہ صاحب) کو سوسائٹی کی تمام تر ذمہ داری سے بری کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ فیصلہ سننے کے بعد شاہ صاحب کی حالت عجیب سی ہوگئی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ شاید ان پر وجد طاری ہو گیا تھا۔ وہ ایک جگہ پر گم سم اور ساکت کھڑے تھے اور کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ شاید ان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی بغیر رشوت اور سفارش کے انصاف مل جاتا ہے۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ میں اس ساری صورتحال کو بڑی دلچسپی اور حیرانی کی ملی جلی کیفیت سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں شاہ صاحب نے وہاں پر کھڑے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے اور تھوڑی دیر تک زیرلب ہی کچھ پڑھتے رہے۔ پھر بولے اور کہنے لگے، ''سر! میں سید ہوں، آل رسولؐ ہوں، آپ نے میرے ساتھ انصاف کیا ہے، میرے پاس سوائے دعا کے آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں۔ میں نے آپ کے لیے اللہ سے دعا کر دی ہے، آپ یقین کریں میری دعا کبھی رد نہیں ہوئی۔ میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ وہ آپ جیسے منصف مزاج افسر کو ڈپٹی کمشنر بنائے''۔

شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیے، پھر بولے، ''سر! آج کا دن اور وقت نوٹ کر لیں۔ آپ کو سید نے دعا دے دی ہے، اللہ نے آپ کو ڈپٹی کمشنر بنانا ہے۔ انشاءاللہ، انشاءاللہ'' اور شاہ صاحب اتنی بات کہہ کر اپنے بیٹے سید فاروق شاہ کا سہارا لیتے ہوئے عدالت سے باہر چلے گئے۔ اور میرے سمیت کمرہ عدالت میں موجود تمام لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈال گئے۔ اگر چہ میں گومگو کی حالت میں تھا لیکن میرا یقین کامل عین الیقین میں بدل چکا تھا کہ شاہ صاحب کی دعا ضرور درگاہ رب العالمین میں شرف قبولیت حاصل کرے گی۔ جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ جب میں لیکوڈیشن بورڈ میں بطور جوڈیشل افسر کام کر رہا تھا تو میں ساتھ ساتھ پی سی ایس 1996ء کا مقابلے کا امتحان دوبارہ دینے کی تیاری بھی کر رہا تھا۔ جب مذکورہ بالا دونوں واقعات پیش آئے اس وقت تک میں نے دوبارہ امتحان نہیں دیا تھا۔ اور اگر میں دوبارہ امتحان نہ دیتا تو میری پرموشن، میرے اس وقت کے محکمہ میں بطور سرکل رجسٹرار، ڈپٹی رجسٹرار اور جائنٹ رجسٹرار (کوآپریٹو سوسائیٹز) ہونا تھی اور میں کسی صورت بھی ڈپٹی کمشنر نہیں بن سکتا تھا۔ اور قبلہ شاہ کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ میں دوبارہ سے پی سی ایس کے مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہوں۔ لیکن انہوں نے پھر بھی مجھے ڈپٹی کمشنر بننے کی یقین دہانی کرا دی۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس واقعہ کے تھوڑے دنوں بعد مذکورہ امتحان کی ڈیٹ شیٹ آ گئی۔ یقین مانیں کہ میں نے جب امتحان دینا شروع کیا تو جب بھی کوئی امتحانی پرچہ حل کرر ہا ہوتا تھا تو مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت میری مدد کر رہی ہے۔ مجھے وہ وہ چیزیں بھی یاد آ جاتی تھیں جو میں نے سالوں پہلے پڑھی ہوئی تھیں۔ حالانکہ میں بطور جوڈیشل افسر سرکاری مصروفیات کی زیادتی کے باعث امتحان کی اتنی اچھی تیاری نہیں کر سکا تھا، جتنی کرنی چاہیے تھی۔ امتحان کے اختتام پر میری توقعات یہ تھیں کہ میرا میرٹ زیادہ سے زیادہ سیکشن افسر کا آئے گا کیونکہ اس وقت سیکشن افسر کا میرٹ دوسرے نمبر پر ہوتا تھا اور پہلے نمبر پر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا میرٹ ہوتا تھا جو کہ آج کل کے پی ایم ایس افسر کا ہوتا ہے۔ پھر کیا ہوا؟ ایک معجزہ ہوا!۔ جب میرا پی سی ایس 96 کے مقابلے کے امتحان کا رزلٹ آیا تو اللہ کی مہربانی سے، میرے مرحوم والدین کی دعاؤں سے اور اوپر ذکر کردہ سکیورٹی گارڈ اور شاہ صاحب جیسے بے سہارا اور مجبور لوگوں کی دعاؤں کے سبب میں تحریری امتحان میں پورے صوبہ پنجاب میں فرسٹ آیا اور میرے نمبر 1050/685 تھے۔ (اس وقت تک معروضی سوالات کی لعنت نہیں متعارف ہوئی تھی۔ تمام سوالات انشائیہ طرز کے ہوتے تھے) تاہم مجھے انٹرویو میں سے 200/108 نمبر ملے اور مجموعی طور پر تحریری اور انٹرویو کے نمبر ملا کر صوبہ پنجاب میں میری پانچویں پوزیشن بنی۔

اس سال ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی صوبہ پنجاب میں صرف دس سیٹیں تھیں۔ پنجاب پبلک سروس کمیشن نے حکومت پنجاب سے مجھے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ فرسٹ کلاس) تعینات کرنے کی سفارش کر دی اور حکومت پنجاب نے مجھے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تعینات کر دیا۔ پھر اللہ کے فضل و کرم سے میں صوبہ پنجاب کے مختلف اضلاع / ڈویژنز میں بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (مجسٹریٹ درجہ اول)، سپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ، اسسٹنٹ کمشنر، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر، ڈپٹی ڈائریکٹر اینٹی کرپشن، ڈپٹی سیکرٹری اور ایڈیشنل کمشنز اور ڈپٹی کمشنر کے طور پر کام کر کے باعزت طور اپنی سروس پوری کر کے 2019ء میں ریٹائر ہوا۔

یہ 1998ء کی بات ہے۔ میری اسسٹنٹ کمشنر (پروبیشن) کی ٹریننگ پراونشل سروسز اکیڈمی پشاور سے مکمل ہوئی تو حکومت پنجاب نے مجھے میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں بطور زونل سیکرٹری/سپیشل مجسٹریٹ درجہ اول تعینات کر دیا۔ اس وقت مرکز اور صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ (ن) کی حکومت تھی۔ خواجہ احمد حسان، جن کا تعلق بھی مسلم لیگ (ن) سے تھا اس وقت لارڈ میئر میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور تھے اور جناب عرفان الٰہی جو کہ ایک ڈی ایم جی افسر تھے چیف

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کارپوریشن افسر میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور (ایم سی ایل) تھے۔ میں نے حسب الحکم حکومت پنجاب جب ایم سی ایل میں جائن کیا تو مجھے زونل سیکرٹری/اسپیشل مجسٹریٹ، زون نمبر آٹھ لگا دیا گیا۔ اس وقت ایم سی ایل کو آٹھ زونوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ زون نمبر آٹھ کا دفتر سمن آباد لاہور میں تھا اور اس وقت میاں مشتاق احمد ایڈووکیٹ صاحب جن کا تعلق مسلم لیگ (ن) سے تھا، اس زون کے ڈپٹی میئر تھے۔ یہ وہی شخصیت ہیں جن کا ایک بیٹا بعد میں سمن آباد کے علاقہ ہی سے مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر ایم این اے بھی بنا۔

میں نے زون نمبر آٹھ میں جائن کیا تو پتہ چلا کہ اس زون میں زونل سیکرٹری کے لئے کوئی دفتر سرے ہی موجود نہیں۔ زونل سیکرٹری کے دفتر میں جناب ڈپٹی میئر صاحب نے اپنا دفتر بنا لیا ہوا تھا۔ میں اس سلسلہ میں جناب ڈپٹی میئر صاحب سے ملا اور ان سے پوچھا کہ میرا دفتر کون سا ہوگا اور میں کہاں بیٹھ کر کارسرکار سرانجام دیا کروں گا؟ تو فرمانے لگے: ''آپ میرے پاس ہی بیٹھ جایا کریں، علیحدہ دفتر کی کیا ضرورت ہے؟''۔ میں نے عرض کی، ''سر! آپ کا دفتر ایک سیاسی دفتر ہے۔ یہاں تو سارا دن لوگوں کا آنا جانا لگا رہے گا، میں یہاں بیٹھ کر کیسے کام کر پاؤں گا؟'' میری اس جرات رندانہ پر جناب ڈپٹی میئر صاحب نے کافی ناگواری کا اظہار کیا۔ کہنے لگے کچھ کرتا ہوں۔ میں چونکہ نیا نیا مجسٹریٹ بنا تھا، پروٹوکول ملنے کے بڑے بڑے خواب تھے لیکن یہاں تو معاملہ یکسر ہی الٹ نکلا۔ مجھے سارے خواب چکنا چور ہوتے نظر آئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک پی سی ایس افسر بن کر ان حالات سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن میں چونکہ ایک بے سہارا افسر تھا، میری پشت پر نہ تو کوئی سیاستدان تھا اور نہ کوئی بیوروکریٹ، اس لیے ایسی جگہ سے تبادلہ کروانا بھی میرے بس میں نہ تھا، اس لیے مجھے حالات سے سمجھوتہ کر کے انہی حالات میں کارسرکار سرانجام دینے تھے۔ تاہم بعد میں انہوں نے کمال مہربانی کی اور ایک چھوٹا سا دفتر مجھے الاٹ کر دیا۔ اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر بھی اس میں رکھوا دیا۔

یہاں میں بتاتا چلوں کہ ہمارے بیوروکریٹک سسٹم میں ایک لاوارث افسر کے لیے کیا کیا مسائل ہوتے ہیں۔ اسے نہ تو اچھی پوسٹنگ ملتی ہے اور نہ کسی مشکل میں پھنس جانے کی صورت میں اس کی مدد کو کوئی آتا ہے، ہاں کچھ لوگ سروس میں آ کر چاپلوسی، جی حضوری، اور کچھ دیگر تکنیکی داؤ پیچ سیکھ کر افسران بالا کے منظور نظر بن کر افسری کے مزے لوٹتے ہیں۔ اپنی مرضی کی پوسٹنگ لیتے ہیں۔ خود بھی انجوائے کرتے ہیں اور اپنے سرپرستوں کو بھی انجوائے کرواتے ہیں۔ اپنے عہدے سے دو دو گریڈ سینئر سیٹوں پر دھڑلے سے براجمان ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان سے سینئر افسران

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کوان کی ماتحتی میں کام کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہمارے ملک کے سیاستدانوں کے پاس جب اختیار ات آتے ہیں تو وہ اپنے اختیارات کا کس طرح ناجائز استعمال کرتے ہیں اور اگر کوئی خوددار افسران کی ہر بات من وعن تسلیم نہ کرے تو اسے نیچا دکھانے کے لیے اس کے خلاف کتنے گھٹیا حربے استعمال کرتے ہیں اور اس کو اتنا زچ کر دیتے ہیں کہ یا تو وہ ان سے صلح کر لیتا ہے اور اپنی انا اور خودداری کا سودا کر کے ناانصافیوں پرمبنی فیصلے کر کے ان کو خوش کر کے اپنی عاقبت خراب کر لیتا ہے۔

ہمارے ملک کے افسران بالا کا بھی، چند استثنائی صورتوں کے علاوہ، ایک المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کے خلاف آنیوالی ہر شکایت کو صحیح سمجھ بیٹھتے ہیں اور پس پردہ حقائق سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس سرکاری ملازم کے خلاف ایک منفی تصور بنا لیتے ہیں جس کے خلاف ایک سادہ کاغذ پر درخواست آ جاتی ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو بندہ صحیح کام کرے گا، کسی کی سفارش نہیں مانے گا، ناجائز کام نہیں کرے گا، لوگوں سے پیسے لے کر ان کے حسب منشا کام نہیں کرے گا، تو کیا سیاستدان یا غلط کام کرنے اور کروانے والے مافیاز اس کی تعریف کریں گے، ہرگز نہیں، وہ تو اس کی شکایات ہی کریں گے، اس کے خلاف جھوٹے الزامات بھی لگائیں گے، اس کو انکوائریوں میں الجھائیں گے، اپنا کام نکالیں گے اور اپنی دھاک بٹھائیں گے تاکہ بعد میں آنے والا افسر محتاط رہے اور میرٹ پر کام کرنے کی جرأت نہ کرے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ سرکاری ملازم کے خلاف آنے والی ہر شکایت/ درخواست جھوٹی ہی ہوتی ہے بلکہ بہت سی شکایات حقیقت پر بھی مبنی ہوتی ہیں۔ ایسی شکایات پر بعد از انکوائری الزامات ثابت ہونے کی صورت میں سرکاری ملازمین کے خلاف سخت ترین ایکشن لیا جانا چاہیے۔

میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سرکاری ملازمت کی خواہش رکھنے والے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ پاکستان میں سرکاری ملازمت ان لوگوں کے لیے ہرگز پھولوں کی سیج نہیں جو میرٹ پر کام کرنا چاہتے ہیں اور انہیں یہ بھی پتہ چلے کہ ایمانداری سے، میرٹ کی بنیاد پر، بغیر سیاسی مداخلت کو مانے، انصاف کی فراہمی اور خودداری سے کام کرنا کتنا مشکل ہے۔ اور ایسے سرکاری ملازم کو کس طرح کے حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اسے کس طرح گلی کا پتھر بنا دیا جاتا ہے۔ اس کا ایک سال کے اندر اندر کتنی جگہوں پر تبادلہ کیا جاتا ہے یا اس کو کتنا عرصہ افسر بکار خاص (اوایس ڈی) رکھا جاتا ہے۔

خیر، دفتر ملنے کے بعد میں نے سٹاف کی میٹنگ کال کی۔ سب لوگوں سے فرداً فرداً تعارف کے بعد میں نے سینئر لوگوں سے پوچھا کہ میرے فرائض میں کیا کیا شامل ہوگا۔ انہوں نے دیگر کاموں کے علاوہ دو کاموں کے بارے میں بتایا کہ وہ کام ان دنوں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں سے ایک کام ناجائز تجاوزات ہٹانا تھا اور دوسرا کام لاہور شہر سے مویشیوں کے انخلاء کا تھا۔ یعنی مجھے اپنے تفویض شدہ علاقہ کو مویشیوں سے پاک کرنا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ہر زون کو ہفتہ میں کم از کم ایک دفعہ پولیس کی نفری بھی دی جاتی ہے جس کی مدد سے انخلائے مویشیاں کا کام کیا جاتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ سب سے زیادہ تجاوزات کس علاقہ میں ہیں تاکہ ہم وہاں سے کام کی بسم اللہ کریں۔ انہوں نے بتایا کہ چوک یتیم خانہ میں انتہا درجہ کی تجاوزات ہیں جس کی وجہ سے وہاں پر عام طور پر ٹریفک کے بہاؤ میں رکاوٹ رہتی ہے، اس کے علاوہ اچھرہ بازار اور کچھ دیگر جگہوں کے نام بھی بتائے گئے۔ مجھے مشورہ دیا گیا کہ ہم تجاوزات ہٹانے کا کام چوک یتیم خانہ سے شروع کریں۔ ان میں سے مجھے کسی نے یہ نہ بتایا کہ زون کے ڈپٹی میئر صاحب کی رہائش بھی چوک یتیم خانہ میں ہے اور ان کے زیادہ تر ووٹر اور سپورٹر اسی علاقہ سے ہیں۔ یہ ایک اور المیہ ہے کہ عام طور پر ماتحت ملازمین ہر نئے آنیوالے آفیسر کو پہلے تو مسائل میں الجھاتے ہیں پھر اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اور اس افسر کے قریب ہونے کے لئے بظاہر افسر کا ساتھ دیتے ہیں لیکن درپردہ وہ اپنے سیاسی آقاؤں کے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ لوکل گورنمنٹ کے اداروں میں تو یہ وبا عام ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ لوکل گورنمنٹ کے زیادہ تر ملازمین کو مقامی سیاستدانوں نے ہی بھرتی کروایا ہوتا ہے اور ایسے ملازمین جب تک سروس میں رہتے ہیں ان کا مطمع نظر صرف اور صرف اپنے سیاسی آقاؤں کی وفاداری کرنا اور ان کی خوشنودی قائم رکھنا ہوتی ہے، کیونکہ افسران تو آتے جاتے رہتے ہیں لیکن ان کے سیاسی آقا تو تادم مرگ ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ان لوگوں نے ایسے ہی کیا۔ چنانچہ دوران میٹنگ یہ فیصلہ ہوا کہ اگلے دن ناجائز تجاوزات کے خلاف مہم کا آغاز چوک یتیم خانہ، لاہور سے ہوگا۔

اگلے دن حسب پروگرام تہہ بازاری عملہ زون نمبر آٹھ کے ہمراہ چوک یتیم خانہ سے عارضی تجاوزات ہٹانے کا کام شروع ہوا تو وہاں کی یونین کے لوگوں نے سرکاری ملازمین کو تجاوزات ہٹانے سے روکا۔ لیکن میں نے ہمت کر کے ان کے دو لوگوں کو موقع پر گرفتار کر لیا اور متعلقہ تھانہ سے فون کر کے نفری منگوالی۔ جب نفری آئی تو میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گرفتار شدہ ملزمان کو متعلقہ تھانہ کی حوالات میں بند کرنے کے لیے ہمراہ ہی پولیس ملازمین کو روانہ کر دیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ باقی لوگ موقع سے فرار ہو گئے اور ہم نے تسلی کے ساتھ سامان تجاوزات اٹھا کر ٹرکوں میں ڈال کر دفتر کے سٹور میں جمع کروا دیا۔ جب میں مع اپنی ٹیم وہاں سے روانہ ہوا تو وہ چوک یتیم خانہ جہاں ہر وقت ٹریفک بلاک رہتی تھی پہچانا نہ جا رہا تھا۔ ٹریفک رواں دواں تھی، کوئی رکاوٹ نہ تھی اور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لوگ ہمیں دعائیں دے رہے تھے کہ عرصہ دراز کے بعد اس چوک میں بھی تجاوزات کے خلاف آپریشن ہوا اور لوگوں کو سکون ملا۔ تاہم دوسری طرف ناجائز تجاوز کنندگان ہمیں برا بھلا بھی کہہ رہے تھے، دھمکیاں بھی دے رہے تھے۔ اور طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اپنے کانوں سے ان لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ نیا نیا افسر آیا ہے، اپنا وزن اور ریٹ بڑھا رہا ہے، منتھلی لینے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ منتھلی شروع ہو جائے گی تو اسے یہ تجاوزات نظر آنی بند ہو جائیں گی، وغیرہ، وغیرہ۔ میں عملے کے ہمراہ وہاں سے نکلا، راستے میں ایک جگہ گاڑی کھڑی کی۔ گرفتار شدہ ملزمان کے خلاف اپنے ہاتھوں سے استغاثہ لکھا، اپنے دستخط کئے اور مقدمہ کی ایف آئی آر درج کرنے کی غرض سے مذکورہ استغاثہ پولیس ملازمین کے حوالے کر کے دفتر اور پھر دفتر سے گھر روانہ ہو گیا۔

میرے پاس ان دنوں موبائل فون تو تھا، لیکن میرا نمبر سوائے سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) کے، کسی کے پاس نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں بہت کم لوگوں کے پاس موبائل فون ہوتا تھا، کیونکہ اس دور میں موبائل فون رکھنا ایک سٹیٹس سمبل سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں موبائل کی کال سننے والے کو بھی شاید چھ روپے فی منٹ کے حساب سے بل دینا پڑتا تھا۔ اس لیے میں اپنا موبائل فون چھپا کر رکھتا تھا تاکہ بل زیادہ نہ آئے۔ میں راستے میں ہی تھا کہ جناب سی سی او صاحب کا فون آ گیا۔ مجھے جناب ڈپٹی میئر میاں مشتاق احمد کا نمبر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ میں ان سے بات کروں۔ میں نے گھر پہنچ کر ڈپٹی میئر صاحب کو فون کیا تو وہ سخت غصہ میں تھے۔ کہنے لگے، ”آپ کو نہیں پتہ کہ زون کا انچارج ڈپٹی میئر ہوتا ہے؟ آپ نے میری اجازت کے بغیر چوک یتیم خانہ میں کیسے ریڈ کی؟ آپ کو نہیں پتہ کہ میرا گھر بھی ادھر ہے اور میرا حلقہ انتخاب بھی یہی علاقہ ہے؟ کل صبح آپ نے سیدھا میرے دفتر آنا ہے، پھر بات ہوگی۔ سردست تھانہ میں فون کرو اور جو معززین آپ نے گرفتار کئے ہیں ان کو وہاں سے رہائی دلواؤ، میں نے بڑی کوشش کی ہے لیکن ایس ایچ او تھانہ آپ کی اجازت کے بغیر ان کو نہیں چھوڑ رہا“۔

میں نے عرض کی، ”سر! مجھے معلوم ہے کہ آپ زون کے سیاسی انچارج ہیں لیکن میں تو حکومت کا نمائندہ ہوں۔ آپ کے اپنے اختیارات ہیں اور میرے اپنے۔ اگر ہر کام کرنے کی آپ سے اجازت لوں گا تو کام کیسے چلے گا۔ کیونکہ آپ کی اپنی سیاسی مجبوریاں ہوں گی۔ باقی رہا گرفتار شدہ ملزمان کو رہائی دلانا، وہ اب میرے بس میں نہیں ہے کیونکہ میں ان کے خلاف استغاثہ دستخط کر کے تھانہ میں بھیج چکا ہوں۔ دوسرا سر! اگر ایسے معززین کو چھوڑ دیا جائے تو میں اس زون میں کام کیسے کر سکوں گا، کیونکہ ان لوگوں نے موقع پر انتہا درجے کی بدمعاشی دکھائی۔ مجھے اور میرے سٹاف

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کوخطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور کارسرکار میں مداخلت کی۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں ان کونہیں چھڑواسکتا'' میری یہ بات سن کرڈپٹی میئرصاحب نے فون بند کردیا۔

میں اگلے دن صبح دفتر پہنچا تو سٹور کیپر میرے پاس آیا اور بتایا۔'' سر! کل ہم نے ناجائز تجاوزات کنندگان کا چوک یتیم خانہ سے جتنا بھی سامان اٹھایا تھا وہ سارا سامان شام کو ڈپٹی میئر صاحب نے مجھے ان لوگوں کو واپس کرنے کا حکم دیا تو میں نے ان لوگوں کو سارا سامان واپس کردیا ہے''۔ میں نے پوچھا:'' یہ بتاؤ کہ ناجائز تجاوزات کا اٹھایا ہوا سامان واپس کرنے کا اختیار کس کا ہے؟'' تو کہنے لگا'' سر! وہ اختیار تو آپ کا ہے''۔ پھر میں نے اسے پوچھا:'' تم نے ڈپٹی میئر کے کہنے پر سامان کیوں واپس کیا؟'' کہنے لگا،'' سر! ہم چھوٹے ملازمین ہیں، ہم نے ان لوگوں کے ساتھ نوکری کرنا ہوتی ہے، میں ڈپٹی میئر صاحب کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔ سر! میں تو بے سہارا سا آدمی ہوں، ڈپٹی میئر صاحب کی حکم عدولی کرنے کی جرات نہیں کرسکتا''۔ مجھے اس کی یہ بات سن کر بہت حیرت ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ میں نے اسے کہا،'' تمہارے خلاف انضباطی کارروائی ہوگی۔ جس کے لئے آج ہی میں مجاز اتھارٹی کو تحریر کروں گا۔ تمہاری جرات کیسے ہوئی کہ تم نے میری اجازت کے بغیر لوگوں کو سامان واپس کردیا''۔ لیکن وہ میری یہ بات سن کر قطعاً پریشان نہ ہوا شاید اس کو معلوم تھا کہ ان کے اپنے ڈپٹی میئر کے ہوتے ہوئے ان لوگوں کا کوئی افسر بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔

میں غصے سے تلملا رہا تھا، اسی حالت میں ڈپٹی میئر کے آفس گیا۔ سلام کرکے بیٹھ گیا۔ ڈپٹی میئر صاحب بھی بہت غصے میں تھے۔ سٹور مین سے میری جو باتیں ہوئی تھیں وہ بھی میرے پہنچنے سے پہلے ان تک پہنچ چکی تھیں۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے،'' آپ نے کل جن معززین اور شرفاء کے خلاف مقدمہ درج کروایا تھا ان کو کون سی سزائے موت ہو جانی ہے، آج نہیں تو کل وہ ضمانت پر رہا ہوکر گھر آجائیں گے۔ بہت دکھ ہوا کہ میں نے ذاتی طور پر ان لوگوں کو چھڑوانے کی درخواست کی لیکن آپ نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور میری بات ماننے سے انکار کردیا۔ یقین کریں میری اتنی توہین پوری زندگی میں نہیں ہوئی جتنی کل ہوئی۔ آپ نے میرے پلے کچھ نہیں چھوڑا''۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر بولے،'' ایک تو کل آپ نے میری اجازت کے بغیر چوک یتیم خانہ میں ناجائز تجاوز کنندگان کے خلاف کارروائی کی، دوسرا اگر میں نے ان لوگوں کا سامان واپس کیا تو آپ نے سٹور کیپر کے خلاف انضباتی کارروائی کی دھمکیاں دینا شروع کردیں۔ آپ نے اگر اس زون میں نوکری کرنی ہے تو یہاں پر جو میں چاہوں گا وہی ہوگا۔ اور خبردار اگر سٹور کیپر کے خلاف کوئی کارروئی کی۔ اگر کارروائی کرنی ہے تو میرے خلاف کرو۔ اس نے بات ختم کی تو میں نے عرض کی''

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سر! اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ زون کے ڈپٹی میئر ہیں، اور سیاسی لیڈر بھی ہیں، لیکن مجھے میرے سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) نے تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا کہ میں نے ہر کام آپ سے پوچھ کر کرنا ہے، آپ ان سے بات کر لیں''۔ کہنے لگے، ''میں کیوں سی سی او سے کہوں؟ میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ اس زون میں وہ ہوگا جو میں کہوں گا''۔ میں پھر کچھ نہ بولا اور انہیں سلام کر کے اپنے آفس آ گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں جب بھی کوئی نیا نیا افسر بنتا ہے تو وہ یہ ارمان اور خواہشات لے کر آتا ہے کہ اس نے جو بھی کام کرنا ہے میرٹ پر کرنا ہے۔ لوگوں کو انصاف فراہم کرنا ہے۔ لوگوں کا خادم بن کر ان کی خدمت کرنی ہے۔ عوام کے لیے زحمت نہیں رحمت ثابت ہونا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ شاید وہ اکیلا ہی تبدیلی لے آئے گا۔ ملک میں شہد کی نہریں بہا دے گا۔ اسے ہرگز اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس راہ میں تو کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ میں بھی کچھ اسی طرح کے احساسات و جذبات لے کر بیوروکریسی میں آیا تھا۔ اس گلے سڑے اور متعفن نظام کو درست کرنے نکلا تھا۔ ابتدا سے لے کر ریٹائرمنٹ تک پوری سروس اس گئے گزرے نظام کے خلاف جہاد کرتے گزر گئی۔ بہت سی مشکلیں، آزمائشیں اور پریشانیاں بھی آئیں لیکن اللہ نے مجھے ثابت قدمی سے اپنا کام جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ اگرچہ میں کوئی بڑی تبدیلی نہ لا سکا نہ کوئی اکیلا شخص یہ کام کر سکتا ہے۔ میں نے آتش نمرود کو بجھانے کے لیے آنیوالے ننھے سے پرندے کی طرح اپنے حصے کا کام جاری رکھا۔ اور اپنے ضمیر کے مطابق فیصلے بھی کرتا رہا۔ میں نے پوری سروس اپنے حصے سے بھی زیادہ کام کر کے اس نظام کو بہتر بنانے میں اپنا حصہ ضرور ڈالا۔ کیوں کہ یہ میرے فرائض میں شامل تھا کہ میں اپنے اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ اختیارات اس کے بندوں کی فلاح و بہبود، آسائش، آسانی۔ بہتری اور انہیں انصاف کی فراہمی کے لئے استعمال کروں۔ میں نے اپنے کیریئر کے دوران افسر شاہی اور سیاستدانوں کے گٹھ جوڑ، کرپشن اور دیگر مفادات کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سیاستدانوں کو کرپشن تک لانے میں افسر شاہی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ سیاستدانوں کو کرپشن کے راستے یہی لوگ دکھاتے ہیں کہ کہاں سے مال کیسے کمایا جا سکتا ہے۔ جب افسران اچھی اچھی سیٹیں لینے کے لیے سیاستدانوں کے ڈیروں کو رونق بخشیں گے، ان کی چاپلوسی کریں گے۔ ان کی مالش اور پالش جیسا فریضہ سرانجام دیں گے، ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ناانصافیاں کریں گے۔ ان کا ہر جائز و ناجائز کام پایہ تکمیل تک پہنچا کر ان کو اس کی رپورٹ کرنا سعادت اور ثواب کا کام سمجھیں گے۔ تو پھر انہیں میرے جیسے افسران کیوں پسند ہوں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گے؟ ہمارے ڈپٹی میئر صاحب کا دماغ خراب کرنے والے بھی ہمارے اپنے ہی افسران تھے۔ورنہ موصوف پڑھے لکھے شخص تھے۔سیاستدانوں کا دماغ خراب کرنے کے حوالے سے میں یہاں پر اپنی سروس کے دوران پیش آنے والے صرف دو واقعات بڑے اختصار کے ساتھ بیان کروں گا جس سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ ہمارے کچھ افسران کس حد تک گری ہوئی حرکتیں کر کے اپنی نوکریاں پکی کرتے اور انصاف پسند افسران کے لئے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔

پچھلی سطور میں بیان کئے گئے واقعہ کے بعد میری ڈپٹی میئر صاحب سے کوئی ملاقات نہ ہوئی۔دو تین دن ہی گزرے ہوں گے کہ میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ ڈپٹی میئر صاحب کا نائب قاصد میرے پاس آیا اور پیغام دیا کہ ڈپٹی میئر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔میں ان کے آفس گیا تو وہاں پر زون کے ایک سینئر سپیشل مجسٹریٹ تشریف فرما تھے۔وہ ریونیو سروس سے تھے۔میں ان کا نام نہیں لینا چاہتا۔موصوف کے ہاتھ میں ایک فہرست تھی جس میں لوگوں کو کیے گیے جرمانوں کی تفصیل تھی۔وہ ڈپٹی میئر صاحب کو وہ فہرست دکھا رہے تھے اور ساتھ یہ بھی بتا رہے تھے کہ سر یہ وہ شخص ہے جس کی آپ نے سفارش کی تھی اس کو میں نے صرف ایک سو روپیہ جرمانہ کیا ہے۔دوسرا یہ والا تھا جس کی آپ نے سفارش کی تھی اس کو آپ کے حکم کی تعمیل میں صرف دو صد روپیہ جرمانہ کیا ہے۔ہاں سر یہ وہ والا بدمعاش ہے جس کے بارے میں آپ نے حکم دیا تھا کہ اس کو ''فل ڈوز'' دینی ہے۔سر! میں نے اس کو پورے پانچ ہزار روپیہ جرمانہ کیا ہے اور ساتھ ہی اس کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ ڈپٹی میئر صاحب آپ سے بہت ناراض ہیں۔اور ہاں سر! وہ یہ بھی کہہ رہا تھا آپ میری ڈپٹی میئر صاحب سے ملاقات کروا دیں۔آپ سر، جب حکم کریں گے میں اس کو آپ کے ڈیرے پر لے آؤں گا۔ڈپٹی میئر صاحب بہت خوش ہو رہے تھے اور ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے میری اضطرابی کیفیت سے محظوظ بھی ہو رہے تھے۔

جب ڈپٹی میئر صاحب ساری رپورٹ دیکھ چکے تو معزز مجسٹریٹ صاحب کہنے لگے،''سر! کل کے لیے کیا حکم ہے؟''ڈپٹی میئر صاحب گویا ہوئے،''آپ اپنے ساتھی کو بھی کچھ سمجھائیں''۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے،''سینئر سپیشل مجسٹریٹ صاحب ان سے سیکھیں کہ نوکری کیسے کرتے ہیں؟ آپ کی نوکری کی شروعات ہیں لیکن آپ کے لچھن ٹھیک نہیں ہیں۔آپ نے دیکھا کہ وہ کس طرح اپنی سارا دن کی کارروائی کی آ کر رپورٹ مجھے دیتے ہیں؟''میں خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔کچھ نہ بولا۔اتنے میں سینئر مجسٹریٹ صاحب نے ڈپٹی میئر صاحب سے پوچھا: ''سر! کیا ہوا ہے؟ کیا کر دیا ہے چودھری صاحب نے؟ یہ تو بڑا سخت مقابلے کا امتحان پاس کر کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مجسٹریٹ بنے ہیں۔ان کی یہاں پوسٹنگ کوتو ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں''۔ڈپٹی میئر صاحب کہنے لگے:''انہوں نے آتے ہی میری سیاست کا بھٹہ بٹھا دیا ہے۔پھر انہوں نے ایک ہی سانس میں پچھلے دنوں کی ساری کارروائی سنادی۔یہ ساری باتیں سن کر سینئر مجسٹریٹ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے، کہنے لگے:''چودھری صاحب! آپ میرے بچوں کی طرح ہیں۔ڈپٹی میئر صاحب تو بڑی پڑھی لکھی اور مہربان شخصیت ہیں۔ان کے ساتھ آپ نے زیادتی کی ہے۔آپ کو ان سے معافی مانگنی چاہیے۔یہ ہمارے بڑے ہیں۔ہمیں ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرنا چاہیے''۔

یہ بات سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔میں نے کہا''سر! زیادتی میں نے کی ہے یا ڈپٹی میئر صاحب نے ؟ میں نے کون سا غلط کام کیا ہے؟ میں نے ڈپٹی میئر صاحب کے اختیارات میں کون سی مداخلت کی ہے۔انہوں نے ہی میرے اختیارات میں مداخلت کی ہے۔میں ناجائز تجاوزات کا سامان اٹھا کرلایا۔انہوں نے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے ازخود وہ سامان لوگوں کو غیر قانونی طور پر واپس کر دیا۔اب آپ بتائیں کہ زیادتی کس نے کی؟اور معافی کس کو مانگنی چاہیے۔'' یہ باتیں سن کر سینئر مجسٹریٹ صاحب نے ڈپٹی میئر صاحب کی طرف دیکھا۔میں نے بھی ڈپٹی میئر صاحب کی آنکھوں میں جھانکا۔ان کی آنکھوں سے شرمندگی سی عیاں تھی۔لیکن زبان سے اپنی غلطی اور غیر قانونی حرکت کا اعتراف کرنے کو تیار نہ تھے۔اس پر سینئر مجسٹریٹ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے، کہنے لگے،''چودھری صاحب پچھلی باتوں پر مٹی ڈالیں۔آئندہ ہم سب مل کر کام کریں گے''۔دوسرے لفظوں میں سینئر مجسٹریٹ صاحب نے ڈپٹی میئر صاحب کا ساتھ دیتے ہوئے یک طرفہ اور بدنیتی پر فیصلہ سناتے ہوئے انہیں باعزت بری کر دیا۔کیوں کہ ان میں اتنی اخلاقی جرات نہیں تھی کو وہ حق سچ کا ساتھ دیتے۔ان کو کم از کم ایک دفعہ تو ڈپٹی میئر صاحب کو احساس دلانا چاہیے تھا کہ انہوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا۔لیکن وہ میرے لیے کیوں اپنی نوکری خراب کرتے۔اپنی نوکری خراب کرتے بھی کیسے! وہ ریاست کے ملازم تھوڑے تھے، وہ تو ڈپٹی میئر صاحب کے ذاتی ملازم بنے ہوئے تھے۔پھر ڈپٹی میئر صاحب سینئر مجسٹریٹ صاحب بہادر سے فرمانے لگے،''یار یہ شیزان والوں کا بڑا دماغ خراب ہے۔(مشہور زمانہ شیزان فیکٹری بندروڈ پر واقع تھی اور زون نمبر آٹھ کی حدود میں تھی) ان کا کوئی بندوبست کرو۔میری طرف متوجہ ہوکر:''کل آپ بھی ان کے ساتھ جائیں گے تا کہ آپ کو بھی تجربہ حاصل ہو''۔میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ان دنوں لاہور کے شہری علاقوں سے مویشیوں کی شہر بدری کی مہم زوروں پر تھی اور اس کے لیے ہفتے میں کم از کم ایک دفعہ ہر زون کو سپیشل پولیس فورس بھی ملتی تھی۔اس سلسلہ میں ٹاؤن ہال سے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ایک شیڈول بھی جاری ہوتا تھا۔ شیڈول کے مطابق میرے زون میں ایک دن بعد سپیشل پولیس فورس مہیا کی جاتی تھی۔ میں نے پھر سٹاف کی میٹنگ کال کی۔ متعلقہ سینئر ملازم سے پوچھا کہ مویشیوں کے انخلا کے لیے کیا حکمت عملی اپنائی جاتی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہم لوگ ایک دن پہلے خفیہ سروے کرتے ہیں، جس علاقہ میں مویشیوں کی موجودگی کا علم ہو جائے اگلے دن وہاں ریڈ کر کے مویشی پکڑ لیے جاتے ہیں اور ان کو ایم سی ایل کے کانجی ہاؤسز میں بند کر دیا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ان کا چارہ وغیرہ کہاں سے آتا ہے تو جواب ملا، ''سر! سنا ہے کہ پہلے تو چارے کے لیے ہر زون کو بجٹ ملا کرتا تھا لیکن کافی عرصہ ہو گیا ہے اس حوالے سے کوئی بجٹ زونز کو نہیں دیا جاتا۔ اب سر! مویشی مالکان اپنے بند شدہ مویشیان کے لیے خود ہی چارے کا بندوبست کرتے ہیں''۔

میں نے پھر پوچھا کہ بند شدہ مویشیوں کو حوالہ مالکان کرنے کے لیے کیا طریقہ کار ہے؟ تو اسی شخص نے مجھے بتایا، ''سر! یہاں پر اس سلسلہ میں دو طریقے رائج ہیں: ایک طریقہ یہ ہے کہ مویشی مالکان ایم سی ایل کی طرف سے مقرر کردہ جرمانہ۔ مبلغ دو ہزار روپیہ فی بڑا جانور اور مبلغ ایک ہزار روپیہ فی چھوٹا جانور۔ خزانہ سرکار میں جمع کروا کر اپنے اپنے مویشی واپس لے جاتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مویشی مالکان لاہور ہائی کورٹ میں ایک رٹ دائر کرتے ہیں۔ وہاں سے ہائی کورٹ کا ایک حکم نامہ لے کر واپس آتے ہیں جس میں تحریر ہوتا ہے کہ مویشی مالکان سے مبلغ پانچ صد روپیہ فی بڑی شاخ اور مبلغ دو صد پچاس روپیہ فی چھوٹی شاخ وصول کر کے مویشیوں کو حوالہ اصل مالکان کر دیا جائے۔ ہم مذکورہ جرمانہ وصول کر کے مویشیان حوالہ اصل مالکان کر دیتے ہیں''۔

پھر میں نے دریافت کیا کہ کل کہاں ریڈ کرنی ہے؟۔ تو کہنے لگا، ''جہاں آپ حکم کریں گے''۔ میں نے کہا، ''بھائی میں تو یہاں نیا آیا ہوں آپ لوگوں کو سب پتہ ہوگا کن کن علاقوں میں کون کون سے لوگوں نے شہری حدود میں مویشی پال رکھے ہیں۔ آپ خود ہی مجھے تجویز دیں''۔ متعلقہ ملازم کہنے لگا، ''سر! ہم آج سروے کر لیتے ہیں۔ کل صبح ریڈ کر کے مویشی پکڑوا دیں گے''۔ وہ تو مجھے کافی دیر بعد پتہ چلا کہ یہ لوگ صرف ان لوگوں کے مویشی پکڑواتے ہیں جو ان کو منتھلی نہیں دیتے۔ ایسے لوگوں کے مویشی بار بار اس وقت تک پکڑواتے رہتے ہیں جب تک کہ یہ لوگ مجبور ہو کر منتھلی دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں اور جن کی طرف سے منتھلی آتی ہے ان کو بروقت ریڈ کی اطلاع کر دیتے ہیں۔ ایسے مویشی مالکان اپنے مویشیوں کو بروقت کہیں اور لے جاتے ہیں اور ریڈ ناکام ہو جاتی ہے۔ میں نے اس شخص سے سوال کیا کہ وہ اس زون میں کب سے ہے؟ اس نے بتایا اس کو زون نمبر آٹھ میں پوسٹ ہوئے تقریباً تین سال ہو گئے ہیں۔ تو میں نے پھر اس سے پوچھا کہ کیا آپ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس تین سال کے عرصہ کے دوران زون میں مویشی رکھنے والے تمام لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کی گئی ہے؟ کہنے لگا: ''سر! ایسا تو ممکن نہیں ہے۔ سیاسی دور ہے۔ اس زون میں دو تین کونسلرز نے بھی سینکڑوں کی تعداد میں مویشی پال رکھے ہیں۔ ان کے خلاف کبھی کسی افسر نے کارروائی کرنے کی جرات نہیں کی۔ کیوں کہ وہ جناب ڈپٹی میئر صاحب کے گروپ کے ہیں۔ حکومتی پارٹی کے ہیں۔ جناب ڈپٹی میئر صاحب نے بھی ان کے خلاف کارروائی کرنے سے منع کر رکھا ہے''۔ میں نے اسے کہا، ''بھئی! یہ تو ناانصافی نہیں ہے؟۔ کیا ایک منصف مزاج افسر کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ بے سہارا لوگوں کے خلاف تو بھاگ بھاگ کر قانونی کارروائی کرتا پھرے اور طاقتور لوگوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں موند لے؟ مجھ سے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں یا تو یہ کام کروں گا ہی نہیں۔ اگر کروں گا تو قانون شکنی کرنے والے تمام لوگوں کے خلاف کارروائی کروں گا''۔

وہ چپ ہو گیا۔ تھوڑا رکا اور پھر کہنے لگا، ''سر! میں نے آپ کو اصل صورتحال سے آگاہ کر دیا ہے۔ آپ جو بھی حکم دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ میں تو پھر آپ سے یہ عرض کروں گا جس طرح سے پہلے کام چل رہا ہے آپ بھی ویسے ہی چلائیں۔۔ سر! ان سیاستدانوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ یہ اپنے مفادات کے لیے سارے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ جب ایمانداری سے اور میرٹ پر کام کرنے والے کسی افسر پر کوئی مشکل آتی ہے تو اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے سر پر جو بھی آفت آتی ہے وہ خود ہی اور اکیلا ہی بھگتتا ہے۔ اس کے ساتھ انصاف کرنے والا کوئی نہیں ہوتا''۔

میں نے کہا، ''کوئی بات نہیں۔ میرا تو یہ عقیدہ اور ایمان ہے جو انصاف کرتا ہے اللہ کی ذات بھی اس کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دیتی۔ اس کو سرخرو کرتی ہے''۔ پھر میں نے اسے کہا، ''آپ یوں کریں کہ آج رات کو آپ مجھے وہ سارے باڑے دکھا دیں جن کے خلاف کبھی قانونی کارروائی نہیں ہوئی۔ ہم کل ان کے خلاف کارروائی کریں گے۔ لیکن یہ بات میرے اور آپ کے درمیان رہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو''۔ وہ کافی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ بولا، ''سر! ساری جگہوں کا تو مجھے معلوم نہیں ہے۔ ہمارا ایک گینگ مین ہے۔ کافی لمبے عرصے سے اس زون میں ہے۔ میں اس کو بلا لوں گا۔ اس کو تمام جگہوں کا پتہ ہوگا۔ وہ ہمیں مکمل ریکی کروا دے گا''۔ خیر، میں طے شدہ پروگرام کے مطابق شام کو علاقہ میں گیا۔ یہ دو ملازم اور میرا سرکاری ڈرائیور میرے ساتھ تھا۔ انہوں نے مجھے پوری ریکی کروا دی۔ میں نے ان دونوں سے پھر کہا: ''بھائی اس راز کو راز ہی رکھنا۔ کل صبح ہم ان بااثر لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کریں گے۔ ان کے مویشیوں کو پکڑ کر کانجی ہاؤس میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بند کریں گے''۔ انہوں نے بڑی اونچی آواز سے انشاءاللہ کہا۔ اگلے دن علی الصبح پولیس فورس بھی پہنچ گئی۔ پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور کوئی بیس کے لگ بھگ ماتحت اہلکاران شامل تھے۔ پولیس کی ایک بس بھی تھی جس میں سارے پولیس والے سوار ہو کر آئے تھے۔ یہ میری سروس کی ''انخلائے مویشیاں'' کی پہلی مہم تھی۔ میں بڑا پرعزم تھا کہ آج بااثر لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کر کے انصاف کا بول بالا کروں گا اور اہل علاقہ کو بتاؤں گا کہ قانون کی نظر میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میرے اپنے ہی میرے نشیمن پر بجلی گرا دیں گے۔

ہم مع پولیس دفتر سے روانہ ہوئے۔ کارپوریشن کا پورا عملہ ساتھ تھا۔ پہلے موقع پر پہنچے تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ اس باڑے میں ایک بھی مویشی نہیں تھا بلکہ وہ باڑا اتنی احتیاط سے صاف کیا گیا تھا کہ لگتا تھا کہ وہاں کوئی مویشی کبھی قریب بھی نہیں پھٹکا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی جگہ ہے جس میں ایک دن پہلے شام کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر گیا تھا۔ میں نے اپنی پریشانی کا کسی کو احساس نہ ہونے دیا۔ سوچا کہ دوسری جگہ چلتے ہیں۔ وہاں ہماری ریڈ کامیاب ہو جائے گی۔ تمام لوگوں کو لے کر دوسری جگہ پہنچا۔ وہاں کا حال بھی پہلے والی جگہ سے مختلف نہ تھا۔ مکمل صفائی ستھرائی۔ مویشیوں کا نام ونشان نہ تھا۔ کسی مہربان نے اپنے مہربانوں کو بروقت اطلاع دے کر ان کی عزت بچا لی تھی۔ مجھے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی تھی اور پریشانی بھی۔ میں نے تیسری جگہ جانے کا اردہ ترک کر دیا اور واپس دفتر کی راہ لی۔ اس دن میں کوئی مویشی نہ پکڑ سکا لیکن اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ جب تک میں اس زون میں تعینات رہا ان نام نہاد بااثر لوگوں کو اپنے گھروں میں مویشی رکھنے کی جرات نہ ہوئی۔

واپسی پر ہم لوگ ایک گلی سے گزر رہے تھے تو کیا دیکھا کہ کسی نے اس گلی میں ہی ایک عدد بھینس اور اس کا کٹا باندھ رکھا ہے۔ چونکہ ہم نکلے ہی انخلائے مویشیاں کی مہم پر تھے اس لیے یہ تو مناسب نہیں تھا کہ مویشی دیکھے بھی جائیں اور ان کو چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ میرے حکم پر اس بھینس اور کٹے کو قبضہ میں لے لیا گیا۔ میں نے سٹاف کو حکم دیا کہ ان مویشیان کو کانجی ہاؤس میں بند کر کے دفتر واپس آ جائیں۔ میں دفتر میں جا کر بیٹھا سوچ رہا تھا ''مخبری'' کرنے والا گھٹیا ملازم کون ہو سکتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ، اس کا بلایا گیا گینگ مین یا میرا سرکاری ڈرائیور؟ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ میرے کمرے میں بعد از اجازت داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی تھا۔ میرے ساتھ ان دونوں نے ریڈ کی ناکامی کا افسوس کیا۔ میں نے کہا: ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، سیانے کہتے ہیں کہ مارنے سے ڈرانا بہتر ہے۔ میرا مقصد صرف مویشیوں کو پکڑنا نہیں، انہیں شہری حدود

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے باہر نکالنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں''۔

اب میرے خلاف سیاسی سازشوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے دونوں اہلکار کہنے لگے''سر! آپ سے ایک گزارش کرنی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔ ہم بڑے مان سے آپ کے پاس آئے ہیں''۔ میں نے کہا بتائیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کہنے لگے:''سر! آپ چونکہ نئے نئے آئے ہیں۔ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم آپ کو گائیڈ کریں۔ آپ ہمارے باس ہیں۔ آپ کی عزت ہماری عزت ہے''۔ میں نے انہیں ٹوکا اور کہا:'' آج تو آپ نے میری بڑی ''عزت افزائی'' کی ہے۔'' کہنے لگے:''سر ہم خود بھی بہت پریشان ہیں۔ پہلے اس زون میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہم ڈھونڈ رہے ہیں کہ یہ بے غیرتی کس نے کی ہے، آپ تھوڑا سا وقت دیں ہم وہ غدار ڈھونڈ کر آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ میں نے کہا اصل مدعا بیان کرو۔ سپرنٹنڈنٹ کہنے لگا:''سر! دراصل جو دو عدد جانور ہم نے واپسی پر پکڑے ہیں وہ اس اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے قریبی عزیزوں کے ہیں۔ غریب لوگ ہیں۔ اس بھینس کے علاوہ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ یہ بے چارے اسی بھینس کا دودھ بیچ کر اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ ان کے پاس جرمانہ ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ آپ مہربانی فرمائیں اور ان جانوروں کو بغیر جرمانہ لیئے چھوڑ دیں''۔ میں نے کہا بھائی یہ کیسے ممکن ہے کہ میں بغیر جرمانہ لئے مویشی چھوڑ دوں۔ کیا یہ غیر قانونی نہیں ہوگا؟ کہنے لگا۔''سر! مویشیوں کا مالک بہت ہی غریب آدمی ہے، اس میں جرمانہ مبلغ تین ہزار ادا کرنے کی سکت نہیں۔ اس کے پاس صرف دو ہزار روپے ہیں۔ اگر آپ حکم کریں تو ہم ایک بھینس کا جرمانہ مبلغ دو ہزار روپے لے لیں اور کٹا بغیر جرمانے کے چھوڑ دیں''۔ مجھے بھی ان کی باتیں سن کر ترس آ گیا اور ان کی اس بات سے اتفاق کر لیا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ ترس کھا کر کٹا چھوڑ دینے پر ایک نیا کٹا کھل جائے گا۔

تین چار دن گزرے ہوں گے کہ مجھے عرفان الٰہی، سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) کا فون آ گیا اور حکم دیا کہ کل صبح دفتر جانے سے پہلے میرے دفتر میں آئیں۔ میں نے کہا:''سر ٹھیک ہے۔ حکم کی تعمیل ہوگی''۔ مجھے ایم سی ایل میں تعینات ہوئے تقریباً ایک ماہ ہی گزرا ہوگا۔ سی سی او صاحب سے زیادہ علیک سلیک نہ تھی۔ اس طرح بلانے کی وجہ کیا ہے؟۔ میں ان سے نہ پوچھ سکا۔ دل و دماغ میں طرح طرح کے خیال آتے رہے۔ بالآخر رات جیسے تیسے گزر ہی گئی اور میں اگلے دن دیئے گئے وقت پر جناب سی سی او صاحب کے دفتر واقع ٹاؤن ہال، لاہور جا پہنچا۔ سی سی او صاحب اپنے دفتر میں موجود تھے۔ ان سے اجازت لے کر ان کے دفتر میں داخل ہوا اور ان کے سامنے رکھی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت کچھ فائلیں دیکھ رہے تھے۔ فارغ ہوئے تو میری طرف متوجہ ہوئے۔ میرا حال احوال پوچھنے کے بعد کہنے لگے،'' کیسا کام چل رہا ہے زون میں؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟''۔ میں نے عرض کی:'' سر! کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اپنا کام ٹھیک طریقے سے کر رہا ہوں۔ نیا نیا آیا ہوں۔ کام سیکھ رہا ہوں''۔ مجھے اس طرح مطمئن دیکھ کر حیرانی سے کہنے لگے'' آپ کو کوئی مسئلہ نہیں ہے؟ ڈپٹی میئر صاحب تو آپ کی بہت شکایات کرتے رہتے ہیں''۔ میں نے کہا:'' سر! وہ بزرگ آدمی ہیں۔ ان کو پتہ نہیں کیوں شکایت ہے مجھ سے؟ مجھے تو ان سے کوئی شکائت نہیں''۔ دراصل میں شروع دن سے ہی اس بات کا قائل تھا کہ افسران بالا کو خواہ مخواہ شکایات کرنے والا افسر نااہل ہوتا ہے۔ اس میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اچھا منتظم وہ ہوتا ہے جو اپنے سینئر کو کم سے کم امتحان میں ڈالے۔ کم سے کم شکایات کرے۔ تمام پیش آمدہ مسائل کا خود حل تلاش کرے۔ اسی وجہ سے میں نے جناب سی سی او صاحب سے جناب ڈپٹی میئر صاحب کی کوئی شکایت نہ کی۔ مجھے اپنے آپ پر یقین تھا کہ مجھ میں اللہ کی مہربانی سے حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ میں حالات پر قابو پالوں گا۔

سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) نے پہلے تو میری طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہنے لگے'' آپ کو یہاں آئے ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی پورا نہیں ہوا، لیکن آپ کی کرپشن کی شکایات آنا شروع ہوگئی ہیں''۔ میں ان کی یہ بات سن کر بہت حیران ہوا۔ ان سے کہا،'' سر ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے قطعاً کوئی کرپشن نہ کی ہے اور ہی نہ میں نے کبھی ایسا سوچا ہے''۔ کہنے لگے،'' میرے پاس ثبوت ہیں۔ اگر آپ کے خلاف کرپشن کے الزامات ثابت ہوگئے تو؟'' میں بڑا ہی مطمئن تھا۔ ان کی طرف سے یہ چیلنج سن کر میرے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ جذباتی ہوگیا۔ میں نے کہا:'' سر! اگر میرے خلاف کوئی بھی کرپشن کا الزام ثابت ہوجاتا ہے تو میں اسی وقت نوکری سے استعفےٰ دے دوں گا''۔

سی سی او صاحب میری اس دیدہ دلیری پر بہت حیران اور پریشان ہوئے۔ پہلے تو مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا، پھر کہنے لگے'' آپ کو پتہ ہے کہ آپ کتنی بڑی بات کر رہے ہو۔ آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ سی ایس ایس یا پی سی ایس کا امتحان پاس کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور آپ اتنا بڑا دعویٰ کر رہے ہیں''۔ میں نے کہا'' سر! آپ درست فرما رہے ہیں۔ واقعی میں بڑے سخت ترین امتحانات سے گزر کر ہی پی سی ایس افسر بنا ہوں لیکن میں جو دعویٰ کر رہا ہوں نہایت سوچ سمجھ کر بقائمی ہوش وحواس کر رہا ہوں۔ میں نے کوئی کرپشن نہیں کی۔ میرا دامن اللہ کے فضل وکرم سے اس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

طرح کی تمام آلودگیوں سے پاک ہے''۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ جناب سی سی او صاحب نے اپنی دراز کھولی اور ایک فائل میرے سامنے رکھ کر کہنے لگے،''اس درخواست میں دیکھو کیا لکھا ہوا ہے؟''۔ میں نے فائل کھولی۔ اسے پڑھا۔ درخواست/ شکایت کے مندرجات کچھ اس طرح تھے:

''جناب (چیف کارپوریشن افسر) میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور۔ جناب عالی! گزارش ہے کہ ہم معزز شہری ہیں اور علاقہ زون نمبر آٹھ میں رہائش پذیر ہیں۔ آپ کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف دلانا چاہتے ہیں۔ اس زون میں آپ نے ایک افسر عبدالغفور چودھری نام کا تعینات کیا ہوا ہے۔ اس نے لوگوں کا جینا محال کر دیا ہے۔ کوئی کام رشوت کے بغیر نہیں کرتا۔ لوگوں کا سامان اٹھا کر لے جاتا ہے اور پیسے لے کر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی کوئی رسید جاری نہیں کرتا۔ لوگوں کے مویشی بھی پکڑ کر لے جاتا ہے۔ جرمانہ وصول کرتا ہے لیکن اس کی بھی رسید جاری نہیں ہوتی۔ پچھلے دنوں اس نے چوک یتیم خانہ میں ریڈ کی۔ ناجائز تجاوز کنندگان کا دو ٹرک سامان اٹھایا اور بعد میں سارا سامان لوگوں سے پیسے لے کر واپس کر دیا اور کسی بھی شخص کو کوئی رسید جاری نہ کی۔ اس کے علاوہ دو تین دن پہلے سمن آباد کے علاقہ سے ایک عدد بھینس اور ایک عدد کٹا پکڑا۔ مالک انتہائی غریب آدمی تھا۔ اس سے مبلغ دو ہزار روپیہ جرمانہ لے کر مویشی چھوڑ دیئے اور کوئی سرکاری رسید نہ جاری کی گئی۔ استدعا کی جاتی ہے کہ اس افسر کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جائے اور زون نمبر آٹھ کے لوگوں کی اس سے جان چھڑوائی جائے۔ العارض۔ اہل علاقہ زون نمبر آٹھ۔ میٹروپولیٹن کارپوریشن، لاہور۔''

سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) بظاہر تو کام میں مشغول ہو گئے لیکن وہ میرے چہرے کے تاثرات کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے جب پوری درخواست پڑھ لی تو انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا،''سر! یہ سب کچھ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جو قابل گرفت ہو۔ میں نے چوک یتیم خانہ سے سامان ضرور اٹھایا تھا اور ساتھ ہی دو یونین اہلکاران کے خلاف مقدمہ بھی درج کروایا تھا۔ جس کی وجہ سے ڈپٹی میئر صاحب میرے ساتھ سخت ناراض بھی ہوئے تھے۔ اور وہ سارا سامان ڈپٹی میئر صاحب نے ہی لوگوں کو دیا تھا اور میں نے کسی شخص کو کوئی جرمانہ نہیں کیا تھا۔ باقی رہا مویشیوں کا معاملہ تو سر! میں نے ایک بھینس اور ایک کٹا پکڑا تھا۔ ان کا مالک میرے دفتر کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کا رشتہ دار تھا۔ مجھے اس نے ہی گزارش کی تھی کہ ان جانوروں کا مالک بڑا غریب آدمی ہے۔ کٹے کا جرمانہ نہ لیا جائے۔ میں نے ان کی درخواست پر مبلغ دو ہزار جرمانہ وصول کر کے جانوروں کو چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ رسید سٹور کیپر نے جاری کرنی تھی۔ اس نے یقیناً جاری کر دی ہوگی''۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس پرسی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) نے پھر سے مجھے پوچھا کہ آپ نے جو استعفاوالی پھڑ ماری ہے اس پر ابھی تک قائم ہیں؟'' میں نے جواب دیا، جی سر! میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں''۔ سی سی او صاحب نے پھر پوچھا" جب ڈپٹی میٹر صاحب نے لوگوں کو سامان واپس کرنے والا غیر قانونی کام کیا تو آپ نے اس کی تحریری یا زبانی رپورٹ کسی کو کی؟ اور دوسرا آپ نے رسید بک چیک کی تھی؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو کہنے لگے، ''سمندر میں رہ کر اگر مگر مچھ سے بیر رکھنا ہوتو پھر آنکھیں اور کان کھول کر چلنا پڑتا ہے۔ ماتحتوں پر اندھا اعتماد نہیں کرتے اور اس طرح کے غیر قانونی معاملات (ڈپٹی میٹر والے) کی تحریری رپورٹ اپنے افسران بالا کو کر دیتے ہیں۔ آپ کو یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ اس درخواست کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ میں یہ انکوائری ریاض احمد ریاض، جو یہاں پر سینئر مجسٹریٹ ہیں کو مارک کر رہا ہوں۔ آپ ان کے پاس جا کر اپنی بے گناہی ثابت کریں اور سنو اتنے بڑے بڑے دعوے نہیں کرتے اور ہاں محتاط رہنا۔ آئندہ آپ کی اس طرح کی کوئی شکایت نہ آئے''۔ میں انہیں سلام کر کے ان کے دفتر سے نکلا اور اپنے دفتر آ گیا۔

دفتر پہنچتے ہی میں نے سٹور کیپر کو مع رسید بک بلایا۔ وہ حاضر ہوا۔ میں نے پوچھا کہ رسید بک کیوں نہیں لے کر آئے؟ کہنے لگا، ''سر! رسید بک تو جناب ڈپٹی میٹر صاحب نے کافی دن پہلے منگوا لی تھی۔ میں کافی دفعہ ان کے پاس رسید بک لینے گیا ہوں لیکن وہ ٹال دیتے ہیں''۔ پھر میں نے پوچھا کہ وہ جو دو ہزار روپیہ بھینس کا جرمانہ تھا اس کو خزانہ سرکار میں جمع کروا دیا ہے کہ نہیں؟ کہنے لگا سر وہ تو میں نے جمع نہیں کروائے۔ وہ تو میرے پاس ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ تم نے کیوں نہیں جمع کروائے؟ یہ تو سیدھی خرد برد ہے۔ تمہارے خلاف قانونی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔ کہنے لگا، ''سر! رسید بک تو ڈپٹی میٹر صاحب کے پاس تھی۔ وہ مجھے دے نہیں رہے تھے۔ میں رسید کاٹتا تو رقم خزانہ سرکار میں جمع کرواتا''۔ میں نے اسے کہا کہ خزانہ سرکار میں رقم جمع کروانے کے لیے رسید کا کاٹا ہونا ضروری تو نہیں۔ تم رقم بینک میں جمع کروا دیتے اور رسید بعد میں کاٹ لیتے۔ کہنے لگا، ''سر! یہ تو دو ہزار روپے ہیں۔ یہاں پر تو لاکھوں کی رقم ہم اپنے پاس رکھتے ہیں۔ جب دل چاہتا ہے بینک میں جمع کروا دیتے ہیں۔ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟'' میں نے کہا بھائی یہ تو غیر قانونی حرکت ہے۔ اس طرح سرکار کے پیسے اپنے پاس رکھنے سے سرکاری ملازم ضابطے کے تحت خرد برد کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ تم نے تو اس جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ تم ابھی جاؤ اور ڈپٹی میٹر صاحب سے رسید بک واپس لے کر آؤ''۔ وہ تھوڑی دیر بعد واپس آیا پھر کہنے لگا ''سر! ڈپٹی میٹر صاحب نے رسید بک دینے سے انکار کر دیا ہے اور ساتھ مجھے یہ بھی بتایا کہ آپ کے سیکرٹری/مجسٹریٹ صاحب کے خلاف ایک شکایت کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) کے پاس آئی ہوئی ہے جس میں بھینس والے دو ہزار روپے کا ذکر ہے جس کی نہ تو ابھی تک کوئی رسید کٹی ہے اور نہ ہی وہ رقم خزانہ سرکار میں جمع ہوئی ہے"۔

میں نے اس اہلکار سے کہا اس جرم کی کارروائی تو آپ کے خلاف بنتی ہے۔ میں نے تو درخواست پر حکم جاری کیا تھا کہ سائل سے مبلغ دو ہزار روپیہ جرمانہ وصول کر کے بھینس حوالہ اصل مالک کی جائے۔ رسید تو آپ نے کاٹنا تھی اور جرمانہ بھی خزانہ سرکار میں جمع کروانے کی ذمہ داری آپ کی تھی"۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی پریشانی کے آثار نہیں تھے۔ کہنے لگا، "سر! آپ پریشان نہ ہوں میں ڈپٹی میئر صاحب سے بات کرتا ہوں۔ میرے ان کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ رات کو میں ان کے ڈیرے پر ہی ہوتا ہوں۔ ہم مل کر تاش بھی کھیلتے ہیں۔ ابھی تو نہیں بات نہیں کر سکتا۔ ان کے پاس کافی لوگ بیٹھے ہیں۔ میں شام کو ان سے بات کر لوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) سے بھی بات کر لیں گے۔ وہ سی سی او صاحب کے بڑے اچھے دوست ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مذکورہ درخواست پر آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی"۔ میں حیرانی سے اس کا منہ تک رہا تھا کہ وہ کس طرح کی باتیں کر رہا ہے۔ میں نے اسے سختی سے کہا "ڈپٹی میئر صاحب سے میری سفارش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سارے معاملے میں میرا کیا قصور ہے؟ اگر قصور ہے تو آپ کا ہے۔ میں انکوائری کا سامنا کر لوں گا لیکن تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ (کیونکہ سٹور کیپر کے خلاف انضباطی کارروائی کرنے کا اختیار سی او صاحب کے پاس تھا)۔ یہ سب کچھ تمہاری اور ڈپٹی میئر کی ملی بھگت سے ہوا ہے۔ اگر ڈپٹی میئر صاحب نے رسید بک منگوائی تھی تو تم نے پہلے کیوں نہ مجھے بتایا؟ ڈپٹی میئر کا رسید بک سے کیا تعلق ہے؟ کب منگوائی تھی انہوں نے رسید بک؟" کہنے لگا: سر! جس دن آپ نے بھینس کا جرمانہ کیا تھا انہوں نے اسی دن مجھ سے رسید بک لے لی تھی اور مجھے رسید کاٹنے سے منع بھی کر دیا تھا"۔

میں نے اس سے پوچھا، "کیا یہ سارا بیان تم انکوائری افسر کے سامنے دے سکتے ہو؟"۔ کہنے لگا، "سر! میں ڈپٹی میئر کے خلاف کیسے بیان دے سکتا ہوں، انہوں نے ہی تو مجھے نوکری دلوائی تھی، اسی لیے تو میں ان کے ڈیرے پر روزانہ حاضری دے کر نمک حلال ہونے کا ثبوت دیتا ہوں۔ سر! جو بات میں نے آپ کو بتائی ہے اگر آپ کسی کے سامنے اس کا ذکر بھی کریں گے تو میں صاف مکر جاؤں گا۔ کبھی ڈپٹی میئر صاحب کے خلاف بیان نہیں دوں گا"۔ پھر کہنے لگا، "سر! آپ میرے افسر ہیں۔ مہربان ہیں۔ نئے نئے افسر بنے ہیں۔ آپ کا تجربہ بہت کم ہے لیکن سر! اگر آپ حکم کریں تو میں آپ کی ایک مدد کر سکتا ہوں۔ آپ کی ساری پریشانی دور ہو جائے گی اور آپ زون میں حکمرانی کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مزے لوٹیں گے''۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟ کہنے لگا ''سر! میں آپ کی ڈپٹی میئر صاحب سے صلح کروا دیتا ہوں۔ وہ میری کسی بھی بات کو نہیں ٹالتے۔ سینئر سپیشل مجسٹریٹ صاحب کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ وہ اس زون میں کس طرح انجوائے کر رہے ہیں؟''۔

سٹور کیپر کی باتیں سن کر میں حقیقت میں پریشان ہو گیا کہ جناب ڈپٹی میئر صاحب انتقام میں اندھے ہو کر کس حد تک گر گئے ہیں؟ وہ کس طرح کے گھٹیا ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں؟ ان کے پاس ایسی گھٹیا حرکت کا کیا اخلاقی جواز ہے؟ ان کو ذرہ بھر احساس نہیں ہے کہ وہ ایک کیریر افسر کے خلاف ایسی گھٹیا حرکات صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ میرٹ کی بات کرتا ہے۔ جو نہ تو خود کسی کے اختیارات میں تجاوز کرتا ہے اور نہ دوسروں کی اپنے اختیارات میں مداخلت قبول کرتا ہے۔ میں نے سٹور کیپر کو سختی سے منع کر دیا کہ میرے حوالے سے ڈپٹی میئر صاحب سے کوئی بات نہ کرے۔ کیوں کہ میں حق پر تھا۔ اور مجھے یقین کامل تھا کہ اللہ کی ذات حق پرستوں کا ساتھ دیتی ہے۔ پھر خیال آیا کہ آرڈر شیٹ جس پر میں نے جرمانہ کیا تھا میری صفائی اور بے گناہی ثابت کرنے کے لئے وہی کافی ہے۔ میں انکوائری افسر کے سامنے اسے پیش کروں گا تو مجھے بری کر دیا جائے گا۔ کیونکہ افسر کے ذمہ حکم نامہ جاری کرنا ہوتا ہے۔ جرمانہ وصول کر کے اسے خزانہ سرکار میں جمع کروانا متعلقہ اہل کار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ سٹور کیپر کو حکم دیا گیا کہ وہ درخواست سائل اور آرڈر شیٹ پیش کرے۔ لیکن سٹور کیپر کہنے لگا کہ سر! وہ بھی ڈپٹی میئر صاحب کے پاس ہے۔ میں نے اسے کہا کہ جائے اور ان سے وہ دستاویزات لے کر آئے۔ وہ گیا اور حسب معمول خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ اور متوقع طور پر اس کا وہی جواب تھا کہ ڈپٹی میئر صاحب وہ دستاویزات نہیں دے رہے۔

ساتھ ہی ان کا پیغام بھی دیا کہ اگر آپ کو کوئی چیز چاہیے تو ان سے بات کر لیں۔ یعنی یہ سارا چکر صرف اور صرف مجھے نیچا دکھانے کے لیے چلایا جا رہا تھا۔ مجھے ڈپٹی میئر صاحب سے صلح کرنے پر مجبور کرنے کے لیے یہ سارا تانا بانا بنا جا رہا تھا۔ میرا ڈپٹی میئر صاحب سے کوئی جھگڑا تو تھا ہی نہیں۔ بات صرف اصول کی تھی۔ وہ میرے اختیارات غیر قانونی طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ میں سروس میں نیا نیا آیا تھا۔ پریشان ہو گیا۔ میں نے تو کبھی ایسا تصور بھی نہ کیا تھا۔ میرا دماغ ماؤف ہونے کے قریب تھا۔ میں اکیلا تھا اور میرے ارد گرد عبداللہ بن ابی کے پیروکاروں کا ایک جتھہ تھا۔ کسی کو کیا بتاؤں کہ سروس شروع کرتے ہی مجھ پر دو ہزار روپے رشوت لینے کا الزام لگ گیا ہے۔ اسی پریشانی کے عالم میں اللہ کو پکارا۔ دعا مانگی، اے غیب کا علم جاننے والے۔ میں آزمائشوں کے قابل نہیں ہوں۔ مجھ پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔ میری غیب سے مدد فرما۔ اچانک دل میں خیال

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آیا کہ کیوں نہ سی سی او صاحب سے مل کر تمام حقائق ان کے گوش گزار کیے جائیں۔ دفتری فون اٹھایا۔ ٹیلیفون آپریٹر سے کہا کہ وہ میری سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) سے بات کروائے۔ تھوڑی دیر میں ہی میری بات ہوگئی۔ میں نے سی سی او صاحب سے کہا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ پوچھنے لگے، ''خیریت تو ہے۔ کوئی نیا چن تو نہیں چڑھا دیا زون میں؟'' ان کے اس رویے سے مجھے تشویش تو بہت ہوئی لیکن میں نے ہمت کر کے چارو ناچار ان سے کہہ ہی دیا کہ سر! میں مل کر آپ سے بات کرنا چاہوں گا۔ ملنے کی اجازت مرحمت فرما دی گئی اور اگلی صبح ساڑھے سات بجے ان کے دفتر میں حاضر ہونے کا شاہی فرمان جاری ہوا۔ میں اگلے دن وقت مقررہ پر سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) کے آفس میں تھا۔ میں سلام کر کے ان کے سامنے بیٹھا تو ان کے دیکھنے کے سٹائل سے ہی مجھے یوں لگا کہ شاید وہ مجھے ہی اس کیس میں قصوروار سمجھ رہے ہوں۔ پوچھنے لگے، ''خیریت تو ہے۔ تم پریشان لگ رہے ہو۔ کیا ہوا؟'' میں نے عرض کی، 'ڈپٹی میئر صاحب جان بوجھ کر مجھے تنگ کر رہے ہیں۔ انہوں نے رسید بک اپنے پاس رکھی ہوئی ہے۔ اور وہ آرڈر شیٹ بھی ان کے قبضے میں ہے جس پر میں نے بھینس کو بعد از ادائیگی جرمانہ چھوڑنے کا حکم صادر کیا تھے۔ اور سر! وہ جرمانے کی رقم مبلغ دو ہزار روپیہ ابھی تک سٹور کیپر کے پاس ہے۔ اس نے خزانہ سرکار میں جمع نہیں کروائی۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے پاس رسید بک ہی نہیں ہے، رسید کیسے کاٹے؟ اور بغیر رسید کے جرمانہ کیسے جمع کروائے؟ سر! اس نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ اسے ڈپٹی میئر صاحب نے رسید کاٹنے سے اور جرمانہ خزانہ سرکار میں جمع کروانے سے منع کیا ہے''۔ کہنے لگے: ''کیا وہ یہ بات انکوائری افسر کے سامنے کر دے گا؟'' میں نے کہا، سر! نہیں وہ یہ بات انکوائری افسر کے سامنے بالکل نہیں کرے گا۔

اس نے صاف انکار کر دیا ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میں اگر یہ بات کسی اور کو بتاؤں گا تو وہ صاف مکر جائے گا''۔ فرمانے لگے، ''یہ کیا بات ہوئی؟۔ مجھے تو ڈپٹی میئر صاحب نے یہ بتایا ہے کو وہ دو ہزار روپیہ آپ کے پاس ہے۔ سٹور کیپر اگر یہ بات کرتا ہے تو اسے سامنے آ کر کھل کر بات کرنی چاہیے۔ وہ آپ کا ماتحت ہے۔ ڈپٹی میئر کا تو نہیں۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائیں''۔ میں نے کہا: ''سر! ڈپٹی میئر صاحب جھوٹ بول رہے ہیں۔ رقم جرمانہ سٹور کیپر کے پاس ہے، میرے پاس نہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں دو ہزار کے لیے جھوٹ بولوں گا۔ سر! یہ میرے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔ ناانصافی ہے۔ بلیک میلنگ ہے ڈپٹی میئر صاحب کی۔ وہی یہ سارا کچھ کروا رہے ہیں۔ آپ بھی ہماری بات نہیں سنیں گے تو اور کون سنے گا؟''۔ سی سی او

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

صاحب میری باتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہے تھے۔ شاید ڈپٹی میئر صاحب سے تعلق کی لاج نبھا رہے تھے۔ کہنے لگے، ''آپ کے پاس دو آپشن ہیں: یا تو ڈپٹی میئر صاحب سے صلح کر لو یا انکوائری بھگتو۔ تیسرا کوئی آپشن نہیں ہے''۔ میں نے عرض کی، سر! ڈپٹی میئر صاحب سے میرا کوئی جھگڑا نہیں۔ صرف اصولوں کا جھگڑا ہے۔ کس بات کی صلح کروں ان کے ساتھ؟ اگر آپ بھی میری بات سننے کو تیار نہیں تو میں انکوائری کا سامنا کرلوں گا''۔ کہنے لگے: ''ٹھیک ہے جائیں اور انکوائری کا سامنا کریں''۔

میں سلام کر کے ان کے دفتر سے اٹھا اور سیدھا جناب ریاض احمد ریاض، جو اس وقت سینئر مجسٹریٹ تھے اور آج کل بطور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (جنرل) اوکاڑہ تعینات ہیں۔ موصوف نیک سیرت، نیک صورت انسان ہیں۔ صوم وصلوۃ کے پابند ہیں۔ ایمانداری اور دیانتداری کی تصویر ہیں۔ پوچھنے لگے: ''چودھری صاحب بڑے پریشان نظر آ رہے ہو۔ چنگے چودھری ہو، چودھری اور پریشانی! بات بنتی نہیں ہے۔ آپ کے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑی ہوئی ہیں۔ خیریت تو ہے؟''۔ میں نے کہا: ''سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) نے میرے خلاف ایک انکوائری آپ کو بھیجی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔'' انہوں نے گھنٹی بجائی۔ نائب قاصد حاضر ہوا۔ اسے کہہ کر میرے والی فائل منگوائی۔ بعد از ملاحظہ فائل میری طرف متوجہ ہوئے۔ پوچھنے لگے: ''اصل معاملہ کیا ہے؟ اس شکایت میں تو مجھے کوئی جان نہیں نظر آتی۔ شکایت کنندہ نے نہ تو اپنا نام لکھا ہوا ہے نہ کوئی ایڈریس ہے۔ یہ اہل علاقہ کیا ہوتا ہے؟ جس کو کوئی شکایت ہوتی ہے وہ سامنے آ کر بات کرتا ہے۔ ایسی درخواستیں قانون کے مطابق غیر قانونی ہوتی ہیں۔ نامعلوم مدعیان کی درخواستوں پر کوئی قانونی کاروائی نہیں بنتی۔ سی سی او صاحب بادشاہ آدمی ہیں۔ ان کو اس طرح کی درخواستوں کو از خود داخل دفتر کر دینا چاہیے۔ آپ بتائیں کہ اصل معاملہ کیا ہے؟'' میں نے حسب الحکم انہیں ''الف تا یے'' ساری کہانی سنا دی۔ بات سن کر وہ خود بھی پریشان ہو گئے۔ کہنے لگے: ''ڈپٹی میئر صاحب کی سی سی او صاحب سے بڑی گہری دوستی ہے۔ وہ تقریباً روزانہ ہی سی سی او صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ حکومتی پارٹی کے ہیں۔ لارڈ میئر اور شریف برادران سے بھی ان کے مراسم کافی گہرے ہیں لیکن آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ آپ سچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا۔ آپ جا کر سکون سے اپنا کام کرو۔ میں یہ درخواست داخل دفتر کر دوں گا۔ ہاں آپ اپنا تحریری بیان ایک دو دنوں میں کسی کے ہاتھ بھجوا دینا۔ میں ان کا شکریہ ادا کر کے سلام کر کے ان کے دفتر سے نکلا اور اپنے دفتر آ گیا۔ دفتر آ کر سٹور کیپر کو طلب کیا اور اسے حکم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دیا کہ وہ اپنا بیان لکھ کر دے کہ مبلغ دو ہزار روپیہ اس کے پاس ہے۔ رسید بک اور دیگر دستاویزات ڈپٹی میٹر کی تحویل میں ہیں۔ رسید بک موجود نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو اس نے رسید کاٹی ہے اور نہ ہی رقم خزانہ سرکار میں جمع کروائی ہے۔ لیکن سٹور کیپر نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگا،'' سر! میں آپ سے پہلے بھی گزارش کر چکا ہوں کہ میں ڈپٹی میٹر صاحب کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا۔ آپ میرے خلاف قانونی کارروائی کے لیے سی ای او صاحب کو تحریر کر دیں۔ میں انکوائری بھگت لوں گا''۔ اس کو چونکہ معلوم تھا کہ وہ ڈپٹی میٹر کا چہیتا ہے اور ڈپٹی میٹر کا سی سی او صاحب سے گہرا تعلق ہے۔ ان حالات میں اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ اس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی یہ باتیں سن کر میں نے سپرنٹنڈنٹ کو بلایا۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی کے لیے سی سی او صاحب کو ایک چٹھی تحریر کروائی۔ دستخط کیے اور ارسال کر دی۔ ساتھ ہی میں نے اپنا جواب لکھا اور سپرنٹنڈنٹ کو دیا کہ وہ اگلے دن جواب انکوائری افسر کے پاس جمع کروا آئے۔

کوئی پندرہ دن گزرے ہوں گے کہ جناب سردار ریاض احمد ریاض کا فون آیا کہ میں کسی اہلکار کو بھیج کر انکوائری رپورٹ کی کاپی منگوا لوں اور ساتھ ساتھ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے شکایت/ درخواست داخل دفتر فرما دی ہے یعنی مجھے بری کر دیا ہے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے: ''میرا نہیں اللہ کا شکر ادا کرو۔ خوش قسمت ہو کہ سی سی او صاحب نے آپ کے خلاف انکوائری میرے پاس بھیج دی۔ اگر یہی انکوائری کسی دیگر افسر کے پاس ہوتی۔ اگرچہ یہ سراسر جھوٹ پر مبنی تھی تو اس افسر نے اپنی نوکری سیدھی کرنے اور جناب سی سی او صاحب اور ڈپٹی میٹر کو خوش کرنے کے لیے آپ کے خلاف لکھ دینا تھا اور آپ کا کیریر خراب ہو جانا تھا۔ جب میری بریت کی خبر ڈپٹی میٹر تک پہنچی تو وہ اپنی ناکامی پر شرمندہ ہونے کی بجائے آگ بگولہ ہو گیا۔ گاڑی پکڑی اور سیدھا سی سی او صاحب (چیف کارپوریشن افسر) کے دفتر پہنچا۔ گلے شکووں کے انبار لگائے۔ سی ای او صاحب سے ناراضی کا اظہار کیا۔ شنید ہے کہ یہ بھی کہا کہ آپ نے اپنے افسر کو بچانے کے لیے انکوائری ریاض احمد ریاض کے سپرد کی۔ کیوں کہ سب کو معلوم تھا کہ موصوف بلا خوف و خطر، بغیر سیاسی یا بیوروکریٹک دباؤ قبول کیے انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے میرٹ پر فیصلہ کرتے ہیں۔ جب بات نہ بنی تو ڈپٹی میٹر میاں مشتاق احمد نے ایک ہفتے کے بعد ایک شکست خوردہ جرنیل کی طرح ایک اور چال چلی۔ مجھے سی ای او صاحب کا فون آیا۔ ان کا لہجہ بڑا تلخ تھا۔ کہنے لگے،'' چودھری صاحب آپ کی ایک اور شکایت آ گئی ہے۔ فلاں تاریخ کو شام کے وقت آپ کی زیر استعمال سرکاری جیپ بکر منڈی بند روڈ، لاہور میں موجود پائی گئی اور آپ نے وہاں پر لوگوں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سے بھتہ بھی وصول کیا اور اس کی کوئی رسید جاری نہ کی۔ ابھی تو مجھے زبانی شکایت موصول ہوئی ہے ایک آدھ دن میں تحریری شکایت میرے پاس پہنچ جائے گی۔ آپ باز کیوں نہیں آتے؟ آپ اب پھر نوکری سے استعفا دینے کی بات کرو گے؟'' میں تھوڑا پریشان تو ہوا لیکن یہ پریشانی چند ساعتوں کی تھی۔ میں نے سی سی او (چیف کارپوریشن افسر) سے عرض کی، ''سر! اس شکایت کا حشر بھی انشااللہ پہلے والی شکایت کی طرح کا ہوگا۔ میں اس کا بھی سامنا کروں گا اور مجھے اپنے اللہ پر یقین کامل ہے کہ میں اس آزمائش سے بھی سرخرو ہوں گا''۔

فون بند ہوگیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ میری سرکاری جیپ بکر منڈی کیسے پہنچ گئی؟ میں تو وہاں گیا ہی نہیں تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ ڈپٹی میئر صاحب کے کارِ خاص سینئر مجسٹریٹ زون نمبر۔8 نے مجھ سے ایک دن جیپ منگوائی تھی۔ تو اس گھٹیا سازش کی کڑیاں ملنا شروع ہوگئیں۔

ہوا یوں کہ ایک دن وہی سینئر مجسٹریٹ صاحب میرے دفتر تشریف لائے۔ کہنے لگے، ''چودھری صاحب! آپ کی بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کو آج ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ میری جیپ خراب ہے اور میرے پاس کوئی ذاتی گاڑی نہیں ہے۔ اگر آپ مہربانی کریں تو آج شام کو اپنے والی سرکاری جیپ مع ڈرائیور میرے گھر بھیج دینا۔ آپ کی بھابی کو ڈاکٹر کو دکھا کر گاڑی واپس بھیج دوں گا۔'' میں نے کہا، ''سر! کوئی بات نہیں۔ میرے لیے یہ کام سعادت سے کم نہیں۔ میں شام کو جیپ مع ڈرائیور آپ کے گھر بھیج دوں گا''۔ چنانچہ میں نے از راہ ہمدردی شام کو سرکاری جیپ مع ڈرائیور جناب سینئر مجسٹریٹ صاحب کے گھر بھجوادی۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ میرا ڈرائیور بھی تو ساتھ ہی تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی اس سازش کا حصہ ہے۔ ڈرائیور کو بلایا اور اس سے پوچھا، ''جس دن تم سرکاری جیپ لے کر سینئر مجسٹریٹ صاحب کے پاس گئے تھے تو تم لوگ کہاں کہاں گئے تھے؟'' کہنے لگا، ''سر! میں جب ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے مجھے یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ دو گھنٹے کے بعد آ کر جیپ واپس لے جانا۔ میرا گھر ان کے گھر سے قریب ہی ہے۔ میں اپنے گھر چلا گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد واپس گیا تو اس وقت تک جیپ واپس نہیں آئی تھی۔ مجھے تقریباً آدھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا''۔ میں نے استفسار کیا، ''جب جیپ واپس آئی تو اس میں کون کون لوگ تھے؟'' کہنے لگا، ''سر! مجسٹریٹ صاحب، ان کا ڈرائیور اور ایک نامعلوم شخص جیپ سے اترا تھا''۔ مجھے پوری کہانی سمجھ آ گئی۔ دراصل ڈپٹی میئر صاحب نے سینئر مجسٹریٹ، جو ان کا ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھا کے ساتھ مل کر یہ چال چلی اور مجھے کرپشن کیس میں پھنسانے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔ میری سرکاری جیپ کو بکر منڈی لے جایا گیا اور وہاں لوگوں سے دھونس سے رقم وصول کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گئی۔افسوس تو مجھے اپنے سینئر کولیگ پر ہوا کہ انہیں ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ اور ڈپٹی میئر کو خوش کرنے اور اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈا کرنے کے لئے اتنی شرمناک اور گھٹیا حرکت کیوں کرر ہے ہیں؟

میں اگلے دن علی الصبح ہی سی سی او کے دفتر پہنچ گیا۔سی سی او صاحب مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ کہنے لگے''خیریت تو ہے کہ آج آپ صبح صبح ہی ٹپک پڑے؟''میں نے ایک ہی سانس میں سرکاری جیپ والا پورا قصہ انہیں سنا دیا۔میری بات سن کر وہ حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی۔اچانک کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھنے لگے۔''یہ ملک صاحب۔سینئر مجسٹریٹ صاحب تو آپ کی سروس سے نہیں ہیں؟انہوں نے ایسی حرکت کیوں کی؟ وہ کیوں ڈپٹی میئر کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں؟انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''سی سی او کے چبھتے ہوئے سوالات میرے لئے مزید پریشانی کا باعث بن رہے تھے۔کیونکہ سینئر مجسٹریٹ صاحب میری ہی پی سی ایس سروس سے تھے۔سی سی او صاحب کا تعلق ڈی ایم جی گروپ سے تھا۔ان کے کہنے کا مطلب شاید یہ تھا کہ ان کے گروپ کا کوئی افسر شاید اس طرح کی حرکت کبھی نہ کرتا۔میرے پاس ان کی اس سوچ کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ یہ کام میری ہی سروس کے ایک افسر نے کیا تھا۔

میں نے عرض کی:''سر! میں کیا کہہ سکتا ہوں۔میں نے حقائق آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔آپ بااختیار ہیں۔عقل ودانش کے منبع ہیں۔تجربہ کار بھی ہیں۔زندگی کے نشیب وفراز کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔میں تو سروس میں نو وارد ہوں اور نوخیز بھی۔میں نے تو آپ ہی سے راہنمائی لینی ہے اور اپنے مسائل بھی آپ سے ہی شیئر کرنے ہیں۔''میری یہ باتیں سن کر موصوف زیرلب مسکرائے۔میرا تیر شاید نشانے پر لگا تھا۔ظاہر ہے مجھ سمیت تعریف کس کو پسند نہیں ہوتی۔کہنے لگے،آپ جاؤ اپنا کام کرو میں دیکھ لیتا ہوں۔''

میں نے انہیں سلام کیا اور واپس اپنے دفتر آ گیا۔اب ڈپٹی میئر میاں مشتاق احمد نے تیسرا وار کیا لیکن وہ بھی خطا گیا اور اللہ کے حکم سے ان کے شر سے خیر کا پہلو نکل آیا۔ہوا یوں کہ ڈپٹی میئر صاحب پھر سے سی سی او کے پاس گئے اور انہیں تجویز دی کہ میرا تبادلہ زون نمبر۔2،میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں کر دیا جائے۔انہوں نے یہ تجویز کیوں دی؟اس تجویز کے پس پردہ بھی ایک لمبی کہانی تھی۔اس وقت میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور آٹھ زونوں پر مشتمل تھی اور اس وقت کے آٹھوں ڈپٹی میئرز مسلم لیگ نون کے تھے۔بعد میں دو ڈپٹی میئر چودھری محمد اظہر،جو اس وقت گورنر پنجاب تھے،کے گروپ میں شامل ہو گئے۔ان میں سے ایک ڈپٹی میئر جن کا نام چودھری محمد سرور تھا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

وہ زون نمبر۔2 کے ڈپٹی میئر تھے۔وہ چونکہ سیاسی طور پر حکومتی پارٹی مسلم لیگ (ن) کے مخالفین میں شامل تھے اس لیے اسے ناکام کرنے کے لیے میرے جیسے افسر کو جو صرف میرٹ پر کام کرتا ہو اور سیاستدانوں کی جی حضوری نہ کرتا ہو۔ان کے زون میں سیکرٹری زون/سپیشل مجسٹریٹ درجہ اول لگانے کی تجویز دی گئی۔یہ تجویز اس وقت کے لارڈ میئر جناب خواجہ احمد حسان کے سامنے رکھی گئی جو منظور کر لی گئی۔اگلے ہی دن میرا تبادلہ زون نمبر۔2 میٹروپولیٹن کارپوریشن، لاہور میں کر دیا گیا لیکن میرے لیے یہ ہجرت مبارک ثابت ہوئی۔ایسے لگا جیسے ''کبے کولت کاری!''۔میں جب زون نمبر۔2 کے ڈپٹی میئر چودھری محمد سرور گجر کو ملا تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔فوری طور پر میرے لیے دفتر کا بندوبست کیا اور ساتھ یہ بھی کہا،''چودھری صاحب آپ کے ساتھ جو کچھ زون نمبر آٹھ میں ہوتا رہا ہے سب کچھ میرے علم میں ہے۔یہاں آپ کو انشااللہ کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ آپ حسب قانون اپنا کام کریں۔میں یا میرا کوئی بھی نمائندہ آپ کے کام میں مداخلت نہیں کرے گا۔مجھے آپ کا میرٹ پر کام کرنا بہت اچھا لگے گا''۔میں سوچ میں پڑ گیا کہ ایک وہ بھی ڈپٹی میئر میاں مشتاق احمد تھا اور ایک یہ ڈپٹی میئر چودھری محمد سرور ہے۔لیکن رویوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔شاید اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ ڈپٹی میئر حزب اقتدار والا تھا اور یہ حزب اختلاف والا۔یا وہ ایڈووکیٹ تھا اور یہ سادہ آدمی ہے۔میں نے اس ڈپٹی میئر کو بڑا شفیق، رحمدل، نفیس اور ایماندار شخص پایا۔ان کی وفات تک میرے ان سے تعلقات رہے۔اللہ ان کو کروٹ کروٹ راحتیں نصیب فرمائے۔آمین

اب یہاں پر مجھے اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔میں ضلع منڈی بہاؤالدین میں بطور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (جنرل/ فنانس اینڈ پلاننگ) خدمات سرانجام دے رہا تھا کہ 2018ء کے الیکشن آ گئے۔جیسا کہ ہمارے ملک میں ایک رواج بن چکا ہے کہ ہر نئے الیکشن کی آمد پر افسران کی وہ اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے کہ الامان، الحفیظ۔خواہ مخواہ ہی افسران کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیج کر ٹی اے/ ڈی اے کی مد میں ریاست کو کروڑوں روپے کا ٹیکہ لگا دیا جاتا ہے۔ایسے تبادلوں کا کیا فائدہ کہ آپ متوقع طور پر جیتنے والی سیاسی جماعت کے نمائندگان کی سفارشات پر افسران کی تبدیلی اور تعیناتی کریں اور دعوی یہ کریں کہ سب کچھ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد کروانے کی غرض سے کیا جا رہا ہے۔پتہ نہیں اس ملک کے غریب اور سادہ عوام کے ساتھ کب تک ایسا گھناؤنا مذاق جاری رکھا جائے گا۔اس طرح سے ان کے مینڈیٹ کو کب تک چوری کیا جاتا رہے گا؟ بھئی افسران کون سے کسی سیاسی پارٹی کے ارکان ہوتے ہیں۔وہ تو ریاست کے ملازم ہوتے ہیں۔وہ تو ہر آنے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

والی حکومت کے خادم ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی حکومت کے احکامات کی خلاف ورزی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہماری تاریخ میں ایک بھی ایسا واقعہ ریکارڈ پر موجود نہیں ہے کہ کسی سرکاری افسر نے عبوری حکومت کے دوران بھی کسی حکومتی حکم کی نافرمانی کی ہو۔

یہ اندھا دھند تبادلے دراصل کسی نئی سیاسی گیم کا حصہ ہوتے ہیں جس کو عام بندہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسی اکھاڑ پچھاڑ میں ہمارے منڈی بہاؤالدین کے ڈپٹی کمشنر صاحب کا بھی تبادلہ کر دیا گیا حالانکہ وہ افسر صرف اور صرف میرٹ پر کام کرنے والا فرض شناس، کام کو سمجھنے والا، عوام کا ہمدرد، اور فوری انصاف فراہم کرنے والے شخص تھے۔ ان کے جانے کے بعد اس ضلع کا ڈپٹی کمشنر ایک ایسے افسر کو لگا دیا گیا جو مجھ سے چار اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (ریونیو) سے دو بیچ جونیئر تھا۔ مجھے وہاں سے تبدیل کر کے ایک ڈویژنل ہیڈ کوارٹر پر ایڈیشنل کمشنر/ ڈائریکٹر ڈویلپمنٹ اینڈ فنانس مقرر کر دیا گیا اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (ریونیو) کو بھی وہاں سے تبدیل کر دیا گیا۔ نئے آنیوالے ڈی سی صاحب موصوف اس سے پہلے اس ضلع میں بطور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (ریونیو) کام کرتے رہے تھے۔

ان کی اس وقت کی حکومتی پارٹی کے ایک ایم این اے سے کسی وجہ سے چپقلش ہو گئی تو اس ایم این اے کے کہنے پر ان کا اس ضلع سے تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ اور اب وہی ایم این اے پھر سے اسی سیٹ سے ایم این اے کا دوبارہ الیکشن لڑ رہا تھا۔ سوچنے کا مقام یہ ہے کہ افسر موصوف کا دوبارہ تبادلہ منڈی بہاؤالدین میں منصفانہ اور آزادانہ انتخاب کروانے کے لیے کیا گیا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موصوف کی تعیناتی اس ضلع میں اس شخص نے کروائی جس کا تعلق متوقع جیتنے والی سیاسی جماعت سے تھا اور ہونے والے الیکشن میں اسی حلقہ سے ایم این اے کا امیدوار بھی تھا جس حلقہ سے سابقہ حکومت کا وہی سابقہ ایم این اے بھی الیکشن لڑ رہا تھا، جس کے کہنے پر نئے آنے والے ڈپٹی کمشنر صاحب کا اس ضلع سے تبادلہ ہوا تھا۔ کیا اسے کہتے ہیں منصفانہ ، آزادانہ اور شفاف انتخابات !۔ یہاں پر ایک دکھ بھری اور دردناک بلکہ شرمناک حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے میرا کلیجہ منہ کو آ رہا ہے، لیکن اس تکلیف دہ اور دکھ بھری داستان کو مکمل کرنے کے لیے حقائق آشکار کیے بغیر چارہ نہیں۔ جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ سیاست دانوں کی توقعات کو ہمارے اپنے ہی افسران اس حد تک بڑھا دیتے ہیں جن پر پورا اترنا ہر افسر کے بس کی بات نہیں۔ اور پھر ایسے سیاستدان ہر اس افسر کا جینا حرام کر دیتے ہیں جو میرٹ کا نام لیتا ہو۔ مذکورہ ضلع میں بھی حاکم ضلع نے ایک ایسی انوکھی مثال قائم کی جس کی کوئی مثال شاید ماضی میں نہ ملے۔ پھر انہیں خود اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ ہوا یوں کہ نئے آنے والے ڈپٹی کمشنر صاحب نے ڈپٹی کمشنر کی سرکاری گاڑی اپنی سابقہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پوسٹنگ کی جگہ پر مع ڈرائیور منگوائی۔ کیوں کہ انہوں نے دفتر میں آ کر جائن کرنا تھا۔ دفتری عملہ کو پابند کیا گیا کہ ان کی تشریف آوری تک دفتر نہ چھوڑے۔ دفتر میں پورا عملہ شام تک ان کا انتظار کرتا رہا لیکن ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر دفتر تشریف نہ لائے۔ رات گئے عملے کو ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں طلب کیا گیا اور جائننگ رپورٹ پر دستخط کر کے اعلیٰ حکام کو ارسال کر دی گئی۔ بعد میں پتہ یہ چلا کہ صاحب بہادر چونکہ اس ضلع میں پہلے بھی تعینات رہ چکے تھے۔ ملازمین سے جان پہچان بھی تھی۔ کسی وفادار ماتحت کو حکم دیا گیا کہ مٹھائی اور گلدستہ تیار رکھے۔ یہ کام بڑی رازداری سے کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کون کسی کا راز اپنے پاس رکھتا ہے۔ اسی طرح حسب معمول بعد میں یہ راز بھی راز نہ رہا۔ موصوف جائن کرنے سے پہلے ہی سرکاری گاڑی میں اس وقت کی متوقع جیتنے والی سیاسی جماعت کے مرکزی عہدیدار چودھری اشفاق کے گھر گلدستہ اور مٹھائی لے کر ان کا شکریہ ادا کرنے گئے۔ کیونکہ موصوف انہی کی سفارش پر ڈپٹی کمشنر لگے تھے۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ الیکشن میں دھاندلی کا پروگرام کس طرح سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ جب آپ کسی سیاسی شخصیت کے کندھوں پر بیٹھ کر کوئی بھی سرکاری عہدہ حاصل کریں گے اور اس طرح کی ناپائیدار عارضی بیساکھیاں استعمال کریں گے تو ایسے سیاستدان آپ کو اپنا زرخرید غلام نہیں سمجھیں گے تو اور کیا سمجھیں گے!

موصوف ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ پہلے تو اس سیاسی شخصیت چودھری اشفاق اور ان کے بیٹے نے ڈپٹی کمشنر صاحب کے کمیٹی روم پر قبضہ کیا۔ وہ دونوں باپ بیٹا ڈپٹی کمشنر صاحب والی کرسی پر باری باری بیٹھتے تھے۔ سائلین کی درخواستیں وصول کرتے تھے اور ان پر احکامات بھی جاری کرتے، بے چارے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر اپنے سر پر ڈی سی کے عہدے کا اعزازی تاج سجائے اپنے دفتر میں بیٹھ کر مکھیاں مارا کرتے تھے۔ اب ان دونوں سیاسی راہنماؤں نے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے ریٹائرنگ روم پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے وہاں بیٹھ کر سائلین کو بلا کر احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے۔ ان کی اس قبیح حرکت پر جناب ڈی سی صاحب بہادر کی یادداشت واپس آ گئی۔ شاید ان کو تھوڑا بہت غصہ بھی آیا ہوگا۔ انہیں یاد آ گیا کہ حکومت پنجاب نے تو انہیں اس ضلع میں ڈپٹی کمشنر تعینات کیا تھا۔ پتہ نہیں موصوف نے کیسے اتنی ہمت کر لی اور سیاسی راہنماؤں کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ اس ضلع کا ڈی سی وہ ہے لیکن بدقسمتی سے سیاستدانوں نے ایسا ماننے سے انکار کر دیا کیوں کہ موصوف اپنی پگڑی بہت پہلے ہی ان کے حوالے کر چکے تھے اور اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اب ڈی سی صاحب موصوف نے اسی سیاسی جماعت کے ایک اور گروپ کی انتہائی طاقتور شخصیت سے رابطہ کر لیا۔ ان کی بیگم کو ڈی سی ہاؤس میں منعقد کی گئی محفل میلاد میں بحیثیت مہمان خصوصی مدعو کیا۔ ضلع کے تمام افسران کی بیگمات کو بھی مہمان خصوصی کے استقبال کے لیے خصوصی طور پر دعوت دی گئی اور اپنی گرہ خاص سے مہمان خصوصی کو تحفے تحائف دے کر رخصت کیا لیکن پھر بھی بات نہ بن سکی کیونکہ سیاستدان خود تو اپنی جماعت میں لوٹوں کو انتہائی خوشدلی سے قبول کر لیتے ہیں اور ان کو خوش آمدید بھی کہتے ہیں۔ پتہ نہیں ان کو بیوروکریسی کی لوٹا کریسی کیوں پسند نہیں آتی؟ ڈی سی صاحب اب کافی پریشان ہو گئے۔ وہ ایک لمبے عرصہ تک اس ضلع میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ حالانکہ وہ ابھی تک بہت جونیئر تھے اور نام نہاد میرٹ کی بنیاد پر ڈپٹی کمشنر لگے تھے۔ اب ڈی سی صاحب بہادر نے اپنی پریشانی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے ایک اور سکیم سوچی۔ اسی ضلع میں اسی سیاسی جماعت کا ایک تیسرا گروپ بھی تھا۔ اس گروپ کے دو حکومتی وزرا بھی تھے۔ موصوف نے اب اس گروپ کی جھولی میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ اب سارا ضلعی پروٹوکول اس گروپ کے لیے مختص کر دیا گیا۔ اب اس والے گروپ کا سربراہ ضلع کے ہر فنکشن کا مہمان خصوصی بننے لگا۔ دوسرے دونوں گروپ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ڈی سی صاحب بہادر کی تمام تر حرکات وسکنات کا خوردبینی جائزہ بھی لے رہے تھے۔

بالآخر جو سیاسی گروپ ڈپٹی کمشنر صاحب کو ضلع میں لے کر آیا تھا اس گروپ کی انا کا مسئلہ بن گیا۔ اسی گروپ نے مختلف بے بنیاد اور جھوٹے الزامات کے تحت محترم ڈپٹی کمشنر صاحب کے خلاف اپنی ہی مدعیت میں محکمہ انٹی کرپشن میں درخواست دائر کر کے انکوائری لگوا دی۔ اور ساتھ ہی وزیراعلیٰ پنجاب کو ضلع کا دورہ کرنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔ وزیراعلیٰ صاحب دورہ پر تشریف لے آئے۔ حکومتی جماعت کے تقریباً تمام سیاستدانوں نے باہم مشورہ کر کے ڈپٹی کمشنر صاحب کے ہی دفتر میں بیٹھ کر جناب محترم ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے خلاف الزامات کے ڈھیر لگا دئے۔ ڈی سی صاحب نے جناب وزیراعلیٰ صاحب کو دکھانے کے لئے ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال کو تیار کروا رکھا تھا لیکن ضلع کے سارے سیاستدان مل کر جناب وزیراعلیٰ صاحب کو سٹی ہسپتال لے گئے۔ جب وزیراعلیٰ صاحب سٹی ہسپتال پہنچے تو ہسپتال کے حالات ناقابل بیان حد تک برے تھے۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وزیراعلیٰ نے جناب ڈپٹی کمشنر صاحب کا فوری طور پر تبادلہ کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ یہ واقعات پڑھ کر قارئین کو یقیناً اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہمارے ملک کے بیوروکریٹس کی ایک بہت بڑی تعداد کچھ اس سے ملتی جلتی حرکتیں کر کے ہی اپنے سیاسی آقاؤں سے خلعت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شاہی بلکہ خلعت حکمرانی کہہ لیجیے، کا حصول ممکن بناتی ہے۔

1998ء میں جب جنرل پرویز مشرف نے جمہوریت پر شب خون مارا اور ایک منتخب وزیراعظم نواز شریف کو اقتدار سے نکال کر حکومت کی باگ ڈور خود سنبھالی تو اس نے ہر ڈکٹیٹر کی طرح نام نہاد اصلاحات کے نام پر قومی اداروں کو تباہ و برباد کرنے کا آغاز کیا۔ ان اصلاحات میں ناظمین والا لوکل گورنمنٹ نظام مجریہ 2001ء بھی تھا۔ یہ نظام کیا تھا؟ بھان متی کا کنبہ تھا۔ اتنا ناقص نظام کہ اس کے نفاذ کے پہلے سال ہی اس میں ڈکٹیٹر کو بے شمار ترامیم کرنا پڑیں اور پھر بھی یہ غیر فطری نظام نہ چل سکا اور بالآخر یہ نظام اپنی موت آپ مر گیا۔ بظاہر تو یہ نظام اس لئے لایا گیا تھا کہ اختیارات کو نچلی سطح تک منتقل کیا جائے لیکن اختیار نچلی سطح تک تو منتقل نہ ہو سکے البتہ ضلعی ناظمین کے پاس اختیارات کا ارتکاز ضرور ہوا اس نظام کے تحت ملک کے انتظامی ڈھانچے کو مکمل طور پر مفلوج کر دیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیارات ختم کر کے اسے ''ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیشن آفیسر'' بنا کر ضلعی ناظم کے ماتحت کر دیا گیا اور تحصیل ناظمین کو بھی یہ تاثر دیا گیا کہ اسسٹنٹ کمشنرز ان کے ماتحت کام کریں گے۔ چنانچہ ناظمین کی اکثریت نے اپنے دیے گئے اختیارات سے وہ تجاوز کیا کہ الامان والحفیظ۔ اس کا خمیازہ قوم ابھی تک بھگت رہی ہے اور ہماری آنے والی نسلیں بھی اسے بھگتیں گی۔ اس نظام کے مطابق پولیس کو مادر پدر آزاد کر دیا گیا اور مختلف سطحوں پر پبلک سیفٹی کمیشن تشکیل دیے گیے جن کے چیئرمین اور ممبران سیاسی لوگ تھے۔ انہیں پولیس کے خلاف شکایات سننے کا کام سونپا گیا۔ یہ کیسا خوبصورت نظام تھا کہ پولیس کے خلاف ان لوگوں نے شکایات سننا تھیں جو چوبیس گھنٹے اپنے حامیوں کو پولیس حراست سے چھڑوانے اور اپنے مخالفین کے خلاف جھوٹے مقدمے درج کروانے کے لیے ایس ایچ اوز، ایس ڈی پی اوز اور ڈی پی اوز کے دفاتر کے طواف کرتے رہتے تھے۔ امن عامہ برقرار رکھنے کا اختیار انتظامیہ سے لے کر ضلعی ناظم کو دے کر عوام کے ساتھ ایک اور مذاق کیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ پولیس نے کبھی ضلع ناظم کے اس اختیار کو دل سے تسلیم نہ کیا اور تسلیم بھی کیوں کرتی جب ناظمین نے پولیس سے ذاتی کام ہی لینے تھے اور یہ ناظمین کی سیاسی مجبوری بھی تھی۔ محکمہ مال جیسے اہم محکمہ کو بھی ضلعی حکومتوں کا حصہ بناتے ہوئے اس ملک کا اتنا نقصان کیا گیا جو شاید کبھی پورا نہ ہو سکے۔

اگرچہ بعد میں ایک ترمیم کے ذریعے محکمہ ریونیو کو ضلع ناظم کی ماتحتی سے نکال کر بلاواسطہ صوبائی حکومت کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس حوالے سے میں اپنی سروس کے دوران پیش آنے والے صرف ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جو میرے موقف کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ اگرچہ کچھ ضلعی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ناظمین نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ بھی کیا اور عوام الناس کو ریلیف بھی دیا لیکن وہ کام اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور میں تعمیر و ترقی کے کام بہت زیادہ ہوئے لیکن اس کی وجہ ناظمین کی حکمت عملی اور جانفشانی نہ تھی بلکہ فنڈز کی فراوانی تھی اور اگر آج بھی اضلاع کو مناسب فنڈز دیے جائیں تو تعمیر و ترقی کا کام ان سے بہت ہی بہتر انداز میں ہو سکتا ہے۔

میں ان دنوں ضلع جہلم میں تعینات تھا۔ ایک دن حسب معمول اپنے دفتر میں بیٹھا کارِ سرکار نمٹا رہا تھا کہ میرے پی اے نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی کہ ایک سٹوڈنٹ مجھے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے ملنے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ وہ مجھ سے مل کر کوئی بات بتانا چاہتا ہے۔ میں نے سائل کو اپنے چیمبر میں بلا لیا۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کا کہا۔ وہ بیٹھ تو گیا لیکن ایسے لگ رہا تھا کہ اس کو شاید زبردستی کرسی پر بٹھایا گیا ہے۔ دراصل وہ گھبرایا ہوا تھا اور شاید پہلا موقع ہو کہ کسی افسر نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا کہا ہو۔ میں نے اسے کہا کہ بیٹا سکون سے بیٹھو اور اپنی بات سناؤ۔ اس نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے اپنی درد بھری کہانی ان الفاظ میں سنائی: ''سر جی۔ میرا نام ساجد ہے اور میں ایف ایس سی کا طالب علم ہوں۔ جس تحصیل کے آپ کلکٹر ہیں میں اس تحصیل کا رہائشی ہوں۔ ہمارے والد صاحب کی ملکیت میں کچھ زرعی رقبہ تھا۔ ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔ میرے والد صاحب سعودی عرب میں ملازمت کرتے تھے، ہماری والدہ صاحبہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا اس لیے ہم تینوں بہن بھائی اپنے والد صاحب کے ساتھ ہی سعودی عرب میں مقیم تھے۔ کچھ عرصہ ہوا ہمارے والد صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جب والد صاحب کے انتقال کے بعد ہم پاکستان آئے اور اپنی زمینوں پر گئے تو کیا دیکھا کہ ہمارے قریبی رشتہ داروں نے ہماری زمینوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ جب ان سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ تمہاری کوئی زمین یہاں نہیں ہے۔ یہ تو ہماری زمین ہے۔ ہم بہت پریشان ہوئے۔ بالآخر ہم نے جب ریونیو ریکارڈ چیک کروایا تو پتہ چلا کہ یتیم بچوں کے والد صاحب کو لاولد ظاہر کر کے ان کی وراثت کے انتقالات ان کے قریبی رشتہ داروں کے نام تصدیق ہو چکے ہیں''۔

یہ کہہ کر اس نے تمام قومی شناختی کارڈوں کی اصل کاپیاں اور فارم ''ب'' کی اصل کاپی میرے سامنے رکھ دی۔ میں یہ بات سن کر تلملا اٹھا اور سوچنے لگا کہ انسان کتنا ظالم ہے، یہ اپنی موت کو کیوں بھول جاتا ہے، اس کو یاد کیوں نہیں رہتا کہ آج وہ کسی کی وراثت ہڑپ کر رہا ہے اور کل کو اس کی اپنی بھی وراثت تقسیم ہونی ہے اور وہ خالی ہاتھ دنیا سے جائے گا۔ دنیا میں کیے گئے ظلم اور زیادتیوں کا حساب صرف اور صرف اسی کو دینا ہوگا۔ کیونکہ اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ قیامت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے دن کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ روزِ محشر ماں باپ اپنے بچوں کو اور بچے اپنے ماں باپ تک کو نہیں پہچانیں گے۔ نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ اور یہ دنیا میں اکٹھا کیا گیا مال و زر کسی کے کام نہیں آئے گا۔ خیر، میں ذرا سنبھلا تو اس سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے اس ضمن میں کیا کیا ہے یعنی کوئی قانونی چارہ جوئی کی یا نہیں؟ اس نے بتایا، ''سر ہم نے دونوں وراثتی انتقالات کے خلاف ڈی ڈی ڈو-آر / اسسٹنٹ کمشنر یعنی آپ کی عدالت میں اپیل دائر کر رکھی ہے۔ مقدمہ عرصہ دراز سے چل رہا ہے، تاریخ پر تاریخ دی جا رہی ہے لیکن ان کی کوئی شنوائی نہیں ہو رہی۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب جن کے پاس اس سیٹ کا ایڈیشنل چارج تھا انہوں نے بھی کوئی پیش رفت نہیں کی۔ البتہ جب سے آپ آئے ہیں کیس کی کارروائی میں تیزی آئی ہے اور اب کیس بحث میں ہے''۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ تسلی رکھے۔ انشاء اللہ فیصلہ میرٹ پر ہوگا لیکن اس کو شاید میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہنے لگا: ''سر! ہم یتیم اور بے سہارا بچے ہیں، ہمیں انصاف کون دے گا، آپ ہمارے لیے امید کی آخری کرن ہیں۔ ہم دعاؤں کے علاوہ آپ کو کیا دے سکتے ہیں؟ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہماری مادرِ وطن میں اس طرح سے بھی ظلم اور زیادتی ہو سکتی ہے''۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور پھر سے یقین دہانی کرانے کی بھرپور کوشش کی کہ اس کے کیس کا فیصلہ میرٹ ہی پر ہوگا تو اس نے پھر کہا۔ ''سر! ہمارا تو اس سسٹم سے اعتماد ہی اٹھ گیا ہے'' اور مزید کہا، ''سر! ہمارے مخالفین ضلع ناظم جہلم چودھری فرخ الطاف (موجودہ وفاقی وزیر فواد چودھری کے چچا) کے خاص بندے ہیں۔ شنید ہے کہ ضلعی ناظم نے ہی تحصیلدار صاحب کو بلا کر مذکورہ انتقالات تصدیق کرنے کا حکم صادر کیا ہے''۔

یہ بات کہہ کر اس نے بڑی معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ میں بھی تو ضلع ناظم کا ہی ماتحت ہوں۔ اور اتنے بڑے بڑے دعوے کر رہا ہوں۔ مجھے اس کی باتیں سن کر حیرت کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی کیونکہ یہ میرے محکمہ کی بدنامی کی بات تھی۔ میں نے اسے پھر یقین دلانے کی کوشش کی کہ فیصلہ میرٹ پر ہوگا۔ لیکن پتہ نہیں اس کو میری باتوں پر یقین کیوں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس سے آئندہ تاریخ پیشی پوچھی اور اسے اس ہدایت کے ساتھ رخصت کیا کہ وہ مقررہ تاریخ پیشی پر اپنے وکیل سے کہے کہ وہ اپنی بحث مکمل کرے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے عدالتی مثلیں منگوا کر ان کو ملاحظہ کیا اور بعد میں اپنی تسلی کے لیے متعلقہ ریونیو آفیسر جو بظاہر تو میرا ماتحت تھا لیکن عملاً کسی اور کا تھا، کو بلا کر بھی پوچھا لیکن وہ آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال گیا اور مجھے باور کروانے کی کوشش کی کہ اس نے فیصلہ میرٹ ہی پر کیا ہے۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے تو میں نے متعلقہ پٹواری کے نام

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پروانہ جاری کرنے کا حکم صادر کیا کہ وہ تاریخ مقررہ پر مکمل ریکارڈ کے ساتھ عدالت میں حاضر ہو۔ پھر ایک ناقابل یقین واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ مذکورہ مقدمات کی تاریخ پیشی سے ایک روز قبل مجھے ضلع ناظم جہلم چودھری فرخ الطاف کے پی اے کا فون آیا اور محترم ناظم صاحب کا حکم سنایا گیا کہ کل میری عدالت میں دو کیسوں کے انتقالات کی اپیلوں کی سماعت ہے، مدعا علیہان ناظم صاحب کے خاص آدمی ہیں، آپ نے دو انتقالات کی اپیلیں خارج کرنی ہیں اور ناظم صاحب کو اس کی رپورٹ بھی کرنی ہے۔ ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ مذکورہ انتقالات متعلقہ ریونیو افسر کو کہہ کر جناب ناظم صاحب ہی نے تصدیق کروائے تھے۔ اس وقت مجھے وہاں تعینات ہوئے صرف اڑھائی ماہ کا قلیل عرصہ ہوا تھا اور میری پوری سابقہ سروس میں اس نوعیت کی یہ پہلی سفارش تھی کہ ناجائز کام کرنے کا حکم دیا جا رہا تھا اور ساتھ کام کر کے رپورٹ کرنے کا بھی کہا جا رہا تھا۔

حالانکہ نارمل حالات میں عدالتی معاملات میں سیاستدان بڑا سوچ سمجھ کر سفارش کرتے تھے لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ حالات کو اس نہج تک پہنچانے میں اپنے سرکاری افسران کا بہت بڑا ہاتھ تھا، جب افسران اپنی نوکری بچانے کے چکروں میں سیاستدانوں کے غلط اور ناجائز کام کر کے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو پھر اس طرح کی ڈیمانڈز کا آنا ایک فطرتی عمل تھا۔ ایک کیریئر آفیسر کے لیے اس سے زیادہ پریشانی کیا ہو سکتی تھی کہ کسی سٹیشن پر سروس شروع ہوتے ہی اس طرح کے نامساعد حالات بن جائیں۔ میں بہت پریشان ہو گیا۔ میرے لیے اب دو ہی آپشن تھے کہ یا تو میں اپنی نوکری بچا لوں اور اپنے باقی ساتھی افسران کی طرح ناظم صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر کسی کی حق تلفی کروں اور انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر انصاف کا قتل کروں یا پھر اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہوں اور نتائج کی پروا کیے بغیر اپنے اللہ کی خوشنودی کی خاطر انصاف کا علم بلند کروں۔ اور اپنے رب کے ہاں سرخرو ہو جاؤں۔ چنانچہ میں نے اپنی نوکری بچانے کے بجائے حق اور سچ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا جو میرے منصب کا تقاضا تھا اور اس کے شایانِ شان بھی تھا۔ اور مجھے اپنے اللہ پر یقین کامل تھا کہ وہ میری راہنمائی فرمائے گا، میری مدد بھی کرے گا اور مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔

اگلے دن میں نے عدالت کی کارروائی شروع کی۔ زیر بحث مقدمہ کے لیے آواز دلائی گئی۔ فریقین مع اپنے اپنے وکلاء پیش عدالت ہوئے، مقدمہ پہلے ہی سے بحث میں چل رہا تھا۔ وکلاء سے پوچھا گیا کہ وہ بحث کے لیے تیار ہیں تو دونوں وکیلوں نے اثبات میں جواب دیا۔ مدعا علیہان کا وکیل بڑا پرجوش تھا کیوں کہ اس کو معلوم تھا کہ اس کی طرف سے بہت بڑی سفارش آئی ہوئی ہے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اور اسے قوی یقین بھی تھا کہ فیصلہ اس کے موکلان کے حق ہی میں ہونا ہے۔ جبکہ مدعیان کا وکیل بڑا مایوس نظر آ رہا تھا شاید اس کو بھی یہ مقدمہ ہارنے کا مکمل یقین تھا۔ میں نے مدعیان کے کونسل کو بحث شروع کرنے کا کہا۔ اس نے اپنے دعوے کے حق میں دلائل دینے شروع کیے، دلائل بڑے وزنی تھے کیوں کہ وہ حق پر تھا۔ اس نے متوفی کے بچوں کا نادرا سے جاری کردہ شناختی کارڈ اور فارم 'ب' پیش کیا اور گاؤں کے کچھ لوگوں کے بیان حلفی بھی پیش کیے اور بتایا کہ محلفین عدالت میں اصالتاً موجود ہیں۔ حسب استدعا کونسل مدعیان مذکورہ محلفین کو عدالت میں بلایا گیا تا کہ ان کی بات سنی جا سکے۔ اس پر مخالف وکیل نے اعتراض اٹھایا کہ قانون کے مطابق اپیل سننے والی عدالت شہادت قلمبند نہیں کر سکتی۔ مدعیان کے کونسل نے جواب دیا کہ عدالت انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے، حقائق تک پہنچنے کے لیے اور اپنی تسلی کے لیے کسی بھی شخص کا موقف لے سکتی ہے۔ چنانچہ کونسل مدعا علیہان کے موقف کو مسترد کرتے ہوئے محلفین کی بات سنی گئی تو انہوں نے بھی تصدیق کی کہ متوفی کے تین بچے تھے وہ لاولد نہیں تھا۔

اور محکمہ مال کے افسران نے بچوں کے ساتھ زیادتی کی ہے اور ان کا وراثتی رقبہ غیر قانونی طور پر دیگر افراد کے نام منتقل کر دیا ہے۔ کونسل مدعا علیہان کو بحث کا موقع دیا گیا لیکن وہ دعوی کی تردید میں کوئی ٹھوس ثبوت نہ پیش کر سکا۔ پٹواری حلقہ حسب الحکم مع ریکارڈ موجود تھا۔ اس کو بلا کر ریونیو ریکارڈ ملاحظہ کیا گیا۔ فریقین کے وکلاء کے دلائل سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ متوفی لاولد نہیں تھا اور اس کے تینوں بچوں کے ساتھ ناانصافی کرتے ہوئے ان کو ان کے جائز اور قانونی حق سے محروم کیا گیا ہے۔ چنانچہ مدعیان کے حق میں فیصلہ سناتے ہوئے زیر مقدمہ دونوں متنازع انتقالات کو منسوخ کر دیا گیا اور متعلقہ ریونیو آفیسر کو تحریری حکم دیا گیا کہ عدالتی فیصلہ کا کاغذات مال میں حسب ضابطہ اندراج کرے۔ دیگر مقدمات کی سماعت مکمل کر کے میں اپنے چیمبر میں چلا گیا۔

ابھی میں اپنے چیمبر میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھا کر دیکھا تو وہ ضلع ناظم کے دفتر کا نمبر تھا۔ کال اٹینڈ کی اور سلام کیا تو دوسری طرف ضلع ناظم موصوف کے پی اے بول رہے تھے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیے بغیر ارشاد فرمایا کہ ناظم صاحب شدید غصے میں ہیں وہ کہہ رہے ہیں، ''ان کے بندوں کے خلاف کیوں فیصلہ دیا ہے جب کہ آپ کو قبل از وقت بتا دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہا کہ آپ کو شاید یہ نہیں پتہ کہ یہاں اگر ناظم صاحب ڈی سی او کو بھی کوئی کام کہیں تو وہ ڈی سی او ہوتے ہوئے بھی خود آ کر ناظم صاحب کو رپورٹ کرتے ہیں کہ کام ہو گیا ہے۔ آپ ایک اسسٹنٹ کمشنر (ڈی ڈی۔او۔آر) ہو کر بھی اتنی جرات کے مالک ہیں کہ ان کے خلاف

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

فیصلہ دے دیا۔ آپ کا شاید اس ضلع میں نوکری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اب آپ کی خیر نہیں''۔ میں نے اسے بڑے تحمل سے کہا کہ ناظم صاحب کو بتائیں کہ آپ کے بندوں کا میرٹ نہیں بنتا تھا اس لیے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔ میری اس بات پر ناظم ضلع کے پی اے صاحب شدید غصے میں آ گئے اور گویا ہوئے، ''آپ کس ملک میں رہ کر میرٹ کی بات کر رہے ہو؟ کہاں ہے میرٹ؟'' اب پی اے کی بات تو کافی حد تک درست بھی تھی اور کہا کہ میں ناظم صاحب کو لائن دے رہا ہوں، آپ ان سے خود بات کر لیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اور ناظم صاحب کے لائن پر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر فون کو ہولڈ رکھنے کے بعد ہیلو کی آواز آئی تو میں نے ٹھک سے سلام کیا لیکن دوسری طرف ناظم صاحب نہیں بلکہ وہی پی اے صاحب بول رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ناظم صاحب سخت غصے میں ہیں وہ آپ سے بات نہیں کرنا چاہتے اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ اس نے جب ناظم صاحب کو میرٹ والی بات بتائی تو وہ اور بھی غصے میں آ گئے ہیں۔ پی اے نے ناظم صاحب کا یہ پیغام بھی دیا کہ اے سی سے پوچھو کہ ''ایہہ کیہڑا چودھری اے (یہ کون سا چودھری ہے؟) سنن وچ آیا اے کہ ایہ ارائیں اے تے اتھاں آ کے وت چودھری بناوداا اے (سنا ہے کہ یہ آرائیں ہے اور یہاں آ کر چودھری بنا ہوا ہے۔) اتھاں ارائیاں نوں کائی پچھدا نا ہیں'' (یہاں تو آرائیوں کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے)۔ میں بڑے تحمل سے ایک پیشہ ور منتظم کی طرح ساری باتیں سن رہا تھا لیکن یہ بات سن کر میں بھی تھوڑا غصے میں آ گیا تو میں نے پی اے صاحب سے کہا کہ ناظم صاحب کو بتا دے کہ ''ہاں میں ارائیں آں پر میں ضلع قصور دا ارائیں آں، تے ساڈے ضلعے وچ صرف ارائیں ای چودھری نیں۔ (ہاں میں آرائیں ہوں لیکن میں ضلع قصور کا آرائیں ہوں۔ ہمارے ضلع میں صرف آرائیں ہی چودھری ہیں)۔ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

فون بند کرنے کے بعد میں پریشانی کے عالم میں سوچنے لگا کہ اس ملک میں میرٹ پر کام کرنا کتنا مشکل ہے بلکہ لوگوں نے اس کو ناممکن بنا دیا ہوا ہے۔ ہم کس معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں لوگ یتیموں کا مال بھی ہڑپ کر جاتے ہیں اور ان کو اپنے اس فعل پر ذرا بھی شرمندگی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کو خیال آتا ہے کہ ایک نہ ایک دن انہوں نے بھی اس دنیا کے ناظم اعلیٰ کے حضور پیش ہونا ہے جہاں پر نہ دنیا کا مال کچھ کام آئے گا اور نہ یہاں کی جاہ و حشمت۔ میں خیالات کی دنیا سے باہر نکلا تو اپنی نوکری کی فکر لاحق ہوئی کہ اتنے طاقتور ضلع ناظم کو ناراض کر کے ان کے ضلع میں کیسے گزارہ ہو گا۔ جہاں پر تمام افسران صرف اور صرف ضلع ناظم کی خوشنودی کے لیے کام کر رہے ہوں، جہاں پر ضلع ناظم صاحب نے ایک ریٹائرڈ افسر کو ایکسٹینشن دلوا کر ای ڈی او (ریونیو) /کمشنر جیسی طاقتور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سیٹ پر بٹھایا ہوا ہو جس کے پاس تمام ڈی ڈی او (آر) (اسسٹنٹ کمشنرز) کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت ہونا ہو، پھر سالانہ خفیہ رپورٹس بھی انہی افسران نے لکھنی ہوں اور ایک کیریئر افسر کی ترقی بھی ان سالانہ خفیہ رپورٹس کی بنیاد پر ہونی ہو۔ تو کافی سوچ بچار کے بعد میں نے یہ بزدلانہ لیکن دانشمندانہ فیصلہ کیا کہ اس ضلع سے فوراً تبادلہ کروا لیا جائے کیوں کہ مجھے اس اسٹیشن پر آئے ہوئے پونے تین ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اور اگر تین ماہ کا عرصہ پورا ہو جاتا تو وہاں سے سالانہ خفیہ رپورٹ لکھوانا لازمی ہو جاتا اور پھر میں وہاں کے افسران اور ضلع ناظم کے رحم وکرم پر ہوتا۔

وقت کم تھا لیکن کام بہت بڑا اور اوپر سے طرفہ تماشا یہ کہ میرے پاس سیاسی سفارش بھی کوئی نہ تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے افسران بالا اور افسران مجاز سے بنفس نفیس ملنے کا فیصلہ کیا اور دو تین دن کی چھٹی لے کر سول سیکرٹریٹ لاہور چلا گیا۔ محترم سہیل شہزاد صاحب جو بہت شفیق اور مہربان افسر تھے۔ وہ اس وقت ایڈیشنل سیکرٹری (ایڈمن) کے عہدے پر فائز تھے۔ میں ان سے ملا اور سارے حالات بتائے، انہوں نے میری بات بڑے غور سے سنی اور مجھے تسلی بھی دی کیونکہ اس ضلع کے حالات کا ان کو بھی کافی حد تک علم تھا۔ انہوں نے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا اور اگلے دن آنے کا کہا۔ اللہ ان کا بھلا کرے کہ میں اگلے دن جب ان کے دفتر گیا تو اس وقت میری خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب میرے تبادلہ کا پروانہ میرے ہاتھ میں تھمایا گیا اور مجھے سیکرٹری ڈسٹرکٹ ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹی گوجرانوالہ تعینات کر دیا گیا تھا۔

میں نے جب افسر موصوف کا شکریہ ادا کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے۔ وہ سیکرٹریٹ میں بیٹھے ہی اپنے افسران کی فلاح و بہبود کے لیے ہیں۔ اگر وہ اپنے افسران کو تحفظ فراہم نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ میں اپنے تبادلہ کا پروانہ لے کر سیکرٹریٹ سے نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالی کی ذات بابرکات انسان کی پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے کس طرح سے اسباب مہیا فرماتی ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان ہاتھ پاؤں تو مارے اور جب کوئی انسان خلوص نیت سے کوئی کام کرنے کی ٹھان لیتا ہے تو اللہ عزوجل کی مدد اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ میں واپس گیا، عہدے کا چارج چھوڑا اور گوجرانوالہ آ کر نئے عہدے کا چارج لے لیا اور اپنے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے مجھے اتنی بڑی پریشانی سے نجات دلائی اور میرے سابقہ اسٹیشن پر تین ماہ مکمل ہونے سے قبل ہی میرا تبادلہ ہو گیا اور خراب سالانہ خفیہ رپورٹ کی تلوار بھی میرے سر سے ٹل گئی۔ وقت گزرتا گیا، میں اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو گیا جہاں بھی حکومت وقت نے تعینات کیا جا کر وہاں جائن کیا اور عوام کا خادم بن کر ان کی خدمت شروع کر دی۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یہ 2017ء کی بات ہے جب میں ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (ریونیو، جنرل اور فنانس اینڈ پلاننگ) کے طور پر اپنے فرائض منصبی سرانجام دے رہا تھا (قارئین حیران ہوں گے میں بیک وقت تینوں عہدوں پر کیوں کام کر رہا تھا؟ دراصل اس وقت ضلع کے معروضی حالات کچھ ایسے تھے کہ کوئی بھی افسر وہاں پر پوسٹنگ کروانے اور کام کرنے کو تیار نہ تھا)۔ایک دن میرے موبائل نمبر پر ایک نامعلوم نمبر سے کال آئی۔ میں نے کال اٹینڈ کی تو دوسری طرف بولنے والے شخص نے اپنا تعارف ساجد کے طور پر کروایا۔میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ سوہاوہ سے بات کر رہا ہے۔ میں نے کہا بھائی میں تو آپ کو نہیں پہچان پا رہا، اپنا تفصیلی تعارف کرواؤ کیوں کہ مجھے وہاں سے ٹرانسفر ہوئے تقریباً دس سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔

اس نے جواب دیا کہ سر میں وہ ساجد بات کر رہا ہوں جس کے لیے آپ نے وقت کے طاقتور ترین ضلع ناظم سے ٹکر لی تھی اور ہم یتیم بچوں کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ مجھے اس کی کال سے خوشگوار حیرت ہوئی۔اس کا حال احوال پوچھنے کے بعد اس سے ان کے کیس کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے مجھے مبارک باد دینے کے لیے اور شکریہ ادا کرنے کے لیے کال کی ہے کیونکہ ریونیو کی صوبہ پنجاب کی سب سے بڑی عدالت- بورڈ آف ریونیو- نے آپ کا کیا گیا فیصلہ بحال کر دیا ہے۔آج ساجد بہت خوش تھا حالانکہ اس کو اس خوشی اور انصاف کے حصول کی خاطر دس سال تک خجل خراب ہونا پڑا۔ میں نے اس سے مزید تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا: ''مخالف فریق نے آپ کے کیے گیے فیصلوں کے خلاف ای ڈی او (ریونیو)/کمشنر کی عدالت میں اپیل کی۔افسر موصوف تو بیٹھے ہی ناظم صاحب کے حکم کی تعمیل کے لیے تھے انہوں نے دو تاریخوں میں آپ کے کیے گیے فیصلوں کے خلاف اپیلیں منظور کر لیں اور ناظم صاحب کی نظروں میں سرخرو ہو گئے''۔ساجد اس دن بہت خوش تھا اور مجھ سے مل کر اپنی خوشی کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔لیکن میری پوسٹنگ اس کے گھر سے بہت دور تھی۔ میں نے اسے صرف اتنا کہا کہ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا کیونکہ مجھے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ فرمان اچھی طرح یاد ہے کہ یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے والا شخص بہت بڑے اجر کا مستحق ہے۔

جب جنرل پرویز مشرف نے ناظمین والا لوکل گورنمنٹ سسٹم نافذ کرنے کے لیے اور نام نہاد اصلاحات کے لیے ایک ادارہ (نیشنل ری کنسٹرکشن بیورو) تشکیل دیا جس کی سربراہی جنرل (ریٹائرڈ) تنویر نقوی کو دی گئی جنہوں نے سول اداروں میں اصلاحات کرنا تھی۔ بعد میں اس ادارے کی سربراہی جناب دانیال عزیز کو سونپی گئی جو اس وقت جنرل پرویز مشرف کے قریبی ساتھی تھے۔وہ آج کل مسلم لیگ (ن) کے ایم این اے ہیں اور اس سیاسی جماعت کے انتہائی قریبی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

حلقوں میں شامل ہیں۔اس بیورو کے دیے گئے نظام کے تحت بیوروکریسی جو کسی بھی ریاست کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے، اسے توڑنے کے لئے ڈپٹی کمشنر کے اختیارات کی بندر بانٹ کی گئی۔کچھ اختیارات ضلع ناظم کو، کچھ پولیس اور بہت سارے اختیارات عدلیہ کو دے دیے گئے جبکہ آئین پاکستان کی روح کے مطابق 1996ء میں جب عدلیہ اور انتظامیہ کو علیحدہ کیا گیا تھا تو اس وقت بھی آئینی ماہرین نے بڑے سوچ بچار اور سیر حاصل بحث وتمحیص کے بعد مجموعہ تعزیرات پاکستان کے باب نمبران 8,9,10 اور 13 اور مجموعہ ضابطہ فوجداری میں موجود تمام جرائم کے مقدمات سننے کے اختیارات انتظامی مجسٹریٹس کو دے دیے تھے۔کیونکہ یہ اختیارات انتظامی نوعیت ہی کے تھے۔جب ہماری سلیکشن بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوئی تو حکومت پنجاب نے ہمیں ابتدائی تربیت کے لیے پراونشل سروسز اکیڈمی پشاور بھیج دیا۔وہاں پر جناب سلیم خاں جو اس وقت ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدہ پر فائز تھے اور بعد میں سیکرٹری قانون حکومت شمال مغربی سرحدی صوبہ اور جج پشاور ہائیکورٹ بھی رہے ہمیں مجموعہ ضابطہ فوجداری مجریہ 1898 پڑھایا کرتے تھے۔ایک دن دوران کلاس انہوں نے بتایا کہ جب 1996ء میں عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کیا جارہا تھا وہ اس آئینی اور قانونی ٹیم کا حصہ تھے جو اس مقصد کے لئے تشکیل دی گئی تھی۔تو اس ٹیم نے بڑی سوچ بچار اور بحث مباحثہ کے بعد اوپر دیے گئے اختیارات انتظامیہ کو دیے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ اختیارات انتظامی نوعیت کے ہیں اگر یہ بھی عدلیہ کو دے دیے گئے تو ریاستی معاملات پر انتظامیہ کی گرفت کمزور ہوجائے گی، امن عامہ کی صورتحال بگڑ جائے گی اور ملک میں بدامنی پھیل جائے گی تو پھر حالات کو قابو کرنا کسی کے بس میں نہیں رہے گا۔ان کی یہ بات آنے والے دنوں میں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی اور صوبائی حکومتیں اتنی پریشان ہوئیں کہ ماسوائے صوبہ پنجاب کے باقی تمام صوبوں نے مذکورہ بالا اختیارات کسی نہ کسی صورت میں انتظامیہ کو واپس کردیئے اور حکومت کی رٹ کو مضبوط کرلیا۔

لوکل گورنمنٹ آرڈیننس مجریہ 2001ء کے نفاذ کے نتیجہ میں ریاست کے انتظامی ڈھانچے کی شکل ہی بگاڑ دی گئی، اس تبدیلی کو اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی کا نام دیا گیا جب کہ یہ اختیارات کی بندر بانٹ کا دوسرا نام تھا۔یہ لوکل گورنمنٹ آرڈیننس مورخہ 14 اگست 2001ء سے نافذ العمل ہوا۔لیکن 13 اگست 2001ء تک کے مسودے میں ایک محکمہ ای ڈی او (مجسٹریسی) کا بھی اس میں موجود تھا۔جسے راتوں رات مذکورہ آرڈیننس سے نکال دیا گیا۔اس محکمہ کو اس طرح آرڈیننس سے نکالنا ایک بہت بڑی بدنیتی تھی۔اس سارے عمل کے پیچھے کیا محرکات تھے، ابھی تک یہ معمہ ہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میری رائے کے مطابق یہ سارا عمل بین الاقوامی ایجنڈے کی تکمیل کے لئے کیا گیا۔ کیونکہ بہت سے بین الاقوامی اداروں نے نیا سسٹم لانے کے لیے فنڈنگ بھی کی تھی۔ ان غیر ملکی اداروں کے مقاصد اور اہداف صرف اور صرف پاکستان کے اداروں کو تباہ کرنا اور ان کو اتنا کمزور کر دینا کہ تھا کسی ایمرجنسی کی صورت میں ملک میں اس قدر افراتفری پھیلے کہ ملک کو سنبھالے کے لیے کوئی مرکزی اور طاقتور ادارہ موجود نہ ہو، اور یہ گھناؤنا فعل ابھی تک جاری وساری ہے کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ ایک طاقتور انتظامیہ کے ہوتے ہوئے کسی بھی ملک کو زیر کرنا ایک خواب کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

خیر، بات ہو رہی تھی جنرل مشرف کے نافذ کردہ ''لوکل گورنمنٹ سسٹم'' کی۔ میں ان دنوں میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں بطور مجسٹریٹ/ زونل سیکرٹری تعینات تھا۔ پی ایم ایس (پی سی ایس) مایہ ناز افسر جناب نسیم صادق اسسٹنٹ کمشنر لاہور کینٹ تھے۔ ایک دن میں ان کے ساتھ ڈیوٹی پر تھا۔ ہم نومنتخب یونین ناظمین کے لیے دفاتر ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اس دن بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ کہنے لگے، ''چودھری صاحب مجھے تو یہ کام کرتے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسا کہ ہم اپنی قبریں خود ہی کھود رہے ہیں''۔ ضلع ناظم لاہور کے لیے میاں عامر محمود اور حافظ سلمان بٹ کے درمیان سخت مقابلہ تھا۔ لیکن میاں عامر محمود کامیاب ٹھہرے۔ یہ الیکشن عدلیہ کی نگرانی میں ہوئے تھے۔ میری ڈیوٹی گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول باغبانپورہ لاہور میں انتظامی امور دیکھنے کے لیے لگی تھی۔ وہاں پر جو کچھ ہوا میں اس کا چشم دید گواہ ہوں کہ موصوف کو کس طرح ضلع ناظم بنایا گیا اور انہیں یہ عہدہ دلانے میں کیا کیا پاپڑ بیلے گئے اور کون کون سی طاقتوں نے تن من دھن کی بازی لگائی یہ ایک لمبی داستان ہے۔ جس کو پھر کبھی بیان کریں گے۔ نیا نظام نافذ ہونیوالا تھا۔ نومنتخب ضلع ناظم لاہور میاں عامر محمود صاحب کے اعزاز میں ایک ڈنر دیا گیا۔ اس کھانے میں حکومت وقت کے چہیتے سیاستدانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں لاہور کے تمام مجسٹریٹس، اسسٹنٹ کمشنرز۔ ڈپٹی کمشنز اور کمشنر لاہور کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ اعلیٰ فوجی قیادت اور فوجی مانیٹرنگ ٹیموں کے افسران کو بھی بلایا گیا تھا۔ آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ کھانا شروع ہونے سے پہلے تمام انتظامی افسران کو حکم ملا کہ وہ اپنی اپنی گاڑیوں سے نیلی بتیاں اتار دیں۔ چنانچہ حکم پر فوری اور من وعن عمل ہوا اور میرے سمیت بہت سارے افسران بغیر کھانا کھائے گھروں کو لوٹ گئے۔ انتظامی افسران، جو اپنے آپ کو ریاست کی کریم سمجھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ امور ریاست ان کے بغیر نہیں چلائے جا سکتے۔ ان کو کھانے پر بلا کر ان کی جس طرح باجماعت توہین کی گئی وہ اپنی مثال آپ ہے اور اس توہین سے بھی ہم نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ اور ہماری گردن کا سریہ پھر بھی نہ نکلا۔ نیا نظام نافذ ہونے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے بعد میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں تعینات سارے افسر نئی تعیناتی کے انتظار میں تھے۔اس وقت جناب عرفان علی صاحب جو ایک ڈی ایم جی افسر تھے، میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں بطور چیف کارپوریشن آفیسر تعینات تھے، مذکورہ افسر اپنی دیانتداری، محنت، جانفشانی، دلیری اور صاف گوئی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔

ایک دن ہم میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور میں تعینات تمام انتظامی افسران ان کے آفس میں موجود تھے۔ نئے نظام کی بات چل نکلی۔ میں نے سوال کیا: ''سر انتظامیہ موجودہ حالات تک کیسے پہنچی۔ان حالات کے پیچھے کیا کہانی ہے؟'' انہوں نے بڑا خوبصورت جواب دیا،فرمانے لگے،'' جو قومیں اپنے ماضی سے سبق نہیں سیکھتیں ان کا مستقبل ہمیشہ تاریک ہوتا ہے۔ جو کچھ ہم ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں وہ ایک دن میں نہیں ہوا۔اس کو تقریباً پچاس سال کا طویل عرصہ لگا ہے۔ ہماری سروس کا طرہ امتیاز عوامی خدمت تھا اور ہونا بھی چاہئے تھا لیکن ہمیں حکمرانی کی لت پڑ گئی۔ کچھ بیوروکریٹ ہمارے ملک کے وزیراعظم بھی بنے اور باقی محلاتی سازشوں میں مصروف ہو کر اقتدار حاصل کرنے کے چکروں میں پڑ گئے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم وزیراعظم تھے تو انہوں نے بھی سی ایس پی کلاس پر کاری ضرب لگائی لیکن ہمیں اس وقت بھی سمجھ نہ آئی اور ہم نے اپنا قبلہ درست نہ کیا اور اپنی روش کو برقرار رکھا۔ آج ہمیں فالتو سمجھ کر بے اختیار کر دیا گیا ہے''۔ انہوں نے مزید کہا،'' ہم نے بطور کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور اسسٹنٹ کمشنر عوام کی کیا خدمت کی ہے؟ ہم نے عوام سے محبت نہیں نفرت کی ہے۔ہم نے انہیں اپنا غلام سمجھ لیا تو اس کے جواب میں ہمیں عوامی نفرت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمیں عدالتی اختیارات انصاف دینے کے لیے دیئے گئے تھے لیکن ہم نے کما حقہ انصاف کے تقاضے پورے نہ کیے۔ذاتی خواہشات کی تکمیل، جاہ وحشمت کا اور ناجائز ذرائع سے دولت کا حصول ہمارا اولین مقصد زندگی بن گیا۔ ہماری پولیس، پولیس مقابلوں میں ماورائے عدالت قتل کرتی رہی اور ہمارے ڈپٹی کمشنرز ماسوائے چند استثنائی صورتوں کے پولیس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جوڈیشل انکوائری کے لیے اس کی مرضی کا مجسٹریٹ مقرر کرتے رہے اور ساتھ ساتھ مجسٹریٹ کو ''ہتھ ہولا'' رکھنے کا بھی کہتے رہے۔اس طرح پولیس روز بروز مضبوط ہوتی گئی اور ہم کمزور۔ یہی حال عدلیہ کا رہا۔ہم نے کبھی اسے درخور اعتنا ہی نہ سمجھا۔ وہ کسی حد تک انصاف کرتے رہے اور ہم سیاست دانوں اور پولیس کو خوش کرتے رہے۔حتیٰ کہ ہم الیکشن میں حکمرانوں کی مدد کرتے رہے اور حکومتی مخالفین کو ناجائز طور پر پابند سلاسل کرتے رہے۔ہم ''ایم پی او'' کے تحت دیے گیے اختیارات کا غلط استعمال بھی کرتے رہے۔نتیجہ یہ نکلا الیکشن کروانے کا اختیار ہم سے لے کر عدلیہ کو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دے دیا گیا۔ آج ہمیں جب بے دست و پا کیا گیا تو ہمارے حق میں ایک بھی آواز نہ اٹھی بلکہ عوام الناس نے خوشی کا اظہار کیا ہے''۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ لوکل گورنمنٹ آرڈیننس مجریہ 2001ء کے نفاذ کے بعد انتظامیہ کو اتنا مفلوج کیا گیا اور ان انتظامی افسران سے اتنا برا سلوک کیا گیا کہ جو ناقابل بیان ہے۔ کمشنر کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کو ڈی سی او (کچھ لوگ اس کو ڈی سی زیرو بھی کہتے تھے) بنا دیا گیا، یہ خصوصی حکم جاری کیا گیا کہ ضلعی ناظمین ڈپٹی کمشنر والے دفاتر میں بیٹھیں گے۔ ڈپٹی کمشنر کے دفاتر کے ساتھ بنی ہوئی عدالتوں کو توڑا دیا گیا۔ بہت ساری تحصیلوں میں تحصیل ناظمین نے اسسٹنٹ کمشنرز کے دفاتر اور عدالتوں پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ بعد میں ان کو حکم دیا گیا کہ وہ لوکل گورنمنٹ کے دفاتر استعمال کریں گے۔ عدلیہ نے بھی اپنے پر پرزے نکالے اور ریونیو افسران کی عدالتوں پر قبضے کر لیے۔ انتظامی افسران کے لیے وہ بہت مشکل وقت تھا۔ بہت سے افسران نے نئے سسٹم میں کام کرنے سے انکار کر دیا اور بہت سے لمبی چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئے یا ملک سے باہر چلے گئے۔ جو باقی بچے ان کے حوصلے بڑے پست تھے لیکن وہ جیسے تیسے سسٹم کے ساتھ چلتے رہے۔ بعض افسران نے تو اتنی بزدلی کا مظاہرہ کیا کہ وہ ناظمین کے تمام ناجائز احکامات خود بھی مانتے رہے اور اپنے ماتحتوں کو بھی ان کی ہر بات ماننے کا حکم دیتے رہے۔ وہ اپنی سیٹیں بچاتے رہے اور باضمیر ماتحت افسران کی سالانہ خفیہ رپورٹیں خراب کر کے ان کا کیریئر بھی خراب کرتے رہے۔ تاہم بہت سارے افسران نے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور نہ تو اپنی عزت نفس مجروح ہونے دی نہ ہی اپنے ماتحتوں کی۔ ان کو ناپسندیدہ شخصیات قرار دے کر ضلع بدر کیا گیا لیکن انہوں نے صبر واستقامت، ایمانداری، عزم وہمت اور جرات و بہادری کا دامن نہ چھوڑا اور اپنے اللہ کے ہاں سرخرو ہوئے۔ میری تحصیل سوہاوہ میں بطور اسسٹنٹ کمشنر/ ڈی ڈی او-آر تعیناتی کے دوران بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو قارئین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ واقعہ سنانے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ میں آپ کو اپنی بہادری کے قصے سنا کر متاثر کروں۔ میرا مقصد صرف یہ سمجھانا ہے کہ انسان کو مشکل سے مشکل حالات میں بھی ہمت، حوصلہ اور صبر واستقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر آپ ہمت ہار گئے تو لوگ بڑی مچھلیاں بن کر آپ کو چھوٹی سی مچھلی سمجھ کر نگل جائیں گے۔ دوسرا یہ ہے کہ آپ کبھی اپنے اختیارات سے تجاوز نہ کریں اور نہ کسی دوسرے شخص کو اپنے اختیارات میں تجاوز کرنے کی اجازت دیں۔

ہوا یوں کہ مجھے ایک دن میرے ڈی سی او صاحب کی کال آئی اور بتایا کہ انہیں ڈسٹرکٹ اینڈ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سیشن جج صاحب نے فون کیا ہے اور فرمایا ہے کہ سوہاوہ میں ایک نئے سول جج صاحب تعینات ہوئے ہیں۔ انہیں دفتر وعدالت کی ضرورت ہے۔ان کے لئے دفتر وعدالت کا کوئی بندوبست کر دیں۔ میں نے تعمیل حکم کا وعدہ کیا۔ اگلے دن میں اپنے دفتر میں کارسرکار میں مصروف تھا کہ میرے نائب قاصد نے آ کر بتایا کہ سول جج (سینئر) صاحب کا اردلی آیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ سول جج صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ میرے پاس کچھ سائلین بیٹھے تھے۔ میں انہیں فارغ کر کے جج صاحب کے پاس چلا گیا۔ میں ان کا نام جان بوجھ کر نہیں لکھ رہا کہ کہیں مجھے توہین عدالت کے جرم میں نہ دھر لیا جائے۔ ان سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ بڑے پرتپاک طریقے سے ملے اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج صاحب کا وہی پیغام دیا جو مجھے ڈی سی او صاحب نے دیا تھا۔ میں نے ان سے کچھ وقت مانگا اور واپس آ گیا۔ دفتر واپس آ کر میں نے متعلقہ ڈی ڈی او (بلڈنگز) کو بلایا۔ انہیں مسئلہ بتایا تو انہوں نے کہا کہ ان کے محکمہ کا ایک ریسٹ ہاؤس خالی پڑا ہے۔ اس کی مرمت کر کے اس میں عدالت کا کٹہرا اور دفتر/ چیمبر بنا کر چند دنوں میں جج صاحب کو وہاں شفٹ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اسے اگلے دن آنے کا کہا۔ وہ حسب وعدہ اگلے دن میرے پاس پہنچ گیا۔ ہم دونوں جج صاحب کے پاس چلے گئے۔ جج صاحب کو ساتھ لے کر مذکورہ ریسٹ ہاؤس جو تحصیل کچہری کے پاس ہی تھا چلے گئے اور جج صاحب کو موقع ملاحظہ کروایا اور تجویز دی کہ نئی عدالت وہاں بنائی جا سکتی ہے۔ لیکن انہیں میری بات کچھ پسند نہ آئی۔ کہنے لگے کہ بہتر ہے کہ تحصیل آفس میں اگر کوئی عدالت خالی ہو تو اس میں نئے جج صاحب کو شفٹ کر دیا جائے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں چیک کر کے انہیں بتاؤں گا۔

میں جج صاحب سے فارغ ہو کر سیدھا تحصیل آفس گیا۔ موقع ملاحظہ کیا تو معلوم ہوا کہ تحصیل آفس میں ریونیو افیسرز کی تین عدالتیں تھیں جن میں سے دو عدالتیں جو نائب تحصیلداران کے لئے بنائی گئی تھیں اور ان کے زیر استعمال تھیں لیکن ان پر سول جج صاحبان پہلے ہی ناجائز طور پر قابض تھے۔ اب ایک عدالت باقی تھی جو تحصیلدار سوہاوہ کے زیر استعمال ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ پہلے بھی مذکورہ دو عدالتوں پر سول جج صاحبان نے بغیر اجازت زبردستی قبضہ کیا ہوا ہے اور بڑی کوششوں کے باوجود عدالتیں خالی نہیں کی گئیں۔ میں وہاں سے سیدھا جج صاحب کے پاس گیا۔ ان کو بتایا کہ تحصیل آفس میں سے دو عدالتیں پہلے سے ہی عدلیہ کے پاس ہیں اور اب وہاں صرف ایک عدالت ہے جو تحصیلدار صاحب کے زیر استعمال ہے۔ وہ عدالت آپ کو نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ تحصیلدار صاحب تحصیل آفس کے انچارج ہوتے ہیں۔ میں ایک آفس کے انچارج کو ان کے دفتر سے بے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دخل نہیں کرسکتا۔ میں نے پھر ریسٹ ہاوس والی آپشن دہرائی لیکن جج صاحب خاموش ہو گئے۔ شاید وہ اب وقت کی بے اختیار اور کمزور ترین انتظامیہ سے تحصیل آفس کا آخری دفتر وعدالت بھی چھین لینا اپنا جائز اور قانونی حق سمجھتے تھے۔ کیوں کہ وہ میری وہاں پوسٹنگ سے پہلے بھی اپنا یہ غیر قانونی حق استعمال کر کے دو عدد عدالتوں پر قبضہ کر چکے تھے اور ان کے اس غیر قانونی اقدام پر افسران بالا نے مجرمانہ خاموشی اختیار کی ہوئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وقت کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج صاحب بہت ہی طاقتور آدمی تھے۔ اور ہمارے ڈی سی او صاحب (ڈی سی زیرو) اتنے ہی کمزور واقع ہوئے تھے اور حالات سے سمجھوتہ کر چکے تھے۔

اگلے روز دن کے تقریباً دو بجے میں فیلڈ ڈیوٹی سے واپس آ کر اپنے دفتر میں بیٹھا ہی تھا کہ اچانک میری نظر کھڑکی سے باہر پڑی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ کرسیاں میز وغیرہ اٹھا کر تحصیل آفس کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ نائب قاصد اندر آیا۔ اس سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں اور فرنیچر اٹھا کر کہاں لے کر جا رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ وہ پتہ کر کے بتاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور ایک ناقابل یقین خبر دی کہ جج صاحبان جو کہ تحصیل سوہاوہ میں منصفی کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں نے تحصیل دار صاحب کے دفتر کا تالا توڑ کر ان کے دفتر کا سامان باہر پھینک کر دفتر پر قبضہ کر لیا ہے اور اب ان کے ملازمین ناجائز طور پر قبضہ کئے گئے دفتر میں اپنا فرنیچر رکھ رہے ہیں۔ ملک کے منصفین کی اس حرکت کو جان کر مجھے حقیقت میں بہت دکھ ہوا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ جن لوگوں نے مظلوموں کی مدد کرنا تھی۔ ظالموں سے قبضے چھڑوا کر مظلوموں کے حوالے کرنے تھے وہ خود ہی قبضہ گروپ بن گیے ہیں اور انصاف فراہم کرنے کی بجائے انصاف کا قتل عام کر رہے ہیں۔

میں نے دل میں سوچا کہ اگرچہ ہمارے بہت برے دن آئے ہوئے ہیں لیکن اتنے بھی برے نہیں کہ لوگ دن دیہاڑے ہمارے دفاتر پر قبضے کرنا شروع کر دیں۔ پھر میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ جب پہلی دفعہ تحصیل آفس کی دو عدالتوں پر قبضہ ہوا تھا تو اگر اس وقت کوئی مرد قلندر تھوڑی سی ہمت دکھاتا یا احتجاج کرتا اور شور مچاتا تو آج یہ تیسری اور آخری عدالت پر ناجائز قبضے کی کبھی نوبت نہ آتی۔ لیکن پھر مجھے اچانک یہ خیال بھی آیا کہ کسی سرکاری افسر کو کیا پڑی کہ ایک سرکاری دفتر کے لیے کسی سے جھگڑا کرے۔ اپنے تعلقات خراب کرے۔ جج صاحبان کے عمل کے خلاف کوئی کام کر کے توہین عدالت کا مرتکب ہو۔ تحصیلدار کا دفتر ہی ہے نا۔ تحصیلدار جانے اور اس کا کام جانے۔ کون سا اس کی اپنی ذاتی جائیداد پر ناجائز قبضہ ہوا ہے؟ ہاں اگر کوئی کسی بیوروکریٹ کی ذاتی یا اس کے خاندان کے کسی فرد کی اور یا اس کے کسی جاننے والے شخص کی جائیداد کی طرف کوئی آنکھ اٹھا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کرتو دیکھے گا تو اس کو ایسا سبق سکھایا جائے گا کہ ایسا کرنے والے کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ لیکن میرے اندر کا انسان بولا۔ تم تحصیل کلکٹر ہو۔ تمہارے فرائض منصبی ہی یہ ہیں کہ تم اپنی تحصیل میں موجود سرکاری املاک کا تحفظ کرو۔ اگر تم اپنا یہ فرض کما حقہ ادا نہیں کر سکتے اور اپنے اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ اختیارات کا استعمال انصاف کے اصولوں کے مطابق نہیں ادا کر سکتے تو تمہیں اس منصب پر فائز رہنے کا کوئی حق نہیں۔ بالآخر میں نے اپنے اندر کے انسان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے نتائج کی پروا کیے بغیر جرات مندانہ اور میرٹ پر مبنی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے دفتر سے باہر نکلا۔ دو تین نائب قاصدوں کو ساتھ لیا اور موقع پر پہنچ گیا۔ موقعہ پر موجود عدالتی اہلکاران جو تحصیلدار صاحب کی عدالت میں سامان رکھ رہے تھے سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کس کے حکم پر ناجائز قبضہ کر رہے ہیں؟ انہوں نے اسی جج صاحب کا نام بتایا جن کو میں ایک دن قبل بتا کر آیا تھا کہ تحصیلدار صاحب کی عدالت ان کو نہیں دی جا سکتی۔ میں کرب اور غصہ کی ملی جلی کیفیت میں تھا۔ عدلیہ کے عملہ کو حکم دیا کہ وہ فوری طور پر اپنا سامان باہر نکالیں اور عدالت خالی کر دیں۔

انہوں نے کہا، ''ہم تو اپنے جج صاحب کا حکم مانیں گے۔ آپ کا حکم ماننے کے روادار نہیں ہیں''۔ میں نے ان سے کہا کہ جاؤ اور اپنے جج صاحب کو جا کر میرا بتاؤ کہ میں موقع پر موجود ہوں وہ بھی تشریف لے آئیں۔ عدالتی اہلکاران اپنا سامان وہیں چھوڑ کر جج صاحب کو بلانے چلے گئے۔ میں نے اپنے ملازمین سے کہا کہ ان ناجائز قابضین کا سامان اٹھا کر باہر پھینکو اور تحصیلدار صاحب کی عدالت کا سامان اندر رکھو اور نیا تالا لا کر لگا دو۔ ریونیو ملازمین نے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ لیکن جج صاحب نے موقع پر نہ آنا تھا اور نہ ہی آئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جج صاحب میرے اس ردعمل کی خبر ملنے پر جہلم روانہ ہو گئے تھے۔

میں اپنے دفتر واپس جا کر بیٹھ گیا اور وقوعہ کی ایف آئی آر پولیس تھانہ میں درج کروانے کے لیے استغاثہ لکھنا شروع کیا ہی تھا کہ ڈی سی او صاحب کا فون آ گیا۔ میں نے فون اٹینڈ کر کے ان کو سلام کیا۔ وہ اپنی آواز سے کافی پریشان اور گھبرائے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ مجھ سے وقوعہ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے جھٹ پوری تفصیل بتائی اور توقع کر رہا تھا کہ وہ خوش ہو کر شاباش دیں گے اور ساتھ ساتھ میری حوصلہ بھی افزائی کریں گے۔ لیکن وہ میری تمام تر توقعات کے خلاف فرمانے لگے، ''آپ نے بہت خطرناک کام کیا ہے، سیشن جج صاحب بہت غصے میں ہیں، انہوں نے ضلع ناظم سے بھی بات کی ہے وہ بھی آپ سے بہت ناراض ہیں۔ آپ کو اس طرح عدلیہ کا سامان باہر نہیں پھینکنا چاہیے تھا۔ آپ پہلے میرے ساتھ بات کرتے''۔ میں نے عرض کی ''سر، کیا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں نے ایک ناجائز قبضہ چھڑوا کر کوئی غلط کام کیا ہے؟ سر، کیا منصفین کے پاس اس طرح قبضہ کرنے کا کوئی اخلاقی یا قانونی جواز ہے؟ کیا اعلیٰ عدلیہ نے ان جج صاحبان کو اس طرح کا کام کرنے کی اجازت دی ہوئی ہے؟ نہیں سر، وہ ایسا کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ جو کچھ ہوا یہ جج صاحب کا ذاتی فعل تو ہو سکتا ہے عدلیہ کا نہیں۔ سر، کل کو کوئی اور سول جج صاحب آئیں گے تو وہ میرے دفتر پر قبضہ کر لیں گے، پھر کوئی سینئر سول جج صاحب آئیں گے انہیں آپ کا دفتر اچھا لگے گا وہ اس پر قبضہ کر لیں گے۔ تو پھر کیا ہوگا۔ یہ سلسلہ کہیں پر تو رکنا چاہیے تھا اور میں نے اس سلسلہ کو روکنے کی ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے''۔

ڈی سی او صاحب کو میری یہ باتیں سن کر کچھ ہمت ہوئی اور تھوڑے سے نرم ہوئے اور مجھے پوچھنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ میں نے کہا،''سر، آپ اس واقعہ کی ایک رپورٹ جناب رجسٹرار لاہور ہائی کورٹ، لاہور کو بھیج دیں۔ ان لوگوں کے خلاف ضرور قانونی کارروائی ہوگی۔ کیونکہ اعلیٰ عدلیہ کبھی اس طرح کے غیر اخلاقی اور غیر قانونی کام کی نہ تو اجازت دے گی اور نہ ہی حوصلہ افزائی کرے گی''۔ لیکن جناب ڈی سی صاحب ایسا کرنے کو تیار نہ تھے۔ تب میں نے کہا،''سر، اگر آپ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو میں اس وقوعہ کی رپورٹ اپنے دستخطوں سے آپ کو بھیجتا ہوں اور اس کی ایک کاپی جناب رجسٹرار لاہور ہائیکورٹ، لاہور کو برائے اطلاع بھیج دیتا ہوں تاکہ یہ معاملہ اعلیٰ عدلیہ کے نوٹس میں آجائے اور عدلیہ کا نام بدنام کرنے والوں کے خلاف حسب ضابطہ کارروائی عمل میں لائی جا سکے۔ جس سے مستقبل میں اس طرح کے واقعات کو روکا جا سکے گا''۔ جناب ڈی سی او صاحب چار و ناچار اس بات پر راضی ہو گئے۔ لیکن مجھے اس واقعہ کی ایف آئی آر دینے سے منع کر دیا۔ بعد میں مجھے نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس واقعہ سے متعلق مکمل طور پر خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد میری ضلعی ناظم جہلم چودھری فرخ الطاف (موجودہ وفاقی وزیر فواد چودھری کے چچا) کے ساتھ بھی ایک بالکل ناجائز کام نہ کرنے کی وجہ سے ان بن ہو گئی جس کی تفصیل میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ان حالات میں میرے لئے اس ضلع کی زمین تنگ کر دی گئی اور میں نے وہاں سے اپنا تبادلہ کروا لیا اور خاموشی سے اپنے عہدے کا چارج چھوڑ کر نئی تعیناتی والی جگہ پر نئے جذبے کے ساتھ اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے شروع کر دیئے۔ اس عدالت کا بعد میں کیا ہوا میرے علم میں نہیں ہے۔ بس یہ تھی میری زندگی کی چند اہم یادداشتیں جنہیں میں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں مَیں ''قومی ڈائجسٹ'' کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں۔ (قومی ڈائجسٹ۔ مارچ 2021ء)

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سابق طالب علم رہنما

محمد انور گوندل

کی دلچسپ یادیں

محمد انور گوندل پاکستان کی طلبہ سیاست کی چلتی پھرتی تاریخ ہیں۔ انہوں نے 1967ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ (لاہور) میں ایف ایس سی پری انجینئرنگ میں داخلہ لیا۔ اس وقت ایوبی آمریت کے خلاف طلبہ برادری شعلہ بداماں تھی۔ گوندل کو قدرت نے بولنے کی صلاحیت وافر عطا کر رکھی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ماحول پر اس حد تک چھا گئے کہ کالج کی سٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہو گئے۔ پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو پھر کون سی ملکی تحریک تھی جس میں انہوں نے حصہ نہ لیا۔ قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ یونیورسٹی تعلیم سے فارغ ہوئے تو جماعت اسلامی سے وابستہ ہو گئے۔ آج کل ادارہ معارف اسلامی (منصورہ) کی انتظامی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہیں۔ کوئی دو ہفتے قبل راقم الحروف نے ان سے ایک طویل مکالمہ کیا جس میں ان سے ماضی کے طوفانی موسموں کی کہانی ان کی زبانی سنی۔ ان کی جماعت اسلامی سے وابستگی وفاداری بشرطِ استواری کی ایک زندہ مثال ہے۔ یہ سرگذشت قارئین کی نذر کی جارہی ہے۔

O......❄......O

میرا تعلق منڈی بہاؤالدین کے گاؤں ساہنا کے ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ میرے والد کا نام حاجی حافظ غلام محمد تھا، وہ چار بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ والد صاحب اپنے گاؤں کے سب سے پہلے حافظ قرآن، پہلے عالم دین اور پہلے حاجی تھے۔ ہم دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی خالد مسعود گوندل ہیں جو جماعت اسلامی ضلع منڈی بہاؤالدین شوریٰ کے رکن اور امیر زون ہیں۔ وہ حافظ قرآن ہیں اور انہوں نے درس نظامی بھی کیا ہوا ہے۔ دورہ حدیث مولانا عبدالمالک سے مکمل کیا۔ ہمارے والد صاحب کی اپنے گاؤں میں بہت عزت تھی اور ہر شخص ان کا بے حد ادب واحترام کرتا تھا۔ والد گرامی انتہائی متحمل مزاج اور دیندار انسان تھے۔ کسی پارٹی کے مابین تنازع ہوتا تو گاؤں والے کہا کرتے کہ اگر اس شخص کے حق میں حاجی غلام محمد صاحب

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بیان دے دیں تو فیصلہ اسی کے حق میں کر دیتے ہیں کیونکہ گاؤں والوں کو معلوم تھا کہ حاجی غلام محمد کسی غلط شخص کی طرفداری ہرگز نہیں کریں گے۔ والد صاحب زمیندار تھے اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے گاؤں میں پنسار کی دکان بھی کھول رکھی تھی اور حکمت بھی کرتے تھے۔ والد صاحب کی کاروبار کے معاملے میں شہرت یہ تھی کہ دوسرے دیہاتوں سے بھی لوگ ان کے پاس آیا کرتے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ اچھی چیز جائز قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یہ ہوا کہ والد صاحب کی جہاں پنسار کی دکان تھی وہاں اور بھی بہت سی دکانیں تھیں، ان دکانوں کے مالک نے جب یہ دکانیں خالی کرنے کو کہا تو والد صاحب کے ایک رشتے دار نے کہا کہ یہ دکانیں ہم خالی نہیں کریں گے کیونکہ یہ دکانیں ہماری ملکیت ہیں، اس پر مالک نے کہا کہ اگر حاجی غلام محمد صاحب خود کہہ دیں کہ یہ دکانیں ان کی ہیں تو میں مالکانہ حقوق سے دستبردار ہو جاتا ہوں۔ اس پر والد صاحب نے کہا کہ نہیں بھائی یہ دکانیں ہماری ہرگز نہیں یہ تو آپ کی ہیں، اس پر والد صاحب کا رشتہ داران سے ناراض ہو گیا۔ والد صاحب کہا کرتے تھے کہ چلو رشتہ دار تو ناراض ہوا لیکن اس سچ بیانی سے اللہ تو ضرور راضی ہوا ہوگا۔ بعد میں وہ رشتہ دار بھی اس فیصلے سے خوش تھا۔

والد صاحب 1916ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے 14 فروری 2011ء میں وفات پائی۔ شناختی کارڈ کے مطابق میری تاریخ پیدائش اپریل 1950ء ہے۔ میں نے گاؤں کے پرائمری سکول میں پانچویں کا امتحان پاس کیا، قریبی گاؤں چھموں سے مڈل اور گورنمنٹ ہائی سکول ملک وال سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد لاہور آ گیا۔

ہم چاروں بھائی بہنوں نے بنیادی تعلیم والدین ہی سے حاصل کی۔ چھوٹے بہن بھائی دونوں حافظ قرآن ہیں۔ میرا شمار ذہین طلبہ میں ہوتا تھا اور میں ہر کلاس میں مانیٹر رہا۔ پرائمری تک تو یہ کہنا مشکل ہے کہ میری کن مضامین میں دلچسپی تھی لیکن آگے جا کر میرے پسندیدہ مضامین تاریخ اور اردو تھے۔ جب میں پرائمری سکول میں پڑھتا تھا تو سکول کے ہیڈ ماسٹر امام دین صاحب تھے، بڑے شفیق اور اپنے پیشے کے ساتھ لگن رکھنے والے میٹرک دور کے اساتذہ کرام میں چودھری محمد یوسف، قاضی محمد شفیع جیسے محنتی اساتذہ نے ہمیں پڑھایا۔ یہ لوگ آج بھی یاد آتے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ وہ اپنے پیشے کے ساتھ کس قدر مخلص تھے۔ قاضی محمد شفیع صاحب نے ہماری انگریزی گرامر اس قدر مضبوط کی کہ ہم نے آج تک انگریزی گرامر میں مار نہیں کھائی۔ والدہ محترمہ ایک عظیم عورت اور شفیق ماں تھیں۔ ان کا معمول تھا کہ بالکل صبح سویرے اٹھ جایا کرتیں، تہجد پڑھتیں، دودھ دوہا کرتیں، اور اس کے ساتھ ساتھ سورۃ یاسین اور دیگر سورتوں کی تلاوت ان کی زبان پر جاری رہتی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تھی۔ احوال الآخرت بھی انھیں زبانی یاد تھی اور بڑی خوش الحانی سے پڑھتی تھیں۔ پھر نمازِ فجر کے وقت ہم تمام بھائی، بہنوں کو نماز کے لیے اٹھایا کرتیں۔ گھر کا ماحول دینی اور دیہاتی تھا۔ والدہ کے پاس گاؤں کی عورتیں قرآن پاک پڑھنے آیا کرتیں۔ میرے نانا جان صاحب کشف بزرگ تھے۔ بڑے اللہ والے تھے۔ جس وقت میرے والد صاحب قرآن پاک حفظ اور درس نظامی مکمل کر کے گاؤں آئے تو پورے گاؤں میں ہمارے گھر پر دیوبندی اور وہابی کا لیبل لگ گیا کیونکہ والد صاحب نے اکثر دینی کتابیں معروف دیوبندی عالم مولانا محمد حسین علی (واں بھچراں ضلع میانوالی) سے پڑھی تھیں۔ میں بچپن میں شرارتی بالکل نہ تھا، کیونکہ والدین کی ایسی تربیت تھی کہ ہمیں شرارت بالکل نہیں سوجھتی تھی۔ مجھے بچپن میں صرف ایک مرتبہ والد صاحب سے مار پڑی تھی جب مجھ سے ایک دن نماز مغرب قضا ہوگئی تھی۔

میٹرک کے بعد میں لاہور آ گیا اور گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لئے اپلائی کیا لیکن میرا داخلہ نہ ہو سکا۔ پھر میں نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں انٹرمیڈیٹ (پری انجینئرنگ) میں داخلہ لے لیا۔ میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں 1967ء میں آیا۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ تاریخی حبیبیہ ہال میں بہت تقریریں کیں اور جلسوں کی صدارت کی۔ میں ابتدائی دنوں ہی سے سٹوڈنٹس پالیٹکس میں آ گیا تھا، شاید یہ تاریخی واقعہ ہے کہ میں واحد ایسا کارکن ہوں جسے اسلامی جمعیت طلبہ جوائن کرتے ہی اسلامیہ کالج کا ناظم بنا دیا گیا۔ اسلامیہ کالج میں آیا تو معلوم ہوا کہ قلعہ گجر سنگھ عبدالکریم روڈ پر مسجد مبارک میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب درس دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان دروس میں باقاعدہ شریک ہونا شروع کیا۔ گو کہ میں نے مولانا مودودی کا نام بہت پہلے سن رکھا تھا۔ بچپن میں والد صاحب بہت سی دینی کتابیں اور رسائل گھر منگوایا کرتے جنہیں پڑھ کر مجھے مولانا مودودی کے متعلق علم تھا۔ والد صاحب بھی مولانا مودودی کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس دور میں ہمارے گھر نوائے وقت اخبار، تسنیم اخبار، شہاب، ایشیاء، الحسنات، الفرقان لکھنو، اور نور رام پور جیسے رسالے آیا کرتے۔ میں بات کر رہا تھا کہ میں نے مبارک مسجد میں مولانا مودودی کے دروس میں باقاعدہ جانا شروع کر دیا۔ ایک دن مبارک مسجد میں میری ملاقات زاہد بخاری (سابق صدر سٹوڈنٹس یونین کراچی یونیورسٹی)، حکیم عبدالوحید سلیمانی، نامور صحافی رمضان عادل، معروف مصنف کرنل اشفاق (جنہوں نے جنٹل مین الحمدللہ، جنٹل مین بسم اللہ جیسی مشہور کتابیں لکھی ہیں) سے ہوئی اور انہوں نے مجھ سے تعارف پوچھا تو میں نے بتایا کہ میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں پڑھتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہماری

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ایک تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ ہے جو مولانا مودودی کی فکر کو لے کر چل رہی ہے، آپ بھی اس کا حصہ بن جائیں اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں تنظیم کی باڈی تشکیل دینے کے لیے ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ میں نے کہا کہ آپ میرے کالج آ جائیں میں ہر دم حاضر ہوں۔ ایک دن مقرر ہوا اور یہ حضرات میرے کالج آئے۔ میں شروع ہی سے ایک لیڈر ٹائپ بندہ تھا، چنانچہ میں نے بہت سے لڑکوں کو جمع کرلیا اور اس طرح اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں جمعیت کا پہلا بھرپور جلسہ ہوا۔ اس جلسہ میں ان حضرات نے اعلان کیا کہ اب اس ادارے میں جمعیت کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور ہم اس ادارے میں انور گوندل کو ناظم بنا کر جارہے ہیں۔ یوں اس طرح میں اسلامی جمعیت طلبہ میں داخل ہوتے ہی ایک بڑے تعلیمی ادارے کا ناظم بنا دیا گیا۔

ان دنوں جمعیت کے سالانہ اجتماع کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں، (پھر یہ اجتماع ڈونگی گراؤنڈ سمن آباد میں ہوا تھا) اور اس وقت اس کے ناظم اعلیٰ سید منور حسن تھے۔ انہی دنوں میرا ان سے تعارف ہوا۔ ایک دن جمعیت کے چند ساتھی مجھے باغ جناح (لارنس گارڈن) لے گئے اور میں نے دیکھا کہ صفدر چودھری مرحوم اور دیگر بہت سے لوگ سید منور حسن کے گرد ایک حلقہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ جب میں پہنچا تو جمعیت کے ساتھیوں نے میرا تعارف کروایا کہ یہ انور گوندل ہیں اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں جمعیت کے ناظم ہیں۔ منور حسن بہت خوش ہوئے اور میری بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ منور حسن بڑے خوش الحان تھے، میں نے اسی موقع پر ان کی زبان سے پہلی بار ''خودی کا سرِنہاں ۔ لا الہ الااللہ'' سنی ۔ یقین جانیے کہ ایسا ایمان تازہ ہوا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بس اس ملاقات کے بعد مجھے سید منور حسن ہمیشہ ایک ناظم اعلیٰ کی صورت ہی میں نظر آئے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ ان کے بعد کوئی ناظم اعلیٰ ان جیسا نہیں آیا۔ یہ بلاشبہ ان کی ایک کرشماتی شخصیت کا اثر تھا۔ بطور ایک طالب علم راہنما سید منور حسن کی کیا ہی بات تھی۔ اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ کا دفتر نیوانارکلی میں بائبل سوسائٹی کے سامنے سعید منزل پر واقع تھا۔ میں تقریباً روزانہ دفتر جایا کرتا۔ کچھ ہی دنوں بعد طلبہ یونین کے انتخابات کا اعلان ہوگیا۔ کالج انتظامیہ کی طرف سے کہا گیا کہ جو اچھا مقرر ہوگا اسی کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت ہوگی۔ جب سلیکشن کے لیے تحریری مقابلہ ہوا تو میں پہلے نمبر پر آیا۔ سجاد نیازی صاحب راوی ہیں کہ کچھ کارکنان جمعیت نے سید منور حسن سے ملاقات کر کے اعتراض کیا کہ اس لڑکے کو صدر کے الیکشن کے لیے نامزد کیا جارہا ہے جبکہ یہ بالکل نیا کارکن ہے۔ اس پر منور حسن نے کہا کہ بھائی الیکشن انور گوندل نے لڑنا ہے، اس میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے اور عام طلبا اسے الیکشن لڑانا چاہتے ہیں، تو آپ کو کیا پریشانی ہے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جائیں اور انور گوندل کو الیکشن لڑنے دیں اور اس کے لیے دعا کریں۔ اس اجازت کے بعد میں نے بڑے جذبے کے ساتھ اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف سے بطور صدر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں الیکشن لڑا اور بھاری اکثریت سے کامیاب ہوا۔ میرے ساتھ جنرل سیکرٹری کی سیٹ پر اعجاز سیفی منتخب ہوئے۔ یہ وہی اعجاز سیفی ہیں جو پھر بعد میں معروف بابائے سوشلزم شیخ رشید کے سیکرٹری بھی رہے۔

جب میں صدر بن گیا تو کچھ ہی دن بعد ڈونگی گراؤنڈ سمن آباد میں جمعیت کا اجتماع عام شروع ہوا جس میں مَیں ایک بڑا جلوس لے کر شریک ہوا۔ اس وقت سٹیج پر ڈاکٹر کمال صاحب کا بیان جاری تھا، ڈاکٹر صاحب نومنتخب ناظم اعلیٰ تھے اور سید منور حسن تین سالہ مدت پوری کر چکے تھے۔ خیر میرا یہ تحریکی و تعلیمی سفر یونہی جاری رہا۔ میں نے بڑے بڑے جلوس نکالے اور متعدد بار گرفتار ہوا۔ ایک بار ہم نے جلوس نکال کر مال روڈ پر شراب کی دکان توڑ دی، اس موقع پر مجھے گرفتار بھی کیا گیا۔ جب 1970ء میں ڈھاکہ میں کرفیو لگا اور حافظ ادریس وغیرہ گرفتار کر لیے گئے اسی دن جب میں سعید منزل نیو انارکلی میں جمعیت کے دفتر سے باہر نکلا تو پولیس نے مجھے بھی گرفتار کر لیا۔ یہ پہلی گرفتاری تھی۔ پولیس مجھے تھانہ پرانی انارکلی لے گئی، جہاں حافظ محمد ادریس صاحب وغیرہ پہلے سے موجود تھے، رات کو بدنام زمانہ ٹارچر سیل تھانہ چونا منڈی لے گئے تاہم اس کے بعد تھانہ سول لائن میں منتقل کر دیا گیا۔ اس موقع پر پورے لاہور شہر میں دھوم مچ گئی کہ انور گوندل کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس دور کے معروف اخبار روزنامہ ''کوہستان'' نے میری گرفتاری کی خبر بڑی نمایاں طور پر شائع کی۔ ان دنوں لاء کالج کے صدر محمد نواز اور میں بہت متحرک تھے۔ حافظ ادریس صاحب بعد میں پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ہمیں تھانہ سول لائن سے کیمپ جیل کی چکی نمبر 40 میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت میرے جیل کے ساتھیوں میں حافظ محمد ادریس، معروف طبیب اور دانش ور حکیم عبدالوحید سلیمانی، رمضان عادل، رانا عبدالحی کے بھائی غلام عباس تھے۔ ہم جیل میں خوب گپ شپ کیا کرتے تھے، ظاہر ہے وہاں کوئی اور کام تو تھا نہیں، اس لیے ہم باتوں سے اپنا جی بہلایا کرتے۔ میں مختلف لیڈروں اور مولویوں کے انداز میں تقریریں کرتا اور میری تقریروں سے قیدی بہت لطف اندوز ہوتے اور کہتے یہاں ایک بڑا ''علماء'' آیا ہوا ہے۔ کرنل (ر) اشفاق حسین آج بھی مجھے اسی نام سے یاد کرتا ہے۔

اسی طرح ایک اور موقع پر چائنیز لنچ ہوم مال روڈ سے فرید پراچہ، ڈاکٹر مغیث الدین شیخ اور مجھے 16 ایم پی او کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اس بار ہم چھ ماہ قید میں رہے، جسٹس محمد اسلم ایک ایک ماہ کر کے ہماری قید بڑھاتے رہے اور ہمیں چھ ماہ بعد رہائی نصیب ہوئی۔ جس وقت ہم گرفتار ہوئے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تو فرید پراچہ کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی، اب ہم جیل میں فرید پراچہ کی شادی کے کارڈ لکھتے لیکن ہماری قید میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ اس طرح ہم نے کئی دفعہ کارڈ لکھے اور کئی دفعہ تاریخ بدلی۔ جس وقت ہم جیل میں آئے تو ہماری چکی میں چڑیوں نے گھونسلے بنائے، انڈے دیئے، بچے پیدا ہوئے اور اڑ گئے لیکن ہمیں رہائی نصیب نہ ہوئی۔ جیل میں میری اور ڈاکٹر مغیث الدین بعد میں (سربراہ شعبہ جرنلزم پنجاب یونیورسٹی) کی میٹھی لسی پر لڑائی ہوتی تھی۔ میں کہتا تھا کہ میٹھی لسی بنائیں گے جبکہ ڈاکٹر صاحب کو یہ پسند نہ تھی۔ چند روز قبل نیو کیمپس میں ان کی نماز جنازہ کے وقت تابوت میں ان کا چہرہ دیکھا تو جی چاہ رہا تھا کہ میں ان سے کہوں کہ اٹھو قاری صاحب! میں میٹھی لسی پر ضد نہیں کرتا لیکن وہ تو میٹھی بلکہ ابدی نیند سو چکے تھے۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد جمعیت نے مجھے ایم اے او کالج میں تھرڈ ایئر میں داخلہ دلا دیا، یہ طلبہ یونین کے الیکشن کے دن تھے۔ چنانچہ میں نے جمعیت کی الیکشن مہم میں حصہ لینا شروع کیا تو میری مخالفت ہوئی کہ انور گوندل کا تعلق تو اسلامیہ کالج سے ہے۔ اب میں ایم اے او کالج کی ٹینکی پر چڑھ کر بڑے جوشیلے انداز میں تقریریں کرتا اور اپنا ایم اے او کالج کا سٹوڈنٹ کارڈ دکھاتا کہ اسی کالج میں تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ الیکشن میں پورا پینل جمعیت نے جیتا لیکن مجھے اس کا نقصان یہ ہوا کہ میرا ایک تعلیمی سال ضائع ہو گیا اور پھر اگلے سال میں نے بی اے آنرز (پولیٹیکل سائنس) میں پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔

جب میں یونیورسٹی آیا تو یہاں جمعیت کے ناظم عبدالواحد کی آرمی میں سلیکشن ہو گئی اور مجھے یونیورسٹی کا ناظم بنا دیا گیا اور ہوسٹل نمبر ا ناظم صاحب کا کمرہ 331 ہی مجھے الاٹ ہو گیا۔ اس دور میں پنجاب یونیورسٹی کی جمعیت لاہور کی جمعیت ہی کا حصہ تھی، پھر انہی دنوں فیصلہ ہوا کہ پنجاب یونیورسٹی کی جمعیت کو لاہور سے الگ کر کے ایک خود مختار حیثیت دے دی جائے۔ یوں جب یونیورسٹی میں ایک الگ مقامی جمعیت کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس کا بھی پہلا ناظم مجھے ہی منتخب کیا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی میں میری نظامت کا دور ایک مشکل دور تھا۔ بی اے آنرز فرسٹ ایئر کے طالب علم کی پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے، ایم فل، اور پی ایچ ڈی طلبہ کے سامنے کیا حیثیت ہو سکتی ہے، لیکن یہ محض اللہ تعالیٰ کی نصرت تھی کہ جامعہ پنجاب میں ہم نے جمعیت کا لوہا منوایا۔ ہم کل سات ارکان فرید احمد پراچہ، عبدالشکور، ارشد چغتائی، محمد شریف نظامی، ارشاد احمد ضیا، مجیب الرحمٰن بٹ اور محمد انور گوندل تھے، لیکن کارکنان بڑے قدآور تھے۔ جن میں جاوید ہاشمی، سید احسان اللہ وقاص، مسعود کھوکھر، حافظ عتیق الرحمٰن، ہمایوں مجاہد، قاری مغیث الدین شیخ، فیاض غوری، فاروق

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

غازی، خالد اللہ دتہ، طیب، شفاعت، حافظ اقبال (باٹنی والے)، خالد ہمایوں، اور یا مقبول جان، چاچا شاہد، سلیم جانگی، طارق شلیے، منظور خان، ارشد کمال، ڈاکٹر نذیر شہید کے بھائی محمد یوسف، لیاقت لکی، میاں عبدالحق، شوکت (ھیلے کالج)، کلیم خورشید، حافظ اسرائیل، سلیم طاہر، اسلم گورائیہ وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ کچھ اور دوست جمعیت کے نظم میں تو شامل نہیں تھے، مگر ہمارے نظریاتی دست و بازو تھے۔ ان میں افتخار فیروز، محمد منور، عبدالرؤف، نوید احمد، فاروق ٹیرر، شیخ عبدالرؤف، مجاہد کامران، مرزا منظور، اکرم شیخ اور سینکڑوں دیگر طلبہ شامل تھے۔ اتنے باصلاحیت لوگوں کا ناظم ہونا میرے لیے باعثِ اعزاز تھا اور اب بھی میں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

جاوید ہاشمی جب سٹوڈنٹس یونین کے سیکرٹری بنے تو ان کے ساتھ صدر یونین حفیظ خان تھے۔ حفیظ خان فی الواقع ایک بڑا نام تھا اور ہر دلعزیز راہنما تھا۔ ان کے بعد بالترتیب جاوید ہاشمی، فرید پراچہ، عبدالشکور اور مسعود کھوکھر یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ جاوید ہاشمی کے دور تک سٹوڈنٹ یونین کی ایک آدھ سیٹ مخالفین لے جاتے تھے، خصوصاً خواتین کی نشست۔ لیکن اس کے بعد ہمارا پورا پینل کامیاب ہوتا رہا۔ خواتین کی نشستیں بھی ہمارے ہی حصے میں آتی رہیں۔ اسی پر بس نہیں ہم نے نظریاتی کام اس قدر آگے بڑھایا کہ سٹوڈنٹس یونین، اساتذہ کی اکیڈیمک سٹاف ایسوسی ایشن اور ایمپلائز یونین تینوں پر ہمارے نظریاتی گروپ کامیاب ہوئے۔

ہمارے مخالفین بھی بڑے بڑے لوگ تھے۔ راشد بٹ مرحوم، راجہ انور، جہانگیر بدر مرحوم، غلام عباس، مسعود باقر اور رانا ارشد (جہاز اغوا فیم) وغیرہ۔ یہ مخالفت اس دور تک ہی تھی اب تو جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو بڑے پرتپاک طریقے سے ملتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست راجا منور ہیں جو لیفٹ، رائٹ اور انتظامیہ کے ساتھ یکساں تعلق رکھتے تھے اور ابھی تک وہ اسی روایت پر قائم ہیں۔ ہمارے دور میں ڈاکٹر سراج، ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر منیر الدین چغتائی، ڈاکٹر خیرات ابن رسا اور پروفیسر شیخ امتیاز علی وائس چانسلر رہے، ایک سے ایک بڑھ کر سکالر اور منتظم تھا۔ اساتذہ میں ڈاکٹر خالد علوی (اسلامیات)، ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی، منور ابن صادق، ڈاکٹر نسیم شوکت، پروفیسر محمد شفیع (آئی ای آر)، پروفیسر محمد اسماعیل بھٹی (انگلش)، پروفیسر محمد اسلم (تاریخ)، پروفیسر شفیق جالندھری (صحافت) اور ڈاکٹر عبدالصمد ہرائی (شماریات) بڑی شفقت کرتے تھے اور راہنمائی بھی فرماتے تھے۔

ہم نے یونیورسٹی میں طالبات میں بھی ایک الگ یونٹ ''ویمن کونسل'' کے نام سے قائم کیا۔ ہم سے پہلے طالبات کی تمام نشستیں لیفٹ کے لوگ لے جایا کرتے تھے۔ ویمن کونسل کا فائدہ یہ ہوا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کہ اب طالبات کی نشستیں بھی ہمیں ملنے لگیں۔لیفٹ والوں نے جو خواتین ونگ بنایا تھا اس کا نام ''ویمن فرنٹ'' تھا۔معروف پولیس افسر ذوالفقار چیمہ کی ہمشیر بھی ہمارے ساتھ سینئر کلاس میں تھیں۔وہ بڑی متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں، ہم سب لوگ انہیں باجی کہہ کر پکارتے تھے۔انھوں نے فی الواقع بڑی بہن کا کردار نبھایا۔ویمن کونسل میں چیمہ صاحب کی ہمشیر نے بہت کام کیا اور طالبات کو اسلامی ومشرقی آداب زندگی کی تعلیم دینے میں مگن رہتی تھیں۔جامعہ میں ''اسلامی جمعیت طالبات'' تو بعد میں بنی، سب سے پہلے ہم نے ''ویمن کونسل'' کے نام سے کام شروع کیا تھا۔پھر ہم نے اپنے مخلص کارکنوں کی مدد سے یونیورسٹی کے ہر ڈیپارٹمنٹ میں الیکشن جیتا، نمایاں ڈیپارٹمنٹ آئی ای آر تھا، جس کے دو دفعہ فیاض غوری صدر بنے۔ہوسٹلوں کے الیکشن کی بڑی گہما گہمی ہوتی تھی۔تقریبات حلف برداری کے لیے میں اکثر منتخب طلبہ و طالبات کو تقریریں لکھ کر دیا کرتا تھا۔ایک بار لطیفہ یہ پیش آیا کہ ایک لڑکا تقریر کر رہا تھا تو وہ ایک جگہ اٹک گیا تو اس موقع پر احسان اللہ وقاص صاحب نے بآواز بلند کہا کہ گوندل صاحب! اب آپ اگلا لفظ بتائیں اس کو۔اس پر پورا مجمع قہقہوں سے گونج اٹھا۔وقاص صاحب کا اندازہ صحیح تھا کہ وہ تقریر میں نے ہی لکھی تھی۔

ہم نے سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے لان کو ہائیڈ پارک بنایا ہوا تھا۔بڑے بڑے جلسے ہوا کرتے تھے، پروفیسر خالد ہمایوں بڑے خوش نویس تھے۔یہ ہمارے بڑے خوبصورت پوسٹر اور اشتہارات لکھا کرتے۔خالد ہمایوں صاحب بڑے ہی خوبصورت انسان ہیں۔اکثر پنجابی میں باتیں کرتے او رہمیں نئی نئی خبریں سنایا کرتے تھے۔یہ جب بھی پوسٹر لکھا کرتے تو سب سے اوپر نمایاں طور پر میرا نام ''محمد انور گوندل۔ناظم پنجاب یونیورسٹی'' لکھا کرتے اور جاوید ہاشمی وغیرہ کا نام نیچے لکھتے۔جب لوگ اعتراض کرتے تو ہمایوں صاحب کہتے کہ اس میں کیا شک ہے کہ گوندل صاحب ہمارے ناظم ہیں، لہٰذا نمایاں نام تو انہی کا ہونا چاہیے۔خالد ہمایوں کا تعلق گجرات سے ہے۔ان کے قریبی احباب میں اوریا مقبول جان اور جاوید اقبال رانا مرحوم تھے۔اوریا مقبول جان گورے چٹے اور رانا سانولے تھے اس لیے یار لوگ ان دونوں کو سفید اور سیاہ سامراج کہہ کر پکارتے تھے۔

ہمارے دور میں تین تحریکیں برپا ہوئیں۔1-بنگلہ دیش نامنظور، 2-تحریک ختم نبوت 1974ء اور 3-تحریک نظامِ مصطفیٰؐ 1977ء۔ان تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا۔بنگلہ دیش نامنظور کا آغاز پنجاب سٹوڈنٹس کونسل کے اجلاس منعقدہ ایس ٹی سی (نیو کیمپس) سے ہوا۔صدارت جاوید ہاشمی صدر پنجاب سٹوڈنٹس کونسل نے کی۔یہ تحریک اتنی زوردار تھی کہ آخر ذوالفقار بھٹو کو کہنا پڑا کہ ''اگر آپ لوگ کہتے ہیں نامنظور، تو ہم بھی منظور نہیں کرتے۔'' اس تحریک میں وحید شہید نے اپنا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

خون پیش کیا۔ اسی شہید کے نام پر ہم نے آئی ای آر کے کمرہ کثیر المقاصد (Multipurpose room) کو وحید شہید کے نام سے موسوم کر دیا۔

29 مئی 1974ء کو میں پنجاب یونیورسٹی کے آئی آر سیکشن میں بیٹھا ہوا تھا کہ خبر ملی کہ ربوہ ریلوے سٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلبہ پر قادیانیوں نے تشدد کیا ہے۔ (یہ تحریک ختم نبوت کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے)۔ ڈاکٹر ارباب عالم جو فرید پراچہ کے بہنوئی ہیں یہ اس وقت نشتر میڈیکل کالج ملتان کے صدر تھے۔ اس واقعہ میں ارباب عالم اور دیگر لوگ زخمی ہوئے۔ جس وقت ہمیں اس واقعہ کا علم ہوا تو ہم نے عصر سے لے کر مغرب تک تمام قادیانی طالب علموں کا سامان ہاسٹل سے اٹھا کر باہر پھینک دیا اور ان طلبہ کو ہوسٹلوں سے باہر نکال دیا۔ میں ایک جلوس کی صورت میں قادیانی اساتذہ کے پاس گیا کہ آپ اساتذہ ہیں اور آپ کی ایک عزت ہے، بس ہم آپ سے درخواست کر رہے ہیں کہ کل سے آپ یونیورسٹی نہ آئیں۔ 7 جون کو نیلا گنبد میں عظیم ریلی منعقد کی گئی۔ پولیس اور ایس ایف ایس کی بھاری تعداد نے ریلی پر دھاوا بول دیا۔ (بھٹو حکومت نے اپوزیشن پر تشدد کرنے کے لیے فیڈرل سیکیورٹی فورس کے نام سے ایک نیم عسکری تنظیم بنائی تھی)۔ 30 طلبہ کو گرفتار کر لیا گیا، لیکن یہ ریلی پھر بھی منعقد ہوئی۔ گرفتار شدگان میں لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کے ناظمین جمعیت (احسان اللہ وقاص و راقم الحروف) دونوں یونیورسٹیوں کے صدور فرید پراچہ اور نعیم سرویا شامل تھے۔ 9 جون کو ہماری رہائی ہوئی۔ 14 جون کو ملک گیر ہڑتال کی گئی۔ اسی روز سینیٹ ہال پنجاب یونیورسٹی میں جلسہ منعقد ہوا۔

15 جون کو اسلامی جمعیت طلبہ نے پنجاب بھر کا دورہ کرنے کے لیے مقررین کی تین ٹیمیں تشکیل دیں۔ راولپنڈی زون جس میں راولپنڈی، کیمبلپور، گجرات، جہلم اور سرگودھا کے اضلاع شامل تھے۔ حفیظ اللہ خان نیازی، صدر اسلام آباد یونیورسٹی، حافظ وصی محمد، صدر زرعی یونیورسٹی فیصل آباد اور ناظم صوبہ لیاقت بلوچ پر مشتمل ٹیم تھی۔ وسطی پنجاب کے اضلاع سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائلپور، جھنگ اور ساہیوال میں فرید پراچہ، راجہ شفقت، حفیظ احمد اور راقم الحروف تھے۔ اس وفد کے میر کارواں عبدالحفیظ احمد تھے۔ ہمارے قافلے میں ہمایوں مجاہد، محمد فاروق اور فاروق غازی بھی شامل تھے۔ ڈیرہ غازی خاں، بہاولپور، بہاولنگر، ملتان، مظفر گڑھ اور رحیم یار خان کی طرف عبدالشکور، منظور خان، زین العابدین اور حافظ عتیق الرحمان تھے۔ لاہور کا محاذ نعیم سرویا، مسعود کھوکھر، اکمل جاوید اور حافظ شفیق الرحمان نے سنبھالا۔ ان ٹیموں نے سات دنوں میں سات سات اضلاع کا طوفانی دورہ کیا اور تقریباً 150 جلسہ ہائے عام سے خطاب کیا۔ اس دورے نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پنجاب کی غیرت کو جگا دیا، ہر فرد تحریک ختم نبوت کا علم ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا: خاتم الانبیاء...... مصطفیٰ مصطفیٰ! یہ نعرہ قادیانیوں پر برق بن کر گرا اور قادیانی نبوت کے محل میں دراڑیں پڑ گئیں۔ 15 جون سے 27 جون تک تڑپا دینے والی گرمی میں دن اور رات کی تمیز مٹاتے ہوئے ختم نبوت کے قافلہ نے اپنا پہلا دورہ مکمل کیا۔ اس دوران کئی دلچسپ واقعات پیش آئے۔ ایک موقع پر ایک مقرر نے کہا کہ جب میں تقریر کرتا ہوں تو سامعین میری مٹھی میں بند ہوتے ہیں، جس پر فرید پراچہ بول اٹھے کہ جناب والا ذرا مٹھی کھول دیں، سامعین کا دم گھٹ رہا ہے۔

جب ہم چنوکی پہنچے تو وہاں پر ایک مولوی صاحب بگڑ گئے کہ یہ جلسہ نہیں ہونے دوں گا۔ ہم نے انہیں کہا کہ جناب یہ جلسہ آپ ہی کی صدارت میں ہوگا۔ اس پر وہ خوش ہو گئے اور پھر یہ جلسہ عام انہی کی صدارت میں ہوا۔ ہمارے گروپ نے نارووال، ظفروال، سیالکوٹ، چونڈہ، سمبڑیال، منڈی واربرٹن، شیخوپورہ، چنیوٹ، فیصل آباد، گوجرہ، سمندری، کمالیہ، ماموں کانجن، چیچہ وطنی، ساہیوال، عارف والا، اوکاڑہ، رینالہ خورد، قصور، کھڈیاں، چونیاں، وزیرآباد، سوہدرہ، کامونکی، گوجرانوالہ، قلعہ دیدار سنگھ اور کئی دوسرے شہروں میں بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کیا۔ ان جلسوں میں ہمایوں مجاہد کی ایک نظم کے اس شعر کو بہت داد ملتی تھی ۔

راہ روانِ شوق یہاں سر کے بل چلو
یہ ربوہ کی سرزمیں نہیں، ارضِ رسولؐ ہے

26 جون راجگڑھ لاہور میں جلسہ عام تھا اور 27 جون کو بعد از نماز مغرب جامعہ مسجد خضراء سمن آباد اور بعد نماز عشا اچھرہ میں پروگرام تھے۔ لیکن گورنمنٹ کو ہماری تھکاوٹ کا کچھ زیادہ ہی احساس ہو گیا تھا چنانچہ اسی شام مسجد خضراء کے جلسے کے بعد راقم الحروف کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ گرفتاری بڑی دلچسپ تھی۔ مجھ سے پہلے ضیاءاللہ خاں نے تقریر کی اور فوری طور پر لباس تبدیل کر کے دھوتی باندھ لی اور قمیض کندھے پر رکھ کر باہر نکل گیا۔ میری تقریر کے بعد حسب پروگرام بتیاں بجھا دی گئیں لیکن میرے دائیں بائیں دو افراد نعرے لگاتے ہوئے میرے ساتھ باہر آئے۔ دراصل وہ سفید کپڑوں میں پولیس والے تھے۔ مجھے گرفتار کر کے تھانہ مزنگ کی حوالات میں بند کر دیا گیا، آدھی رات کو حاجی عبدالرشید کھوکھر صدر انجمن صرافہ بازار ایک وفد کے ساتھ آئے اور تھانے کے عملے کے رویے پر افسوس کا اظہار کیا کہ ایک ختم نبوت کے مجاہد کو چوروں اور ڈاکوؤں کے ساتھ بند کیا ہوا ہے۔ تھانے کے عملے نے مجھے حوالات سے نکال کر صحن میں چارپائی مہیا کر دی اور اگلی دوپہر کوٹ لکھپت جیل پہنچا دیا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پہلے دن میں اکیلا تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے ظفر جمال بلوچ، فرید پراچہ، منصور الحمید، مسعود کھوکھر، ہمایوں مجاہد، راجہ شفقت، عبدالشکور، نعیم سرویا اور چاچا شاہد وغیرہ بھی جیل میں پہنچ گئے۔ ۱۱ر جولائی کو ہماری رہائی عمل میں آئی۔ 18 اگست کو پنجاب سٹوڈنٹس کونسل کا کنونشن فرید پراچہ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ ڈاکٹر خالد علوی نے ختم نبوتؐ پر مدلل تقریر کی۔ اسی رات فرید پراچہ نے مسلم مسجد لوہاری گیٹ میں پنجاب بھر کے طلبہ راہنماؤں سے ناموسِ رسالتؐ کے لیے جان لڑا دینے کا حلف لیا۔ 5 ستمبر کو پنجاب بھر کے تعلیمی اداروں میں ہڑتال ہوئی۔ 7 ستمبر 1974ء یوم انتظار تھا۔ رات نو بجے ٹیلی ویژن سے قومی اسمبلی کے تاریخ ساز فیصلے کی خبر نشر ہوئی تو ہر چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ ہر زبان پر مبارک باد کے الفاظ تھے۔ آج طلبہ کی قید و بند کی صعوبتیں رنگ لائیں۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج سید مودودیؒ کو بھی بے پایاں خوشی ہوگی جنھوں نے 1953ء میں پھانسی کی سزا سن کر بھی مطالبہ کیا تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔ ''یہی اس مسئلے کا حل ہے۔'' ہمارے سر خدا کے حضور جھک گئے۔ بے ساختہ زبان پر یہ الفاظ تھے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جب حافظ ادریس نے پنجاب یونیورسٹی طلبہ یونین کے الیکشن میں حصہ لیا تو ان کا رزلٹ روک لیا گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ وائس چانسلر علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب سے ان کے گھر پر ملاقات کرنی چاہیے۔ ہم لوگ سعید منزل (نیو انارکلی) جمعیت کے دفتر سے نکلنے لگے تو کچھ دوستوں نے کہا کہ انور گوندل تو جمعیت کے امیدوار رکنیت ہیں تو لہذا ان کو ساتھ نہیں لے جانا چاہیے۔ میں ان دنوں راج گڑھ میں رہتا تھا۔ رمضان عادل، پروفیسر اکرم طاہر، رانا عبدالحیی، چودھری نیاز محمد، اختر ورک، فضل الرحمٰن، امتیاز شاہ سب لوگ اکٹھے رہتے۔ سحری کے وقت یہ لوگ وائس چانسلر سے ملاقات کر کے واپس آئے تو ان سب کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ میں نے کہا کہ ملاقات کیسی رہی، آپ لوگ افسردہ کیوں ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ وہاں پر بس عجیب سی صورتحال پیش آگئی کہ کسی طرح وی سی صاحب کے ہاں ایک آدھ گملا ٹوٹ گیا اور بدمزگی پیدا ہوگئی۔

اگلی صبح ہم اٹھے تو وائس چانسلر کی طرف سے یہ بیان اخبارات میں چھپا ہوا تھا کہ ''اگر کسی نے استاد کی عزت دیکھنی ہو تو وہ میرے گھر کا نقشہ دیکھ لے''۔ اس بیان سے ہم سب لوگ بہت پریشان ہوئے۔ یہ بیان جب سید مودودی نے پڑھا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور افسوس کرنے لگے کہ کیا میں نے اس کام کے لئے اسلامی جمعیت طلبہ بنائی تھی کہ ایک استاد کی عزت بھی غیر محفوظ ہو جائے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

قاری صغیر کے بعد لاہور جمیعت کرنل اشفاق (معروف مصنف) ناظم لاہور بن گئے لیکن یہ بھی چند دن بعد آرمی میں سلیکٹ ہو کر چلے گئے۔ لاہور میں جمیعت کے جتنے بھی ناظم آئے وہ سب لاہور سے باہر کے رہنے والے، صرف کرنل اشفاق ہی پہلے لاہورئیے تھے جو ناظم جمیعت بنے۔کرنل اشفاق کے جانے کے بعد مجھے لاہور کا قائم مقام ناظم بنا دیا گیا حالاں کہ میں امیدوار رکنیت تھا۔ لاہور جمیعت کے ساتھ احمد بلال محبوب، ڈاکٹر محمد یونس، ڈاکٹر ریاض، خالد نواز، خلیق ارشد اور نعمان بٹ جیسے بڑے بڑے کارکن تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں ایم اے صحافت کروں لیکن میں جمیعت کے حوالے سے حکومت کی نظروں میں اس قدر بدنام تھا کہ پنجاب یونیورسٹی میں جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ پروفیسر وارث میر صاحب نے مجھے داخلہ دینے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ میرٹ لسٹ میں میرا دوسرا نمبر تھا۔ جب میں نے وارث میر صاحب سے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ وزیراعلیٰ پنجاب صادق قریشی کا براہ راست حکم ہے کہ انور گوندل کو داخلہ نہیں دینا، اب میں ان کے حکم کا پابند ہوں۔ بعد میں ورکنگ جرنلسٹ کے طور پر روزنامہ وفاق کے ایڈیٹر مصطفیٰ صادق نے وارث میر کو لکھا کہ یہ ہمارا ورکنگ جرنلسٹ ہے اسے داخلہ دیا جائے لیکن مجھے داخلہ نہ مل سکا۔ اس میں مَیں سمجھتا ہوں کہ وارث میر صاحب کا کوئی قصور نہ تھا وہ وزیراعلیٰ پنجاب کے حکم کے پابند تھے۔ اس کے بعد میں نے ایم اے اسلامیات پرائیویٹ طور پر کیا۔ (اب آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ اب اس عمر میں میرا ذوق بیدار ہوا کہ مجھے ایم فل کرنا چاہیے، اور اب میں نے ایم فل میں داخلہ لیا ہے)۔ اس دور میں جماعت اسلامی اور اسلامی جمیعت طلبہ کا آپس میں بہت قریبی تعلق تھا۔ جس وقت 1970ء کا الیکشن ہوا تو پروفیسر عثمان غنی جماعت اسلامی کی طرف سے منڈی بہاؤالدین سے الیکشن لڑ رہے تھے، انہوں نے اس وقت کے ناظم جمیعت لاہور قاری صغیر سے اجازت لی کہ انور گوندل کو انتخابی مہم کے لیے مجھے دے دیں، چنانچہ میں نے ان کی انتخابی مہم میں بھرپور حصہ لیا اور تقریریں کیں۔

1977ء میں ایک مرتبہ پھر مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میرے ساتھ فاروق غازی اور ملک جاوید اختر بھی شامل تھے۔ جس وقت ہم رہا ہو کر آئے تو بھٹو کے خلاف قومی اتحاد کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ جب رہائی کے بعد اچھرہ میں جمیعت کے دفتر پہنچا تو وہاں فرید پراچہ کے والد مولانا گلزار احمد مظاہری تشریف فرما تھے، مجھے کہنے لگے کہ، بچے! آپ نے پنجاب یونیورسٹی میں فرید پراچہ کو صدر بنوایا تھا، تو اب یہ آپ کا بھائی فرید پراچہ ایم پی اے کی سیٹ پر قومی اتحاد کی طرف سے حصہ لے رہا ہے، اب بھی تم اس کا ساتھ دو۔ چنانچہ میں نے ان کی بھرپور انتخابی مہم چلائی۔ فرید پراچہ ایم پی اے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کی نشست پر امیدوار تھے جبکہ ایم این اے کی نشست پر چودھری رحمت الٰہی امیدوار تھے۔ چودھری صاحب جب پراچہ صاحب کے حلقے میں آتے تو ہماری تقریریں سنتے اور جلسوں کے انتظامات دیکھتے تو بہت خوش ہوتے، چنانچہ اگلے الیکشن میں چودھری صاحب نے مجھے اپنے پاس رکھا۔

1978ء میں جنرل ضیاء الحق نے اپنی کابینہ میں جماعت اسلامی کے چار ارکان بھی شامل کیے: ان میں پروفیسر خورشید احمد، چودھری رحمت الٰہی، پروفیسر عبدالغفور احمد اور محمود اعظم فاروقی شامل تھے۔ اس موقع پر میاں طفیل محمد نے چودھری صاحب سے کہا کہ جناب آپ تو اسلام آباد چلے جاتے ہیں لیکن آپ کے حلقے کے لوگ آپ کے آفس آتے ہیں تو انہیں کوئی سنبھالنے والا نہیں ہوتا۔ میاں صاحب کے حسب فرمان مجھے چودھری صاحب نے اپنا پبلک ریلیشنز آفیسر مقرر کر دیا۔ میں دفتر میں مستقل بیٹھنے لگا اور لوگوں کے مسائل سن کر انہیں چودھری صاحب تک پہنچایا کرتا۔ اس دور میں ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ پورے ملک میں نمک کا قحط پڑ گیا اور لوگ ایک کلو کی خاطر مارے مارے پھرنے لگے لیکن نمک نہیں ملتا تھا۔ یہ عجیب بات تھی اور معلوم نہ ہو سکا کہ نمک مارکیٹ سے کیوں غائب ہو گیا تھا۔ اس وقت اگر کسی کو ایک گاڑی نمک کی مل جاتی تو وہ سمجھتا کہ مجھے خزانہ مل گیا ہے۔ ان دنوں ہم کوشش کر کے لوگوں کو نمک دلوا دیتے تو لوگ بہت دعائیں دیتے۔ ادارہ معارف اسلامی کراچی 1963ء میں قائم ہوا۔ اس کے بعد اس کی ایک شاخ ڈھاکہ میں قائم ہوگئی۔ مولانا سید مودودی خود ہی اس ادارے کے سربراہ تھے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ ایسا ہی ایک ادارہ لاہور میں ہونا چاہیے۔ اس بارے میں مشاورتیں ہوتی رہیں تا آنکہ 1978ء میں مولانا سید مودودی کو سعودی حکومت کی طرف سے پہلا شاہ فیصل ایوارڈ ملا۔ جب سعودی حکومت نے شاہ فیصل ایوارڈ جاری کیا تو سب سے پہلا ایوارڈ ہی مولانا سید مودودی کو عطا کیا۔ ایوارڈ وصول کرنے کے لیے مولانا کے بیٹے سعودی عرب گئے۔ اس موقع پر مولانا سید مودودی نے تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ مجھے یہ ایوارڈ اسلام کی خدمت کے عوض ملا ہے اور میں اس رقم کو اسلام ہی کی خدمت پر خرچ کروں گا۔

بہر حال اس رقم سے لاہور میں ادارہ معارف اسلامی قائم کیا گیا۔ 1979ء میں یہ ادارہ قائم ہوا اور اس کا ایک چھوٹا سا دفتر اچھرہ میں بنا۔ دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ جاوید احمد غامدی ابتداء میں اس ادارے کے ساتھ وابستہ ہوئے لیکن وہ جلد ہی ایکسپوز ہو گئے اور چند ماہ بعد رخصت ہو گئے۔ ستمبر 1979ء میں مولانا سید مودودی کا انتقال ہوا تو میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی اس ادارہ کے سربراہ بن گئے۔ دسمبر 1979ء میں کراچی میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مولانا سید مودودی کی شدید خواہش کے مطابق لاہور میں اس ادارے کا باقاعدہ کام شروع کیا جائے۔ اس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

فیصلے کے مطابق مولانا خلیل احمد حامدی صاحب کو ادارے کا پہلا ڈائریکٹر بنادیا گیا۔ ناظم مالیات شیخ فقیر حسین جو 1941ء سے جماعت اسلامی کے ناظم مالیات چلے آرہے تھے، وہ بھی اس میٹنگ میں موجود تھے۔ وہ لاہور آئے تو مجھے کہنے لگے کہ اس اجلاس میں جب فیصلہ ہوا کہ ادارہ کے ڈائریکٹر خلیل حامدی ہوں گے تو اس پر میاں طفیل محمد نے کہا کہ حامدی صاحب کے ساتھ ایک بندہ اور بھی ہونا چاہیے جو ان کی مدد کر سکے، تو شیخ صاحب نے کہا کہ انور گوندل کو ان کے ساتھ لگا دیا جائے۔ میں اس وقت جماعت اسلامی پنجاب کا سیکرٹری اطلاعات تھا۔ میاں طفیل محمد نے کہا کہ آج کل جماعتوں پر تو ویسے بھی پابندی ہے (یادر ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے 79-1978ء میں تمام سیاسی جماعتوں پر مکمل پابندی عائد کر دی تھی) اور انور گوندل فارغ ہے تو اس سے ادارہ معارف اسلامی میں کام لیا جائے۔ بس وہیں سے میری منظوری ہوئی اور تب سے اب تک اس ادارے کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ جب خلیل احمد حامدی صاحب مجھے ملے اور انہوں نے بھی اس فیصلہ سے آگاہ کیا تو میں نے کہا کہ میں تو لیکچرار شپ کا ارادہ رکھتا ہوں تو انہوں نے فرمایا کہ بھائی تم نوجوان ادھر اُدھر نکل جاؤ گے تو یہ جماعت کا کام کون کرے گا۔ بس یہ ان کا اخلاص تھا جس سے میں بہت متاثر ہوا اور میں نے ان سے کہا کہ بس میں آج کے بعد کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گا، آپ مجھے جہاں کھڑا کریں گے وہیں پر کام کروں گا۔ وہ دن اور آج کا دن' میں نے پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ یکم جنوری 1980ء کو میرے باقاعدہ آرڈر کر دیئے گئے، اس دفتر کا باقاعدہ آغاز بھی یکم جنوری 1980ء میں ہوا اور میرا تقرر بھی اسی دن ہوا۔ میں مسلسل چالیس سال سے اپنے اسی مشن میں مگن ہوں جس مشن پر مجھے میرے بزرگ اور مشاہیر چھوڑ کر گئے تھے۔ آج بھی میری تنخواہ صرف چالیس ہزار روپے ہے۔

یکم جنوری 1980ء سے آج تک ادارہ معارف اسلامی کے تحت 371 علمی اور فکری کتابیں شائع ہو چکی ہیں جبکہ چھوٹی کتابوں اور کتابچوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ یہاں وضاحت کرتا چلوں کہ 371 ٹائٹل ہیں جب کہ کئی کتابوں کی کئی جلدیں ہیں اور پھر ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یکم جنوری 1980ء کو میں نے اس ادارے میں سب سے پہلے صرف ایک میز اور ایک کرسی لا کر رکھی تھی اور الحمدللہ آج یہ ایک مستحکم ادارہ بن چکا ہے۔ بڑے بڑے حضرات نعیم صدیقی، جسٹس ملک غلام علی، مولانا خلیل احمد حامدی، سید شبیر احمد، سید نظر زیدی، الیف الدین ترابی، جمیل احمد رانا، چودھری محمد اسلم سلیمی اور حافظ محمد ادریس جیسی شخصیات اس ادارے کے ساتھ کام کرتی رہیں۔ ایک وسیع لائبریری بھی ہے جس میں ادارے کی مطبوعات کے علاوہ ہزاروں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کتابیں رکھی ہیں۔ شاید میں لیکچرار ہوتا تو اس قدر کام نہ کر پاتا، بس یہ اللہ تعالیٰ ہی کی کرم نوازی ہے کہ اس نے مجھ سے یہ کام لے لیا۔ میں نے مولانا سید مودودی صاحب کو پہلی بار سرگودھا میں اس وقت دیکھا جب وہ ایک سیاسی جلسے کے لیے تشریف لائے تھے اور میں اپنے والد صاحب کے ساتھ اس جلسے میں گیا تھا۔ اس وقت میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کے بعد جب لاہور آ گیا تو پھر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ مبارک مسجد میں ان کے دروس میں باقاعدہ شریک ہوتا تھا۔ جس وقت اسلامی جمعیت طلبہ کا دفتر سعید منزل نئی انارکلی سے شفٹ ہو کر اچھرہ آ گیا تو پھر ہم ہر روز اور ہر وقت مولانا سید مودودی صاحب کو دیکھا کرتے، ان کی خدمت کرتے، ان کی باتیں سنتے۔

ایک زمانے میں ہم جمعیت کا اس قدر کام کرتے تھے کہ مولانا کے ہاں ان کے لان میں سو جاتے تھے، اس دور کے بڑے دلچسپ واقعات اب بھی یاد آتے ہیں۔ جمعیت کی طرف سے یہ حکم تھا کہ جو بھی رکن جمعیت صبح کی باجماعت نماز نہیں پڑھے گا وہ اپنے خرچ پر ناشتہ کرے گا اور اسے اجتماعی ناشتہ نہیں دیا جائے گا۔ ہمارے ایک دوست ضیاء اللہ خان منج ایڈووکیٹ ہیں۔ یہ حمایت اسلام لاء کالج میں یونین کے صدر رہے تھے۔ یہ بعد میں بڑے ممتاز قانون دان بن گئے اور ہائی کورٹ بار کے سیکرٹری بھی منتخب ہوئے۔ ایک رات یہ کہیں سے لیٹ آئے اور آ کر سو گئے۔ جب ہم نے انہیں صبح نماز کے لیے اٹھایا تو انہوں نے سوتے سوتے جیب سے چار آنے نکالے اور کہا کہ یار میرا بند باہر سے لے آنا اور مجھے اب سونے دو۔ اس پر ہم تمام لوگ بہت ہنسے اور محظوظ ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی میں میرا کمرہ نمبر 331 تھا اور وہی جمعیت کا دفتر بھی تھا۔ ہر وقت اس کمرے میں رونق لگی رہتی۔ جس وقت سعید منزل نئی انارکلی میں دفتر تھا تو ہم نے ایک بہت بڑی رضائی بنائی ہوئی تھی اور سردیوں میں تمام لوگ اسی ایک رضائی میں دبک کر سو جاتے۔ عجیب بے فکری کا زمانہ تھا۔ جب حافظ ادریس نے طلبہ یونین کا الیکشن لڑا تو ان کی مہم میں کوپر روڈ کالج کی پرنسپل زینب کاکاخیل اپنی طالبات کو بھی بھیجا کرتی تھیں، اس پر لیفٹ کی طالبات مذاق اڑایا کرتی تھیں کہ حافظ صاحب آپ تو بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو دنیا میں ہی حوریں مل گئی ہیں۔ جب حافظ ادریس کا رزلٹ تیار ہو رہا تھا، تو اس موقع پر گولی چلی اور ایک لڑکا برکات جان کی بازی ہار گیا۔ زندگی کی اس قدر طویل یادداشتیں ہیں کہ انسان محفوظ کرنے بیٹھے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آ جائے۔ مولانا سید مودودی کی مجالس میں ہم بہت سے نوجوان بیٹھا کرتے تھے۔ مولانا کی باتیں سنتے، ان سے بہت کچھ سیکھتے۔ ان کی عصر کی مجلس تو خاص طور پر بہت مشہور تھی۔ اس مجلس میں مولانا ہر موضوع پر گفتگو فرماتے۔ لوگ مختلف سوالات بھی کیا کرتے۔ ہمیں اس وقت بہت خوشی محسوس ہوتی جب ہم مولانا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کی جائے نماز اور ان کا پان دان اٹھا کرلاتے۔ مولانا بڑے خوبصورت، وجیہہ اور نفیس قسم کے انسان تھے۔ بڑے زندہ دل اور خوش مزاج تھے۔ ان میں بذلہ سنجی بھی کمال کی تھی۔ آپ مولانا کی نفاست کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وہ جو پان اور سپاری کھاتے ان کے منہ اور سفید کپڑوں پر ایک معمولی سا داغ بھی نہیں لگتا تھا، حالانکہ جو لوگ پان کھاتے ہیں ان کا چہرہ اور کپڑے داغ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مولانا کا چہرہ بہت نورانی تھا، شخصیت میں ایک سحر تھا، یہی وجہ تھی کہ ایک مرتبہ فیصل آباد سے ایک شخص خنجر سے مسلح ہو کر آیا کہ مولانا کو قتل کرنا ہے۔ لیکن جب اس کی نظر مولانا کے چہرے پر پڑی تو وہ دم بخود رہ گیا کہ نہیں نہیں ایسی نیک ہستی پر خنجر نہیں چلایا جا سکتا۔ مولانا خوش گفتار اور خوش لباس بھی تھے۔ مولانا کے کمرے میں ہر ہر چیز بڑے سلیقے اور قرینے سے رکھی ہوتی۔ کتابیں، پاندان، ادویات ایک ایک چیز بڑی خوبصورتی سے بجی ہوتی۔ مولانا جو ادویات استعمال کرتے تھے ان کی ترتیب کچھ یوں ہوتی تھی کہ ایک لائن میں دوائیں بجی ہوتی تھیں اور جو جو دوا استعمال کرتے جاتے وہ لائن کے آخر میں رکھتے جاتے۔ یہ بظاہر تو ایک معمولی سی بات لگتی ہے لیکن جس انداز سے وہ ادویات کی ترتیب لگاتے اور ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو ان کا سلیقہ اور قرینہ بہت متاثر کرتا۔ مولانا سید مودودی مختلف کتابوں کے اوپر حاشیہ لکھا کرتے تھے۔ صرف ان حاشیوں سے ہی کتنی ہی کتابیں وجود میں آگئیں۔ مولانا کی کتاب ''سیرت سرور عالمؐ'' تین جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب مولانا عبدالوکیل علوی نے مرتب کی، دراصل یہ کتاب مولانا کے حواشی سے مرتب کی گئی ہے۔ آپ اس سے مولانا کی ذہانت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں بہت بیمار پڑ گیا اور کافی دن بعد اچھرہ گیا تو صفدر علی چودھری مولانا سید مودودی کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہ انور گوندل ہیں جو اسلامیہ کالج میں یونین کے صدر ہیں، یہ کافی دن بیمار رہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں کافی دن سے نوٹ کر رہا تھا کہ یہ نوجوان نظر نہیں آ رہا، اللہ انہیں صحت دے۔ یہ میرے لیے ایک بہت بڑی سعادت کی بات تھی۔ عصر کی مجلس میں مولانا سید مودودی ہر ہر بات کا بڑا اچا تلا جواب دیا کرتے تھے۔ ہلکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر ہمہ وقت رہتی، وہ زاہد خشک ہرگز نہ تھے وہ تو ایک بڑے زندہ دل انسان تھے۔ ایک دن کسی نے ان سے ایئر مارشل اصغر خان کی تحریک استقلال کے متعلق سوال کیا تو فرمایا، ''ہاں تحریک استقلال میں سب کچھ موجود ہے 'استقلال کے سوا'' ۔ انجمن شہریان لاہور ایک معروف سماجی تنظیم تھی، ایک بار اس کا ذکر آیا تو فرمانے لگے'' آج کل ''انجمن'' بے چاری دو ''رانوں'' کے درمیان پھنسی ہوئی ہے''۔ یاد رہے کہ اس وقت انجمن شہریان لاہور کے صدر رانا اللہ داد خان اور سیکرٹری جنرل

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

رانا نذر الرحمٰن تھے۔ مولانا میں ایسی بہت سی خوبیاں تھیں۔ حاضر جوابی کی صلاحیت تو ان پر بس تھی، فی البدیہہ جملہ ادا کرتے اور لوگوں کو حیران کر دیتے۔ جس وقت بہت سے علمائے کرام نے مولانا سید مودودی کے خلاف محاذ کھولا تو فرمایا کرتے کہ میرے پاس تو اتنا وقت نہیں کہ جواب دیتا پھروں۔

مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے کہ جب 1974ء کی تحریک ختم نبوت میں بادشاہی مسجد لاہور میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر جمعیت علمائے اسلام والوں نے بڑی بدنظمی کا مظاہرہ کیا۔ جس وقت مولانا سید مودودی کی تقریر شروع ہوئی تو جان بوجھ کر عین اس وقت مولانا مفتی محمود کو ایک جلوس کی شکل میں مین گیٹ سے اندر لایا گیا جس سے مجمع اٹھ کھڑا ہوا اور بڑی بدمزگی پیدا ہوئی۔ جبکہ طے یہ ہوا تھا کہ تمام مقررین، نامور علمائے کرام اور قائدین کو مسجد کے جنوبی دروازے سے اندر لایا جائے گا اور مین گیٹ استعمال نہیں کیا جائے گا۔ تمام قائدین اسی سائیڈ والے صدر دروازے سے آتے رہے لیکن جب مولانا سید مودودی کی تقریر شروع ہوئی تو یہ لوگ اس ڈسپلن کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے مفتی محمود صاحب کو اندر لے آئے جس سے بہت جھگڑا پیدا ہوا۔ جماعت اسلامی کے لوگوں نے اس پر احتجاج کیا کہ آپ لوگ جلسہ خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس موقع پر جوتے چل گئے اور مولانا مودودی نے اپنی تقریر وہیں ختم کر دی۔ بعد میں مولانا سید مودودی نے ہمیں فرمایا کہ آپ لوگوں کو صبر کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ دوسرے دن قومی اخبارات میں صرف مولانا مودودی کی تقریر ہی چھپ سکی، کیونکہ سید مودودی تقریر لکھ کر لائے تھے، ان کی لکھی تقریر اخبار نویسوں کے ہاتھ لگ گئی۔ یوں اخبارات میں صرف مولانا مودودی کو ہی نمایاں کوریج مل سکی۔

کوثر نیازی کے متعلق میں ہمیشہ ایک ہی بات کرتا ہوں جو شورش کاشمیری نے کی تھی کہ ''کوثر نیازی! تمہیں جو عزت مولانا سید مودودی کے جوتوں میں بیٹھ کر نصیب ہوئی تھی وہ تم کو پھر کبھی نہ مل سکے گی'' اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ ایک مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ کوثر نیازی منصورہ مرکز آ رہے ہیں اور قاضی حسین احمد سے ان کی ملاقات طے ہے۔ میں گیٹ پر آ گیا اور میں نے اعلان کیا کہ جس شخص نے سید مودودی کو گالیاں دی ہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ انہی کے قائم کردہ مرکز میں آ جائے۔ اس کا قاضی صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے کوثر نیازی کو آنے سے منع کر دیا۔

1978ء میں میں اسلامی جمعیت طلبہ سے نکل کر جماعت اسلامی کی طرف آ گیا اور مولانا فتح محمد صاحب نے مجھے رکن جماعت بنا دیا۔ لاہور میں جمعیت اور جماعت کے جتنے بھی اہم سیٹ اپ رہے میں ان میں بنیادی کردار ادا کرتا رہا۔ نائب قیم، قائم مقام جنرل سیکرٹری، نائب امیر، ناظم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نشر واشاعت، ناظم فہم قرآن، ناظم زون، ناظم علاقہ اور ناظم شعبہ تربیت رہا۔ لاہور جماعت میں سید اسعد گیلانی، خرم مراد، چودھری غلام جیلانی، رانا اللہ داد خان، عبدالوحید خان، یوسف خان، ملک محمد اسلم، عبدالسلام خان، عبدالحمید کھوکھر اور پروفیسر عثمان غنی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ نادرِ روزگار ہستیاں دارِ فانی سے کوچ کر چکی ہیں۔ زمیں کھا گئی آسمان کیسے کیسے! جماعت کی طرف سے دو مرتبہ پنجاب اسمبلی کا الیکشن بھی لڑا۔ لوگ میرے والد صاحب کو کہا کرتے تھے کہ انور گوندل ایک قابل لڑکا تھا، یہ سی ایس ایس کر جاتا لیکن یہ سیاست کے چکر میں پڑ گیا۔ والد صاحب جواب دیتے تھے کہ بس مجھے یہ اطمینان رہنا چاہیے کہ میرا بیٹا رزق حلال کماتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو پھر مجھے اس سے کچھ غرض نہیں کہ وہ کیا کرتا ہے اور کیا نہیں۔ والد صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ ہمارے لیے سعادت کی بات ہے کہ ہمارا بیٹا دین کا کام کر رہا ہے۔ آپ نے یہ سوال کیا کہ اب اس عمر میں مجھے کوئی پچھتاوا تو نہیں کہ جماعت کا رکن نہ بنتا تو بہت ترقی کر سکتا تھا؟۔ بھائی دیکھیں، جب میری شادی ہوگئی، اخراجات اور ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں تو کچھ پریشان ضرور ہوا، لیکن پھر سوچا کہ انسان کے مقدر میں جو لکھا ہو وہی ملتا ہے۔ یہ سوچ کر اطمینان ہو جاتا ہے کہ ہم نے اس جماعت میں رہ کر بڑے بڑے علماء اور مشاہیر کی خدمت کی، مولانا سید مودودی جیسے عالم اسلام کے عظیم مفکر کی صحبتیں اختیار کیں، ختم نبوت کے لیے کام کیا، ادارہ معارف اسلامی میں دینی و فکری کام کیا۔ میں جماعت کا رکن نہ ہوتا تو یہ سب کیسے کر سکتا تھا۔ یہ سوچ کر تسلی ہو جاتی ہے کہ ان شاء اللہ یہ چیزیں ہماری آخرت سنوار دیں گی۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے صرف ایک بیٹا دیا جو جوانی ہی میں دل کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا ہے۔ لیکن اس ذات کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے اس بیٹے سے پانچ پوتوں (ابراہیم، ابوبکر، داؤد، موسیٰ اور یوسف) سے نوازا ہے، اب ان پوتوں کو دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہوں۔ بس یہ اللہ کے کام ہیں، اگر وہ ایک دروازہ بند کرتا ہے تو کئی دروازے کھول دیتا ہے۔ یادوں کے دریچے سے جھانکتا ہوں تو بہت سی نامور شخصیات سامنے آتی ہیں جن کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات بہت قیمتی نظر آتے ہیں۔ ان سے بہت کچھ سیکھا۔ بہت سی نامور شخصیات ہیں جن کے ساتھ میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ جسٹس ملک غلام علی صاحب ایک بہت بڑا نام ہے۔ یہ شریعت کورٹ کے پہلے جسٹس تھے۔ ان کی شخصیت کے تو کیا ہی کہنے! غلام علی صاحب وہ واحد شخص تھے جنہیں مولانا مودودی نے مکمل اجازت دے رکھی تھی کہ ”آپ میری طرف سے جو چاہیں لکھ دیا کریں“۔ یہ ایک بہت بڑی بات تھی، مولانا مودودی صاحب کا یہ بیان ملک صاحب پر مکمل اعتماد کا مظہر ہے۔ میاں طفیل محمد، خلیل

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

حامدی، جسٹس غلام علی، یہ ایسے نامور لکھاری تھے کہ ان کی تحریر میں مولانا مودودی کا ہی اثر تھا۔ اسلوبِ تحریر بھی بالکل مولانا مودودی جیسا تھا۔ ان شخصیات نے مولانا مودودی سے ایسی خوشہ چینی کی کہ ان کی ایک ایک چیز اپنا لی تھی۔ جس وقت جنرل ضیاء الحق نے شریعت کورٹ بنائی تو انہوں نے میاں طفیل محمد سے کہا کہ مجھے اس کے لیے ملک غلام علی صاحب جیسا شخص بطور جسٹس چاہیے۔ ایک تو جنرل ضیاء الحق نے پیر کرم شاہ الازہری صاحب کو لیا اور دوسرے ملک صاحب کو۔ جنرل ضیاء الحق نے ملک غلام علی کی بہت سی انگریزی اور اردو تحریریں پڑھ رکھی تھیں اور وہ ان سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ملک صاحب کی بہت سی کتابیں ہیں، ان کی یادداشتیں بھی چھپ چکی ہیں۔ ملک صاحب بڑی عاجزانہ طبیعت کے مالک تھے، وہ اپنے نام کے ساتھ جسٹس یا مولانا وغیرہ کچھ بھی نہیں لکھتے تھے۔ اب تو کسی کو ایک نعت بھی یاد ہو جائے تو وہ علامہ بن جاتا ہے۔ ملک صاحب کا مزاج بڑا دھیما اور عالمانہ تھا۔ جب وہ ہم نوجوانوں کو درس دیا کرتے تو علم و فکر کے دریا بہا دیا کرتے تھے۔

نعیم صدیقی کا اپنا ایک بڑا قد کاٹھ ہے۔ ہم ان کی صحبتوں میں بیٹھے، شاعری ہو یا افسانہ نگاری، وہ ہر لحاظ سے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ انہوں نے سیرت النبیؐ پر 'محسن انسانیت' کے عنوان سے ایک شاہکار کتاب تصنیف کی۔ نعیم صدیقی کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ایک بار مجھ سے فرمانے لگے کہ میرے گھر میں ریڈیو رکھا ہے، اس کا لائسنس بنوانا ہے۔ میں نے کہا مولانا! آج کے دور میں ریڈیو کا لائسنس کون بنواتا ہے۔ فرمانے لگے جب ریاست کی طرف سے یہ لائسنس بنوانا ضروری ہے تو پھر ہمیں بھی بنوانا ہوگا ورنہ یہ خیانت ہوگی۔

نعیم صدیقی مرحوم ادارہ معارف اسلامی میں بھی کام کرتے۔ انہوں نے یہاں ایک الگ سیاہی اور قلم رکھا ہوا تھا۔ اپنا ذاتی کام اپنے قلم اور سیاہی سے کرتے اور ادارے کی اشیاء ہرگز نہ استعمال کرتے۔ وہ تقویٰ اور زہد کا ایک پہاڑ تھے۔ ایک مرتبہ ہم نے فیصلہ کیا کہ ادارہ معارف اسلامی کا کوئی رسالہ نکالنا چاہیے۔ میں نے صدیقی صاحب سے کہا کہ کوئی اچھا سا نام تجویز فرما دیں۔ میں حیران رہ گیا کہ انہوں نے قلم اٹھایا اور بس لکھتے ہی چلے گئے۔ ایسے ایسے خوبصورت نام تجویز کیے کہ علم و فن کے دریا بہا دیے۔ یہ ناموں کی لسٹ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ پھر ہم نے ان کے تجویز کردہ نام "تفہیم" کے عنوان سے رسالہ نکالنا شروع کیا۔ اس پرچے پر مدیرِ اعلیٰ کا نام خلیل احمد حامدی صاحب کا ہوتا تھا اور میرا نام بطور نائب مدیر تھا۔ اس رسالے کے کچھ شمارے شائع ہوئے لیکن جاری نہ رہ سکا۔ صدیقی صاحب تقریر کے بھی بادشاہ تھے اور تحریر کے بھی۔ اس کے علاوہ قرآن آسان تحریک کے مولانا شبیر احمد، الیف الدین ترابی (جماعت اسلامی آزاد کشمیر)، بچوں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے ادیب سید نظر زیدی اور طالب ہاشمی سمیت بہت سے لوگوں سے یادیں وابستہ ہیں۔ ہم نے ادارہ معارف اسلامی کی طرف سے ہر موضوع پر لکھاریوں کے الگ الگ گروپس بنائے ہوئے تھے۔ ان میں بڑے بڑے نامور اہل قلم شامل تھے۔

میاں طفیل محمد ایک عظیم انسان تھے۔ 1988ء میں جس وقت سانحہ اوجڑی کیمپ رونما ہوا یہ ان دنوں کی بات ہے کہ میرے کان میں شدید درد ہوا اور میں بہت تکلیف میں مبتلا ہوگیا۔ میں نے میو ہسپتال سے چیک اپ کروایا تو معلوم ہوا کہ کان کا آپریشن ہوگا۔ ای این ٹی کے ماہر ڈاکٹر اظہر حمید نے میو ہسپتال میں داخل کرلیا۔ اب وہاں اس قدر رش تھا کہ میری آپریشن کی باری ہی نہیں آتی تھی اور میں بہت پریشان تھا۔ ایک رات میں ہسپتال میں سویا ہوا تھا کہ اچانک مجھے اٹھا دیا گیا کہ آپ کا آپریشن ہے، پہلے تو میں بہت حیران ہوا کہ ابھی تو میرا نمبر بھی نہیں لگا یہ اچانک میری باری کیسے آگئی۔ جب میں تیار ہوکر آپریشن تھیٹر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں امیر جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد اور چودھری بشیر احمد صدر کسان بورڈ بذات خود تشریف فرما ہیں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ڈاکٹر اظہر حمید صاحب کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ چودھری بشیر احمد کے رشتہ دار ہیں۔ چودھری بشیر احمد پاکستان کے پہلے زرعی گریجوایٹ تھے اور پاکستان کسان بورڈ کے صدر بھی تھے۔ میں نے محترم میاں طفیل محمد کو صرف فون کر کے صورتحال بتائی تھی۔ میاں محمد طفیل صاحب نے چودھری بشیر احمد کے ذریعے ڈاکٹر کو سفارش کردی تھی لیکن پھر خود بھی چودھری بشیر احمد کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں کہ ایک کارکن کے لیے اتنی بڑی شخصیت خود چل کر آئی تھی۔ یہ واقعہ آج بھی یاد آتا ہے تو آنکھیں بھر آتی ہیں کہ وہ کیسے بڑے لوگ تھے اور کتنا بڑا ظرف رکھتے تھے!

1973ء میں بڑا سیلاب آگیا۔ اس سیلاب نے بڑی تباہی مچائی۔ جماعت اسلامی نے حسبِ معمول ریلیف کیمپ لگایا۔ اس کیمپ کے انچارج ملک محمد اسلم صاحب تھے جب کہ میں ان کا نائب تھا۔ شرقپور شریف سے شاہدرہ اور شاہدرہ سے کالا خطائی تک بڑے علاقے میں ایک سال تک ریلیف کا کام کیا۔ جماعت اسلامی لاہور کے رکن کی حیثیت سے چند سال کے علاوہ مسلسل ضلعی شوریٰ کا رکن منتخب ہوتا رہا۔ ضلعی شوریٰ کی روداد لکھنا میرے ہی ذمے تھا۔ محترم قاضی حسین احمد نے 1989ء میں اجتماعات عام کا سلسلہ شروع کیا تو کل پاکستان بنیاد پر بڑے بڑے اجتماعات لاہور میں مینار پاکستان، شاہ فیصل مسجد اسلام آباد، ازاخیل نزد نوشہرہ اسی طرح ایم ایم اے کے جلسہ ہائے عام میں میری ڈیوٹی ہمیشہ ایک بہت ہی نازک شعبہ میں لگائی جاتی رہی یعنی بجلی اور لاؤڈ اسپیکر کی ذمہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

داری۔ 2016ء میں میری رکنیت صوبہ پنجاب میں شفٹ کردی گئی جہاں میں نے صوبائی امراڈاکٹر وسیم اختر اور میاں مقصود احمد کے ساتھ ڈپٹی سیکرٹری جنرل کے فرائض سرانجام دیے۔

قاضی حسین احمد پرعزم اور انقلابی شخصیت کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حسن دلنواز سے نوازا تھا۔ جماعت کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے منصورہ منتقل ہوئے تو ان کی صاحبزادیوں کے داخلے کا مسئلہ پیش آیا۔ یہ سعادت بھی خاکسار کے حصے میں آئی۔ سمیحہ راحیل قاضی کو لاہور کالج اور خولہ کو کیپری ہینسو سکول وحدت روڈ میں داخل کرایا۔ میں نے قاضی حسین احمد کی شخصیت کو بہت قریب سے دیکھا اور متاثر ہوا۔ ان کی اسلام اور پاکستان کے لئے ناقابل فراموش خدمات ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ لوگ جماعت اسلامی سے تو شاید واقف نہ تھے لیکن وہ قاضی حسین احمد کی جماعت سے خوب واقف تھے۔ ایک مرتبہ قاضی صاحب سفر سے واپس تشریف لائے تو مسکرا کر فرمانے لگے یار! ہم لوگ نواز شریف کی مخالفت تو بہت کرتے ہیں لیکن موٹروے بنا کر اس نے سفر بہت آسان کردیا ہے۔ قاضی صاحب کی یہ فہم و فراست ہی تھی کہ انہوں نے سپاہ محمد اور سپاہ صحابہ جیسی متشدد تنظیموں کو ایک ہی ٹیبل پر بٹھا دیا اور ایم ایم اے کی شکل میں بے مثال اتحاد کی بنیاد رکھی۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ میری ایک اور اہم گرفتاری واجپائی تحریک کے موقع پر عمل میں آئی اور یہ میری آخری گرفتاری تھی۔ واجپائی تحریک جماعت اسلامی نے چلائی تھی۔ اس موقع پر مال روڈ پر ایک بڑے جلسہ عام کا انعقاد ہوا۔ اس روز صبح ہی سے لوگ مختلف مقامات پر مظاہرے کررہے تھے۔ اس موقع پر نیو کیمپس میں گولی بھی چلی اور ایک کارکن بھی زخمی ہوا۔ جس وقت ہمیں علم ہوا تو ہم (میں، فرید پراچہ اور لیاقت بلوچ) سٹیج سے اترے اور اس لڑکے کی عیادت کرنے گئے۔ جنرل ہسپتال سے واپسی پر ہم نے لیاقت بلوچ کے گھر پر نماز پڑھی اور چائے پی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ بادشاہی مسجد کے قریب جماعت کے لوگوں اور پولیس میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے اور حالات کشیدہ ہیں۔ امیر جماعت اسلامی لاہور میاں مقصود نے لٹن روڈ پر واقع دفتر میں ایک احتجاجی جلسے کا اعلان کر دیا۔ ہم نے انہیں تجویز دی کہ یہ جگہ تنگ ہے اور یہاں جلسہ نہ کیا جائے، خیر اب کیا ہوسکتا تھا اگلے روز لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے۔ جب ہم پہنچے تو دیکھا کہ ہر طرف پولیس ہی پولیس نظر آرہی ہے۔

اس جلسہ میں منور حسن، قاضی حسین احمد، لیاقت بلوچ اور دیگر بہت سے قائدین اور دیگر شہروں سے آئے ہوئے سیکڑوں کارکنان شریک تھے۔ جب جلسہ شروع ہوا تو اچانک پولیس نے مجمع پر ہلہ بول دیا۔ آنسو گیس اور لاٹھی چارج شروع کردیا۔ پورا دفتر آنسو گیس سے بھر گیا اور دم گھٹنے لگا۔ اس موقع پر لیاقت بلوچ نے کسی کو کال کر کے کہا کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو، قاضی صاحب کا دم

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گھٹ رہا ہے، کیا تم ہمیں مارنا چاہتے ہو۔ اس کے بعد ہم سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے شہروں سے بھی ہزاروں کارکن آئے ہوئے تھے، سب کو گرفتار کر کے مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ مجھے، قاضی صاحب، لیاقت بلوچ، منور حسن اور دیگر پچیس کے قریب لوگوں کو ایک پولیس وین میں ٹھونس دیا گیا، ذرا آگے جا کر قاضی صاحب اور لیاقت بلوچ کو اتار دیا گیا اور ہم سب کو تھانہ ریس کورس میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں کوٹ لکھپت جیل منتقل کر دیا گیا۔

پورے پنجاب کی جیلیں اس موقع پر بھر گئی تھیں، کیونکہ بلا مبالغہ سیکڑوں لوگ گرفتار ہوئے تھے۔ دس دن کے بعد ہمیں کوٹ لکھپت جیل سے سنٹرل جیل میانوالی منتقل کر دیا گیا۔ میرے ساتھ سمیع اللہ بٹ، منور حسن، عبدالغفار عزیز، میاں مقصود، حافظ سلمان بٹ اور دیگر بہت سے کارکن تھے۔ جب ہم لاہور سے روانہ ہوئے تو اس قافلہ نے پہلا پڑاؤ شاہ پور جیل میں کیا، یہاں حافظ سلمان بٹ اور اعجاز چودھری سمیت کچھ لوگوں کو اتار دیا گیا اور پھر ہمیں میانوالی جیل لے جایا گیا۔ یہاں ہم نے تیس دن گزارے۔ اس جیل میں جماعت کے تقریباً 150 کے قریب لوگ بند تھے۔ جب ہم یہاں پہنچے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل باجوہ صاحب تھے، انہوں نے ہم سے تلخ لہجے میں بات کی تو میں نے کہا کہ جناب ہم بھی جٹ پتر ہیں، ہم کسی اخلاقی جرم میں نہیں آئے آپ ہمارے ساتھ بدتمیزی کر رہے ہیں، ہم اسلام اور ملک کی خاطر یہاں لائے گئے ہیں۔ خیر اس دھمکی کا اثر ہوا کہ اس کے بعد باجوہ صاحب ہمارے لیے نرم ہو گئے۔ میانوالی جیل میں ہمیں "کمرہ مخض" کے نام سے ایک بارک میں بند کر دیا گیا۔ اس بارک میں بہت خطرناک قسم کے قیدی بند تھے۔ یہاں کل تعداد تیس کے قریب تھی جن میں جماعت کے 10 لوگ تھے۔ میں اور سید منور حسن، عبدالغفار عزیز، میاں مقصود احمد، رحیم یار خان کے غلام رسول، کراچی کے لیئین اور سمیع اللہ بٹ اسی کمرے میں تھے۔ پرانے قیدیوں نے ہماری بہت خدمت مدارت کی اور ہمیں ایک اسلامی کارکن جان کر ہماری بہت عزت کی۔ یہاں پر جماعت کے ایک ساتھی بہت پرانے قیدی تھے جن کا نام عبدالجبار تھا، یہ کافی عرصے سے ایک مقدمہ میں یہاں تھے۔ ان کا جیل انتظامیہ میں بہت اثر ورسوخ تھا۔ انہوں نے مختلف قیدیوں سے کمبل، بستر لے کر ہم سب جماعت کے ساتھیوں کو بھجوائے۔ ان کا جذبہ ایثار دیکھنے والا تھا۔ اب میری قسمت دیکھیے کہ میرا بستر سمیع اللہ بٹ صاحب کے ساتھ تھا۔ بٹ صاحب کے خراٹے بہت زیادہ مشہور ہیں، اس قدر خراٹے لیتے کہ سونے بالکل نہ دیتے، میں نے اپنے ایک خط میں جماعت کے ذمہ داران کو از راہ تفنن لکھا کہ: "میں اور سمیع اللہ بٹ صاحب ایک کمرے میں بند ہیں، یہ خراٹے لیتے ہیں اور سونے نہیں دیتے۔ یوں میں قید بامشقت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کاٹنے پر مجبور ہوں"۔

یہاں میں بتاتا چلوں کہ میانوالی جیل حکام نے تو ہمیں تنگ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ نہ سونے کو جگہ ملتی اور نہ ہی ڈھنگ کا کھانا نصیب ہوتا۔ لیکن اس موقع پر میانوالی کی جماعت اسلامی نے ہماری بڑی خدمت کی۔ روزانہ کھانا بھجوانا، خیریت دریافت کرنا، ہمارے حالات ہمارے گھر والوں اور مرکز تک پہنچانا، یہ سب ذمہ داری میانوالی جماعت نے ڈاکٹر محمد انور امیر ضلع میانوالی کی قیادت میں بخوبی پوری کی۔ میرے لیے تکلیف دہ لمحہ وہ تھا جب میرا اکلوتا بیٹا میری ملاقات کے لئے آیا، سلاخوں کے پیچھے ہم بس اشارے ہی کر سکتے تھے اور بات چیت نہ کر سکتے تھے۔ مجھے دیکھ کر بیٹا بہت پریشان ہوا۔ ہمارا "کمرہ مخض" اس پھانسی گھاٹ کے قریب تھا جہاں عاشق رسول غازی علم دین شہیدؒ کو پھانسی دی گئی تھی۔

ایک دن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھے کہا کہ آپ صرف معافی نامہ کے لیے دو لفظ لکھ دو اور گھر جاؤ کیوں بچوں کو پریشان کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ جناب ہم ایک اسلامی جماعت کے رکن ہیں، ہم پختہ کار لوگ ہیں۔ اگر میرے ساتھ والے 300 لوگ بھی معافی مانگ لیں اور رہا ہو جائیں تب بھی انور گوندل آپ سے معافی نہیں مانگے گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرا کوئی بھی ساتھی معافی نامہ داخل نہیں کروائے گا۔ وہ حیران ہوا کہ واقعی آپ کا جذبہ تو بہت بلند ہے۔ آخر ایک ایک کر کے تمام احباب رہا ہوتے رہے اور میں اکیلا رہ گیا۔ عیدالاضحیٰ کی رات تھی۔ میرے قیدی ساتھیوں نے کہا کہ آپ ہمیں کل نماز عید پڑھایے گا کیوں کہ ہمارے کمرے والوں کو دوسروں کے ساتھ اجازت نہیں ہوتی۔ انھوں نے میرے کپڑے بھی دھوئے۔ رات کے تقریباً تین بجے مجھے بیدار کر کے بتایا گیا کہ تمھاری ضمانت کے آرڈر موصول ہو گئے ہیں، آخر میں عیدالاضحیٰ کی صبح رہا ہوا۔ جب میں سب سے آخر میں رہا ہوا تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل مجھے کہنے لگے کہ واقعی آپ آخری قیدی ہیں جو رہا ہو رہے ہیں۔ آپ کے تمام ساتھی رہا ہو چکے ہیں۔ میں صبح نماز فجر سے پہلے رہا ہو کر میانوالی میں جماعت کے مرکز تفہیمات اسلامیہ میں پہنچا وہاں نماز ادا کی۔ عید کا دن تھا اور ٹریفک بھی نہیں تھی۔ میانوالی کے احباب نے ہمارے گھر جانے کا بندوبست کر دیا اور یوں میں اپنے گھر منڈی بہاؤالدین پہنچ گیا۔ کہتے ہیں کہ جب انسان کسی کے بہت قریب ہو تو اس کے عیب کھلتے ہیں، لیکن میانوالی جیل میں ہم نے سید منور حسن کو جتنا قریب سے دیکھا ان کی مزید خوبیوں کا پتا چلا اور ہم ان کے زیادہ گرویدہ ہو گئے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ جیل میں بہت کم سوتے، ہر وقت یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں پر ایک اور واقعہ بیان کرتا جاؤں کہ جس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

وقت سید منور حسن امیر جماعت تھے تو میں نے ان سے کہا کہ امیر صاحب، مرکز والوں کو میڈیکل الاؤنس اور گریجوایٹی الاؤنس ملتا ہے جبکہ ادارہ معارف اسلامی کو یہ الاؤنس نہیں دیے جاتے۔ انہوں نے رہائی کے بعد ہدایات جاری کیں ادارہ معارف اسلامی کے کارکنان کو بھی یہ دونوں الاؤنس دیے جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا مودودی سے جو ایک علمی اور فکری وراثت چلی آ رہی تھی شاید سید منور حسن اس کی آخری کڑی تھے۔

ایک مرتبہ میرے بیٹے کا یو ایم ٹی میں داخلہ میرٹ پر تو ہو گیا لیکن مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ہمارے پاس فیس نہ تھی۔ میں نے اس ضمن میں ڈاکٹر سید منصور علی سے ذکر کیا، انہوں نے سید منور حسن سے بات کر دی۔ اگلے روز مجھے سید منور حسن نے بلوایا۔ کہنے لگے کہ ہاں! نہ تو میں انور گوندل کو جانتا ہوں اور نہ ہی انور گوندل مجھے جانتا ہے، میں مسکرا دیا تو فرمانے لگے کہ بھائی ڈاکٹر صاحب کو کہنے کی کیا ضرورت تھی، آپ مجھے بھی تو کہہ سکتے تھے۔ پھر کہنے لگے کہ آپ کا مسئلہ جلد حل ہو جائے گا۔ اب ہوا یہ کہ اگلے روز منور صاحب لندن چلے گئے اور میں پریشان ہو گیا کہ اب کیا ہو گا۔ اسی دن مجھے ناظم شعبہ تنظیم رشید صاحب کا فون آیا کہ منور حسن صاحب یو ایم ٹی کے ریکٹر حسن مراد کے نام ایک رقعہ دے گئے ہیں اور انہوں نے حسن مراد کو فون بھی کر دیا ہے۔ خیر میرا بیٹا وہ رقعہ لے کر حسن مراد کے پاس گیا تو اس کی فیس معاف ہو گئی اور اس نے یو ایم ٹی سے ایم بی اے کیا۔ سابق نائب امیر جماعت خرم مراد کے ساتھ میرا کوئی زیادہ وقت نہیں گزرا۔ لاہور جماعت کی امارت کے دوران میں نے ان کے ساتھ ایک کارکن کے طور پر کام کیا۔ ان کا علمی مقام و مرتبہ بہت بلند تھا، ان کی بلند پایہ علمی کتابیں ان کے علمی مقام کا بین ثبوت ہیں۔ تقویٰ و پرہیزگاری میں بہت آگے تھے۔ پھر ان کی اولاد کو بھی اللہ نے خوب نوازا۔ اب دیکھیے یو ایم ٹی کا شمار اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ مرکز جماعت میں میرا زیادہ تعلق چودھری رحمت الٰہی سے رہا۔ چودھری صاحب صاحب الرائے شخص تھے اور شوریٰ کی بحثوں میں عموماً چودھری صاحب کی آخری رائے ہوتی تھی۔ چودھری صاحب کا بڑا کارنامہ مرکز منصورہ اور جامع مسجد منصورہ کی تعمیر ہے جو انھوں نے رانا اللہ داد خان کے ساتھ مل کر تعمیر کی۔ چودھری صاحب بڑے خوش نویس تھے۔ اردو اور انگریزی میں ان کے مختصر نوٹس جماعت کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ابرار احمد (معتمد امیر جماعت) بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ اسلامی جمعیت طلبہ والے ایک قرارداد لکھ کر لائے۔ چودھری صاحب نے قرارداد دیکھی اور صرف ایک لفظ کاٹ دیا۔ جمعیت والے بڑے خوش تھے کہ ان کی قرارداد میں بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ صبح اخبارات میں دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سارا مفہوم بدل چکا تھا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرا شروع سے ادبی اور علمی ذوق رہا۔ ہر قسم کی کتابیں پڑھتا اور لکھتا بھی تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے ''اخبار الجامعہ'' کا مدیر بھی رہا۔ اس بات کو دیکھتے ہوئے مجھے ادارہ معارف اسلامی میں لکھنے پڑھنے کا کام زیادہ کرنا چاہیے تھے۔ لیکن مجھے یہاں ایڈمنسٹریٹو کام کرنا پڑا ہے۔ مجھے یہاں علمی و تحقیقی کام کا موقع نہ ملا۔ یہاں تمام فائلوں کے پیٹ میں ہی بھرتا ہوں۔ مسودہ حاصل کرنا، اس کی پرکھ پڑچول کرنا، مسودے کو کمیٹی کے سامنے پیش کرنا، کمپوزنگ کروانا، پروف ریڈنگ، کتاب کے لیے کاغذ خریدنا، پازیٹو بنوانا، ڈیزائننگ کروانا، ٹائٹل بنوانا، ٹائٹل کی لمینیشن کرانا، پھر اس کتاب کو چھپنے کے لئے پرنٹنگ پریس میں دینا، جلد سازوں کے پیچھے بھاگنا۔ کتاب کی تیاری میں بہت سے مراحل ہوتے ہیں، یہ سب کام میں کرتا ہوں۔ جس وقت مولانا مودودی صاحب لندن سے علاج کروا کر پاکستان آئے تو انہوں نے اس موقع پر بیان دیا کہ یہ ملک سٹالن اور لینن کا نہیں ہے، یہ ملک محمد عربیؐ کے غلاموں کا ہے۔ جب تک ہم زندہ ہیں اور ہماری گردنوں پر ہمارے سر سلامت ہیں یہاں سوشلزم نہیں آئے گا۔ یہاں اسلام کے علاوہ کوئی ازم نہیں چلنے دیا جائے گا۔ اگر سوشلزم آیا تو ہماری لاشوں سے گزر کر آئے گا۔ میں نے یہ الفاظ سید مودودی صاحب کی زبان سے خود سنے ، ان کے اس بیان کو خوب شہرت ملی اسی طرح جب سوشلزم کیخلاف مولانا نے ''شوکت اسلام'' کا دن منانے کا اعلان کیا تو اس موقع پر لاہور میں ایک بہت بڑا جلوس نکلا۔ ایک ٹرک پر سٹیج سجا ہوا تھا۔ ٹرک پر سید مودودی، مولانا گلزار مظاہری، شورش کاشمیری نوابزادہ نصر اللہ خاں، چودھری غلام جیلانی، خواجہ علاؤ الدین اور عبدالحمید کھوکھر ودیگر موجود تھے اور مائیک میرے ہاتھ میں تھا۔

مجھے سید مودودیؒ سے لے کر صدر مملکت محمد رفیق تارڑ کی زیر صدارت جلسہ ہائے عام کی نظامت کے فرائض سرانجام دینے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ میاں محمد عثمان مرحوم دو دفعہ اور ڈاکٹر فرید پراچہ ایک دفعہ ایم این اے منتخب ہوئے ان کی انتخابی مہم چلائی اور ناظم انتخاب کے فرائض سرانجام دیے۔ جب سید مودودی کی رحلت ہوئی میں اس وقت باٹا پور میں اپنے عزیزوں کے ہاں گیا ہوا تھا۔ جب ٹی وی پر خبر چلی تو مجھ پر سخت غم کی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ رات کا وقت تھا، میں اسی وقت موٹر سائیکل پر نکل پڑا اور مرکز آ گیا۔ اس وقت مولانا خلیل احمد حامدی لوگوں کے جم غفیر سے خطاب کر رہے تھے۔ دوسرے تیسرے دن پھر ہم ایئر پورٹ گئے اور مولانا کی میت وصول کی۔ میں ان نوجوانوں میں شامل تھا جو ایئرپورٹ سے اس ٹرک کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے اچھرہ تک آئے جس ٹرک میں مولانا کا جسد خاکی موجود تھا۔ ساری رات ہم جاگتے رہے۔ اگلی صبح ہم منصورہ پہنچے۔ منصورہ مسجد کے شرقی دروازے کے پاس مولانا کی قبر تیار کی گئی لیکن مولانا کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بیٹوں کا پیغام آیا کہ ہم نے مولانا کو اچھرہ میں دفن کرنا ہے۔ جماعت نے بیٹوں کے اس مطالبے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ میاں طفیل محمد اور چودھری رحمت الٰہی نے مولانا کے بیٹوں کو آگاہ کرنے کے لیے مجھے اچھرہ بھیجا۔

مولانا مودودی کی نماز جنازہ قذافی سٹیڈیم میں ادا کی گئی۔ نماز جنازہ عالم اسلام کے نامور عالم دین علامہ یوسف القرضاوی (قطر) نے پڑھائی۔ لاکھوں کا مجمع تھا، جب صف بندی ہونے لگی تو جنرل ضیاء الحق آئے اور نماز جنازہ میں شریک ہوئے اور مولانا کو آہوں سسکیوں میں لاکھوں افراد نے اچھرہ کی سرزمین پر لحد میں اتارا۔ اس طرح عالم اسلام کا ایک عظیم باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ میں ان چند خوش قسمت افراد میں سے ہوں جنہوں نے مولانا کو اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا۔ 27 جون 2020ء کو سید منور حسن کو بھی کراچی کے قبرستان میں لحد میں اترتا ہوا دیکھا۔ یہ چوتھے امیر جماعت ہیں جن کے جنازہ میں میں نے شرکت کی اور انھیں سپرد خاک بھی کیا۔ سید منور حسن صرف سابق امیر جماعت نہیں تھے، بلکہ ایک مربی، ایک بہادر قائد، ایک ہمدرد انسان اور اللہ کے ولی تھے۔ دعا ہے: خدا تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے! یہ ساری روداد اپنی جگہ لیکن خود کو ہمیشہ کارکن ہی سمجھا۔ ایک کارکن کی حیثیت سے اجتماعات میں دریاں بچھائیں، کرسیاں لگائیں، خیمے نصب کیے، لاؤڈ اسپیکر فٹ کیے، لیکن پھر اگر تقریر کرنا پڑی تو بھی اس سے پیچھے نہیں ہٹے۔ میں اب بھی ایک کارکن ہوں اور سچی بات یہ ہے کہ میرے ہم عصر دوستوں نے بھی مجھے کارکن کے روپ ہی میں دیکھنا چاہا۔ میں اس کے لیے بھی ان کا شکرگزار ہوں۔ بس یہ تھی میری زندگی کی مختصر کہانی جسے میں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ قومی ڈائجسٹ کا بے حد شکریہ کہ اس نے مجھے ان یادداشتوں کو محفوظ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ احسان دانش کے ان اشعار پر اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا!

دور تھا اک گزر چکا، نشہ تھا اک اتر چکا
اب وہ مقام ہے جہاں شکوۂ بے رخی نہیں
زخم پر زخم کھا کے جی ، اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر ، لبوں کو سی ، عشق ہے یہ، دل لگی نہیں

(قومی ڈائجسٹ۔ اگست 2020ء)

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کارکن تحریک پاکستان، صحافی
محمد ابراہیم طاہر
کی زندگی کے نشیب و فراز

میاں ابراہیم طاہر 1937ء میں بھارتی شہر کپورتھلہ میں پیدا ہوئے۔ کپورتھلہ میں مسلمان کثیر تعداد میں آباد تھے اور جب تحریک پاکستان نے زور پکڑا تو اس کا شمار بھی تحریک کے اہم مراکز میں ہونے لگا اور گلی گلی، نگرنگر ''بن کے رہے گا پاکستان۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان'' کے نعرے گونجنے لگے۔ میاں ابراہیم طاہر نے کپورتھلہ میں تحریک پاکستان کو بہت قریب سے دیکھا، اس وقت وہ بچے تھے اور انہوں نے بڑوں کی دیکھا دیکھی اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ''بچہ مسلم لیگ'' بنا رکھی تھی۔ تقسیم ہند کے وقت جب کپورتھلہ میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا تو ابراہیم طاہر نے یہ خونی مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ہجرت کے وقت ان کے خاندان کے 14 افراد نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ان میں میاں ابراہیم طاہر کے دادا اور دادی جان بھی شامل تھے۔ میاں ابراہیم طاہر کے والدین نے پاکستان آ کر فیصل آباد میں سکونت اختیار کی۔ انہوں نے 1953ء میں فیصل آباد سے اس وقت کے سب سے بڑے اخبار ''زمیندار'' کے رپورٹر کی حیثیت سے صحافت کا آغاز کیا۔ وطن عزیز جب فیلڈ مارشل ایوب خان کے ''مارشل لاء'' کی زد میں آیا اور صحافت پر کڑا وقت آیا تو ابراہیم طاہر اکاؤنٹس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے اور معروف اداروں میں کام کرتے رہے لیکن لکھنے پڑھنے کا مشغلہ جاری رکھا۔ عنایت اللہ (مرحوم) کے ماہنامہ ''حکایت'' میں مختلف موضوعات پر لکھتے رہے اور ان کا نام ادارتی عملے میں باقاعدہ شائع ہوتا۔ ابراہیم طاہر افغانستان اور بھارت سمیت کئی ممالک کا سفر کر چکے ہیں اور ایک صحافی کی حیثیت سے وہاں کے سماجی و سیاسی حالات کا قریب سے مشاہدہ کر چکے ہیں۔ انہیں ہر موضوع پر کتابیں جمع کرنے اور مطالعہ کا بے حد شوق ہے۔ ان پر ایم فل کا مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ چند روز قبل ہم نے میاں ابراہیم طاہر کے ساتھ طویل نشست کر کے ان کی دلچسپ یادداشتوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی جو انہی کی زبانی قارئین کے ذوق کی نذر کی جا رہی ہیں۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرا نام میاں محمد ابراہیم طاہر ہے اور میں نو نومبر 1937ء کو بھارتی شہر کپورتھلہ میں پیدا ہوا۔ کپورتھلہ جالندھر شہر سے بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم دو بھائی اور دو بہنیں ہیں اور ہم سب کی پیدائش کپورتھلہ کی ہے۔ کپورتھلہ میں مسلمان اکثریت میں تھے، اس وقت یہاں مسلمانوں کی آبادی 60 فیصد سے زائد تھی اور سکھ تقریباً تیس فیصد تھے جبکہ ہندوؤں کی تعداد کم تھی ۔ جب پاکستان بنا اس وقت میں دس سال کا تھا اور پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ تقسیم ہند کا اعلان ہوا تو کپورتھلہ کے مسلمانوں میں عدم تحفظ کا شدید احساس پیدا ہو گیا۔ ریاست کی فوج اور پولیس میں مسلمانوں کی اکثریت بھی تھی لیکن آزادی کا اعلان ہوتے ہی مسلمان سپاہیوں سے اسلحہ لے لیا گیا تھا۔ تقسیم کے وقت پٹیالہ، امرتسر اور کپورتھلہ میں سب سے زیادہ قتل عام ہوا۔ میرے خاندان کے 14 افراد شہید ہوئے ، ان شہداء میں میرے دادا اور دادی جان بھی شامل تھے۔ ہم بھی شاید ان شہیدوں میں شامل ہوتے لیکن ہمارے والد صاحب کے ایک سکھ دوست نے ہمیں اس ٹرین میں سوار ہونے سے روک لیا تھا جس کے سارے مسافروں کو شہید کر دیا تھا۔ والد صاحب کے اس سکھ دوست نے اپنی پگڑی اتار کر والد صاحب کے پیروں پر ڈال دی تھی کہ آپ اس ٹرین میں سوار نہ ہوں۔ کپورتھلہ میں مسلم لیگ کا بہت زور تھا، یہاں کا وزیر اعظم بھی مسلمان تھا جس کا نام عبدالعزیز فلک پیما تھا۔ (عبدالعزیز فلک پیما جنوری، 1879ء کو موچی دروازہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد مقرر ہوئے اور پھر انڈین لیجسلیٹیو اسمبلی کے رکن رہے، اکتوبر 1930ء میں گول میز کانفرنس کے سیکریٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ عبدالعزیز فلک پیما نے 1935ء سے 1936ء تک فائنانشل کمشنر پنجاب، 1937ء سے 1940ء تک ریاست جے پور میں وزیر ریونیو اور 1940ء سے 1945ء تک ریاست کپورتھلہ میں وزیر اعظم کے اہم مناصب پر فرائض انجام دیے، تقسیم ہند کے بعد وہ حکومت پاکستان اور حکومت پنجاب کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ عبدالعزیز فلک پیما فلسفہ سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ 1922ء میں انہوں نے جریدے ہمایوں سے اپنی قلمی سفر کا آغاز کیا اور پھر ہندوستان بھر کے جرائد میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے۔ فلک پیما ان کا قلمی نام تھا جو بعد ازاں ان کے نام کا جزو بن گیا۔ عبدالعزیز فلک پیما کا سات مئی 1951 کو لاہور میں انتقال ہوا اور آپ میانی صاحب قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں ''مضامین فلک پیما، فلک پیمائیاں، آسمان اور آنسو ہیں۔ (عبدالستار اعوان۔ بحوالہ: '' بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ'' از: منیر احمد سلیچ۔ وکی پیڈیا ڈاٹ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کام۔) عبدالعزیز فلک پیا کا گھر ہمارے گھر کے قریب تھا۔ میرا بچپن یہاں بہت خوش حالی میں گزرا۔ میرے والد کا نام حاجی میاں محمد علی تھا، میرے والد صاحب کپورتھلہ کے شاہی محلات کے نگران تھے۔ والد صاحب مہاراجہ کپورتھلہ کے خاص آدمی تھے۔ ہمارا تعلق آرائیں قوم سے ہے اور ہم لوگ زراعت کے شعبے سے وابستہ تھے۔ ہم کپورتھلہ میں زیادہ تر سبزیاں کاشت کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ میں پانچ چھ سال کا تھا کہ ہماری ہمسائی مجھے سفید پاجامہ، سفید کرتہ پہنا کر اور مجھے خوب بنا سنوار کر مجھے اپنے والد کے پاس شاہی محلات میں بھیج دیتی کہ جاؤ اور اپنے ابا کے پاس چلے جاؤ۔ ایک مرتبہ میں والد صاحب کے پاس شاہی محل میں بیٹھا ہوا تھا کہ مہاراجہ کپورتھلہ اس طرف آ نکلا، مجھے والد صاحب نے کہا کہ دیکھو مہاراجہ صاحب آ رہے ہیں اور آپ نے ان کو سلام کرنا ہے کیونکہ جو بچہ ان کو سلام کرتا ہے تو وہ خوش ہو کر اس بچے کو انعام دیتے ہیں۔ وہ عام طور پر ایک روپیہ انعام دیتے تھے اور اس وقت ایک روپیہ بھی بہت بڑی رقم تھی، اس ایک روپے کے سکے پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر کندہ ہوتی۔ جب مہاراجہ کپورتھلہ قریب آئے تو والد صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ اسے سلام کرو، جیسے ہی والد صاحب کی کہنی میرے سر پر ہلکی سی لگی تو میں نے گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ مہاراجہ دیکھ کر بہت ہنسا اور کہنے لگا کہ اصل مہاراجہ تو یہ ہے جسے دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

مہاراجہ نے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ مجھے محل کے اندر لے گیا اور اپنے بچوں کو کہنے لگا کہ یہ دیکھو، یہ ہے اصل مہاراجہ۔ اس طرح میں پھر ہر وقت شاہی محلات میں آنے جانے لگا۔ اس وقت میں بہت باتونی تھا اور اپنی دادی اماں سے جو کہانیاں سنتا وہ شاہی محلات میں جا کر مہاراجہ کے بچوں کو سناتا تو وہ بہت خوش ہوتے۔ اس محل میں مجھے ''راطوطا'' کہا جانے لگا تھا (جو طوطا باتیں کرتا ہو اسے اس دور میں ''را'' طوطا کہا جاتا تھا)۔ میرا بچپن اس طرح بہت اچھا گزر رہا تھا اور مجھے ہر طرف سے بہت پیار مل رہا تھا۔ مجھے سکول جانے اور کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن والد صاحب مجھے پڑھانا نہیں چاہتے تھے کیونکہ والد صاحب بنیادی طور پر ایک کاشتکار تھے اور وہ سوچتے تھے کہ اگر یہ پڑھ گیا تو پھر کاشتکاری کا کام کون سنبھالے گا۔ اس دور میں ہمارے علاقے میں نہریں نہیں ہوتی تھیں اور کنوؤں سے پانی نکال کر کھیتوں کو پانی لگایا جاتا۔ میری والدہ صاحبہ مجھے پڑھانا چاہتی تھیں چنانچہ انہوں نے مجھے سکول ڈال دیا، جب میں پانچویں جماعت میں تھا تو پاکستان بن گیا۔

کپورتھلہ کے مسلمانوں میں تعلیم حاصل کرنے کا کوئی شوق نہ تھا اور پورے کپورتھلہ سے صرف آٹھ بچے تھے جو پانچویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ تحریک پاکستان کے جذبوں اور

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ولولوں نے ہم بچوں پر بھی خاصا اثر ڈالا تھا اور ہم نے وہاں کے ماحول کے مطابق مسلم لیگ کے جلسوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ہم بچے تھے اور ہم بھی نعرے لگاتے تھے کہ ''بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ بن کے رہے گا پاکستان''۔ ہم بچوں نے بڑوں کی دیکھا دیکھی ایک ''بچہ مسلم لیگ'' بھی بنا رکھی تھی۔ ہم شہر کی گلیوں اور خاص طور پر ہندو آبادیوں میں چلے جاتے اور وہاں پاکستان کے نعرے لگاتے تھے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ ہم تو بہت چھوٹے تھے اور ہمیں بالکل معلوم نہ تھا کہ ''پاکستان'' کس چیز کا نام ہے۔ بس یہ ماحول کا اثر تھا کہ جلسے جلوس دیکھ دیکھ کر ہم بھی نعرے لگانا شروع ہو جاتے۔

انہی دنوں قائداعظم محمد علی جناح جالندھر تشریف لائے، اس وقت عام مسلمان انہیں ''بابا جناح'' کہتے تھے۔ ہمیں سکول کے استاد نے بتایا کہ بابا جناح جالندھر آ رہے ہیں۔ میں نے گھر آ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ میں تو بابا جناح کو دیکھوں گا۔ والد صاحب کہنے لگے کہ وہاں بہت زیادہ ہجوم ہوگا، تم کیسے بابا جناح کو دیکھو گے۔ میں نے والدہ صاحبہ سے بہت ضد کی تو آخر کار مجھے والد صاحب جالندھر لے گئے۔ ہم جلسے سے ایک دن قبل ہی جالندھر شہر میں خالہ کے ہاں پہنچ گئے اور پھر اگلے دن ہم ریلوے سٹیشن پہنچے جہاں ''بابا جناح'' نے آنا تھا۔ سٹیشن پر مسلمانوں کا بہت زیادہ رش تھا۔ جب ٹرین آئی تو لوگوں کا جذبہ امڈ آیا اور فضا نعرہ تکبیر اللہ اکبر، بن کے رہے گا پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان، کے نعروں سے گونج اٹھی۔ مجھے والد صاحب نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ جیسے ہی ٹرین رکی اور قائداعظم محمد علی جناح ٹرین سے باہر آئے اور انہوں نے اپنا ہاتھ ہلایا اور سب کو خاموش ہونے کو کہا تا کہ وہ کچھ ارشاد فرمائیں تو نعرے ایک دم بند ہو گئے اور ماحول پر خاموشی چھا گئی۔ میں چونکہ بچہ تھا خاموش نہ ہوا اور مسلسل نعرے لگاتا رہا۔ میں اس وقت ٹرین کے پاس تھا اور مجھے قائداعظم محمد علی جناح نے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ والد صاحب آگے ہوئے اور بابائے قوم نے میرے کندھے پر تھپکی دی، میں اس لمس کو آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ اس کے بعد بابا جناح ہماری ریاست کپورتھلہ میں بھی تشریف لائے تو اس وقت بھی میں نے انہیں دیکھا۔ میرے دادا جان مسلم لیگ کپورتھلہ کے نیشنل گارڈ تھے اور وہ محمد علی جناح کی سیکورٹی کے انچارج تھے۔ (ہجرت کے وقت میرے دادا اور میری دادی دونوں نے جام شہادت نوش فرمایا)۔ اس موقع پر قائداعظم محمد علی جناح نے نماز جمعہ بھی ہماری شاہی مسجد کپورتھلہ میں ادا کی تھی۔ یہ مسجد مہاراجہ کپورتھلہ نے بہت دلچسپی سے تعمیر کروائی تھی۔ اس مسجد کا افتتاح اس وقت کے نواب آف بہاولپور نے کیا تھا۔ مسجد کا نقشہ آج بھی شاہی قلعہ کے اندر واقع عجائب گھر میں موجود ہے۔ یہ بہت ہی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

خوبصورت مسجد تھی۔

تقسیم ہند کے وقت کپورتھلہ کی ایک تحصیل سلطان پور تھی، اعلان کیا گیا کہ تمام مسلمان سلطان پور میں جمع ہو جائیں اور یہاں سے پاکستانی فوج کی حفاظت میں مسلمانوں کو پاکستان لے جایا جائے گا، یہ سب دھوکہ تھا اور ہندوؤں، سکھوں کی ایک سازش تھی۔عید گاہ سلطان پور میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان جمع ہو گئے اور پھر جب یہ قافلہ چلا تو کچھ ہی فاصلے پر ہمارے شہر کے نزدیک اس پورے قافلے کو شہید کر دیا گیا، چند نوجوان ہی بھاگ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ یہ بہت ہی خوفناک قتل عام تھا جو ریاست کپورتھلہ میں ہوا۔مسلمانوں کا مال اسباب لوٹ لیا گیا۔اس قتل عام کے بعد شہر کپورتھلہ کو قلعہ بند کر دیا گیا اور ہم اپنی مدد آپ کے تحت قلعہ بند ہو گئے تھے۔ہم مسلسل کئی مہینے تک گھیرے میں رہے۔ بعد میں اکتوبر میں جب کچھ امن ہوا تو ہم وہاں سے نکلے، ہم لوگ جالندھر شہر پہنچے جہاں پر پاکستان آرمی کی بلوچ رجمنٹ کا کیمپ لگا ہوا تھا۔وہاں سے ہمیں پاک فوج کی حفاظت میں پاکستان لایا گیا۔ہم جالندھر سے بذریعہ ٹرین شیخو پورہ پہنچے۔شیخو پورہ میں ہم نے دیکھا کہ ہر طرف مکان جلے ہوئے تھے،اس کی وجہ یہ تھی کہ کپور تھلہ کے قریب ایک گاؤں تھا جس کا نام شیخو پورہ تھا، یہاں کے مسلمانوں کو سکھوں نے بے دردی سے مارا اور ان کے مال اسباب لوٹ لیے تھے،اس کے ردعمل میں پاکستان میں واقع شیخو پورہ کے مسلمانوں نے بھی ہندوؤں اور سکھوں کے گھر جلا ڈالے۔شیخو پورہ میں ہمیں ایک کارخانے میں ٹھہرایا گیا۔اس کے بعد ہمیں ننکانہ صاحب بھیج دیا گیا جہاں ایک گوردوارے کے قریب ایک مکان ہمیں الاٹ کیا گیا۔والد صاحب کو ویسے بھی سکھوں سے بہت نفرت ہو گئی تھی کیونکہ سکھوں نے ہمارے خاندان کے چودہ افراد کو شہید کیا تھا۔والد صاحب نے یہ مکان لینے سے انکار کر دیا تو پھر ہمیں فیصل آباد بھیج دیا گیا۔والد صاحب نے ایک مل میں نوکری شروع کر دی،اس طرح زندگی بسر ہوتی رہی۔

میں نے فیصل آباد شہر سے ہی میٹرک اور پھر انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ہم نے اس دور میں بہت زیادہ غربت کا سامنا کیا۔ہم لٹے پٹے پاکستان آئے اور اپنا ہنستا بستا گھرانہ کپورتھلہ چھوڑ آئے تھے۔ہمیں یہاں ایک بار پھر اس قدر سخت محنت کرنا پڑی کہ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔میرا ایک نقصان یہ ہوا کہ جب ہم فیصل آباد آئے اور ہمیں سکول داخل کروایا گیا تو میرے چھوٹے بھائی نے کہا کہ میں اکیلا کلاس میں نہیں بیٹھوں گا میرے ساتھ ابراہیم طاہر بھی بیٹھے گا، اب اساتذہ میرے چھوٹے بھائی کو تو ظاہر ہے کہ ڈائریکٹ پانچویں کلاس میں نہیں بٹھا سکتے تھے تو اس کا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

حل یہ نکالا گیا کہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی کلاس میں پہلی جماعت میں اس کے ساتھ بٹھا دیا گیا تا کہ اس کا دل لگا رہے، یوں میرے پورے پانچ سال ضائع ہو گئے۔ یوں ہم دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ میں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی اور پھر ہم 1960ء میں لاہور آ گئے۔

میں نے 1953ء میں جب ہم فیصل آباد میں تھے صحافت میں قدم رکھا اور مولانا ظفر علی خان کے شہرہ آفاق اخبار ''زمیندار'' کے ساتھ بطور نامہ نگار منسلک ہو گیا۔ 1953ء کی تحریک ختم نبوت پوری شدت کے ساتھ اٹھی تو اس وقت زمیندار اخبار کے فرنٹ صفحے پر میری خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ میں ساتھ ساتھ پڑھ بھی رہا تھا اور صحافت کا شوق بھی پورا کرتا رہا۔ بعد میں روزنامہ نوائے وقت کے ساتھ بھی منسلک ہو گیا۔ دراصل مجھے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا اور پھر یہی شوق مجھے صحافت کی طرف بھی لے آیا۔ میرا پہلا مضمون آغا شورش کاشمیری کے ہفت روزہ ''چٹان'' میں شائع ہوا تھا۔ یہیں سے میرا حوصلہ بلند ہوا اور میں نے باقاعدہ صحافت کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ اس وقت زمیندار اخبار ایک آنے کا تھا، یہ اخبار تحریک ختم نبوت کا سرخیل اخبار تھا۔ میں سکول سے نکل کر خبریں اکٹھی کرتا، سب سے پہلے کچہری (عدالتوں) میں جاتا وہاں سے خبریں اکٹھی کرتا۔ تازہ فیصلوں کی نقول حاصل کرتا، پھر وہاں سے نکل کر پولیس ہیڈ کوارٹر جاتا وہاں سے تازہ صورتحال معلوم کرتا، جرائم کی تفصیلات اکٹھی کرتا اور پھر ساری خبریں لکھ کر لاہور بھیجتا۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اگلے دن جب اخبار آتا تو میری خبریں اس میں لگی ہوتیں۔ میں بروقت خبریں اس طرح لاہور میں زمیندار اور نوائے وقت کے دفاتر پہنچایا کرتا کہ اس دور میں ایک بس سروس چلتی تھی جس کا نام جی ٹی ایس (گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس) تھا، اس کا اڈہ لاہور میں ریلوے سٹیشن کے سامنے ہوا کرتا تھا۔ جی ٹی ایس کا جو آخری ٹائم فیصل آباد سے لاہور آتا تھا میں نے اس کے ڈرائیور کے ساتھ دعا سلام بنا لی تھی۔ اب میں اس ڈرائیور کو تمام خبریں دیتا اور ساتھ میں اس ڈرائیور کو بطور معاوضہ ایک سگریٹ کی ڈبی دیتا، یوں وہ بڑی دلجمعی کے ساتھ میری خبریں لاہور پہنچایا کرتا، اس وقت یہ ڈبی ایک آنے کی تھی۔ اس طرح اگلے دن دوپہر کے وقت ہمارے پاس جب اخبار پہنچتا تو اس میں میری خبریں لگی ہوتی تھیں۔ تحریک ختم نبوت کے دوران ایک مرتبہ میں رپورٹنگ کر رہا تھا تو ایک ٹرین گوجرہ سے فیصل آباد آ رہی تھی کہ اسے احتجاجی مظاہرین نے روک لیا۔ میں اب انجن کے اوپر کھڑا ہو کر خبر لکھ رہا تھا کہ اسی لمحے سٹیشن کے قریب ایک پانی کے تالاب کے ساتھ ملٹری نے ایک مورچہ بنایا ہوا تھا جہاں سے فوج نے براہ راست گولیاں برسانا شروع

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کردیں۔ (آپ کو یاد ہوگا کہ 1953ء کی تحریک ختم نبوت میں فوج نے کرفیو لگایا تھا اور براہ راست گولی چلائی تھی)۔ میں نے انجن سے نیچے چھلانگ لگا دی اور حواس باختہ ہو کر اس طرف بھاگنا شروع کر دیا جس طرف سے گولیاں آ رہی تھیں۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا، میں بس بھاگتا رہا۔ اچانک ایک دیوار سامنے آئی، حالانکہ وہ کافی اونچی تھی لیکن مجھے نہیں پتہ چل سکا کہ اس اتنی اونچی دیوار کو میں نے کیسے کراس کیا، میں نے چھلانگ لگائی اور دیوار کی دوسری طرف جا گرا، یہ ایک باغ تھا۔ میرے دوسرے ساتھی مجھ سے بچھڑ چکے تھے۔ جب میں زخمی ہو کر بہت دیر بعد گھر پہنچا تو گھر والے بہت رو رہے تھے کیونکہ انہیں کسی نے بتا دیا تھا کہ ابراہیم طاہر کو گولی لگ گئی ہے، حالانکہ مجھے گولی نہیں لگی تھی۔

صحافت میں میں اپنا پہلا استاد مولانا ظفر علی خان کو مانتا ہوں، میں نے ان سے لاہور میں ملاقات بھی کی تھی۔ اس وقت مولانا بیمار تھے اور چارپائی پر تھے۔ جب میں ان سے ملا تو وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ فیصل آباد سے زمیندار کا نمائندہ اتنا کم عمر لڑکا ہے جبکہ خبریں بہت ہی مستند اور جامع بنا کر بھیجتا ہے کیونکہ ان دنوں فیصل آباد میں ختم نبوت تحریک کا بڑا زور تھا۔ مولانا بہت خوش ہوئے اور میری بھرپور حوصلہ افزائی فرمائی۔ پھر انہوں نے مجھے ایک نصیحت کی جو آج بھی میری سماعتوں میں بالکل تروتازہ ہے۔ مولانا نے کہا ''بیٹا اگر تم اس فیلڈ میں آ گئے ہو تو پھر صحافت کو اپنی ماں اور بہن کی حرمت کے برابر سمجھنا''۔ جب فیلڈ مارشل ایوب خان کا مارشل لاء لگا تو میری صحافت کچھ عرصہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ میں ان دنوں رشین ایمبیسی اور چائنہ ایمبیسی سے خط کتابت کیا کرتا تھا۔ ان دنوں کچھ کتابیں میرے ہاتھ لگ گئی تھیں جن کی وجہ سے میرا مائنڈ سیٹ سوشل ازم کی طرف ہو گیا۔ ان دنوں میری ایک نظم ''کیا یہاں زردار دولت کو خدا کہتے ہیں'' ایک رسالے میں شائع ہوئی اور وہ رسالہ بھی پرنٹنگ پریس سے ضبط کر لیا گیا۔ میں کچھ عرصہ انڈر گراونڈ رہا اور پھر منظر عام پر آیا۔ میرے گھر پر پولیس نے چھاپہ مارا۔ میں تو گھر سے بھاگ گیا لیکن میری کتابیں، اخبارات وغیرہ سب کچھ پولیس لے گئی۔ بس یہ بچپن تھا اور پولیس چھاپے کے بعد ہی میرے ذہن سے ''سوشل ازم'' کا خمار اتر گیا۔ یہ ایوب خان کے ابتدائی دور کی بات ہے۔

مجھے اسی دور میں شاعری سے بھی لگاؤ ہوا اور میں اشعار کہنے لگا۔ میری شاعری کے استاد کا نام احمد ریاض تھا، یہ فیصل آباد کے معروف دانشور اور شاعر تھے۔ ریاض صاحب ساحر لدھیانوی کے بھی استاد تھے۔ یہ روزنامہ غریب فیصل آباد کے ایڈیٹر اور مالک تھے، یہ اخبار اب بھی فیصل آباد سے شائع ہوتا ہے۔ میں احمد ریاض صاحب سے شاعری کے اسرار و رموز سیکھا کرتا تھا۔ ایک دن انہوں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نے مجھے نصیحت کی کہ بیٹا شاعری کا شوق چھوڑ دو، کیونکہ یہ صرف آپ کو شہرت دے گی اور روٹی نہیں دے گی۔ میں اور معروف صحافی جمیل اطہر قاضی (روزنامہ جرات) ہم دونوں ریاض صاحب کے شاگرد تھے۔ قاضی صاحب اور میں دونوں بچپن کے دوست ہیں۔ اس دور میں چونکہ صحافت کر کے آپ روزی روٹی نہیں کما سکتے تھے تو اس لیے میں نے اب سنجیدگی سے ذریعہ معاش کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ ہم رپورٹرز کو اس دور میں اخبارات صرف خبریں بھیجنے کے لیے ڈاک خرچ دیا کرتے تھے، میں روزنامہ زمیندار اور نوائے وقت کے لیے کام کرتا تو مجھے ان دونوں اخبارات کی طرف سے صرف خبریں ارسال کرنے کے لیے کچھ ڈاک خرچ ہی دیا جاتا۔ اس دور میں اخبار خود ہی ''غریب'' تھے اور ان کی مالی حالت بہت پتلی تھی تو ایسے میں وہ ہم رپورٹروں کو کیسے تنخواہ دے سکتے تھے۔ بہر حال زندگی کا سفر یونہی کٹتا رہا اور میں نے فیصل آباد کے ایک کالج میں اکاؤنٹس کی ٹریننگ لینا شروع کر دی اور پھر مجھے ایک جگہ ''کالونی تھل ٹیکسٹائل ملز'' میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ کی نوکری مل گئی۔ میاں عزیز اے شیخ کالونی ٹیکسٹائل گروپ کے مالک تھے۔ یہ اپنے دور کا بڑا معروف ٹیکسٹائل گروپ تھا۔ اسی دور میں میں نے بی کام بھی کر لیا، اب یوں ہوا کہ مل مالک کا بڑا بیٹا ہیلے کالج لاہور سے بی کام کر کے گیا تھا اور اسے یہ بہت برا لگا کہ ہمارا ایک ملازم بی کام کر کے میرے برابر بیٹھے گا، چنانچہ اس کی پاداش میں مجھے ایک دور دراز علاقہ بھکر میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ کالونی گروپ کی ایک بڑی مل بھکر میں بھی واقع تھی۔ کالونی گروپ کی بہت سی ملیں تھیں، خاص طور پر ان کی ٹیکسٹائل ملیں اور فلور ملیں ملک کے اہم شہروں میں واقع تھیں۔

خیر جب میری ٹرانسفر بھکر ہوئی تو میں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا کہ میں اتنی دور اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر کیسے جاؤں گا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ فیصل آباد میں ہمیں مل کی طرف سے ایک کوارٹر ملا ہوا تھا جس میں میرے والد اور ہم بہن بھائی رہتے تھے، میرے بہن بھائی پڑھتے تھے۔ اگر میں بھکر چلا جاتا تو یہ کوارٹر ہم سے لے لیا جاتا اور ہمارے لیے بہت سے مسائل کھڑے ہو جائے، چونکہ میری والدہ 1957ء میں وفات پا گئی تھیں تو اب گھر کا سربراہ میں تھا، والد صاحب بہت بوڑھے تھے اور تمام ذمہ داریاں میرے سر تھیں۔

میں صبح سویرے اٹھتا اور اپنے بہن بھائیوں کو سکول کی تیاری کرواتا، انہیں ناشتہ کرواتا اور انہیں سکول روانہ کر کے خود ملازمت پر چلا جاتا۔ اب مجھے مالکان کی طرف سے کہا گیا کہ آپ کو ہر حال میں بھکر جانا ہوگا۔ ایک دن میرے والد صاحب بہت پریشانی کے عالم میں گھر آئے اور میرے سامنے آ کر رو پڑے اور کہنے لگے کہ آج مل مالک کی بیگم صاحبہ نے مجھے اپنے پاس بلایا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اور مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر اس ہفتے ابراہیم طاہر بھکر نہیں جاتا تو پھر آپ کو یہ کوارٹر خالی کرنا ہوگا۔ والد صاحب بھی اسی مل میں کام کرتے تھے۔ والد صاحب کی بات سن کر بہن بھائی بھی رونے لگے تو ان حالات میں میں نے بھکر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے ایک دو سوٹ ایک تھیلے میں ڈالے اور بوجھل قدموں سے فیصل آباد جی ٹی ایس (گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس) سٹینڈ کی جانب چل پڑا۔ میں ایک بس میں سوار ہوا، بس چل پڑی اور کافی دیر بعد کنڈیکٹر میرے پاس کرایہ لینے آیا تو میں نے پوچھا کہ بھکر کا کتنا کرایہ ہے؟ کنڈیکٹر بولا بھائی جان یہ بس تو لاہور جارہی ہے اور اب لاہور آنے والا ہے۔ یہ سن کر میں بہت حیران ہوا اور اسے کہا کہ چلو خیر ہے مجھے لاہور ہی لے جاؤ ۔آج سوچتا ہوں کہ یہ واقعی قدرت کا فیصلہ تھا اور محض غلط بس میں بیٹھنے کی وجہ سے میری پوری قسمت بدلنے والی تھی۔

میں لاہور پہنچ کر جی ٹی ایس سٹینڈ پر اترا۔ کچھ عرصہ قبل ہی میرا چھوٹا بھائی لاہور آچکا تھا اور مجھے اس کے آفس کا تھوڑا بہت اندازہ تھا کہ منٹگمری روڈ کے آس پاس ہی کہیں ہے، یہ آفس بھی کالونی گروپ کا ہی تھا۔ میں لوگوں سے پوچھتے ہوئے بھائی کے آفس جا پہنچا اور وہ مجھے اچانک دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ جہاں اس وقت مال روڈ پر پچورا ما سنٹر ہے یہاں کسی دور میں ''سول اینڈ ملٹری گزٹ بلڈنگ'' واقع تھی اور یہ لاہور کی ایک مشہور جگہ تھی۔ آپ یقین کیجیے کہ بھائی مجھے یہاں لے گئے اور مجھے پہلے ہی دن اکاؤنٹس میں ایک اچھی نوکری مل گئی اور تنخواہ بھی فیصل آباد والی تنخواہ سے ڈبل تھی۔ اب قسمت دیکھیے کہ یہ فرم بھی ''کالونی گروپ'' کی تھی۔ ہم دونوں بھائیوں نے پرانی انارکلی میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا اور پیدل ہی آفس جاتے تھے۔ میں یہاں چند ہی ماہ رہا کہ کالونی گروپ فیصل آباد والوں کو پتہ چل گیا کہ ابراہیم طاہر بھکر نہیں گیا اور ہمارے ہی رشتہ داروں کے ہاں لاہور میں ملازمت کر رہا ہے۔ انہیں یہ بات بہت ناگوار گزری۔

لاہور میں کالونی گروپ کے مالک کا نام میاں نصیر احمد تھا اور ان کا ایک بیٹا ہمایوں تھا۔ ان کی ایک بہت بڑی کوٹھی مال روڈ پر میاں میر پل کے قریب واقع تھی، یہ آٹھ کنال کی بڑی شاندار کوٹھی تھی۔ جب کالونی گروپ تقسیم ہوا تو یہ کوٹھی فیصل آباد گروپ کے حصے میں آئی۔ اس میں بہت سے کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ کوٹھی میں ان کے بہت سے گھوڑے رکھے ہوئے تھے اور دیگر ملازمین بھی رہتے تھے۔ ہمیں ہمایوں نے کہا کہ ایک حصے میں آپ دونوں بھائی رہائش رکھ لیں اور ملازمین کی نگرانی کیا کریں۔ میری شادی 1960ء میں ہوئی تھی اور میری ایک چھوٹی سی بیٹی تھی، میں خوشی خوشی فیصل آباد گیا اور اپنے بچوں کو لے کر اس کوٹھی میں منتقل ہوگیا۔ ایک بار پھر اس مالک کی اہلیہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرے پاس آ گئی کہ آپ یہاں سے نکلو کیونکہ یہ ہماری کوٹھی ہے۔ خیر ہم وہاں سے نکلے اور ایک اور جگہ پر مکان کرایہ پر لے لیا۔ جب مجھے "کالونی گروپ" نے زیادہ تنگ کیا تو مجھے بھائی نے کہا کہ آپ اس گروپ کو چھوڑ دیں، اللہ آپ کو کہیں اور اچھی نوکری دے گا۔ اس طرح میں نے تنگ آ کر یہ گروپ چھوڑ دیا۔ کمشنر انکم ٹیکس لاہور کے ساتھ میرے بھائی کے اچھے تعلقات تھے، بھائی نے ان سے میری ملازمت کے بارے میں بات کی تو انہوں نے کہا کہ سول ملٹری گزٹ بلڈنگ کے بالکل سامنے پارسیوں کی ایک کمپنی "کانڈا والا انڈسٹریز" کا دفتر ہے اور انہیں اکاؤنٹنٹ کی ضرورت ہے، میں انہیں فون کرتا ہوں اور آپ فوری طور پر وہاں پہنچیں۔ مجھے پیغام ملا تو میں کانڈا والا آفس جا پہنچا۔ کانڈا والا اپنے وقت کا ایک بہت بڑا گروپ تھا، اس کا ہیڈ آفس کراچی میں تھا، کراچی میں "کانڈا والا بلڈنگ" بہت معروف جگہ ہے۔ "کانڈا والا انڈسٹریز لمیٹڈ" نے پاکستان میں ہر قسم کی گاڑیاں تیار کرنے میں اس دور میں سبقت حاصل کر لی تھی۔ ان کی تیار کردہ عام استعمال میں آنے والی مشہور، پائیدار اور مضبوط گاڑیاں پورے ایشیا میں مشہور تھیں۔ اس گروپ کا ہیڈ آفس کانڈا والا بلڈنگ ایم اے جناح روڈ کراچی میں واقع تھا۔ یہ گروپ "یونیورسل جیپ"، "گلیڈ ییز جیپ"، "یوٹیلٹی ویگن جیپ" اور دیگر گاڑیاں تیار کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ملٹری کے استعمال کے لیے بھی مختلف قسم کی فوجی جیپیں تیار کی جاتی تھیں۔ کانڈا والا موٹرز نے 1962 میں کراچی میں کارخانہ لگایا اور دنیا بھر میں جیپوں کے نمبر ون برانڈ کی پاکستان میں پروڈکشن اور اسمبلنگ شروع کی۔ اس دور کے روزنامہ جنگ، نوائے وقت میں کانڈا گروپ انڈسٹریز کے بڑے بڑے اشتہارات شائع ہوتے تھے جس میں گروپ کی خدمات اور مصنوعات کا ذکر ہوتا۔ یہاں میں بتاتا چلوں کہ اس دور میں ہمارے اطراف کے ممالک جن میں چین، روس، بھارت اور تھائی لینڈ شامل ہیں، یہ ممالک اس دور میں اس طرح کی ورلڈ کلاس انڈسٹری لگانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے جو ہمارے پاس تھی۔ بدقسمتی سے یہ ادارہ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے قومیا لیا اور اس کا نام تبدیل کر کے "نیا دور موٹرز" رکھ دیا گیا۔ یہ "نیا دور" اس انڈسٹری کے لیے بدترین دور ثابت ہوا اور سرکاری کنٹرول میں آنے کے چند سال کے اندر جیپ کی پروڈکشن مکمل طور پر بند ہو گئی۔ آخر کار یہ ادارہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔

بہرحال مجھے "سول ملٹری گزٹ بلڈنگ" کے سامنے واقع مسٹر کانڈا والا گروپ میں نوکری مل گئی۔ یہ بالکل انگلش ٹائپ آفس تھا، لڑکیاں ٹائٹس پہنے بیٹھی تھیں، مکمل انگریزی ماحول تھا۔ یہ لڑکیاں رات کو کلبوں میں جا کر ڈانس کرتی تھیں، شرابیں پیتی تھیں اور خود کو انگریز کی نسل سے ثابت

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کرنے کی پوری کوشش کرتی تھیں۔ یہ ایسی فرفر انگریزی بولتی تھیں جیسی ان کی مادری زبان ہو۔ دفتر میں صرف انگریزی بولی جاتی تھی، مجھ سے انگریزی میں انٹرویو لیا گیا تو میری انگریزی ذرا کمزور تھی۔ وہاں ایک شخص نے انہیں کہا کہ یار آپ نے اس کی انگریزی چیک کرنی ہے یا اس سے کام لینا ہے۔ اس کا کام چیک کرو، اگر کر سکتا ہے تو بس ٹھیک ہے، انگریزی آنا ضروری نہیں۔ بہر حال مجھے اس گروپ میں بہت اچھی نوکری مل گئی۔ 26 مارچ 1966ء کو میں نے یہ فرم جوائن کر لی، یہاں تنخواہ بہت پرکشش تھی۔ اس سے قبل میں سول ملٹری گزٹ میں 250 روپے پر کام کرتا تھا اور کانڈا والا گروپ نے میری تنخواہ 500 مقرر کی۔ انٹرویو میں مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ کتنی تنخواہ پر کام کریں گے؟ میں نے بڑی چھلانگ لگائی اور کہا کہ میں 500 روپے پر کام کروں گا، انہوں نے فوراً کہا کہ آپ آج ہی سے کام شروع کر دو۔

اس گروپ کا اصول تھا کہ 29 مارچ کو ان کا مالی سال ختم ہوتا تھا، میں نے 26 مارچ کو کمپنی جوائن کی اور تین دن بعد ان کا سال ختم ہونے والا تھا۔ وہ ہر سال کی کلوزنگ پر اپنے ملازمین کو سپیشل بونس دیتے۔ 29 مارچ کو انہوں نے مجھے ایک لفافہ دیا کہ یہ آپ کا بونس ہے، جب میں گھر پہنچا اور لفافہ کھولا تو حیران رہ گیا کہ یہ بہت بڑی رقم تھی، یہ سات ہزار روپے تھے جو اس وقت ایک خطیر رقم تھی۔ میرے گھر والے کہتے تھے کہ آپ نے کوئی ڈاکہ مارا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مجھے اس کمپنی میں صرف تین دن ہوئے تھے لیکن انہوں نے مجھے بھی ان ملازمین میں شامل کیا جن کو سالانہ بونس دیا گیا۔ اس کمپنی کے پارسی مالکان کے اصول وضوابط بہت زبردست تھے اور وہ بہت مزدور دوست تھے، لوگوں کی قدر کرنا جانتے تھے۔ اس خطیر رقم سے میں نے اچھرہ اور رحمٰن پورہ کے درمیان ایک آبادی ''دوہٹہ کالونی'' کے نام سے ہے، وہاں 22 مرلے جگہ خرید لی اور اپنا مکان بنا لیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کا دور آیا تو اس میں شیخ رشید وزیر صحت تھا۔ یہ اچھرہ میں پانی والی ٹینکی کے پاس ڈھائی مرلے کے گھر میں رہتا تھا، یہ بنیادی طور پر وکیل تھا اور اس کی وکالت چلتی نہیں تھی تو اس نے سیاست شروع کر دی۔ والد صاحب اکثر اس کے پاس جاتے اور گپ شپ لگاتے۔ اس وقت ہر طرف کھیت تھے، شیخ رشید صبح سیر کے لیے نکلتا تو اکثر ہمارے گھر والد صاحب کے پاس آ جاتا۔ الیکشن آیا تو اس نے والد صاحب سے کہا کہ میاں جی اس علاقے میں سب سے پرانے آپ ہیں، آپ لوگوں کو قائل کریں کہ مجھے ووٹ کاسٹ کریں۔ یہ 70 کے الیکشن کی بات ہے، پھر بھٹو صاحب جیت گئے۔ اس الیکشن کے متعلق کہا گیا تھا کہ اگر پیپلز پارٹی کسی گدھے کو بھی اپنا امیدوار کھڑا کر دیتی تو لوگوں نے گدھے کو بھی ووٹ دے دینا تھا۔ اس وقت پوری فضا پی پی پی کے حق میں تھی۔ الیکشن میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شیخ رشید ایلیکٹ بھی ہوا اور پھر منسٹر بھی بن گیا۔ یہ جو شادمان کالونی ہے یہ اس دور میں جیل کا علاقہ تھا۔ فیروز پور روڈ سے نہر تک یہ وسیع و عریض جیل تھی۔ اس پورے علاقے میں صرف دو چیزیں تھیں ایک مینٹل ہسپتال تھا اور دوسری یہ جیل تھی۔ جب شیخ رشید منسٹر بنا تو اس نے والد صاحب سے کہا کہ میاں جی میں نے آپ کے لیے شادمان میں دو کنال جگہ الاٹ کروالی ہے، یہ آپ بطور تحفہ رکھ لیں کیونکہ آپ نے ہمارا مکمل ساتھ دیا ہے لیکن میرے والد نے یہ پلاٹ لینے سے انکار کردیا کہ اس پر میرا کوئی حق نہیں بنتا اور یہ سرکاری جگہ ہے۔

خیر میں بات کررہا تھا اپنی ملازمت کی تو میں ''کانڈاوالا انڈسٹریز لمیٹڈ'' میں کام کررہا تھا اور لندن، ڈھاکہ اور کراچی کے کاروباری معاملات کا انچارج تھا۔ سارا حساب کتاب میرے پاس ہوتا۔ میری تنخواہ تیزی سے بڑھتی گئی، میں لندن اور کراچی بہت زیادہ جاتا رہا لیکن ڈھاکہ نہ جاسکا۔ پھر یہ ہوا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں دیگر صنعتوں کے ساتھ ساتھ اس صنعت پر بھی زوال آگیا اور اسے ''قومیا'' لیا گیا۔ اس گروپ کا بیڑہ غرق ہوکررہ گیا۔ پارسیوں کو بھی تنگ کرنا شروع کردیا گیا اور یوں یہ کمپنی 1998ء میں بالکل بند ہوگئی۔ میں یہ کمپنی 1991ء کو چھوڑ کر مستقل طور پر امریکہ چلا گیا لیکن کمپنی نے میرا نام اپنے ملازمین کی فہرست میں سے اس وقت خارج کیا جب 1998ء میں یہ بالکل بند ہوگئی۔ 1998 میں لاہور آفس مکمل طور پر بند کردیا گیا۔ ''کانڈاوالا انڈسٹریز لمیٹڈ'' کا لاہور آفس جو مال روڈ پر سول اینڈ ملٹری گزٹ بلڈنگ کے سامنے واقع تھا وہاں جیولری مارکیٹ بنی ہوئی ہے، یہ پینوراما سنٹر کے بالکل سامنے ہے۔ اس کے عقب میں ہمارے گروپ کی بہت بڑی ورکشاپ تھی جو لارنس روڈ تک آتی تھی۔ اب اس جگہ پر دکانیں وغیرہ بن گئی ہیں اور پرانے آثار ختم ہوگئے ہیں۔ میں ذوالفقار علی بھٹو کا سخت ناقد ہوں۔ اس نے سوائے تباہی کے اس ملک کو کچھ نہیں دیا۔ بھٹو دور ایک سیاہ ترین دور تھا، بھٹو نے ملک کو دولخت کیا تھا۔ بھٹو پر اقتدار کے حصول کا اس قدر بھوت سوار تھا کہ اس نے بنگالیوں کے ساتھ سخت ناانصافیاں کیں اور آخرکار یہ ملک ٹوٹ گیا۔ بھٹو نے سیاسی مخالفین کا قتل کیا اور اس نے صنعتوں کو قومیانے کی پالیسی اپنا کر انہیں تباہی سے دوچار کرڈالا۔

میں تو بھٹو دور کو سیاہ ترین دور قرار دیتا ہوں۔ میں نے بھٹو کا دور بھی قریب سے دیکھا اور جنرل ضیاء الحق شہید کا دور بھی۔ ضیاء کا دور سنہری ترین دور تھا اور اسے ویسے ہی بدنام کردیا گیا۔ اس وقت افراتفری نہیں تھی، لوگوں کو عزت کی روٹی نصیب ملتی تھی۔ حالانکہ جنرل ضیاء کا دور مشکل ترین دور تھا اسے بہت سے قومی و عالمی چیلنجز کا سامنا تھا۔ ضیاء کے دور میں سوویت یونین کی طرف سے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہم پر ایک بہت بڑی جنگ مسلط کر دی گئی تھی لیکن ضیاء اور ان کے ساتھیوں نے بڑی بصیرت اور بہادری کے ساتھ اس جنگ کا مقابلہ کیا اور سرخ فوجوں کو شکست فاش سے دوچار کیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جنرل ضیاء نے امریکی اسلحہ سے روس کو شکست دی لیکن میں کہتا ہوں کہ جنرل ضیاء نے روسی اسلحہ سے ہی روس کو شکست دی۔ اس کی تفصیل مختلف کتابوں میں آ چکی ہے، میں جنرل ضیاء الحق شہید کو مجاہدِ اسلام کہتا ہوں۔

جب 1965ء کی جنگ ہوئی تو اس وقت میں کانڈا والا گروپ میں کام کر رہا تھا۔ آفس ٹائم صبح آٹھ بجے تھا اور مجھے مسٹر کانڈا والا نے کہا تھا کہ آپ دس بجے آیا کرو، آپ ہمارے چیف اکاؤنٹنٹ ہو اور آپ صرف مجھے جواب دہ ہو۔ 6 ستمبر 65ء کو جنگ شروع ہوئی تو اس دن میں آفس پہنچا تو ایک لڑکی جو ہمارے ایم ڈی مسٹر کانڈا کی سیکرٹری تھی میرے پاس بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی کہ مسٹر کانڈا والا نے صبح سے چھ بار فون کیا ہے اور آپ کا پوچھا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے مسٹر کانڈا والا نے خود حکم دے رکھا ہے کہ آپ صبح دس بجے آفس آیا کریں۔ اس نے فوراً نمبر ملایا اور میری بات کروائی۔ مسٹر کانڈا کہنے لگے ''مسٹر طاہر! تم جانتے ہو کہ پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ شروع ہو چکی ہے''۔ میں نے کہا مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے کہ باقاعدہ جنگ لگ چکی ہے اور تم ایسا کرو کہ میں نے اکبری منڈی میں ایک آڑھتی کو فون کر دیا ہے تم فوری طور پر وہاں پہنچو اور وہاں سے ضروری گھریلو راشن لے کر تمام ورکرز میں تقسیم کر دو۔ فلور مل سے آٹا خرید لو اور وہ بھی سب میں تقسیم کر دو۔ مسٹر کانڈا کہنے لگے کہ ''میں جنگ عظیم دوم بھگت چکا ہوں، مجھے علم ہے کہ جنگ کس قدر رتباہی پھیلاتی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ اشیائے خورونوش کا ہوتا ہے''۔ میں مسٹر کانڈا والا کا انسانیت کے متعلق اس قدر احساس جان کر حیران رہ گیا، یعنی انہوں نے اپنی ذات اور اپنے کاروبار کی بات نہیں کی بلکہ انہیں اپنے ورکروں اور مزدوروں کی فکر تھی۔ میں نے پھر اشیائے خورونوش لے کر تمام ورکروں میں بانٹ دیں۔

دن گیارہ بجے فیلڈ مارشل ایوب خان نے ریڈیو پر جب تقریر کی تو اس وقت باقاعدہ پوری قوم کو علم ہوا کہ جنگ چھڑ چکی ہے جبکہ ایوب کی تقریر سے پہلے ہی مجھے اس جنگ کا علم مسٹر کانڈا والا کے ذریعے ہو چکا تھا۔ مسٹر کانڈا والا کو اس لیے اس جنگ کا بروقت پتہ چل گیا کیا تھا کہ جرنیل ان کے دوست تھے۔ یہ لوگ رات کو شرابیں پینے اور عیاشیاں کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے اور ان کی بڑی پکی دوستیاں تھیں۔ اس وقت شراب کا کاروبار بھی صرف پارسی لوگ ہی کیا کرتے تھے۔ اس وقت پاکستان میں دو بڑی ملیں تھیں جہاں پر اعلیٰ برانڈ کی شرابیں بنتی تھیں اور یہ شرابیں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ایکسپورٹ ہوتی تھیں۔ایک مل کا نام Murree Brewery ہے اور دوسرا نام اس وقت ذہن میں نہیں آ رہا۔مری بریوری دیگر کولڈ ڈرنکس بھی بناتی ہے۔آج بھی یہ دونوں ملیں شراب کشید کرنے میں معروف ہیں۔

مسٹر کانڈا والا پاکستان ٹیلی ویژن ایبٹ روڈ لاہور کے سامنے ایک کوٹھی میں رہتے تھے اور یہ کوٹھی معروف لکھاری امتیاز علی تاج کی ملکیت تھی۔ میں نے ایک مرتبہ مسٹر کانڈا والا سے کہا کہ آپ کے پاس اتنا پیسہ ہے آپ اپنا مکان کیوں نہیں بنا لیتے ؟ انہوں نے مجھے جواب دیا کہ Fools build houses and wise men live in (بے وقوف لوگ گھر بناتے ہیں اور عقل مندان میں رہتے ہیں)۔ کہنے لگا کہ میں نے جو خطیر رقم گھر بنانے پر خرچ کرنی ہے وہ میں اپنے کاروبار بڑھانے پر کیوں نہ خرچ کر دوں؟۔خیر جب ''کانڈا والا انڈسٹریز'' گروپ زوال کے قریب آن پہنچا تو میں نے اسے خیر باد کہا اور 1991ء میں امریکہ چلا گیا اور 2005ء تک وہیں رہا۔میں نے امریکہ میں جاتے ہی اپنا بزنس شروع کر دیا ہے اور اللہ نے مجھے بہت نوازا۔میں نے امریکہ میں پٹرول پمپ کے ساتھ ایک سٹور کھولا اور اپنا کام شروع کر دیا،اس دور میں امریکہ میں مقیم اکثر پاکستانی یہی کاروبار کرتے تھے۔پھر 2005ء میں میری اہلیہ شدید علیل ہو گئیں تو مجھے بامر مجبوری مستقل طور پر پاکستان واپس آنا پڑا۔اس کے بعد میں نے کوئی کام نہیں کیا اور بس لکھنے اور پڑھنے سے دل لگا لیا۔میں بالکل بھی بوریت محسوس نہیں کرتا،بس اپنا نماز روزہ کرتا ہوں اور دلچسپ کتابیں پڑھتا ہوں اور لکھتا رہتا ہوں۔جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجھے زمانہ طالب علمی سے ہی صحافت اور لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا۔جب 1970ء میں عنایت اللہ صاحب کا ماہنامہ حکایت کا پہلا شمارہ نکلا تو اس میں میرا مضمون بھی شامل تھا۔عنایت اللہ صاحب پہلا شمارہ خود مجھے دینے آئے تھے۔65 کی جنگ کو جس طرح عنایت اللہ مرحوم نے کور کیا وہ شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ میں نے حکایت میں مختلف موضوعات پر لکھا اور بہت لکھا۔میرے پسندیدہ مصنف نسیم حجازی تھے، میری ان کے ساتھ بہت زیادہ دوستی رہی اور میں ان کے اخبار میں ''کوہستان'' میں مستقل طور پر لکھتا بھی رہا۔حجازی صاحب بہت ہی نفیس انسان تھے اور دوستوں کی قدر کرنے والے تھے۔بعض اوقات میرے کالمز اخبار کے فرنٹ صفحے پر بھی شائع ہوا کرتے۔مجید نظامی ، مجیب الرحمٰن شامی ،جمیل اطہر قاضی،عنایت اللہ (مدیر حکایت) کے ساتھ بھی میرا بہت زیادہ تعلق رہا۔میرا سب سے پہلا مضمون شورش کاشمیری کے اخبار چٹان میں شائع ہوا۔

میں نے 1953ء میں فیصل آباد سے صحافت کا آغاز کیا اور میرا بچپن بھی وہیں گزرا۔اس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

وقت اس کا نام لائل پور تھا، اس دور میں لائل پور میں صحافت کے چار بڑے نام تھے۔ چودھری ریاست علی آزاد ایڈیٹر روزنامہ ''غریب'' بڑی زندہ دل شخصیت تھے، یہ شام کے وقت کچہری بازار میں فٹ پاتھ کے اوپر اپنا حقہ لے کر بیٹھتے تھے، ان کے آس پاس لوگ جمع ہوتے اور محفل خوب جمتی۔ اس دور میں ابھی لوگوں میں افراتفری نہیں مچی تھی اور لوگوں کے پاس گپ شپ اور محفلوں کا وقت بھی ہوتا تھا۔ دوسرے صحافی کا نام ناسخ سیفی تھا۔ یہ ''سعادت'' اخبار فیصل آباد کے بانی تھے۔ ناسخ سیفیؒ نے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا، انہوں نے ہمیشہ انگریز کے سامنے کلمہ حق بلند کیا، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے فرمان پر ''سعادت'' اخبار کا ڈیکلریشن حاصل کیا تھا۔ ناسخ سیفی نے تحریک پاکستان کے لیے اپنی بھرپور سرگرمیاں جاری رکھیں۔ بعد میں ان کے بیٹوں خلیق الرحمٰن سیفی، شفیق الرحمٰن سیفی نے سعادت اخبار کی باگ ڈور سنبھال لی اور یہ اخبار اب بھی شائع ہو رہا ہے۔ تیسرے صحافی خلیق قریشی تھے جو ''عوام'' اخبار نکالتے تھے۔ چوتھے صحافی چودھری شاہ محمد عزیز تھے جو ڈیلی ''بزنس'' کے نام سے اخبار شائع کرتے تھے۔ یہ سارے اخبار کچہری بازار فیصل آباد سے شائع ہوتے تھے۔ فیصل آباد میں ریلوے سٹیشن کے قریب جی ٹی ایس چوک پر ڈیلی بزنس اخبار کا دفتر تھا۔ ان چاروں صحافیوں سے میری بہت اچھی ملاقاتیں رہیں۔ میں نے ان سے خبر بنانا اور لکھنا سیکھا۔ یہ لوگ بامقصد صحافت کرنے والے تھے۔ روزنامہ عوام کے ایڈیٹر خلیق قریشی شاعر بھی تھے، فیلڈ مارشل ایوب خان کے دورِ حکومت میں انہوں نے نظمیں کہی تھیں۔ وہ اکثر ''کالونی ٹیکسٹائل گروپ'' کے مالک میاں عزیز اے شیخ کو نظمیں سنایا کرتے تھے کیونکہ میاں عزیز اے شیخ باذوق انسان تھے اور وہ اکثر اپنے دفاتر میں مشاعروں کا انعقاد کروایا کرتے۔

فیصل آباد کے سہگل گروپ نے بھی اپنا اخبار ''آفاق'' نکالا تھا۔ یہ ایوب خان کا دور تھا۔ سہگل گروپ کا مالک سعید سہگل تھا۔ انہوں نے فیصل آباد میں ایک سرکاری سڑک پر قبضہ کر کے دفتر بنایا تھا۔ سہگل گروپ فیلڈ مارشل ایوب خان کے بہت قریب تھا اور ایوب خان نے انہیں کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ جب فیلڈ مارشل نے محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف الیکشن لڑا تھا تو اس وقت ایوب خان کا انتخابی نشان پھول تھا اور سہگل گروپ نے کروڑوں روپے کے پھول تقسیم کیے تھے۔

صحافت کے ساتھ ساتھ مجھے سیر و سیاحت کا شروع سے شوق رہا ہے اور پھر اللہ نے مجھے موقع بھی دیا کہ میں نے مختلف ممالک کے سفر کیے۔ زندگی کا اولین سفر جو میں نے اپنے شوق کے بل بوتے پر کیا وہ 1947ء کے اوائل میں تھا، تب پاکستان نہیں بنا تھا اور میری عمر دس برس تھی لیکن مجھے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تمام واقعات اچھی طرح یاد ہیں۔ یہ سفر کپورتھلہ سے امرتسر کا تھا۔ 1947ء کا سال شروع ہو چکا تھا اور یہ ایک پرآشوب دور تھا۔ والد صاحب کو کاروباری سلسلے میں امرتسر جانا تھا اور میں نے بھی ضد کی کہ مجھے ساتھ لے جایئے۔ امرتسر میں جانا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ سکھ جتھوں نے ہندوؤں کی شہ پر امرتسر میں مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا اور مسلمانانِ امرتسر بڑی جرات کے ساتھ سکھوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ بہر حال میری ضد کے آگے والد گرامی نے ہتھیار ڈال دیے اور مجھے ساتھ لے گئے۔ ہم امرتسر ریلوے سٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ شہر میں کرفیو نافذ ہے اور فوج گشت کر رہی ہے۔ ہمیں ہال بازار میں ایک ہندو کھتری کروڑی مل کے ہاں جانا تھا لیکن ملٹری ہمیں اس طرف نہیں جانے دے رہی تھی کیونکہ سکھ جتھے ننگی کرپانیں لیے سڑکوں پر گشت کر رہے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک مسلمان اہلکار مل گیا جس نے ہمیں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں بٹھا دیا۔ ہندو کھتری نے ہم سے دن گیارہ بجے کا وعدہ کیا تھا کہ وہ خود ریلوے سٹیشن آ جائے گا کیونکہ گیارہ بجے کرفیو کا کچھ وقفہ ہوتا تھا۔ بہر حال مقررہ وقت پر کھتری آ گیا اور ہم اس کے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر اس کے گھر چلے گئے۔ والد صاحب نے جلدی جلدی اس کے ساتھ اپنا کاروباری حساب کتاب کیا اور ہم واپس کپورتھلہ آ گئے۔

میرا دوسرا بڑا سفر ہندوستان سے پاکستان کی طرف تھا جو ایک نہایت کٹھن، خطرناک اور دلدوز واقعات سے پر تھا۔ درحقیقت یہ سفر موت سے زندگی کی طرف تھا۔ اس سفر کی مختصر روداد میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ بہر حال بتانے کا مقصد یہ ہے کہ مجھے سفر کرنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے دنیا کے مختلف ممالک کی سیر کی اور پڑوسی ملک بھارت میں تو میں 18 مرتبہ گیا اور مختلف مقامات دیکھنے کا موقع ملا۔ اکثر سفرناموں کے تاثرات تو میرے کتابوں میں چھپ چکے ہیں۔ یہاں مختصر عرض کرتا چلوں کہ میں 1977ء میں دہلی گیا۔ میں پاکستانی زائرین کے اس قافلے میں شامل تھا جس نے حضرت امیر خسروؒ کے عرس مبارک میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ ہم 14 ستمبر 1977ء کو حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر جمع ہوئے اور پھر بسوں کے ذریعے واہگہ کے راستے بھارت پہنچے۔ کسٹم حکام نے ہماری ایک گھنٹہ چیکنگ کی اور پھر ہم لوگوں کو امرتسر ریلوے سٹیشن پہنچا دیا گیا۔ رات نو بجے ہم بذریعہ ٹرین امرتسر سے روانہ ہوئے اور صبح سات بجے دہلی ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ یکم اکتوبر کو ہم نے حضرت امیر خسروؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور محبوب الٰہیؒ کے مزارات پر حاضری دی اور اگلی صبح ہم نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے مزار پر حاضری دی۔ ہم نے قطب مینار بھی دیکھا۔ اسلام کی اس عظمتِ رفتہ کے اس شاہکار کو دیکھ کر بہت زیادہ مسرت محسوس کی اور اس

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے ساتھ ساتھ اس کی زبوں حالی پر افسوس بھی ہوا۔ قطب مینار کے چاروں طرف نیچے سے اوپر تک قرآن پاک کی آیات مبارکہ کندہ ہیں۔ اس کے ساتھ قطب الدین ایبک نے مسجد باب السلام کا آغاز بھی کیا تھا لیکن اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکا۔ مسجد کا ایک ہی مینار تعمیر ہوا تھا جو آج ''قطب مینار'' کہلاتا ہے۔ دوسرے مینار اور مسجد کے لیے رکھے گئے پتھر اس وقت تک (1977) تک وہیں موجود تھے، اب تازہ صورتحال کا مجھے علم نہیں ہے۔

ہم حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر بھی حاضر ہوئے۔ اسی مزار پرانوار پر بابا فرید گنج شکرؒ نے چلہ کاٹا اور فیض حاصل کیا تھا۔ کاکیؒ کے مزار کے احاطے میں ہی آپ کے خلیفہ حضرت شاہ عبدالعزیز بسطامیؒ اور آپ کے استاد خلیفہ حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے مزارات واقع ہیں۔ ہم حضرت باقی باللہؒ کے مزار پر بھی گئے۔ ہم نے آگرہ بھی دیکھا، دہلی سے آگرہ جا رہے تو سڑک کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ راستے میں غازی آباد، بلند شہر اور علی گڑھ جیسے شہر بھی دیکھے۔ ہم علی گڑھ یونیورسٹی دیکھنا چاہتے تھے لیکن نہ دیکھ سکے۔ ہم سکندر آباد میں بھی گئے اور وہاں اکبر اعظم کی آخری آرام گاہ بھی دیکھی۔ اکبر اعظم کا مقبرہ بہت عظیم اور مغلیہ طرز تعمیر کی شاندار یادگار ہے۔ یہ تین منزلہ مقبرہ ہے اور اس پر انتہائی خوبصورت میناکاری کی گئی ہے۔

میں نے جامع مسجد آگرہ بھی دیکھی اور نماز ظہر ادا کی۔ دنیا کا عجوبہ تاج محل بھی دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ تاج محل دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے۔ یہ سنگ مرمر کا شاندار محل شاہ جہان نے اپنی بیگم ممتاز محل کی یاد میں دریائے جمنا کنارے تعمیر کروایا تھا۔ شاہ جہان خود بھی ممتاز محل کے پہلو میں محو خواب ہے۔ تاج دروازہ 211 فٹ لمبا اور 86 فٹ چوڑے چبوترے پر لال پتھروں کا ایک نہایت خوبصورت تین منزلہ دروازہ ہے۔ تاج دروازہ سے اتر کر سیڑھیوں پر اترنے کے بعد تاج باغ شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی وسیع وعریض باغ ہے۔ اپنے بھارتی دوروں میں مجھے نامور صوفیائے کرام کے مزارات کے علاوہ تاج محل آگرہ، جامع مسجد دہلی، جامع مسجد فتح پوری دہلی، ہمایوں کا مقبرہ دہلی، لال قلعہ دہلی اور دیگر اہم مقامات دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نومبر 1986ء میں حضرت علاء الدین علی احمد صابر پیاؒ کے عرس مبارک میں کلیئر شریف بھارت گیا۔ ہم واہگہ کے ذریعے امرتسر پہنچے، امرتسر سے ہمیں بذریعہ ریل گاڑی ''رڑکی'' پہنچا دیا گیا۔ رڑکی سے ایک گھنٹہ کی مسافت طے کر کے ہم حضرت صابر پیاؒ کے مزار پر پہنچے۔ ہمارے یہاں تین دن سونے یا عبادات میں گزرے کیونکہ حضرت پیاؒ کا مزار ایک جنگل بیابان میں واقع ہے اور اس وقت وہاں قریب کوئی بھی شہر یا مارکیٹ نہیں تھی۔ یہاں بتاتا چلوں کہ بھارت میں بزرگوں کے عرس کے دنوں میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مزارات کے آس پاس ہر جگہ بھارتی خفیہ اہلکار موجود ہوتے ہیں جو پاکستانی زائرین پر بہت کڑی نظر رکھتے ہیں۔حتیٰ کہ ٹیکسی ،رکشہ ڈرائیور بھی زیادہ تر خفیہ پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کے اہلکار ہوتے ہیں یا ان کے ایجنٹ ہوتے ہیں جو پاکستانیوں کی ہر مووومنٹ کی رپورٹس اپنے محکموں کو بھیجتے رہتے ہیں۔بے چارے بعض زائرین ذرا بھی ادھر ادھر ہوتے ہیں تو انہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے، یہ بڑی تکلیف دہ صورتحال ہے۔اس لیے بھارت میں پاکستانیوں کا مختلف تقریبات یا عرسوں میں شرکت کے لیے جانا بے حد حساس معاملہ بھی ہوتا ہے، قدم قدم پر احتیاط کرنا پڑتی ہے اور ذرا سی غفلت یا لاپرواہی سے آپ انڈین جیلوں میں بند کیے جا سکتے ہیں۔ایک مرتبہ میں نے حاجی کیمپ لاہور میں بھارت جانے والے زائرین سے اپنے خطاب میں کہا کہ ''ہم سب ایک دشمن ملک میں جا رہے ہیں ،جہاں ہمیں قدم قدم احتیاط کی ضرورت ہے۔وہاں کوئی ایسی حرکت نہ کریں جو ہمارے وطن کی بدنامی کا باعث ہو، بزرگ زائرین کی ہر موقع پر مدد کریں ۔ سامان اٹھانے ، چڑھنے ،اترنے میں ان کی مدد کریں''۔

بھارت میں مختلف زیارات کے علاوہ مجھے متعدد بار نجی دوروں پر بھی بھارت جانے کا اتفاق ہوا ہے۔فاطمہ بیگم عرف شکنتلا کے منہ بولے بیٹے نے ہمیں اپنی اکلوتی بیٹی ریٹا کی شادی میں شرکت کا کارڈ بھیجا تھا۔ یہ شادی 15 دسمبر 1980ء کو تھی ۔ہم اس شادی میں شریک ہونے کے لیے بھارت گئے ، یہ بھی ایک یادگار تقریب تھی ۔(شکنتلا گریوال نے مولانا سید مودودیؒ اور ان کی بیگم کے زیرِ شفقت رہ کر اسلام قبول کر لیا تھا اور پھر ساری زندگی ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے طور پر گزاری اور 1978ء میں ان کا انتقال ہوا۔(فاطمہ بیگم عرف شکنتلا کی مکمل داستان میں نے اپنی کتاب ''شکنتلا سے فاطمہ تک'' میں سپردِ قلم کی ہے)۔25 مارچ 1979ء کو میں ایک دورے میں دہلی تھا کہ مجھے بھارت کی سابق وزیرِاعظم اور جواہر لال نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کا موقع ملا، اس ملاقات کا حال روزنامہ نوائے وقت 26 مارچ 79ء میں شائع ہوا۔اندرا گاندھی نے ایک سوال کے جواب میں مجھے کہا تھا کہ ہم دوبارہ اقتدار میں آ گئے تو ہم پاکستان سمیت تمام ہمسایوں سے اچھے تعلقات استوار کریں گے۔اس وقت مسز گاندھی بظاہر کمزور لگ رہی تھیں لیکن ہمہ وقت مستعد نظر آتی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کی کوٹھی پر روزانہ ہزاروں لوگ ان سے ملاقات کرنے کے لیے آتے تھے۔اندرا گاندھی بنفسِ نفیس خود ان کے مسائل بڑی توجہ کے ساتھ سنتی تھیں اور مناسب انداز سے ان کی رہنمائی کرتیں۔ ان کی کوٹھی کے لان میں دو بڑے شامیانے نصب تھے۔ یہاں پر آنے والے ملاقاتیوں کو آرام و آسائش سے رکھا جاتا تھا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جس دور میں (1979ء میں) روس نے افغانستان میں مداخلت کی میں اس وقت جرمنی میں تھا۔ ان دنوں دنیا بھر کے تمام ریڈیو، اخبارات اور ٹی وی چینلز پر یہی خبریں ہوتی تھیں اور پاکستان کے لئے نئے خطرات کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔ اس وقت جرمنی کے ایک ٹی وی چینل کو کسی ایسے صحافی کی ضرورت تھی جو حال ہی میں افغانستان سے ہو کر آیا ہو اور تازہ ترین صورتحال سے جرمن قوم کو آگاہ کرے۔ اتفاق سے میں جرمنی سے پہلے کابل میں ایک ہفتہ رہ کر آیا تھا اور میں نے زیر زمین رہنے والے چند مجاہدین کے انٹرویوز بھی کیے تھے جو اس وقت پانچ قسطوں میں ''نوائے وقت'' میں شائع ہوئے۔ یاد رہے کہ اس وقت مجاہدین نے روس کے خلاف عام جہاد کا اعلان ابھی تک نہیں کیا تھا۔ جرمن ٹی وی نے پاکستانی سفارتخانے کی وساطت سے مجھ سے رابطہ کیا۔ چنانچہ مجھے پاکستان اور افغان مجاہدین کے نقطہ کو جرمن عوام کے سامنے ایک گھنٹے تک پیش کرنے کا موقع ملا۔ میرے ساتھ ایک امریکی، ایک افغان اور ایک ایرانی صحافی بھی موجود تھے۔ ہم سب نے اپنا اپنا نقطہ نظر اپنی زبانوں میں پیش کیا لیکن تمام پروگرام جرمن زبان میں ترجمہ ہو کر نشر ہو رہا تھا۔ کوئی سنسر اور کوئی پابندی نہ تھی، مجھے یہ بہت اچھا لگا کہ پروگرام کے شروع ہونے سے قبل بھی ہمیں کسی قسم کی کوئی بریفنگ نہیں دی گئی۔ نہ ہی پروگرام کے اختتام پر کوئی اعتراض کیا گیا۔ میں جرمنی میں تحریر و تقریر کی اس حد تک مکمل آزادی دیکھ کر بہت خوش ہوا، پروگرام ختم ہونے پر ہم سب کو معقول معاوضہ بھی دیا گیا۔ جرمن ٹی وی میں آنے کے بعد تو میرا حلقہ زیادہ وسیع ہو گیا اور پاکستانیوں کی جانب سے میری دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مجھے دو مرتبہ جرمنی جانے کا موقع ملا اور میں نے جرمن معاشرے کو بہت قریب سے دیکھا۔ جرمن لوگ پھولوں کے بہت دلدادہ ہیں۔ گھر کے ہر کونے، کمرے، بالکونی، سیڑھیوں غرضیکہ ہر جگہ رنگ برنگ اور طرح طرح کے پھولوں کے گملے نہایت سلیقے سے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں صاف گوئی کی بہت عمدہ روایت ہے۔ ملکی قوانین کی سخت پابندی کرتے ہیں۔ پولیس اور دیگر اداروں سے بہت تعاون کرتے ہیں۔ ٹریفک کے اصولوں پر بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں۔ پیدل چلنے والوں کے لئے بھی ان کے ہاں بہت احترام ہے۔ گاڑی مخصوص کار پارکنگ کے علاوہ کہیں بھی پارک نہیں کرتے۔

جرمنی کا دفتری نظام بھی بہت عمدہ، سیدھا اور سادہ ہے۔ ہر شخص کی ایک فائل متعلقہ راتھ ہاؤس (میونسپلٹی) کے پاس موجود ہوتی ہے۔ جس میں اس شخص کے متعلق پیدائش سے لے کر تمام تر تفصیلات محفوظ ہوتی ہیں۔ جرمنی میں سرکاری دفاتر کے اہلکار بہت خوش اسلوبی سے پیش آتے ہیں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اور کسی بھی شہری کو بار بار دفاتر کے چکر نہیں لگواتے۔ جرمن قوم کا ہر شخص پوری ذمہ داری اور آئین کے دائرے میں رہ کر اپنے فرائض انجام دیتا ہے، وہاں دفتری عملے کے ساتھ کسی شہری کو کوئی شکایت نہیں ہوتی کیونکہ دفاتر کا عملہ شہریوں کو خوار نہیں کرتا بلکہ انہیں بھرپور ریلیف دیتا ہے۔ جرمنی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہاں کے سرکاری دفتروں میں افسروں، ماتحتوں، کلرکوں اور چپڑاسیوں کا کوئی چکر نہیں ہے۔ ایک ہی شخص اپنے دفتر کا انچارج، افسر، ماتحت، کلرک اور چپڑاسی ہوتا ہے۔ وہ خود ہی متعلقہ شہری کی فائل نکالتا ہے، ٹیلی فون کرتا ہے، ٹائپ کرتا ہے اور خود ہی فیصلہ کر کے شہری کا کام کر دیتا ہے۔ ہر دفتر میں یہی عمل نظر آتا ہے۔

جرمنی کی عدالتوں میں بھی ججوں کے پاس کوئی ریڈر، ٹائپسٹ، کلرک یا آواز لگانے والا نہیں ہوتا۔ جج صاحب خود ہی کمرے سے باہر آ کر آواز دیتے ہیں، خود فائل نکالتے، کیس سنتے، ٹائپ کرتے اور فیصلہ لکھتے جاتے ہیں۔ جرمنوں کو صفائی کا مبالغہ کی حد تک جنون ہے۔ اسی لئے ان کے گھر، گلیاں، بازار، سڑکیں، دکانیں، دفاتر اور شاہراہیں انتہائی صاف ستھری نظر آتی ہیں۔ کوڑا کرکٹ تو دور کی بات ہے کہیں بھی ماچس کی تیلی، سگریٹ کا ٹکڑا وغیرہ بھی نہیں دکھائی دیتا۔ جگہ جگہ ڈسٹ بن لگے ہیں اور شہری اپنی بے کار اشیاء ان میں ڈالتے ہیں۔ جرمنوں کو اپنے مستقبل کی فکر نہیں ہوتی کیونکہ اولاد جوان ہو کر اٹھارہ سال کی عمر کے بعد اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ والدین کو اولاد کی اور اولاد کو والدین کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ جرمن لوگ ہر چیز بینک کے قرضے سے خریدتے ہیں۔ ان کی اکثریت بینکوں کی مقروض ہوتی ہے۔ اچھا گھر، اچھی گاڑی، وغیرہ کا سب کو جنون ہے اور یہ چیزیں انہیں بینک سے ملتی ہیں، اس طرح وہ ساری عمر بینکوں کے قرضے اتارتے رہتے ہیں۔ جوان جرمن لڑکے لڑکیاں اپنی مرضی سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مرضی سے نوکریاں کرتے ہیں اور مرضی سے رہتے ہیں۔ اکثریت بغیر شادی کے اکٹھے رہتی ہے۔ ان کی اولادیں بھی ہوتی ہیں لیکن وہ شادی کا پھندا اپنے گلے میں نہیں ڈالتے۔ جرمن اپنے والدین کو بس اس حد تک یاد رکھتے ہیں کہ ان کی سالگرہ یا کسی تہوار پر ان کو مبارکباد دینے چلے جاتے ہیں اور بس۔ اس کے علاوہ والدین کے ساتھ ان کا کسی قسم کا کوئی سماجی، اخلاقی اور روحانی تعلق نہیں ہوتا۔ ان سب کمزوریوں کے باوجود جرمن قوم نظم وضبط، قوانین کی سخت پابند ہے۔ جرمن لوگ صرف اپنی قومی زبان میں ہی گفتگو کرتے ہیں۔ اخبارات، رسائل، چینلز، دفتری خط کتابت سب کچھ جرمن زبان میں ہے۔ گرچہ انگریزی پڑھائی جاتی ہے لیکن ان کی ترجیح اپنی قومی زبان ہی ہے۔ میں نے ہمبرگ بندرگاہ بھی دیکھی ہے۔ یہ جرمنی کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ اس کا شمار

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دنیا کی بڑی بندرگاہوں میں ہوتا ہے۔ہمبرگ شہر، بندرگاہ اور مضافات کا رقبہ سات سو مربع کلومیٹر ہے۔آدھے رقبے پر جنگلات، باغات، پارک اور خوبصورت جھیلیں ہیں۔ یہ شہر بحری اور ہوائی راستوں کے ذریعے پوری دنیا کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ہمبرگ کو جرمنی کا وینس بھی کہتے ہیں۔اس شہر میں ''وینس'' سے کہیں زیادہ یعنی تقریباً دو ہزار تین سو کے قریب پل ہیں۔کہا جاتا ہے کہ یہ بندرگاہ تقریباً آٹھ صدی پرانی ہے۔ہمبرگ صنعت وحرفت کا ایک اہم مرکز بھی ہے۔جرمنی کے سب سے بڑا اخبار ''ٹاگس شاؤ'' اسی شہر سے شائع ہوتا ہے۔ہمبرگ کی بندرگاہ کے کنارے سے یا کسی بحری جہاز کی چھت سے ہمبرگ شہر کا نظارہ کیا جائے تو وہ اپنی صدیوں پرانی قدیم وضع کی عمارات، گرجوں، برجوں اور کرم خوردہ عمارتوں کا مجموعہ نظر آتا ہے۔جرمنوں کو اپنے ماضی سے اس قدر پیار ہے کہ وہ پرانے کھنڈرات پر بھی اسی طرز کی عمارت کھڑی کر لیتے ہیں جیسی کہ پہلے موجود تھی۔ان قدیم وضع کی پرانی عمارتوں کے بازاروں اور گلیوں میں جدید دور کے تمام ہنگامے پوری آب وتاب سے نظر آتے ہیں۔فنِ تعمیر کے لحاظ سے جرمنی کا سٹی ہال جسے راتھ ہاؤس بھی کہتے ہیں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔سٹی ہال پر اہلِ جرمن ہمیشہ ناز کرتے ہیں۔سٹی ہال کے گنبد، اس کے ستون، اس کی انتہائی خوبصورت کندہ کاری سے مزین چھتیں، دیواروں پر شہرہ آفاق مشاہیر اور جرنیلوں کے مجسمے، فن سنگ تراشی کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے، تاریخی اہمیت کا اعلیٰ قیمتی نایاب فرنیچر اور قالین، انتہائی وسیع وعریض اسمبلی ہال، وزراء اور اعلیٰ حکام کے انتہائی قیمتی ساز وسامان سے آراستہ دفاتر ہیں، غرض سٹی ہال ایک مکمل عجائب گھر کا منظر پیش کرتا ہے۔

جرمنی کی سٹاک ایکسچینج بلڈنگ کا شمار دنیا کی قدیم سٹاک ایکس چینجز میں ہوتا ہے۔1558ء میں تعمیر ہونے والی عمارت 1842 کی آتشزدگی کے باعث نیست ونابود ہوگئی تھی۔1880ء اور 1910ء میں اس کے مشرقی اور مغربی حصے دوبارہ تعمیر کیے گئے تھے جنہیں دوسری جنگ عظیم 1939ء میں ہوائی بمباری سے شدید نقصان ہوا۔چنانچہ 1947ء کے بعد اس کی تعمیر نو اور مرمت کی گئی۔اس بلڈنگ میں تین بڑے ٹریڈنگ ہال، پانچ ایکس چینج جس میں شیئرز، سٹاک اور انشورنس ایکس چینج شامل ہیں۔سٹاک ایکس چینج کی یہ عمارت سٹی ہال سے متصل ہے۔اسی طرح ''ایوان فن'' اینٹوں کی بنی ہوئی ایک قدیم اور عظیم عمارت ہے۔یہ جرمن فنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔اسے ہمبرگ کا پرانا پارلیمنٹ ہاؤس بھی کہتے ہیں۔یہ 1844ء میں تعمیر ہوا تھا۔سینٹ نکولائی کا گرجا گھر بھی دیکھنے لائق ہے۔نیوٹاؤن کے نام سے 1188ء میں جس بندرگاہ کی بنیاد رکھی گئی تھی اس کا پہلا گرجا گھر یہی ہے۔اس کی تعمیر سرخ اینٹوں سے کی گئی ہے۔اس کے 1657 فٹ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بلند و بالا مینار ہیں۔

سینٹ مائیکل چرچ کو ہمبرگ کی پہچان کہا جاتا ہے۔ یہ فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کا قدیم اور معروف گرجا گھر ہے۔ جھیل آلسٹر ہمبرگ کی ایک خوبصورت جھیل ہے۔ ہمبرگ کی سیر یہ جھیل دیکھے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ہر طرف سبزہ و گل، فضا معطر، حسین اور مسکراتے چہرے نظر آتے ہیں۔ جھیل کے نیل گوں پانی پر تیرتے آبی پرندے بھلا منظر پیش کرتے ہیں۔ ہمبرگ شہر کا ٹی وی ٹاور بھی دیکھنے والا ہے۔ اس شہر کے دیگر قابل ذکر مقامات میں ہمبرگ کا عجائب گھر، چڑیا گھر، تاریخی اہمیت کے متعدد گرجے، یونیورسٹیاں، پرانے بحری جہاز، وغیرہ شامل ہیں۔

مجھے امریکہ کو بھی دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ امریکہ میں میرا میزبان منظور تھا، منظور نے اپنے گھر میں میری رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ منظور کی امریکن بیوی کا نام انجلینا تھا جس کا نام منظور نے ''مائی گلابو'' رکھا ہوا تھا۔ مائی گلابو ''پرنسٹن یونیورسٹی'' میں غیر ملکی طلبا کو انگریزی پڑھایا کرتی تھی۔ بڑی زندہ دل، ہنس مکھ اور انتہائی تعلیم یافتہ سیاہ فام خاتون تھی۔ لوگ کہتے ہیں اور شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ جس نے امریکہ جا کر ڈزنی لینڈ نہیں دیکھی اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں اور میرا میزبان منظور گاڑی میں بیٹھے اور ڈزنی لینڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈزنی لینڈ منظور کے گھر سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ ہم نے راستے میں ایک جگہ رک کر ایک ریستوران میں ناشتہ کیا۔ قریبی بینک سے منظور نے کچھ ڈالرز نکلوائے اور ہم دوبارہ ڈزنی لینڈ کی جانب روانہ ہو گئے۔ ہم ڈزنی لینڈ پہنچ گئے تو وہاں پر بہت زیادہ رش تھا، ہزاروں لوگ موجود تھے۔ یہاں پر دوسرے ممالک سے بھی جدید ترین عجائبات دیکھنے کے لیے لوگ آتے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہاں پر روزانہ اسی طرح رش ہوتا ہے۔ ویک اینڈ پر رش بہت بڑھ جاتا ہے۔ میلوں تک گاڑیاں پارکنگ میں لگی تھیں، ہم نے بھی گاڑی پارک کی اور شٹل ٹرین کے ذریعے داخلے کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم حیرت کی دنیا میں ڈوب گئے اور دنیا کے اندر داخل ہو گئے۔ ڈزنی لینڈ ایک حیرت کی دنیا ہے۔ ڈزنی لینڈ کو تین حصوں میجک کنگڈم، ایکیورٹ پارک اور ایم جی ایم سٹوڈیو میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے تمام حصوں کی سیر کو دیکھنے کے لیے دس دن کا وقت چاہیے۔ ایک دن میں انسان اپنی انتہائی کوشش کر کے بھی چند حصے ہی دیکھ سکتا ہے۔ ہم صرف چند حصے ہی دیکھ سکے۔ کشتی کے ذریعے ہم نے جنگلات کی سیر کی۔ جنگلات میں جگہ جگہ آپ پر مصنوعی درندے حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہ اپنی دھاڑوں اور حرکتوں سے بالکل اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ کئی کمزور دل لوگ تو بے ہوش بھی ہو جاتے ہیں۔ تاریک حصوں میں بڑے بڑے مگر مچھ بھی کشتیوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ ڈزنی لینڈ میں ہم نے خلائی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گاڑی میں بیٹھ کر خلاء کی سیر بھی کی۔ خلائی سیر کے متعلق بار بار انتباہ کیا جاتا تھا کہ کمزور اعصاب اور کمزور دل والے لوگ اس میں سفر نہ کریں۔ جگہ جگہ پر ایسی وارننگ والے بورڈز بھی لگے ہیں۔ منظور نے خلائی سفر سے انکار کر دیا، وہ پہلے ایک سفر کر چکا تھا، اسے وہ سفر نہیں بھولتا تھا۔ بہر حال میں گاڑی میں داخل ہوا تو ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں تارے چمک رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی کسی خلائی سیارے سے گاڑی ٹکرا جاتی تھی۔ یہ سفر بہت خوفناک تھا۔ میرے جیسا مضبوط اعصاب اور دل کا مالک انسان بھی آیت الکرسی کا ورد کرنے لگا تھا۔ خلائی گاڑی کی رفتار، تاریکی، اردگرد پہاڑ جیسے سیاروں اور تاروں کی گردش میں گاڑی ٹکراتے ٹکراتے رہ جاتی۔ یہ بہت ہی خوفناک سفر تھا جس سے کوئی انسان اپنی جان سے بھی جا سکتا ہے۔

ڈزنی لینڈ میں طلسماتی دنیا میں مشہور زمانہ کارٹون فلم ''مکی ماؤس'' کے تمام کرداروں کا بہت بڑا جلوس نکلتا تھا۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ اور ناقابل فراموش پروگرام ہوتا۔ مکی ماؤس کے جلوس کی گزرگاہ کے دونوں طرف تماشائیوں کا جم غفیر جمع ہو جاتا ہے۔ بہر حال ڈزنی لینڈ عجائبات کی دنیا ہے۔ اس کی مثال کوئی ملک نہیں پیش کر سکتا۔ اگرچہ بہت سے ملکوں میں ایسے تفریحی عجائبات موجود ہیں لیکن وہ ڈزنی لینڈ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ رات کے وقت ڈزنی لینڈ میں بے پناہ چراغاں کیا جاتا ہے۔ آتشبازی کی جاتی ہے لیکن یہ حقیقی آتشبازی نہیں ہوتی، یہ صرف الیکٹرانک کی ترقی اور ہنرمندی کا کمال ہے کہ آپ کو رنگ برنگی روشنیاں زمین سے فضا میں بلند ہوتی نظر آتی ہیں اور بہت حسین منظر پیش کرتی ہیں۔

میں نے امریکہ میں ''وولاشیا کونٹی جیل'' بھی دیکھی۔ یہ جیل فلوریڈا میں واقع ہے۔ میرا دوست منظور اس جیل میں فوڈ ڈیپارٹمنٹ کا انچارج تھا۔ جیل کا کچن دیکھا جو منظور کی براہ راست نگرانی میں کام کرتا تھا۔ جیل کا یہ کچن ہمارے ہاں کے فائیو سٹار ہوٹلوں سے بھی زیادہ صاف ستھرا اور اعلیٰ معیار کا تھا۔ کچن اور ڈائننگ ہال کے درمیان کھڑکیاں لگی تھیں جہاں سے قیدیوں کو کھانا باقاعدہ ٹرے میں لگا کر پیش کیا جاتا تھا اور وہ قیدی میز کرسیوں پر بڑے مزے کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ تمام قیدیوں کو ایک ہی عمدہ قسم کا کھانا فراہم کیا جاتا۔ ہم نے تقریباً ایک گھنٹہ تک جیل کے مختلف حصے دیکھے اور مختلف شعبہ جات کا معائنہ کیا۔ قیدیوں کو بڑے بڑے ہال کمروں میں نہایت عمدہ قسم کے بستر اور بیڈ مہیا کیے جاتے جہاں ہر قسم کی سہولت میسر ہوتی۔ صرف خطرناک قیدیوں کو الگ تھلگ کمروں میں رکھا جاتا تھا لیکن یہ کمرے بھی ہمارے ہاں کے تھری سٹار ہوٹلوں سے زیادہ معیاری تھے۔ چونکہ فلوریڈا کا موسم پاکستان کی طرح کافی گرم ہے اس لیے یہ جیل مکمل

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

طور پر ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ جیل کے ساتھ ایک بہت بڑا کھیل کا میدان ہے۔ یہاں ہر قیدی کو دو گھنٹے کے لیے کھیل کود اور ورزش کے لیے لایا جاتا ہے۔ اس میدان کے اردگرد بہت مضبوط اور آہنی جنگلہ تھا تاکہ کوئی قیدی فرار نہ ہونے پائے۔

ہم ''ڈے ٹو نا بیچ'' کے ساحلی مناظر سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ ان دنوں شدید گرمی پڑ رہی تھی، اس لیے ساحل سمندر پر میلوں تک بے پناہ رش تھا۔ ہم کچھ دیر بعد واپس آ گئے، اگلی صبح منظور اپنے آفس چلا گیا اور اس کی بیوی انجلینا مجھے پھر ''ڈے ٹو نا بیچ'' لے آئی۔ انجلینا مجھے ایک ایسے حصے میں لے گئیں جہاں بھیڑ بالکل نہ تھی اور یہ انتہائی پرسکون علاقہ تھا۔ صرف اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ ہم نے ایک گھنٹہ ساحل سمندر پر گزارا اور واپسی پر ایک سٹور ''سامز ہول سیل سٹور'' میں گھس گئے۔ ایسے سٹور امریکہ کے تقریباً ہر بڑے شہر میں موجود ہیں جہاں مختلف کمپنیاں اور کارخانے اپنی مصنوعات سستے داموں فروخت کے لیے پیش کرتے ہیں۔ یہ ایسی مصنوعات ہوتی ہیں جو ایک خاص موسم میں فروخت ہونے سے رہ جاتی ہیں اور ان کا گوداموں میں پڑے رہنا کمپنیوں کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے اس لیے ان سٹورز کے ذریعے یہ مصنوعات سستے داموں فروخت کر دی جاتی ہیں۔

میں نے امریکہ میں لینڈ اوور (Land over) کا علاقہ بھی دیکھا۔ اس علاقے میں غربت اور افلاس کے آثار نمایاں تھے۔ اس علاقے میں منشیات کی وباء عام تھی بلکہ یہ پورا علاقہ ڈرگ مارکیٹ کے نام سے معروف تھا۔ علاقے میں جرائم کی شرح بھی بہت تھی۔ گاڑیوں کی چوری، سرقہ بازی، پرس چھیننے کے واقعات عام تھے۔ رات کو اکثر فائرنگ کی آوازیں آتی تھیں۔ ہمارے گھر کے قریب ایک مکان میں ہر وقت نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کا ہنگامہ لگا رہتا تھا۔ یہ مکان ڈرگ ہاؤس کے نام سے معروف تھا۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ ہم تینوں دوست کھانا کھا کر ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ ایک کالا اپنے ہمراہ ایک خوبرو لڑکی کو لے کر ہمارے پاس آ گیا۔ لڑکی نے گھر داخل ہوتے ہی فالتو کپڑے اتار پھینکے اور دوستوں کے ہمراہ بلا تکلف جام پینے لگی۔ لڑکی اگرچہ کالی تھی لیکن اس کی رنگت جاذب نظر تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ میں نے الحمدللہ پوری زندگی کبھی شراب کباب کو ہاتھ نہ لگایا لیکن شراب کی محفلوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے تینوں دوست اور وہ لڑکی نشے کی حالت میں بدمست ہو چکے ہیں تو میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور ایک کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نیند کی آغوش میں جا چکا تھا۔ وہ لوگ کب تک عیش کرتے رہے مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ اگلی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

صبح اتوار تھی اور میرے دوستوں کی چھٹی تھی۔ میں اٹھا نماز ادا کی اور سیر کو نکل گیا۔ خدا کے فضل سے میں جرمنی، انگلینڈ، کابل، انڈیا، امریکہ جہاں جہاں بھی گیا میں نے صبح کی سیر کو برقرار رکھا۔ میں سیر سے واپس آیا تو دوست ابھی تک سو رہے تھے۔ میں نے چائے بنائی، ناشتہ کیا اور مطالعہ کرنے لگا۔ دوپہر کے قریب سب لوگ سو کر اٹھے، ناشتہ کیا، کچھ دیر گپ شپ چلتی رہی۔ ایک دوست سہیل پیزہ شاپ پر کام کرتا تھا اور اس کا اپنی دکان پر جانے کا وقت ہوا تو اس نے تیاری کی اور جب اپنا پرس جیب میں رکھنے لگا تو دیکھا کہ وہ بالکل خالی تھا۔ دوسرے دوست نے اپنا بٹوہ چیک کیا تو وہ بھی خالی نکلا۔ یوں وہ لڑکی میرے ان دوستوں کو داد و عیش دینے کے بعد ان کے بٹوے خالی کر کے رات کے اندھیرے میں چلتی بنی۔ اگلی رات کو میرے ان دوستوں نے اس ''کالے امریکی'' کے ذریعے اس لڑکی کو دوبارہ بلوایا اور اس سے باز پرس کی، پہلے تو اس نے لیت و لعل سے کام لیا جب سہیل نے آنکھیں دکھائیں تو وہ بھی آخر امریکن تھی وہ دھمکیوں پر اتر آئی اور بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کہنے لگی کہ تم لوگوں نے میرے ساتھ ریپ کیا ہے اور میں ابھی پولیس کو بلاتی ہوں۔ یہ سنتے ہی دوست اس کی منتیں کرنے لگے اور اسے نہایت عزت سے رخصت کر کے سکھ کا سانس لیا۔

آٹھ اکتوبر کو واشنگٹن ڈی سی میں جشن پاکستان کی تقریب منعقد کی جارہی تھی اور ہم تینوں دوست بھی وہاں پر پہنچے۔ اس اجتماع میں ہزاروں پاکستانی موجود تھے۔ یہ تقریب واشنگٹن مانومنٹ کے سبزہ زار پر منعقد کی جارہی تھی۔ یہ یادگار روائٹ ہاؤس کے قریب واشنگٹن شہر کے عین درمیان اور دریائے پوٹامک کے کنارے پر واقع ہے۔ بے شمار پاکستانیوں نے کھانے پینے کی اشیاء اور مختلف مصنوعات کے سٹالز لگائے ہوئے تھے۔ پاکستان سے آئے فنکاروں طاہرہ سید، امجد حسین اور ٹینا ثانی نے اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا۔ یہاں بتاتا چلوں کہ واشنگٹن امریکہ کا دارالخلافہ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی طنابیں بھی یہیں سے کھینچی جاتی ہیں۔ یہ اگرچہ امریکی دارالحکومت ہے لیکن یہاں کی آبادی کی بھاری اکثریت سیاہ فاموں پر مشتمل ہے۔ ان سیاہ فاموں سے سفید فام بہت تنگ ہیں۔

ایک دن صبح سیر کے دوران مجھے ایک مارکیٹ میں ''لٹریری کونسل'' کا بورڈ نظر آیا۔ میں نے قریب جا کر اس کے کھلنے کے اوقات نوٹ کیے اور گھر واپس آ گیا۔ یہ ادارہ امریکہ میں نئے نئے آنے والوں کو انگریزی سکھاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اپنی انگریزی بہتر کرلوں۔ میں ایک روز دفتری اوقات میں وہاں چلا گیا اور انچارج سے اپنا مدعا بیان کیا۔ اس دفتر میں کام کرنے والی سب کالی عورتیں تھیں۔ انچارج نے مجھے ایک ادھیڑ عمر عورت کے پاس بھیج دیا جس نے تقریباً ایک گھنٹہ تک مجھ سے زبانی، تحریری ٹیسٹ لیے اور پھر نتیجہ یہ نکلا کہ میں ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کیونکہ ان کے بقول میری انگریزی پہلے ہی بہت بہتر تھی، انہوں نے مجھے واپس بھیج دیا لیکن ساتھ ہی مجھ سے امتحانی فیس کی مد میں چھ ڈالر بھی اینٹھ لیے۔

مجھے افغانستان میں جانے کا اتفاق بھی ہوا، یہ 1972ء کے زمانے کی بات ہے۔ ہم کابل میں جہاں کہیں بھی جاتے اور اپنا تعارف کرواتے تو افغان شہری ہمارے لئے چشم ماروشن دل ماشاد کی عملی تصویر بن جاتے، تب افغانستان خوشحال تھا اور ابھی اس پر جنگ کے سائے نہیں منڈلائے تھے۔ کیا معلوم تھا کہ چند ہی برس بعد اس خطے کو ایسی نظر لگنے والی ہے کہ یہ ایک طویل عرصہ تک جنگ اور پھر خانہ جنگی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ اس پہلے سفر کابل کی یادیں میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ہم ستمبر 72ء کی ایک شام لاہور سے بذریعہ بس پشاور روانہ ہوئے، اس وقت میرے دو دوست حاجی میاں عبدالرزاق اور خان عطا محمد بھی میرے ہمراہ تھے۔ پشاور سے ہم نے بس کے ذریعے کابل جانا تھا، دو گھنٹے کا وقفہ تھا، چنانچہ ہم نے شیو کی، غسل کیا اور ناشتہ کیا۔ ہم بس پر سوار ہوئے اور ایک گھنٹے بعد طورخم بارڈر کراس کر کے افغانستان کے شہر جلال آباد پہنچ گئے۔ پھر جلال آباد سے بس پر سوار ہوئے اور کابل کی جانب عازم سفر ہوئے، جلال آباد سے کچھ دیر تک تو بس میدانی علاقے میں سفر کرتی رہی اور پھر پہاڑوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ تمام راستے میں سڑک کے ساتھ دریائے کابل بھی ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ یہ ایک انتہائی خطرناک اور دشوار سفر تھا۔ ڈرائیور کی ذرا سی لاپرواہی سے بس ہزاروں فٹ گہرے دریائے کابل میں گر سکتی تھی لیکن اس روڈ پر سفر کرنے والے ڈرائیور بہت ماہر ہوتے ہیں اور ایک ایک گھاٹی، سرنگوں اور موڑ سے واقف ہوتے ہیں۔ ہم کابل پہنچے اور جہاں پر بس سے اترے اس علاقے کا نام "زرنگار پارک" تھا، یہاں بے شمار ہوٹل تھے۔ آخر ہمیں اٹلانٹک ہوٹل پسند آیا اور بھاؤ تاؤ کر کے تین بستروں والا ایک کمرہ حاصل کیا۔ ہم شام کے وقت سیر کرتے ہوئے بازاروں کو نکل جاتے۔ ہم پھر پھراتے دریائے کابل کی طرف آ نکلتے، دریا شہر کے وسط سے گزرتا ہے۔ یہاں دریا کی کیفیت لاہور کے ظفر علی روڈ کے ساتھ ساتھ گزرنے والے گندے نالے کی سی ہے، یعنی پانی بہت کم اور گندا ہے۔ دریا کے دونوں اطراف سڑکیں، دکانیں وغیرہ بنی ہوئی ہیں۔ ہم نے کابل میں مقبرہ بابر، باغ بالا، کابل ہوٹل وغیرہ اور کابل کا عجائب گھر دیکھے۔ "باغ بالا" کابل شہر سے مغرب کی جانب چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، اس کے قریب ہی انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل ہے۔ یہ دراصل امیر عبدالرحمٰن کا محل تھا جسے اب ایک سیرگاہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہ باغ ایک خوبصورت پہاڑی اور ریستوران پر مشتمل ہے۔ یہ باغ افغان فن تعمیر کا عمدہ شاہکار ہے۔ اس میں ایک خوبصورت تالاب ہے۔ یہ ایک بہترین تفریحی مقام اور سیرگاہ ہے۔ ہم نے باغ بالا کی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

خوب سیر کی۔ گردونواح میں انگور، سیب اور سیب، خوبانی کے خوبصورت درخت لگے ہوئے تھے۔

جس دور میں میں افغانستان گیا تب یہ ملک بہت پرامن تھا اور ابھی اس میں روس نے مداخلت نہیں کی تھی، خانہ جنگی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ہر طرف امن اور خوبصورتی تھی۔ ہم نے کابل کا ''شہرنو'' بھی دیکھا۔ یہ ایک جدید اور فیشن ایبل شہر تھا۔ اسے ہم لاہور، کراچی کی اچھی سوسائٹیوں سے تعبیر کر سکتے تھے۔ خوبصورت کوٹھیاں، دلکش تفریحی پارک، صاف ستھری اور نہایت عمدہ سڑکیں، یورپ کے جدید ترین فیشن کے ملبوسات پہنے ہوئے صحت منداور توانا لوگ پھولوں کی طرح دمکتے ہوئے چہرے والے بچے، سڑکوں پر دوڑتی جدید گاڑیاں، غرض یہ شہرنو یورپ کا کوئی حصہ معلوم ہوتا تھا۔ افغانستان کے تمام امیر لوگ، سرکاری افسر، سفارتی نمائندے اور شاہی خاندان کے افراد اسی علاقے میں رہتے تھے۔ سابقہ شاہی خاندان کی رہائش گاہ ''ارگ پیلس'' بھی اسی علاقے میں واقع تھا جسے اب ''پیپلز ہاؤس'' کا نام دیا گیا تھا۔ تمام ممالک کے سفارتخانے اسی علاقے میں واقع تھے۔ میں پہلی بار 1972 میں اور دوسری مرتبہ اکتوبر 1978ء میں افغانستان گیا۔ اپریل 1978ء میں سردار داؤد کا تختہ الٹ چکا تھا اور کمیونسٹ رہنما نور محمد ترہ کئی برسرِاقتدار تھے۔ حکومت کا تمام کنٹرول اور نظم وضبط طالب علموں، خلق پارٹی ممبران اور کمیونسٹوں کے ہاتھ میں تھا، یہ لوگ کسی اور ضابطے کی پابندی کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔

اس مرتبہ ہم افغانستان گئے تو طورخم بارڈر پر متعین افغان عملے کا رویہ بڑا ترش تھا۔ یہ لوگ اخلاق اور اصول وضوابط سے عاری تھے۔ افغان حکام کا رویہ اور ہمارا سامان الٹ پلٹ کر ادھر ادھر پھینکنا واقعی ہمارے ساتھ ذلت آمیز سلوک تھا، وجہ یہ تھی کہ عملے کے تمام ارکان نوجوان طالب علم تھے اور ان کا تعلق ''خلق پارٹی'' کے ساتھ تھا۔ ان کی کمیونسٹ ذہنیت اور پاکستان دشمنی واضح تھی۔ کمیونسٹ حکومت کے دور میں روس کا اثر رسوخ بہت بڑھ گیا تھا اور افغانستان میں مذہبی اور اسلامی ذہن رکھنے والے لوگوں کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔ اس وقت افغانستان کی باگ ڈور عملی طور پر روس کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ بعد میں افغانستان کے حالات نے جو رخ اختیار کیا اس سے سب لوگ بخوبی آگاہ ہیں۔ مجاہدین نے چند ہی ماہ میں کمیونسٹ حکومت کو زچ کر کے رکھ دیا، نور محمد ترہ کئی کی ناکامی پر روس نے اس کی جگہ پر وزیر خارجہ حفیظ اللہ امین کو اقتدار دے دیا۔ لیکن حفیظ اللہ امین بھی مجاہدین کو نہ کچل سکے تو دسمبر 1979ء میں روس نے اسے بھی رخصت کر دیا اور اس کی جگہ ''ببرک کارمل'' کو بٹھا دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ لوگ کمیونسٹ حکومت سے خوش نہیں تھے۔ ایک مرتبہ بس میں سفر کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دوران کابل کے سٹوڈنٹ سے ملاقات ہوئی۔ وہ کہنے لگا کہ میں پڑھ رہا ہوں اور ملک سے باہر جانے کا بھی سوچ رہا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ ''اب تو تمہاری اپنی حکومت (طالب علموں) کی ہے، اب تم ملک سے باہر کیوں جانا چاہتے ہو؟''۔ وہ کہنے لگا کہ بس بعض اوقات اپنے غیروں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ میں نے پھر اس سے پوچھا کہ'' موجودہ حکومت (ترہ کئی حکومت) نے طالب علموں کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے اور انہیں اعلیٰ عہدوں پر بٹھا دیا ہے، پھر تم اتنے بددل کیوں ہو؟''۔ طالب کہنے لگا کہ'' یہی تو بدقسمتی ہے کہ ملک کی باگ ڈور یونیورسٹیوں کے کھلنڈروں کے پاس آگئی ہے۔ لوگوں کے مسائل بڑھ گئے ہیں۔ یونیورسٹی کے طالب علم اپنی کمیونزم خدمات کی بنا پر اعلیٰ عہدوں پر بٹھا دیے گئے ہیں''۔

کابل کے مغرب میں ''کوہ پغمان'' کے سامنے نہایت خوبصورت سیرگاہ واقع ہے۔ ہم کابل سے ایک ٹیکسی پر سوار ہوئے جس نے پندرہ منٹ میں وہاں پہنچا دیا۔ ہم نے ایک گھنٹہ تک اس حسین وادی کی سیر کی، تصویریں بنائیں، جنگل، تالاب، چشمے اور آبشاریں دیکھیں۔ یہ کافی اونچائی پر واقع ہے اور یہاں سے کابل ایرپورٹ بالکل صاف نظر آتا ہے۔ روسی قبضے کے دوران مجاہدین اس جگہ سے روسی فضائیہ کو نشانہ بنایا کرتے تھے۔ پغمان کے قریب کارگاہ جھیل ہے۔ یہاں ڈیم بنا کر بجلی پیدا کی گئی ہے۔ اس دور میں (1978ء میں) یہ علاقہ کابل کا بہت پرکشش علاقہ تھا۔ مغلیہ سلطنت کے بانی شہنشاہ بابر کا مزار ''کوہ شیر دروازہ'' نامی پہاڑی کے قریب واقع ہے۔ ایک سادہ چبوترہ ہے جس کے سائے میں ہندوستان کا پہلا مغل فاتح ابدی نیند سو رہا ہے۔ کابل شہر سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر کابل عجائب گھر واقع ہے۔ یہاں پرانے زمانے کے سکے، ہتھیار، مورتیاں، گندھارا تہذیب کے آثار، بدھ مت کے مجسمے وغیرہ موجود ہیں۔ کچھ پرانی کتابیں، مخطوطے اور شاہی فرمان بھی موجود ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ لاہور شہر کی طرح کابل شہر کے نواح میں بھی ''مزنگ'' نامی ایک آبادی موجود ہے اور اس کے قریب ہی کابل کا چڑیا گھر واقع ہے۔ یہ مماثلت کس قدر دلچسپ ہے۔

بس یہ میری زندگی کی کچھ دلچسپ یادداشتیں تھیں جو میں نے آپ سے بیان کی ہیں۔ باقی میں نے جو مختلف ممالک کے سفر کئے ہیں ان کی روداد میرے سفرناموں پر مشتمل کتابوں میں موجود ہے جو سفرنامہ جرمنی، سفرنامہ امریکہ اور سفرنامہ بھارت وغیرہ کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی میری چند دیگر موضوعات پر کتابیں موجود ہیں۔ میں نے 1937ء سے 2005ء پر بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ 2005ء میں امریکہ سے واپس آیا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اور بس گھر کا ہی ہو کر رہ گیا۔ اب زیادہ تر مطالعہ کرتا ہوں، کچھ لکھتا رہتا ہوں اور نماز، تلاوت قرآن کریم میں مصروف رہتا ہوں۔ اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں کہ اللہ نے مجھے موقع دیا کہ میں نے مختلف نشیب و فراز دیکھے اور بھرپور زندگی گزاری۔ آخر میں آپ کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ (قومی ڈائجسٹ۔ مارچ 2022ء)

○……❄……○

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جنگِ 1971ء اور بھارتی جیل سے فرار

لیفٹیننٹ کرنل شجاعت لطیف

کی حیرت انگیز داستان

لیفٹیننٹ کرنل شجاعت لطیف 1946ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ پڑھائی لکھائی کی جانب کچھ خاص لگاؤ نہ تھا۔ کہتے ہیں میں: ''ایک متوسط درجے کا طالب علم'' رہا۔ 1966ء میں بی ایس سی تھرڈ ایئر میں تھے کہ فیصلہ کیا بس مزید نہیں پڑھنا، چنانچہ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں قسمت آزمائی کی اور سیکنڈ لیفٹیننٹ کے طور پر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ 1968ء میں پی ایم اے سے پاس آؤٹ ہوئے اور انہیں انفینٹری کی ایک یونٹ 15FFR (فرنٹیئر فورس رجمنٹ) میں بھیج دیا گیا۔ یہ یونٹ اس وقت والٹن روڈ لاہور میں تعینات تھی۔ اکتوبر 1971ء میں ان کی یونٹ کو مشرقی پاکستان میں جیسور سیکٹر کے مقام پر تعینات کر دیا گیا۔ ان دنوں مشرقی پاکستان میں بغاوت کے شعلے پوری طرح بھڑک چکے تھے، غیر بنگالیوں کا قتل عام جاری تھا، شیخ مجیب الرحمٰن کی سول نافرمانی کی تحریک شروع تھی اور حالات انتہائی ناگفتہ بہ تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل شجاعت لطیف اُس وقت کیپٹن تھے۔ انہوں نے جیسور، کھلنا، بوئی چنا، چنخل گھاٹ، دریائے بھیرب سمیت بہت سے مقامات پر فرنٹ مورچوں پر لڑتے ہوئے انتہائی خوفناک جنگ کا سامنا کیا۔ اپنے بہت سے ساتھیوں کو زخمی اور شہید ہوتے دیکھا۔ 16 دسمبر 1971ء کو جنرل سرینڈر ہوا تو ان کے کمپنی کمانڈر میجر مختار احمد عثمانی نے بھی سرینڈر کر دیا اور یوں شجاعت لطیف اپنے بہت سے ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار کر لیے گئے۔

لیفٹیننٹ کرنل شجاعت لطیف نے سوا دو سال بھارت کی قید میں گزارے۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے دشمن کی قید سے دو مرتبہ فرار ہونے کی کوشش کی۔ پہلی کوشش اس وقت کی جب انہیں آگرہ قیدی کیمپ سے رانچی جیل شفٹ کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے ساتھیوں کی مدد سے اپنی ہتھکڑی اور سلاخیں کاٹ ڈالیں اور فرار ہو گئے لیکن جلد ہی شدید زخمی حالت میں دوبارہ گرفتار کر لیے (زخموں کے نشانات ابھی تک ان کے ماتھے اور چہرے پر نمایاں ہیں)۔ فرار ہونے کی دوسری

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کوشش اس وقت کی جب رانچی جیل میں انہوں نے ایک سرنگ کھودی۔ سرنگ کی کوشش کامیاب ہونے کو تھی کہ معاہدہ طے پا گیا اور انہیں رہا کر دیا گیا۔ بریگیڈیئر صدیق سالک اور لیفٹیننٹ کرنل شجاعت لطیف ایک ہی کیمپ میں قید تھے۔ صدیق سالک نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''ہمہ یاراں دوزخ'' میں لیفٹیننٹ کرنل شجاعت لطیف کے فرار کی داستان یوں بیان کی ہے۔'' یکم جولائی 72ء کو انڈین آرمی کی زیرحراست کیپٹن شجاعت لطیف نے تیز رفتار ٹرین سے چھلانگ لگا دی، اسے شدید چوٹیں آئیں۔ اس کا خون بہنے لگا لیکن وہ اس سے بے نیاز ہتھکڑی سمیت بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔ وہ جن راہوں سے گزرا، انہیں خون حریت سے سجاتا گیا۔ وہ جن ویرانوں سے ہوکر نکلا وہاں شجاعت کی داستانیں بکھیرتا گیا۔ حتیٰ کہ اس کے جسم سے بہنے والے خون نے اس کے قدم تھام لیے اور خون کی باقی بوندوں کا واسطہ دے کر اسے یہ سفر ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا اور جسم ناتوانائی کے ہاتھوں بے بس ہوکر دوبارہ اسیر ہوگیا''۔

ہمارے دوست جناب کرنل امجد حسین امجد نے توجہ دلائی کہ آپ لیفٹیننٹ کرنل شجاعت لطیف سے ضرور ملیے اور ان کی یادداشتیں محفوظ کیجیے۔ ساتھ ہی انہوں نے شجاعت لطیف صاحب کا موبائل فون نمبر سینڈ کر دیا۔ شجاعت لطیف صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے توقع سے بڑھ کر رسپانس دیا۔ جلد ہی ان کے گھر پر ایک طویل نشست ہوئی۔ دوران گفتگو ان کی آرمی جوائن سے لے کر، ڈھاکہ روانگی، ایام اسیری، رہائی اور ریٹائرڈمنٹ سے لے کر ان کی نیب میں تعیناتی تک بہت سے تجربات اور مشاہدات زیر بحث آئے۔ دوران ملاقات معلوم ہوا کہ ان کی عسکری یادداشتوں پر مشتمل کتاب ''یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے'' بھی حال ہی میں شائع ہو چکی ہے۔ ہماری کوشش رہی کہ ان سے اُن موضوعات پر بات کی جائے جن پر انہوں نے اپنی کتاب میں لب کشائی سے گریز کیا ہے۔ مجھے ان کی شخصیت کا بہت ہی مثبت پہلو یہ نظر آیا کہ کرنل صاحب کسی کی کردار کشی کرنے سے بہت ہی کتراتے ہیں۔ بس اپنی ہی یادیں بیان کرتے ہیں اور کسی کو ڈسکس کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں اس طویل ملاقات کا احوال اور ان کی کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی چند دلچسپ یادداشتیں پیش کی جارہی ہیں۔ امید ہے قارئین لطف اندوز ہوں گے۔

O......❄......O

مقبوضہ کشمیر میں سری نگر میں ایک مقام ہے، جس کا نام ''بٹ مالو'' ہے۔ میرے آباؤ اجداد اسی خطے کے رہنے والے تھے اور پھر اٹھارویں صدی میں بہتر معاش کی تلاش میں بٹ مالو سے ہجرت کر

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے سیالکوٹ آ گئے۔ میرے دادا کا نام عبدالعزیز تھا اور وہ انگریزوں کو مقامی زبانیں فارسی، اردو اور پشتو وغیرہ پڑھایا کرتے تھے۔ دادا جان کبھی بھی انگریزی فوج کے دستوں کے ساتھ جاتے تو میرے والد خواجہ عبداللطیف کو ساتھ لے جاتے۔ والد صاحب بڑی توجہ کے ساتھ اپنے والد یعنی میرے دادا کو دیکھا کرتے تھے کہ وہ انگریزوں کو کیسے پڑھاتے ہیں۔ والد صاحب نے دسویں جماعت تک تعلیم باقاعدہ کسی سکول سے حاصل نہ کی تھی۔ بس وہ میرے داد سے ہی پڑھتے رہے اور پھر براہ راست دسویں جماعت کا امتحان دے دیا اور فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ والد گرامی نے ایف اے کا امتحان سینٹ بوائز کالج کلکتہ اور بی اے آنرز کا امتحان پریزیڈنسی کالج کلکتہ سے پاس کیا۔ اس کے بعد ایم اے معاشیات اور ایل ایل بی کی ڈگریاں علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ میرے بڑے تایا خواجہ برکت علی 1906ء میں محکمہ ڈاک سے پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے، وہ سول سروس سے وابستہ رہے۔

میرے والد صاحب بیسویں صدی شروع ہونے سے دو سال قبل یعنی 1898ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب خواجہ عبداللطیف بیس سال کی عمر میں سیالکوٹ کے سب سے کم عمر میونسپل کمشنر تھے۔ وہ وکالت کے پیشے سے بھی وابستہ رہے اور 1935ء میں مالی کمزوری کی وجہ سے انہوں نے وکالت ترک کر دی اور مشہور زمانہ تعلیمی ادارے مرے کالج سیالکوٹ میں اکنامکس پروفیسر کے طور پر منسلک ہو گئے، بعد میں اسی ادارے سے ریٹائرڈ ہوئے۔

میں 11 دسمبر 1946ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوا۔ ہمارے والد صاحب نے ہم تمام بھائی بہنوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ سب سے بڑے بھائی راحت لطیف میجر جنرل کے عہدے سے پاک فوج سے ریٹائرڈ ہوئے۔ جب ذیڈاے بھٹو کو گرفتار کیا گیا تو اس وقت میرے یہی بھائی صاحب ٹرپل ون بریگیڈ راولپنڈی میں بطور بریگیڈیئر تھے۔ ان کی ایک شہرہ آفاق انگریزی میں شائع ہوئی، بعد میں یہ اردو زبان میں ''راحت بیتی اور بھٹو کے آخری ایام'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ان سے چھوٹے بھائی کا نام خواجہ وجاہت لطیف ہے۔ یہ مختلف اعلیٰ عہدوں پر رہے اور آئی جی سندھ پولیس کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے۔ سجاد لطیف (مرحوم) میرا جڑواں بھائی تھا۔ یہ 1979ء میں انتقال کر گئے۔ سب سے بڑی بہن زرینہ شفقت نے کنیئرڈ کالج لاہور سے گریجوایشن کی۔ دوسری بہن فریدہ ارشد نے کالج آف ہوم اینڈ سوشل سائنسز سے ڈگری حاصل کی۔

میرا پڑھائی لکھائی کی جانب کچھ خاص لگاؤ نہ تھا۔ میں ایک متوسط درجے کا طالب علم رہا۔ 1966ء میں مَیں بی ایس سی تھرڈ ایئر میں تھا کہ یہ اٹل فیصلہ کر لیا کہ بس آگے نہیں پڑھنا اور میں نے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

فوج میں جانا ہے۔ آخر کار میں نے پاکستان ملٹری اکیڈمی میں 37th پی ایم اے لانگ کورس کے لیے درخواست دے دی اور میں 19 اپریل 1966ء کو سیکنڈ لیفٹیننٹ کے طور پر فوج میں بھرتی ہوگیا۔ جب ہم ایبٹ آباد بس سٹاپ پر پہنچے تو پی ایم اے کاکول سے ہمیں کچھ فوجی سپاہی لینے آئے ہوئے تھے۔ وہ ڈانٹتے ہوئے اور بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے پی ایم اے لے گئے۔ انہوں نے جس بے دردی سے ہمارا استقبال کیا وہ ایک تلخ تجربہ تھا اور مجھے اپنے خواب ٹوٹتے محسوس ہوئے۔ دراصل یہ بھی ٹریننگ کا ایک حصہ تھا جس کا ہمیں بعد میں پتہ چلا۔ پی ایم اے کاکول کا گیٹ کراس کرتے ہی ہم پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی اور فرنٹ رول، کرالنگ، رننگ وغیرہ کی صورت میں ہماری ٹریننگ کا آغاز ہوگیا۔

سب سے پہلے ایک این سی او (نان کمیشنڈ آفیسر) ہمیں حجام کے پاس لے کر گیا جہاں ہماری مخصوصی فوجی کٹنگ کی گئی۔ پی ایم اے کاکول میں ایک کمرے میں ہم دو کیڈٹس رہتے تھے۔ میرے ساتھ ایک بنگالی کیڈٹ شریف الحق تھا۔ کمرے کشادہ اور خوبصورت تھے۔ کپڑے رکھنے کے لیے الگ الگ الماریاں تھیں۔ ایک کونے میں پڑھائی لکھائی کے لیے ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ سردیوں میں کمرے کو گرم رکھنے کے لیے دیوار کے ساتھ ہیٹر لگا ہوا تھا جس میں گرم پانی ابلتا رہتا۔ صبح پانچ ہمارے رگڑے کی ڈرل شروع ہوتی جو رات دس بجے تک جاری رہتی۔ عسکری تربیت ایک سخت ترین مرحلہ تھا اور ہمارے اساتذہ کی نظریں ہر وقت ہمارا تعاقب کرتی رہتیں۔ ہمیں زندگی کی ایک ایک چیز میں ڈسپلن سکھایا گیا کہ کھانا کس طرح کھانا ہے، چمچ، چھری اور کانٹا کس طرح استعمال کرنا ہے۔ ہمیں اس بات پر سخت تربیت کی جاتی کہ ہر کام بالکل وقت پر کرنا ہے۔ جتنا سالن ضرورت ہو اتنا ہی پلیٹ میں ڈالنا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہاں میں ایک بات پھر دہراتا چلوں جو کہ میں نے اپنی کتاب میں نہایت تفصیل سے لکھی ہیں کہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول ایک نہایت خوبصورت وادی میں واقع ہے۔ اس کے اردگرد سرسبز پہاڑ، چیڑ اور صنوبر کے درخت ایک دلکش نظارہ پیش کرتے ہیں لیکن یہ خوبصورت مناظر اکیڈمی میں بسنے والے کیڈٹس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے کیونکہ ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ نظاروں سے لطف اندوز ہو۔ کیڈٹس اس خوبصورت وادی کے تمام تر حسن سے محروم ہی رہتے ہیں۔ شرارتی اور کام چور کیڈٹس کو سزا اس طریقے سے دی جاتی کہ ان کی جسمانی فٹنس میں اضافہ ہو اور ذہنی فتور میں کمی واقع ہو۔

ہمیں ہر ہفتے دو فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ایک اردو اور ایک انگریزی۔ فلم دیکھنا بھی ہمارے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لیے کسی مصیبت سے کم نہ تھا۔ ہم مفتی ڈریس یعنی سفید قمیض، گرے پتلون اور کالے بوٹ پہن کر باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے سینما ہال میں داخل ہوتے اور سیٹوں پر تختے کی مانند بالکل سیدھا بیٹھ جاتے۔ ادھر ادھر دیکھنے کی قطعی طور پر اجازت نہ تھی۔ ہمیں دوران ٹریننگ فوجی مضامین کے علاوہ سول تعلیم کے مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اکیڈمک کورس مکمل کرنے پر بی یا بی ایس سی کی ڈگری دی جاتی تھی۔ چونکہ میں نے ایف ایس سی کیا تھا اس لیے مجھے بی ایس سی کے مضامین کا انتخاب کرنا پڑا۔ اس میں انگریزی، اردو، فزکس اور ریاضی شامل تھی۔ ان میں میری کارکردگی بس واجبی سی ہی تھی۔ بہرحال میں بی ایس سی کی ڈگری تھرڈ ڈویژن میں حاصل کر لی۔ پی ایم اے کے شب و روز گزرتے گئے اور آخر کار وہ دن بھی آن پہنچا جس کا ہمیں بڑی شدت کے ساتھ انتظار تھا یعنی پاس آؤٹ ہونے کا دن۔ ہمارا کورس 55 کیڈٹس پر مشتمل تھا۔ ان میں سے جنہوں نے استعفیٰ دیا ان کی تعداد گیارہ تھی، 26 کیڈٹس ریلیگیٹ ہوئے جس سے مراد یہ تھی کہ انہیں چھ ماہ مزید اکیڈمی میں گزارنا ہوں گے، میں اپنی تمام تر کوتاہیوں اور شرارتوں کی وجہ سے اپنے کورس میں سے پندرہویں نمبر پر رہا اور پاس آؤٹ ہو گیا۔ 21 اپریل 1968ء میں میری پی ایم اے سے پاس آؤٹ پریڈ ہوئی اور مجھے انفینٹری کی ایک یونٹ 15FFR میں بھیج دیا گیا۔ یہ یونٹ اس وقت والٹن روڈ لاہور میں تعینات تھی۔

یہ ایک ریکی اینڈ سپورٹ یونٹ تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ وہ یونٹ تھی جس کے پاس بڑے ہتھیار مشین گنیں، ریکائل لیس رائفلز وغیرہ تھیں۔ اس یونٹ نے 65ء کی جنگ میں بہت اچھی کارکردگی دکھائی تھی۔ بعد ازاں اس یونٹ کو انفینٹری یعنی پیادہ فوج کا درجہ دے دیا گیا۔ یہ ایک بہت پرانی یونٹ تھی اور جنگ اور امن دونوں حالات میں اس کی کارکردگی بڑی زبردست رہی۔ حال ہی میں سوات اور وزیرستان میں دہشت گردوں کے خلاف جو آپریشن ہوئے اس یونٹ نے بڑی زبردست صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ اس یونٹ ''آپریشن راہِ نجات'' اور ''آپریشن ضرب عضب'' میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

1971ء میں جب مشرقی پاکستان پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے تو اس سال کے بالکل اوائل میں میری یونٹ کو جیسور (مشرقی پاکستان) میں تعیناتی کے احکامات موصول ہوئے۔ میری یونٹ سے قبل جیسور محاذ پر 25 بلوچ رجمنٹ (انفینٹری) تعینات تھی اور ایک عرصہ سے مکتی باہنی کے خلاف سرگرم عمل تھی، اب اس یونٹ کو آرام پہنچانے کی غرض سے یہاں مغربی پاکستان واپس بلوا لیا گیا اور ہماری یونٹ کو جیسور بھیج دیا گیا۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یہاں میں بتا تا چلوں کہ مشرقی پاکستان کو ہم سے الگ کرنے کے لئے بھارت شروع دن سے ایک مکمل پلاننگ کے تحت کام کرتا رہا اور ہم خواب غفلت میں رہے۔ ہم اس کی سازشوں کو ہی نہ جان سکے۔ مثال کے طور پر بھارت نے یہ کیا کہ 30 جنوری 1971ء کو اپنے ایک فوکر طیارے ''گنگا F-22'' کی ہائی جیکنگ کا ڈرامہ رچا کر اسے لاہور بھجوا دیا۔ مبینہ طور پر اسے دو ہائی جیکرز اغواء کر کے لاہور لائے تھے۔ ان ہائی جیکرز کی خوب تشہیر کی گئی اور انہیں پاکستانی ہیروز بنا کر پیش کیا گیا۔ قوم کو یہ بتایا جاتا رہا کہ یہ کشمیری مجاہدین ہیں اور انہوں نے مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا ہے۔ بہرحال اس کی کہانی اب تو بہت سی کتابوں میں چھپ چکی ہے۔ مختصر طور پر بتا تا چلوں کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب لاہور ایئر پورٹ پر پہنچے اور ان ہائی جیکرز سے ملاقات کر کے انہیں قوم کے سامنے ایک ہیرو کے طور پر پیش کیا۔ اخبارات نے ان ہیروز کی خوب سرخیاں جمائیں اور قوم نے خوشی سے بغلیں بجائیں۔ اب بھارت نے ردعمل کے طور پر یہ کیا کہ فوری طور پر ہماری ایئر سپیس بند کر دی تا کہ پاکستان کا کوئی جہاز ڈھاکہ نہ جا سکے، یوں بھارت کا سب سے پہلا وار کامیاب ہوا اور ڈھاکہ سے ہمارا سب سے آسان اور تیز رفتار رابطے کا ذریعہ فوری طور پر کٹ گیا۔ اس کے بعد روس کی مدد سے بھارتی افواج نے سمندر میں بھی اپنی نیوی کو ہائی الرٹ کر دیا۔ اس موقع پر بھارت نے روس کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا تھا کہ اگر ان دونوں ملکوں پر کوئی تیسرا ملک حملہ کرے گا تو یہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ یہ تو بہت بعد میں ان ہائی جیکرز کی تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ سارا ڈرامہ بھارت نے خود رچایا تھا تا کہ مغربی پاکستان کا مشرقی پاکستان سے رابطہ کٹ جائے اور بھارت پوری دنیا کے سامنے اس کا جواز بھی پیش کر سکے۔

اس طرح بھارت کی ہوائی حدود کی بندش کی وجہ سے میری یونٹ 15 ایف ایف لاہور سے کراچی بذریعہ ریل گاڑی روانہ ہوئی۔ ہم نے دو تین دن کراچی میں قیام کیا اور پھر ہمیں پی آئی اے کے ذریعے سری لنکا کے راستے سے مشرقی پاکستان پہنچایا گیا۔ ہماری یونٹ نے 16 اکتوبر 1971ء کو اپنے علاقے کا مکمل کنٹرول سنبھال لیا۔ جیسور میں ہمارے علاقے میں آٹھ پل تھے جن کا دفاع بہت ضروری تھا۔ یہاں میں بتا تا چلوں کہ دوران امن ٹریننگ کے مطابق اصول یہ ہے کہ ایک انفینٹری بٹالین دفاع میں پانچ ہزار گز کا علاقہ سنبھال سکتی ہے جبکہ مشرقی پاکستان میں ہمیں اس سے کئی گنا زیادہ علاقہ دفاع کے لیے دے دیا گیا۔ اس طرح میری یونٹ چالیس میل کے علاقہ کی ذمہ دار تھی۔ ان حالات میں اس علاقے کا موثر دفاع ممکن نہ رہا۔ نفری کی کمی کا بھی شدید سامنا تھا جس کی وجہ سے ہمیں اپنی دفاعی لائن میں بہت سے علاقے خالی چھوڑنا پڑے۔

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یہاں بتا تا چلوں کہ سانحہ مشرقی پاکستان کے اسباب وعلل پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ہم سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ سانحہ کیوں رونما ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب کچھ جاننے کے باوجود بھی جس بات سے محروم ہیں وہ ہے اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنا۔ ہم لوگ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے کی اخلاقی جرات سے محروم ہیں۔ میرے خیال سے مشرقی پاکستان کے اسباب پر مزید بحث کرنا اور تکرار کرنا بالکل بے سود ہے۔ میں یہاں ان حالات وواقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کا میں نے خود سامنا کیا، میں اپنی ذاتی رائے بھی پیش کرنے کی کوشش کروں گا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار کون تھا۔

میرے نزدیک سقوط ڈھاکہ کے تین مرکزی ملزم یہ ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو، جنرل یحیٰی خان او ر شیخ مجیب الرحمٰن۔ باقی جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کو بھی زیادہ مطعون ٹھہرایا جاتا ہے تو میں بتا تا چلوں کہ میں جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا کیونکہ ہم ڈھاکہ سے بہت دور شدید لڑائی میں مصروف تھے۔ ہماری پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ ہم جنرل نیازی کو ڈسکس کرتے۔ ہاں اتنا ضرور کہوں کہ جنرل نیازی ہمارے سپہ سالار تھے اور میں ان کے بارے میں کسی قسم کا منفی تاثر نہیں دینا چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنرل نیازی سمیت ہم سب فوجیوں کو قربانی کا بکرا بنا کر سیاستدانوں نے اپنا الو سیدھا کیا تا کہ سقوط ڈھاکہ کا مقدمہ سیاستدانوں پر فٹ نہ ہو اور صرف فوج کو بدنام کیا جائے۔ چالاک سیاستدانوں نے سارا ملبہ جنرل نیازی پر ڈالا اور خود "پاک صاف" ہو گئے۔ اگر 1971ء کی جنگ کی شکست نہایت قابل افسوس ناک ہے تو یہ غلط پروپیگنڈہ اور وہ بھی اپنوں کی طرف سے، اس شکست سے بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔

میں یہ بتا تا چلوں کہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے جھوٹ بھی بہت زیادہ بولا اور لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ مثال کے طور پر پورے مشرقی پاکستان میں ہماری صرف ایک ڈویژن فوج تعینات تھی۔ جب جنگ شروع ہوئی تو مغربی پاکستان سے مزید دو ڈویژن فوج مشرقی پاکستان بھیجی گئی۔ اہم ترین کمزور پہلو بتا تا چلوں کہ اس دو ڈویژن فوج میں نہ تو آرمرڈ (رسالہ) دستے شامل تھے اور نہ ہی توپ خانہ (آرٹلری) شامل تھا جبکہ اس کلیے کو ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ کسی بھی جنگ میں یہ دونوں عناصر انتہائی اہم ترین ہوتے ہیں اور ان کے بغیر کوئی جنگ نہیں جیتی جا سکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ بھارت کو بھر پور فضائی قوت بھی حاصل تھی۔ جبکہ ہمارے پاس 1965ء والے سیبر طیارے تھے۔ یہ سارے سیبر طیارے ڈھاکہ کے فوجی اڈے پر کھڑے تھے۔ جب 21 نومبر 1971ء کو بھارت نے باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا تو بھارتی فضائیہ نے ڈھاکہ

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ایئرپورٹ پر حملہ کر دیا لیکن ہماری اینٹی ایئر کرافٹ گنوں نے کمال مہارت کا مظاہرہ کیا اور 18 بھارتی لڑاکا طیارے مار گرائے۔اس کے بعد بھارت نے انتہائی اونچائی سے بمباری شروع کر دی اور اس نے رن وے مکمل طور پر تباہ کر دیا۔

ایک جھوٹ تو اتنا زیادہ بولا گیا کہ میں اس کی ضرور تردید کروں گا۔وہ یہ ہے کہ قوم کا یہ ذہن بنایا گیا کہ مشرقی پاکستان میں 92 ہزار فوج تعینات تھی۔یہ سراسر غلط اعداد و شمار ہیں اور یہ صرف فوج کو بدنام کرنے کی کوشش ہے۔کھلی حقیقت یہ ہے کہ فوج کی ایک ڈویژن میں تقریباً دس ہزار فوجی ہوتے ہیں۔مشرقی پاکستان میں تین ڈویژن فوج تعینات تھی تو اس حساب سے فوج کی تعداد 92 ہزار کس طرح ہوگئی؟؟۔میں پوری سپاہیانہ دیانتداری کے ساتھ بتاتا چلوں کہ درست بات یہ ہے کہ فوج کی تعداد صرف 24 سے 30 ہزار تک تھی۔92 ہزار کی جو بات کی جاتی ہے اس میں ان تمام مغربی پاکستانی محکمہ جات اور ان کے ملازمین کو شامل کر دیا جاتا ہے جو مشرقی پاکستان میں موجود تھے۔مشرقی پاکستان میں تعیناتی کے بعد سب سے پہلی فوجی کارروائی جس میں مَیں شامل تھا وہ ''بوئی چنا آپریشن'' تھا۔پانچ نومبر 71ء کو ہماری یونٹ 15FF کے کمانڈنگ افسر کو عبدالغفور (یہ ایک بنگالی باشندہ تھا اور جیسور پیس کمیٹی کا چیئرمین تھا) نے اطلاع دی کہ مکتی باہنی بوئی چنا کے علاقے میں انتشار پھیلا رہی ہے۔چنانچہ ہمارے سی او نے علاقہ مکینوں کو مکتی باہنی سے چھٹکارا دلانے کا فیصلہ کیا۔اس کارروائی کا نام ''آپریشن بوئی چنا'' تھا۔اس میں کیپٹن اعزاز جنجوعہ اور مجھے اہم ذمہ داری دی گئی۔ہم نے یہ آپریشن تین مختلف اطراف سے شروع کیا۔جیسے ہی میں مکتی باہنی کے علاقہ میں پہنچا دشمن نے فائر کھول دیا۔ہماری بھرپور جوابی کاروائی سے دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔ہم نے دشمن کا بہت دور تک پیچھا کیا اور اسے دور تک دھکیل دیا۔ہم نے واپسی پر ایک ایک جھگی کی تلاشی لی، جہاں عمر رسیدہ لوگ مقیم تھے انہیں ہم نے چارپائیوں پر ڈالا اور اپنے ساتھ لے آئے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے انہیں ''چیئرمین پیس کمیٹی'' کے حوالے کر دیا اور خالی جھگیوں کو آگ لگا دی۔

ایک اور موقع پر مجھے اطلاع ملی کہ علاقہ سنخیرہ کے قریب پنخل گھاٹا گاؤں میں مکتی باہنی اپنا بیس کیمپ مستحکم کرنا چاہ رہا ہے۔یہ گاؤں ہماری یونٹ کی رسد کے لیے آمد و رفت کے قریب واقع تھا اور اگر فوری کارروائی کر کے دشمن کا قلع قمع نہ کیا جاتا تو جیسور کی طرف سے آنے ولی ہماری رسد بند ہو سکتی تھی۔میں اپنے کمانڈنگ افسر (سی او) کو بتائے بغیر دس یا پندرہ جوانوں کو اپنی جمعیت میں شامل کیا اور پیدل پنخل گھاٹا گاؤں کی جانب رخ کیا۔ہم مکتی باہنی کے علاقہ سے گزر رہے تھے۔ہم اس بات سے بے پرواہ تھے کہ ہم دشمن کے علاقے سے گزر رہے ہیں اور وہ ہم پر گھات لگا کر حملہ کر سکتا

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہے۔آبادی سے گزر کر جب ہم کھلے علاقہ میں پہنچے تو دشمن نے ہم پر فائرنگ شروع کردی۔ ہماری موثر جوابی کارروائی سے دشمن پسپا ہو گیا لیکن میرا ٹاکرا ایک دبلے پتلے مکتی باہنی سے ہو گیا۔اس نے صرف لنگی پہنی ہوئی تھی۔ پیشتر اس کے کہ وہ بھاگتا، میں نے اسے اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔اس نے اپنا ہتھیار زمین پر پھینک دیا۔میرے نزدیک ایسے باغی کے لیے معافی نہ تھی چنانچہ میں نے اسی کی رائفل اٹھائی اور اسے شوٹ کر دیا۔اس ایکشن میں سات مکتی باہنی مارے گئے اور ہم نے بے شمار ایمونیشن پر قبضہ کیا۔ ہماری اس کامیاب فوجی کارروائی کا ذکر میجر جنرل عتیق الرحمٰن نے اپنی کتاب ''وارڈنز آف دی مارچیز'' میں بھی کیا ہے۔

مشرقی پاکستان محاذ پر میرے ساتھ منسلک ینگ آفیسرز اور جوانوں نے بہت زیادہ حب الوطنی اور جان فروشی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ جنگ لڑی۔ان متوالوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انہی میں سے ایک افسر کا نام لیفٹیننٹ طارق احمد حسین تھا۔ سنگھیرہ، محمود پورہ، بھومرہ وغیرہ پر بنگلہ دیش اور بھارت کی حدود کا تعین تقریباً ایک سو گز چوڑے نالے سے کیا جاتا ہے۔آر پار آمد و رفت کے لئے ایک پل تھا۔ جہاں سے کلکتہ 83 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔دریا میں پانی کی گہرائی کافی تھی ۔دونوں اطراف سے بنکرز نالے کے بالکل اوپر کنارے پر بنائے گئے تھے۔دشمن کا ایک مورچا ایسا تھا جس پر مشین گن لگی ہوئی تھی۔ جیسے ہی ہمارا کوئی جوان دریا کے کنارے پر حرکت کرتا تو دریا کے بند کے پیچھے بیٹھے بھارتی فوجی بھاگ کر مورچے پر آتے اور فائرنگ شروع کر دیتے۔میری ''ڈی کمپنی'' کے پاس ایک 75 ایم ایم آر آر گن تھی۔اسے دشمن کے ٹینکوں کے خلاف ایک سٹینڈ پر نصب کر کے بریچ بلاک کے اوپر لگی ہوئی سائٹ میں سے نشانہ لیتے ہوئے ٹارگٹ پر فائر کیا جا سکتا تھا۔دشمن کی حرکات اور اپنی دفاعی پوزیشن کے مدنظر اس گن کو سٹینڈ پر مکمل طور پر فکس کر کے اسے دشمن کی نظروں سے بچانا ناممکن تھا۔

لیفٹیننٹ طارق احمد حسین کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔اس نے گن کی نالی کے آخری حصے کو مورچے میں دو ریت سے بھرے ہوئے تھیلوں کے درمیان میں رکھا اور پیچھے سے بریچ بلاک کھول کر نالی کے بیچ میں سے دیکھتے ہوئے عین دشمن کے مورچے پر فکس کر دی۔اس مورچے میں دشمن کی مشین گن لگی ہوئی تھی، دشمن کے جوان ہم پر فائر کرنے کے لئے مورچے پر آتے تھے اور فائر کر کے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔اب مجھے طارق نے کہا کہ آپ دریا کے بند پر دائیں سے بائیں حرکت کریں، جونہی دشمن کے فوجی فائر کرنے مشین گن کی طرف آئیں گے تو میں فوراً فائر کھول دوں گا۔اب یہ کام خطرے سے بالکل بھی خالی نہ تھا اور اپنی موت کو دعوت دینے والی بات تھی۔ میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

خوفزدہ ہوگیا لیکن میں بسم اللہ پڑھی اور حرکت کرنے لگا۔ طارق کا اندازہ بہت ہی درست نکلا۔ اس کی کیلکولیشن بھی کمال کی تھی۔ جیسے ہی میں نے دریا کے بند پر حرکت کی، دشمن بھاگ کر مجھ پر فائر کرنے کے لئے اپنے مورچے میں آیا، اس سے پہلے کے وہ فائر کرتا طارق نے اپنی گن کا ٹریگر دبا دیا۔ گولہ سیدھا دشمن کے مورچے پر جالگا اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔ یہ واقعہ آج بھی مجھے یاد آتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

بہرحال 16 دسمبر 1971ء کو جنرل سرینڈر ہوا تو ہم اپنے کمپنی کمانڈر میجر مختار احمد عثمانی کے ہمراہ گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کے بعد میجر مختار احمد عثمانی، کیپٹن اختر، کیپٹن صغیر احمد اور مجھے 55 فیلڈ رجمنٹ جیسور کے کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا جہاں پر پوچھ گچھ ہوئی۔ بھارتی فوجی اس پر پریشان تھے کہ ہمارے توپ خانے کا فائر اتنا کارگر اور کامیاب کیسے رہا تھا؟ حالانکہ کیپٹن اختر (آرٹلری آبزرور) کے پاس کوئی نقشہ یا کوئی اور ایسی چیز نہ تھی جس کی مدد سے دشمن پر درست طریقے سے فائر کیا جا سکتا۔ رات ہم نے پریشان میں گزاری کہ اس قید سے کیسے نجات حاصل کی جائے، کیسے فرار ہوا جائے۔ دوسری طرف بھارت نے ہماری تسلی کی خاطر یہ افواہ پھیلا دی کہ راستے میں مختصر کاغذی کارروائی کے لیے آگرہ کے مقام پر کچھ دیر رکنے کے بعد آپ کو پاکستان بھیج دیا جائے گا۔

قصہ کوتاہ ہمیں بذریعہ ٹرین آگرہ لے جا کر ''آگرہ جیل'' کی مختلف بیرکوں میں بند کر دیا گیا۔ یہ انگریز دور کی بنی وحشت ناک جیل تھی جس کی دیواریں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ مجھے اور کیپٹن محبوب قادر کو ایک سیل میں بند کیا گیا۔ شدید سردی تھی اور ہمارے پاس سردی سے بچنے کے لیے کوئی کپڑا تک نہ تھا۔ ہم نے سردی سے بچنے کا طریقہ یہ نکالا کہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک واک شروع کر دی۔ جیل میں روزانہ ہماری گنتی کی جاتی۔ چند دن بعد ہم 25 افسروں کو اسی جیل کے کیمپ نمبر 44 میں منتقل کر دیا گیا جہاں ہم نے چھ مہینے گزارے۔ ہم جنگی قیدی تھی اور ہمارے پاس موجود ہر قسم کے لباس چادر، کمبل، کپڑوں وغیرہ پر PW یعنی ''Prisioner of War'' لکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک سفید پاجامہ اور ململ کا ایک کرتا کسی طریقے سے کینٹین سے حاصل کیا۔ جن پر PW نہیں لکھا تھا اور میں نے یہ سامان چھپا کر رکھ دیا۔

ہم تمام افسروں میں مثالی اتحاد تھا اور ہم بھارتیوں منفی رویوں کے خلاف کھل کر اظہار کرتے۔ ہمارے اتحاد کو دیکھتے ہوئے جیل انتظامیہ نے ہمارے اس گروپ کو ''ٹربل میکرز'' قرار دیا اور ہمیں آگرہ جیل سے رانچی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جیل منتقل کرنے کا پروگرام بنایا۔رانچی منتقل ہونے والے مجموعی طور پر ہم 29 افسر تھے۔ ہماری لسٹیں تیار ہوئیں اور پھر ہمیں جوڑوں کی شکل میں Cells میں چوبیس دن بند رکھا گیا۔میرے ساتھ کیپٹن احسن صدیق تھا۔رانچی جیل روانگی ہوئی تو میں نے آدھے بازو والی بنیان اور خاکی پتلون پہنی ۔پتلون کے نیچے میں نے PW کے بغیر پاجامہ پہن رکھا تھا اور کمر کے ساتھ کرتا باندھ رکھا تھا۔میرا مصمم ارادہ تھا کہ موقع ملتے ہی فرار ہو جاؤں گا۔آگرہ جیل چونکہ بہت ہی بوسیدہ تھی اور آئے روز اس کی مرمت جاری رہتی تو ایک دن موقع پا کر کیپٹن احسن نے لوہا کاٹنے والی ''ریتی'' کاریگر کی نظروں سے چرا کر اپنے پاس رکھ لی۔ہم ریلوے سٹیشن پہنچے اور ریل گاڑی میں بٹھا دیے گئے۔ہمارے ساتھ ٹرین میں بھارتی فوج کی ایک کمپنی تھی جس کی کمانڈ ایک کیپٹن کے پاس تھی جس کا نام راٹھی تھا۔ایک بار پھر ہماری گنتی کی گئی اور ہمیں جوڑوں کی شکل میں ہتھ کڑیاں لگا دی گئیں۔یعنی ایک کی بائیں اور دوسرے کی دائیں کو ہتھ کڑی لگائی گئی۔اس طرح ہم 28 افسروں کے چودہ جوڑے بن گئے اور جو ایک بچ گیا تھا اس کے دونوں ہاتھوں کو ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔میرا ماسٹر ہاتھ چونکہ بایاں ہے تو میں نے اپنا دایاں ہاتھ لیفٹیننٹ حمید نیازی کے بائیں ہاتھ سے بندھوا دیا۔اس طرح ہم دونوں کے ماسٹر ہاتھ آزاد تھے۔ہم نے ڈبے میں اپنی سیٹ کا چناؤ بنچوں والے آخری حصے میں کھڑکی کے ساتھ کیا۔ میجر جعفر، کیپٹن حفیظ علی، میجر جنجوعہ، میجر قادر، میجر نصیب اللہ شہید اور کیپٹن ہدایت ہمارے سامنے بیٹھے تھے۔ڈبے کے اندر آنے جانے والے راستے کو چھلے دار تار سے بند کر دیا گیا تھا اور ڈبے کے مین دروازوں کے درمیان والی جگہ پر ایک حوالدار اور دو مسلح جوان مستعد کھڑے تھے۔باقی انڈین فوجی نفری ہمارے ڈبے کے آگے اور پیچھے والے ڈبوں میں موجود تھی۔ یوں سیکورٹی کے لحاظ سے ایک بہت سخت حصار قائم کر دیا گیا تھا۔ہم میں سے جس کسی کو رفع حاجت کی ضرورت پڑتی تو حوالدار کو آواز دی جاتی جو چھلے دار تار کو ایک طرف ہٹا کر اندر داخل ہوتا اور باقی دو جوان سٹین گن تھامے اس کے پیچھے ہوتے۔ ہتھکڑی کھولی جاتی اور ڈبے کے اندر موجود واش روم کو استعمال کرنے کی اجازت دی جاتی۔ جہاں بھی گاڑی رکتی بھارتی فوجی ہمارے ڈبے کو گھیرے میں لے لیتے اور پھر گنتی شروع کر دیتے اور ''سب اچھا'' کی رپورٹ کیپٹن راٹھی کو دی جاتی۔

ریل گاڑی کے ہر ڈبے کی کھڑکی میں چار لوہے کی سلاخیں متوازی حالت میں جڑی ہوئی تھیں، میں کھڑکی کی طرف بیٹھا تھا، کھڑکی کی سلاخ کو کاٹنے کا مسئلہ ہمارے درمیان زیر بحث آیا تو کیپٹن احسن نے وہ ریتی اپنی چپل کے تلوے سے نکال کر میجر قادر کے سپرد کر دی کیونکہ اس وقت میجر قادر ہمارے ماسٹر مائنڈ تھے۔ہم نے منصوبہ بنایا کہ اس ریتی سے سب سے نیچے والی سلاخ کو کاٹا جائے تا کہ اس میں سے نکلا جا سکے۔اب ہم منصوبے پر عمل کرنے کے لیے رات کا انتظار

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کرنے لگے تاکہ تاریکی اور گاڑی کی چھک چھک کی آواز میں ہم اپنا کام کرسکیں۔ ہم پہرے داروں کے طور طریقوں کا بھی بغور مشاہدہ کرتے رہے۔ ہم نے باتوں باتوں میں بھارتیوں سے پوچھا کہ آگرہ سے رانچی کا کتنا سفر ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک دن اور ایک رات کا سفر ہے، مطلب یہ کہ ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ رات کے نو بجے تو ہم نے سلاخ کاٹنے کا کام شروع کر دیا۔ ریتی بہت ہی چھوٹی تھی اور اسے پکڑنا بہت مشکل تھا۔ جب گاڑی رکتی ہم اپنا کام بھی روک لیتے۔ جب ایک جوڑا تھک جاتا تو دوسرا جوڑا یہ فریضہ انجام دیتا۔ صبح تقریباً تین بجے ہم سلاخ کاٹ چکے تھے۔ کیپٹن احسن صدیق نے ہماری ہتھکڑی کو کاٹنا شروع کر دیا اور آدھ گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد ہتھکڑی کٹ چکی تھی اور اب میری کلائی میں صرف ہتھکڑی کا کڑا رہ گیا۔ اب سلاخ کھینچ کر ہمارے ماسٹر مائنڈ میجر قادر نے اپنا سر باہر نکالا اور گاڑی کی رفتار جانچنے کی کوشش کی۔ میجر قادر نے کہا کہ ٹرین کی رفتار تو بہت تیز ہے۔ سب کو خاموش دیکھ کر میں نے کہا ''اگر اجازت ہو تو میں بھاگ جاؤں؟'' سب نے سر ہلا دیا۔ میں نے اللہ کا نام لیا سب کو خدا حافظ کہا، کھڑکی سے باہر نکلا اور اوپر والی سلاخ کو اپنے ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لیا۔ اب میں ٹرین کے باہر کی طرف لٹک رہا تھا، گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی اور وہ ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ میں ذہنی طور پر تیار تھا کہ مجھے شدید چوٹیں آئیں گی۔ ہماری گاڑی کے متوازی ایک اور بھی پٹری تھی، خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں اس طرف سے کوئی اور گاڑی نہ آ جائے اور مجھے کچل نہ ڈالے۔

میں نے ایک بار پھر اللہ کا نام لیا اور ڈبے سے پرے زور سے ''سوئنگ'' لیا اور لوہے کی سلاخ چھوڑ دی۔ اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو دیکھتا ہوں کہ میرے پاس ایک گھوڑا کھڑا ہے اور دو پولیس اہلکار اور چند دیگر لوگ مجھے اٹھا رہے ہیں۔ مجھے گھوڑے پر بٹھا دیا گیا اور ایک پولیس سٹیشن لے جا کر چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ یہ کسی گاؤں کا تھانہ تھا۔ میرے کپڑے مکمل خون آلود تھے، زبان کٹ چکی تھی اور ایک دانت گر چکا تھا۔ ناک اور ماتھے کے ملاپ پر گہری چوٹ آئی جس کا نشان ابھی تک موجود ہے۔ پولیس اہلکاروں نے پوچھا تم کون ہو؟ میں نے کہا میں بول نہیں سکتا، پنسل کاغذ لاؤ، پنسل کاغذ لایا گیا تو میں نے فقط اتنا لکھا ''کیپٹن شجاعت''۔ یہ پڑھتے ہی پولیس حرکت میں آ گئی، ٹیلی فون بجنا شروع ہو گئے۔ دو سپاہیوں نے میرے ہاتھ پاؤں ہتھکڑیوں اور لوہے کی موٹی چین میں جکڑ ڈالے۔ کچھ دیر بعد مجھے گاؤں میں ایک دکان پر لے جا کر میری مرہم پٹی کروائی گئی۔ اس کے بعد مجھے ریلوے سٹیشن لایا گیا جس پر ''ریلوے سٹیشن دلدار نگر'' لکھا ہوا تھا۔ مجھے سخت سیکورٹی میں ٹرین پر سوار کر دیا گیا اور تقریباً دو گھنٹے کی مسافت کے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بعدایک تھانے میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ تھانے کے گیٹ پر ''تحصیل غازی پوری پولیس سٹیشن'' لکھا تھا۔

اگلی صبح دو آدمی آئے اور میز کرسیاں لگا کر بیٹھ گئے انہوں نے میرے سامنے انگریزی کا اخبار رکھا اور ایک خبر پڑھنے کو کہا: خبر کا لب لباب یہ تھا: ''دو جنگی قیدیوں نے ٹرین سے بھاگنے کی کوشش کی ،ایک کو گولی ماردی گئی اور دوسرا بھاگنے میں کامیاب ہو گیا''۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں ، میں نے تو اکیلے ہی ٹرین سے چھلانگ لگائی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مزید کچھ نہ پوچھا اور مجھے ساتھ والے کمرے میں لے گئے جہاں بھارتی فوج کا ایک کپتان، ایک جے سی او اور چند دیگر جوانوں موجود تھے کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے پھر میرے ہاتھ پاؤں جکڑ ڈالے اور ایک فوجی گاڑی میں بٹھا دیا۔

یہ ایک فوجی Dodge تھی جس میں دس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے اس میں آٹے کی بوری کی طرح اٹھا کر پھینکا اور خود بھی میرے ساتھ سوار ہو گئے۔ گاڑی کافی دیر چلتی رہی ،گاڑی رکنے پر معلوم ہوا کہ ہم کسی فوجی یونٹ میں پہنچ چکے ہیں، مجھے کوارٹر گارڈ کے سیل میں بند کر دیا گیا، یہاں بھی انکوائری ہوئی۔ ایک لیفٹیننٹ کرنل منہاس نے مجھ سے فرار کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا: ''قیدی ہونے کے ناطے میرا حق ہے کہ میں بھاگنے کی کوشش کروں لیکن افسوس میں کامیاب نہ ہو سکا''۔ مجھے سیل میں دس روز رکھا گیا اور ایک دن وہی ٹرین والا کیپٹن راٹھی اپنے جوانوں کے ہمراہ مجھے لینے آ گیا۔ ایک بار پھر زنجیروں میں جکڑ کر گاڑی میں بٹھایا گیا اور ہم رانچی جیل پہنچ گئے ۔ہم رات کے اندھیرے میں رانچی جیل پہنچے اور مجھے ایک سیل میں بند کر دیا گیا۔ میں اس سیل میں 28 دن قید رہا، پھر میرے احتجاج پر مجھے کیمپ نمبر 98 میں منتقل کر دیا گیا۔ یوں مختلف کیمپوں اور تفتیشی مراحل سے گزرتے ہوئے مجھے آخر کار کیمپ نمبر 95 میں شفٹ کیا گیا اور یہی میری منزل تھی جہاں میرے ساتھی موجود تھے۔ جب اپنے ساتھیوں سے ملا تو خوب آؤ بھگت ہوئی۔ سب دوست میری فرار اور پھر گرفتاری کی داستان سننے کو بہت بے چین تھے۔ جبکہ مجھے تجسس یہ تھا کہ دوسرا افسر کون تھا جسے گولی مار کر شہید کر دیا گیا تھا۔ خیر میں نے اپنی مکمل داستان دوستوں کو سنائی اور مجھے انہوں نے بتایا کہ تمہارے فرار ہونے کے بعد پٹنہ ریلوے سٹیشن پر ٹرین رکی اور گنتی کی گئی تو ایک افسر کم پایا گیا۔ اس سے بھارتی فوجیوں میں شدید اضطراب اور بے چینی پھیل گئی۔ بار بار گنتی کی جاتی لیکن ایک افسر کم نکلتا۔

فوجیوں نے ٹرین کو گھیرے میں لے لیا، کیپٹن راٹھی شدید غصے میں تھا کہ کیپٹن شجاعت کیسے

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بھاگ نکلا۔ کافی دیر پٹنہ سٹیشن پر گاڑی کھڑی رہی۔ آخر گاڑی چل پڑی اور سیکورٹی مزید سخت کر دی گئی۔ اس کے بعد میجر نصیب اللہ کو واش روم جانے کی حاجت ہوئی، پہرے دار نے ان کی ہتھکڑی کھولی اور وہ واش روم کی جانب چل دیے۔ تھوڑی دیر بعد سٹین گن کے لگاتار فائر کی آواز آئی۔ یہ واش روم ڈبے میں موجود لوگوں سے اوجھل تھا۔ سب پریشان ہو گئے کہ کیا ہوا ہے۔ گاڑی ایک ویرانے میں رک چکی تھی، کیپٹن راٹھی پاکستانی افسروں کے پاس آیا اور بتایا کہ میجر نصیب اللہ نے بھاگنے کی کوشش اور ہماری گولیوں کا نشانہ بن گیا ہے۔ سب قیدیوں نے اس پر احتجاج کیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، کیپٹن راٹھی نے کرنل حق نواز اور میجر جعفر کو لاش دیکھنے کی اجازت دے دی، وہ کیا دیکھتے ہیں کہ گولیاں نصیب اللہ کے سینے پر لگی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے اگر وہ فرار ہو رہے ہوتے تو گولیاں ان کی پشت پر لگتیں۔ اگلے دن بھارتی اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ ''دو پاکستانی جنگی قیدیوں نے بھاگنے کی کوشش کی، ایک فرار ہو گیا اور دوسرا مارا گیا''۔

کیپٹن راٹھی اور اس کے ساتھیوں نے بڑی چالاکی سے یہ گیم کھیلی تاکہ اس پر اور اس کے ماتحتوں کی نااہلی پر پردہ پایا جا سکے۔ یوں انہوں نے میرے فرار کی کہانی کو سنسنی خیز انداز میں پیش کیا اور ایک بالکل بے گناہ افسر کو شہید کر کے اپنی نااہلی پر پردہ ڈال دیا۔ رانچی جیل میں بھی ہم نے سرنگ کھود کر فرار ہونے کی ایک بھرپور کوشش کی لیکن اسی مشن کے دوران معاہدہ طے پا گیا اور ہمیں رہا کر دیا گیا۔ (ماہنامہ قومی ڈائجسٹ۔ فروری 2023ء)

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

6 ستمبر 1965ء کا معرکہ

میجر جنرل شفیق احمد (ستارہ جرأت)

کی جنگی یادداشتیں

میجر جنرل (ر) شفیق احمد 1934ء میں وادی سون سکیسر (خوشاب پنجاب) کے ایک گاؤں نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ 1952ء میں پاک فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ بھرتی ہوئے اور میجر جنرل کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ میجر جنرل شفیق احمد جنگ ستمبر 65ء کے موقع پر کیپٹن تھے اور انہوں نے اس جنگ میں چونڈہ کے مقام پر بڑی جرات کے ساتھ اپنی یونٹ ''تھری ایف ایف'' کی ایک کمپنی کی قیادت کرتے ہوئے حصہ لیا۔ اس خوفناک لڑائی میں میجر جنرل شفیق احمد کی کمپنی کا سامنا انڈین آرمی کی 20 راجپوت رجمنٹ اور 5 جموں کشمیر بٹالین سے رہا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی کمپنی اور بٹالین کے درجنوں جوانوں کو شہید اور زخمی ہوتے دیکھا۔ موت کئی مرتبہ انہیں قریب سے چھو کر گزر گئی۔ ایک موقع پر تو انہوں نے خود کو ٹٹول کر کنفرم کرنا چاہا کہ میں واقعی زندہ بھی ہوں یا نہیں۔

میجر جنرل (ر) شفیق احمد کو طویل عسکری کیریئر کے دوران تین بڑے فوجی اعزازات سمیت بہت سے میڈلز سے نوازا گیا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے جنگ ستمبر میں بہادری سے لڑنے پر انہیں ''ستارہ جرات'' عطا کیا۔ آرمی چیف جنرل محمد ضیاء الحق نے ''ہلال امتیاز'' (ملٹری) دیا اور ایف سی بلوچستان میں بطور آئی جی عمدہ کارکردگی پر آرمی چیف جنرل محمد اسلم بیگ نے ''ستارہ بسالت'' سے نوازا۔ گزشتہ دنوں میں نے اپنے دوست عمر یعقوب (سینئر رپورٹر) کے ہمراہ میجر جنرل (ر) شفیق احمد کے ساتھ ایک نشست کا پروگرام بنایا۔ جنرل صاحب سے رابطہ ہوا تو انہوں نے کمال شفقت سے وقت دیتے ہوئے کہا کہ آپ آج شام ہی میرے ہاں تشریف لائیں۔ ہم مقررہ وقت سے کچھ لیٹ پہنچے تو کہنے لگے یار! میں کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے معذرت چاہی تو فرط جذبات میں کہنے لگے: ''معذرت کی کوئی بات نہیں۔ میں صرف قومی جذبے کی خاطر ہی ''ہلال'' کو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

انٹرویو دینے کے لیے آمادہ ہوا ہوں کہ اگر میری وجہ سے قوم میں جذبہ حب الوطنی تازہ ہوتا ہے اور ایک انسپائریشن ملتی ہے تو یہ میرے لیے ایک سعادت ہوگی ۔ایسے کام قومی خدمت کے جذبے سے کرنے چاہئیں''۔ذیل میں میجر جنرل شفیق احمد کے ساتھ کی گئی اس نشست کا احوال قارئین کے ذوق کی نذر کیا جا رہا ہے۔سوال اس انداز سے کیے گئے کہ ایک دلچسپ سٹوری وجود میں آ گئی ہے۔ لیجیے جنگ ستمبر کی کہانی انہی کی زبانی سنتے ہیں۔

O......❄......O

میں 1952ء میں پاک فوج میں بھرتی ہوا اور عسکری تربیت کے بعد انفینٹری گروپ ''تھری فرنٹیئر فورس'' کا حصہ بنا۔ جنگ ستمبر 65ء کے موقع پر مَیں کیپٹن تھا اور سٹاف کالج کوئٹہ میں ایک کورس کر رہا تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو یہ کالج بند کر دیا گیا اور تمام افسروں کو اپنی یونٹوں میں بھیج دیا گیا۔اس وقت میری یونٹ ''تھری فرنٹیئر فورس'' چونڈہ کے محاذ پر تعینات تھی ۔ مجھے حکم ملا کہ فوری طور پر چونڈہ پہنچ کر اپنی یونٹ میں رپورٹ کرو۔ میں کوئٹہ سے تین دن کا سفر کر کے چونڈہ پہنچا۔اس وقت میری جوانی عروج پر تھی اور میں اُس دشمن کے خلاف لڑنے کے لئے بہت پُرعزم تھا جس نے میرے وطن پر حملہ کر دیا تھا۔ میں جلد از جلد محاذ جنگ پر پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔

مورخہ 9 ستمبر کو مَیں چونڈہ پہنچا اور مجھے ایک کمپنی کی کمانڈ دے دی گئی، یہ کمپنی 150 جوانوں پر مشتمل تھی۔ مختصر طور پر بتاتا چلوں کہ ایک پلٹن میں پانچ کمپنیاں ہوتی ہیں اور ہر پلٹن کی کمانڈ ایک کرنل کے پاس ہوتی ہے۔اس طرح پانچ کمپنی کمانڈروں میں سے ایک میں بھی تھا۔اصولی طور پر ہماری پلٹن میں کل 850 لوگ ہونے چاہیے تھے لیکن نفری کی کمی کی وجہ سے ہماری پلٹن میں 500 سے بھی کم لوگ تھے۔ جونیئر کمیشنڈ آفیسرز کی بھی شدید کمی تھی اور ان کی تعداد صرف 14 تھی ۔ جنگ میں ہماری پلٹن کے کل 72 جوان شہید ہوئے جبکہ میری کمپنی کے 25 جوان شہید اور دو زخمی ہوئے ۔میرے نائب کمپنی کمانڈر کیپٹن عبدالوحید کاکڑ تھے (یہ وہی کاکڑ صاحب ہیں جو بعد میں پاک فوج کے آرمی چیف بنے)۔ یہ اس جنگ میں دو مقامات پر شدید زخمی بھی ہوئے۔ایک موقع پر دشمن نے ہم پر ٹینک کا فائر کیا جس کے نتیجہ میں ہمارے دو جوان شہید ہو گئے۔ میں بالکل محفوظ رہا اور کاکڑ صاحب زخمی ہو گئے۔دوسرے موقع پر وہ ایک جیپ حادثے میں شدید زخمی ہوئے ۔عبدالوحید کاکڑ بہت اچھے اور بہادر افسر تھے۔انہوں نے کمانڈ اینڈ کنٹرول کا بہترین مظاہرہ کیا۔

جنگ ستمبر لاہور میں تو چھ تاریخ کو شروع ہو گئی تھی لیکن سیالکوٹ میں چونڈہ کے مقام پر یہ لڑائی

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سات تاریخ کوشروع ہوئی۔ یہ ایک بڑی بھیانک اور خطرناک جنگ تھی۔ انٹرنیشنل بارڈر سے چونڈہ گاؤں دس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ جنگ اس دس میل کوشامل کرکے اوردائیں بائیں علاقوں کو ملا کرتقریباً بیس میل کے اندر ہورہی تھی۔ بیس میل کے علاقے میں ہرطرف انفینٹری دستے، توپیں، ٹینک اورمورچے دکھائی دیتے تھے۔ جب گھمسان کی لڑائی ہورہی ہوتو کبھی دشمن آگے آتا ہےتو کبھی آپ آگے بڑھتے ہیں۔ چونڈہ کے گاؤں میں بھی یہی کچھ ہوتا رہا لیکن یہ محض اللہ کی مدد اورنصرت تھی کہ ہمارے جوانوں نے دشمن کو چونڈہ گاؤں سے آگے نہ آنے دیااوراس کے خوفناک عزائم چونڈہ گاؤں کی مٹی کے اندردفن کردیے۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہی مشہور ہے کہ چونڈہ کی لڑائی صرف ٹینکوں کی لڑائی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مقام پر ہمارے انفینٹری دستوں نے بھی کمال جرات کا مظاہرہ کیااورناقابل فراموش قربانیاں پیش کیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ چونڈہ کی جنگ میں میرے تمام جوانوں اورافسروں کی کارکردگی مجھ سے بہرحال بہت ہی اچھی رہی۔ میرے نزدیک یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ اس لڑائی میں کون زیادہ دلیری سے لڑااورکون کم دلیری سے۔ میرے سامنے سبھی جوان بہت زیادہ بے جگری سے لڑرہے تھے اور وہ اپنی دھرتی کی خاطر مرمٹنے پر تیار تھے،اس لیے میں کسی کوبھی کم یازیادہ دلیرنہیں کہہ سکتا۔ میری نظر میں آج بھی سب برابر ہیں۔

ہم نے دس ستمبر کو ہرلحاظ سے چونڈہ کادفاع مضبوط کرلیا تھااور جب سیز فائر ہواتو اس وقت ہم اپنے اسی پوائنٹ پرموجود تھے جہاں سے ہم نے دفاع لیا تھا۔ یعنی اس پوری لڑائی میں ہمارے جوانوں نے دشمن کوایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ گھمسان کی اس لڑائی میں دشمن کے بھی بہت سے لوگ مارے گئے اور ہمارے بھی کافی جوان شہید اور زخمی ہوئے۔ اگرآپ میرا اور جوانوں کا جذبہ پوچھیں گےتو حقیقت یہ ہے کہ ایک فوجی کے اندرلڑائی کا اوراپنے وطن کے دفاع کا جذبہ ہمیشہ موجودرہتا ہےاور پھروہ فوجی مسلمان ہوتواس کے اندر یہ جذبہ مزیدابھرکرسامنے آتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اگر میں مارا گیاتو شہید ہوجاؤں گااوربچ گیاتو غازی۔

ہمیں ٹریننگ میں بتایا گیا تھا کہ اگرکسی وقت لڑائی چھڑتی ہےتوتم نے کیسے مقابلہ کرنا ہے۔ ایک فوجی کی ٹریننگ اس کے سارے کیریئر میں جاری رہتی ہے اور وہ ہردم تیار و بیدار رہتا ہے۔ اسلحہ کااستعمال، سخت جسمانی ٹریننگ، ایکسرسائز، واٹرکراسنگ کورس، سوئمنگ کورس سمیت کوئی درجنوں کورسز ہوتے ہیں جوایک فوجی کرتا رہتا ہے۔ پھرفوج میں بہت سے مختلف گروپس ہوتے ہیں اور ہر گروپ کی الگ الگ ذمہ داریاں ہیں۔ انفینٹری کا جوان کیا کرے گا، کمانڈو نے کیا کرنا ہے، آرٹلری اورآرمرڈ کا جوان کیا کرے گا، میڈیکل کور، سگنل وانجینئرنگ اور سپلائی کور کے لوگ کیا کریں گے۔ ایک

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

منظم فوج کا کام بھی یہی ہے کہ وہ امن میں بھی حالت جنگ میں رہتی ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ ایک تسلسل کے ساتھ جنگی تیاریوں میں لگی رہتی ہے۔ جو لوگ یہ تنقید کرتے ہیں کہ ''فوج زمانہ امن میں کیا کام کرتی ہے؟'' تو ایسے لوگ درحقیقت احمقوں کی جنت میں بستے ہیں۔ امن ہو یا جنگ فوج سال کے بارہ مہینے اور چوبیس گھنٹے حرکت میں رہتی ہے۔ جنگ ستمبر کے موقع پر ہمارے پاس وسائل تو واقعی بہت کم تھے لیکن ہماری فوج میں چونکہ تنظیم سازی کا عمل بہت پائیدار تھا اس لیے جب لڑائی چھڑی تو ہر جوان اپنی اپنی ڈیوٹی پر بڑے ڈسپلن اور پورے جذبے کے ساتھ موجود تھا۔

فوجی افسر ایک لیڈر کی طرح ہوتا ہے اور سپاہی اس لیڈر کے ساتھی اور کارکن ہوتے ہیں۔ میں چونڈہ کے محاذ پر کمپنی کمانڈر تھا اور ڈیڑھ سو جوانوں کی قیادت میرے ہاتھ میں تھی۔ مجھے ایک علاقے کے دفاع کی ذمہ داری سونپی گئی۔ میں نے اپنے جوانوں کے ساتھ مل کر بھرپور منصوبہ بندی کی، پچاس سے ساٹھ مورچے بنائے۔ جوانوں کو ہدایات دیں کہ آپ نے فائر کہاں کہاں کرنا ہے۔ رات کو کیسے ڈیوٹی کرنی ہے اور دن کے وقت کیا کرنا ہے۔ جوانوں کی ڈیوٹیاں تقسیم کی گئیں۔ سونے اور کھانے کے اوقات مقرر ہوئے۔ اپنے مورچوں کو کیموفلاج کیا۔ دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا بھی کمپنی کمانڈر کی ذمہ داری ہے۔ میں نے اور نائب کمانڈر کیپٹن عبدالوحید کاکڑ نے دشمن پر کڑی نظر رکھی۔ ہم رات کے وقت دشمن کے مورچوں کے بالکل قریب چلے جاتے اور ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتے۔ انہی باتوں اور دیگر انٹیلی جنس معلومات سے علم ہوا کہ ہمارے مدمقابل دشمن کی ''20 راجپوت بٹالین'' اور ''فائیو جموں کشمیر بٹالین'' ہیں۔

ہمارے اور دشمن کے مورچوں کے درمیان کوئی ایک ہزار گز کا فاصلہ تھا۔ بعض مقامات پر یہ فاصلہ چار سو گز بھی تھا۔ ایک دو مواقع ایسے آئے کہ دشمن ہم سے صرف ایک سو گز کے فاصلے پر بھی تھا۔ ایک رات اچانک دشمن کے ٹینک ایڈوانس کرتے ہوئے آگے بڑھے اور ہم پر ہلہ بولنے کی کوشش کی۔ دشمن کی کوشش تھی کہ ہم ہڑبڑا کر مورچے چھوڑ کر بھاگ جائیں گے لیکن اللہ کے فضل سے جری جوان ڈٹ گئے، اللہ نے ہمیں استقامت دی اور دشمن کو کامیابی نہ ملی۔ اس لڑائی میں ہمارے اور بھارتی فوج کے بہت سے لوگ مارے گئے اور صبح ہونے سے پہلے دشمن اپنی پوزیشنوں پر واپس چلا گیا۔ ایک رات دشمن کی کئی کمپنیوں نے ہم پر حملہ کیا اور ہمارے بہادروں نے ایسی ترکیب کے ساتھ جواب دیا کہ دشمن اپنی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گیا، کچھ لوگوں کو ہم نے قیدی بھی بنالیا۔ دو دن بعد دشمن نے صرف ایک رات میں دو بڑے حملے کیے جنہیں پسپا کر دیا گیا۔ پہلا حملہ رات کے وقت کوئی آٹھ بجے حملہ کیا گیا، یہ سردیوں کے دن تھے اور سات آٹھ بجے ہی رات محسوس ہوتی ہے، اس حملے کو

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہمارے جوانوں نے پسپا کر دیا۔ دوسرا حملہ ایک بجے کیا اور وہ بھی ناکام ہوا۔ ایک موقع پر دشمن نے ہمارے بٹالین ہیڈ کوارٹر پر حملہ کیا اور گھمسان کا رن پڑا، آخر کار دشمن کو بھاری نقصان کے ساتھ واپس جانا پڑا۔

دشمن اس لیے پے در پے حملے کرتا تھا کہ چونڈہ سے آگے بڑھنا اس کے باقاعدہ جنگی پلان میں شامل تھا۔ اس نے صرف چونڈہ کے محاذ پر جو ٹینک براہ راست جنگ میں جھونک دیے تھے ان کی تعداد پانچ سو تھی۔ دیگر فوجی قوت انفنٹری، بکتر بند دستے، توپ خانہ وغیرہ اس کے علاوہ تھے۔ دراصل دشمن چونڈہ کو ایک مضبوط مرکز بنا کر پورے پاکستان پر قبضے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک رات میں دشمن کے مورچوں کے پاس چلا گیا۔ میں انہیں دیکھ تو نہیں سکا لیکن ان کی باتیں سن کر اندازہ ہوا کہ وہ حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میں فوری طور پر واپس آیا اور اپنے جوانوں کو الرٹ کیا۔ ہم نے دشمن فوج کی ''20 راجپوت بٹالین'' اور ''فائیو جموں کشمیر بٹالین'' کو بہت نقصان پہنچایا۔ فائیو جموں کشمیر بٹالین کے چند سپاہی اور ان کے کمانڈر کو بھی ہم نے پکڑ لیا۔ ایک مرتبہ 20 راجپوت بٹالین نے ہم پر حملہ کیا، اس معرکے میں دشمن کا ایک میجر اور چند سپاہی مارے گئے۔ ایک اور جھڑپ کے دوران میں نے دشمن کے ایک کمپنی کمانڈر کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نام لیفٹیننٹ چوہان تھا اور اس کا تعلق ''فائیو جموں کشمیر بٹالین'' سے تھا۔ لڑائی میں وہ میرے بالکل سامنے آ گیا، میں نے اسے ''ڈس آرم'' کر کے قید کرنے کی کوشش کی تو اس نے سرنڈر کرنے کے بجائے فرار ہونا چاہا تو میں نے اپنی سٹین گن سے اس پر سیدھا فائر کھول دیا اور وہ موقع پر مر گیا۔

چونڈہ کی جنگ میں مَیں نے کم از کم 25 بار موت کو بہت قریب سے دیکھا اور ہر بار مجھے ایسا لگا کہ بس یہ آخری لمحہ ہے اور چند سانسیں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے کسی دوسرے علاقے میں جانا تھا۔ راستے میں میری نظری دشمن کے ایک ٹینک پر پڑی جو صرف سو گز کے فاصلے پر تھا۔ ڈگنگ کر کے اسے جھاڑیوں کے ساتھ کیموفلاج کیا گیا تھا۔ میری اچانک اس پر نظر پڑی لیکن مجھ سے غلطی یہ ہوئی اور میں سمجھا کہ تیزی سے بھاگ کر آگے نکل جاؤں گا اور ٹینک والا مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ اگر دیکھ بھی لیا تو جب تک وہ تیار ہوگا میں اس کی رینج سے دور نکل جاؤں گا۔ میں بھاگ کر ٹینک کے آگے سے نکلا تو اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ تھوڑا آگے جا کر پانی کا ایک نالہ تھا، اس میں گھٹنے تک پانی تھا۔ میں اس نالے میں داخل ہوا تو پانی کی وجہ سے میرے بھاگنے کی سپیڈ کم ہو گئی، اسی لمحے ٹینک والے نے مجھے دیکھ لیا اور ٹینک پر نصب چھوٹی مشین گن سے مجھ پر فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں میرے آس پاس گر رہی تھیں۔ میں بڑی مشکل سے نالہ کراس کر کے ایک مورچے میں

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

گھس گیا اور اس نے ٹینک کی مین گن سے میرے مورچے پر گولہ داغ دیا۔ گولہ مورچے کے کنارے پر لگا، ایک زوردار دھماکہ ہوا لیکن مجھے اللہ نے محفوظ رکھا۔ میں کافی دیر مورچے میں بیٹھا رہا، میں مورچے سے نکلا تو وہ میری تاک میں تھا اور اسی طرح تیار بیٹھا تھا۔ اس نے ٹینک پر لگی مشین گن سے پھر فائرنگ شروع کردی۔ میں بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ جب فائر بہت تیز ہوا تو میں نے سوچا کہ میں لیٹ جاتا ہوں اور دشمن سمجھے گا کہ مجھے گولی لگ گئی ہے اور وہ فائر بند کردے گا۔ چنانچہ میں لیٹ گیا لیکن وہ پھر بھی فائر کرتا رہا۔ اب مجھے موت بالکل قریب نظر آرہی تھی۔ میں ایک بار پھر اٹھا اور بھاگتے ہوئے قریب موجود گنے کی فصل میں گھس گیا۔ اس جنگ میں کئی مرتبہ گولے ایسے ہم پر گرے کہ بچنے کی کوئی امید نہ تھی لیکن اللہ نے زندگی باقی رکھی تھی تو دشمن ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ ایک مرتبہ ایک گولہ ہمارے قریب گرا، میں لیٹ گیا اور میرے قریب کھڑا جوان فضا میں بلند ہوا اور دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر شہید ہو گیا۔ مجھے آج بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے جوانوں کی بے پناہ قربانیاں یاد آجاتی ہیں۔

چونڈہ محاذ پر کامیابی کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ ہم مسلمان تھے اور ہمارے اندر جو جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ تھا ظاہر ہے دشمن ایسے جذبات سے یکسر محروم تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہماری ٹریننگ اچھی تھی اور ہمارے لیڈر بہت اچھے تھے۔ جنگ ستمبر میں قدم قدم پر اللہ نے ہماری مدد و نصرت کی اور ہم نے اپنے عسکری ٹیکٹس اور جذبہ ایمانی کو کام میں لاتے ہوئے دشمن کو شکست سے دوچار کیا۔ میرے عسکری پروفیشن کی یادیں تو بہت زیادہ ہیں لیکن جنگ ستمبر کے جو خاص واقعات میرے ساتھ پیش آئے وہ میں نے مختصر طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

چونڈہ پر میری کارکردگی کے پیش نظر میرے کرنل صاحب نے میرے لیے "ستارہ جرات" کی سفارش کی اور فیلڈ مارشل ایوب خان نے مجھے یہ اعزاز عطا کیا۔ اس کے علاوہ میں نے سابق آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ سے ستارہ بسالت اور جنرل ضیاء الحق سے ہلال امتیاز ملٹری حاصل کیا۔ (ماہنامہ "ہلال" ستمبر 2021ء)

www.currentnn.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

روزنامہ پاکستان

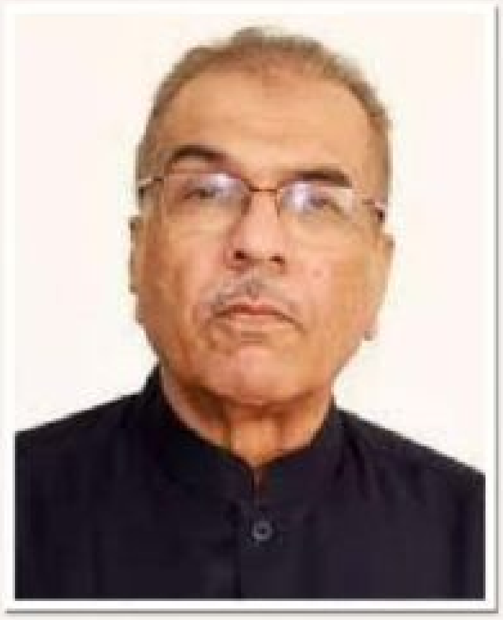

بسمہٖ تعالیٰ

14افراد کی کہانی

ہر وہ شخص جو کسی نہ کسی شعبے میں کچھ نہ کچھ کر دکھاتا اور اپنے آپ کو منواتا ہے، اُس کے پاس بتانے کے لیے کچھ نہ کچھ ہوتا ہے اور اس سے سیکھا بھی کچھ نہ کچھ جا سکتا ہے۔ اُس کی کتابِ زندگی ان سب لوگوں کے لئے گائیڈ کی حیثیت رکھتی ہے جو آگے بڑھنا اور اپنے مستقبل کو سنوارنا چاہتے ہیں۔ دائرہ چھوٹا ہو یا بڑا، کسی کو شہرت کم ملی ہو یا زیادہ، اہمیت اس لگن، جستجو اور کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں پودا لہلہاتا ہے اور پھل یا پھول سے لد جاتا ہے۔ عبدالستار اعوان نے 14 منتخب افراد کی کتابِ زندگی آپ کے سامنے کھول کر رکھ دی ہے، گویا ایک کتاب میں 14 کتابیں سمٹ آئی ہیں۔ انہیں پڑھیے اور ان سے ملاقات کیجیے جو ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں۔

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

قوم افراد کے مجموعے کا نام ہے اور اگر ہر فرد کمر ہمت کس لے، ہار نہ مانے اور اپنا سفر جاری رکھے تو پوری قوم ناقابل تسخیر بن جاتی ہے۔ 14 افراد کی کہانی اگر پوری قوم کی کہانی بن جائے تو عبدالستار اعوان کا سر بھی فخر سے بلند ہو جائے گا اور ہم سب بھی سربلند ٹھہریں گے۔

28/02/2022

مجیب الرحمن شامی
سینئر صحافی، تجزیہ نگار

www.currentma.com

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner